سیرتِ
اشرف
از منشی عبدالرحمن خان
یورپ
عرب
افریقہ
ایشیا
پاکستان
چین
بحر ہند
بحرالکاہل
ناشر
ادارہ نشر المعارف چہلیک ملتان شہر
مغربی پاکستان
ASHRAF

٧٨٦

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

سیرتِ اشرف

یعنی

سوانحعمری حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح

مؤلفہ

منشی عبدالرحمن خاں

ناشر

ادارہ نشر المعارف چہلیک ملتان شہر

قیمت بارہ روپے

ستمبر ۱۹۵۶ء

باراول ۱۱۰۰

ان کے نام

جو علم و عمل کے اس دورِ افراط و تفریط میں
انسانیت کی مکمل اور صحیح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں

نقوش و تاثرات

مسلمان جس دورِ ابتلاء سے گزر رہا ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ وہ خود کو اسلامی سانچے میں ڈھال لے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب اسے تعلیمات اسلامی کے ہر پہلو سے واقف و آگاہ کیا جائے۔ اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے قوم کے سامنے ایسا پاکیزہ لٹریچر پیش کیا ہے۔ جس سے ہر طبقہ و خیال کا معمولی قابلیت کا انسان زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ کے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں شعور و بصیرت حاصل کر سکتا ہے جس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ذیل کے نقوش و تاثرات سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ تعارفِ قرآنی — اس میں بیارہ سے سادے لفظوں میں قرآن پاک کے نام کام اور پیغام کو مؤلف نے اختصار اور خوش اسلوبی سے جمع کر دیا ہے۔ کلام مجید کی مختلف حیثیتوں پر اردو میں ایسی عام فہم اور آسان کتابیں بہت کم ہیں (مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی)

یہ اسم بامسمیٰ کتاب ہے مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ اور قرآن مجید کے طلبہ کے لئے ایک اچھے مقدمہ یا تعارف نامہ کا کام دے سکتی ہے (مفسر قرآن مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

یہ کتاب اپنی جامعیت اور اختصار کے لحاظ سے بہت زیادہ مفید ہے اس کے پڑھنے سے مضامین قرآن مجید کا ایک بہترین خاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں آجاتا ہے (مولانا احمد علی صاحب لاہوری)

۲۔ بصائرِ قرآنی — اس میں قرآنی حکم و بصائر کو حسن ترتیب کے ساتھ مختلف عنوانات کے تحت جمع کر کے لوگوں کو خالص قرآنی تعلیمات سے قریب تر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ع۔ر
(محقق اسلام مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

اس میں قرآنی حقائق و معارف کو مناسب ترتیب سہل عنوانات۔ عام فہم انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ معمولی قابلیت کا انسان بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ (مولانا سید محمد میاں ناظم جمعیۃ العلماء ہند)

۳۔ احکامِ قرآنی — اس کے ذریعہ قرآن کریم کے جمال جہاں آرا سے آسان، دلچسپ اور تاریخی طریقہ سے دنیا کو اس طرح روشناس کرایا گیا ہے کہ کم استعداد آدمی اور ابتدائی تعلیم پانے والے بچے بھی اس کے نورِ ہدایت سے کلیۃً محروم نہ رہیں (شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی)

یہ اپنے طرز کی نئی۔ دلکش اور عام فہم کتاب ہے جس میں اعتقادات۔ عبادات۔ معاملات وغیرہ پر قرآنی احکام جمع کئے گئے ہیں (مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان) سے

۴۔ داستانِ عمل | یہ مسلمانوں کے اخلاق فاضلہ کی ایک تاریخ ہے۔ جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں درسِ عمل حاصل کیا جا سکتا ہے (ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ)

اس میں اسلامی تاریخ کے مشہور واقعات کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ اخلاق و کردار کے مختلف شعبوں میں اسلام کس قسم کے انسان چاہتا ہے (روزنامہ "نوائے وقت" لاہور) سے

۵۔ اخلاق و آداب | اس میں شرعی ادب کے تمام عملی نقشے۔ عالمانہ و عارفانہ اسوے پیش کر کے امت کو شاعرانہ، عامیانہ، رہبانیہ، متکبرانہ اور منافقانہ رسوم و آداب و اخلاق اور متواضعانہ و متکبرانہ حدود و رسوم پر لگانے کی کامیاب سعی کی گئی ہے (مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند)

اس میں کتاب و سنت۔ سیرت و آثار۔ فقہاء اور صلحائے امت کے تواتر معمول کو سامنے رکھ کر آداب و اخلاق کی سہل و آسان انداز میں تعلیم دی گئی ہے۔ جس کے پڑھنے سے یقیناً تزکیہ قلب و دماغ ہوتا ہے (ماہنامہ "فاران" کراچی)

اسلام میں آداب و اخلاق کی بڑی اہمیت ہے۔ بلکہ اس کا مقصد ہی ان کی تکمیل ہے اس کتاب میں انسانی زندگی کے جملہ شعبوں اور انسانی اعمال کے سارے اچھے مظاہر کے متعلق بڑی تفصیل و استیعاب سے آداب و اخلاق جمع کئے گئے ہیں۔ اور اس کا کوئی رخ اور کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پایا۔ (ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ)

اس میں چھ سے لحد تک کے اصول و آداب زندگی جمع کئے گئے۔ جن کی اسلام تعلیم دیتا ہے اس سے تعمیر سیرت میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اور اسلامی تعلیمات سے عام بیگانگی کو دور کرنے میں یہ کتاب بہت ممد ثابت ہو گی (ہفت روزہ قندیل لاہور)

اسلامی فلسفہ اخلاق اور دیگر احکام کو قرآن و سنہ کی روشنی میں نہایت سلیس زبان میں اس طرح جمع کیا گیا ہے کہ اس سے ہر شخص استفادہ کر سکتا ہے۔ مرتب کی تحریر پر کسی ایک فرقے یا کسی ایک مذہبی گروہ کی چھاپ نہیں ہے۔ (روزنامہ "امروز" لاہور) سے

۶۔ فتنہ پرویز و حقیقت حدیث | اس میں منکرین حدیث کے امام وقت غلام احمد پرویز کے عنوانات کی ان کے اپنے بیانات سے تردید کی گئی ہے۔ اس فتنہ کے آغاز۔

اس کے اثرات۔ اس سے پیدا شدہ نتائج۔ حدیث کی دینی حیثیت۔ اطاعتِ رسول کے قرآنی احکام
قرنِ اولیٰ میں حفظِ حدیث۔ اس کی صحت و حفاظت کے اہتمام۔ اس کے ذرائع حفظ و کتابت
اصولِ روایت و درایت اور تدوینِ حدیث کی تاریخ اور حدیثوں کی کثرت کے متعلق مبالغہ آمیز بیانات
کی تردید کی گئی ہے۔ زبان صاف و آسان، پیرایۂ بیان عام فہم اور مؤثر ہے اور دلائل وزنی ہیں
(ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ)

اس میں فتنہ انکارِ حدیث کا رد حدیث کی قدر و قیمت کی توضیح اور پرویزی مدرسۂ فکر کا تجزیہ کیا
گیا ہے۔ بہت سی باتیں معلومات افزا ہیں (ماہنامہ ترجمان القرآن۔ لاہور) سے۔

۷۔ مشاہدات و واردات اس کتاب کے مصنف ایک ایسے کہنہ مشق اہلِ قلم ہیں جنہوں
نے اہل اللہ کی صحبت سے روحانی دنیا میں بہت کچھ حاصل کیا
ہے۔ انہوں نے اپنے گوناگوں مشاہدات۔ واردات۔ تجربات۔ احساسات اور جذبات کے
ایک دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے یہ ان مسلمانوں کے استفادہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ جو مادہ پرستی
کی رو میں بہہ کر روحانی دنیا کو قطعاً نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ اس میں پر از معلومات اور اثر انگیز
واقعات درج ہیں۔ (روزنامہ "نوائے وقت" لاہور)

ایک صاحبِ قلم کی آپ بیتی جنہوں نے اپنے حالات سادگی۔ بے تکلفی اور دلیری سے لکھ
دئے ہیں اور ان سے اپنی فہم و بصیرت کے مطابق سبق لیتے اور نکالتے گئے ہیں (صدق جدید لکھنؤ)

اس میں مصنف نے اپنی زندگی کے دینی و دنیاوی روحانی تجربات کو سبق آموز۔ اخلاقی اور اصلاحی
رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب دونوں حیثیتوں سے مفید ہے۔ اس سے اخلاقی سبق بھی حاصل
ہوتا ہے اور دنیوی امور میں بھی بصیرت حاصل ہوتی ہے (ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ) سے۔

۸۔ حقائق و معارف اس میں مؤلف نے نہایت کاوش سے مختلف سنجیدہ عنوانات کے تحت وہ
اشعار منتخب کرکے درج کئے ہیں۔ جو زندگی کے اعلیٰ اقدار سے واسطہ
رکھتے ہیں۔ ان کا ذوقِ شعر بلند ہے اور ان کا انتخاب سوقیانہ اور مبتذل اشعار سے پاک۔ اگر
کوئی خوردہ گیر یہ کہے کہ حقائق و معارف کا کوئی حصہ اس کے دل کے تاروں پر زخمہ زنی کرنے سے
قاصر ہے۔ تو میں یہ سمجھوں گا کہ اس کا ذوقِ شعر محلِ نظر ہے (عالیجناب ایس اے رحمٰن صاحب چیف جسٹس مغربی پاکستان)

اس میں مختلف موضوعات پر اردو کے مشہور شعرا کے اشعار جمع کئے گئے ہیں۔ اس سے مقررین
مقالہ نگاروں اور مضمون نگاروں کے لئے بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ اشعار کے انتخاب میں سلیقہ

کارفرما ہے اور مرتب کے حسن انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے (روزنامہ "نوائے وقت" لاہور)

تین سو دس عنادین کے تحت مختلف شعراء کے منتخب اشعار کے اس مجموعہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اخلاق و اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو خواتین بھی پڑھ سکتی ہیں کہ بے راہ روی اور آزاد خیالی اور شوخی و بیباکی کی پرچھائیں بھی فاضل مرتب نے کہیں نہیں پڑنے دیں (ماہنامہ "فاران" کراچی) ہے

۹۔ خضر و مسیحا اس میں اخلاقی۔ قومی اور خالص انسانی موضوعات پر بلند پایہ مفکروں کا روح پرور کلام اور نظمیں ملک کے معیاری رسالوں سے منتخب کر کے پیش کی گئی ہیں مصنف کی یہ کوشش ادب کے مواد میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اور یہ انتخاب اس لحاظ سے بھی قابل داد ہے کہ اس کی تمام نظمیں تعمیری رجحانات کی علمبردار ہیں۔ اس کا مطالعہ پوری انسانی برادری کے لئے یکساں مفید ہے۔ (ہفت روزہ قندیل لاہور)

اس میں بعض مشہور اور بعض ایسی دلکش نظمیں موجود ہیں۔ جو پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔ قوم جس دور سے گزر رہی ہے۔ اس کے لئے یہ خوان نعمت غنیمت ہے (میاں بشیر احمد صاحب مدیر ہمایوں لاہور) ۱۲؍

۱۰۔ اقبال اور مُلّا علامہ اقبال کے نام پر علماء کرام کو نشانہ ستم بنانے کی جو مذموم مہم ادارہ ثقافت اسلامیہ کے صدر خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم نے اپنے رسالہ "اقبال اور ملا" کے ذریعہ شروع کی تھی۔ اس میں ان تمام بہتانوں کی علامہ اقبال کے ذاتی خیالات دینی نظریات اور مذہبی عقائد کی روشنی میں تردید کی گئی ہے۔ اور علامہ اقبال کے اشعار سے نہیں بلکہ ان کے ملفوظات۔ مکتوبات۔ خطبات اور بیانات سے ثابت کیا گیا ہے۔ کہ علامہ اقبال علماء کو اسلام کی قوت عظیم کا سرچشمہ اور مغرب زدہ مسلمانوں کو نہایت پست فطرت اور علوم اسلامیہ سے قطعاً بے بہرہ سمجھتے تھے۔ "اقبال اور ملا" کے ذریعہ اس طبقہ کی ابلہ فریبیوں کو چاک کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے (شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی) ۸؍

۱۱۔ تعمیر پاکستان اور علماء ربانی تاریخی انکشافات اور نادر معلومات کا یہ ایک ایسا قابل قدر مجموعہ ہے جس کے مطالعہ سے قائد اعظم کو گالیاں دینے اور کانگریس پر ایمان لانے والے اکثر ارباب فہم توبہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس میں پہلی دفعہ اس راز پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ پاکستان کا تخیل علامہ اقبال سے پہلے حضرت مولانا اشرف علی

تھانوی نے پیش کیا تھا۔ اور انہوں نے ہی قائداعظم کی دینی تربیت فرمائی تھی۔ تعمیر پاکستان اور تدوین آئین کے سلسلہ میں سیاسی رہنماؤں کی خودغرضانہ مساعی۔ علماء ربانی کی مخلصانہ جدوجہد اور جماعت اسلامی کی باغیانہ سرگرمیوں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کو ختم کرنے کے سرکاری منصوبہ کی روح فرسا تفصیلات پیش کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے (طاقت) ہے۔

۱۲۔ **انسانیت حیوانیت کی راہ پر** اس میں دانایان فرنگ کے پیش کردہ اعداد و اسناد کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں مغرب کی خودساختہ اور اخلاق باختہ عریاں تہذیب انسانیت کی کوئی تعمیر یا خدمت نہیں کر سکی اور وہ اپنی زندگی کے ابھی دو سو سال بھی پورے نہیں کرنے پائی کہ اس کے ہولناک نتائج سے خود اس کے مراکز میں زلزلہ سا آگیا ہے۔ اس کے متعلق تفصیلات اور حیرت انگیز معلومات کو مصنف نے ایسے مؤثر اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ گہرے طلسمی حجابات جو عیار مغرب کی افسوں گری نے دنیا کے سامنے حائل کر رکھے ہیں یکے بعد دیگرے اُٹھتے چلے جاتے ہیں اور انسان بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ واقعی انسانیت حیوانیت کی راہ پر جارہی ہے (عاقبت گرنالی) ملعہ۔

ناظم ادارہ نشر المعارف
چہلیک۔ ملتان شہر

ضروری اعلان

ہندوستانی خریدار مولانا نصیر الدین صاحب ناظم یحیوی بک ڈپو مظاہر العلوم سہارنپور کو کتاب کی قیمت اور محصول ڈاک روانہ کر کے رسید ادارہ نشر المعارف چہلیک ملتان شہر (مغربی پاکستان) کو بھیج کر کتاب منگا سکتے ہیں۔
تاجروں سے خاص رعایت۔

ناظم

فہرست مضامین

حصہ اول ــــ آغازِ زندگی

۵۔ حصولِ علم

۶۔ اساتذہ کرام

۷۔ درس و تدریس

۸۔ شاگردانِ رشید

۹۔ صحبتِ بزرگاں

۱۰۔ دعاءِ بزرگاں

۱۱۔ وعظ و تبلیغ

۱۲۔ معمولاتِ وعظ

۱۳۔ دورۂ سفر

۱۴۔ معمولاتِ سفر

۱۵۔ شرفِ بیعت

۱۹۔ رشد و ہدایت

حصہ دوم —— بہارِ زندگی

۲۰۔ شمائل

۲۱۔ اخلاق

۲۲- عادات

۲۳- معاملات

۲۴- معمولات

۲۵۔ معیشت

۲۶۔ معاشرت

۲۷۔ حُسن

۲۸۔ عبدیت

۲۹۔ علم و ادب

۳۰۔ لطافت و ظرافت

۳۱۔ خشونت

۳۲۔ محبوبیّت

۳۳۔ مقبولیّت

۳۴۔ عزو شرف

حصہ سوم — اصول زندگی

۴۸۔ اختلاف و اتفاقات

۴۹۔ ذکر و فکر

۵۰۔ تخیلِ پاکستان

۵۱۔ اصلاحِ معمارِ پاکستان

۵۲۔ آئینی سرگرمیاں

۵۳۔ سیاسی کشمکش

حصہ چہارم ——— انجامِ زندگی

۵۴- اہتمامِ اصلاحِ امت

۵۵- مجازینِ صحبت وبیعت

۵٦۔ تصنیفات وخطبات

۵۷۔ اہل و عیال

۵۸۔ اہتمام سفر آخرت

۵۹۔ علالت و رحلت

۶۰۔ اعتراف عظمت

ماخذات

سیرت ہذا کی تیاری کے سلسلہ میں حسبِ ذیل کتب سے امداد لی گئی ہے

(۱)

نمبر	کتاب	مصنف
۱	اشرف السوانح ہر سہ حصہ	خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ
۲	خاتمۃ السوانح	〃
۳	حسن العزیز	〃
۴	حکیم الامت	مولانا عبد الماجد دریابادیؒ
۵	سفرنامہ پاکستان	〃
۶	حیاتِ اشرف	مسٹر غلام محمد عثمانیہ
۷	لمعاتِ کبریٰ	شیخ الجامعین مغربی
۸	فتوحات	شیخ ابن عربیؒ
۹	انوار القلوب	مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
۱۰	الاعتدال فی مراتب الرجال	مولانا محمد زکریا کاندھلوی
۱۱	جامع المجددین	مولانا عبد الباری ندوی
۱۲	تجدید تصوف و سلوک	〃
۱۳	یادِ رفتگاں	مولانا سید سلیمان ندویؒ
۱۴	مکتوبات امدادیہ	مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ
۱۵	المہند علی المفند	مولانا خلیل احمد مہاجر مدنیؒ
۱۶	الشہاب الثاقب	مولانا حسین احمد مدنی
۱۷	نقشِ حیات	〃
۱۸	ہزار سال پہلے	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۱۹	وقایۃ المسلمین	مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی

نمبر	کتاب	مصنف
٢٠	آداب الشیخ والمرید	مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
٢١	افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ	″
٢٢	اشرف الافادات ″	مولانا عبدالاحد تسورتی
٢٣	کمالات اشرفیہ	مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی
٢٤	معمولات اشرفیہ	منشی علی محمد لاہوری
٢٥	اشرف المعمولات	″
٢٦	تالیفات اشرفیہ	مولوی عبدالحق فتحپوری ہسوی
٢٧	مزید المجید	مولانا عبدالمجید بچھرایونی
٢٨	آثار رحمت	مولانا جلیل احمد علی گڑھی
٢٩	القول الجلیل	″
٣٠	بزم جمشید	مولانا وصل بلگرامی
٣١	ارمغان جاوداں	″
٣٢	معمولات سفر	مولانا حکیم محمد مصطفےٰ بجنوری
٣٣	حسام الحرمین	مولانا احمد رضا خاں بریلوی
٣٤	"معارف" سلیمان نمبر	مولانا شاہ معین الدین احمد
٣٥	حرف اقبال	علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
٣٦	ملفوظات اقبال	مسٹر محمود نظامی
٣٧	حیات قائد اعظم	چوہدری سردار محمد
٣٨	مشاہدات واردات	مؤلف سیرت ہذا
٣٩	تعمیر پاکستان اور علماء ربانی	″
٤٠	ملفوظات	حافظ صغیر احمد مظفر نگری
٤١	کلمۃ الحق	حکیم عبدالحق کوٹی
٤٢	امپیریل گزٹ	

(۲)

متذکرہ صدر کتب کے علاوہ صاحب سیرت حضرت تھانویؒ کی مندرجہ ذیل تصنیفات وتالیفات وخطبات سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۴۳ نشر الطیب
۴۴ حیات المسلمین
۴۵ معاملۃ المسلمین
۴۶ صیانۃ المسلمین
۴۷ بوادر النوادر
۴۸ قصد السبیل
۴۹ تعلیم الدین
۵۰ زاد السعید
۵۱ آداب معاشرت
۵۲ اصلاح انقلاب
۵۳ اصلاح الخیال
۵۴ موائد العوائد
۵۵ الصدق الرویا
۵۶ نوادر خلیل
۵۷ ذکر محمود
۵۸ حفظ الایمان
۵۹ بسط البنان
۶۰ حکایات الشکایات
۶۱ الافاضات الیومیہ
۶۲ مقالات حکمت
۶۳ خیر العبور
۶۴ الحج المبرور
۶۵ ہفت اختر
۶۶ راحت القلوب
۶۷ تجارت آخرت
۶۸ کلمۃ الحق
۶۹ ملت ابراہیم
۷۰ حقیقت تصوف
۷۱ دعوات عبدیت
۷۲ الاسعاد والابعاد
۷۳ ذم النسیان
۷۴ ایثار الیتامیٰ
۷۵ مواعظ تبلیغ
۷۶ مواعظ اشرفیہ
۷۷ التشرف
۷۸ الباطن
۷۹ الاسراف
۸۰ المخفوع

دو لفظ

(از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی)

حکیم الامت، اشرف العلماء حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ اس زمانہ میں ایک آیت من آیات اللہ تھے۔ ایک مستقل مشعلِ ہدایت، چراغ راہ، بیسیوں کمالات ظاہری و معنوی کے جامع — ضرورت تھی کہ آپ کی سیرتیں مختلف اور متعدد لکھی جاتیں اور آپ کی زندگی کے ہر ہر پہلو کو نمایاں کیا جاتا۔

اشرف السوانح مع تکملہ، اس میں شک نہیں کہ اپنی جگہ ایک بڑے پایہ کی کتاب ہے۔ نافع، مستند، قابل قدر۔ لیکن جدید ضرورتوں کا تقاضا کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ اس "کچھ اور" کو پورا کرنے کیلئے مؤلف "سیرتِ اشرف" سلمہ نے قلم اٹھایا اور اللہ نے ان کی ہمت میں برکت بھی عطا کر دی۔

کتاب کی پوری قدر و قیمت و افادیت کا اندازہ تو اس کے چھپنے اور پورے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکے گا۔ ان سطور کے راقم کی نظر سے اب تک اس کی خوب مفصل فہرست مضامین، نیز اسکے ابتدائی مطبوعہ اوراق گذرے ہیں، جو بحیثیت مجموعی قابل داد ہیں۔

پوری دیگ کا اندازہ چند چاولوں سے ہو جاتا ہے۔ اسی معیار سے یہ بہ اطمینان کہا جا سکتا ہے کہ کتاب ان شاء اللہ دلچسپ جامع و بصیرت افروز ہو گی۔

عبدالماجد

درسِ حیات

(از حضرت مولانا خیر محمد صاحب خلیفہ ارشد حضرت تھانوی و مہتمم مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان)

اشرف الاولیا قطب الارشاد شیخ المشائخ مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی حنفی چشتی صابری امدادی نور اللہ مرقدہٗ کی حیاتِ طیبہ علمی و عملی کمالات اور ظاہری و باطنی فیوض و برکات کی جامعیت کے اعتبار سے ایک ممتاز اور بے نظیر حیثیت رکھتی تھی جن کا ہر قول و فعل انسانیت کیلئے مشعلِ راہ تھا۔ لسانِ خیر و دربار اشرفیہ خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ

کہیں نہ دیکھا کہیں نہ پایا جمال ایسا کمال ایسا
دکھائے کوئی اگر ہو دعویٰ جمال ایسا کمال ایسا

خواجہ صاحب موصوف فطری شاعر ہونے کے علاوہ گریجویٹ، حضرت تھانوی کے خلیفہ اعظم اور خادم خاص بھی تھے۔ انہوں نے حضرت کی حیات میں ہی آپ کی سوانح "اشرف السوانح" کے نام سے لکھی تھی جو صحیح حالات کی جامع اور خود صاحب سیرت کی مصدقہ تھی۔ مگر وہ اپنے مخصوص انداز بیان و ترتیب کی وجہ سے عوام سے زیادہ خواص کیلئے ہی مفید ثابت ہوئی۔ اسلئے ضرورت تھی کہ تاریخی حیثیت سے جدید طرز پر ایک ایسی سیرت اشرفیہ لکھی جائے جس سے عام تعلیم یافتہ طبقہ بھی استفادہ و استفاضہ کر سکے۔

محبی و محترمی جناب منشی عبد الرحمٰن خاں صاحب بانی سلمہٗ نے اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے "اشرف السوانح" کی اساس پر جدید تقاضوں کے مطابق ایک ایسی جامع اور مفصل گر صحیح و متین سیرتِ اشرف مرتب کی ہے جس کی اہل الرائے کے نزدیک سیرۃ النبی کے بعد اردو ادب میں نظیر ملنی مشکل ہے۔ حسنِ ترتیب نے اسے نقشِ حیات کے ساتھ درسِ حیات بھی بنا دیا ہے۔ جسے پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے اور اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سیرت

"نور کی بنی ہوئی اور تقدس کے سانچے میں ڈھلی ہوئی کسی مافوق الفطرت ہستی کی ہے؟ یا آب و گل سے ترکیب پائے ہوئے انسانی دل اور بشری جذبات رکھنے والے کی؟"

مؤلف سلمہٗ نے "سیرتِ اشرف" مرتب کر کے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو ہی پورا نہیں کیا بلکہ خدام دربار اشرفیہ پر خصوصاً اور عام مسلمانوں پر عموماً احسان فرمایا ہے اور مجھ ایسے ناکارہ و خطاکار کو تیاری کے ساتھ ساتھ حرفاً حرفاً مطالعہ کی سعادت بخش کر مشورہ طلب امور میں مشورہ بھی قبول فرمایا ہے جس سے قلبی راحت نصیب ہوئی اور دل سے دعا نکلی کہ حق تعالیٰ منشی صاحب موصوف کو مزید دینی خدمات کی توفیق عطا فرمائے۔ ان کی تمام دینی تالیفات و تصنیفات کو مقبول و نافع بنائے اور ان کے قال کو حال بنا کر رضا و قرب سے نوازے۔ آمین ثم آمین

خیر المدارس۔ ملتان شہر
۲۶ رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ

خادم الطلباء والفقراء
خیر محمد جالندھری عفا اللہ عنہ

متبرک سیرت

(از نواب جمشید علی خاں صاحب رئیس اعظم باغپت وممبر یو۔پی اسمبلی)

یہ مژدہ جاں بخش معلوم ہو کر کیا بتاؤں کس قدر مسرت ہوئی اور دل سے آپ کیلئے کتنی دعائیں نکلیں کہ آپ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح حیات مرتب فرما رہے ہیں۔ سوانح کے کچھ اجزاء جو آپ نے اپنے کرم سے بھیجے۔ وہ میں نے بہ شوق و رغبت مطالعہ کئے۔ ماشاء اللہ اسلوب بیان اور طرز ترتیب بہت خوب ہے۔

پاکستان کے ابتدائی تخیل کے عنوان سے جو کچھ جناب نے تحریر فرمایا۔ نہایت سلیقہ کے ساتھ تحریر فرمایا۔ اس عنوان پر قلم اٹھانا بہت دشوار تھا کہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جائے اور مبالغہ بھی نہ ہو۔ گذشتہ داعیان کی دلآزاری بھی نہ ہو۔ اور جو کچھ لکھا جائے۔ دلائل کے ساتھ ہو منتشر موتی خواہ علیحدہ علیحدہ کیسے ہی نادر و نایاب ہوں۔ اس قدر جاذب نہیں رکھتے اور نہ اس قدر دیدہ زیب ہوتے ہیں۔ جیسے ایک لڑی میں سلیقہ سے پرونے کے بعد بیش بہا اور خوشنما ہو جاتے ہیں۔ آپ جس کاوش و کاوش سے اس متبرک سیرت کو مکمل فرما رہے ہیں یہ آپ ہی کا حصہ ہے اع

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

مجھے مسرت ہے کہ اس تصنیف میں آپ پوری دیانت سے کام لے رہے ہیں۔ اور خدام حضرت تھانوی مطمئن و مسرور ہیں کہ باری تعالےٰ نے سیرۃ اشرف کی تالیف و تصنیف کا کام اپنے ایسے بندہ سے لیا ہے جو ہر طرح اس اہم ترین خدمت کی انجام دہی کا اہل ہے

مبارک ہے آپ کی ذات کہ اللہ تعالےٰ نے آپ سے ایسا جلیل القدر کام لیا۔ جو دنیا و آخرت دونوں اعتبار سے عدیم المثال ہے۔ جملہ حلقہ بگوشان حضرت والا آپ کے شکر گذار ہیں۔ کہ آپ نے بر وقت یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے۔ اور آپ کی اس دینی خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین

نیازمند
جمشید

باغپت ضلع میرٹھ
۱۸ر جولائی ۱۹۵۵ء

نمونۂ اخلاقِ محمدی

(از نواب محمد اسماعیل خاں صاحب بیرسٹر و صدر یو۔پی مسلم لیگ)

یہ معلوم کر کے بے انتہا مسرت ہوئی۔ کہ آپ نے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت قریب قریب مرتب کر لی ہے۔ مجھے مولانا مغفور سے پہلی مرتبہ مسلم لیگ کی تحریک کی ابتدا میں تھانہ بھون میں ملاقات کا موقعہ ملا۔ میں اپنے دوست نواب جمشید علی خاں کے ہمراہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ کیونکہ انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا۔ کہ حضرت مولانا لیگ کے مقاصد سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور تحریک کے سلسلہ میں مفصل معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی ملاقات ظہر کی نماز کے بعد مسجد میں ہوئی۔ جہاں مولانا ایک حلقہ کے درمیان تشریف فرما تھے۔ ہم کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ اور دوسرے لوگوں کو وہاں سے رخصت کر دیا۔ عصر کی نماز تک ان سے گفتگو جاری رہی۔ اس کے بعد انہوں نے وعدہ فرمایا کہ وہ لیگ سے اپنی ہمدردی کا اعلان اخباروں میں فرمادیں گے۔

رات کو کھانے کی دعوت دی۔ جہاں ایک نہایت دلچسپ صحبت رہی۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ مولانا کو دیکھتے ہی میرے دل پر ان کی بزرگی کا گہرا اثر ہوا۔ اور وہ تمام شکوک رفع ہو گئے۔ جو میرے دل میں تحریک خلافت کے دوران میں تھانہ بھون کے بیانات کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے

دوسری مرتبہ مولانا نے خود مجھے تھانہ بھون میں طلب کیا۔ اس دن رات کو بھی اپنے گھر کھانے پر مدعو فرمایا۔ جب میں اپنے ہمراہیوں کے وہاں پہنچا۔ تو مولانا خود ہاتھ دھلانے پر مصر ہوئے جس کو ہم ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے۔ پھر اپنے ہاتھ سے دسترخوان بچھایا اور کھانا لے کر آئے ان کی اہلیہ محترمہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اوٹ کے پیچھے سے گرم گرم روٹیاں لاتی رہیں جب کھانا کھا چکا تو مولانا نے فرمایا "آیئے جنت کا کام کریں"۔ میرے پوچھنے پر کہ وہ کیا؟ فرمایا "کلوا واشرب"۔

وہ اخلاقِ محمدی کے پورے حامل تھے۔ جیسا اثر میرے قلب پر ان سے ملنے پر ہوا ایسا صرف ایک مرتبہ اور ہوا تھا۔ جبکہ پہلے پہل (شیخ الہند) مولانا محمود الحسنؒ سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ خلافت اور لیگ کی تحاریک کے دوران بہت سے علماء سے ملنے کے اتفاقات ہوئے۔ لیکن کسی کا بھی اتنا اثر نہ ہوا۔ جیسا کہ مولانا تھانوی سے ملنے کا۔

ان کے خطوط میرے پاس آتے رہے۔ جو اس وقت میرے لڑکے کے پاس ہیں میں انہیں لکھ رہا ہوں کہ وہ یہ خطوط آپ کو روانہ کر دیں۔

نیازمند
محمد اسماعیل خاں

مصطفیٰ کاسل۔ میرٹھ
۱۰ر جون ۱۹۵۵ء

چراغ راہ

(از عالیجناب نواب حافظ احمد سعید خاں صاحب چھتاری سابق گورنر یو۔پی)

مجھے بڑی مسرت ہے کہ آپ حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت لکھ رہے ہیں یہ ایک بہت ہی ضروری کام ہے اسلئے کہ قوم کے افراد کو ایسے لوگوں کی سیرت جاننے سے خود اپنی سیرت بنانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ایسے حضرات کے سوانح حیات قوم کے لئے چراغ راہ کا کام دیتے ہیں۔ قوم کو ایسے حضرات کی سیرت اور کردار کی روشنی میں برے اور بھلے کی تمیز کا موقع ملتا ہے۔ اور اچھے کاموں کی ترغیب اور بری باتوں سے اجتناب کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ مجھے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نہ صرف ذاتی طور پر شرف نیاز حاصل تھا۔ بلکہ خاندانی طور پر ان تمام حضرات کی خدمت کرنے کا فخر مجھے اور میرے آباؤ اجداد کو حاصل رہا ہے کہ جن حضرات سے حکیم الامت کو تعلق تھا مثلاً مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب مرحوم و مغفور صحیح معنوں میں حکیم الامت تھے وہ احکام شرعیہ کو اس اسپرٹ میں بیان فرماتے تھے کہ جو تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں اسلامی دنیا میں کارفرما تھے۔ مثالاً ایک قصہ عرض کر دوں۔

مولانا مرحوم مغفور کی خدمت میں ایک صاحب حاضر ہوئے اور حج پر جانے کا خیال ظاہر کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ تم پر کوئی قرضہ تو نہیں ہے۔ انہوں نے انکار کیا تو فرمایا کہ کوئی جوان بیٹی شادی کو تو نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک لڑکی ہے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ پہلے لڑکی کی شادی کرو جب حج کو جانا۔ اب ایسے حضرات کہاں ہیں جو اسلام کی صحیح صورت کو سمجھیں اور شارع کے مقصد کو ہر وقت پیش نظر رکھیں۔ مجھے امید ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت مسلمانوں کے لئے مشعل راہ بن جائے گی۔

راحت منزل۔ علی گڑھ
۱۶۔ مئی ۱۹۵۵ء

نیاز مند
احمد سعید

پیش لفظ

سیرت کی صورت

حق تعالےٰ جلشانہ نے اپنے کلامِ پاک میں قرآن کا ایک مقصد یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ:۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ۔ (یوسف ۱/۱۲)

ہم نے آپ کے پاس جو یہ قرآن بھیجا ہے اس کے ذریعہ ہم آپ کو سب قصوں سے اچھا قصہ سناتے ہیں۔ اس سے قبل آپ (اس سے) بالکل بے خبر تھے۔

اسلئے قرآن کریم دستورِ حیات کے علاوہ اممِ سابقہ کی ایک ایسی تاریخ بھی ہے۔ جو ان کے احوال وحوادث کو بصائر وعبر اور علوم وہدایات کے لئے پیش کرتا ہے۔ اور یہی تاریخ نویسی کا اصل الاصول ہے۔ اگرچہ عام دستور کے مطابق تذکرہ نویس یا سوانح نگار انقلاب آفریں شخصیتوں کے پُرعظمت کارناموں کو صرف یہ دکھانے کے لئے پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے دنیا کو بامِ ترقی پر پہنچانے میں کتنا حصہ لیا۔ مگر یہ اصول اسلام کی مایۂ ناز شخصیتوں کو پیش کرنے کے سلسلہ میں چنداں مدد نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اسلام کی تاریخ دنیا کی دوسری تاریخوں سے بالکل مختلف ہے۔

اسلام کا روشن ترین دور سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوکر خلافتِ راشدہ تک ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم گذشتہ ساری تاریخ اسی دور کی تفصیلات وتائید کے لئے بیان کرتا ہے۔ اور آئندہ کی تمام تاریخ اسی دور کی روشنی میں مرتب کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسلئے اسلام کی مایہ ناز اور قابلِ فخر شخصیات کو پیش کرتے وقت یہ دکھانا عبث ہوگا۔ کہ انہوں نے دنیا کو ترقی کی کتنی منازل طے کرائیں۔ بلکہ یہ دکھانا ہوگا کہ انہوں نے اپنی علمی وعملی جدوجہد سے دنیا کو آفتابِ نبوت کی روشنی میں لانے میں کتنا حصہ لیا۔

قرآن کریم کے استقصار سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے یہی دستور چلا آرہا ہے کہ حق تعالےٰ ہر قوم کے لئے بمنشا وَ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ایسے ہادی ورہبر بھیجتا رہا۔ جو اس قوم کو ہدایت کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ جب تک سلسلہ نبوت جاری رہا۔ نبی آتے رہے۔ جب یہ

ختم ہوگیا۔ تو وقتاً فوقتاً ایسے مصلح اور مفکر بھیجے جاتے رہے۔ جو قوم کو اس دینی اور انسانی راہ پر لانے کی کوشش کرتے رہے۔ جس سے وہ بھٹک کر رسم و رواج اور بدعات و خرافات کے گڑھے میں جا گری تھی۔

تاریخ ہمیشہ خود اپنی ورق گردانی کرتی ہے۔ جب تک قوم میں کوئی ایسا مصلح موجود رہتا ہے۔ وہ صراطِ مستقیم پر چلنے میں کوشاں رہتی ہے۔ مگر جونہی وہ اپنا فرض ادا کر کے چل دیتا ہے۔ تو کچھ عرصہ کے بعد اس کی تعلیم و تربیت کا اثر ختم ہونا شروع ہوتا ہے۔ اور وہ قوم پھر اسی مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں سے اسے راہِ ہدایت پر لایا گیا تھا۔ اس کی بہترین مثال خود اسلام کا دورِ اولین ہے کہ:

"جو دین قیصریت و کسرائیت کے رنگ کو مٹانے آیا تھا۔ اس کے نام لیوا چالیس برس کے بعد خود ہی قیصریت و کسروانیت کے رنگ میں آہستہ آہستہ ایسے رنگ گئے کہ اس کے امراء و حکام۔ خلفاء راشدین کی نیابت کی جگہ قیصر و کسریٰ کی جانشینی پر فخر کرنے لگے۔ وہی تعیش۔ وہی سونے چاندی ریشم و حریر اور طاؤس و رباب کی زندگی مسلمان امراء و احکام کی زندگی کا مقصد بن گیا۔ بیت المال ان کا ذاتی خزانہ ہوگیا۔ اور سلطنت ان کی موروثی ملکیت۔ جاگیرداری اور زمینداری اسلامی اصول کی بجائے قیصر و کسریٰ کے طرز کی پیروی جاری ہوگئی۔"

(جامع المجددین ص۲۹ ملخصاً)

چنانچہ تاریخ اسلام میں ایسے ادوار آئے۔ جن کی اصلاح و درستی کے لئے مصلح و ہادی پیدا ہوتے رہے۔ ماضی قریب کی مشہور شخصیتیں حضرت شیخ احمد سرہندی۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید۔ اور حضرت مولانا سید احمد بریلوی رحمہم اللہ تعالےٰ اسی سلسلہ کی اہم کڑیاں تھیں۔ جنہوں نے احیائے سنن و ردِ بدعات کیلئے اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق خدمتِ دین و خلق کے فرائض انجام دیئے۔ جن پر تاریخ بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔

مگر ان کے بعد تعلیم جدید کا ایک ایسا دور آیا۔ جس نے تہذیبِ مغرب کو مسلمانوں کی نظروں میں معزز بنا دیا اور اسلام کو خود اسلام کے نام لیواؤں کی نظروں میں ذلیل۔ جس کی وجہ سے انہوں نے دین کے اصول و مبادی کو ترک کر کے افرنگی تصورات پر قصرِ حیات تعمیر کرنا شروع

کر دیا۔ ہر بات میں مغرب کے قانون و سیاسیات کی نقالی ہونے لگی ہر جگہ لندن و پیرس کی عریانی و بے حجابی نظر آنے لگی۔ بدعات و خرافات کو دین سمجھا جانے لگا۔ رقص و سرود اور چنگ و رباب کی سرپرستی شروع ہو گئی اور قریباً ہر مسلمان کے دل و دماغ سے نقشِ اسلام مٹنے لگا۔

جب مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی حالت اس حد تک گر گئی۔ تو حق تعالٰے نے اپنی سنت کے مطابق ایک ایسا حکیم اور مصلح بھیج دیا۔ جس نے دنیا کو بتلا دیا کہ دین صرف نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ نوافل یا اوراد کا نام نہیں۔ بلکہ اس کے اجزا اخلاق معاشرت اور معاملات بھی ہیں۔ انہوں نے دینِ کامل کے تمام ابواب و اجزا کو مدِ نظر رکھ کر تعمیر ملت کا کام شروع کیا۔ اور دنیا کو وہی بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ جو دشتِ عرب کے ایک اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیا تھا کہ

"حقیقت میں ترقی جس کی اس وقت دم بدم پکار ہے۔ اونچے محلوں۔ بھرے خزانوں۔ بیش قیمت لباسوں۔ گراں بہا سامانوں۔ بڑی بڑی تجارتوں۔ اعلیٰ ملازمتوں۔ اونچی اونچی تنخواہوں۔ شاہانہ احتراموں، اعزازوں اور خطابوں کا نام نہیں۔ بلکہ اللہ تعالٰے کے احکام کی تعمیل کے ساتھ بلند اخلاق شریف عادات اور پاک و صاف قلب کا نام ہے۔ جو آب و گل سے وابستہ اور فانی کا طالب نہ ہو۔ اور حبِ مال اور حبِ جاہ کا گرویدہ نہ ہو۔ جس میں اخلاص کے ساتھ خالق کی رضا کے لئے خلق کی خدمت کا جذبہ ہو"۔ (جامع المجددین ص ۲۹)

وہ مصلح اور حکیم حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے وہ مسلمانوں کی دینی اور دنیوی صلاح و فلاح اور انفرادی و اجتماعی بہبود و ترقی کے لئے اتنا نادر علمی خزانہ چھوڑ گئے ہیں۔ جو قیامت تک کام دے سکتا ہے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے۔ کہ ان کے نام۔ کام اور پیغام سے دینی طبقہ تو بخوبی آگاہ ہے۔ مگر موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ قریباً نا آشنا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حضرت تھانوی کی تعلیمات کی تہذیب و تسہیل اور نشر و اشاعت کا کام اس پیمانہ پر نہیں ہو رہا۔ جس پیمانے پر دوسرا لٹریچر پھیلایا جا رہا ہے۔ اور نہ ہی ان کے حالاتِ زندگی پر اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے نو تعلیم یافتہ طبقہ کو ان کی طرف کشش ہو سکتی۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے حضرت تھانویؒ کی جو "اشرف السوانح" مرتب کی تھی اور جس کی خود حضرت تھانویؒ نے نظرِ ثانی کی تھی۔ وہ اگرچہ ہر لحاظ سے جامع ہے۔ مگر اس کا اندازِ بیان مورخانہ ہونے کی وجہ سے اس کا مطالعہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے مانع ہے۔ اسلئے میرے دل میں بارہا یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی صاحبِ قلم اس کی تہذیب و تسہیل ہی کر دے۔ تاکہ ہمارے انگریزی خواں حضرات بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس غرض کے لئے میں نے سب سے پہلے مولانا عبد الباری صاحب ندوی استاذ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی کی توجہ مبذول کرائی۔ جو حضرت تھانویؒ کے جلیل القدر خلفاء میں سے ہیں انہوں نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۴۷ء میں مطلع فرمایا کہ:-

"حضرت علیہ الرحمۃ کی سوانح جس طرز کی آپ کے پیشِ نظر ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اس کے تحریر فرمانے کا مصمم ارادہ فرما چکے تھے غالباً ابتدا بھی فرما دی تھی۔ خدا کرے۔ تکمیل فرما دیں۔

جی احقر کا بھی چاہتا ہے کہ حضرت کی کتابیں ایسی شائع ہوں کہ نیا طبقہ بھی مستفید ہو سکے۔ مگر ظاہر کو موجبِ رغبت بنانے کے ساتھ باطناً بھی نئی تہذیب و ترتیب و تسہیل کی ضرورت ہے۔ خوشی ہوئی کہ آپ حضرات کو اس طرف توجہ ہے۔ اللہ تعالےٰ قبول فرمائے اور مدد فرمائے۔"

اس اطلاع پر میں نے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی طرف رجوع کیا۔ تو انہوں نے میرے خط کا یہ جواب بھیجا:-

بھوپال۔ ۲۸ جون ۱۹۴۷ء

مکرم
السلام علیکم

جوابِ خط میں تاخیر ہوئی۔ آپ کا خط کاغذوں کے ڈھیر میں مل گیا تھا آج نظر آیا۔ تاخیر کی تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔

بے شبہ "اشرف السوانح" کی تہذیب کا کام میں نے شروع کیا تھا ایک دو جزو لکھے تھے۔ کہ میں علیل ہو گیا۔ پھر بھوپال آنا پڑا۔ اور وہ کام رک گیا۔ اور جلد امید نہیں۔ ایسی حالت میں کوئی اور شخص اس کام کو

کرنا چاہے۔ تو وہ ضرور کرے۔
اللہ تعالےٰ آپ لوگوں کو حفظ و امان میں رکھیں اور اپنی توفیقات سے
بہرہ ور فرمادیں۔ والسلام
سید سلیمانؒ

اس پر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں میں نے محقق اسلام سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن صاحبؒ گیلانی صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی کا دروازہ کھٹکایا۔ اور انہیں لکھا کہ میں حضرت تھانویؒ کی یادگار کے طور پر ایک رسالہ "پیغام اسلام" جاری کر رہا ہوں۔ آپ حضرت تھانویؒ کے متعلق مضامین عطا فرمایا کریں اور ان کی سیرت لکھنے کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔ اسکے جواب میں انہوں نے ایک مضمون بعنوان "حکیم الامت کا جادۂ اعتدال" روانہ فرمایا (جو سیرت نمبر میں درج ہے) اور لکھا۔

"جامعہ عثمانیہ

حضرت والا

علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
عدیم الفرصتی کی وجہ سے کوئی مضمون تیار نہ ہو سکا۔ بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ مولانا تھانویؒ کی کتابوں کا ذخیرہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے تاہم آپ کے تقاضے کے بعد خاموشی گناہ معلوم ہوا۔ مختصر سا مضمون "کمالات اشرفیہ" کی مدد سے تیار کر کے بھیج رہا ہوں اور کیا عرض کروں دعا کیجئے کہ فرصت میسر آئے۔
مناظر احسن گیلانی"

بعد میں کچھ ایسا انقلاب آیا۔ کہ نہ رسالہ جاری ہو سکا۔ نہ کہیں سکون و اطمینان کی فضا باقی رہی کہ کسی اور سے تقاضا کرتا۔ گو یہ خیال بھلایا بھی نہ جا سکا۔
کچھ عرصہ بعد لکھنؤ سے خبر آئی کہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی حضرت تھانویؒ کے متعلق "جامع المجددین" تصنیف فرما رہے ہیں۔ جس سے کچھ تسلی ہوئی۔ مگر جب وہ چھپ کر آئی۔ تو اسے حضرت تھانوی کے صرف مجددانہ کارناموں پر مشتمل پایا۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت تھانویؒ نے "جماعت سازی" کے اس دور میں کس طرح انبیائی طریق پر "افراد سازی" کا اہتمام بالشان

کارنامہ سرانجام دیا۔ مگر یہ سوانح کا کام نہ ہو سکی۔ اس کے بعد یہ اطلاع ملی کہ محترم مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر "صدق جدید" لکھنؤ "حکیم الامت" کے نام سے حضرت تھانوی کی انسانیت کی معموری کر رہے ہیں۔ اب اس کا انتظار ہونے لگا۔ جب وہ چھپ کر آئی۔ تو اسے مولانا محترم کے ان ذاتی نقوش و تاثرات پر مشتمل پایا جو حضرت تھانوی کو اس دور کا "ایک بہترین انسان" ثابت کرتے تھے۔ یہ تصنیف لطیف اگرچہ حضرت تھانوی کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو روشنی میں لے آئی۔ مگر سوانح حیات کی تعریف میں پھر بھی نہ آ سکی۔ اسلئے اب اس کے سوائے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ اپنی علمی بے مائیگی کے باوجود حق تعالٰے کے فضل عام کے بھروسہ پر اس کام کو خود ہی سرانجام دینے کی کوشش کروں۔

میرے اس ارادہ کا جب محترمی مولوی ثناء اللہ خاں صاحب ناشر کتب لاہور کو علم ہوا تو انہوں نے مجھے اس میدان میں قدم رکھنے سے روکنے کے لئے یہ لال جھنڈی دکھائی کہ:-

"حضرت تھانویؒ اس بات کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔ کہ ان کی سیرت لکھی جائے۔"

اس سے بڑی پریشانی ہوئی۔ جسے رفع کرنے کے لئے حضرت تھانویؒ کے فیض یافتہ محترم حاجی عبدالسلام صاحب ہوشیارپوری نے لکھا کہ:-

"حضرت تھانویؒ کی سیرت اختصار کے ساتھ جدید ندوی طرز پر ضرور مرتب فرمائیے۔ اس کی بڑی ضرورت ہے۔ موجودہ سوانح طویل اور مشکل ہے جس کے عوام متحمل نہیں ہو سکتے۔ حضرت قدس سرہٗ نے جو منع فرمایا تھا وہ اس وجہ سے تھا کہ مؤلفین افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں اب جبکہ خود حضرت قدس سرہٗ کے زمانہ میں حضرت کے سامنے لکھی ہوئی اشرف السوانح موجود ہے۔ تو انہی واقعات کو دوسرے طرز پر مرتب کرنے میں کیا حرج ہے۔ صرف طرز نگارش دوسرا آسان ہوگا واقعات وہی ہوں گے۔ اگر کسی بات کا اضافہ بھی ہو۔ تو وہی جس کو حضرت اپنے ملفوظات میں بیان فرما چکے ہوں۔"

حاجی صاحب کے اس ارشاد کی تائید اشرف السوانح کے دیباچہ "کشف الحقیقت" سے

ی ہوگئی۔ جو حضرت تھانویؒ نے خود لکھا تھا۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ چونکہ:-

"اکثر خوش اعتقادوں سے غلو ہو جاتا ہے۔ اسلئے میں نے تباکید منع کیا ہے کہ میری سوانح عمری نہ لکھی جائے۔"

مگر اس کے ساتھ ہی "اشرف السوانح" لکھنے کی اجازت اسلئے دیدی کہ اپنے سامنے یہ کام کرانے سے:-

"روایات میں افراط و تفریط کا احتمال بہت کم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ صاحب واقعہ اس کی تنقید کر سکتا ہے۔ اور اس کی مصلحت کے اہم ہونے میں شبہ نہیں۔"

اپنی زندگی میں اور اپنی نگرانی میں اپنی سوانح حیات لکھوانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کے حالات زندگی پر روایات کا کہرنہ چھا سکا۔ اور آنے والے مؤرخ کے لئے جدید طرز پر ان کی سوانح حیات لکھنا آسان ہو گیا۔ کیونکہ ان کی سوانح حیاتؒ اور تالیفات و تصنیفات کے علاوہ ان کے روزمرہ کے معمولات سے لے کر ان کے مواعظ و ملفوظات تک سب کے سب ان کے اپنے تصحیح و تصدیق شدہ موجود ہیں۔ جن میں ان کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح عیاں نظر آتا ہے

یہ کام شروع کرنے کے لئے جب حضرت تھانوی کی علمی اور عملی کارناموں کا جائزہ لیا تو انہیں تو سو سے زائد کتب پر مشتمل پایا۔ علم و عرفان اور حقائق و معارف کے اس بحر ذخار کی غواصی سے طبیعت گھبرا سی گئی۔ محترم اسد ملتانی نے مجھے متذبذب دیکھ کر فرمایا کہ:-

"داستانِ عمل" لکھ لینے کے مقابلہ میں یہ کام اتنا مشکل نہیں جتنا سمجھ رہے ہو۔"

اس سے ہمت بڑھی۔ مگر کام شروع کرنے سے پہلے قطب دوراں۔ شیخ زماں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ العالی رئیس الخلفاء دربار اشرفیہ کی اجازت ضروری تھی۔ اور انہیں اس ارادہ سے مطلع کیا۔ تو انہوں نے اس دعا سے کہ:-

"جس بحر بے پایاں میں آپ نے قدم رکھا ہے۔ حق تعالےٰ آپ کی ہر قدم پر مدد فرمائے۔"

ہمت افزائی فرمائی۔ آپ کا دعا فرمانا تھا کہ بمصداق اجابت از در حق بہر استقبال مے آید

قلم حرکت میں آگیا۔ اور دیکھتے دیکھتے غیب سے ایسے سامانِ سہولت پیدا ہوگئے کہ خود صاحبِ دعا بھی حیران رہ گئے۔ یہ ہیں وہ حالات جن میں یہ سیرت لکھنے کی صورت پیدا ہوئی۔

سیرت ہذا لکھنے کے دوران میں عجیب و غریب انکشافات ہوئے۔ صاحب "اشرف السوانح" خسرو دربار اشرفیہ خواجہ عزیزالحسن صاحب مجذوبؒ حضرت تھانویؒ کے پاس مدتوں رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ؎

ہم جس پہ مر رہے ہیں۔ وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی۔ تم مگر کہاں ہو

اور انہیں اس پر اصرار تھا۔ بلکہ وہ اس کا تکرار بھی کرتے تھے کہ ؏

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

حضرت تھانویؒ کی انسانیت کی مصوری کرنے والے مشہور قلمکار اور فلسفی مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی ایک مختلف المشرب بزرگ کے مرید ہونے کے باوجود بعالمِ وجد یہ نعرہ لگاتے ہوئے کہ ؏

"اب نہ کہیں نگاہ ہے۔ اب نہ کوئی نگاہ میں"

اور بار بار یہ فرماتے ہوئے کہ ؏

"نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے۔ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے"

اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ میں نے ۔

"اپنے سلیے تجربہ اور سابقہ میں انہیں ایک بہترین انسان پایا"

مگر میں اس بحرِ ناپیدا کنار کی غواصی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نطق سراپا وحی تھا۔ اور ان کا خُلق قرآن کی عملی تفسیر۔ اسی طرح حضرت تھانویؒ کا ہر قول و فعل کتاب و سنت کی تنویر و تفسیر تھا۔ اور اس لحاظ سے حضرت تھانوی ایک "بہترین انسان" ہی نہیں۔ اس دور کے بے نظیر انسان بھی تھے۔ جن کی کتابِ زندگی کا ہر ورق درسِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے مقصود اور طریق دونوں واضح ہو جاتے ہیں جن کا کوئی قول و کردار ایسا نظر نہیں آتا۔ جس سے زندگی کے کسی نہ کسی گوشہ پر روشنی نہ پڑتی ہو۔ اور علم و عمل کی راہیں نہ کھلتی ہوں۔

دوسری عجیب بات یہ معلوم ہوئی کہ پاکستان کا تخیل سب سے پہلے حضرت تھانویؒ نے ہی پیش کیا تھا۔ اس کے حصول و بقاء کا پروگرام اور اس کے نظام کا خاکہ حضرت اُس وقت تجویز فرما چکے تھے۔ جبکہ پاکستان چاہنے والوں یعنی علامہ اقبالؒ وغیرہ کو ابھی اس کا خیال بھی نہ آیا تھا۔

تیسرا راز یہ کھلا کہ حضرت تھانویؒ نے ہی قائد اعظم کے پاس تبلیغی وفود و خطوط بھیج کر انہیں مسنون طریق پر پابند نماز بنایا۔ اور ان میں دینی ذوق پیدا کیا۔ یہ جو قائد اعظم پر آخر زمانہ میں اسلامی رنگ غالب نظر آتا تھا۔ یہ سب حضرت تھانوی کے فیضان کا نتیجہ تھا۔

چوتھا سراغ اس بات کا لگا کہ بڑے بڑے جلیل القدر گورنروں۔ نوابوں۔ رئیسوں۔ ججوں اور وکیلوں کا اصلاحی تعلق بھی در بار اشرفیہ سے رہا۔ جن کے حالات — نام ظاہر کئے بغیر "اشرف السوانح" میں مذکور ہیں۔ میں نے چاہا کہ ان کے حالات ان کے نام کے ساتھ لکھوں۔ مگر مجھے مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا۔ کہ جب حضرتؒ نے کسی مصلحت سے ان کے نام ظاہر نہیں فرمائے۔ تو آپ کیوں ظاہر کرتے ہیں ممکن ہے وہ حضرات خود اپنا نام شائع کرانا پسند نہ کریں۔ اسلئے میں نے بھی اتباعاً ان کے نام پردۂ راز میں رہنے دیئے۔

حضرت تھانویؒ کے باقیات الصالحات میں بڑے بڑے صاحب علم و قلم ہوئے ہیں جو علم و فضل میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اگر وہ اس کام کی طرف توجہ فرماتے۔ تو یقینی طور پر اسے بہتر اور احسن طریق سے سرانجام دیتے۔ اور اپنی ذاتی معلومات۔ مشاہدات اور واردات کا بھی اضافہ فرماتے۔ مگر میرے لئے یہ ممکن نہ تھا۔ کیونکہ میرے کان جب حضرت تھانوی کے نام نامی اور اسم گرامی سے آشنا ہوئے۔ اس کے ایک سال بعد ہی آپ رحلت فرما گئے اسلئے میں ان کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکا۔ میں نے ان کا جاہ و جلال اور حسن و جمال اسی سیرت کے آئینہ میں دیکھا۔ اور اتنی دلجمعی سے دیکھا کہ اب زیارت کی حسرت ہی باقی نہیں رہی۔ البتہ اس آئینہ میں اپنا دینی سراپا اور اس کا ایک ایک داغ اور دھبہ دیکھ کر بحر ندامت میں غرق ہو جاتا ہوں۔

میرے پاس حضرتؒ کے علمی سرمایہ کا اتنا ذخیرہ موجود تھا کہ اس کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی تھی۔ اسلئے میں نے ان علمی یادگاروں سے استفادہ نہیں اٹھایا۔ جو حضرت کے خدام کے پاس محفوظ ہیں مثلاً نذکورۃ الصدور انکشافات کی وضاحت

کے لئے جن کا ذکر تو حضرت کی مطبوعہ تحریرات میں موجود ہے۔ مگر ان کی تفصیل موجود نہیں حضرتؒ کے مخلصین و معتقدین مولانا شبیر علی صاحب تھانوی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی۔ نواب جمشید علی خاں صاحب اور نواب محمد اسماعیل خاں صاحب کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ جو ان سے واقف تھے۔

غلو و مبالغہ کے خوف سے میں نے پیش کردہ واقعات پر طویل نقد و تبصرہ ان کی بسیط تشریح و تفسیر سے حتی الوسع احتراز کیا ہے تاکہ کتاب کا حجم نہ بڑھ جائے۔ اور اسے حضرت تھانویؒ کی وکالت پر محمول نہ کیا جائے۔ واقعات و حالات کی ندرت و کثرت کے سبب اخذ و استنباط کے لئے عام سیرتوں کی طرح ان کا اعادہ و تکرار بھی نہیں کیا گیا۔ البتہ آپ کو مختلف ابواب میں ایک ہی نوع کے ضمنی عنوان ضرور ملیں گے مگر ان کے تحت آپ واقعات بالکل مختلف پائینگے جو ان کی زندگی کے قریباً تمام گوشوں اور پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے ہیں۔

"سیرت اشرف" کا بنیادی سرمایہ چونکہ "اشرف السوانح" ہے۔ اس لئے اس کے اقتباسات بلا حوالہ درج کئے گئے ہیں۔ اور اکثر مقامات پر الفاظ بھی اسی کے مستعار لئے گئے ہیں۔ البتہ حضرت کی یا ان کے مخلصین و مسترشدین کی مطبوعہ کتب سے جو اقتباس لئے گئے ہیں۔ انکے ساتھ حوالہ درج کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اضافے حضرتؒ کے قدامت پسند خدام پر گراں گذریں گے۔ لیکن اگر وہ ان کی افادیت پر غور فرمائیں گے۔ تو وہ لازماً اور انصافاً مجھے حق بجانب پائیں گے۔ میں نے حتی الوسع حضرتؒ کے قائم کردہ حصار احتیاط کے اندر رہتے ہوئے اس سیرت کو مرتب کیا ہے۔ اور مزید احتیاط صحت کے لئے حضرت تھانویؒ کے خلیفہ ارشد حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ اور فاضل دیوبند مولوی عبد الرشید صاحب نسیم سے اس کی مزید جانچ پڑتال بھی کرالی ہے۔ اور ان کے مشورہ کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی صاحب یہ خیال کریں کہ میں نے حضرت کی وصیت کا احترام نہیں کیا۔ یا ان کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کیا ہے۔ تو جس طرح حضرتؒ نے ان حضرات سے فرمایا تھا کہ "مجھ کو پہچانا نہیں گیا" اسی طرح میں بھی یہ عرض کروں گا کہ انہیں حضرت کے ارشادات کی روح کی معرفت حاصل نہیں ہوئی۔

مجھ ایسے نا اہل کو جن حالات نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے مجبور کیا ہے۔ وہ من و عن قارئین کرام کے پیش کر دیے گئے ہیں۔ اور جس کاہش و کاوش سے میں نے اسے

مرتب کیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اس کی ترتیب سے ہو جائیگا۔ اس کے بعد اگر آپ اس سیرت کو دلچسپ پائیں۔ تو اسے محض مولا کریم کا فضل سمجھیں۔ اگر اس سے مستفیض ہوں تو اسے حضرتؒ کا فیض جانیں۔ اور اگر اس میں آپ کو کوتاہیاں اور خامیاں نظر آئیں۔ تو ان کے لئے مجھے معاف فرما دیں۔ کیونکہ میں نہ مؤرخ ہوں۔ نہ ادیب۔ اور نہ فی الواقعہ تصنیف کا سلیقہ جانتا ہوں۔ اس لئے میری تحریر کے حسن و قبح پر نظر رکھنے کی بجائے صاحب سیرت کے ارشادات و حالات پر نظر رکھیں۔ جن کا تعارف مقصود ہے اور دعا فرما دیں کہ مولا کریم میری اس ناچیز سعی کو قبول و مقبول فرما دیں۔ اور اس کے پڑھنے والوں کو صاحب سیرت کی طرح انسانیت کے صحیح مقام پر پہنچا ئیں۔ آمین ثم آمین

اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ

احقر العباد
عبدالرحمٰن خان

چہلیک۔ ملتان شہر
۱۴؍ اگست ۵۵ء

نہ گنجد در بیاں وصفِ کمالش
کنم طبع آزمائی با خیالش

تعارف

صاحبِ سیرت کی کہانی ان کی اپنی زبانی

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھانہ بھون میں متعینہ ایک پولیس آفیسر نے بیعت کی درخواست کی تھی۔ جس کے جواب میں آپ نے انہیں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا:۔

"میں ایک خشک طالب علم ہوں۔ اس زمانہ میں جن چیزوں کو درویشی کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے جیسے محفل میلاد شریف۔ عرس گیارھویں۔ نیاز فاتحہ قوالی وغیرہ مثل ذالک۔ میں ان سب سے محروم ہوں اور اپنے دوستوں کو بھی اسی خشک طریقہ پر رکھنا پسند کرتا ہوں۔

میں نہ صاحب کشف ہوں نہ صاحب کرامت۔ نہ صاحب تصرف ہوں اور نہ عامل۔ صرف اللہ و رسول کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں۔

اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا۔ نہ اپنی حالت۔ نہ اپنی کوئی تعلیم۔ نہ امور دنیہ کے متعلق کوئی مشورہ چھپانا چاہتا ہوں۔

عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ البتہ عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہوتا ہوں۔

میں کسی سے نہ کوئی فرمائش کرتا ہوں۔ نہ کسی کی سفارش۔ اسی لئے بعض اہل الرائے مجھ کو خشک کہتے ہیں۔ میرا مذاق یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی رعایت سے کوئی اذیت نہ دوں۔ خواہ ترقی ہی اذیت ہو۔

سب سے زیادہ اہتمام مجھ کو اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے لئے اس امر کا ہے کہ کسی کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے۔ خواہ بدنی ہو۔ جیسے مار پیٹ۔ خواہ مالی ہو جیسے کسی کا حق مار لینا۔ یا ناحق کوئی چیز لے لینا۔ خواہ آبرو کے متعلق ہو۔ جیسے کسی کی تحقیر۔ کسی کی غیبت۔ خواہ نفسانی ہو۔ جیسے کسی کو کسی تشویش میں ڈالنا۔ یا کوئی ناگوار، رنجیدہ معاملہ کرنا۔ اور اگر غلطی سے کوئی بات ایسی ہو جاوے تو معافی چاہنے سے عار نہ کرنا۔

مجھے ان کا اس قدر اہتمام ہے کہ کسی کی وضع خلاف شرع دیکھ کر تو صرف شکایت ہوتی ہے مگر ان امور میں کوتاہی دیکھ کر سخت صدمہ ہوتا ہے۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس سے نجات دے بہتے میرا کیا چھپا ورنہ لوگوں نے تو سہ

نقش کردہ ام رستم پہلوان ؛ دگر نہ یلے بود در سیستان"

آغازِ زندگی

ذرّہ ذرّہ میں ہے پنہاں ایک دنیائے عمل،
خواب سمجھا ہے جسے تو ہے وہی تعبیرِ خواب

(راشد)

تھانہ بھون

وجہ تسمیہ آئین اکبری میں اس قصبہ کا نام تھانہ بھیم درج ہے۔ جو راجہ بھیم کے زمانہ میں اس کے نام کی نسبت سے رکھا گیا تھا۔ اگرچہ کاغذات شاہی میں اس کا دوسرا نام محمد پور بھی ملتا ہے۔ جو یہاں آباد ہونے والے مسلمانوں نے اپنے ایک فرزند فتح محمد کے نام پر رکھا تھا۔ مگر اسے کوئی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اور بدستور تھانہ بھون ہی مشہور رہا۔

امپیریل گزٹ جلد ۲۳ ۱۹۰۸ء میں اس کی وجہ تسمیہ دوسری درج ہے اس میں لکھا ہے کہ یہاں کسی زمانہ میں بھوانی مندر موجود تھا۔ جو بڑا مشہور تھا۔ اور اسی کی نسبت سے اس کا نام تھانہ بھون پڑ گیا۔ اور قرین قیاس بھی یہی ہے کہ بھوانی سے بھون ہوا ہے۔ بھیم سے بھون نہیں ہوا۔

محل وقوع یہ قصبہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے ضلع مظفر نگر کی تحصیل کیرانہ میں مظفر نگر سے ۱۸ میل شمال مغرب میں پختہ سڑک پر واقع ہے جس کے ارد گرد مشہور قصبات دیوبند۔ گنگوہ۔ کاندھلہ۔ کیرانہ۔ جھنجانہ اور پانی پت ایسے مردم خیز اور تاریخی مقامات موجود ہیں۔

تاریخی عظمت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہ قصبہ مجاہدین کا مرکز رہا۔ جبکہ وہاں کے باشندگان قاضی محبوب علی خاں اور ان کے بھتیجے قاضی عنایت علی خاں کی زیر قیادت جنگ آزادی میں کود پڑے۔ اور انہوں نے بڑی بہادری سے تحصیل اور پھر شاملی پر قبضہ کر لیا اور جو ۱۱۳ افراد اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ ان کو موت کی نیند سلا دیا۔ بعد ازاں سکھوں اور گورکھوں نے مسلسل رات گھنٹے جنگ کرنے کے بعد ایک مجسٹریٹ کی زیر سرکردگی اس پر قبضہ کر لیا اور اس کے در و دیوار پیوند زمین کر دیئے۔

تاریخ میں یہ تمام علاقہ مردم خیز درج ہے۔ اس قصبہ اور اس کے ملحقہ قصبات میں تعلیم دین کے بڑے بڑے ادارے واقع ہیں۔ جس کثرت سے اس علاقہ میں علماء و فضلا اور مشائخ گذرے ہیں۔ اس کی نظیر ہندو پاکستان کے کسی دوسرے خطہ میں نہیں مل سکتی۔ اس لئے ایک انگریز افسر بندوبست نے اپنی رپورٹ میں اس علاقہ کے باشندوں کی ذہنی قابلیت کو سراہتے ہوئے تھانہ بھون کے لوگوں کو "عاقلان تھانہ" کا لقب دیا۔ جس کی تائید قنوج کے دیندار بزرگ اور مردم شناس رئیس شیخ معشوق علی کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ جو انہوں نے ایک مرتبہ حضرت تھانوی سے فرمائے۔

"ان اطراف کے لوگ ہماری طرف کے لوگوں سے ہر بات میں بڑھے ہوئے ہیں چنانچہ
یہاں کا عالم وہاں کے عالم سے اچھا۔ یہاں کا جاہل وہاں کے جاہل سے اچھا۔ حتیٰ کہ
یہاں کا کافر وہاں کے کافر سے اچھا ہے۔"

ریلوے لائن شروع شروع میں اس قصبہ کے پاس سے ریلوے لائن نہیں گذرتی تھی حضرت تھانوی کی بڑی خواہش تھی۔ کہ ریل ان کے قصبہ کے پاس سے گذرے۔ تاکہ یہاں آنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ حق تعالیٰ کو چونکہ اپنے اطاعت شعار بندوں کی دلجوئی مطلوب ہوتی ہے اسلئے دعا قبول ہوئی۔ اور سہارنپور سے ایک چھوٹی لائن اس طرف سے گذاری گئی۔ مگر اسٹیشن جو بنا وہ اصل قصبہ جہاں سے شروع ہوتا ہے اس سے کوئی دو میل اُدھر۔ یعنی خواہ آدمی دہلی کی طرف سے آئے۔ خواہ سہارنپور سے۔ اسے قصبہ تک پہنچنے کے لئے دو تین میل کا سنسان غیر آباد جنگل کا راستہ سواری سے طے کرنا پڑتا۔ اس سے بھی لوگوں کو تکلیف ہوتی۔ جو حق تعالیٰ کو منظور نہ تھی۔ اس لئے اس نے حضرت کے دل میں یہ دوسرا خیال ڈال دیا کہ اسٹیشن ہی قصبہ کے پاس بنے تاکہ آنے جانے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ کیونکہ انسان کچھ نہیں چاہ سکتا جب تک اس کا مالک و مولا نہ چاہے۔ لطف یہ ہے کہ ہوتا وہی ہے جو وہ خود چاہتا ہے۔ مگر اس کی خواہش انسان کے دل میں پیدا کر کے اور پھر اسے قبولیت کا درجہ بخش کر اس کی تسلی کا سامان کر دیتا ہے۔

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں، می دھد یزداں مرادِ متقین

جدید اسٹیشن بس اس خیال کا دل میں آنا تھا کہ آپ نے جدید اسٹیشن بنوانے کے لئے سب سے پہلے در مولا پر خود دعا سے دستک دی۔ پھر خانقاہ کے ذاکرین و شاغلین سے باضابطہ دعاؤں کی سفارش کرائی۔ مسبب الاسباب تک عرض معروض پہنچانے کے بعد اربابِ اسباب کی توجہ کے لئے ٹریفک منیجر کے نام خطوط بھجوائے۔ ان پر خود تصدیقی دستخط فرمائے۔ اور اس طرح آستانِ اشرفی تک پہنچنے والوں کی راحت رسانی کے لئے مطابق سنت "دعا اور دوا" دونوں سے کام لیا جس کا ثمرہ یہ نکلا کہ ۱۸ر نومبر ۱۹۲۸ء کو خانقاہ کے محاذ میں جدید اسٹیشن کھلا۔ حضرت کے ایک مرید نے اس کا نام "تھانہ بھون شریف" تجویز کیا۔ لیکن حضرت نے تبسم کے ساتھ اس سے اختلاف کیا۔ اور "تھانہ بھون" نام پر اتفاق فرمایا۔ جواب اسی نام سے موسوم ہے۔

آبادی ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں یہاں کی آبادی اڑتالیس ہزار کے قریب تھی۔ اس کے بعد قریب چھبیس ہزار رہ گئی۔ اور بعدہٗ گھٹتے گھٹتے چھ سات ہزار تک جا پہنچی۔ مگر اب اس میں پھر

اضافہ ہوگیا ہے۔

تازہ اہمیت شروع شروع میں اگرچہ یہ ارباب کمال کے ساتھ ساتھ ارباب ثروت و اقتدار کا مرکز رہا، مگر انقلاباتِ زمانہ نے اس کی وہ شان و شوکت باقی نہ رہنے دی۔ حضرت تھانوی کے مولد و وطن ہونے کی وجہ سے اس کی عظمتِ رفتہ پھر بحال ہوگئی۔ اور خانقاہ امدادیہ نے اسے تاریخ میں پھر ایک خصوصی مقام دلوادیا۔

نام و نسب

نامِ نامی حضرت تھانویؒ کا دادھیالی نام عبدالغنی تھا۔ مگر اس زمانہ کے مقبول و مشہور مجذوب حضرت حافظ غلام مرتضیٰ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے جن کی ان کے ننھیال پر خاص نظرِ التفات تھی۔ ان کا نام اشرف علی تجویز کیا۔ جس کی تفصیل آپ کو حضرت کے ذکرِ ولادت میں ملے گی۔ یہ ان کی ہی توجہ و اثر کا نتیجہ تھا کہ آپ کا دادھیالی نام قبولِ عام حاصل نہ کرسکا۔ اور اس مجذوب کا تجویز کردہ نام زباں زدِ خواص و عام ہوگیا۔ چونکہ کوئی فعل بدون مصلحت نہیں ہوتا۔ اسلئے دادھیالی نام کی تجویز بھی بلا ضرورت نہ تھی۔ اس تجویز کی مصلحت و حکمت کا راز اس وقت کھلا جبکہ حضرت تھانویؒ نے اس نام کو خود اپنے رسالہ المخطوب المذابیہ میں ایک ایسے موقع پر استعمال کیا۔ جہاں عرفی نام سے کام لینا خلافِ مصلحت تھا۔ اگر آپ کا اسم ثانی موجود نہ ہوتا۔ تو آپ کو یقیناً کوئی دوسرا فرضی نام استعمال کرنا پڑتا اور یہ مسندِ نبوت کے ایک جانشین کی شان کے خلاف تھا۔ اسلئے قدرت کے حسنِ انتظام کے تحت شروع سے ان کا دوسرا نام تجویز ہوچکا تھا۔

لقبِ گرامی آپ کا لقب حکیم الامت ہے جو سب سے پہلے مولوی مرزا محمد بیگ مالک مطبع محبوب المطابع دہلی کا انشا ہوا۔ جنہوں نے اسے بعینہٖ اسی طرح حضرت کے پتہ میں تحریر کیا۔ جس طرح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کے ساتھ مجدد الف ثانی لکھ دیا تھا۔ جو خود بخود زبانِ خلق پر نقارۂ خدا ہو کر رواج پاگیا اور جسے حضرت کے اصلاحی کارناموں نے اسم بامسمّیٰ کردیا۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ جب کسی تحریر میں حضرت کے نام کے ساتھ حکیم الامت لکھا ہوا نہ پاتے تو بہت ناراض ہوتے اور فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے جیسا قلوب

رجال میں ان کے لئے ایک لقب ڈال دیا ہے۔ تو اس کو چھوڑنا نہ چاہیئے کہ اس میں حضرت حق کے ساتھ سوءادب ہے۔

نسب عالی حضرت کا سلسلہ نسب ان کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

"اشرف بن منشی عبدالحق بن حافظ فیض علی بن غلام فرید شہید بن محمد جلال بن رحمت اللہ بن امان اللہ (جو سنہ ۱۱۰۵ھ میں موجود تھے) ابن عتیق اللہ خطیب (صاحب فرمان مسندہ ۸ جمادی الاول سنہ ۱ جلوس عالمگیری) ابن حافظ حبیب اللہ (صاحب فرمان عہد جہانگیری) ابن شیخ آدم (صاحب فرمان عہد اکبر اول بشراکت برادر خود فرید) ابن مولانا صدر جہاں جد اعلیٰ خطیبان موجود در سنہ ۹۶۳ھ بعہد اکبر اول (مطابق ایک فرمان کے جس میں ان کو بہ لفظ تقوی شعار لکھا ہے"۔ (مواعظ لعوائد)

خصوصیات خاندانی تھانہ بھون میں فاروقیوں کے چار مشہور خاندان تھے۔ جو خطیب، قاضی، نائب رنائب قاضی، اور محتسب کہلاتے تھے۔ حضرت تھانوی اسی خطیب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا آپ وراثتاً خطیب تھے۔ خطیبوں کے جد اعلیٰ مولانا صدر جہاں تھے۔ جو اپنے فرمانروا کے الفاظ میں "تقوی شعار" تھے۔ اسلئے تقوی آپ کی خاندانی خصوصیت تھی مولانا صدر جہاں کا شجرہ نسب سلطان شہاب الدینؒ سے ملتا ہے۔ جو اولیا رکاملین میں سے تھے فرخ شاہ لقب رکھتے تھے۔ اور والی کابل رہ چکے تھے۔ شیوخ تھانہ بھون حضرت شیخ محی والدہ نیز حضرت شیخ جلال الدین تھانیسریؒ۔ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ بہ سب سلطان شہاب الدین الملقب بہ فرخ شاہ کابلی کی اولاد سے ہیں۔ جن کا تذکرہ "زبدۃ المقامات" میں ان الفاظ میں موجود ہے:۔

مرد ے از اجلہ امراء اعاظم وزرار سلاطین کابل بودہ نخستیں نزیل ہندوستان اوست کہ از غزنین وکابل بدیار ہند آمد گویند وے باوصاف خجستہ موصوف بود تبریج اسلام وتوہین عبدۂ اصنام معروف (منقول از تتمہ سابعہ تنبیہات وصیت)

اس طرح ولایت بھی آپ کا خاندانی ورثہ تھی۔ جس سے مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ سابق مفتی دارالعلوم دارالعلوم دیوبند کے اس سجع

"از گروہ اولیا اشرف علی"

کی تائید ہوتی ہے اور آگے چل کر یہ سلسلہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے۔ جن کی عقل وفراست مسلمات عالم میں سے ہے۔ اسلئے آپ کی فہم وفراست بھی خاندانی تھی۔

آپ کے نانا پیرجی نجابت علیؒ اعلیٰ فارسی دانی۔ انشاپردازی۔ لطیفہ گوئی۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بہت مشہور تھے اور ریاست کپورتھلہ میں بعہدہ وکیل ریاست ممتاز تھے۔ اگرچہ وہ مولانا شاہ نیاز احمد بریلویؒ کے خلیفہ خاص سے بیعت تھے۔ مگر ان پر نظرِ تربیت حضرت حافظ صاحب مجذوب کی تھی۔ جس کی وجہ سے اُن پر آثار ذکر و شغل کا اس قدر غلبہ ہوا کہ انہوں نے خود کو فکرِ معاش وادائے حقوق سے بے نیاز کر لیا۔ اس پر حافظ صاحب کو ان کی یہ کیفیت اپنی توجہ سے سلب کرنی پڑی اگرچہ ان کی وفات کے قریب حضرت حافظ صاحبؒ نے ان پر پھر ایک ایسی نظر ڈالی کہ وہ کیفیت عود کر آئی۔ اسی طرح آپ کے حقیقی ماموں پیرجی امداد علیؒ حافظ صاحب کی نظرِ توجہ سے بڑے صاحبِ حال و قال بزرگ بن گئے۔ جن کا سوز و گداز اور عشقِ حقیقی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اور خود حضرت تھانویؒ کے قول کے مطابق :-

"اُن کے کلمات سے ایک آگ سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور حضرت حافظ شیرازیؒ کا یہ شعر ان پر صادق آتا تھا۔

غلام آں کلماتم کہ آتش افروزد — نہ آب سرد زند در سخن بر آتش تیز"

اسی طرح آپ کے ننھال کے جدِ اعلیٰ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ جن پر اکثر سلاسلِ طریقت منتہی ہوتے ہیں۔ اسلئے عشق کی دولت آپ کو ننھال سے اور طریقت کی فضیلت ان کے جدِ اعلیٰ سے آپ کو ملی ہوئی تھی۔

آپ کے والد ماجد منشی عبدالحق تھانہ بھون کے ایک مقتدر رئیس اور صاحبِ نقد جائداد تھے وہ بقول صاحبؒ "اشرف السوانح" :-

"فارسی میں بہت اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ اور بہت اچھے انشاپرداز تھے۔ گو باقاعدہ قاری نہ تھے۔ لیکن مخارج بہت صحیح تھے۔ گو حافظ نہ تھے۔ لیکن ناظرہ ایسا رواں تھا کہ بعض اوقات حافظوں کو بھی لقمہ دیا کرتے تھے۔ میرٹھ کی ایک بڑی ریاست کے مختارِ عام تھے اور باجازت رئیس کمسریٹ کے ٹھیکے بھی لے لیا کرتے تھے۔ جن میں خدا تعالیٰ نے اتنی برکت عطا فرمائی کہ ہزاروں روپے کی آمدنی ہوتی جس سے بہت سی نئی جائیداد بھی خرید لی۔ اور خرچ کے مواقع پر بہت فراخ حوصلگی کے ساتھ روپیہ صرف فرماتے تھے۔"

اس طرح آپ نے دولت۔ ریاست۔ وجاہت اپنے والد سے پائی تھی جس نے آپ میں استغناء

پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے کوئی آپ کو زیر اثر نہ لا سکا۔ چنانچہ آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ:۔
"بفضلہٖ تعالیٰ میرے اوپر کسی بڑے سے بڑے رئیس کا بھی محض اس کی ریاست اور وجاہت ظاہری کی بنا پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہی کیا رئیس ہیں؟ ہم بھی خدا کے فضل سے گھر کے کھاتے پیتے ہیں۔ ہم کوئی مفلس زادے نہیں۔ الحمدللہ میں نے ہمیشہ نہایت فراغت کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ اور ہزاروں روپے اپنے ہاتھوں خرچ کئے ہیں۔ اسلئے اب کوئی حسرت مال و متاع کے متعلق ایسی باقی نہیں رہی۔ جس کی وجہ سے کسی مالدار کی طرف نظر احتیاج ہو۔ کیونکہ جب چیزوں سے جی بھر جاتا ہے تو اس کا طبعی خاصہ ہے کہ حرص و طمع باقی نہیں رہتی۔"
غرضیکہ آپ کو فراست و حکمت، ولایت و طریقت، خطابت و وجاہت۔ دولت، ریاست اور عشق و تقویٰ ایسے انعاماتِ الٰہی ورثہ میں ملے تھے۔ جن کی وجہ سے آپ شانِ فاروقی اور شانِ علوی دونوں کے مظہر تھے۔ اور ایسا ہونا سنت اللہ کے عین مطابق تھا۔ کیونکہ حق تعالےٰ جسے منصب ارشاد پر بٹھاتے ہیں۔ تو اسے شرافتِ نسبی اور اعزاز خاندانی بخشتے ہیں۔ تاکہ وہ مرجع خلائق بنے اور بڑے سے بڑے آدمی بھی اس کے اتباع سے عار نہ کریں۔

کرامتِ ولادت

مشیتِ الٰہی میں خواہشاتِ انسانی کو کوئی عمل دخل حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ طب اور سائنس کی انتہائی ترقی کے اس دور میں برتھ کنٹرول کے ماہرین دنیا کی روز افزوں آبادی کو قاطع النسل ادویات کے ذریعہ روکنے میں ناکام رہے ہیں۔ کیونکہ جس نے دنیا کی ہوا کھانی ہوتی ہے۔ اسے قاطع النسل ادویات اور مانع حمل آلات کے استعمال کے باوجود بھی وہ منصۂ شہود پر آنے سے نہیں روک سکتے۔ حکمتِ خداوندی کا یہی وہ نقطۂ ماسکہ ہے جس پر پہنچ کر بڑے بڑے ملحدین و منکرین کو بھی عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمْ کہنا پڑا۔

قطع نسل کی سعی آپ کا واقعہ ولادت بھی اسی مادی دنیا کے لئے درسِ عبرت ہے۔ جو نظام قدرت میں اپنی عقل و سائنس کے ذریعہ دخیل ہو کر اسے بدلنا چاہتی ہے۔ آپ کے والد ماجد کو خارش کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ کسی دوائی سے افاقہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ ع مرض بڑھتا گیا

جوں جوں دوائی جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان تھے۔ بلکہ تنگ آچکے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک ڈاکٹر نے ان کے لئے ایک ایسی اکسیر دوائی تجویز کی۔ جو قاطع النسل تھی انہوں نے بقاء نوعی پر بقاء شخصی کو ترجیح دیتے ہوئے وہ دوائی کھالی کہ "بلا سے اولاد نہ ہو۔ شفا تو ہو"۔ اس واقعہ کا ذکر حضرت تھانوی نے خود مقدمہ "حسام عبرت" میں کیا ہے۔

اس واقعہ کا جب آپ کی والدہ ماجدہ کو علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئیں۔ کیونکہ پہلے بھی ان کی اولاد ترینہ زندہ نہ رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ بات آپ کی نانی صاحبہ کے کان تک پہنچ گئی۔ اتفاق سے ان دنوں افضل المجاذیب حافظ غلام مرتضیٰ پانی پتیؒ بھی آپ کے ننھیال سابقہ تعلقات کی بنا پر آئے ہوئے تھے۔ آپ کی نانی صاحبہ نے اس سلسلہ میں ان سے شکایت کردی۔

ولادت کی بشارت عادت اللہ یوں جاری ہے کہ وہ جب کسی کو رشد و ہدایت کے لئے منتخب فرماتا ہے۔ تو اس کو بھیجنے سے قبل اپنے مقبول بندوں کی معرفت اس کی بشارت دیتا ہے۔ حافظ صاحب نے یہ شکایت سنی تو دعا کی اور فرمایا:۔

"یہ عمر و علی کی کشاکش میں مرجاتے ہیں۔ اب کی بار علی کے سپرد کردینا۔ زندہ رہے گا"۔

یہ مجذوبانہ معمہ کوئی نہ سمجھ سکا۔ مگر آپ کی والدہ صاحبہ جو غیر معمولی فہم و فراست رکھتی تھیں۔ فوراً سمجھ گئیں۔ اور فرمایا:۔

"حافظ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ لڑکوں کے باپ فاروقی ہیں اور ماں علوی۔ اور اب تک جو نام رکھے گئے وہ باپ کے نام پر رکھے گئے۔ یعنی فضل حق وغیرہ۔ اب کی بار جو لڑکا ہو اس کا نام ننھیال کے ناموں کے مطابق رکھا جائے۔ جس کے آخر میں علی ہو"۔

نام و کام کا تعین حافظ صاحب نے ہنس کر ان کی اس معمہ فہمی کی داد دیتے ہوئے فرمایا:۔ "واقعی میرا مطلب یہی ہے۔ یہ لڑکی بڑی عقلمند معلوم ہوتی ہے انشاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی خاں رکھنا۔ دوسرے کا نام اکبر علی خاں۔ دونوں صاحب نصیب ہوں گے۔ ایک لڑکا میرا ہوگا۔ وہ مولوی ہوگا۔ اور حافظ ہوگا۔ دوسرا دنیادار ہوگا"۔

اس طرح آپ کے نام اور کام کا تعین بھی حق تعالیٰ نے اپنے ایک برگزیدہ بندہ کی زبانی استقرار حمل سے قبل کرادیا۔ جبکہ آپ ابھی عالم ارواح ہی میں تھے۔ جس وقت اس بزرگ نے آپ کا نام تجویز کیا اسی وقت ایک اور عورت نے بھی حافظ صاحب سے اپنے پوتے کا نام تجویز کرنے کی درخواست کی تو

انہوں نے نہایت ترشروئی سے بدیں الفاظ انکار فرمایا کہ:۔

"کیا میں بھاٹ ہوں۔ جو نام رکھتا پھروں"۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بزرگ کا آپ کے متعلق قبل از ولادت پیشگوئی فرمانا اور نام تجویز کرنا بالہام غیبی اور بربنارِ اختصاص تھا۔

تدبیر و تقدیر کا تصادم آپ کے والد ماجد تو قاطع النسل دوائی کھا کر مطمئن تھے کہ اب اولاد کی بجائے تسفا ہی ملے گی۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس لئے اس نے اس دوائی کے استعمال کے فوراً بعد آپ کی ولادت کی بشارت دلائی تھی۔ چنانچہ اس مسبب الاسباب نے اپنے فضل خاص سے قاطع النسل دوائی کو افزائش نسل کا سبب بنا دیا۔ اِدہر آپ عالمِ وجود میں آئے اُدھر آپ کے والد ماجد کو بھی آرام آگیا۔ گویا آپ شکم مادر سے ہی مادی دنیا کے لئے چیلنج بن کر نکلے۔

تاریخ و مقام پیدائش آپ کی پیدائش ۵ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ کو بروز چہارشنبہ بوقت صبح صادق اپنے ننہال کے مکان واقعہ محلہ خیل قصبہ تھانہ بھون میں ہوئی اور اس مجذوب کی ہدایت کے مطابق آپ کا نام اشرف علی رکھا گیا۔ بعدہٗ آپ ان کی بشارت کے مطابق حافظ۔ قاری۔ مولوی۔ معلم۔ متکلم۔ فقیہ۔ مفسر۔ محدث اور مصلح ہوتے۔ اور آپ کے برادر خورد منشی اکبر علی مرحوم بریلی میونسپلٹی کے سیکرٹری بنے۔ اسی لئے حضرت تھانوی رح فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"یہ جو میں کبھی کبھی اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں۔ اُن ہی مجذوب صاحب کی روحانی توجہ کا اثر ہے۔ جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں۔ کیونکہ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے۔ الجھی ہوئی باتوں کی متحمل نہیں"۔

کرمِ عظیم جس طرح دعائے خلیل اللہ "رحمتہ للعالمین" کو لانے کا باعث ہوئی۔ اسی طرح اس مجذوب اللہ کی دعا بھی "کرمِ عظیم" لائی۔ کیونکہ جس سال آپ کی ولادت ہوئی۔ اس سال کا تاریخی مادہ کرمِ عظیم نکلا۔ جو ہر لحاظ سے کرمِ عظیم ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا آپ پر کرم عظیم یہ ہے کہ انہوں نے آپ کو اصلاح وارشاد کے لئے منتخب فرمایا۔ اور آپ کا امت مسلمہ پر کرم عظیم یہ ہے کہ آپ اصلاح امت کے لئے ایک ایسا نادر اور عظیم علمی و عملی خزانہ چھوڑ گئے۔ جو صدیاں تک نشانِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

عہدِ طفولیّت

حدّت کی علّت بچوں کی نشوونما میں والدہ کے دودھ کا غیر معمولی اثر ہوتا ہے جو عہد سے لحد تک رہتا ہے۔ آپ کی پیدائش کو ابھی چودہ مہینے ہی گذرے تھے۔ کہ آپ کے چھوٹے بھائی اکبر علی پیدا ہو گئے۔ چونکہ آپ کی والدہ ماجدہ کا دودھ دو بچوں کے لئے کافی نہ تھا۔ اس لئے آپ کے لئے دودھ پلانے والی انّا رکھی گئی۔ جو ضلع میرٹھ کے ایک دیہات کی قصائن تھی۔ بعد ازاں اسی کے دودھ پر آپ نے پرورش پائی۔

قدرت کا کوئی کام بدوں مصلحت نہیں ہوتا۔ چودہ ماہ کے بعد ماں کے شفقت بھرے دودھ کا سلسلہ منقطع ہو جانا اور اس کے بعد دودھ کے لئے ایک قصائن کا مہیا ہونا بھی بلا وجہ نہ تھا۔ چونکہ قدرت نے آپ سے اصلاحِ امت کا کام لینا تھا۔ جس کے لئے نرمی کے ساتھ ساتھ بسا اوقات گرمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلئے آپ کو بچپن میں قصائن کا دودھ پینا پڑا۔ اس سے مزاج میں حدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ آپ خود ہی اکثر از راہِ مزاح فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"میں نے قصائن کا دودھ پیا ہے۔ اسی لئے کبھی میرے مزاج میں حدت ہے مگر الحمدللہ شدت نہیں۔ میرا دل اس قدر نرم ہے کہ مجھ سے کسی کی ذرا سی بھی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ اگر کسی کو ادنیٰ تکلیف میں بھی دیکھ لیتا ہوں۔ تو دل پگھل جاتا ہے اور پانی ہو جاتا ہے"۔

آپ نے اپنے طبعی تعلق اور اتباعِ سنت کی وجہ سے اس انّا کی اولاد کا پتہ لگانے کی بعدازاں بڑی کوشش کی۔ کہ اس کے ساتھ سلوک کیا جائے۔ مگر اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

بھائی پر فضیلت آپ ابھی پانچ سال کے تھے کہ والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور ماں کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ والدہ کے انتقال کے بعد آپ اپنی تائی صاحبہ کے پاس رہنے لگے۔ آپ کے والد کو والدہ سے بھی زیادہ آپ سے محبت تھی۔ غایت محبت کی وجہ سے انہوں نے آپ کو بڑے ناز و نعم میں رکھا۔ تیز طبع ہونے کے باوجود وہ آپ سے بڑی نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر یہ شوخی بھی کرتے۔ تو انہیں بہت کم مارتے۔ ایک مرتبہ اس ترجیحی سلوک کی آپ کی تائی صاحبہ نے آپ کے والد سے شکایت کی۔ تو انہوں نے فرمایا،

"بھابھی صاحبہ! اول تو یہ چھوٹا ہی بڑے کو شرارت سکھاتا ہے۔ دوسرے بڑا اپنا سبق یاد کرلیتا ہے۔ اسلئے مجھے اس سے زیادہ محبت ہے اور چھوٹا یاد نہیں کرتا۔"

چنانچہ آپ خود بھی فرماتے تھے کہ:-

"میں بہت کم پٹتا تھا اور استادوں کے ہاتھ سے بہت کم پٹا ہوں۔ قریب بالکل ہی نہ پٹنے کے۔ کیونکہ سبق یاد کرلیتا تھا۔ اور ادب کے ساتھ رہتا تھا۔"

غیرت کی تربیت

ماہ رمضان میں ختم قرآن کے موقع پر عام طور پر مساجد میں شیرینی وغیرہ تقسیم کی جاتی ہے۔ محلہ کے لڑکے ایسے موقعہ پر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر آپ کے والد کو آپ کا سائل ہونا گوارا نہ تھا۔ اس لئے وہ آپ کو مستغنی المزاج بنانے کے لئے ایسے موقع پر مسجدوں میں نہ جانے دیتے تھے۔ ایسی قدغن سے بچے پر ناگوار اثر پڑنا لازمی تھا۔ اس کے ازالہ کے لئے انہوں نے ایک عجیب ترکیب نکالی جس کی تفصیل حضرت کے اپنے الفاظ میں یوں ہے:-

"تراویح میں ختم قرآن کی جو مٹھائی مسجدوں میں تقسیم ہوتی۔ اس میں کبھی شریک نہ ہونے دیتے بلکہ اس روز خود بازار سے مٹھائی منگوا کر اُس سے زیادہ کھلا دیتے اور کہتے کہ مسجدوں میں مٹھائی لینے کے لئے جانا بے غیرتی کی بات ہے۔ اس خوبی کے ساتھ ہم لوگوں کو حرص سے بچاتے اور غیرت سکھاتے۔"

آوارگی سے نفرت

آوارگی کا سنگ بنیاد زیادہ تر بچپن میں ہی پڑتا ہے۔ جبکہ بچوں کو عام میل ملاپ اور کھیل کھیلنے کے پورے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ آپ کو طبعًا اس چیز سے نفرت تھی۔ اسی لئے آپ محلہ کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی بجائے اپنی ہمشیرہ کے ساتھ گھر کے اندر ہی کھیلا کرتے تھے۔ اس بات کو محلہ کے لڑکے اپنی توہین پر محمول کرتے تھے اور چاقو لے کر پیچھے پھرتے رہتے تھے۔ کہ آپ کو رعب اور تشدد کے ذریعہ اپنے ساتھ کھیلنے پر مجبور کیا جائے اسلئے آپ کی حفاظت کے لئے مدرسہ جاتے وقت ملازم کو ساتھ بھیجا جاتا تھا۔ جب اس کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہُوا اور وہ اپنے ارادہ سے باز نہ آئے۔ تو مجبورًا تھانہ پر رپورٹ کی گئی۔ تھانیدار نے سب لڑکوں کو بلا کر آپ کے بید سے جو اتفاق سے اُس وقت آپ کے ہاتھ میں تھا۔ خوب پیٹا اور کہا۔ کہ اگر آئندہ کسی نے ان کو اپنے ساتھ کھیلنے پر مجبور کیا۔ تو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔ اس کے بعد پھر کسی نے آپ کو اپنے ہمراہ کھیلنے کی دعوت نہ دی۔

نماز سے محبت اپنی ہمشیرہ کے ساتھ گھر میں بھی آپ کوئی فضول کھیل نہ کھیلا کرتے تھے۔ بلکہ اپنے ساتھیوں کے جوتے اکٹھے کر کے ایک جوتہ آگے رکھ دیتے۔ اور باقی جوتوں کے پیچھے صفیں بنا دیتے اور خوش ہو کر ساتھیوں کو تبلیغاً کہتے کہ دیکھو۔ جوتے بھی نماز پڑھ رہے ہیں۔ یہ نماز کے شوق اور محبت کا اثر تھا۔ کہ

تہجد کی عادت آپ کو تہجد کی عادت لڑکپن میں ہی پڑ گئی تھی۔ ابھی آپ بارہ برس کے تھے کہ تہجد پڑھنی شروع کر دی۔ آپ کی بڑی نانی صاحبہ جن کو آپ سے بہت محبت تھی نصف شب کو نوافل و وظائف میں آپ کو مشغول دیکھ کر بہت کڑھتیں اور اس خیال سے کہ بچہ ہے کہیں ڈر نہ جائے ان کے تہجد کے وقت اُٹھ بیٹھتیں۔ آپ کو پیار محبت سے سمجھاتیں کہ بیٹا تم ابھی تہجد پڑھنے کے مکلف نہیں۔ مگر آپ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ آپ سنی اَن سنی کر کے تہجد و وظیفہ میں مشغول ہو جاتے اور جب تک آپ اس سے فارغ نہ ہو جاتے۔ وہ پہرہ دیتی رہتیں۔ دین کی اس محبت کا اثر یہ ہوا۔ کہ حق تعالےٰ

مقبولیت و محبوبیت نے بچپن میں ہی لوگوں کے دلوں میں آپ کے لئے محبت پیدا کر دی آپ نہ صرف بزرگوں یا اپنوں کی نظر میں محبوب بنا دیئے گئے بلکہ غیر بھی آپ کی ایسی حرکتوں پر سکوت اختیار کرنے لگے۔ جن سے ان کے رسم و رواج کی تنقیص کا پہلو نکلتا تھا۔ چنانچہ آپ خود فرماتے تھے کہ۔

"اللہ تعالےٰ کے فضل سے بچپن ہی سے میں جہاں کہیں رہا۔ اعزہ واقربا اپنے اور بیگانے سب کا ہی محبوب رہا۔ حالانکہ میں بچپن میں بہت شوخیاں کرتا تھا۔ مگر آج کل کے لڑکوں کی سی گندی شرارتیں نہ ہوتی تھیں۔ اسلیئے سب کو بجائے ناگوار ہونے کے بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ دیوالی کے زمانہ میں میرٹھ چھاؤنی کے بازار میں سڑک پر دو رویہ چراغ جلائے جاتے تھے۔ دو طرف ہم دو تو بھائی چلنا شروع کرتے اور دو ہاں ٹھوکر دے کر سب کو ایک طرف سے بجھاتے چلے جاتے۔ مگر کوئی بُرا نہ مانتا۔ ہندوؤں کو بھی ناگوار نہ ہوتا"

گویا آپ بچپن میں ہی سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کا مظہر تھے۔

مزاج کی لطافت حق تعالےٰ نے آپ کو ایسا لطیف مزاج عطا کیا تھا۔ کہ بچپن میں ہی کسی کا ننگا پیٹ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کیونکہ ننگا پیٹ دیکھتے ہی آپ کو فوراً قے آجاتی تھی۔ محلہ کے لڑکوں کو اس بات کا علم ہو گیا اور وہ آپ کو ستانے کے لئے پیٹ کھول کھول کر

دکھاتے اور آپ قے کرتے کرتے پریشان ہو جاتے۔ قدرت کے انتظامات بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں کہ اس نے اس لطیف المزاجی کو عام لڑکوں سے میل ملاپ نہ رکھنے کا ذریعہ بنا دیا۔ اور اس طرح آپ کو خانہ نشین بنا کر بری صحبتوں سے بچا لیا۔ اور طبیعت میں نظم و ضبط پیدا کر دیا۔ چنانچہ آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ:-

"بچپن ہی سے میرا دماغ اس کا عادی ہے کہ اگر کوئی معمولی سے معمولی بات بھی ہو۔ مگر ترکیب کے ساتھ نہ بیان کی جائے۔ نہ میری سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ نہ خود الجھی ہوئی تقریر کروں نہ دوسرے کی الجھی ہوئی تقریر سمجھوں۔ کیونکہ بچپن ہی سے میرا دماغ ایک خاص ترتیب کا عادی ہو رہا ہے۔"

یہ اسی لطیف المزاجی کا اثر تھا کہ اگر کوئی شخص الجھا ہوا کلام یا بے اصول کام کرتا جس کا آپ سے تعلق ہوتا تو آپ کو اسی وقت تنبخر ہو کر درد سر ہونے لگتا۔ حالانکہ دماغ اتنا قوی تھا کہ بلا تکان سارا دن اور سونے وقت تک کام کرتے رہتے تھے اور بالکل نہ تھکتے تھے۔

سایۂ ابر رحمت: یہ عام طور پر مشہور ہے کہ ع

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری

گر جس کے فضل خاص سے آپ نے بچپن اور لڑکپن اخلاق و تقویٰ سے گزارا۔ اس کے لئے بوعدۂ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ راحت رسانی کے غیر معمولی سامان پیدا کر دینا بھی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ جس کی وجہ سے لگ ہے گا ہے اس کی رحمتِ خاص ابر کے سایہ کی شکل میں بھی نمودار ہونے لگتی تھی۔ جس کی تفصیل صاحب "اشرف السوانح" نے ان الفاظ میں پیش کی ہے:-

"آثارِ نیک میں سے ایک یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت والا کی تائی صاحبہ نے جن کے پاس بچپن میں رہے ہیں۔ خود حضرت والا سے بیان کیا کہ لڑکپن میں اکثر دیکھا گیا۔ کہ جب حضرت والا کو کہیں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ تو اس روز ابر ضرور ہو گیا۔ اور بہت راحت کے ساتھ سفر طے ہوا۔ حضرت فرماتے تھے کہ مجھے خود بھی گا ہے گا ہے ایسا ہونا یاد ہے۔"

حصولِ علم

حسنِ انتخاب جس طرح انبیاء علیہم السلام کی ہدایات وحی الٰہی پر مبنی ہوتی ہیں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی بشارات کبھی تائیدِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ اور ان کے پورا ہونے کے غیب سے سامان ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت تھانوی کے متعلق حضرت حافظ غلام مرتضیٰ پانی پتی نے جو مولوی اور حافظ ہونے کی پیشگوئی فرمائی تھی۔ اس کے پورا ہونے کا غیب سے یوں سامان پیدا ہوا کہ آپ کے والد ماجد نے جو اپنے وقت کے بڑے رئیس تھے۔ آپ کو تو دینی تعلیم کے لئے منتخب فرمایا اور اپنے چھوٹے صاحبزادہ منشی اکبر علی مرحوم کو دنیوی یعنی انگریزی تعلیم کے لئے حالانکہ عام طور پر روسا اپنی اولاد کو دنیوی تعلیم دلانے میں ہی عزت و افتخار سمجھتے ہیں۔ اور دینی تعلیم دلانے میں سبکی و عار۔ اور حضرت کا شاندار اور پاکیزہ بچپن بھی اس بات کا متقاضی تھا کہ آپ کو ایسی پاکیزہ تعلیم دلائی جاتی جس سے وہ خصوصیاتِ عظمت جو قدرت نے آپ کی جبلت میں رکھ دی تھیں روشن و نمایاں ہو جائیں۔

عربی کی تعلیم آپ کا تعلیمی دور تعلیم قرآن سے شروع ہوا جس کے چند پارے آپ نے کھتولی ضلع میرٹھ کے رہنے والے آخون جی سے پڑھے۔ پھر حافظ حسین علی سے جو دہلی کے باشندے تھے۔ اور میرٹھ میں رہا کرتے تھے۔ قرآن حفظ کیا۔

عربی کی ابتدائی کتابیں آپ نے اپنے وطن تھانہ بھون میں ہی مولانا فتح محمدؒ سے پڑھیں۔ مگر اس کی باقاعدہ تعلیم ——— دارالعلوم دیوبند پہنچ کر مشکوٰۃ شریف۔ مختصر معانی نورالانوار اور ملا حسن سے شروع کی۔ آپ آخر ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں اس مدرسہ میں داخل ہوئے اور شروع ۱۳۰۱ھ یعنی قریباً پانچ سال کے عرصہ میں جبکہ ابھی آپ ۱۹-۲۰ برس کے تھے۔ فارغ التحصیل ہو گئے۔

فارسی کی تعلیم آپ نے فارسی کی ابتدائی تعلیم میرٹھ کے ہی استادوں سے حاصل کی تھی۔ اس کی متوسطات تھانہ بھون میں مولانا فتح محمد سے پڑھیں۔ جو ان کے عربی کے بھی استاد تھے۔ انتہائی کتب ابوالفضل تک اپنے ماموں واجد علی سے پڑھیں۔ جو ادب فارسی کے استاد کامل تھے۔ دیوبند پہنچ کر پنج رقعہ۔ قصائد عرفی اور سکندر نامہ وغیرہ مولانا منفعت علی دیوبندی سے پڑھ کر اس کی تکمیل کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں جبکہ ابھی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ آپ نے فارسی میں

مثنوی زیر و بم تصنیف کی اور اسی سے آپ کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔

منطق میں مہارت منطق میں آپ نے مہارت تامہ حاصل کر لی تھی۔ اس کے متعلق آپ خود ہی اظہار تشکر کے طور پر فرمایا کرتے تھے:۔

"الحمد للہ! مجھے منطق میں مہارت حاصل ہے۔ اور میں یہ بات کیوں نہ کہہ دوں۔ کیونکہ نہ میں متواضع ہوں۔ نہ متکبر۔ جو چیز حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔ اس کا کیوں انکار کروں اللہ کی دین ہے میرا کوئی کمال نہیں۔ اور میں اس کو در حقیقت کوئی کمال بھی نہیں سمجھتا۔ کیونکہ بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کی برکت سے یہ اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہے کہ ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ   جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ"

معقولات سے مناسبت معقولات سے آپ کو بہت دلچسپی اور مناسبت تھی۔ جس کی وجہ سے صدرا اور شمس بازغہ جیسی مشکل کتابوں کا اکثر حصہ بے ترجمہ پڑھتے چلے جاتے تھے۔ اور مشکل مسائل بھی پانی نظر آتے تھے۔ مگر اس مناسبت کے باوجود آپ دوسروں کی طرح بس معقولات کے ہی ہو کر نہ رہے بلکہ اسے ہمیشہ دینیات کے لئے بطور علوم آلیہ کے ہی سمجھا۔ کیونکہ اعتدال اور سلامتی آپ کی فطرت میں داخل تھی۔ جس کی وجہ سے آپ ہر چیز کو اعتدال پر رکھتے تھے۔ معقولات سے اس قدر مناسبت ہونے کے باوجود منقولات کے مقابلہ میں آپ کو ہمیشہ ان فنون سے نفرت رہی اسی لئے جب فلسفہ کا سبق شروع کرتے تو بجائے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھتے۔ جو آپ کی بالغ النظری کی دلیل ہے۔ کیونکہ شیطان ہمیشہ اسی راستہ سے حملہ کرتا ہے چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ

"الحمد للہ! میں کبھی طبیعت کو عقل پر غالب نہیں آنے دیتا۔ اور کبھی عقل کو شریعت پر غالب نہیں آنے دیتا۔"

یہ واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ آپ کی بالغ النظری وہبی تھی۔ کسبی نہ تھی۔

قرأت کی مشق آپ نے قرآن کریم تو شروع ہی میں حفظ کر لیا تھا۔ مگر قرأت کی مشق شہرہ آفاق قاری محمد عبد اللہ مہاجر مکی سے بمقام مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ فرمائی تھی۔ جو قرار عرب کے نزدیک بھی نہایت جید اور مسلم ماہر فن قاری تھے۔ قرأت کی مشق کے سلسلہ میں استاد نے انہیں ایک نہایت ہی عجیب اصول بتلایا کہ لہجہ کی طرف مطلق التفات نہ کیا جائے۔ بس ساری توجہ مخارج کی تصحیح میں صرف کی جائے۔ کیونکہ تصحیح مخارج کے بعد جو لہجہ بھی پیدا ہوگا۔ مستحسن ہی ہوگا۔ چنانچہ حضرت نے ا

کی طرف کبھی توجہ نہ دی۔ حالانکہ عام طور پر قرار لہجہ میں دلکشی پیدا کرنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ لہجہ کی طرف توجہ نہ دینے کا یہ نتیجہ نکلا کہ آواز میں اتنی دلکشی پیدا ہوگئی کہ آپ جب مدرسہ کی بالائی منزل پر قرارت کی مشق کرتے ——— تو راہگیر آواز کی کشش پر رک جاتے اور یہ تمیز نہ کر سکتے کہ استاد پڑھ رہا ہے یا شاگرد۔

مناظرہ کی قوت

آپ میں طالب علمی کے زمانہ میں ہی پیدا ہوگئی تھی۔ دیوبند کی تعلیم کے دوران میں جبکہ ابھی لڑکے ہی تھے۔ حاضر جوابی۔ طلاقت لسانی۔ ذہانت وفطانت اور منطق میں کمال مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہاں جب بھی کبھی کوئی مذہبی مناظرہ کے لئے آتا۔ آپ فوراً اس کے پاس پہنچ جاتے۔ اور انہیں عاجز اور زیر کر لیتے۔ ادھر اُستادوں کو یہ ڈر لگا رہتا۔ کہ ابھی لڑکا ہے کہیں مرعوب نہ ہو جائے۔ اور آپ پر یہ جوش سوار ہوتا کہ اسے چاروں شانے چت گرانا ہے۔ گویا آپ طالب علمی کے زمانہ میں ہی لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کی مشق کر رہے تھے۔

طالب علمی کے زمانہ میں ہی آپ نے عیسائیوں۔ آریوں۔ شیعوں۔ غیر مقلدوں سے بڑے بڑے معرکۃ الآرا مناظرے کیے۔ مگر کسی مناظرہ میں نہ اصولِ مناظرہ کو ہاتھ سے جانے دیا۔ اور نہ حق بات تسلیم کرنے سے کبھی گریز کیا۔ آپ کی منطقی تقریریں سن کر رئیس المناظرین مولانا سید مرتضیٰ احسنؒ وجد میں آ جاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ

"آپ کو مناظرہ میں اس قدر ملکہ ہے کہ بڑے سے بڑا مناظر بھی مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا۔"

عظمت کا راز

داناؤں کا فیصلہ ہے کہ

"عظمت ایک فی صدی ودیعت کی جاتی ہے اور ۹۹ فی صدی محنتِ شاقہ سے حاصل ہوتی ہے۔"

حضرت تھانوی بھی دنیا کے ان عظیم المرتبت انسانوں میں سے تھے۔ جن کی عظمت وجلالت محنتِ شاقہ کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ خداداد تھی۔ چنانچہ حضرت خود فرمایا کرتے تھے :۔

"میں نے پڑھنے میں کبھی محنت نہیں کی۔ جو کچھ اللہ نے عطا فرمایا ہے۔ اساتذہ اور بزرگوں کے ساتھ ادب ومحبت کا تعلق رکھنے کی بدولت عطا فرمایا۔ اور الحمدللہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی بزرگ کو ایک منٹ کے لئے بھی ناراض نہیں کیا۔ اور جتنا میرے قلب میں بزرگانِ دین کا ادب ہے۔ آج کل شاید ہی کسی کے دل میں اتنا ہو۔"

اساتذہ کی توجہ یہ انہی آثارِ عظمت کا نتیجہ تھا کہ آپ پر اساتذہ کی خصوصی توجہ تھی۔ بلکہ آپ کے زمانہ طالب علمی کے حالات و عادات ہی اساتذہ کو خود بخود آپ پر توجہ خاص رکھنے کے لئے مجبور کرتے تھے۔ اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے۔ کہ ہزاروں میں کوئی نوجوان کی جگہ لینے کو تیار ہو رہا ہے۔ جس کی غمازی مندرجہ ذیل واقعات کرتے ہیں۔

وقت کی قدر دنیا میں وقت سے زیادہ قیمتی اور کوئی چیز نہیں۔ وقت ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے جو گذر جانے کے بعد دنیا جہاں کی ساری دولتیں صرف کر دینے کے باوجود بھی ہاتھ نہیں آ سکتا۔ اور جو اس کی قدر کرتا ہے۔ وہی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

آپ نے طالب علمی کے زمانہ میں ایک منٹ بھی ضائع کرنا گناہ سمجھا۔ آپ کسی سے ملتے جلتے نہ تھے ہر وقت اپنی پڑھائی میں لگے رہتے تھے۔ اگر کسی وقت فرصت ملتی۔ تو آپ اپنے استادِ خاص مولانا محمد یعقوب مدرس اول کی خدمت میں جا بیٹھتے۔ ایک دن مولانا کہیں باہر تشریف لے گئے۔ جس کی وجہ سے آپ کے پاس فارغ رہنے کی ایک معقول وجہ تھی۔ مگر آپ نے فارغ رہنا گوارا نہ کیا اور اپنے دوسرے استاد مولانا سید احمد کی خدمت میں جا بیٹھے۔ وہ آپ کی خلاف معمول آمد پر حیران ہوئے اور وجہ پوچھی تو آپ نے کمال سادگی سے صحیح بات عرض کر دی کہ:۔

"حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب باہر تشریف لے گئے ہیں۔ اسلئے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ تاکہ وقت بیکار نہ جائے۔"

تضیع اوقات سے احتراز آپ طالب علمی کے زمانہ میں مدرسہ کے دارالاقامہ میں ہی رہتے تھے۔ حالانکہ دیوبند کے اندر آپ کے بعض دور کے رشتہ دار بھی رہائش رکھتے تھے اور وہ اکثر حضرت سے تقاضا کرتے رہتے تھے کہ ہمارے گھر آ کر کھانا کھا لیا کرو۔ کیوں تکلیف اٹھاتے ہو۔ مگر آپ نے کھانا تو درکنار تضیع اوقات کے خیال سے میل ملاپ رکھنا بھی بند کر دیا تھا۔ آخر ان کے اصرار پر آپ نے یہ بات اپنے والد ماجد کو لکھی۔ کیونکہ آپ ان کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اور ساتھ ہی یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں آپ کے اعزہ شکایتہً اس بات کا والد صاحب سے ذکر نہ کر دیں جس کے جواب میں آپ کو والد صاحب نے ڈانٹ لکھی کہ:۔

"تم وہاں رشتہ داریاں جتانے گئے ہو یا طالب علمی کرنے؟"

بس آپ کو اتنا لکھا کافی ہو گیا۔ اور جتنا عرصہ دیوبند میں پڑھتے رہے کبھی کسی رشتہ دار کو ملنے نہ گئے چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے۔ کہ:۔

"الحمدللہ! میں وہاں جیسا بے داغ گیا تھا۔ ویسا ہی پانچ برس رہ کر بے داغ لوٹ آیا جب فارغ التحصیل ہوگیا۔ اس وقت آزادی کے ساتھ اپنے سب اعزہ سے جا کر ملا۔ اور پھر ان کی دعوتیں بھی قبول کیں۔ اس سے قبل کسی سے میل جول پیدا نہ کیا۔ نہ اعزہ سے نہ طلباء سے نہ اہل قصبہ سے۔ اگر کوئی میل جول بڑھانا چاہتا۔ تو اُس کے ساتھ بے رخی سے پیش آتا یہاں تک کہ لوگ عموماً دماغ دار سمجھتے۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔ دراصل مجھ کو اپنا وقت فضول ضائع کرنے سے نفرت تھی"۔

فضولیات سے اجتناب

سکولوں اور کالجوں میں عام طور پر خصوصی اور تفریحی پارٹیاں ہوتی رہتی ہیں جن میں طلبا ذرا آزادی کے ساتھ کھل کھیلتے ہیں اور اس وقت کو انتہائی خوش طبعی کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر آپ ایسے مواقع پر حتی الوسع خود کو بچا کر رکھتے تھے ایک مرتبہ مدرسہ میں طلبا کی آموں کی دعوت ہوئی۔ جس میں آپ اور آپ کے استاد مولانا محمد یعقوبؒ و مولانا محمد قاسمؒ بھی شریک تھے۔ جب آم تھوڑے رہ گئے۔ تو مولانا محمد یعقوب اس خیال سے چل دیئے کہ ابھی ان میں گٹھلی چھلکا ہوگا۔ آپ بھی یہ بات بھانپ گئے۔ اور اپنے استاد کے ساتھ ہی اس مجلس سے اُٹھ کر چلے آئے۔ مولانا محمد قاسم ازراہِ تواضع شریک رہے۔ چنانچہ استادوں کے چلے آنے کے بعد وہ آپس میں خوب کھل کھیلے۔ اور شرارتیں کرنے لگے۔ جن سے باز رکھنے کے لئے مولانا محمد یعقوب کو واپس آنا پڑا۔ وہ مولانا کو آتا دیکھ کر مارے شرم کے بھاگ گئے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ اس زمانہ میں فضولیات سے کتنا اجتناب کرتے تھے۔

یکسوئی کی عادت

اس کے ساتھ ساتھ آپ کو یکسوئی کی عادت بھی تھی۔ جو طالب علمانہ زندگی کیلئے ازحد ضروری ہے۔ ورنہ انتشار کی وجہ سے پڑھائی اطمینان کے ساتھ نہیں ہوسکتی آپ جب بھی لڑکوں کو اپنے کمرہ کی طرف بڑھتے دیکھتے۔ فوراً کواڑ بند کر لیتے۔ تاکہ کوئی آپ کی پڑھائی میں مخل نہ ہو۔ اور آپ کا وقت ضائع نہ کرے۔ جسے عام طور پر طلبا برا مناتے۔ چنانچہ اُسی آموں کی دعوت والے دن جب آپ اُٹھ کر چلے آئے تو لڑکوں نے اسے "آداب تفریح" کے خلاف سمجھا۔ اور دعوت سے فارغ ہونے کے بعد اس بات کا انتقام لینے کے لئے آپ پر گٹھلی اور رس پھینکنے کے ارادہ سے آپ کے کمرہ کا رخ کیا۔ مگر آپ نے انہیں کچھ کہے بغیر صرف کواڑ بند کر لئے۔ جس پر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ غرضیکہ جس طرح آپ بچپن میں خانہ نشین رہے۔ اسی طرح طالب علمی کے زمانہ میں بھی گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے رہے۔ جو انسان کو بری صحبتوں سے بچاتی ہے۔

علم کا شوق یہ اسی گوشہ نشینی کی برکت تھی کہ آپ تحصیل علم میں ہمہ تن مشغول رہتے تھے۔ آپ کے تحصیلِ علم کے شوق کا صرف اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے بعض خاص کتابیں جن کے لئے مدرسہ میں وقت نہ تھا بعض اساتذہ سے اس طرح پڑھیں کہ وہ حضرات تو نماز کے لئے وضو کر رہے ہوتے اور آپ ان سے سبق پڑھ رہے ہوتے۔ آپ کے اس غیر معمولی ذوق و شوق کی وجہ سے اساتذہ بھی آپ کا خاص طور پر لحاظ کرتے بلکہ ناز برداری بھی کرتے۔

ذہانت و ذکاوت حصولِ علم کے شوق نے جہاں آپ کو اپنے دوسرے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ ممتاز کر دیا تھا۔ وہاں آپ کو ذہین و ذکی بھی بنا دیا تھا جس کا آپ کے اساتذہ کو بھی اعتراف تھا۔ چنانچہ جب حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز طلبا کا امتحان لینے اور دستار بندی کرنے تشریف لائے۔ تو شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا کی ذہانت و ذکاوت کی خاص طور پر تعریف فرمائی۔ حضرت شیخ الہند کی زبانی حضرت مولانا گنگوہی نے آپ کی غیر معمولی تعریف سن کر آپ سے بہت مشکل مشکل سوالات کئے۔ جن کے جوابوں سے مولانا بہت خوش ہوئے۔

آپ کے استاد مولانا سید احمد نے جب آپ کا سکندر نامہ کا امتحان لیا۔ تو آپ کو ایک شعر کا وہ مطلب یاد نہ رہا۔ جو استاد نے بتایا تھا۔ اسلئے آپ نے فوراً اپنی طرف سے اس کا مطلب بیان کیا۔ مولانا نے دریافت کیا کہ کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا ہے؟ تو آپ نے اپنی طرف سے ہی دوسرا مطلب بیان کر دیا مولانا نے پھر پوچھا اس کے علاوہ بھی کوئی اور مطلب ہو سکتا ہے۔ تو آپ نے تیسرا مطلب بیان کر دیا۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ ان میں سے تمہارا کوئی مطلب بھی صحیح نہیں۔ مگر میں صرف تمہاری ذہانت پر نمبر دیتا ہوں۔ طلباء میں آپ کی شہرت زیادہ تر اسی ذہانت و ذکاوت اور حافظہ کی وجہ تھی۔

قوتِ آخذہ اس غیر معمولی حافظہ نے آپ میں قوتِ آخذہ پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے آپ اپنے اساتذہ کاملین سے بدرجہ اتم کمالات اخذ کر لیتے تھے۔ اور ایک اجنبی کیلئے استاد اور شاگرد میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ جس کی مثال قرأت کی مشق کے ضمن میں گذر چکی ہے اسلئے آپ اپنے اساتذہ کرام کے مظہر اتم بھی تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ جبکہ اساتذہ کرام بھی آپ کو حق تعالیٰ نے ایسے دستیاب کئے۔ جو اپنے وقت کے غزالی اور رازی تھے جس کی تفصیل اگلے باب میں آ رہی ہے۔ آپ کے اساتذہ چونکہ ظاہری و باطنی کمالات کے بھی جامع تھے۔ اسلئے ان کی توجہات

تصوف کا ذوق سے طالب علمی کے زمانہ میں ہی آپ میں ذوقِ تصوف پیدا ہو گیا تھا۔ آپ نے

ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم کے لئے کتب تصوف کا مطالعہ بھی اسی زمانہ میں شروع کر دیا تھا۔ اور طریق تصوف میں غایت شغف رکھنے لگے تھے۔ جسے اس زمانہ کے جنیدؒ و شبلیؒ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ العزیز مہاجر مکی نے دیوبند سے ہزاروں میل دور مکہ معظمہ میں بیٹھے ہوئے اپنے نور فراست سے تاڑ لیا۔ اور بالا دیدہ و شنیدہ وہاں طلب فرمایا جس کی تفصیل باب بیعت میں آئے گی۔ چنانچہ آپ کے طالب علمی کے زمانہ میں جب میرٹھ کے رئیس شیخ الٰہی بخش (جن کے ان آپکے والد ماجد مختار ریاست تھے) بغرض زیارت مولانا شاہ رفیع الدینؒ مہتمم مدرسہ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو آپ کی وضع قطع اور طالب علمانہ رنگ دیکھ کر حیران رہ گئے اور حضرت مہتمم سے بے ساختہ فرمایا کہ:-

"حضرت آپ نے تو لڑکے کو بالکل فنافی الشیخ کر دیا ہے۔"

انتہائی سادگی یہی وجہ تھی کہ آپ مدرسہ میں انتہائی سادگی سے رہتے تھے۔ اپنے اساتذہ سے صرف علوم ہی حاصل نہ کرتے تھے۔ بلکہ ان کا طرز تمدن و معاشرت بھی نقل کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ نے حضرات اہل مدرسہ دیوبند کو دیکھ کر اپنا قدیم وضع کا غرارہ دار پاجامہ پہننا ترک کر کے تنگ مہری کا پاجامہ پہننا شروع کر دیا تھا۔ وضع قطع بود و باش۔ غرضیکہ ہر باب میں سادگی نمایاں تھی۔ چنانچہ طالب علمی کے زمانہ میں بدوران تعطیلات ایک دفعہ آپ گھر تشریف لے گئے۔ تو آپ نے غایت سادگی سے رضائی لپیٹ رکھی تھی۔ باقاعدہ اوڑھے ہوئے نہ تھے کہ دونوں پلے برابر ہوں۔ لٹکے ہوئے نہ ہوں۔ آپ کے والد ماجد یہ ہیئت دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اور آپ سے کہا کہ:-

"میاں تم کو رضائی اوڑھنا بھی نہیں آتا۔"

اگرچہ آپ والد صاحب سے بڑے ڈرتے تھے۔ گو ادب بھی بڑا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت آپ نے فی البدیہہ یہ جواب دیا:-

"حضرت اگر آپ کو رضائی اوڑھنا ہی سکھانا تھا۔ تو مدرسہ دیوبند نہ بھیجتے۔ وہاں تو کسی کو بھی رضائی اوڑھنا نہیں آتا۔ سب ہی الول جلول ہیں۔"

آپ کے والد ماجد نے تیز مزاج ہونے کے باوجود آپ کو کچھ نہ کہا۔ نہ ہی اس کے بعد آپ کو ایسی باتوں پر ٹوکا۔ آپ جب اپنے زمانہ طالب علمی کی سادگی اور اپنے دور مشیخت میں طلباء کی خوش لباسی اور بناؤ سنگار پر نظر دوڑاتے تو انتہائی افسوس کے ساتھ فرماتے کہ:-

"یہ دلیل اس کی ہے کہ ان کی نظر عالی نہیں۔ اور ان کو علم کا چسکا لگا نہیں۔ ورنہ ایسی ادنیٰ باتوں اور ادنیٰ چیزوں کی طرف کبھی التفات نہ ہوتا۔"

گھر سے تبلیغ اسی طرح آپ گھر کے دوسرے معاملات میں بالعموم اور جائز و عام جائز کے مسائل میں بالخصوص اپنے والد ماجد سے اختلاف فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ کے والد ماجد نے کسی کی اراضی رہن رکھ لی۔ جبکہ آپ ابھی زیر تعلیم تھے۔ جب اس کی خبر آپ تک پہنچی۔ تو آپ نے فرض تبلیغ کی ادائیگی کے لیے انہیں لکھ بھیجا کہ یہ ناجائز ہے۔ اس پر آپ کے والد ماجد نے اپنے ایک ملنے والے ہندو سے شکوہ کیا کہ۔

"ہم نے اپنے ایک لڑکے کو عربی پڑھوائی ہے۔ وہ ہمیں ہر بات پر ٹوکتا ہے کہ یہ بات خلاف شرع ہے۔ یہ بات ناجائز ہے ہمیں رائے دیتا ہے کہ رہن رکھنا چھوڑ دو وغیرہ"

یہ سن کر اس ہندو نے کہا کہ۔

"منشی جی یہ تو بڑے خوشی ہونے کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا لڑکا بڑا لائق ہے آپ کا بڑا خیر خواہ ہے۔ اگر آپ اسے نجوم پڑھاتے۔ تو وہ آپ کو جہوت کی باتیں بتاتا۔ قانون پڑھاتے۔ تو قانون بتاتا۔ طب پڑھاتے تو نافع و مضر چیزیں بتاتا۔ آپ نے اس کو دین پڑھایا ہے۔ تو وہ لامحالہ دین ہی کی باتیں بتائے گا۔ شکر کرو بڑا لائق ہے۔ بڑا خیر خواہ ہے۔ آخرت کے عذاب سے بچاتا ہے۔ آپ کو اس بات پر خوش ہونا چاہیئے۔ کہ جو کچھ میں اس کے پڑھانے پر خرچ کر رہا ہوں۔ وہ ٹھکانے لگ رہا ہے"

فتویٰ نویسی طالب علمی میں تبلیغ کا اہتمام اور اپنے گھر کے مفاد کے خلاف! سبحان اللہ یہ آپ کے مردِ حق ہونے کی دلیل تھی۔ پھر آپ صرف مبلغ ہی نہ تھے۔ بلکہ اسی طالب علمی کے زمانہ میں مفتی بھی تھے۔ کیونکہ آپ کی غیر معمولی ذکاوت و ذہانت اور علم و تقویٰ کے پیشِ نظر آپ کے استادِ خاص مولانا محمد یعقوبؒ نے فتویٰ نویسی کا کام بھی طالب علمی کے زمانہ میں آپ ہی کے سپرد کر رکھا تھا۔ آپ بڑے بڑے الجھے ہوئے اور طویل طویل سوالات کے جوابات نہایت سہولت اور جامعیت کے ساتھ چند لفظوں میں تحریر کر دیتے۔

ایک دفعہ ایک طویل استفتار کا ویسا ہی طویل اور مفصل و مدلل جواب لکھ کر مولانا کی خدمت میں لائے مولانا نے سارا پڑھا اور تستخیل کرتے ہوئے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے پاس وقت بہت ہے۔ اس کے بعد آپ نے جامع و مانع جواب لکھنے شروع کر دیئے۔

احساسِ حقیقت طالب علمی کے زمانہ میں ایسی خداداد صلاحیتیں رکھنے کے باوجود احساسِ حقیقت اس درجہ حاوی تھا کہ ۱۲۹۰ھ میں جب دیوبند میں شاندار جلسہ ہونا قرار پایا۔ جس میں

آپ کی دستار بندی ہونے والی تھی۔ تو آپ دستار بندی کی خبر سن کر اپنے چند ہم سبقوں کو ساتھ لے کر حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی کہ:۔

"حضرت سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی کی جائے گی اور سند فراغ دی جائے گی۔ حالانکہ ہم اس قابل ہرگز نہیں۔ لہٰذا اس تجویز کو منسوخ فرمایا جاوے۔ اگر ایسا کیا گیا تو مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی۔ کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی"۔

یہ سن کر مولانا کو جوش آگیا اور فرمایا:۔

"تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں۔ اس لئے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ باہر جاؤ گے۔ تو تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی۔ جہاں جاؤ گے بس تمہی تم ہوگے۔ باقی سارا میدان صاف ہے۔ اطمینان رکھو"۔

چنانچہ یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ عوام و خاص تو کیا بڑے بڑے علماء فضلاء آپ کی ہمیشہ قدر و منزلت کرتے رہے۔

روحانی تربیت چونکہ حق تعالیٰ نے آپ کو فطرتاً ایسی غیر معمولی صلاحیتیں بخشی تھیں جو خود بخود آپ کی تربیت کر دیتی تھیں اور ایسا نورِ فراست عطا کیا تھا۔ جو بچپن سے ہی آپ کو صراط مستقیم دکھا رہا تھا۔ اسلئے بچپن سے لے کر فارغ التحصیل ہونے تک کسی کو آپ کی تربیت خاص کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی پیدا نہ ہوئی۔ چونکہ ہر کام خود بخود ٹھیک ہو رہا تھا۔ اسلئے کبھی زجر و توبیخ یا ترہیب و تہدید بلکہ ترغیب تک کی نوبت نہ آئی۔ اور اگر کچھ کمی باقی رہ گئی تھی جس پر کسی کی نظر نہ جاسکی۔ تو اس کو پورا کرنے کا بھی قدرت نے خاص انتظام کر دیا۔ جس کی تصدیق اس واقعہ سے ہوتی ہے۔ جو آپ نے خود اپنے رسالہ "صدق الرویا" میں تحریر فرمایا کہ بحالت خواب:۔

"میں نے زمانہ تحصیل مدرسہ عالیہ دیوبند میں ایک بزرگ کو دیکھا۔ مجھ سے پوچھتے ہیں تمہاری عمر کیا ہے اور تمہارا نیا سال کب شروع ہوگا۔ میں نے عمر بتلائی اور کہا کہ ۵ ربیع الثانی کو سال شروع ہوگا۔ وہ بزرگ فرمانے لگے کہ سال شروع ہونے سے پہلے دو روزے رکھ لینا برکت ہوگی۔ میں نے اس پر عمل کیا اور کئی سال تک وہ عمل کرتا رہا پھر کسل ہوگیا۔ ایک بار اس زمانہ میں بھی وہ عمل کیا تھا۔ مگر غالباً ایک روزہ رکھا تھا میں نے اس خواب کو اپنے عزیزوں میں سے ایک بزرگ سے بیان کیا۔ انہوں نے مجھ سے حلیہ پوچھا۔ میں نے بیان کیا سن کر فرمایا یہ حافظ غلام مرتضےٰ صاحب قدس سرہٗ

تھے۔ جو ایک مجذوب مگر پاکیزہ بزرگ تھے۔ جن کی مدح شیوخ طریقت بلکہ خود حضرت مرشدی حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے بھی فرمائی ہے۔"

اسی طرح حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ جو حضرت میاں جی نور محمد نور اللہ مرقدہٗ کے خلفاء خاص میں سے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے پیر بھائی تھے۔ جب آپ کو مکتب جاتے دیکھتے تو فرماتے کہ میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہوگا۔ اور ایسا ہی ہوا کہ ان کے بعد اس قصبہ میں آپ ہی کی ذات علوم ظاہری و باطنی کی جامع تھی۔ اور جب وہ وفات پا گئے تو بعد وفات بھی انہوں نے آپ سے عالم رؤیا میں فرمایا کہ

"ہم کو تمہاری طرف اب بھی ویسی ہی توجہ ہے۔ جیسی حیات میں تھی۔"

غرضیکہ آپ کی طالب علمی کا زمانہ بھی حق تعالیٰ کی عنایات لئے عنایات کا مظہر تھا۔ ورنہ اتنی خوبیاں ایک شخص میں یکجا دیکھنے کا عموماً اتفاق نہیں ہوتا کہ وہ طالب علمی کے زمانہ میں ہی معلم بھی ہو۔ مبلغ بھی ہو۔ مفتی بھی ہو۔ مصنف بھی ہو۔ متقی بھی ہو۔ مناظر بھی ہو۔ معقول بھی ہو۔ معتدل بھی ہو۔ ماہر بھی ہو اور پھر ترتیب میں منفرد بھی ہو۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

اساتذہ کرام

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ان سے حضرت تھانویؒ نے اپنے نصاب کی کوئی خاص تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ البتہ ان کے درس جلالین میں از راہِ عقیدت و شوق تحصیل علم گاہے گاہے شرکت کرتے تھے۔ آپ کے داخلہ کے ایک سال بعد ہی مولانا رحلت فرما گئے تھے۔ مگر مدرسہ کے ایک روشن ستارہ ثابت ہونے والے اس طالب علم کو مولانا نانوتویؒ نے طالب علمی کے ابتدائی زمانہ میں ہی تاڑ لیا تھا کہ یہ کچھ قدرتی اور فطری خصوصیات کا مالک ہے۔ اسلئے آپ پر ان کی خاص نظرِ شفقت رہی اور انہوں نے آپ کو صرف ایک ہی سبق پڑھایا۔ جس کے آپ زلیت منظور ہے۔

ایک بار مولانا نے حضرت سے دریافت فرمایا کہ کونسی کتابیں پڑھتے ہو؟ آپ پر مولانا کا اس قدر رعب و ادب غالب ہوا کہ کتابوں کے نام بھول گئے۔ انہوں نے ہیبت کا اثر دور کرنے کیلئے آپ سے دوسری باتیں شروع کردیں جس سے آپ کی طبیعت کھل گئی۔ اور پھر فرمایا کہ دیکھو ایک تو پڑھنا

ہوتا ہے اور ایک گننا محض پڑھنا کافی نہیں۔ گننے کی بھی ضرورت ہے۔ اس کو تمثیلاً اس طرح سمجھایا کہ ایک عالم تھے۔ جنہوں نے ہدایہ کو حفظ کر لیا تھا۔ ان سے ایک دوسرے عالم نے جو حافظ ہدایہ نہ تھے لیکن ہدایہ کو خوب سمجھ کر پڑھا تھا۔ ایک مسئلہ کا ذکر کیا۔ حافظ ہدایہ نے پوچھا کہ یہ مسئلہ کونسی کتاب میں ہے۔ انہوں نے کہا ہدایہ میں۔ حافظ ہدایہ نے کہا نہیں۔ ہدایہ تو مجھے حفظ یاد ہے۔ اس میں تو کہیں نہیں۔ اس پر غیر حافظ ہدایہ نے کہا کہ یہ مسئلہ ہدایہ ہی کا ہے اور کتاب منگا کر اس کے اندر ایک عبارت نکال کر دکھائی جس میں وہ مسئلہ بعینہٖ تو مذکور نہ تھا۔ لیکن اس سے یہ مسئلہ قریب مستنبط ہوتا تھا۔ جس کی تقریر کے بعد حافظ ہدایہ کو ماننا پڑا کہ واقعی یہ ہدایہ ہی کا مسئلہ ہے۔ اور بہت افسوس کے ساتھ کہنے لگے کہ بس جی حقیقت میں تو ہدایہ کو تمہیں نے پڑھا ہے۔ ہم نے تو گویا پڑھا ہی نہیں۔ محض حفظ کر لینے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ واقعہ نقل فرمانے کے بعد حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ بس پڑھنے اور گننے میں یہ فرق ہے۔

مولانا فتح محمد تھانویؒ

یہ ایک بڑے جید عالم۔ کامل درویش۔ سراپا دین۔ بہت ہی بابرکت اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ یہ پہلے حضرت نواب قطب الدین خاں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد تکمیل سلوک شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے کی اور مشرف بہ خلافت ہوئے۔ یہ حضرت تھانویؒ کے استادِ اول تھے۔ جن سے حضرت نے ابتدائی کتب فارسی وعربی پڑھی تھیں۔ حضرت کی خوش قسمتی تھی یا قدرت کا حسن انتظام کہ حضرت کو بالکل نوعمری میں جبکہ حضرت کا قلب تمام آلودگیوں سے پاک تھا آپ کو ایسے استاد کامل مل گئے۔ جن کی تعلیم وتربیت حضرت کے لئے مفتاح برکات وسعادات اور کلیدِ خیرات وحسنات ثابت ہوئی اور جن کے فیض صحبت سے دل میں دین کی محبت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ اعترافاً فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"جو اصل سرمایہ ہے یعنی دین کی محبت۔ وہ مجھ کو مولانا ہی کے فیض صحبت سے حاصل ہوا کیونکہ مولانا دین کے عاشق تھے۔ مولانا کی برکت سے دین کا یہاں تک شوق بڑھ گیا کہ میں نابالغی میں ہی تہجد پڑھنے لگا تھا۔"

استاد کا اہتمام احترام

مولانا رحمۃ اللہ علیہ علوم ظاہری وباطنی میں جس قدر جامع تھے قد وقامت اور جثہ میں اتنے ہی مختصر۔ علاوہ ازیں منکسر المزاج اور سادہ وضع تھے جس سے بظاہر ان کے مقام کا بآسانی پتہ نہ لگ سکتا تھا۔ حضرت تھانویؒ کو بھی استاد سے خاص رغبت ومحبت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت کے ہاں ایک صاحب مہمان ہوئے تو آپ انہیں اپنے استاد کی زیارت

کرانے کے لئے لے گئے۔ مولانا چونکہ صاحبِ نظر تھے اور دیکھ رہے تھے کہ آج کا شاگرد کل کا استادِ زمانہ ہوگا۔ اسلئے استاد ہونے کے باوجود حضرت کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت تھانویؒ اپنے مہمان کے ہمراہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو وہ اس طرح آپ کی تعظیم و تکریم سے ملے۔ جیسے کوئی اپنے بزرگ کو ملتا ہے۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور مغرب کے قریب آپ واپس لوٹے۔ مہمان نے پوچھا کہ آپ نے تو استاد کو ملانے کے لئے کہا تھا۔ وہاں نہیں چلئے؟ حضرت نے فرمایا اپنے استاد سے تو آپ کو ملا کر آرہا ہوں۔ اس پر وہ بہت متعجب ہوئے اور کہا کہ وہی استاد تھے۔ وہ تو شاگرد سے بھی معلوم نہیں ہوتے تھے۔

استاد کی درخواستِ معافی

زمانہِ طالب علمی میں آخر کبھی کبھی استاد از راہِ ہمدردی و شفقت شاگرد پر ہاتھ چلا ہی بیٹھتا ہے۔ اسلئے مولانا جو عد درجہ متقی بھی تھے۔ ایک بار اپنے شاگردِ رشید کے پاس چل کر آئے اور فرمانے لگے۔

"جب دو آدمی ایک جگہ رہتے ہیں۔ تو ان میں کچھ تعلقات بھی ہو جاتے ہیں اور ان تعلقات کی وجہ سے کچھ حقوق بھی ہو جاتے ہیں۔ جن میں کچھ کوتاہیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ لہذا مجھ سے بھی ضرور کچھ کوتاہیاں ہوئی ہوں گی۔ ان کی میں معافی چاہتا ہوں۔"

حضرت فوراً سمجھ گئے کہ طالب علمی کے زمانہ میں مولانا نے جو کبھی شاذ و نادر پیٹا تھا۔ یہ اس کی معافی کی درخواست ہے۔ اور اس لطیف پیرایہ میں پیش کی جا رہی ہے۔ اسلئے فرمایا:-

"حضرت جس چیز کی معافی چاہی جا رہی ہے۔ اس کو میں سمجھ گیا ہوں۔ توبہ توبہ حضرت وہ تو عین شفقت و رحمت تھی۔ اس کی معافی کیسی۔ یہ جو دو حرف آگئے ہیں۔ یہ انہی کی تو برکت ہے۔"

مولانا نے کہا نہیں۔ معاف ہی کردو۔ حضرت نے بہت عذر کیا مگر وہ نہ مانے۔ جس پر حضرت نے فرمایا کہ:-

"میں نے معاف کیا۔"

اس پر وہ بہت مسرور ہوئے۔

استاد کا جنازہ شاگرد کے گھر

مولانا کا اکثر معمول تھا کہ وہ از راہِ تواضع و شفقت خود اپنے شاگرد کو ملنے جایا کرتے تھے۔ جس سے شاگرد کے مقام کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب ان کی وفات ہوئی۔ تو اس زمانہ میں طاعون شدید تھا اور بروزِ انتقال بہت زور کی بارش ہو رہی تھی۔ اسلئے حضرت تھانویؒ نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔ مولانا کے اعزہ

بھی ارباب علم و فہم تھے۔ اور وہ استاد و شاگرد کے تعلقات کو بخوبی جانتے تھے۔ اسلئے وہ حضرت تھانویؒ کو معذور سمجھ کر خود ان کے استاد کا جنازہ ان کے پاس لے گئے۔ گویا بوقتِ رخصتِ دنیا بھی مولانا اپنا معمول پورا کر گئے۔

عالم برزخ سے توجہ مذکورہ بالا واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عالم برزخ سے بھی استاد کی شاگرد پر کتنی توجہ تھی۔ اس کی مزید تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ایک بار حضرت سفر کانپور سے واپس آئے۔ تو مولانا کے داماد حافظ عصمت اللہ مرحوم نے جو حضرتؒ کے بچپن میں ہم سبق رہے تھے۔ خواب میں مولانا کو دیکھا کہ وہ حضرت کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"وہ کانپور سے آئے ہیں۔ تم ان کی دعوت کیوں نہیں کرتے۔ دعوت کرو اور یہ جو مرغا گھر میں پلا ہوا ہے۔ اسے ذبح کر کے کھلاؤ۔"

چنانچہ انہوں نے اسی مرغے کو ذبح کر کے حضرت کی دعوت کی۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ یہ حضرت تھانویؒ کے خاص الخاص اور سب اساتذہ سے زیادہ محبوب اور محترم استاد تھے۔ دار العلوم دیوبند کے مدرس اول فن درس میں متدرسین اور علوم ظاہرہ میں یگانۂ روزگار اور بڑے صاحبِ باطن اور صاحبِ کشف و کرامات تھے اور اولیا کاملین میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ العزیز کے خلفائے عظام میں سے تھے اور قطب تکوین کا درجہ رکھتے تھے۔

شاگرد کی عقیدت مولانا کے انوارِ باطنی کا آپ کے قلبِ مصفا پر کچھ ایسا عکس پڑا کہ آپ کو مولانا سے غایت درجہ عقیدت و محبت پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ جب دنوں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے گنگوہ میں درس حدیث دینا شروع کیا۔ تو بہت سے لڑکے وہاں چلے گئے اور انہوں نے آپ کو بھی ترغیب دی کہ چونکہ مولانا کے ہاں ناغے بہت ہوتے ہیں۔ لہذا آپ بھی وہیں چلیں۔ آپ نے فرمایا:۔

گو میں سمجھتا ہوں کہ وہاں درسِ حدیث بہتر ہوگا۔ لیکن مجھے تو اپنے استاد کو چھوڑنا بے وفائی معلوم ہوتی ہے۔ جب تک مولانا خود یہ نہ فرما دیں کہ بس اب میرا ذخیرۂ علمی ختم ہو گیا ہے اب مجھ سے تمہاری تعلیم نہیں ہو سکتی۔ گو یہاں ناغے بہت ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ پڑھاتے ہیں۔ تو سیراب فرما دیتے ہیں"

استاد کی شفقت آپ کی اس گرویدگی کا یہ اثر ہوا کہ آپ کے استاد بھی دوسرے طلباء کی نسبت آپ

پرخصوصی شفقت و توجہ فرماتے تھے اور آپ کے سامنے خصوصیت سے حقائق و معارف اور نکات و دقائق علمیہ زیادہ بیان فرماتے تھے۔ اس طرح آپ اپنی غیر معمولی قوتِ آخذہ سے دوسروں کی نسبت زیادہ فیوض و برکات حاصل کرتے تھے اور علوم عجیبہ و غریبہ سیکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ مولانا کے درس کی کیفیت آپ یوں بیان فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"اُن کا حلقۂ درس کیا ہوتا تھا۔ حلقۂ توجہ ہوتا تھا۔ یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے آیات کا مطلب بیان فرما رہے ہیں۔ اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہیں۔"

افتاء و امامت کا اعزاز

آپ کی محبت و صلاحیت نے استاد کے دل میں اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا نے طالب علمی کے زمانہ میں ہی آپ سے افتاء کا کام لینا شروع کر دیا تھا۔ اور کبھی کبھی آپ کو اپنی جگہ امام بھی بنا دیتے تھے۔ ایک بار انہوں نے آپ سے ظہر کی نماز پڑھانے کی فرمائش کی تو آپ نے عذر کیا کہ حضرت میں نے تو ابھی سنتیں بھی نہیں پڑھیں تو اس پر مولانا نے یہ عجیب و غریب جواب دیا کہ:۔

"ہم تو فرض میں تمہاری اقتدا کریں گے۔ سنتوں میں تھوڑا ہی اقتدا کریں گے۔"

شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ

یہ بھی حضرت کے اساتذۂ خاص میں سے تھے۔ جن سے حضرت نے طالب علمی کے زمانہ میں بہت سی کتابیں پڑھیں مولانا پہلے دارالعلوم دیوبند میں مدرس رابع تھے۔ پھر ترقی کر کے مدرس اول ہو گئے۔ یہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگردِ رشید اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفۂ خاص تھے۔ آپ کو ان سے بھی بڑی عقیدت و محبت تھی۔ اکثر و بیشتر ان کا ذکر خیر فرماتے رہتے تھے۔ بلکہ آپ نے ان کے کمالاتِ علمیہ و عملیہ پر ایک رسالہ "ذکر محمود" کے نام سے بھی تصنیف فرما کر شائع کیا تھا۔ سیاسی تحریکات کے زمانہ میں اگرچہ حضرت کو ان سے اختلاف ہو گیا تھا۔ لیکن ان کا ذکرِ خیر بدستور فرماتے رہتے تھے اور اس میں کسی قسم کا فرق نہ آیا تھا

شفقت کی انتہا

مولانا کو بھی آپ سے بڑی انس و محبت تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں چونکہ آپ کو مناظرہ کا بڑا شوق ہوتا تھا۔ اس لئے اس عرصہ میں آپ کو جہاں بھی مناظرہ کی خبر ملتی۔ فی الفور پہنچتے۔ ایک دفعہ ایک یورپین عیسائی نے مناظرہ کے لئے اسٹیشن دیوبند کے قریب خیمے لگوائے۔ حضرت کو جب علم ہوا تو بیتابانہ مناظرہ کے لئے دوڑ پڑے۔ اتفاق سے اس بات کا مولانا کو بھی پتہ چل گیا تو وہ اس خیال سے کہ آپ نو عمر۔ نو آموز۔ ناتجربہ کار ہیں۔ کہیں مرعوب نہ ہو جائیں۔ فوراً اپنے شاگرد رشید کی امداد کے لئے وہاں پہنچے۔ اور حضرت کو ہٹا کر ان کی جگہ خود مناظرہ شروع کر دیا۔ اور دو چار باتوں میں ہی اس

مشنری کو خیمہ اکھاڑنے پر مجبور کر دیا۔

عزت افزائی کی حد

ذکرِ محمود میں حضرت تھانویؒ بعد حسرت لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ میری کوتاہی یا کم ہمتی تھی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مکاتبت کا بہت ہی کم اتفاق ہوا اور بعض اوقات اس کی نوبت بھی آئی۔ اور اس کا جواب بھی بالالتزام عطا ہوا۔ تو ان کی حفاظت کا کچھ التزام نہیں ہوا۔ اس وقت کل تین والے نامے محفوظ یاد آتے ہیں۔ ایک تو تفسیر کے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے جو تتمہ جلد رابع فتاویٰ امدادیہ ص۳۲۶ میں مطبوع ہوگیا ہے اور دو ذیل میں برکت کے لئے نقل کرتا ہوں جو حضرت کے مذاق۔ تواضع وشفقت پر دلالت کے لئے بھی دو شاہد عدل سے کم نہیں ہیں"۔

ان دو والا ناموں میں حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے شاگرد رشید کو ان الفاظ سے خطاب کیا تھا:۔

۱۔ سراپا فضل وکمال ثمر نکم اللہ تعالےٰ وجعلکم فوق کثیر من الناس

۲۔ معدنِ حسنات وخیرات دام ظلکم

حضرت تھانویؒ کا مولانا نے جن الفاظ میں دوسرے لوگوں سے ذکر کیا۔ ان کے متعلق حضرت تھانویؒ ذکرِ محمود میں لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت نے بعض الفاظ میری شان سے بہت ارفع فرمائے۔ اسلئے میں نے ان کو نقل نہیں کیا کہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک"۔

شاگرد کا اختلاف

مولانا کانگریس کے بہت بڑے حامی اور مؤید تھے۔ مگر آپ کے شاگرد رشید "سراپا فضل وکمال معدنِ حسنات وخیرات" استادِ محترم سے اس معاملہ میں سخت اختلاف رکھتے تھے یعنی مولانا کانگریس کے جتنے حامی تھے۔ یہ اتنے مخالف اور مخالفت کا بھی یہ عالم تھا کہ ایک طرف تمام اکابر دیوبند اور دوسری طرف تھانہ بھون کا یہ کیہ و تنہا درویش۔ چونکہ ان دونوں بزرگوں یعنی استاد و شاگرد کے درمیان رائے کا اختلاف بالکل اجتہادی قسم کا تھا اور محض اخلاص وللہیت پر مبنی تھا۔ جیسے آئمہ مجتہدین اور سلف صالحین میں شروع سے چلا آتا ہے اس لئے اس اختلاف کے باوجود استاد شاگرد کے ذاتی تعلقات میں قطعًا فرق نہ آیا جس پر ان کے ناداں دوستوں اور نافہم مخلصوں میں بڑی کشاکش رہتی تھی۔ حضرت تھانویؒ کے عقیدتمندوں کو تو اس معاملہ میں لب کشائی کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ مگر مولانا کے مخلصین ان سے اکثر شکایت کرتے رہتے تھے۔ اور مولانا حضرت کے حسن ظن کی تصدیق اور خدماتِ دینی کی تعریف فرما کر ان کو تاہ

نظروں کو اعتراضات سے روکتے تھے۔ ایک دفعہ تو ایک پانی پتی عالم سے یہاں تک کہہ دیا کہ:۔

”بھائی اپنی جماعت میں اختلاف تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لاؤ پھر میں ہی کسی قدر رائے کیوں نہ بدل دوں اور اس معاملہ میں ان (حضرت تھانویؒ) کی موافقت کر لوں۔ کیونکہ میرے اوپر کوئی وحی تو نازل ہوتی نہیں کہ میری رائے ٹھیک ہی ہو۔“

ایک اور موقعہ پر جب حضرت تھانویؒ مولانا کران اختلافات کے باوجود ملنے دیوبند تشریف لے گئے۔ تو اس موقعہ کو غنیمت جان کر مولانا کے ایک مخلص نے مولانا سے تحریک کی کہ یہ (حضرت تھانویؒ) اس وقت آئے ہوئے ہیں اگر امور اختلافیہ پر ان سے گفتگو فرمالیں تو شاید رائے متفق ہو جائے مولانا نے ارشاد فرمایا:۔

”نہیں مناسب نہیں۔ جو شخص اپنا لحاظ کرتا ہو۔ اس سے ایسی گفتگو کرنا مناسب نہیں۔ نیز گفتگو سے رائے نہیں بدلا کرتی۔ واقعات سے بدلا کرتی ہے۔“

ان اختلافات کے باوجود استاد شاگرد کے درمیان تعلقات بدستور قائم و دائم رہے اور مولانا اپنے شاگرد کو جب بھی خط لکھتے مخدوم۔ مکرم ایسے الفاظ سے خطاب کرتے جس پر حضرت تھانویؒ نے مولانا سے درخواست کی کہ ایسے الفاظ تحریر نہ فرمایا کریں ان سے خجالت ہوتی ہے گر مولانا نے ایسے ہی الفاظ تحریر فرمائے۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے پھر لکھا:۔

”میری درخواست منظور نہ ہونے سے معلوم ہوا کہ حضرت کو اسی میں راحت ہے گو مجھ کو کلفت ہے۔ گو میں حضرت کی راحت کو اپنی راحت پر مقدم سمجھتا ہوں۔ اب جو مرضی ہو اختیار فرمایا جاوے میں گوارا کروں گا۔“

شاگرد کے ادب اور استاد کی رعایت کی ایسی مثالیں صرف مردانِ حق میں ہی مل سکتی ہیں۔ اربابِ اغراض و نفسانیت سے ایسی توقع کہاں؟

مولانا سید احمد دہلویؒ یہ بھی آپ کے اساتذہ میں سے تھے۔ انہوں نے ریاضی کسی استاد سے نہیں پڑھی تھی۔ صرف اپنی خداداد فہم و فراست سے بطور خود ہی مطالعہ کر کے اس فن کو حاصل کیا تھا۔ اور ریاضیات میں بدرجہ کمال ماہر ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ دراس الاذکیا مولانا محمد یعقوبؒ ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ:۔

”خود اقلیدس بھی اگر ذہین ہوگا۔ تو بس اتنا ہی ہوگا۔ ان سے زیادہ نہ ہوگا۔“

دیگر اساتذہ ملا محمود مولانا عبد العلیؒ کا نام بھی حضرت اپنے اساتذہ کرام میں لیا کرتے تھے۔

قاری محمد عبداللہ مہاجر مکی ان سے آپ نے مکہ معظمہ میں قرآت کی مشق کی تھی۔ جو قرارِ عرب کے نزدیک نہایت جید۔ اور مسلّم ماہر فن قاری تھے اور امامِ فن مشہور آفاق تھے انہوں نے بھی اپنے شاگرد رشید میں کچھ ایسی غیر معمولی صلاحیتیں دیکھیں کہ زمانہ شاگردی میں ہی حضرت کو عملی تربیت دینے کے لئے اپنے مدرسہ کے طلبہ کو بعض رسائل قرآت کے چند اسباق پڑھانے پر مامور کر دیا۔ تاکہ کتب فن سے بھی مناسبت ہو جائے۔

اعزازِ دینی کی بشارت حضرت مولانا رفیع الدین رحمتہ اللہ علیہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی کے خلیفہ تھے اور حضرت شاہ صاحب مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہا اللہ تعالیٰ کے اساتذہ میں سے تھے۔ جن دنوں حضرت تھانوی دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان دنوں یہ اس کے مہتمم تھے وہ گو عالم نہ تھے۔ مگر بصیرت باطنی سے بہرہ ور اور پرلے درجہ کے منتظم تھے۔ ان کی حضرت پر خاص نظرِ عنایت تھی۔ ایک دفعہ حضرت تھانوی انہیں ملنے گئے تو وہ چارپائی پر کچھ اس انداز سے بیٹھے تھے کہ پائنتی کی طرف جگہ بالکل کم بچی ہوئی تھی۔ آپ غایت ادب کی وجہ سے پائنتی کی طرف بیٹھنے لگے تو مولانا نے ہاتھ پکڑ کر سرہانے کی طرف بٹھانا چاہا۔ حضرت عذر کرنے لگے تو فرمایا کہ اپنے بڑوں کا کہنا ماننا چاہیئے۔ جہاں وہ بٹھائیں وہیں بیٹھنا ادب ہے۔ اس پر حضرت طوعاً و کرہاً سرہانے بیٹھ گئے۔ اس موقعہ پر مولانا نے حضرت کو دارا شکوہ اور عالمگیر کی اس بزرگ سے ملاقات کا قصہ سنایا۔ جس کے پاس دونوں باری باری حصول تخت و تاج کی دعا کرانے گئے تھے۔ دارا شکوہ تو اس بزرگ کے اصرار کے باوجود ان کی مسند پر نہ بیٹھا اور غایت ادب کی وجہ سے نیچے بیٹھ گیا اور جب دعا کی درخواست کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے تو تمہیں تخت پر بٹھانا چاہا تھا۔ تم خود نہیں بیٹھے جس کا اسے ازحد افسوس ہوا۔ اور اس نے یہ واقعہ عالمگیر سے چھپایا۔ لیکن جب عالمگیر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بزرگ نے انہیں اپنی مسند پر بیٹھنے کو فرمایا۔ تو وہ فی الفور اس پر بہ تعمیل حکم بیٹھ گئے اور جب انہوں نے بھی تخت تاج کی درخواست کی۔ تو اس بزرگ نے فرمایا کہ تخت پر تو میں نے بٹھا دیا ہے۔ رہا تاج۔ وہ میرے اختیار میں نہیں۔ وہ تمہارے فلاں خادم کے اختیار میں ہے۔ گویا اس لطیف پیرایہ میں مہتمم صاحب نے حضرت کو اعزازِ دینی کی بشارت دی۔ جو اس دور میں سوائے حضرت کے اور کسی کو نصیب نہ ہوا۔ چونکہ اس صاحبِ فراست بزرگ نے تاڑ لیا تھا کہ یہ طالب علم تو پیدائشی صالح ہے۔ اس لئے وہ آپ کو بسا اوقات سفر میں بھی ساتھ رکھتے تھے۔ بلکہ اکثر آپ کو امام بنا کر خود پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ حضرت

نے سوءِ ادب سمجھا کہ ایسے بزرگ ان کے مقتدی ہوں۔ اس لئے عذر کر دیا۔ اور اصرار سے بچنے کے لئے دوسری مسجد میں نماز پڑھنی شروع کر دی۔

غرضیکہ جتنا صالح شاگرد تھا۔ اتنے ہی کامل اسے استاد ملے تھے۔

وجہِ احترام اگرچہ کاملین اپنے شاگردِ رشید کا صرف صالحیت کی بنا پر ہی اتنا ادب و احترام نہ کرتے تھے۔ بلکہ اس خصوصیت کی بنا پر کرتے تھے۔ جس کا ذکر باب "مجددیت" میں آئے گا ورنہ ان کے حلقۂ درس میں حضرت تھانوی کے ایسے ہم مکتب بھی شریک تھے۔ جو بعد میں اپنے علم و فضل اور زہد و تقوی کی بنا پر آسمانِ شہرت پر مہر و ماہ کی طرح چمکے۔ مگر ان کی طرف انہوں نے کبھی خصوصی توجہ نہ فرمائی تھی۔

درس و تدریس

فیض عام کا اہتمام کانپور میں سب سے قدیمی دینی مدرسہ "فیض عام" تھا۔ اس کے صدر مدرس مولانا احمد حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے جو اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء سے تھے۔ ماہر معقولات تھے اور طلباء میں بڑے مقبول و مشہور تھے۔ حق تعالیٰ کو چونکہ حضرت تھانویؒ کو اس مسندِ حسن پر بٹھانا منظور تھا۔ اس لئے اس مقلب القلوب نے مولانا احمد حسنؒ کے دل میں کوئی ایسی بات ڈال دی کہ وہ ناراض ہو کر اس مدرسہ سے چل دیئے اور اپنا الگ مدرسہ "دار العلوم" کے نام سے قائم کر لیا۔ ان کی شہرتِ علم و فضل کی وجہ سے کسی کو اس مسند پر بیٹھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور حضرت تھانویؒ کو ان حالات کا کوئی علم نہ تھا۔ چنانچہ جب وہاں سے ایک مدرس کی طلبی ہوئی۔ تو اخیر صفر ۱۳۰۱ھ میں آپ باجازت والد ماجد بارضاء اساتذہ کرام بادنا مل تشریف لے گئے۔ اور درس دینا شروع کر دیا۔ گویا مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو سب سے پہلے معلمی کا اعزاز بخشا گیا۔ جو سب پیشوں سے زیادہ معزز و محترم ہے۔

نورِ علم کا اثر حضرت تھانویؒ صرف زیورِ علم سے ہی آراستہ نہ تھے بلکہ جمالِ ظاہری اور کمالِ باطنی کے ساتھ جذبۂ خدمتِ دین اور زبانِ فیض ترجمان بھی رکھتے تھے جس کی وجہ سے بالکل نوجوان اور سبزہ آغاز ہونے کے باوجود آپ کی جملہ مدرسین اور اہل شہر میں بڑی شہرت ہو گئی۔ اور اتنے ہر دلعزیز ہو گئے کہ جن کی مسند پر کوئی بیٹھنے کی جرأت نہ کرتا تھا

وہی مولانا احمد حسنؒ بھی آپ سے بڑی محبت اور وقعت سے پیش آنے لگے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں آپ کی اور بھی قدر و منزلت بڑھ گئی۔

غیب سے ہمت افزائی پڑھنے اور پڑھانے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے اور ایسے استاد کے لئے جسے قبل ازیں معلمی کی تربیت حاصل نہ ہو۔ اسے متعلمی سے فوراً معلمی پر بٹھا دیا جائے اور اس کے سامنے پڑھانے کے لئے بڑی بڑی کتابیں رکھ دی جائیں۔ تو اس کا گھبرا جانا لازمی امر ہے۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ شروع شروع میں اس کام سے بہت گھبرائے کہ یا اللہ میں ان کتابوں کو کیونکر پڑھا سکوں گا۔ اسی گھبراہٹ کے عالم میں بارگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہوئے اور بمصداق اجابت از در حق بہر استقبال مے آید۔ دعا کے بعد جو پڑھانے بیٹھے تو بفضلہ تعالیٰ کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اور نہایت آسانی کے ساتھ پڑھاتے چلے گئے۔ اسکے علاوہ وقتاً فوقتاً غیب سے بھی آپ کی تسلی اور ہمت افزائی کا سامان ہوتا رہا۔ جیسا کہ آپ کے مندرجہ ذیل رؤیا صادقہ سے ظاہر ہے۔ جو خود حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں "الصدق الرؤیا" سے نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) "احقر نے جب حدیث کا درس شروع کیا۔ تو استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے اس طرح مشرف ہوا کہ میرے روبرو ایک جماعت صحیح بخاری پڑھنے والوں کی موجود ہے۔ اور ایک نسخہ بخاری کا میرے سامنے ہے جس کو میں دیکھ کر درس دیتا ہوں اور میرے برابر میں حضرت استاذی الممدوح تشریف رکھتے ہیں۔ اور غالباً آپ کے پاس بھی ایک بخاری شریف کا نسخہ ہے اور میں جو بیان کرتا ہوں۔ مولانا اس کی تقریر فرماتے ہیں۔ الخ

(۲) ایک مقام ہے۔ جیسے کانپور میں جناب عبدالرحمٰن خاں صاحب بانی مدرسہ جامع العلوم کانپور کا چھوٹا مطبع۔ وہاں کہ میں کے پاس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کھڑے ہیں اور میں قریب ہوں اس کے بعد مجھ کو مناسبت تفسیر کا ظن غالب ہو گیا۔"

غیرتِ دینی کا تقاضا حضرت تھانوی کو مدرسہ فیض عام میں کام کرتے ابھی تین چار ماہ ہی گزرے تھے۔ کہ آپ کی غیر معمولی قابلیت کے پیش نظر منتظمین مدرسہ نے چاہا کہ حضرت اپنے مواعظ میں مدرسہ کی امداد کے لئے چندہ کی تحریک بھی کیا کریں۔ اسے حضرت تھانویؒ نے غیرتِ دینی کے خلاف سمجھا۔ کہ مدرس درس دین بھی دے۔ وعظ بھی کرے اور اپنی تنخواہ کے لئے چندہ بھی جمع کرے۔ اسلئے آپ نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اراکین مدرسہ نے اس عدم

تحریک چندہ کی آپس میں بیٹھ کر کچھ شکایت کی۔ جس کی کسی نے حضرت کو بھی اطلاع کر دی۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ ”اگر چندہ ہی کے لئے وعظ کہنا ہے۔ تو میں چندہ اپنے ہی لئے کیوں نہ کروں یہ کام میرا نہیں ہے بلکہ خود اراکین مدرسہ کا ہے۔ میرا کام تو فقط پڑھانا ہے“۔ مگر اراکین مدرسہ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اس بات کا چرچا کرنے لگے۔ جو آپ کو سخت ناگوار گذرا۔ اور آپ نے استعفےٰ دے دیا۔ لجاجت انہوں نے معذرت کی لیکن حضرت نے اس بنا پر کہ یہ ناقدرے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے میرا نباہ مشکل ہوگا۔ وہاں رہنا منظور نہ فرمایا۔

اس سلسلہ میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ”وہ ذرا جوانی کے جوش و خروش کا زمانہ تھا۔ اور اصل وجہ تو یہ تھی کہ نوکری ہی میرے مزاج کے خلاف تھی۔ جب میں نے والد صاحب کو یہاں کی شکایت لکھی تو انہوں نے ان لوگوں کی سب باتوں کی توجیہات لکھ کر بھیجیں اور لکھا کہ ابھی وہیں رہو۔ علیحدگی اختیار کرنے میں عجلت مناسب نہیں۔ کیونکہ ہمیں تو نوکری مقصود ہی نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ ہم نے تو محض اس لئے تم کو اجازت دے دی تھی کہ اچھا ہے ابھی کتابیں تازہ ہیں۔ پڑھانے سے پختہ ہو جائیں گی۔ اگر تم نے نوکری چھوڑ دی۔ تو پھر پڑھانے کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائیگا اور سب پڑھا لکھا نسیاً منسیاً ہو جائیگا۔ کیونکہ بدوں پابندی کے تم پڑھاؤ گے نہیں۔ اور اگر مدرسہ میں رہو گے۔ تو پھر پابندی کرنی پڑے گی“۔

مگر چونکہ وہاں سے آپ کا دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ اس لئے مدرسہ فیض عام کا تعلق چھوڑ ہی دیا۔ اور واپسی وطن کا قصد فرما لیا۔

باعزت مراجعت

روانگی وطن سے قبل آپ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ کی زیارت کی غرض سے گنج مرادآباد تشریف لے گئے کہ مبادا پھر اس طرف آنا نہ ہو ——— وہ آپ کے ہم مشرب و ہم مسلک بزرگ نہ تھے۔ بلکہ نقشبندی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت تھانویؒ چشتی سلسلہ سے۔ چونکہ وہ قطب وقت تھے۔ اس لئے اس مرد حق کی ان کی زیارت ضروری سمجھی۔

اگرچہ جوہر ناشناس اراکین نے حضرت تھانویؒ جیسا گوہر بے بہا ہاتھ سے کھو دیا تھا۔ مگر اہل شہر آپ کے اخلاص فی الدین سے اتنے متاثر تھے۔ کہ ان سے یہ صدمۂ مفارقت برداشت نہ ہو سکا۔ اور انہوں نے حضرت تھانویؒ کو واپس لانے کی تجاویز سوچنی شروع کر دیں۔ معززین شہر میں سے عبدالرحمٰن خاں اور حاجی کفایت اللہ کو حضرت سے خاص محبت و عقیدت تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ چکے

تھے کہ شہر کے تمام مدرسوں میں معقولات پڑھائی جاتی ہے اور دینیات کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے اس لئے انہوں نے کانپور کے محلہ پٹکا پور کی جامع مسجد میں جدید مدرسہ کھولنے کا فیصلہ کیا۔ اور جو پچیس روپیہ ماہوار آپ مدرسہ فیض عام سے تنخواہ پاتے تھے۔ وہ ان دونو حضرات نے از گرہ خود ادا کرنے کا فیصلہ کیا کہ ایسے مولوی کہاں ملتے ہیں۔ ان کو یہاں سے جانے نہ دیا جائے۔

چنانچہ جب آپ گنج مراد آباد سے واپس کانپور تشریف لائے تو ان دونو حضرات نے آپ کو باصرار روک لیا۔ اور آپ نے بھی ان کے اخلاص اور والد ماجد کے ارشاد کے پیش نظر اس مسجد میں بیٹھ کر درس دینا منظور کر لیا۔ اور اس مسجد میں "جامع العلوم" کے نام سے جدید مدرسہ قائم کر لیا جو جامع دینیات و معقولات تھا۔ شروع شروع میں طلبہ کو آپ سے پڑھتے ہوئے شرم آتی تھی کیونکہ آپ ابھی بالکل نوعمر اور سبزہ آغاز تھے۔ جس کی وجہ سے کئی سال تک طلبہ کی تعداد کم رہی اور جب ڈاڑھی بڑھی تو طلبا کی تعداد بھی زیادہ ہونے لگی۔

اگرچہ حضرت کی تنخواہ ان حضرات نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ مگر بعد ازاں چندہ بھی ہونے لگا لیکن حضرت نے کبھی اپنی طرف سے چندہ کی تحریک نہ کی۔

للّٰہیّت کا اثر

حضرت تھانوی شروع سے ہی اخلاص و ایثار کے مجسمہ تھے۔ ایک طرف نوکری کرنا خلاف طبع تھا دوسری طرف تنخواہ لے کر اللہ کا کام کرنا درست خیال نہ کرتے تھے۔ حالانکہ اس کے جواز میں متاخرین کا فتویٰ موجود تھا۔ مگر تقویٰ کا تقاضا یہ تھا کہ اگر دین پڑھانا ہے تو لوجہ اللہ پڑھایا جائے۔ اسلئے آپ نے دہلی جا کر حکیم عبدالمجید خاں مرحوم دہلوی کے مطب میں طب کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ درس تدریس کے ساتھ مطب کا سلسلہ شروع کر کے بسر اوقات کی جائے۔ مگر وہاں جانے سے قبل آپ نے والد ماجد سے اجازت چاہی اور انہوں نے آپ کی تحریک پر بخوشی اجازت دے دی۔ بلکہ اپنے اس فرزند ارجمند کی سعادت مندی سے متاثر ہو کر اپنے ایک گاؤں گدائے کھیڑہ کی آمدنی آپ کے اخراجات کے لئے مقرر کر دی تاکہ آپ معاشی بے فکری سے باطمینان خدمتِ دین کا فریضہ انجام دے سکیں۔

طب کی تعلیم

چنانچہ آپ لوجہ اللہ تعلیم دین کے شوق سے سرشار ہو کر کانپور سے دہلی پہنچے اور حکیم عبدالمجید خاں دہلوی سے تعلیم طب حاصل کرنی شروع کر دی۔ حکیم صاحب صاحبِ ثروت و امارت ہونے کی وجہ سے بڑے مستغنی المزاج تھے۔ مگر اتنے بڑے اور مشہور آدمی ہونے کے باوجود حضرت کے اخلاق و آداب سے متاثر ہو کر آپ پر بڑی شفقت و عنایت

کرنے لگے۔ ادھر اہل کانپور آپ کی جدائی میں پھر بے تاب ہونے لگے اور ارباب مدرسہ آپ کی خدمت میں وہاں پہنچے۔ اور مدرسہ کی اہمیت کا واسطہ دے کر واپسی کے لئے بڑی منت سماجت کی۔ آپ کے دیوبند کے ہم سبق حکیم مولوی جمیل الدین غازی پوری نے بھی آپ کو مشورہ دیا کہ:۔

"طب کا مشغلہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے۔ کیونکہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مطلب سے دین اور علم دین کی خدمت ہرگز نہیں کی جا سکتی۔"

اس پر آپ نے مخلصین و محبین کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے واپسی کا قصد تو کر لیا۔ مگر آمدن بہ ارادت رفتن بہ اجازت کے تحت اور حکیم صاحب کی حد سے بڑھی ہوئی محبت و شفقت کے پیش نظر خود بخود پڑھائی چھوڑنے کو خلاف مروت و تہذیب سمجھا۔ اور جو بلانے آتے تھے ان سے فرمایا کہ اگر حکیم صاحب اجازت دے دیں تو میں چلنے کو تیار ہوں۔ انہوں نے اس بارہ میں حکیم صاحب سے درخواست کی۔ حکیم صاحب نے باولِ ناخواستہ ان الفاظ میں اجازت دیدی کہ:۔

"خیر! اگر اپنی ترقی کرنا نہیں چاہتے۔ تو اختیار ہے۔ چلے جائیں۔"

چنانچہ چند روزہ طب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کانپور واپس تشریف لاکر درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ اور مسلمانان کانپور خوشی سے پھولے نہ سماتے جیسے ان کے اجڑے چمن میں پھر سے بہار آگئی۔

مسرتِ مرشد اس امر کی اطلاع جب آپ کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ العزیز کو پہنچی تو انہوں نے اس بازگشت پر ان الفاظ میں اظہار مسرت فرمایا:۔

"طبابت کے شغل کو ترک کر کے آپ کے کانپور تشریف لاکر دینیات کے شغل کا حال معلوم ہوا بہت خوشی ہوئی۔ اللہ جل جلالہ آپ کی خدمت میں برکت دے اور آپ کے برکات و فیض سے تمام مسلمانوں کو مستفیض و مستفید کرے۔ میں نے قبل ہی آپ کو مشورہ دیا تھا کہ دین کو خوب مضبوط پکڑنا چاہیئے۔ دنیا خود ہی اچھی صورت میں خدمت کو حاضر رہے گی۔ بہرکیف آپ لوگ علماء ورثۃ الانبیاء ہیں آپ لوگوں کو اللہ تعالےٰ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے پیدا کر کے بڑے درجے عنایت کئے ہیں پس اپنے مقصود کا خیال سب پر مقدم رکھنا چاہیئے۔" (مکتوب امدادیہ ص۳)

اس کے بعد آپ نے اطمینان سے اپنا کام شروع کر دیا اور پورے چودہ سال وہاں درس و تدریس میں مشغول رہے۔

طریقۂ تعلیم کی نفاست

حضرت تھانوی کا طرزِ تعلیم اتنا سلیس نفیس اور سہل تھا کہ جو طالب علم دو چار سبق بھی حضرت سے پڑھ لیتا تھا۔ پھر اس کی کسی اور استاد سے تسلی نہ ہوتی تھی۔ اس کی وجہ حضرت کے خود اپنے اس بیان سے ظاہر ہے کہ:-

"میں جب پڑھاتا تھا۔ تو اپنے اوپر بہت تعب برداشت کر کے پہلے سے سبق کی تقریر کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا۔ پھر پڑھاتا تھا۔ اسلئے میری ساری تقریر نہایت سہل اور با ترتیب ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے مشکل سے مشکل مضامین بھی طالب علموں کے لئے بالکل پانی ہو جاتے تھے اور بآسانی ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ گو مجھ کو تو سہل کر کے تقریر کرنے میں بہت تعب ہوتا تھا لیکن طلباء کو کسی مقام کے سمجھنے میں ذرا الجھن نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ صدرا میں ایک مشہور مقام ہے۔ تناۃ بالتکریر جو بہت ہی مشکل سمجھا جاتا ہے۔ جب کتاب میں وہ مقام آیا تو میں نے قبل اس کے کہ طلبا کو اس مقام کی اطلاع دوں۔ اس کے مضمون کی ایک سلیس تقریر کر دی۔ لیکن یہ نہ معلوم ہونے دیا کہ یہ تقریر کس مشکل مقام کی ہے بلکہ یوں ہی سرسری طور پر تقریر کر دی۔ چونکہ میں نے بہت ہی سہل کر کے تقریر کی تھی طلبا کی سمجھ میں خوب اچھی طرح آ گئی۔ اور جب انہوں نے اس کا اقرار کر لیا۔ تب میں نے کہا کہ یہ تو وہی مقام تھا جس کو تناۃ بالتکریر کہتے ہیں۔ تو یہ سنتے ہی وہ چونکنے ہوئے۔ میں نے کہا کہ بس بس اب نہ ڈرو۔ اب تو پار ہو گئے۔ میں نے پھر پوچھا کہ بتاؤ یہ بھی کوئی مشکل مقام تھا۔ انہوں نے کہا۔ ہم کو تو طلبا نے اس سے بہت ہی ڈرا رکھا تھا لیکن یہ تو کچھ بھی مشکل نہ تھا۔

مقام تو واقعی مشکل تھا۔ لیکن میں نے اس کی تقریر ایسی بے فکری اور سلاست سے کی کہ نہایت سہولت کے ساتھ ان کی سمجھ میں آ گئی۔ البتہ مجھ کو سہل کر کے بیان کرنے میں بہت تعب اٹھانا پڑا۔ کیونکہ دوسروں کا بوجھ میں نے اپنے اوپر لے لیا۔

میں پڑھانے میں ہمیشہ یہی کرتا تھا۔ آج کل کے اساتذہ اپنے اوپر ذرا مشقت نہیں ڈالنا چاہتے۔ بات یہ ہے کہ شفقت نہیں رہی محض ضابطہ پوری رہ گئی ہے۔

میں نے پڑھاتے وقت ضرورت سے زائد کبھی تقریر نہیں کی۔ صرف حل کتاب پر اکتفا کیا۔ زوائد سے طالب علموں کا کبھی وقت ضائع نہ کیا۔ اور میں اس کی تاکید اپنے ماتحت مدرسین پر بھی رکھتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی، جا کر ان کے پڑھانے کی جانچ بھی کیا کرتا تھا۔

اساتذہ زیادہ تر اپنی قابلیت کے اظہار کے لئے نکات و دقائق کی تقریر کیا کرتے ہیں جن سے کتاب کے اصل مطلب میں بھی خلط ہو جاتا ہے۔ بعض یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جب تک اس قسم کی

تقریریں نہ کی جائیں۔ اُستاد کی مہارت کے متعلق طلبہ کی تسلی نہیں ہوتی۔ لیکن طلبہ کی یہ تسلی دیکھنی چاہیے یا ان کا نفع۔ ان کا نفع تو اس میں ہے کہ اصل کتاب کو اچھی طرح حل کر دیا جائے۔ کیونکہ استعداد اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جب استعداد پیدا ہو جائے گی۔ تو پھر نکات و دقائق خود ہی سمجھ میں آنے لگیں گے۔ لہٰذا استاد کا اصل مطمح نظر یہی ہونا چاہیے۔

یہ جو نئے نئے طریقے ہفتہ وار مشق تقریر و مناظرہ کے نکلے ہیں۔ ان کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ مضر ہیں۔ اسلئے کہ ہفتہ بھر تک بجائے اسباق کی طرف متوجہ رہنے کے اسی کی تیاری میں رہتے ہیں اول تو اس قسم کی مشق کرانے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ جب کتابیں خوب اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں گی۔ تو تقریر و تحریر و مناظرہ سب کی استعداد خود بخود ہی پیدا ہو جائے گی اور اگر ایسا ہی شوق ہے۔ تو جو طالب علم جو کتاب پڑھ رہا ہو۔ اسی کے متعلق اس سے تقریر کرائی جایا کرے۔ اس سے تقریر کی مشق بھی ہو جائے گی۔ اور حرج بھی نہ ہوگا۔ بلکہ کتابیں اور پختہ ہو جائیں گی"

طلباء کو ہدایت

حضرت تھانوی طلبہ کو اپنے تجربہ کی بنا پر ہدایت فرماتے تھے کہ تم تین باتوں کا التزام کر لو۔ پھر میں ٹھیکہ لیتا ہوں اور ذمہ دار ہوتا ہوں کہ تمہیں استعداد علمی حاصل ہو جائے گی۔

(۱) جو سبق پڑھنا ہو اس کا مطالعہ ضرور کر لیا جائے اور مطالعہ کوئی مشکل کام نہیں ہے کیونکہ مطالعہ کا مقصود صرف یہ ہے کہ معلومات اور مجہولات متمیز ہو جائیں۔ بس اس سے زیادہ کاوش نہ کرے۔

(۲) سبق کو استاد سے اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لے۔ بلا سوچے سمجھے آگے نہ بڑھے۔ اور اگر اس وقت استاد کی طبیعت حاضر نہ ہو۔ تو کسی دوسرے وقت سمجھ لے۔

(۳) اس کے بعد ایک بار خود بھی مطلب کی تقریر کرے۔

بس پھر ان تینوں التزامات کے بعد بے فکر رہے چاہے یاد رہے یا نہ رہے۔ انشاء اللہ استعداد ضرور پیدا ہو جائے گی۔

یہ تینوں باتیں تو درجہ وجوب میں ہیں اور ایک بات درجہ استحباب میں ہے وہ یہ کہ کچھ آموختہ بھی روزانہ دہرا لیا کرے۔

اساتذہ بزمرہ طلبا

حضرت تھانوی فن درس و تدریس میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور علوم ظاہریہ میں مہارت تامہ کا نتیجہ تھا کہ مسند ارشاد پر بیٹھنے کے بعد اکثر طلبا بلکہ اساتذہ چٹیوں میں تھانہ

بھون پہنچ جاتے تھے۔ کیونکہ حضرت وہاں بھی اکثر مضامین طلبہ کے کام کے بیان فرماتے تھے اور ایسے ایسے نکات و دقائق علمیہ بیان فرماتے تھے۔ جن سے اساتذہ کی مشکلیں آسان ہو جاتی تھیں۔ تعطیلات کے ایام میں علماء و اساتذہ کی تھانہ بھون کو روانگی دیکھ کر بعض نا فہم لوگ استادوں سے سوال کیا کرتے تھے کہ :-

"تم تعطیلات میں تھانہ بھون کیوں جایا کرتے ہو یہیں رہ کر مطالعہ کتب کیوں نہیں کیا کرتے۔ جس سے تمہاری معلومات علمیہ بڑھیں"۔

یہ سوال خود ہمارے مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ــــ سے بھی ہوا اور انہوں نے اسے من و عن حضرت سے نقل فرما دیا۔ اس پر حضرت نے سوال کیا کہ :-

"منافع باطنیہ تو خیر رہنے دیجئے۔ یہ بتایئے کہ یہاں کے تعلق کے بعد کتابوں کے پڑھانے میں بھی آپ کو بہ نسبت پہلے کے کچھ اعانت ہوئی"

جس کا جواب مفتی صاحب نے یہ دیا۔

"حضرت بہت زیادہ اعانت ہوئی اور کھلا فرق محسوس ہوتا ہے"۔

اس پر حضرت فرمانے لگے کہ ایسے لوگوں کو بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ :-

"میں وہاں بھی مطالعہ ہی کے لئے جایا کرتا ہوں"۔

ایک مفید دستور العمل دنیوی مدارس کی طرح دینی مدارس میں بھی طلباء کو بعد فراغت درس سندات فراغ دی جاتی تھیں۔ مگر عام دستور یہ تھا کہ جو طالب علم بوجہ عدم مناسبت یا عدم دلچسپی یا قلت کی بنا پر معقولات نہ پڑھے لیکن دینیات کی تمام کتابیں پڑھ چکا ہو۔ اسے سند فراغ نہ دی جاتی تھی۔ حضرت تھانوی نے اس دستور کو نا واجب قرار دیتے ہوئے یوں بدل دیا کہ سند فراغ میں انھوں نے لفظ درسیات کے ساتھ لفظ دینیات کا بھی اضافہ فرما دیا۔ وہ ان لفظوں کے لئے سند مطبوعہ میں جگہ چھوڑ دیتے تھے۔ جو طلبا فارغ دینیات ہوتے ان کیلئے سند میں لفظ دینیات لکھ دیا جاتا۔ اور جو فارغ درسیات ہوتے ان کے لئے لفظ درسیات لکھ دیا جاتا۔ ویسے دونوں کی سند یکساں تھی۔

علاوہ ازیں اس زمانہ میں نہ صرف فارغین حدیث کو سند کے ساتھ دستار دی جاتی تھی۔ بلکہ ہر قسم کے فارغین کو دستار ضرور دی جاتی تھی۔ جس پر ریشم سے طالب علم کا نام مع مدرسہ و سن کے لکھا ہوا ہوتا تھا۔ مگر حافظوں اور ناظرہ خوانوں کو اس سے محروم رکھا جاتا تھا۔ حضرت تھانویؒ نے اس

دستور ہیں بھی اصلاح کی غرض سے فرمایا کہ :-
"جب فارغین حدیث کو دستار دی جاتی ہے ۔ تو فارغین قرآن کو کیوں نہ دی جائے"
بس پھر فارغین قرآن کو بھی دستار ملنے لگی ۔
اس طرح آپ نے پہلی مرتبہ مستحق طلبار کی حق رسی فرمائی اور قدیم دستور کو جس سے بعض طلبا کی حق تلفی ہوتی تھی ۔ اس طرح بدلا کہ اس کی نوعیت میں کوئی فرق نہ آیا ۔ مگر نتیجہ پہلے سے بہتر نکلا اور یہی ایک مجدد کا کام ہوتا ہے کہ وہ کام کی نوعیت کو بدلے بغیر درمیان سے مفسدہ کو نکال دیتا ہے ۔

معقولات کی اہمیت طلبار کے مفاد کے لئے حضرت تھانوی اس بات کے زیادہ خواہاں تھے کہ وہ معقولات میں ضرور مناسبت پیدا کرلیں ۔ کیونکہ آپکا خیال تھا کہ :-
"اگر منطق کی ایک کتاب بھی سمجھ سے پڑھ لی جائے ۔ تو پھر کسی دوسری کتاب کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور منطق سے پوری مناسبت پیدا ہو جاتی ہے"
اس لئے ترک تدریس کے بعد قیام تھانہ بھون میں بھی حضرت کا یہ معمول رہا کہ اپنے خاص تعلق والوں کو منطق کی کم از کم ابتدائی کتاب خود پڑھا دیتے تھے ۔ جس سے ان کو منطق سے پوری مناسبت پیدا ہو جاتی تھی ۔ پھر وہ دوسری کتابوں میں کہیں نہ رکتے تھے ۔

کم فرصت طلبا کا نصاب اسی طرح آپ نے کم فرصت طلبار کے لئے ایک خاص نصاب بعنوان "ضمان التکمیل فی زمان التعجیل" مرتب فرمایا تھا ۔ جس کے لئے دس نئی کتابیں بھی تصنیف کرنی پڑیں ۔ جن کے مجموعہ کا نام "تلخیصات عشر" ہے ۔ اور اس کے مفید ہونے کا تجربہ حضرت نے دوسرے طلبار کی بجائے خود اپنے اعزہ کو اس کے مطابق تعلیم دے کر کرلیا تھا کیونکہ یہاں بھی یہی احتیاط لاحق تھی کہ اگر یہ تجربہ ناکام ثابت ہوتو اپنوں کا وقت ضائع ہو ۔ دوسروں کا ضائع نہ ہو ۔ حالانکہ اس میں وقت کے ضائع ہونے کی کوئی بات ہی نہ تھی ۔ آخر علم میں کچھ نہ کچھ تو اضافہ ہوتا ۔

اعتراف محبت حضرت تھانوی صفر ۱۳۰۱ھ میں کانپور تشریف لائے اور آخر صفر ۱۳۱۵ھ تک یعنی پورے چودہ سال اہل کانپور کی خدمت دینی بذریعہ درس و تدریس مواعظ و تصانیف اور ارشاد و تلقین انجام دیتے رہے ۔ جہاں حضرت کی محبت و عقیدت نہ صرف

انہوں بلکہ مخالفوں کے دلوں میں راسخ ہو چکی تھی۔ وہاں اس محبت کے اثر سے آپ اپنے وطن عزیز یعنی تھانہ بھون کو بھی بھول بیٹھے تھے۔ فرماتے تھے کہ:۔

"کانپور والوں نے میرے ساتھ ایسی محبت اور تعظیم و تکریم کا برتاؤ کیا کہ میں اپنے وطن کو بھی بھول گیا۔ اور جتنا وہاں جی لگتا تھا۔ اپنے وطن میں بھی نہ لگتا۔ اتنی محبت تھی کہ میں نے اپنے برتنوں پر بھی بجائے اپنے نام کے لفظ "کانپور" کھدوایا تھا۔ اب بھی جو ان برتنوں کو دیکھ لیتا ہوں تو کانپور یاد آجاتا ہے۔ اگر حضرت حاجی صاحب کا ایما نہ ہوتا۔ تو میں عمر بھر بھی کانپور کو نہ چھوڑتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری جو اتنی شہرت ہوئی۔ تو وہ کانپور والوں ہی کی بدولت ہوئی۔ ورنہ میں واقعی اس درجہ کا شخص ہرگز نہ تھا۔ اور نہ اب ہوں مجھے اب بھی کانپور والوں سے بہت محبت ہے اور میں ان کا بہت ممنون ہوں۔ کچھ منجانب اللہ ان کے قلوب میں عام طور سے میرے ساتھ ایسی محبت ہو گئی تھی کہ اختلاف مشرب بھی اس سے مانع نہ رہا تھا۔"

شاگردانِ رشید

فیض یافتگان کی تعداد حضرت تھانوی کے چودہ سالہ قیام کانپور کے زمانہ میں "جامع العلوم" کے چشمہ علم سے کس قدر تشنگان علم نے اپنی پیاس بجھائی۔ اس کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں ہو سکی۔ مگر ان کی تعداد کثیر ضرور تھی۔ صاحب اشرف السوانح نے حضرت تھانوی کی صدر مدرسی کے زمانہ کے کاغذات سے مرتب کردہ فہرست کی رو سے ایسے ۴۵ طلباء کے نام دیئے ہیں جنھوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی سلسلۂ فیض علم جاری رکھا۔ اور نورِ علم پھیلاتے رہے ان میں سے جو آسمانِ علم پر روشن ستاروں کی طرح چمکے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:۔

روشن ستارے ۱۔ مولانا محمد اسحٰق بردوانی۔ بڑے صاحب حافظہ اور جید عالم تھے۔ چھ ماہ کے اندر پورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور طالب علمی کے زمانہ میں ہی نحو کی مشہور کتاب کافیہ پوری حفظ کر لی تھی۔ حضرت تھانوی کے ترک تدریس کے بعد مولانا ہی حضرت کے جانشین اور مدرس اول مقرر ہوئے۔ اور بالکل حضرت کی طرح حسن انتظام رکھا۔ ایک عرصہ کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ (یونیورسٹی) میں مدرس دینیات ہو گئے اور وہاں سے مدرسہ عالیہ ڈھاکہ میں منتقل ہو کر قریباً پانچ

سو روپیہ مشاہرہ پر پہنچ کر پنشن پائی۔ اس کے بعد آپ لوجہ اللہ علوم دینیہ پڑھاتے رہے۔ طریق باطن میں حضرت تھانوی ؒ نے انہیں اپنا خلیفہ مجاز بھی بنا دیا تھا۔

۲۔ **مولانا محمد رشید کانپوری۔** بڑے ذہین و ذکی۔ خوش فہم، خوش اخلاق اور متواضع عالم تھے۔ حضرت کے سامنے ہی مدرس ہو گئے تھے۔ اور پھر مدرس دوم لگ گئے تھے۔ علم فقہ سے مناسبت کے سبب افتاء کا کام انہیں کے سپرد تھا۔ جو بڑی خوبی سے انجام دیتے رہے بالآخر ترقی کر کے مدرسہ عالیہ کلکتہ جا پہنچے۔

۳۔ **مولانا احمد علی فتحپوری۔** جامع علوم ظاہری و باطنی اور بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ فقہ سے بڑی مناسبت رکھتے تھے۔ حضرت کے پہلے خلیفہ مجاز تھے۔ بہشتی زیور کے پہلے پانچ حصے انہوں نے حضرت کے ارشاد پر مرتب کئے۔ جن سے اب تک ہزاروں مسلمان فیض یاب ہو رہے ہیں یہ اپنے قصبہ فتح پور اور بارہ بنکی ہی علم دین پڑھاتے تھے۔

۴۔ **مولانا صادق الیقین کرسوی۔** نہایت لطیف الطبع۔ ذہین و ذکی الحس عالم باعمل اور متقی تھے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ بدعات و رسومات سے اتنے نفور تھے۔ کہ مولود شریف کے مسئلہ پر اپنے والد ماجد سے سخت اختلاف بلکہ کشیدگی پیدا کر لی تھی۔ جسے بعد میں حضرت تھانوی ؒ نے حسن تدبیر سے اس طرح سلجھایا کہ ان کے والد ماجد کو وہ رسم ہی ترک کرنی پڑی جس پر ان کی آپس میں صلح ہو گئی۔ قلت طعام و قلت منام کا بہت اہتمام تھا جس کی وجہ سے ضعیف الجثہ ہو گئے تھے۔

۵۔ **مولانا فضل حق بارہ بنکی۔** یہ حضرت کے تلامذہ میں سب سے پہلے فارغ التحصیل تھے نہایت قابل عالم تھے۔ علم فلسفہ سے بڑی مناسبت رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے مشکل ترین مقام "قضاۃ بازنگریز" کی امتحان میں ایسی اچھی تقریر لکھی کہ وہ بطور یادگار مدرسہ میں محفوظ رکھی گئی۔ آپ کافی عرصہ قنوج میں شمع علم جلاتے رہے۔

۶۔ **مولانا شاہ لطف الرسول بارہ بنکی۔** نہایت ذہین و ذکی۔ فہیم و عاقل ذی استعداد عالم اور نہایت ذی الحال ذاکر و شاغل درویش تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ سے بذریعہ خط بیعت ہوئے مگر تعلیم حضرت تھانوی سے پا کر ان کے خلیفہ مجاز ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ خشیت کا بڑا غلبہ رہتا تھا۔ صاحب کشف بھی تھے۔ تیز طبع ہونے کے باوجود متواضع تھے۔ حضرت کے مشہور رسالہ "قصد السبیل الی مولی الجلیل" کی آپ نے ہی تسہیل کی تھی۔ اور حضرت کے واقف کردہ قبرستان

میں بھی سب سے پہلے انہوں نے ہی جگہ پائی تھی۔

۷۔ **مولانا حکیم محمد مصطفےٰ بجنوری۔** ادب عربی اور معقولات کے بڑے ماہر تھے۔ حضرت کی تقریر کے نوٹ عربی میں بطور مختصر نویس لیا کرتے تھے۔ پھر اردو میں پھیلا دیتے تھے اس طرح انہوں نے بے شمار وعظ قلمبند فرمائے۔ مناجات مقبول کے عربی حصہ کا اردو ترجمہ۔ حضرت کی مشہور تصنیف "الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ" (جواب اسلام اور عقلیات کے نام سے شائع ہوئی) کی نفیس شرح۔ حضرت کے رسالہ "شوق وطن" کی تسہیل بہشتی زیور کے حصہ نہم اور بہشتی گوہر میں مندرجہ مجربات معلومات اشرفیہ۔ مجالس الحکمت۔ امثال عبرت وغیرہ تصنیفات سب ان کی قلمکاری کا نتیجہ ہیں۔ تقویٰ کا اتنا اہتمام تھا کہ حج کے موقعہ پر نماز کے وقت آپ نے موٹر ڈرائیور کو موٹر روکنے کے لئے کہا۔ مگر اس نے نہ روکی اس پر موٹر سے کودنے پر آمادہ ہوئے کہ معاً موٹر میں کوئی نقص واقع ہو گیا جس کی وجہ سے موٹر خود بخود رک گئی اور انہوں نے بروقت نماز باجماعت پڑھائی۔ صرف عالم۔ حافظ۔ متقی۔ مخیر۔ مصنف اور حضرت کے خلیفہ مجاز ہی نہ تھے۔ بلکہ بڑے پایہ کے حکیم بھی تھے کشش تحریر سے اخلاق و مزاج کی کیفیت معلوم کر لیتے تھے اور قارورہ دیکھتے ہی تاڑ لیتے تھے کہ یہ فاسق کا ہے یا متقی کا۔

۸۔ **مولانا سید اسحٰق علی کانپوری۔** بڑے سلیم الفطرت متواضع۔ صاحب نسبت بزرگ اور حضرت کے خلیفہ مجاز تھے۔ اور نہایت قابل و ذی استعداد اساتذہ میں سے تھے کافی عرصہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔

۹۔ **مولانا مظہر الحق راموی (چاٹگام)** بڑے ادیب۔ نظم و نثر عربی فارسی میں قادر تھے اور بنگال کے مشاہیر علماء میں شمار ہوتے تھے۔

۱۰۔ **مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہ۔** حضرت کے خواہرزادہ اور بڑے صاحب فہم و فراست عالم ہیں۔ مشاہیر علما میں ان کا شمار ہے۔ پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ دینیات رہے۔ اب دار العلوم ٹنڈو الٰہ یار ضلع حیدرآباد سندھ میں شیخ الحدیث ہیں۔ "اعلاء السنن" کا دقیق علمی کام حضرت نے اعتماد کلی کی وجہ سے ان ہی کے ذریعہ مکمل کرایا اور اس کام سے بہت مسرور ہوئے۔ یہ گیارہ جلدیں ان کی فقہ و حدیث میں مہارت تامہ و نظر دقیق کی مظہر ہیں۔ جنگ پاکستان میں یہ قائد اعظم کے خصوصی معاون رہے۔ سلہٹ کے ریفرنڈم میں ان کی سعی بارآور ہوئیں جن پر قائد اعظم نے مسرت کا اظہار فرمایا۔

شاگردوں سے انس استاد و شاگرد کا تعلق باپ بیٹے کا سا ہوتا ہے اور اس تعلق کی مضبوطی

ادب و اطاعت پر منحصر ہوتی ہے جس سے استاد کی شفقت و محبت بڑھتی ہے۔ حضرت تھانوی کو اپنے مریدوں سے اپنے شاگرد زیادہ عزیز تھے۔ اور ان سے خود بھی بڑی ہی محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ اور ان کا دوسروں سے بھی اعزاز و احترام کراتے تھے۔ کسی کو ان کی طرف بری نظر سے نہ دیکھنے دیتے تھے۔ کسی سے گھر کا کام نہ خود کراتے تھے نہ کسی دوسرے کو ان سے کام لینے دیتے تھے۔ نہ کسی کو کسی کے گھر سے جا کر کھانا لینے دیتے تھے اور نہ انہیں محتاجوں یا فقیروں کی طرح دعوتوں میں جانے دیتے تھے۔ غرضیکہ ہر طرح ان کا عزو وقار بڑھاتے رہتے تھے۔ اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

"جتنا تعلق مجھ کو اپنے شاگردوں سے ہے اتنا معتقدین سے نہیں۔ کیونکہ معتقدین سے اتنی طبیعت نہیں کھلتی جتنی شاگردوں سے کھلی ہوئی اور بے تکلف ہوتی ہے"

اور یہ اسی حقیقت کا اثر تھا کہ طلبار کو بھی حضرت سے بدرجہ عشق محبت تھی۔

صحبتِ بزرگاں

صحبت کا اثر عقل پرستوں کے ماہرین تعلیم و نفسیات کو تو یہ راز اب معلوم ہوا کہ محض تحریر و تقریر سے ذہنیتیں نہیں بدل سکتیں۔ تا وقتیکہ اس غرض کے لئے خاص ماحول یا تربیت گاہیں پیدا نہ کی جائیں۔ جن میں کچھ عرصہ کے لئے طلبار الگ تھلگ رہ کر ایک مشترک زاویہ نگاہ کے ماتحت زندگی بسر کرنا سیکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے ہر نظامِ تعلیم میں ایک تربیتی نظام کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے مگر شمعِ نبوت کے پروانے اس راز کو روزِ اول سے ہی پا گئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ زیادہ تر اپنا وقت مجلس نبوی میں گذار کر تعلیمات اسلام کی عملی تربیت حاصل کرتے رہتے تھے۔ بلکہ اصحابِ صفہ تو اسی غرض کے لئے وہاں مستقل طور پر رہنے لگے تھے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ صحبتِ نبوی سے فیض یاب ہو سکیں اور تب سے ہی بزرگوں کی صحبت حاصل کرنے کی بنیاد پڑی۔ کیونکہ علم و معرفت کے جو اسرار و اسباق اس سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ وہ اوراق سے ممکن نہیں۔ اور جو منازل محض بزرگوں کی نظر و توجہ سے دنوں میں طے کی جا سکتی ہیں۔ وہ مجاہدات و ریاضات سے برسوں میں بھی طے ہونی محال ہیں۔

حضرت تھانوی بھی اپنی کامیابی کا راز اس صحبتِ بزرگاں کو ہی بتاتے تھے۔ کہ:

"نہ کبھی طالب علمی میں میں نے محنت کی۔ نہ اس طریق میں کبھی مجاہدات و ریاضات کئے۔ جو

کچھ اللہ تعالےٰ نے عطا فرمایا۔ وہ سب اپنے حضرات اساتذہ و مشائخ کی دعا و توجہ اور میری طرف سے غایت درجہ ادب و عقیدت کا ثمرہ ہے۔ مَیں نے کبھی کسی بزرگ کو ایک منٹ کے لئے بھی مکدر نہیں کیا۔"

صالحین سے محبت آپ کو بچپن سے ہی اہل اللہ سے بڑی محبت و عقیدت تھی۔ کتب بینی کا گو بہت زیادہ ذوق نہ تھا۔ مگر بزرگوں کے تذکرے بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے ․․․ "طبقات الکبریٰ" جو بزرگوں کے احوال و اقوال پر مشتمل ہے۔ اکثر زیر مطالعہ رہتی تھی۔ قلت فرصت کے باوجود عصر کے بعد قبل مغرب تک جبکہ حروف بھی بمشکل نظر آتے تھے۔ وقت نکال کر ایسی کتابیں پڑھا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ ان سے انتخاب بھی کرتے جاتے تھے۔ جو بعد ازاں "نزہتہ البساتین" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جو ایک ہزار حکایات پر مشتمل ہے۔

بزرگوں کے تذکرے آپ مجلس میں اکثر و بیشتر بڑے جوش و خروش سے بزرگوں کے تذکرے سنایا کرتے تھے۔ جو سننے والوں کے دلوں میں مشائخ و صوفیاء اور علماء و فقہا کی محبت پیدا کر دیتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"یہ حضرات اہل سکر تھے۔ ان کے تذکروں میں بھی یہ اثر ہے کہ سکر کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان بزرگوں کے ناموں سے بھی روح میں تازگی اور قلب میں ایک نور پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ حضرات عشاق تھے۔ ممکن نہیں کہ ان کے حالات پڑھے جائیں اور قلب میں محبت الٰہی پیدا نہ ہو۔"

بزرگوں کی غائبانہ توجہ اولیاء اللہ سے والہانہ محبت و عقیدت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی غائبانہ طور پر آپ سے محبت و شفقت کرنے لگے جس کی تائید ان واقعات سے ہوتی ہے۔

(۱) حضرت مولانا خلیل احمد رحمتہ اللہ علیہ جو بہت بزرگ تھے۔ فرماتے تھے کہ مجھ کو تم سے اس وقت سے محبت ہے۔ جس وقت اس کو خبر بھی نہ تھی۔

(۲) شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ مہاجر مکی نے جو حضرت تھانوی کی ولادت سے بہت عرصہ پہلے ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ آپ کو طالب علمی کے زمانہ میں ہی مکہ معظمہ بلا بھیجا تھا۔

(۳) مکہ معظمہ میں اس زمانہ میں حضرت خلیل پاشا نامی ایک بزرگ رہا کرتے تھے۔ حج کو

جانے والے اکثر علماء ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ مگر حضرت تھانویؒ نے اپنے حج کے زمانہ میں اپنے شیخ حضرت حاجی امداداللہ کی موجودگی میں کسی دوسرے شیخ کی خدمت میں جانا خلاف مصلحت سمجھا۔ جس کی وجہ سے وہ حضرت خلیل پاشا کی خدمت میں نہ گئے۔ رات کو آپ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی صاحب فرما رہے ہیں کہ تم خلیل پاشا سے نہیں ملے؟ آپ نے عالمِ خواب میں ہی جواب دیا کہ:۔

"اس کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے لوگ حج کو آتے ہیں تو مقصود خانہ کعبہ ہوتا ہے جس کے مختلف طرق ہیں۔ کوئی بمبئی کے راستے سے آتا ہے۔ کوئی کراچی ہو کر۔ اسی طرح اس طریق میں مقصود حق تعالیٰ ہیں اور شیوخ طرق ہیں جب ہم نے حاجی صاحب کو اپنا شیخ طریقت تجویز کر لیا۔ تو پھر دوسرے شیخ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ مقصود کے حصول کے لئے وہی کافی ہیں"

بقول حضرت تھانویؒ اس جواب کو سن کر وہ صاحب خاموش ہو گئے اور صبح آپ نے اس خواب کا تذکرہ حضرت حاجی صاحب سے کیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ کیا مضائقہ ہے۔ بزرگ آدمی ہیں زیارت کر آؤ۔ تب جا کر آپ نے ان کی زیارت کی۔

(۴) صرف دنیا والوں کی ہی توجہ آپ کی طرف نہ تھی۔ بلکہ عالم برزخ والے بھی آپ کی طرف متوجہ تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنی شادی کے موقعہ پر جب پہلا وعظ فرمایا۔ تو ایک رات کو حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خواب میں حضرت کو شادی کی مبارکباد دینے تشریف لائے اور مبارکبادی کے بعد فرمایا کہ:۔

"مجھ کو تو جو توجہ تمہارے ساتھ حالتِ حیات میں تھی۔ وہ اب بھی ہے"۔

یہ حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ اس زمانہ کے اولیاء اللہ پر آپ کا مقام۔ کام۔ ذاتی جوہر اور فطری استعداد منکشف ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ سے سب آپ کے گرویدہ ہو رہے تھے۔

ہم مسلک بزرگوں کا سلوک

حضرت تھانویؒ گو حضرت حاجی صاحب کے مرید ہونے کی حیثیت سے یک در گیر، محکم گیر کے اصول پر عمل پیرا تھے مگر اس تعلق کو بزرگانِ عصر کی صحبت و زیارت کے سلسلہ میں مانع بھی نہ سمجھتے تھے اور نہ ہی آپ کے شیخ حضرت حاجی صاحبؒ نے کبھی اسے برا منایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ ہم مسلک اور مختلف المشرب دونوں طرح کے بزرگوں کی نظر توجہ کے مرکز بن گئے۔ ہم مسلک و ہم سلسلہ بزرگان میں سے حضرت مولانا

محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمہم اللہ تعالےٰ کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔ ان کے علاوہ آپ جن حضرات سے روحانی تربیت حاصل کرتے رہے وہ یہ تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ

یہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کے خلیفہ اعظم تھے۔ اپنے وقت کے قطب الارشاد محقق عالم اور کامل درویش تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہی آپ ان کی توجہ خاص سے اتنے متاثر ہوئے کہ مولانا سے درخواست بیعت کر دی مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ میرے مرید نہیں بلکہ پیر بھائی بنیں گے۔ اس لئے انہوں نے یہ درخواست منظور نہ کی مگر یوں بھی وہ آپ کا بہت ہی لحاظ فرماتے تھے۔ اور ہر طرح بڑے ہوتے ہوئے آپ سے ایسا سلوک فرماتے تھے۔ جیسے بڑے بڑوں سے کیا کرتے ہیں۔

قیام تھانہ بھون کے ابتدائی زمانہ میں ایک مرتبہ آپ حضرت مولانا گنگوہیؒ کو ملنے کے لئے تشریف لے گئے۔ اس وقت مولانا چارپائی پر تشریف فرما تھے اور باقی تمام حاضرین مجلس بوجہ ادب نیچے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ بھی دوسرے حاضرین مجلس کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئے۔ بس آپ کا نیچے بیٹھنا تھا کہ مولانا بھی چارپائی سے اتر کر نیچے فرش پر آ گئے۔ جہاں سب بیٹھے تھے۔ اس سے آپ کو سخت خجالت ہوئی۔ اور عرض کیا کہ:-

"حضرت اب تو اکثر حاضری کا اتفاق ہوا کرے گا اور میں تو خادمانہ طور پر حاضر ہوتا ہوں خادموں ہی کا سا برتاؤ فرمایا کریں"۔

مولانا نے یہ فرما کر آپ کی خجالت دور کی کہ نہیں! میں دیر سے لیٹا ہوا تھا۔ اس لئے نیچے آ بیٹھا ہوں اس کے بعد آپ جب کبھی حاضر خدمت ہوتے۔ مولانا نشست تو نہ بدلتے مگر اکرام و احترام بڑا کرتے جس پر مولانا کے ایک خادم نے عرض کیا۔

"حضرت وہ تو اپنے کو حضرت کا ادنیٰ خادم سمجھتے ہیں اور پیر کا سا ادب کرتے ہیں۔ آپ کیوں اتنا لحاظ فرماتے ہیں"۔

مولانا نے فرمایا کہ تم تو اندھے ہو۔ میں تو اندھا نہیں"۔

حضرت تھانویؒ کو بھی حضرت مولانا گنگوہی سے اپنے شیخ جیسی محبت و عقیدت تھی۔ چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ:-

"میں نے ایسا جامع ظاہر و باطن بزرگ کوئی نہیں دیکھا۔ اسلئے اور لوگوں کے ساتھ تو میری عقیدت استدلالی ہے اور مولانا کے ساتھ غیر استدلالی۔ دلائل سوچنے سے بھی ذہن ابا کرتا ہے کہ مولانا تو بزرگ ہیں ہی۔ دلائل قائم کرنے کی کیا حاجت ہے ع آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ بلکہ دلائل کا سوچنا بھی خلاف ادب سا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے حضرت مولانا سے یہ بھی اجازت لے رکھی تھی کہ اگر کوئی اشکال ظاہری یا باطنی پیش آئے۔ تو پوچھ لیا کروں لیکن عمر بھر میں صرف تین چار ہی بار استفسار کی نوبت آئی۔ پھر مولانا کے جوابات کی ایسی برکت ہوئی کہ انہیں سے سارے اشکالات حل ہوتے رہے۔ مزید استفسارات کی ضرورت ہی واقع نہ ہوئی"

۴۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمتہ اللہ علیہ

یہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ اعظم اور بڑے صاحب ارشاد بزرگ تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر گزر چکا ہے۔ حضرت تھانویؒ سے انہیں غائبانہ محبت تھی۔ آپ کی طرف ان کی غیر معمولی توجہ دیکھ کر بعض حاسدوں نے جنہیں آپ ہمیشہ "عنایت فرماؤں" کے لفظ سے یاد کیا کرتے تھے۔ آپ سے بعض غلط حکایات منسوب کر دیں۔ تاکہ آپ کی عزت و وقعت بزرگوں کی نظر میں نہ رہے۔ چنانچہ آپ نے اسی وقت ایک رقعہ لکھ کر مولانا کی خدمت میں حقیقتِ حال کی آگاہی کیلئے بھیجا۔ جس کا انہوں نے یہ جواب بھیجا کہ:-

"معلوم نہیں۔ لوگوں کو کیا مزہ آتا ہے کہ غلط روایتیں پہنچا کر اہل خیر کے قلوب کو دکھاتے ہیں مجھ ناچیز کو جو محبت اور تعلق پہلے تھا۔ وہی عقیدت بحمد اللہ موجود ہے ؎

آں نیست کہ حافظ را مہرت رود از خاطر ——— آں وعدۂ پیشیں تا روز پسیں باشد

جو قلبی محبت اور جس کو ذخیرۂ آخرت سمجھ رکھا ہو۔ وہ انشاء اللہ تعالے نہیں بدل سکتی۔ جو روایتیں پہنچی ہیں۔ ان میں مبالغہ سے بہت کام لیا گیا ہے"

ایک مرتبہ آپ مولانا کے ساتھ بہاولپور کے سفر سے واپس آرہے تھے۔ اتفاق سے یہ دونوں حضرات ایک ہی ڈبہ میں تھے۔ جس میں ان کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ رفقاء سفر دوسرے ڈبہ میں تھے۔ ظہر کا وقت اور گرمی کا موسم تھا۔ آپ کو سخت پسینہ آرہا تھا۔ یہ دیکھ کر مولانا نے نہایت بے تکلفی اور غایت تواضع سے آپ کو پنکھا کرنا شروع کر دیا۔ آپ بوجہ غایت ادب یہ برداشت نہ کر سکے۔ اسلئے پریشان ہو کر فوراً پنکھا پکڑ لیا مولانا نے فرمایا کیا حرج ہے۔ کوئی دیکھنا تھوڑا ہی ہے۔ کیونکہ تیسرا آدمی تو کوئی موجود نہیں"

آپ نے جواب دیا کہ "جس کے لئے میں آپ کا ادب کرتا ہوں۔ وہ تو دیکھ رہا ہے"۔ اس پر مولانا ہنس پڑے۔

آپ نے حضرت مولانا سے اپنے تعلقات کی نسبت ایک رسالہ "خوانِ خلیل" کے نام سے بھی شائع کیا تھا۔ جس میں آپ لکھتے ہیں:۔

"عجیب بات یہ ہے کہ باوجودیکہ میں ہر طرح چھوٹا تھا۔ عمر میں بھی۔ طبقہ میں بھی اور علم و عمل میں تو مجھ کو کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ اس میں تو چھوٹے بڑے ہونے کی نسبت کا ذکر بھی ایک درجہ میں ادعا ہے علم و عمل کا۔ مگر مولانا کا برتاؤ مساویانہ تو یقینی تھا ہی۔ بعض اوقات ایسا برتاؤ فرماتے تھے۔ جیسے چھوٹے بڑوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

احقر کو بعض امور اجتہادیہ ذوقیہ متعلقہ معاشرت و انتظام میں رائے کا اختلاف تھا۔ اور اس اختلاف کے ہوتے ہوئے میرا یہ خیال تھا کہ مولانا سے صرف اعتقاد عقلی ہو سکتا ہے۔ انجذاب طبعی نہ ہوگا۔ مگر کیفیت یہ تھی کہ حاضری تو حاضری تصور کرنے سے اس قدر انجذاب ہوتا تھا کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا اور غالباً اسی کا اثر ہوگا کہ خواب میں بھی اگر کبھی زیارت ہوتی تو اسی شان سے ہوتی یہ کھلی دلیل ہے محبت کی کہ محب کا گمان بھی نہیں بلکہ احتمال عام کا ہے مگر طبیعت ہے کہ کھنچی چلی جاتی ہے"۔

۲۔ حضرت حاجی سید محمد عابد دیوبندیؒ

یہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ کے مجازین خاص میں سے تھے۔ عملیات میں خصوصیت کے ساتھ شہرہ آفاق تھے کچھ دن دار العلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے تھے۔ اس قدر پابند اوقات و معمولات تھے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ فرمانے لگے کہ:۔

"جاننے والا ہر وقت یہ بتا سکتا ہے کہ اس وقت حاجی صاحب فلاں کام میں مشغول ہوں گے اور اگر کوئی اس وقت جا کر دیکھے۔ تو ان کو اس کام میں مشغول پائے۔ کبھی اس کے خلاف نہیں ہو سکتا"۔

طالب علمی کے زمانہ میں حضرت تھانویؒ اکثر چھتہ والی مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ جہاں حاجی صاحب کا زیادہ تر قیام رہتا تھا۔ حاجی صاحب خوش اعتقادی اور حسن ظن کی بنا پر اکثر اوقات آپ کو ہی اپنا امام بنایا کرتے تھے۔ خصوصی توجہ کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حاجی صاحب رمضان شریف میں افطاری کا بڑے پیمانہ پر اہتمام فرمایا کرتے تھے اور سب کو چیزیں

تقسیم کرتے تھے۔ ان کے قیام مکہ معظمہ کے دوران میں حضرت تھانوی بھی وہیں مقیم تھے چنانچہ افطار کے وقت حرم میں آپ جہاں بھی ہوتے وہیں آپ کا حصہ بھیجتے۔ آپ بھی ان کا بڑا ادب کرتے تھے۔ چنانچہ جن دنوں حاجی صاحب کی ارباب مدرسہ دیوبند سے کشیدگی تھی۔ تو آپ کو وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ آپ کے چونکہ اساتذہ اور مہتمم سب کے ساتھ خصوصی تعلقات تھے۔ اسلئے آپ حاجی صاحب کو ملنے کے لئے بڑے بے قرار تھے۔ مگر اساتذہ کا ادب و احترام مانع تھا۔ اسلئے آپ نے ہمت کر کے اس کشیدگی کے اثرات کا حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر فرمایا کہ اگر انہیں ملنے نہ جاؤں۔ تو سخت بے مروتی و بے وفائی ہوگی۔ اور اگر ملنے جاؤں تو ممکن ہے مدرسہ کے مصالح کے خلاف ہو۔ مولانا نے فرمایا "نہیں نہیں۔ ضرور جاؤ۔ مصالح کے خلاف نہیں۔ بلکہ اس میں مدرسہ کی یہ مصلحت ہے کہ ان کی مخالفت کم ہوگی"۔ یہ الفاظ دیگر مولانا نے یہ فرما کر آپ کی مصلحت اندیشی اور دور بینی کی نہ صرف داد دی۔ بلکہ آپ کے مصلح کل ہونے کا بھی اعتراف فرمایا۔

۱۴۔ حضرت مولانا سید احمد حسن امروہوی

یہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بہت محبوب اور ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ کے طریقِ باطن میں مجاز تھے۔ مشاہیر علماء ہند میں ان کا شمار تھا۔ ان کی فصاحت و بلاغت تحریر و تقریر اور مہارتِ مناظرہ شہرہ آفاق تھی۔ حضرت تھانوی ان کے ساتھ اکثر جلسوں میں بھی شریک رہے۔ گو آپ عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔ مگر وہ آپ کا بہت ادب و لحاظ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ جب آپ کو ان کے ہاں امروہہ میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ تو آپ بیت الخلا پوچھنا بھول گئے پچھلی رات کو جو تقاضا حاجت کی ضرورت پیش آئی۔ تو از حد پریشان ہوئے کہ اب کس سے پوچھا جائے۔ وہ اپنے نورِ فراست سے حضرت کو پریشان دیکھ کر فوراً گھر سے باہر آئے۔ اور پردہ کرا کر حضرت کو زنان خانے میں لے گئے۔ اور اپنے دستِ مبارک سے استنجے کے ڈھیلے اور پانی کا لوٹا بیت الخلاء میں رکھ دیا جس سے آپ کو از حد گرانی ہوئی اور فرمایا کہ یہ ڈھیلے تو تبرک ہو گئے۔ اب استنجا کس سے کیا جاوے۔ مولانا نے بغایت تواضع فرمایا کہ "کیا ہوا ہم میں نے ہی رکھ دیئے"۔ اس واقعہ کو نقل فرماتے ہوئے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔

ہماری جماعت میں مولانا بہت نفیس لباس پہنتے تھے جو بظاہر تکلف کی حد تک پہنچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور مجھے بھی ایسا ہی گمان تھا۔ مگر اس دن کے واقعے سے میں مولانا

کی تواضع بے تکلفی اور سادگی کا بے حد معتقد ہو گیا۔ اور سمجھ گیا کہ مولانا کی خوش لباس کا منشاء نفاست و لطافتِ مزاج تھا۔ نہ کہ تکلف۔"

۵۔ حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ یہ بھی حضرت تھانویؒ کے پیر بھائی یعنی حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء مجازین میں سے تھے۔ مگر مسائل اجتہادیہ میں آپ سے عملی اختلاف رکھتے تھے۔ ان کے علم و فضل کا کانپور میں بڑا شہرہ تھا۔ اور بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت تھانویؒ اُس وقت بالکل نوعمر تھے اور آپکا ابتدائی زمانہ تھا۔ کہ ایک دعوت میں مولانا نے محض اپنے خصوصی تعلق اور اعترافِ عظمت کے طور پر آپ کے سامنے کا بچا ہوا کھانا بطور تبرک سب کے سامنے نوش فرما کر لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

۶۔ مولانا شاہ محمد حسینؒ الٰہ آبادی یہ بھی حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہؒ کے خلیفہ مجاز اور بڑے صاحبِ نظر بزرگ تھے۔ حضرت تھانویؒ کا خصوصی ادب و لحاظ کرتے تھے۔ گو مسئلہ اجتہادیہ سماع میں ان کا مذاق حضرت کے خلاف تھا۔ مگر اس اختلاف کا ان کی باہمی محبت و الفت پر کوئی اثر نہ تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک شخص نے مولانا کے ساتھ حضرت تھانویؒ کی بھی دعوت کی۔ مولانا کا معمول تھا کہ وہ کھانا کھانے کے بعد مجلس سماع منعقد کرتے تھے۔ جسے وہ اپنی اصلاح کے لئے روحانی غذا سے تعبیر کرتے تھے۔ اسلئے حضرت تھانویؒ نے اس دعوت میں جانے سے عذر فرما دیا۔ داعی کی اس شرط پر کہ حضرت کی موجودگی میں مجلس سماع منعقد نہ ہوگی۔ حضرت نے شمولیت فرمائی اور مولانا کی رعایت و ادب کے پیش نظر کھانے کے بعد جلد ہی رخصت ہونے لگے۔ تو مولانا بھی ساتھ ہی اُٹھ بیٹھے۔ حضرت کا خیال تھا کہ یہ شاید مشایعت کے لئے اٹھے ہیں۔ مگر وہ بھی حضرت کے ساتھ ہی واپس گھر کو تشریف لے گئے اور اس بات کو نہ صرف خلاف مروت بلکہ خلاف ادب سمجھا کہ جس مجلس میں حضرت شریک نہ ہوں۔ وہ اس میں شریک ہوں۔ اور اس طرح حضرت کی خاطر انہوں نے اپنا معمول بدل کر خود کو اس روز روحانی غذا سے محروم کر لیا۔ سوائے حضرت تھانویؒ کے انہوں نے اور کبھی کسی کے ساتھ ایسی رعایت نہ برتی تھی۔

۷۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوریؒ یہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے خلفائے عظام میں سے تھے اور بڑے صاحبِ فیض بزرگ تھے۔ ان کی سادگی دینداری اور انکساری کا رنگ خدام میں بھی نمایاں تھا۔ امر حق کہنے میں کبھی کسی کا لحاظ نہ کرتے تھے۔ جو کہنا ہوتا آنکھیں نیچی کر کے صاف صاف فرما دیتے تھے۔ اور اسی وجہ سے حضرت تھانویؒ کو بھی ان سے

خاص محبت تھی۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ "شاہ صاحب کے ساتھ بھی میرا اعتقاد وجدانی اور غیر استدلالی تھا"۔ اور ان کی عنایات و توجہ اور تعظیم و تکریم کا یہ عالم تھا کہ جن دنوں وہ علیل تھے۔ حضرت عیادت کو رامپور تشریف لے گئے۔ اس وقت آرام تو آچکا تھا۔ مگر کمزوری باقی تھی۔ اور اپنے کمرہ کی چھت پر خلوت خانہ میں رہا کرتے تھے۔ حضرت کا قیام نیچے باغ کے صحن میں تھا۔ انہیں حضرت کے آرام کا اس قدر خیال تھا کہ نیچے تشریف لا کر بار بار پوچھتے تھے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں یہاں تک کہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:-

"نگرانی کا یہ حال تھا کہ رات کو جس وقت بھی میری آنکھ کھلتی۔ تو دیکھتا کہ شاہ صاحب موجود ہیں۔ قریب قریب رات بھر یہی مشغلہ رہا"۔

حضرت شاہ صاحب مولانا کے وعظوں میں نہایت شوق و رغبت سے شرکت فرمایا کرتے تھے۔

۸۔ حضرت حاجی محمد انور دیوبندیؒ

یہ حضرت سید محمد عابد دیوبندیؒ کے خلیفہ اور بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے اور بعض کے خیال کے مطابق یہ اپنے شیخ سے بڑھے ہوئے تھے۔ حج سے واپس آنے کے بعد ان پر سُکر کی سی کیفیت غالب رہتی تھی۔ اپنی چیزیں لوگوں کو مفت دے دیتے تھے۔ کھانے پکوا کر لوگوں میں تقسیم کرتے رہتے تھے۔ اور لوگ انہیں جنون میں مبتلا سمجھتے تھے۔ اسی عرصہ میں حضرت تھانوی کا دیوبند جانا ہوا۔ اور آپ انہیں ملنے تشریف لے گئے۔ اہل اللہ کی نظر کے سامنے بے رنگ و خشت اور گوشت و پوست کی دیواریں کبھی حائل نہیں ہوا کرتیں۔ انہوں نے فوراً تاڑ لیا کہ حضرت تو خود صاحب اسرار ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ میں آپ سے ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ جو میں نے آج تک کسی پر ظاہر نہیں کی اور نہ آپ میری زندگی میں کسی پر یہ راز فاش کریں۔ چنانچہ حضرت نے ان کی وفات کے بعد وہ بات بتا دی وہ فرماتے تھے کہ

"میں نے حرم شریف میں بعض حضرات انبیاء علیہم السلام کی بیداری میں زیارت کی ہے جو میری حالت ہے۔ یہ انہیں حضرات کی نظر کا اثر ہے"۔

مختلف المشرب بزرگوں کی عنایتیں

ہم مشرب بزرگوں کے علاوہ حضرت تھانویؒ نے مختلف المشرب بزرگوں کی زیارت و صحبت حاصل کرنے میں کبھی بخل نہیں کیا تھا۔ بلکہ آپ کو جہاں جہاں بھی کسی صاحبِ دل اور صاحبِ نظر بزرگ کا پتہ لگا۔ آپ فیض حاصل کرنے کے لئے بیتابانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسی غرض کے لئے آپ نے بارہا صعوبتِ سفر بھی برداشت کی۔ جو آپ کے اخلاص اور بے تعصبی پر دال ہے۔ ذیل میں چند ایسے بزرگوں کی

ملاقاتوں کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

۱۔ قطب العالم حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن مراد آبادی قدس سرہٗ العزیز بڑے صاحب کشف و استغراق مستغنی المزاج اور آزاد خیال بزرگ تھے۔ نہ کوئی بات یاد رکھتے تھے۔ نہ کسی کو منہ لگاتے تھے۔ ان کی وضع قطع اور بود و باش بالکل سادہ اور آزاد تھی۔ گو طبیعت میں تصنع و بناوٹ قطعاً نہ تھی مگر غایت سادگی اور بے ساختگی کی وجہ سے لہجہ ذرا سخت اور تیز تھا۔ کسی سے خصوصیت کا برتاؤ کرنے کے عادی نہ تھے اور نہ کسی کی تعریف میں مبالغہ کرتے تھے۔ مگر پاس ادب اتنا تھا کہ بزرگوں کے تذکرہ کے وقت جوش میں کھڑے ہو جاتے تھے۔

حضرت تھانویؒ ابھی نوجوان ہی تھے کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر مدرسہ فیض عام کانپور میں مدرس مقرر ہو کر آگئے۔ مگر جب دو ماہ بعد ہی ملازمت چھوڑ کر تھانہ بھون واپس جانے لگے تو آپ کو گنج مراد آباد میں مولانا کی زیارت کرنے کا خیال آیا کہ شاید پھر اس طرف آنے کا اتفاق نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی آپ ایک طالب علم کو ساتھ لے کر چل پڑے اور راستہ کی ناواقفیت کے باوجود بھولتے بھٹکتے رات کو ایسے وقت وہاں جا پہنچے۔ جب عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ اور مولانا حجرہ میں تشریف لے جا چکے تھے۔ آپ نے خادم کے ذریعہ اطلاع کرائی۔ انہوں نے اندر بلایا اور ایک دم تیزی سے پوچھا کہ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو۔ آپ نے بہ ادب بہ اختصار جواب دیا۔ ایک طالب علم ہوں کانپور سے آیا ہوں۔ زیارت کو حاضر ہوا ہوں۔ وجہ تاخیر معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے پھر اسی تلخ لہجہ میں فرمایا۔ بھلا یہ زیارت کا وقت ہے۔ آدمی اگر سویرے آئے تو دوسرا دوتی کا سامان بھی کرے۔ مگر اس مجسمۂ ادب و تہذیب نے ہتایا پر بھی وجہ تاخیر پیش کرنا سوء ادب سمجھا اور پُر تقصیر بن کر کھڑے رہے۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں فرمایا جی ہاں۔ حکم ہوا کہ جاؤ بازار سے کچھ کھا لو۔ اور صبح کو چلے جانا۔ اور خادم سے کہا کہ اسے فلاں مکان میں ٹھہرا دو۔ حضرت تھانویؒ نے اس شدت کو شفقت و تربیت پر محمول کیا اور باہر آکر بازار جانے کی فکر کرنے لگے۔ بس ان کا باہر آنا تھا کہ شاید انہیں حضرت کے مقام کے متعلق کشف ہوا فوراً واپس بلایا اور بیٹھنے کا امر فرمایا۔ آپ از راہ ادب تخت پر بیٹھنے کی بجائے چٹائی پر بیٹھ گئے تو مولانا نے انہیں تخت پر بٹھایا۔ گھر سے کھانا منگایا۔ وہ سامنے رکھا۔ خود اُٹھے اور بیڑا لا کر پیش کیے آپ کے استاد مولانا محمد یعقوبؒ کی بہت تعریف کی۔ بہت دیر باتیں کرتے رہے اور جب آپ کھانے

سے فارغ ہو کر جانے لگے تو مولانا خلاف معمول آپ کو جائے قیام تک پہنچانے آئے۔ اور صبح جاتے وقت اپنے سامنے ٹٹو پر سامان لادکر اور دعا فرما کر رخصت کیا۔

اگرچہ ان کے استغراق کا یہ عالم تھا کہ ایک آدمی ملنے کے بعد جب تھوڑی دیر بعد دوبارہ سامنے آتا۔ تو انہیں ہرگز یاد نہ رہتا کہ یہ ابھی ہو کر گیا ہے۔ مگر تھانہ بھون کے اس طالب علم کی یاد ان کے دل میں کچھ ایسی گھر کر گئی کہ کبھی کبھی آنے جانے والوں کے ذریعہ آپ کو سلام کہلا بھیجتے تھے۔

چند سال بعد آپ کو دوبارہ ایام تعطیل میں ان کی خدمت میں حاضری کا موقعہ ہاتھ آیا۔ آپ اپنے ساتھ ہدیۃً کانپور کے خوبصورت خوش ذائقہ اور خوشبودار پیڑے بھی لے گئے۔ اگرچہ یہ ان کی مرغوبات میں سے نہ تھے۔ مگر چونکہ آپ کی شان عالی۔ حالی اور مآلی ان پر منکشف ہو گئی تھی اسلئے انہوں نے پیڑوں کو خلاف توقع بہت مسرت سے قبول کیا اور فرمایا کہ یہ تو ہمارے کام کی چیز ہے۔ ہم تو ان کا شربت پیا کریں گے۔ اس روز آپ روزہ سے تھے۔ اسی وقت آپ کے ایک اور ہم سفر روزہ دار بھی پہنچے۔ جو بوڑھے تھے مولانا نے اس سے پوچھا کہ کیا روزے سے ہو اس نے کہا ہاں۔ اس پر بہت خفا ہوئے کہ سفر میں اور ایسے سخت موسم میں روزہ رکھا۔ بس ابھی چلے جاؤ۔ ادھر آپ کو بھی اندیشہ خفگی لاحق ہو گیا۔ کہ اتنے میں وہ آپ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا کیا روزہ ہے؟ آپ نے خفگی کی پروا نہ کرتے ہوئے سچ کہہ دیا کہ جی ہاں۔ تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا ہاں بہت اچھا کیا۔ جوان آدمی ہو۔ تمہیں روزہ رکھنا مناسب تھا۔ اب تو بڑی ہی شفقت و محبت سے پیش آتے رہے اور بڑی رازدارانہ گفتگو فرماتے رہے۔ مثلاً فرمایا کہ :-

"کہنے کی تو بات نہیں۔ لیکن تم سے کہتا ہوں کہ جب سجدہ میں جاتا ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالےٰ نے پیار کر لیا۔ بھائی جنت کا مزہ برحق۔ حوض کوثر کا مزہ برحق مگر نماز میں جو مزہ ہے۔ کسی چیز میں بھی نہیں۔ بھائی ہم تو قبر میں بس نماز پڑھا کریں گے دعا ہے کہ ہمیں تو اللہ میاں قبر میں یہ اجازت دے دیں کہ بس نماز پڑھے جاؤ"

جب ایک دو دن بعد حضرت نے واپسی کی اجازت چاہی تو فرمایا کہ اجی جلدی کیا ہے۔ مدرسہ کی تو تعطیل ہے۔ اور ٹھہرو۔ وہاں چونکہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت ہی نہ ہوتی تھی۔ اس لئے حضرت نے اس رعایت کو غنیمت سمجھا۔ اور چند دن ٹھہر گئے۔ اس عرصہ میں مولانا آپ کو صرف پر تکلف و عمدہ ہی نہ کھلاتے رہے۔ بلکہ علم و معرفت سے بھی نوازتے رہے۔

۲۔ حضرت صوفی شاہ سلیمان لاجپوریؒ یہ بہت بڑے ذی وجاہت بزرگ تھے۔ حسن اتفاق

سے ایک مرتبہ صوفی صاحب سورت سے راندیر تشریف لا رہے تھے اور حضرت تھانویؒ راندیر سے سورت جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک پل پر دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ صوفی صاحب فوراً گاڑی سے اترے اور حضرت تھانویؒ سے جو موٹر میں تھے ملے۔ بس پہلی ملاقات میں ہی کچھ ایسا اثر ہوا کہ راندیر واپس جا کر مسجد میں بیٹھے۔ اپنے معتقدین و مریدین کے سامنے بہت دیر تک روتے رہے۔ آخر ایک نے ہمت کر کے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے تو انہوں نے بلا تامل حضرت تھانویؒ کا نام لے کر فرمایا کہ نہ جانے آنکھوں سے کیا کر گئے ہیں۔

۴۔ حضرت مولانا شاہ ابو احمد مجددی بھوپالی

یہ اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے۔ حضرت تھانوی سفر بھوپال کے دوران میں ان کی زیارت کو بھی تشریف لے گئے۔ اتفاق سے اس وقت مولانا سو رہے تھے۔ اسلئے حضرت نے ان کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور باہر انتظار کرتے رہے۔ کافی دیر کے بعد جب مولانا بیدار ہوئے تو آپ نے خادموں کی زبانی اطلاع کرائی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت تھانویؒ آئے اور میرے سونے کی وجہ سے انتظار کرتے رہے تو خادموں سے سخت خفا ہوئے کہ تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا۔ حضرت نے فوراً دکالتاً فرمایا کہ میں بڑے آرام سے بیٹھا رہا۔ اس پر ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور کافی دیر تک حضرت سے محبت کی باتیں کرتے رہے۔

اسی طرح حضرت تھانویؒ نے کانپور کے تارک الدنیا بزرگ حضرت شاہ عبداللطیفؒ مراد آباد کے حضرت حافظ عبدالرحمٰن خلیفہ سائیں توکل شاہؒ۔ دیوبند کے حضرت بہادر علی شاہؒ۔ حضرت ملا شہاب الدین ولایتیؒ وحضرت گھسن شاہؒ پانی پت کے صاحب کشف اور صاحب حال وقال بزرگ حضرت پیرا شاہ۔ مونگیر کے حضرت مولانا محمد علی خلیفہ مولانا شاہ فضل الرحمٰن۔ دہلی کے مولانا نذیر حسینؒ۔ تھیرہ ضلع مظفرنگر کے حضرت حافظ تفضل حسینؒ۔ کانپور کے مشہور بزرگ حضرت شاہ احسان الحقؒ۔ بغداد کے صاحب کشف حضرت عبدالوہابؒ۔ سہارنپور کے گوشہ نشین بزرگ حضرت شاہ ابوالحقؒ۔ انبالہ کے مشہور سائیں توکل شاہ۔ دین پور کے مشہور شیخ حضرت مولانا خلیفہ غلام محمدؒ۔ کانپور کے مولانا محمد عادلؒ۔ لکھنؤ کے مولانا عبدالحی فرنگی محلی۔ مولانا محمد نعیم فرنگی محلی۔ اور مولانا عین القضاۃ رحمہم اللہ کی زیارت کی اور فیض صحبت حاصل کیا۔

وجہ مقبولیت

ہر سلسلہ کے بزرگان کرام اور اولیاء عظام کی طرف سے آپ کا غیر معمولی ادب واحترام۔ کم عمری کے باوجود آپ سے بزرگوں کا سا سلوک۔ بلا تعارف ظاہری

آپ کی انتہائی رعایت اور بایں معاملہ آپ پر غایت اعتماد کرنا گو بظاہر آپ کے صاحب عزت و عظمت اور محبوب و مقبول ہونے کی دلیل ہے۔ مگر فی الواقعہ اس کی حقیقت کچھ اور تھی۔ جس پر سے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز مراد آباد کے صاحب سوز و گداز بزرگ حضرت مولانا محمود حسن (؟) رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت پردہ اٹھایا۔ جب ممدوح الذکر کی عیادت کے لئے حضرت تھانوی تشریف لے گئے۔ مولانا اس وقت سفر آخرت کی تیاری میں تھے۔ انہوں نے اپنے حالات مرض بیان کرنے کے بعد یکایک نہایت جوش کے ساتھ مگر آبدیدہ ہوکر آپ سے ان الفاظ میں درخواست دعا کی کہ :۔

"خیر! یہ تو مرض کے حالات ہیں۔ اب آپ میرے لئے دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالے میرا خاتمہ ایمان پر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس صدی کا مجدد بنایا ہے۔ اللہ تعالے آپ کے فیوض و برکات سے عالم کو منور کرے۔ اور آپ کے ذریعہ سے رسوم و بدعات کا قلع قمع کرے۔"

دعا بزرگاں

اہمیت دعا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں تمہیں وہ چیز بتلاتا ہوں جو تمہیں تمہارے دشمنوں سے نجات دلائے اور تمہاری روزی بڑھائے۔ وہ یہ کہ تم رات دن جس وقت کہ موقع ملے اللہ تعالے سے اپنی حاجت کے لئے دعا مانگا کرو کیونکہ دعا مسلمانوں کا ہتھیار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی منزہ عن الخطا جماعت بھی اکثر و بیشتر مصروف دعا رہتی تھی۔ آج کل مسلمانوں کے مصائب اور تباہی و بربادی کے جہاں اور بہت سے اسباب موجود ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے معاملہ میں دعا کی طرف متوجہ نہیں ہوتے حضرت تھانوی ابھی عالم ارواح میں ہی تھے کہ آپ کے لئے اہل اللہ مصروف بدعا ہو گئے عالم وجود میں آئے تو نہ صرف اس دور کے بزرگوں کی غائبانہ دعائیں آپ کے شامل حال رہیں بلکہ عالم برزخ والے بھی آپ کی طرف متوجہ رہے بایں ہمہ آپ جب کسی بزرگ کے ہاں تشریف لے جاتے۔ تو ان سے درخواست دعا ہی کیا کرتے۔ حضرت تھانوی کے حق میں بزرگوں نے کس قسم کی دعائیں کیں اور ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ ان کی مختصر تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

محبتِ الٰہی

حضرت شاہ شیر محمد خاں پیلی بھیت کے مشہور بزرگ تھے۔ ایک عقد میں حضرت کا وہاں جانا ہوا۔ تو آپ ان کی زیارت کو بھی تشریف لے گئے اور ان سے درخواست دعا کی کہ میرے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ اپنے دونوں ہاتھ۔ گرد حضرت نے بلا تامل بہ تعمیل حکم بہ غایت عقیدت دونوں ہاتھ سے جب مل چکے تو پوچھا کہ کچھ گرمی پیدا ہوئی ہے عرض کیا جی ہاں۔ وہ فرمانے لگے کہ بس اسی طرح قلب کو رگڑتے جاؤ۔ انشاء اللہ تعالیٰ اللہ کی محبت دل میں پیدا ہو جائے گی۔

طالب علمی کے زمانہ میں آپ نے ایک کتاب میں دیکھا کہ ایک پیر نے اپنے مرید سے پوچھا کہ کیا تم خدا کو جانتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ میں خدا کو کیا جانوں۔ میں تو آپ کو جانتا ہوں" پس یہ قول پڑھتے ہی آپ غصہ سے لال پیلے ہو گئے۔ اور حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی خدمت میں یہ مقولہ پیش کر کے عرض کیا کہ:-

"دیکھیے حضرت غالی صوفیوں کی یہاں تک پیر پرستی بڑھ گئی ہے کہ پیر ہوتے ہوئے نعوذ باللہ اپنے کو خدا سے بھی مستغنی سمجھ لیا ہے۔"

مولانا نے نہایت لطافت سے اس کی تاویل کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ کیا تم خدا کو جانتے ہو۔ اس پر حضرت کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوا کہ واقعی اللہ جل شانہٗ کی کنہ کو کسی کو بھی نہیں اور یہ جواب عرض کر دیا۔ مولانا نے فرمایا تو پھر اس کے قول کی بھی یہی تاویل کیوں نہ کر لی جائے۔ کفر کا فتویٰ کیوں لگایا جائے۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے دل میں محبت الٰہی تو بچپن سے ہی موجود تھی۔ مگر اس بزرگ کی دعا نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ چنانچہ جب آپ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ تو وہاں اپنے قیام کے دوران میں تنزلات ستہ پر جس کا توحید وجودی سے خاص تعلق ہے۔ ایک رسالہ بعنوان "اثبات الوجود فی اطوار الشہود" لکھ ڈالا جس کا ایک جزو "التجلی العظیم فی احسن تقویم" بھی ہے۔ جس میں انسان کی جامعیت کی تحقیق ہے۔ آپ نے جب یہ مضامین اپنے شیخ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ العزیز کو سنائے تو انہوں نے مسرت و جوش میں آکر فرمایا:-

"اس میں تو تم نے بالکل میرے سینہ کی شرح کر دی ہے۔"

اور یہ ایک حقیقت تھی۔ کہ حضرت حاجی صاحب نے اپنے سینہ مبارک سے جو چیز حضرت کے سینہ مبارک میں ڈالی تھی۔ وہ توحید تھی۔ چونکہ یہ مضامین غلبۂ توحید کے زمانہ کے لکھے ہوئے تھے۔ اسی لئے حضرت نے رسالہ تنبیہات وصیت کے ضمیمہ ملقب بہ ثانیۃ التابع حصہ دوم نمبر ۳ مطبوعہ النور ماہ شوال المکرم ۱۳۴۶ھ

صفحہ ۲ میں عوام کو اس کے مطالعہ کی ممانعت کر دی۔ اور خواص کو بھی ان کا درجہ بتلا دیا کہ ان کو ذوقیات سے آگے نہ بڑھائیں۔

وہیں ایک صاحبِ علم مولوی محمد احسن مطوف مکہ معظمہ نے وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر شبہ ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تو بالکل ایمان کے خلاف ہے۔ حضرت نے اس پر جوش میں آ کر مسلسل دو گھنٹے تقریر فرما دی تو وہ پکار اُٹھے کہ:-

"واقعی اس مسئلہ کی تو ایسی ضرورت ثابت ہوئی کہ بدون اس کے تو ایمان کا تحقق ہی نہیں ہو سکتا۔"

بعض حضرات نے تو تکمیلِ ایمان ہی کو اس پر منحصر فرمایا تھا۔ اور انہوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر اس کو ایمان کا موقوف علیہ قرار دیدیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ حضرت کے دل میں کتنی بے پناہ محبتِ الٰہی موجزن تھی۔

حال وقال حضرت محمدی شاہ ولایتی الٰہ آباد کے ایک درویش طبع بزرگ تھے ایک مرتبہ آپ کے والد ماجد بیمار ہو گئے۔ اور حضرت کو لو الھیوا صحت یاب ہوتے پر وہ آپ کو شاہ صاحب کی خدمت میں لے گئے اور بتلایا کہ یہ میرا لڑکا ہے۔ دیوبند کا فارغ التحصیل ہے۔ اس نے فارسی میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔ انہوں نے اس مثنوی کے کچھ اشعار سن کر دعا دی کہ:-

"اللہ تعالےٰ قال کو حال کرے۔"

گو حال کا رنگ بچپن سے نمایاں تھا کہ تہجد پڑھا کرتے تھے۔ اور زمانہ طالب علمی میں حضرت مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ توجہ میں شریک رہتے تھے۔ جس کا نتیجہ خود حضرت ان الفاظ میں بیان فرمایا کرتے تھے کہ:-

"مجھ کو اس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے مجھ میں نفسانیت کا شائبہ بھی نہیں رہا۔ اور گویا میں بالکل فرشتہ ہو گیا۔"

اور بعد میں یہ حال آہستہ بدل گیا۔ یعنی آپ نے حال سے بے حال ہو کر آہ تخلص اختیار کر کے اشعار کہنے شروع کر دیئے۔ قیام مکہ معظمہ کے دوران میں آپ نے اسی "حال" کے زیر اثر ایک پر کیف غزل کہہ ڈالی جس میں سرتا سر توحید وجودی کے مضامین تھے۔ مگر اس کو عوام کے لئے مضر خیال کر کے اس کی اشاعت کی اجازت نہ دی۔ البتہ صاحب اشرف السوانح کی درخواستِ خاص پر الٹرلیس صرف یہ دو شعر نقل کرنے کی اجازت دے دی ؎

خودی جب تک رہی اس کو نہ پایا | جب اس کو ڈھونڈ پایا خود عدم تھے
حقیقت کیا تمہاری تھی میاں آہؔ | یہ سب آما اُدہ کے لطف و کرم تھے

اُسی زمانہ میں قاری عبدالحق صاحب کے سالانہ جلسہ میں حضرت سے وعظ کی فرمائش کی گئی۔ آپ نے غلبۂ حال کی وجہ سے سرزمینِ "حال" یعنی مکہ معظمہ میں وعظ کہنا خلافِ ادب سمجھا اور انکار کر دیا۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کی سفارش پر مجبور ہو کر وعظ کے لئے اسٹیج پر تشریف لائے اور ایک خوش لحن ترکی آدمی نے آپ کی تقریر سے قبل کارروائی جلسہ شروع کرنے کے لئے تلاوت شروع کی بس اس کا پڑھنا تھا کہ حضرت پر ایسا "حال" طاری ہوا کہ "قال" کے نہ رہے۔ فرماتے تھے کہ:-

"ایسا پُر درد اور پُر اثر لہجہ میں نے عمر بھر نہ سُنا تھا۔ تمام جلسہ پر ایک سناٹے کا عالم طاری ہو گیا اور میرے تو ہوش ہی بجا نہ رہے۔ ہچکی بندھ گئی۔ پھر جب مجھ سے وعظ کے لئے کہا گیا تو میں نے کہا کہ اگر مجھ سے وعظ کہلوانا تھا۔ تو اس سے قرآن نہ سنوانے۔ اب تو میں بیان پر قادر ہی نہیں رہا۔ اور واقعی اس کی قرأت کا اتنا شدید اثر ہوا تھا۔ کہ وعظ کہنے کی بالکل قدرت ہی نہ رہی تھی۔ نہ ہاتھ پاؤں قابو میں رہے۔ نہ دل قابو میں رہا۔ نہ زبان قابو میں رہی۔ ان لوگوں کو بھی دیکھنے سے معلوم ہو گیا کہ میں اس وقت واقعی معذور تھا۔"

اس طرح حق تعالیٰ نے بھی آپ کے ادب کے پیش نظر بمصداق میاں یزداں مراد متقیں غیب سے ایسا سامان پیدا کر دیا۔ وعظ نہ کرنے کا عذر معقول و مقبول ہو گیا۔ اور ویسے بھی آپ کے ہر قال سے حال ظاہر تھا۔

امیری و فقیری حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری کے سابق پیر آخون صاحب ولایتی کے خلیفہ اور حضرت شاہ صاحب کے ہمنام تھے۔ حضرت تھانوی سے بہت محبت فرماتے تھے۔ جب حضرت سہارنپور ان کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تو انہوں نے آپ کی درخواست دعا پر فرمایا:-

"اللہ تعالیٰ بدن کو امیر رکھے اور دل کو فقیر۔"

بفضلہٖ تعالیٰ آپ کی ساری عمر ایسی گذری۔ کونسا انعام تھا جو حق تعالیٰ کی طرف سے عطا نہ ہوا تھا۔ انہاں جملہ ایک اچھا مراض بھی تھا جو حق تعالیٰ نے اس طرح عطا فرمایا کہ اس سے کام میں کبھی حرج واقع نہیں ہوا۔ اتری ہوئی آنت سے متواتر تیس برس وعظ و تبلیغ کے سلسلہ میں سفر فرماتے رہے۔ اگر اس مرض نے زیادتی بھی اختیار کی تو محض اس وجہ سے کہ حضرت کو قطب الارشاد بنا کر ایک جنہ

بٹھانا مقصود تھا۔ دوسرا عارضہ دماغی تبخیر کا تھا جس کی وجہ سے نیند اکثر مختل رہتی اور کئی کئی راتیں ایسے گذر جاتیں۔ مگر پھر اتنی سیری سے نیند آتی کہ ساری کلفت دور ہو جاتی۔ نیند نہ آنے کی حالت میں حضرت کے قول کے مطابق دماغ کی حرارت میں انتعاش ہو کر کام کرتے وقت اور بھی تیزی سی محسوس ہونے لگتی اور خوب کام ہوتا۔ یہ بدن کی امیری کا ہی تو نتیجہ تھا کہ مرض کے باوجود بھی کام میں حرج واقعہ نہ ہوتا تھا۔ اور اجر میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ویسے بھی بفضلہ تعالیٰ آپ کی صحت غیر معمولی طور پر بھی بہت ہی اچھی تھی۔ اور یہ اسی کی برکت تھی کہ حضرت صدیوں کا کام سالوں میں کر گئے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ ایک کثیر المشاغل انسان کا کام ہے؟ حالانکہ ایسی مثال شاذ ہی نظر آئے گی اور لطف یہ کہ ایک ہی وقت میں کئی کئی کام کرتے تھے۔ مثلاً حفظ تلاوت بھی جاری ہے اور کبھی وقفات میں اور کبھی بلا وقفہ خطوط کے جواب بھی لکھے جاتے ہیں۔ مسائل دقیقہ پر بھی غور و خوض ہو رہا ہے۔ اور طالبین کے اشکال بھی رفع کئے جا رہے ہیں۔ پھر بدن کی امیری اس سے بھی ظاہر ہے کہ جس بیماری سے لوگ مہینوں میں اچھے ہوتے تھے۔ حضرت دو تین دن میں اچھے ہو جاتے تھے۔ ان کی غیر معمولی صحت کا اتنا چرچا ہوا کہ ایک مولوی نے صاحب اشرف السوانح سے کہا کہ:۔

"مولانا کو کوئی بوٹی معلوم ہے جس کے استعمال سے ان کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی رہتی ہے ان سے وہ بوٹی معلوم کرنی چاہیئے"

چنانچہ انہوں نے حضرت تک اس کا سوال پہنچا دیا۔ آپ نے ہنستے ہوئے فرمایا کہ:۔

"وہ خبطی ہے۔ لو میں وہ بوٹی بتلائے دیتا ہوں۔ وہ بوٹی تعلق مع اللہ ہے جس سے ہر وقت قلب میں قوت، طمانیت اور طبیعت میں فرحت و بشاشت رہتی ہے۔ جو صحت کی جڑ ہے"

یہ اسی تعلق مع اللہ کا اثر تھا کہ بیماری کی حالت میں بھی معمولات میں فرق نہ آتا تھا۔ چنانچہ ایک روز یعنی ۱۲ جمادی الثانی ۱۳۵۳ھ کو حضرت کو درد ریح کا شدید دورہ ہوا جو درد گردہ کے قریب تک پہنچا ہوا تھا۔ لیکن کمال ضبط کے ساتھ صبح کی نماز اسی درد کے عالم میں اس طرح پڑھائی کہ کسی پر اپنی تکلیف کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ البتہ اس میں چھوٹی آیات تلاوت فرمائیں۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد دوسرے کام بھی کرتے رہے۔ اور صبح کی مجلس میں تشریف لا کر طالبین کو مستفید فرماتے رہے۔ آٹھ بجے کے قریب خدام کو اس تکلیف کا پتہ چلا۔ وہ دوائی وغیرہ لائے۔ بس سے بفضلہ تعالیٰ گھنٹہ بھر میں درد دور ہو گیا۔ ورنہ ایسی حالت میں ایک عام انسان سے جو اس قدر کام

کے لئے کہاں مجال رہتے ہیں۔

دل کی فقیری کا یہ حال تھا کہ آپ فرماتے تھے کہ:۔

"مجھے تو اس تصور ہی سے وحشت ہوتی ہے کہ میری ملک میں ضرورت سے زیادہ چیزیں ہوں۔ چاہے ان چیزوں سے خود مجھے سابقہ کبھی نہ پڑتا ہو۔ لیکن خیال ہوتا ہے۔ کہ میری ملک میں ایسی فضول چیزیں کیوں ہوں۔ آخر ان کا کیا ہوگا۔ بہت ہی طبیعت الجھتی ہے کہ جو چیز کام میں نہ آوے۔ وہ گھر میں کیوں رہے۔ مفت میں پہرہ چوکی دینا حمال ہونا۔ مزدور بننا۔ فضول کا دردِ سر۔ صائبؔ نے خوب کہا ہے کہ ؎

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسبابِ معاش آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

میرے پاس کوئی چیز ہدیہ آتی ہے تو آتے ہی غم سوار ہو جاتا ہے۔ کہ اس کو کس کام میں لاؤں۔ جب تک اس کی ضرورت ذہن میں نہیں آجاتی۔ ہمیشہ اس کی فکر رہتی ہے کہ کیا استعمال کروں۔ ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں حق تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری نہ ہو کہ نالائق ہم تو بخش کر دیتے ہیں۔ اور تو گھبراتا ہے۔ بعض چیز تو خیر ایسی ہوتی ہے کہ آتے ہی کام آجاتی ہے۔ لیکن بعض چیز ایسی آتی ہے کہ سوچنا پڑتا ہے کہ آخر اس کا کیا کروں۔ یا تو کسی کو دیدی۔ یا اگر بخل کا غلبہ ہوا۔ تو سوچا کہ اچھی مفت کسی کو کیوں دوں لاؤ بیچو۔ بس بیچ کر اس کی رقم ضروری موقعوں پر خرچ کردی۔ الحمدللہ خیر سلا۔ اس کا موجود رہنا بار رہتا ہے" (راحت القلوب صـ۲۵)

برکاتِ اوقات مکہ معظمہ کے قیام میں حضرت نے تنویر کا ترجمہ "اکسیر فی اثبات التقدیر" کے نام سے۔ حضرت حاجی صاحب کی فرمائش پر لکھا تھا۔ روزانہ جس قدر ترجمہ فرماتے۔ حاجی صاحب کو سنا دیتے۔ جسے سن کر وہ بہت خوش ہوتے۔ اور مقدار کی زیادتی پر فرمایا کرتے کہ:۔

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے وقت میں برکت عطا فرمائی ہے"

واقعی حضرت حاجی صاحب نے یہ فرما کر ایک مسلمہ حقیقت پر سے پردہ اُٹھایا تھا۔ حضرت کے اوقات کی برکات کا تو روزانہ ہی مشاہدہ ہوتا رہتا تھا۔ اب بھی اس پر آپ کی صدہا تصنیفات و تالیفات شاہد عدل ہیں۔ روزانہ چالیس سے پچاس تک قابل جواب خط آتے۔ بڑے لمبے چوڑے اور فقہ، سلوک، کلام وغیرہ کے متعلق۔ جن کے پڑھنے میں ہی کافی وقت صرف ہو جاتا۔ اور جواب لکھنا

تو مزید براں ۔ ایک دن پچاس کے قریب خط آئے اور آپ جب پڑھ کر جواب لکھ بیٹھے ۔ تو حساب کرنے پر معلوم ہوا کہ فی خط دو منٹ سے بھی کچھ کم وقت صرف ہوا ۔ اسی طرح جب آپ کسی دینی کام میں مشغول ہوتے ۔ تو بفضلہ تعالےٰ مخل اوقات واقعات و حادثات پیش نہ آتے ۔ جیسے کسی دن ڈاک زیادہ آگئی تو تعویذ لینے والے کم آئے ۔ وقس علی ہذا ۔

"جن ایام میں آپ تفسیر "بیان القرآن" تحریر فرما رہے تھے ۔ ان کے متعلق حضرت کا بیان ہے کہ "بفضلہ تعالےٰ ڈھائی برس کی طویل مدت میں میرا کان تک گرم نہ ہوا ۔ اور ایک دن بھی ناغہ نہیں ہوا ۔ کبھی معمولی شکایت نزلہ زکام تک بھی نہیں ہوئی ۔ حالانکہ اس دوران میں خاص تھانہ بھون میں طاعون کا عرصہ تک زور رہا ۔ جس سے کسی قدر حرج بھی ہوا ۔ لیکن یہ ایسا حرج نہ تھا کہ جس کا بعد میں تدارک نہ ہو سکے ۔ میں اس زمانہ میں یہ دعا کیا کرتا تھا کہ تفسیر کے ختم ہونے تک نہ مروں ۔"

پھر وقت میں برکت کچھ اس طرح بھی ہو جاتی کہ جب آپ کچھ لکھنے بیٹھتے تو مضامین کی آمد شروع ہو جاتی ۔ بڑے اچھے ہوئے خطوط کا ایسا کافی و وافی و شافی جواب فی البدیہہ لکھتے جاتے کہ کوئی ضروری اور خفی سے خفی پہلو بھی نظر انداز نہ ہونے پاتا ۔ اور تصانیف میں بھی بڑے بڑے دقیق علمی مضامین نہایت جامعیت کے ساتھ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ۔

بسا اوقات اس کی یہ صورت پیدا ہو جاتی کہ جس مضمون کو کسی کتاب میں ڈھونڈنا چاہتے ۔ اس کا موقع فوراً ذہن میں آجاتا ۔ یا محض ورق گردانی سے سامنے آجاتا ۔ بسا اوقات راہ چلتے ۔ نماز پڑھتے بات کرتے ۔ اٹھتے بیٹھتے ضروری مسائل ذہن میں خود بخود آجاتے ۔ اور سب سے زیادہ وقت کی بچت انتہائی انضباط اوقات اور حسن انتظام سے ہوتی ۔ جب کوئی کام شروع فرما لیتے ۔ تو جب تک اسے ختم نہ کر لیتے ۔ چین نہ لیتے ۔ یہاں تک کہ بعض تصانیف کے قریب الاختتام پر ساری ساری رات بیٹھے لکھتے رہتے ۔ اور ایک منٹ کے لئے بھی آرام نہ فرماتے ۔ اس کے ساتھ ہی متوجہ الی اللہ بھی رہتے ۔ اور فرمایا کرتے ۔ :۔

"چاہے توفیق یاد خدا کی نہ ہو ۔ لیکن میں اپنی طرف سے تو قلب کو فارغ رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں ۔ تاکہ اگر کبھی توفیق ہو ۔ تو آسانی سے حق تعالیٰ کی طرف قلب کو رجوع کر سکوں اور اس وقت کوئی مانع توجہ الی اللہ سے نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ الجھی ہوئی باتوں سے میری طبیعت پریشان ہو کر متغیر ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ میں چاہا کرتا ہوں کہ بات ختم ہو کر جلد یکسوئی

حاصل کرلوں اور طبیعت اُکتی نہ تھی۔ لوگ الجھی ہوئی باتیں کرکے خواہ مخواہ دیتک طبیعت کو اٹکاتے اور الجھائے رکھتے ہیں"۔

دعائے امدادیہ حضرت تھانوی نے جب حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ العزیز سے استفادہ شروع کیا۔ تو پھر وہ ہر وقت ان کے لئے دست بدعا رہنے لگے۔ کوئی خط ایسا نہ آتا جس میں دعاؤں سے نہ نوازا جاتا۔ جیسا کہ ذیل کی دعاؤں سے ظاہر ہے جنہیں مختلف مکتوبات امدادیہ سے نقل کیا گیا ہے:-

۱۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ظاہر و باطن میں ترقی کرے۔ اور
۲۔ آپ کے جان و مال میں برکت دے۔ خاتمہ بخیر کرے۔
۳۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مخلصین سے کرے۔
۴۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے ماسوا سے اپنی طرف کرے۔
۵۔ خداوند تعالیٰ آپ کو اپنی رضا و حفاظت میں رکھے اور ترقی دارین عطا فرمادے۔
۶۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بادۂ عشق سے سیراب بنا کر تشنہ وار رکھے۔
۷۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مدام اپنی یاد۔ ذوق شوق اور مواجید میں سرشار و مخمور رکھے۔
۸۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دریائے محبت کا غواص بنائے اور مراد سے مالا مال فرمائے۔
۹۔ حق سبحانہ آپ سے مخلوق کو فیض یاب کرے۔ برکات بندگاں اور مراد سے مالا مال فرمائے۔
۱۰۔ خداوند تعالیٰ بتصدق اپنے حبیب احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب مرادیں پوری فرمائے اور تمہارے دامن تمنا کو گوہر مقصود سے بھر دے۔
۱۱۔ آپ کے استقامت و توکل میں کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ظاہری و باطنی فیض کو روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔
۱۲۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زیادہ علم و فضل بخشے۔ جس میں خلق اللہ کو نفع عام ہو۔ اور تصانیف مفید و مقبول ہوں۔
۱۳۔ ہمیشہ آپ کا خیال رہتا ہے۔ آپ کو درجات علیا عطا فرمائے اور آپ کا فیض ہمیشہ جاری رہے۔

ہر وقت دعاؤں میں یاد رکھنے والے حاجی صاحب جب اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو دعا کے لئے رسائل بھی اسی دربار اشرفیہ کے ہوئے اور حضرت کو لکھا:-

"بخدمت فیض درجت عمدۃ السالکین زبدۃ الواصلین حضرت العالم الحافظ الحاج القاری شاہ محمد اشرف علی التھانوی ادام اللہ عرفانہ و مجدتہ"

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

خط آپ کا پہنچا۔ نہایت مسرت حاصل ہوئی اور قلب کو فرحت۔ اللہ تعالیٰ آں عزیز کو ترقی ظاہر و باطن عطا فرمائے۔ اور خلق اللہ کو مستفید بفیوض صوری و معنوی کرے آمین انشاء اللہ میں ہر وقت دعا کرتا ہوں۔ آپ سے مخلوقات کثیرہ کو فائدہ ہوگا۔ اور سلسلہ جاری رہے گا۔ وقت آخر ہے۔ دعائے خاتمہ بالخیر کا طالب ہوں" (از مکتوب ۳۸)

آہ! یہ آخری گھڑی بھی کتنی کٹھن ہوتی ہے۔ کہ جن کے دریائے فیض سے ایک دنیا فیضیاب ہوتی رہتی ہے۔ وہ دارالفنا سے دارالبقا کو جاتے ہوئے خود کو تشنہ کام پاتے ہیں۔

بزرگوں کی ان دعاؤں اور تمناؤں کی مقبولیت کی خود حضرت کی ساری زندگی ہی شاہد عادل ہے۔ کون سی دعا اور کون سی تمنا ہے جو مولا پاک نے اپنے فضل خاص سے پوری نہیں فرمائی۔

وعظ و تبلیغ

فریضۂ تبلیغ یہ اتنا اہم فریضہ ہے کہ اس کے لئے حق تعالیٰ کو انبیاء علیہم السلام کی جماعت بھیجنی پڑی۔ ان کی آمد کا سلسلہ بند ہونے کے بعد یہ کام علماء کرام کے سپرد ہوا۔ جو ورثۃ الانبیاء ہیں۔ سنت اللہ یوں جاری ہے کہ وہ جس کو کسی کام کے لئے مامور کرکے بھیجتا ہے۔ اس کے اندر بدو فطرت سے ایسی صفات بھی پیدا کر دیتا ہے۔ جن کی مدد سے وہ یہ کام بآسانی اور بسہولت انجام دیتا ہے۔

مشق وعظ حق تعالیٰ نے چونکہ حضرت تھانوی کو اس منصب جلیلہ پر فائز فرمانا تھا۔ اسلئے انکے دل میں بچپن سے ہی وعظ و تبلیغ کا شوق موجزن کر دیا تھا۔ آپ جہاں بھی مسجد خالی دیکھتے شغل کے طور پر اسکے منبر پر چڑھ کر کچھ نہ کچھ پڑھنا شروع کر دیتے۔ طالب علمی کے زمانہ میں آپ نے اس غرض کے لئے اپنے ہم سبق طلباء کی ایک مختصر سی بے نام ونشان انجمن بنائی ہوئی تھی۔ جس کا ہر شب جمعہ کو اجلاس ہوتا تھا۔ اور سب نمبر واری باری وعظ گوئی کی مشق کرتے تھے۔ اس طرح آپ نے تحصیل علوم کے ساتھ ساتھ وعظ و تبلیغ کی مہارت تامہ بھی حاصل کر لی تھی۔

پہلا وعظ ابھی آپ تعلیم ہی حاصل کر رہے تھے۔ اور اپنی عمر کی اٹھارویں منزل سے نہیں گزرے تھے

کہ آپ کے نکاح کا انتظام کر دیا گیا۔ اور اس غرض کے لئے آپ کو تھانہ بھون جانا پڑا۔ جمعہ کے روز آپ کے والد ماجد نے آپ کے ماموں منشی واجد علی سے فرمایا کہ:۔

"میں بوجہ مشغولیت حوض والی مسجد میں نماز پڑھ لوں گا۔ آپ اشرف کے ساتھ جامع مسجد چلے جائیں۔ اور بعد نماز اس کا وعظ کرا دیں۔"

جب آپ کے ماموں نے اس امر سے آپ کو مطلع کیا۔ تو آپ نے شرم کے مارے مجمع عام میں وعظ کہنے سے صاف انکار کر دیا۔ جونہی نماز ختم ہوئی۔ آپ کے ماموں نے آپ کے وعظ کا اعلان کر دیا۔ اب نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔ آخر بہ تعمیل حکم وعظ کہنا پڑا۔ لیکن فرماتے تھے کہ:۔

"مجھے اتنی شرم آئی کہ ممبر پر بھی نہیں بیٹھا۔ بلکہ نیچے بیٹھ کر اور نظریں نیچی کر کے سورۃ بقرہ کی شروع آیات کا وعظ بیان کر دیا۔"

گویا نکاح کی تقریب سعید آپ کا عوام سے بھی تعلق قائم کرنے کا باعث ہوئی

ترتیب وعظ حضرت تھانویؒ ہمیشہ خطبہ ماثورہ پڑھ کر کسی آیت یا حدیث سے وعظ شروع فرماتے اور اس کی ذیل میں مناسب موقعہ ضروری مضامین بیان فرماتے جاتے جو فصیح و بلیغ، پرمغز و متین الفاظ کا مرقع ہوتے اور اخیر میں اس آیت یا حدیث کے ترجمہ و دعا پر وعظ ختم فرماتے۔ ہر وعظ حقائق و معارف کا مجموعہ ہوتا جس پر تصوف کا رنگ غالب ہوتا۔ اگرچہ آپ پہلے سے مضمون سوچ کر یا تیار کر کے نہ آتے۔ بلکہ اس وقت جو کچھ القا ہوتا۔ اس پر بے تکلفی سے وعظ شروع کر دیتے۔ مگر وہ .... بے ربط نہ ہوتا۔ بلکہ اس تسلسل اور تواتر سے مضامین بیان فرماتے۔ جیسے کوئی تصنیف شدہ رسالہ پڑھ رہے ہوں۔ اور نہ ہی غیر ضروری مضامین یا اشعار یا مقفی مسجع عبارت سنا سنا کر دفع الوقتی کے لئے سامعین کی سمع خراشی فرماتے۔ بلکہ آمد مضامین کا یہ عالم ہوتا کہ وقت ختم ہو جاتا اور وہ باقی رہ جاتے۔ چنانچہ حکیم محمد مصطفےٰ صاحب جو حضرت کے وعظ قلمبند کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ:۔

"احقر نے خود ایک حدیث کا بیان کم از کم پچاس بار سنا۔ کبھی مضامین مکرر نہیں ہوئے۔"

وعظ کے دوران میں آپ حضرت جلال الدین رومیؒ کی طرح ترغیب و ترہیب کے لئے برموقع حکایات و تمثیلات بھی بیان فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ عام لطیفوں اور بازاری حکایتوں سے بھی تہذیب و لطافت کے ساتھ ایسے نتائج و نصائح مستنبط فرماتے تھے کہ مجمع کبھی رو دیتا اور کبھی ہنس پڑتا۔ حکیم

محمد مصطفےٰ صاحب نے حضرت کے مواعظ کی زینت بننے والی حکایات کو الگ کر کے ترتیب دی تھی۔ دو جلدوں میں "امثالِ عبرت" کے نام سے شائع بھی کیا۔ جو پانچ سو سے زائد حکایات پر مشتمل ہے۔

اسی طرح بدوران وعظ عربی، فارسی اور اردو کے اشعار بھی ایسے برمحل پڑھتے کہ مضمون میں جان پڑ جاتی۔ سامعین پھڑک اُٹھتے۔ ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اور وہ بے اختیار ہو کر کہتے کہ حضرت جب شعر پڑھتے ہیں۔ تو دل اچک لیتے ہیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ گویا یہ شعر اس موقع کے لئے کہا گیا ہے۔ مگر کبھی کوئی شعر بطرز موسیقی نہیں پڑھا۔ اگر کوئی شعر برمحل یاد آجاتا۔ تو بے ساختگی کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں پڑھ دیتے۔ اگرچہ حضرت نے اشعار یاد کرنے کی طرف کبھی توجہ نہ فرمائی تھی۔ پھر بھی حضرت کے مواعظ سے جب حکیم محمد مصطفےٰ صاحب نے اشعار چنے۔ تو وہ تیرہ سو کے قریب نکلے۔ جو "ابیاتِ حکمت" کے نام سے شائع ہوئے۔

اثر و تاثیر چونکہ آپ کا ہر وعظ ادع الیٰ سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي احسن کا مظہر ہوتا جس میں نہایت حکیمانہ انداز قوی دلائل اور پختہ براہین کی روشنی میں بہترین مضامین ہوتے۔ اسلئے عوام و خواص وجد میں آجاتے۔ اور جس کی وجہ سے بسا اوقات وعظ ملتوی کرنا پڑتا۔ کیونکہ لوگوں کے وجد میں آنے سے مجمع میں انتشار پیدا ہو جاتا۔ بسا اوقات حضرت چھ چھ سات سات گھنٹے بھی وعظ کرتے رہتے اور بڑے بڑے امراء و رسار برابر بیٹھے یا کھڑے رہتے۔ خواہ ان پر دھوپ بھی آجاتی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ اور مجمع پر ایسا محویت کا عالم طاری رہتا کہ کان علیٰ رؤسهم الطير کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اچھے اچھے فلسفیوں کے فلسفے ماند پڑ جاتے۔ اور وہ حضرت کے بیان کردہ معارف کے سامنے اپنے علمی حقائق کو حقیر سمجھنے لگتے۔ پتھر دل موم ہو جاتے۔ مردہ دلوں میں جان پڑ جاتی۔ مایوس پُر امید ہو جاتے۔ خشک اور پژمردہ چہرے ہشاش بشاش نظر آنے لگتے۔ مختلف المشرب انہیں ہمشرب سمجھنے لگتے۔ مخالف الجھنے کی بجائے سلجھنے پر مجبور ہو جاتے۔ اگر کوئی کج فہم محض ہٹ دھرمی پر اتر بھی آتا۔ تو وہ بھی کچھ دیر بعد جا کر حضرت کے پاؤں پکڑ کر معافی کا خواستگار ہوتا۔ اسی لئے حضرت کے مخالفین لوگوں کو منع کرتے کہ تھانوی کے وعظ میں مت جاؤ۔ وہ کوئی عمل کر دیتے ہیں۔ کانپور میں حضرت مسلسل دو ماہ محلہ محلہ نماز پر وعظ فرماتے رہے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ مسجدوں میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے جگہ نہ رہتی۔ اور نماز کا شوق اتنا بڑھا کہ تانگے والے اپنی سواریوں سے پوچھ پوچھ کر نماز یاد کیا کرتے تھے۔

پُر لطف واقعہ شادی کے تھوڑے دنوں بعد آپ کو بمقام گنگوہ اپنے سسرال جانا پڑا۔ ان دنوں وہاں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا عرس تھا۔ وہاں کے لوگوں نے آپ کو وعظ فرمانے پر مجبور کیا۔ آپ نے ان کی درخواست پر وعظ فرمایا۔ جس میں مناسب موقعہ پر اولیاء اللہ کے فضائل بیان فرمائے۔ ساتھ ہی ساتھ بڑے جوش وخروش سے بہ احسن طریق بدعات کا رد اور سماع مروّج کی مضرت بھی بیان فرمائی۔ اس وعظ میں بڑے بڑے پیرزادے بھی موجود تھے۔ اگرچہ وعظ کا اکثر حصہ ان کے مسلک کی تردید میں تھا۔ مگر وہ اندازِ بیان سے بڑے خوش ہوئے کسی نے بُرا نہ منایا۔ بڑے اطمینان اور غور سے سب باتیں سنتے رہے۔ وہیں حضرت نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ اکثر نے تو اختلاف مشرب کی پروا نہ کرتے ہوئے حضرت کے پیچھے نماز پڑھ لی۔ مگر ایک پیرجی نے بدیں وجہ حضرت کے پیچھے نماز نہ پڑھی کہ یہ "بزرگوں" کو بُرا کہتے ہیں۔ اس سے سب کو حیرت ہوئی۔ اور انہوں نے پیرجی سے پوچھا کہ کون سے بزرگ کو بُرا کہا ہے؟ آپ نے تو بزرگوں کے فضائل بیان کئے ہیں۔ کہنے لگے "ڈھولکی کو بُرا کہا ہے"۔ پوچھا گیا کہ کیا ڈھولکی تمہاری بزرگ ہے۔ کہا! ہاں!! ڈھولکی ہماری بزرگ ہے۔ اس پر لوگ ہنسنے لگے تو وہ اور جوش میں آئے اور کہا کہ اگر جبرائیل علیہ السلام بھی آکر اس کے خلاف کہیں گے۔ تو نہ مانوں گا۔ شکر ہے حضورؐ کا نام ناحق نہ لے دیا۔ اس پر سب لوگوں نے اسے برا بھلا کہا۔ اور وہاں کے باشعور پیرزادوں نے اسے سمجھایا کہ:۔

"یہ حضرات علماء ہیں۔ ان کو حق ہے کہ شریعت کے احکام ہم کو بتائیں۔ صوفیہ نے ہمیشہ شریعت کا ادب کیا ہے۔ احکام شریعت کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کیا ہے۔ اور کبھی مزاحمت نہیں کی"۔

جب اس نے اپنے پیرزادوں کو بھی حضرت کی تائید وحمایت میں بولتے دیکھا۔ تو پھر اسے کچھ ہوش آئی اور پوچھا کہ انہوں نے جبہ شریف کی بھی زیارت کی تھی؟ لوگوں نے بہ مسرت کہا کہ ہاں! حضرت نے اس کی زیارت کی تھی۔ اس پر وہ بہت خجل ہوا۔ اور تھانہ بھون جا کر حضرت سے معافی مانگی۔ اس واقعہ کو نقل کرکے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"پہلے زمانہ کے پیرزادے بھی غنیمت تھے۔ کیونکہ وہ اللہ اللہ کرنے والے تھے گو غلطیوں میں مبتلا تھے۔ مگر اللہ کا نام لینے کی برکت تھی۔ آج کل تو اکثر محض دکاندار ہی ہیں"۔

اندازِ بیان اختلافی مسائل پر حضرت جب بھی وعظ فرماتے۔ تو وہ مختلف المشرب حضرات کے مرید

یا تعاقداروں کو ان سے برگشتہ کرنے کی قطعاً کوشش نہ کرتے۔ بلکہ ایسے احسن طریق سے بات کر جاتے کہ وہ تلخ و ترش باتیں سن کر بھی یہی سمجھتے کہ ہماری تائید ہو رہی ہے۔ مارواڑ میں ایک جگہ حضرت کا وعظ تھا۔ وہاں کے پیرزادے کو خوف لاحق ہوا کہ یہ میرے مریدوں کو مجھ سے برگشتہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے وہ چپکے سے اپنے "مطلب" کے کسی عالم کو لے کر وعظ میں آ بیٹھے۔ کہ جونہی حضرت کوئی بات ان کے مفاد کے خلاف کریں گے۔ یہ اس عالم سے حضرت کا مناظرہ کرا دیں گے۔ حضرت کو اس بات کا قطعاً علم نہ تھا۔ مگر منجانب اللہ مناسب حال مضمون ہی معرض بیان میں آگیا۔ جس میں آپ نے انتہائی لطیف انداز میں لوگوں کی توجہ ایسے پیرزادوں سے ہٹانے کے لئے فرمایا:۔

"بزرگوں کی اولاد کا بھی حق ہے کہ ان کی مالی خدمت ضرور کی جائے۔ لیکن ان سے دین کی خدمت ہرگز نہ لی جائے۔ مسئلہ مسائل پوچھنے کی ان کو ہرگز زحمت نہ دی جائے اور یہ کام علماء سے لیا جائے۔ کیونکہ وہ واقف ہیں۔ لیکن علماء کی مالی خدمت نہ کی جائے کیونکہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ سب بقدر حاجت تحصیل معاش کر رہے ہیں اور ان بزرگ زادوں کا اور کوئی ذریعہ معاش نہیں۔ لہٰذا مالی خدمت تو ان کی کی جائے۔ اور کام علماء سے لیا جائے۔"

یہ سن کر وہ پیرزادے بڑے خوش ہوئے۔ اور بعد وعظ مناظرہ کرانے کی بجائے حضرت کے ہاتھ چومے حالانکہ حضرت نے ان کی جڑیں کاٹ دی تھیں۔

اظہارِ حق بقول صاحب اشرف السوانح:۔

"حضرت والا نے ضرورت کے موقعوں پر بڑے بڑے معرکتہ الآرا مباحث اور مختلف فیہ مسائل پر وعظ اس خوبی کے ساتھ فرمائے کہ نہ اظہار و احقاق حق میں کچھ تامل فرمایا۔ نہ تردید و ابطال باطل میں کوئی کسر اٹھا رکھی۔ نہ کسی کی ذرا دل آزادی کی نہ تہذیب کو کبھی ہاتھ سے جانے دیا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ:۔

کریلا تو کھلاتا ہوں۔ لیکن چٹ پٹے مسالوں سے مزیدار بنا کر اور کونین کی گولی شکر میں لپیٹ کر دیتا ہوں کہ ناگواری کی بجائے خوشگواری کے ساتھ بسہولت حلق سے اتر جائے۔"

چنانچہ اکثر دیکھا گیا کہ آپ نے نو تعلیم یافتہ اور روشن خیالوں کو ایسے دل آویز عنوان سے کھری کھری باتیں سنائیں کہ وہ ناراض ہونے کی بجائے خوش ہوتے تھے اور اچھا اثر قبول کرتے رہے۔

مؤتمر الانصار کے اجلاس میرٹھ میں ایک متشدد واعظ نے انگریزی خوانوں کو بہت بُرا بھلا کہا۔ یہاں تک کہ ملعون کہہ دیا۔ جسے انہوں نے بُرا منایا۔ دوسرے روز حضرت تھانوی ؒ نے وہی مضمون اس تمہید کے ساتھ بیان فرمایا کہ:۔

"مولانا نے بوجہ وقت کی کمی کے جو کچھ فرمایا تھا مجمل فرمایا تھا۔ چونکہ وہ مضمون ضروری ہے اس لئے میں آج اسی کی تفصیل عرض کرتا ہوں"۔

اس پر وہ بچارے اور گھبرائے۔ کہ حضرت تھانوی اب خوب آڑے ہاتھوں لیں گے۔ مگر ان کا یہ توحش بالکل غلط نکلا۔ کیونکہ اگرچہ حضرت نے ان سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں کے عقائد ملحدانہ اور کفریہ کی تفصیل تشریح کی۔ مگر اس تہذیب ولطافت کے ساتھ کی کہ زبان فیض ترجمان سے کوئی متوحش لفظ نہ نکلا۔ اور اس کے بعد فیصلہ خود انہی لوگوں پر چھوڑ دیا کہ:۔

"جس کے ایسے ایسے عقائد و اعمال ہوں۔ اس کے بارے میں شریعت مقدسہ کو سامنے رکھ کر آپ کیا حکم دیتے ہیں"۔

تو انہیں ناگواری کے ساتھ نہیں خوشگواری کے ساتھ ندامت کے لہجہ میں تسلیم کرنا پڑا کہ:۔

"واقعی ہم لوگ ایسے ہیں"۔

اس پر حضرت نے آخری اصلاحی تازیانہ لگایا کہ:۔

"اگر آپ واقعی اپنی اصلاح چاہتے ہیں۔ تو آپ جس کو محقق سمجھتے ہوں۔ اس کے پاس جا کر کم از کم چالیس روز مہمان رہیں لیکن خاموشی کے ساتھ۔ اور اپنے تمام شبہات لکھ کر ان کے حوالے کر دیں۔ پھر وقتاً فوقتاً جو باتیں مجلس میں ہوتی رہیں۔ ان کو سنتے رہیں اور تنہائی میں ان پر غور کریں۔ میں اللہ کے بھروسہ پر دعا بلکہ دعویٰ کرتا ہوں کہ اس مدت میں باین تدبیر انشاءاللہ تعالیٰ شبہات دور ہو کر کم از کم عقائد تو بالکل درست ہو جائینگے جب عقائد درست ہو گئے تو ان کی برکت سے انشاءاللہ رفتہ رفتہ اعمال بھی درست ہو جائیں گے"۔

اس سے ان پر اور بھی زیادہ اچھا اثر پڑا کہ یہ صرف دعویٰ نہیں کرتے بشاہدہ بھی کرانے کو تیار ہیں۔ یہ صرف حسن بیان کی برکت تھی۔ کہ لوگوں کی لغزشیں اور خطائیں آئینہ بن کر ان کے سامنے آجاتی تھیں۔ اور وہ حضرت کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اپنی سیرت کی بدصورتی دیکھ کر حیران و سرگرداں ہو جاتے تھے۔

اعجازِ بیان مناسب موقع تقریر کرنے میں تو حضرت کو کمال حاصل تھا۔ کانپور کے قیام کے زمانہ میں جب حضرت نے یہ دیکھا کہ عشرہ محرم میں اہل سنت والجماعت بھی اہل تشیع کی مجالس عزا کو رونق دیتے ہیں۔ تو اس حکیم الامت نے ان کی عادت کی نبض دیکھ کر اس کا یوں علاج کیا کہ آپ نے بھی اول عشرہ محرم میں روزانہ بالترتیب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے واقعاتِ وفات بیان کرنے شروع کر دیئے۔ تاکہ مشاہیرِ اسلام کے حالاتِ زندگی سننے کی عادت بھی نہ چھوٹے۔ اور اہل عزا کے ساتھ تشبہ بھی نہ رہے۔ مجدد کا بس یہی کام ہوتا ہے کہ وہ اپنی بصیرت وفراست سے لوگوں کی فطرت معلوم کر کے ان کی عادت نہیں بدلتا۔ ہیئت بدل دیتا ہے۔ حضرت کی مجلس کا رنگ ایسا نکھرا کہ اب ادھر مجمع ہونا شروع ہو گیا۔ صرف سنی ہی نہیں شیعہ بھی بکثرت حضرت کی مجلس میں آنے لگے۔ جس سے ان کی اپنی مجلسیں پھیکی پڑ گئیں۔ اب جو حضرت کا بیان شروع ہوا۔ تو انہوں نے اول تینوں خلفائے عظام کے واقعات کچھ اس انداز سے پیش کئے۔ کہ اہل تشیع حضرات کے ساتھ سب روتے تھے۔ اور شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ اس خوبی سے بیان فرمائی کہ ہائے ہائے کرنے والے واہ واہ کرنے لگے۔ اور اتنے دردبھرے واقعہ پر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو نہ نکلا۔ حالانکہ اس میں شیعہ بکثرت موجود تھے۔ حضرت کے اس کارنامہ پر لوگوں کو صرف حیرت ہی نہ ہوئی بلکہ عظمتِ حسین رضی اللہ عنہ کا انہیں کو پہلی بار احساس ہوا۔

اس طرح ایک موقع پر حضرت نے بارِ خلافت کی ذمہ داریوں اور دشواریوں کا بیان فرماتے ہوئے شیعہ حضرات سے فرمایا کہ:-

> "آپ حضرات کو خلفائے ثلثہ کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ۲۴ سال تک راحت میں رکھا۔ ورنہ بجائے ۶ سال کے ۳۰ سال تک مصیبت بھگتنی پڑتی۔ کیونکہ شروع خلافت سے تیس سال تک حضرت علی رضی اللہ زندہ رہے۔ جس میں صرف چھ سال خود خلیفہ رہے۔"

جس سے اکثر کے خیالات بدل گئے۔

حجتِ محبت نظامِ قدرت کا یہ دستور ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا و سزا کا کچھ یہاں بھی احساس و مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح و ترقی کی طرف زیادہ توجہ کرے اگرچہ ہر حادثہ کسی نہ کسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر اربابِ بصیرت تو اسے مسبب الاسباب کی طرف قریب کرتے ہیں اور کور سوا دا سے کسی اتفاقی سبب پر محمول کرتے ہیں۔ مقربین الی اللہ کو اکثر ایسے واقعات

پیش آتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ...... جو جتنا زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اس پر حجت بھی اتنی زیادہ ہوتی ہے۔ جیسے ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی کام کے سلسلہ میں لفظ "انشاء اللہ" فرمانا سہواً رہ گیا۔ جس پر کئی دنوں تک وحی کا آنا رک گیا تھا۔

حضرت تھانویؒ کے خطبات و مقالات سے چونکہ ہزاروں لوگ فیض یاب ہو رہے تھے جسے محسوس کرتے ہوئے ایک دن آپ کی زبان سے یونہی برسبیل تذکرہ یہ الفاظ نکل گئے کہ:۔

"بھلا ہو سکتا ہے۔ بُرا بھلا بیان کر لیتا ہوں۔ پہلے سے سوچنے یا کتاب دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ جو کچھ بیان ہوتا ہے۔ وہ وقتی واردات ہوتے ہیں"

اس فی البدیہہ آمد سے حضرت کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ:۔

"مجھ میں قوتِ بیانیہ زبا نداتوں کی سی نہ سہی۔ مگر کچھ تو کہہ ہی لیتا ہوں"۔

بس اتنی سی بات پر قوتِ بیانیہ سلب ہو گئی۔ "کچھ تو کہہ ہی لیتا ہوں"۔ کی جگہ یہ فرماتے کہ "کچھ تو کہلوا ہی دیتا ہے" تو وہ مالک و خالق جس نے آپ کو محبوب خلائق بنا دیا تھا زیادہ راضی ہو جاتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس خیال کے پیدا ہونے کے بعد جب آپ گرمی خام میں وعظ کہنے بیٹھے تو وہی الفاظ و مضامین جو وقت وعظ صفوں کی صفیں بنا کر بغرض انتخاب سامنے آجاتے تھے۔ قریب بھی نہ پھٹکے۔ بس اب وہ حضرت خالی الذہن ہو کر بیٹھے تھے۔ فرمایا:۔

اعترافِ عجز

"بہتیرا سوچ ساچ کر پھیر پھار کر بیان کرنا چاہا۔ مگر کچھ بیان نہ ہو سکا اور بالکل تقریر نہ چل سکی۔ کوئی مضمون ہی ذہن میں نہ آیا۔ آیت پڑھ کر اس کا ترجمہ کیا۔ پھر طبیعت بند۔ مرادفات بڑھا کر مکرر ترجمہ کیا کہ شاید اس سے کچھ طبیعت کھلے اور آگے کو سلسلہ چل سکے۔ لیکن اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔ مجبور ہو کر میں نے چاہا کہ لاؤ کوئی مضمون پہلے کا بیان کیا ہوا ہی بیان کر دوں۔ کیونکہ آخر بہت سے مضامین پہلے کے بیان کئے ہوئے اور پڑھے ہوئے ہی تھے۔ لیکن اس وقت کوئی ایسا مضمون بھی یاد نہ آیا۔ اور نہ ہی ذہن کچھ کام دیتا تھا۔

احساسِ اشتباہ

اب مجھے معلوم ہو گیا کہ اس وقت مجھ کو دراصل بیان پر قدرت ہی نہیں رہی لہٰذا مجبور ہو کر میں نے مجمع سے کہہ دیا کہ صاحبو! اس وقت کوئی مضمون ہی ذہن میں نہیں آتا۔ کیا بیان کروں۔ بس آپ دعا کیجئے۔ چنانچہ دعا کر کے بیان ختم کر دیا شروع کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیا۔ شرم بھی آئی کہ وعظ کا سامان۔ فرش۔ چوکی وغیرہ

سب کچھ ہوا۔ لوگ بھی وعظ سننے کے لئے بہت اشتیاق سے جمع ہوئے۔ لیکن مجھ سے کچھ بیان نہ ہو سکا۔ سب کو تعجب تھا۔ کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن مجھے کچھ بھی تعجب نہ تھا کیونکہ مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ یہ اللہ تعالےٰ نے میرے ناز کا علاج کیا ہے اور میرے اس خطرہ کا جواب دیا ہے۔ جو مجھ کو اس واقعہ سے قبل بھی گزرا تھا۔ کہ مجھے بیان پر قدرت حاصل ہے۔

کرشمۂ قدرت اللہ تعالےٰ نے دکھا دیا کہ یہ سب ہماری توفیق ہے۔ ورنہ تمہیں کچھ بھی قدرت حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اس خیال سے توبہ کی۔ بس پھر کبھی ایسا نہیں ہوا۔ عمر بھر میں ایک ہی مرتبہ یہ صورت واقع ہوئی۔ اور اللہ تعالےٰ نے ساری عمر کیلئے سبق دے دیا۔ تاکہ کبھی وسوسہ بھی نہ آسکے۔ کہ ہم جب چاہیں بیان کر سکتے ہیں۔ اور یہ دکھا دیا کہ جو بیان ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوتے ہیں"۔

بڑے آدمیوں کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ وہ اعتراف گناہ میں دیر نہیں کرتے۔ ورنہ ایسے موقعوں پر لوگ عام طور پر تاویل سے کام لیتے ہیں۔ اور ناسازیٔ طبع وغیرہ کا عذر کر کے اپنے عیب پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔

خطِ خرافات دنیا میں ایسا کوئی پیغمبر یا ولی نہیں گزرا جسے احکامِ الٰہی سنانے کے عوض مخالفین کے سب وشتم کا نشانہ نہ بننا پڑا ہو۔ حضرت تھانوی بھی اس قاعدہ اور کلیہ سے مستثنےٰ نہ تھے۔ جب آپ بلاخوف لَوْمَۃَ لَائِمٍ رد بدعات فرماتے تو مخالفین کے سینوں پر سانپ لوٹ جاتے۔ مگر حضرت کے خداداد رعب سے بدورانِ وعظ کسی کو لب کشائی کی کبھی ہمت نہ ہوئی۔ البتہ جونپور میں قبل از وعظ حضرت کو ایک خط بذریعہ ڈاک ملا جس میں درج تھا کہ تم جولاہے ہو۔ جاہل ہو اور کافر ہو۔ ذرا سنبھل کر بیان کرنا۔

جامع جواب حضرت نے قبل وعظ مجمع کو خطاب کرتے ہوئے مضمونِ خط سے آگاہ کرنے کے بعد فرمایا کہ:۔

"میں آپ سے اس امر میں یہ مشورہ چاہتا ہوں۔ یہ جو لکھا ہے کہ تم جولاہے ہو۔ تو اگر میں جولاہا بھی ہوں۔ تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں یہاں کوئی رشتے ناتے کرنے تو نہیں آیا۔ صرف احکامِ الٰہی سنانے آیا ہوں۔ اس کو قومیت سے کیا علاقہ۔ دوسرے یہ چیز اختیاری بھی نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے جس کو جس قوم میں چاہا پیدا فرما دیا۔ سب قومیں اللہ کی بنائی ہوئی

ہیں۔ یہ سب اچھی ہیں۔ اگر اعمال واخلاق اچھے ہوں۔ یہ تو تھی مسئلہ کی تحقیق۔ رہی واقعہ کی تحقیق۔ اس کی مسئلہ کی تحقیق کے بعد ضرورت ہی نہیں رہتی۔ بہرحال اگر آپ کو مجھ پر اعتبار ہے تو میں مطلع کرتا ہوں کہ میں جاہل نہیں۔ اگر تحقیق کا شوق ہے۔ تو وہ میرے عمائدِ وطن سے کی جا سکتی ہے۔ البتہ اتنا اقرار کرتا ہوں کہ میں جاہل بلکہ اجہل ہوں لیکن جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا ہے اور کتابوں میں پڑھا ہے۔ وہی نقل کر دیتا ہوں۔ اگر کسی کو کسی بات کے غلط ہونے کا شبہ ہو تو اس پر عمل نہ کرے۔

باقی رہا کافر ہونے کا معاملہ۔ اس میں قیل وقال کی ضرورت نہیں۔ میں آپ صاحبان کے سامنے پڑھتا ہوں اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ علے والہٖ وسلم اگر میں نعوذ باللہ کافر تھا۔ تو اب نہیں رہا۔ دھمکی کے متعلق عرض یہ ہے کہ وعظ گوئی میرا پیشہ نہیں ہے۔ اگر آپ صاحبان نہ چاہیں۔ تو میں ہرگز بیان نہ کروں گا۔ رہا سنبھل کر بیان کرنا۔ تو اس کے متعلق صاف صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ میری عادت خود ہی چھیڑ چھاڑ کی نہیں ہے یعنی کبھی کوئی بات ایسی بیان نہیں کرتا۔ جس سے کسی کی دلآزاری ہو۔ یا فساد پیدا ہو۔ لیکن اگر اصولِ شرعیہ کی تحقیق کے ضمن میں کسی ایسے مسئلہ کے ذکر کی ضرورت ہی آ جاتی ہے۔ جس کا رسوم بدعیہ سے تعلق ہو۔ تو پھر میں رکتا بھی نہیں۔ اسلئے کہ یہ صریح دین میں خیانت ہے۔

تجویز و مشورہ ان باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب جو آپ کی رائے ہو مطلع فرمایئے اگر اس وقت کوئی ادنیٰ شخص بھی مجھ سے کہہ دیگا کہ بیان نہ کیا جائے۔ تو ہرگز نہ کروں گا۔ لیکن اس کے متعلق میرا مشورہ یہ ہے کہ مجھے بیان کرنے دیا جائے جب کوئی بات خلافِ طبع کرنے لگوں۔ مجھے فوراً روک دیا جائے۔ فی الفور بیٹھ جاؤنگا بہتر تو یہ ہے کہ صاحبِ خط ہی مجھے روک دیں۔ اگر انہیں شرم آئے یا ہمت نہ پڑے تو کسی دوسرے کو سکھلا پڑھا دیں۔ وہ ان کی طرف سے مجھے روک دیگا"۔

بس پھر تو بڑے بڑے بدعتی جو اس مجمع میں موجود تھے۔ خط لکھنے والے کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ مگر حضرت نے انہیں روک دیا کہ گالیاں نہ دیجئے۔ مسجد کا احترام کیجئے۔

ردِ بدعات اس کے بعد حضرت نے ردِ بدعات پر حسب عادت تہذیب ومعقولیت کے ساتھ

غیر دل آزادانہ طریق پر پرجوش تقریر فرمائی کہ حضرت کی طرف سے روک دینے کا اختیار پانے کے باوجود کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ البتہ تصوف کے بیان پر بدعتی سبحان اللہ کہتے رہے۔ اور جب رد بدعات ہونے لگا۔ تو سب منقار زیر پر رہے حالانکہ ان میں ایک با اثر کٹر بدعتی معقولی مولوی اور پھر پٹھان بھی موجود تھا۔ جس کی عادت تھی کہ جو بھی وعظ میں کوئی بات خلاف طبع کہتا۔ یہ وہیں ہاتھ پکڑ کر منبر سے اتار دیتا۔ لیکن خدا کے فضل سے اس نے بھی دم نہ مارا اور چپکے سے بیٹھا سب کچھ سنتا رہا

اعترافِ حکمت | لیکن جب وعظ ختم ہونے کے بعد سب مجمع رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہوا تو اس مولوی پٹھان نے حضرت سے صرف اس قدر کہا کہ :۔

"ان مسائل کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

انہیں ایک دوسرے بدعتی خیال کے ذی اثر مولوی صاحب حضرت کی حمایت میں کچھ کہنے لگے کہ حضرت نے انہیں روک دیا کہ :۔

"خطاب مجھ سے ہے، آپ جواب نہ دیں۔ مجھے عرض کرنے دیں"۔

اور پھر ان معقولی مولوی صاحب سے فرمایا :۔

"آپ نے یہ بات پہلے مجھ سے کیوں نہ فرمائی۔ جب میں نے مشورہ طلب کیا تھا اور پھر بیان میں کیوں نہ روکا۔ جبکہ میں نے آپ کو اختیار دیا تھا۔ اب اور تو کچھ نہیں ہو سکتا مجمع ابھی موجود ہے۔ آپ ابھی پکار کر کہہ دیجئے کہ اس بیان کی کوئی ضرورت نہ تھی اگرچہ وہ میرے نزدیک ایک ضروری بیان تھا۔ مگر میں آپ کی تکذیب نہ کرونگا"۔

اس پر لوگ ہنس پڑے اور وہ صاحب اپنی اہانت کے خوف سے حضرت کی حکمت عملی کا امتحان کرتے ہوئے چل دیئے۔ لوگ انہیں برا بھلا کہنے لگے۔ تو حضرت نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ "صاحبو۔ ایک پردیسی کی وجہ سے آپ اپنے مقامی علماء کو ہرگز نہ چھوڑیں"۔

عزت و راحت | ان واقعات کو بیان کر کے حضرت فرمایا کرتے تھے۔ کہ :۔

"الحمد للہ بڑے بڑے مخالفین میں وعظ کہنے کا اتفاق ہوا لیکن کبھی کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ نہ کہیں بے آبروئی ہوئی۔ یعنی ایسی جس کو عادۃً بے آبروئی سمجھا جاتا ہے۔ مختلف مقامات پر جانا ہوا اور مختلف الخیال لوگوں سے سابقہ رہا۔ کہیں اپنے مسلک اور مشرب کو چھپایا نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سب جگہ عزت

اور آرام ہی کے ساتھ عمر بھر رکھا۔ البتہ دو بار قدرے خلجان پیش آیا۔ جو حدِ کلفت تک نہ پہنچا تھا۔"

موقع شناسی ایک ہم وطن دوست کی طلب پر ایک دفعہ حضرت تھانویؒ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے ہمراہ جو جسپور تشریف لے گئے۔ جہاں متعدد وعظ ہوئے۔ جن سے اہلِ بستی بھی خاطر خواہ طریق پر متاثر ہوئے۔ ایک روز اس میزبان نے حضرت کے وعظ کے لئے ایسے مقام کا اعلان کیا۔ جہاں کے لوگ نہ صرف اہلِ فساد اور اہلِ عناد بدعتی تھے۔ بلکہ وہ میزبان سے ذاتی کدورت بھی رکھتے تھے۔ پھر یہ اعلان ان کی رضا و مشورہ کے بغیر کیا تھا۔ اسلئے وہ یوں سمجھے کہ ان کو زک پہنچانے کے لئے یہ حضرت کا وعظ کرا رہے ہیں۔ جبکہ ہماری طرف سے کوئی درخواست وعظ نہیں۔ اسلئے ہم اپنی مسجد میں وعظ نہ ہونے دیں گے۔ میزبان کو بھی اس بات کا علم ہو گیا۔ اور اس نے پولیس کی امداد کا انتظام کر لیا تا کہ کسی قسم کا اندیشہ فساد نہ رہے۔ جب حضرت تھانویؒ کو اس کیفیت کا علم ہوا۔ تو انہوں نے حسبِ عادت ایسی تشویش کی جگہ پر وعظ نہ کرنے کا اعلان فرما دیا۔ مگر مولانا خلیل احمدؒ نے فرمایا اگر ایسا بھی ہو۔ تب بھی تبلیغِ حق میں ایسے امور کی پرواہ نہ کرنا چاہیئے مولانا کے اس ارشاد پر حضرت نے بدیں وجہ موافقت کر لی کہ

"ایک اس وجہ سے کہ منشاء اس رائے کا دین ہے۔ گو وہ امر اجتہادی ہے جس میں موافقت واجب نہیں۔ مگر ناجائز بھی نہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ جب مولانا جانے کو تیار ہیں۔ تو میں کیا چیز ہوں کہ اپنی جان بچاؤں۔"

جب یہ حضرات اس مسجد میں پہنچے۔ تو سب نے بلا سلام و کلام غیظ آلود نگاہوں سے استقبال کیا۔ یہ سب حضرات خاموشی سے بیٹھ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر سنتیں پڑھنے لگے کہ دونوں طرف سے آویزش ہو گئی یہاں تک کہ لوگوں کو سنتیں بھی بھول گئیں کہ وعظ نہیں ہونے دیں گے۔ ایک اُٹھ کر خود منبر پر بیٹھ گیا۔ کہ جب منبر ہی فارغ نہ ہوگا۔ تو وعظ کس پر بیٹھ کر کریں گے۔ بعض نے آستینوں سے خنجر نکال لئے۔ مولانا تو اسلئے مطمئن تھے کہ حضرت خود تمام حالات پر قابو پا لیں گے اور حضرت اس لئے متفکر تھے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہو جائے۔ کیونکہ جس امدادی پولیس کا آپ کے میزبان نے انتظام کر رکھا تھا۔ اس کا بھی کہیں نام و نشاں ہی نظر نہ آتا تھا۔ حضرت نے سنتوں سے فارغ ہوتے ہی بھانپ لیا کہ یہ سارا غیظ و غضب اس احتمال پر ہے کہ کہیں وعظ نہ ہونے لگے۔ اس لئے آپ نے مفسدین کے سرغنہ کو اپنے پاس بلایا۔ وہ حضرت کے رعب سے آ گیا۔ مگر بڑے غصہ سے

کہا کہیئے! حضرت نے فرمایا:-

"تم کو یہ شبہ ہے کہ وعظ ہو گا۔ سوسن لو۔ میں ہی وہ واعظ ہوں۔ میرا وعظ ایسا ارزاں نہیں کہ کسی کے سر ہو کر کہوں۔ میں تو بہت خوشامد کرا کر وعظ کہتا ہوں۔ اور اس حالت میں تو کسی طرح کہہ ہی نہیں سکتا۔ تم اطمینان رکھو۔ میں ہرگز وعظ نہ کہوں گا۔ خواہ تمام اہل محلہ بھی درخواست کریں۔ تم لوگ دمنت۔ یہ اعلان میرے مشورہ کے بغیر اور میرے منشاء کے خلاف ہوا ہے۔"

اس سے نہ صرف وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ بلکہ سب خاموش ہو گئے۔ فضا میں سکون پیدا ہوتے ہی حضرت مع مولانا و ہمراہیوں کے مسجد سے رخصت ہوئے۔ انہیں راستہ میں محافظانِ امن کا ایک دستہ ایک سب انسپکٹر کی زیر سرکردگی آتے ملا۔ وہ کہنے لگے حضرت چلئے۔ وعظ فرمایئے۔ آپ نے فرمایا۔ سبحان اللہ کیا موقع پر پہنچے ہیں۔ یہاں تو خون ہو جاتا۔ آپ کا آنا کس مصرف کا ہوا۔

ع پس ازاں کہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

اس پر مولانا بحسرت فرمانے لگے کہ:-

"راہ حق میں ایسی کلفت بھی کیسی لذت بخش ہے"۔

اُدھر مفسدین کا سرغنہ کہہ رہا تھا:-

"ان لوگوں کی کیا بات ہے۔ ان لوگوں کی تو جوتیاں ہم اپنے سر پر رکھ لیں۔ یہ سارا فساد ان کے میزبان کا ہے۔ جس نے اپنی رائے سے اعلان کر دیا۔ ہم کو وعظ ہونا ناگوار نہ تھا۔ بلکہ یہ متغلبانہ تصرف ناگوار ہوا۔ ہم کو خاص طور پر اطلاع کی جاتی۔ تو ہم خود حاضر ہو کر وعظ کی درخواست کرتے۔ پھر آنے والوں کے لئے خاص طور پر فرش کا۔ برف کا۔ شربت کا انتظام کرتے۔ اس طرح ہماری سخت اہانت تھی۔ جو کسی طرح گوارا نہ تھی"۔

گویا یہ غلجان محض حضرت کے میزبان کی کوتہ اندیشی کی وجہ سے ہوا۔

قاتلانہ حملہ

اسی طرح آپ کو ایک مرتبہ بمبئی میں بھی کلفت کا سامنا ہوا۔ آپ وہاں اپنی چھوٹی اہلیہ محترمہ کو لینے گئے۔ جو حج سے واپس آ رہی تھیں۔ وہاں عام طور پر حکیم محمد سعید صاحب کے ہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ اس دفعہ ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے ایک اور صاحب نے ازراہِ محبت اپنے ہاں ٹھہرا لیا۔ مغرب کی نماز حضرت نے ان کے محلہ کی مسجد میں پڑھی۔ اتفاق سے ان دنوں کوئی مناظرہ ہونے والا تھا۔ جس کے سلسلہ میں باہر سے بعض مناظرین نے آنا تھا۔ چونکہ

جہاز دیر سے پہنچا تھا۔ اسلئے کپتان نے سواریوں کو نہ اُترنے دیا کہ صبح اتاریں گے۔ جس کی وجہ سے حضرت کو رات وہاں رہنا پڑا۔ اہلِ محلہ کو جو جماعت مفسدین سے تعلق رکھتے تھے، شبہ ہوا کہ شاید حضرت بھی اس مناظرہ کے سلسلہ میں آئے ہیں۔ اسلئے انہوں نے تحقیق کئے بغیر نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بمصداق

ہر چہ خواستش دیم کشتہ روئے را ۔۔۔ چو محبت نما نا جفا جوئے را

مسلح ہو کر بعد عشاء دندناتے بے جا کرتے ہوئے اس مکان میں گھس آئے اور لالٹین توڑ کر حضرت پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ جس کو حضرت کے ایک ہمراہی رئیس کے ملازم نے روکا اور حضرت اس تاریکی میں سڑک کی طرف ایک برآمدہ میں ہو گئے۔ جہاں سے صاحب خانہ نے پولیس کو آواز دی۔ جس پر وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے اور اس طرح حق تعالیٰ نے سب کو محفوظ رکھا صبح کو مجیبین نے پولیس کمشنر کو اطلاع دی۔ اس نے کہا کہ صاحب معاملہ کو تکمیل تفتیش تک ٹھیرنا پڑے گا۔ اس وقت تک یہ امر تصدیق ہو چکا تھا کہ حملہ آوروں کو حضرت کے شرکت مناظرہ کا دھوکا ہوا تھا۔ اسلئے حضرت نے اس غرض کے لئے وہاں ٹھہرنا گوارا نہ کیا۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"مجھ کو یہ دو وجہ سے منظور نہ ہوا۔ ایک تو اسلئے کہ میں جہاز کی ملی گھر پہنچانا چاہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ان لوگوں کا یہ فعل عمداً نہ تھا۔ قتل خطا کی طرح قابل قصاص نہ تھا پھر ایسے مواخذات اپنے بزرگوں کی وضع کے بھی خلاف تھے۔ البتہ میں نے مکان بدل لیا اور پھر آزادانہ پھرتا رہا۔ کیونکہ ان کو دھوکہ ہونا محقق ہو گیا تھا۔ اور امن و امان سے اپنے وطن واپسی ہوئی۔ یہ قصہ اتنا غلط مشہور ہوا کہ قتل تک کی روایتیں پھیل گئیں۔ تحقیق کے لئے دوستوں کے خطوط آئے۔ واقعیت معلوم کر کے سب مطمئن ہو گئے۔ غرضیکہ بفضلہ تعالیٰ کسی سفر میں میرے کسی فعل کی وجہ سے کسی کو کوئی ناگواری یا برہمی نہیں ہوئی۔ اور ان دو مقام یعنی بمبئی اور حیدرآباد میں جو ہوا۔ غیروں کے سبب ہوا۔ اور ان کے اثر سے بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت رہی۔"

عزمِ سفرِ یورپ حضرت تھانویؒ نے چونکہ تبلیغِ دین کو مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔ اسلئے اس غرض کے لئے آپ ہر جگہ جانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے اور بعد زمانی و مکانی کو قطعاً خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آپ کے ایک ہم وطن بابو حبیب احمد صاحب تھانوی کسی کام کے سلسلہ میں یورپ تشریف لے گئے۔ وہاں واقفیت بڑھنے پر انہوں نے لوگوں کے سامنے وقتاً فوقتاً اسلام کی خوبیاں بیان کرنی شروع کر دیں۔ جس کے نتیجہ کے طور پر وہاں کچھ

لوگ مسلمان ہو گئے۔ جن میں بعض بڑے طبقہ اور بڑے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ اکثر مسائل کے سلسلہ میں حضرت تھانوی ؒ سے بذریعہ خط وکتابت معلومات حاصل کرتے تھے اور نومسلموں کے نام بھی تجویز کرایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک کالج کی پروفیسر یا پرنسپل جو مسلمان ہوئی حضرت نے اس کا نام "پراڈے" "بریدہ" میں بدل دیا۔ جس سے وہ بہت خوش ہوئی۔ اور حضرت کی خدمت میں شکریہ کا خط بھیجا۔

اس خط وکتابت کی وجہ سے بعض نومسلموں کو حضرت سے غائبانہ تعلق پیدا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کا خط بھی حبیب صاحب کی معرفت آیا کہ ہمیں حاضری کا اشتیاق ہے مگر پردہ کے پابند نہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ ہماری عورتوں کی حاضری باعث ناراضی ہو۔ اس محقق کامل نے جواب میں لکھا کہ:-

"وجہ اور کفین کا ستر فی نفسہٖ واجب نہیں۔ بلکہ فتنہ کے سبب مامور بہ ہے۔ اور آپ کی عورتوں کی طرف یہاں کے لوگوں کو رعب کی وجہ سے کسی قسم کا نفسانی خیال ہونا بعید ہے۔ لہٰذا انتفاء علت کے سبب ان کو اس کی اجازت مل سکتی ہے"۔

اسی خط وکتابت کے دوران میں بابو حبیب احمد صاحب نے حضرت کو تبلیغی اغراض کیلئے یورپ آنے کی دعوت دی اور مترجم کی حیثیت سے اپنی خدمات بھی پیش کیں۔ چونکہ وہاں تبلیغ کے بہت ہی زیادہ اور مفید نتائج برآمد ہونے کی اُمید تھی۔ اسلئے آپ نے فوراً یورپ کا عزم کر لیا اور اس غرض کے لئے اپنے پاس سے مصارف اور ایک مدبر ترجمان کا بھی انتظام کر لیا مگر روانگی سے قبل آپ نے انہیں خط لکھا کہ:-

"آنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے کچھ شبہات لکھ کر بھیج دیں اور یہاں سے جو جواب پہنچے۔ وہ ان کو سنا دیا جائے۔ تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ آیا میرے جواب ان کے مذاق کے موافق بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ اگر اس سے نفع ہو۔ تو آنا مناسب ہوگا۔ ورنہ اتنا طویل سفر کیوں اختیار کیا جائے"۔

مگر یہ ابھی ان تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ بابو حبیب احمد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ جس کی وجہ سے آپ اس تبلیغی دورہ پر نہ جا سکے۔

فتنہ ارتداد ۱۳۴۱ھ میں اطراف آگرہ کی طرف فتنہ ارتداد پھیل گیا۔ اس کے انسداد کے لئے آپ نے مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی اور مولانا عبدالمجید صاحب بچھرایونی کو روانہ فرمایا

تاکید فرمائی کہ مبلّغ کو لوگوں پر کھانے کا بار اور کسی قسم کا بار ہرگز نہ ڈالنا چاہیئے حتیٰ کہ اگر وہ خوشی سے کوئی خدمت کرنا چاہیں۔ تب بھی عذر کر دیا جائے۔ صرف اس کی اجازت ہے کہ اگر کوئی شخص مبلّغ سے آٹے وغیرہ کے پیسے لے کر کھانا پکوا دے تو مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ کسی مقامی مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ اور کوئی شرعی مانع بھی نہ ہو۔ اور اس کی بھی اجازت عطا فرمائی کہ جن ضروری چیزوں کا انتظام مبلغ خود نہ کر سکے۔ مثلاً چارپائی۔ وہ اگر کوئی شخص خوشی سے پیش کرے۔ تو استعمال کا مضائقہ نہیں۔ مگر از خود ایسی اشیاء بھی طلب نہ کی جاویں۔ البتہ کسی کے بلانے پر جاویں۔ تو دامی کے یہاں کھانا اور اس سے کرایہ لینا امر آخر ہے۔ اور اس معمول کو عام رکھا جائے۔ کیونکہ اگر کسی شخص کو خصوصیت کی وجہ سے مستثنیٰ کیا گیا تو دوسروں کو شکایت ہوگی۔ ان شرائط کے ساتھ ساتھ آپ نے مبلغین کی راحت کا خاص انتظام فرمایا۔ مصارف سفر میں ان کو بہت وسعت عطا فرمائی تاکہ بشاشت سے کام ہو سکے۔ یہاں تک کہ مصارف کا تفصیلی حساب طلب نہ فرمایا۔ کیونکہ آپ غیر معتمد کو سرے سے مبلّغ ہی نہ رکھتے تھے اور معتمد سے تفصیل طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔

ارتداد زدہ علاقہ میں مبلغین بھیجنے کے علاوہ آپ نے خود بھی ایک سفر فرمایا جس میں دیواڑی، نانوتہ اور موضع اسمٰعیل پور متصل الور میں الاتمام لنعمۃ الاسلام وعظ ہوا۔ جس کے تین حصے ہیں۔ دوسرے سفر کا قصبۂ نوح اور فیروز پور جھرکا وغیرہ کے لئے ارادہ فرمایا تھا کہ اسی اثناء میں سفر سے عذر پیش آگیا۔ جس کی وجہ سے سفر بالکل موقوف کر دیا۔ اسی زمانہ میں آپ نے رسالہ "انسداد لفتنۃ الارتداد" عرف اسلام کی ایک جھلک "نماز کی عقلی خوبیاں" شائع فرمائے۔ جن میں سے موخرالذکر دو رسالوں کا ہندی ترجمہ بھی شائع کیا گیا۔ ایک رسالہ میں وید سے گائے کی قربانی کو ثابت کیا۔

آپ کو تبلیغ کا اتنا اہتمام تھا کہ مولانا عبدالکریم صاحب کے ایک دوست نے انہیں اپنے ہمراہ حج پر لے جانا چاہا۔ مولانا صاحب کو بے حد اشتیاق حج بیت اللہ کا تھا۔ انہوں نے حضرت سے اجازت چاہی۔ تو آپ نے فرمایا کہ جس کام میں یہاں مشغول ہے۔ وہ حج نفل سے مقدم اور افضل ہے اور بڑے جوش کے ساتھ فرمایا کہ ایسے ہی موقع کے لئے حضرت مسعود بک نے فرمایا ہے ؎

اے قوم بہ حج رفتہ کجائید کجائید — معشوق دریں جاست بیائید بیائید

اس تبلیغی مہم سے پہلے دو سال کے اندر ہی ارتداد کی کافی روک تھام ہوگئی تھی۔ اس کے بعد مولانا عبدالکریم صاحب کو تحریک عادل فی المیراث کے سلسلہ میں پنجاب بھیج دیا اور مولانا عبدالمجید صاحب پورے بارہ سال خانقاہ کی طرف سے یہ فریضۂ تبلیغ ادا کرتے رہے۔ جس سے بہت نفع ہوا۔

اہتمامِ تبلیغ حضرتؒ ہمیشہ اسلامی مدارس کو بھی اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے کہ تبلیغ کا اہتمام بھی تعلیم کی طرح ضرور کیا جائے۔ کیونکہ تعلیم و تعلم کا اصل مقصد ہی تبلیغ ہے۔ جو حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا فرضِ منصبی تھا۔ چنانچہ خانقاہ کی طرف سے بھی آپ نے تبلیغ کا سلسلہ جاری فرما رکھا تھا۔ اور اس غرض کے لئے باقاعدہ مبلغ رکھے ہوئے تھے۔ "حیات المسلمین" بھی خاص تبلیغ کی نیت سے مرتب فرمائی تھی۔ ۱۳۵۰ھ میں تو اس سلسلہ کو باقاعدگی کے ساتھ چلانے کے لئے ایک خاص صورت تبلیغ و اشاعت کی تجویز فرمائی جو نہایت مفید اور سہل ثابت ہوئی اور اسکو آثارِ رحمت ۱۳۵۰ کے لقب سے چھپوا کر شائع فرمایا۔

خطابِ خاص غرضیکہ حضرت کی زندگی کا بیشتر حصہ تبلیغ دین میں ہی صرف ہوا اور ہزاروں وعظ فرمائے۔ اخیر عمر میں حضرت نے قریب قریب وعظ کہنا ترک فرما دیا تھا۔ اگر کبھی کوئی اتفاق ہوتا تو حضرت ہاتھ میں کوئی کتاب لے کر بیان فرما دیتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"اب وہ امنگ ہی نہیں رہی۔ جس کا سبب یہ ہے کہ بفضلہ تعالیٰ ساری ضروری باتیں بیان کی جا چکی ہیں۔ اور بوجہ زیادتِ سن ضعف بھی عارض ہو گیا ہے۔ اب لمبی تقریر سے جی الجھتا ہے۔ بس ضرورت کے موافق خطابِ خاص پر ہی اکتفا کرنا پسند کرتا ہوں اور درحقیقت خطابِ خاص ہی زیادہ نافع ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں سب ضرورت ہی کی باتیں ہوتی ہیں"۔

فیضانِ خداوندی صاحب "اشرف المعمولات" لکھتے ہیں کہ:۔
"حضرت والا کی ذات بابرکات سے جو کچھ امتِ مرحومہ کو فائدہ پہنچا ہے محتاج بیان نہیں۔ حضرت والا کے فیوضِ عامہ میں سے حضور کے مواعظ بھی ہیں۔ جو حضور کی کھلی کرامت ہیں۔ علوم معارف کا ارشاد وقت کے لحاظ سے ہونا فیضانِ خداوندی ہوتا ہے۔ جتنی خوبیاں کسی کلام میں ظاہری و باطنی ہو سکتی ہیں۔ من کل الوجوہ حضور کے مواعظ میں موجود ہوتی ہیں۔ حضرت کے مواعظ میں علما طلبا اور عوام سب قسم کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ اور اپنے اپنے مذاق کے موافق حظ اٹھاتے ہیں۔ مثلاً
(۱) علما علوم و معارف دیکھ دیکھ کر عش عش کرتے ہیں۔ اکثر مسائل کا حل پا کر شاد ہوتے ہیں۔
(۲) صوفی منش اصحاب اپنے اپنے امراض باطنی کا حل پا کر دل ہی دل میں دعائیں دیتے جاتے ہیں۔
(۳) عوام اپنے کام کی باتیں سن کر الگ محظوظ ہوتے ہیں۔
(۴) نئی روشنی کے دلدادہ اپنے خیالاتِ فاسدہ کی تردید سن کر اوہام باطلہ سے تائب ہوتے ہیں
(۵) قرآن کریم اور احادیث شریف میں باہم جہاں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔ اس کو باحسن وجوہ

حل فرماتے ہیں اور عجیب وغریب نکات ولطائف معرضِ ظہور میں آتے ہیں۔

(۶) علوم ظاہری و مسائل فقہیہ کو بھی عجیب انداز سے ارشاد فرماتے ہیں۔

(۷) باطنی مسائل اور جہلاء صوفیہ کے اغلاط کو بھی بیان فرماتے ہیں تاکہ عوام راہ پاکر جہلاء صوفیہ کے جال سے نجات پاویں۔

(۸) کفار کے اعتراضات کے جوابات ایسے طرز سے بیان فرمائے جاتے ہیں کہ دوبارہ اس پر اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

پسندیدگی رسول یہ انہی خصوصیات کا نتیجہ تھا کہ فخر موجودات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت تھانوی کے مواعظ پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ جیسا کہ اصدق الرؤیا کے مندرجہ ذیل خواب سے ظاہر ہے جو بستی گوگران تحصیل کرانہ کے ایک مرد صالح نے جمعرات ۵ شعبان ۱۳۵۲ھ کو دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور ان کی خدمت میں ہمارے حضرت (تھانوی) اور دیگر علماء حضرات حاضر ہیں۔ ایک بڑا مکان ہے۔ سب علماء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ حضور وعظ بیان فرماویں۔ حضور نے جواب میں فرمایا کہ وعظ بیان کرنے والے بہت سے علماء موجود ہیں۔ پھر دوبارہ علماء نے درخواست وعظ کی کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ جواب میں ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہ العالی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ وعظ انہیں بیان کرنا چاہیئے یہ اچھا وعظ بیان کرنے والے ہیں۔ سب علماء چپ ہو گئے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی ہی مقبولیتِ مواعظ کا باعث تھی۔

تاثر سامعین حضرت تھانوی کے وعظ میں علماء فضلاء حکماء امراء ادباء شعراء وکلاء غرضیکہ ہر طبقہ کے لوگ شمولیت کرتے تھے۔ اپنے تو خیر غیر بھی بہت ہی متاثر ہو کر جاتے تھے ان کے تاثر کا اندازہ حسب ذیل چند آراء سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ ایک انگریزی خواں عہدہ دار نے صاحب اشرف السوانح سے کہا:

"ہم نہیں سمجھتے تھے کہ مولویوں میں بھی ایسے واعظ ہیں۔ جو ہر بات کو دلائل منطقی و عقلی سے ثابت کریں۔"

۲۔ ایک بار حضرت مجذوبؒ وعظ "زراعت القلوب" ریل میں بیٹھے اپنے احباب کو پڑھ کر سنا رہے

تے کہ چند ہندو سامعین کہنے لگے کہ:۔
"یہ کتاب کسی بڑے قابل کی لکھی ہوئی ہے"۔
۳۔ سفر رنگون کے دوران میں انہی کی زبانی وعظ "طریق القلندر" سن کر جہاز کا کپتان کہنے لگا:۔
"اگر یہ شخص انگریزی پڑھتا۔ تو جج ہو جاتا"۔
۴۔ بھوپال میں حضرت کے وعظ سن کر ولایت کا سند یافتہ مرہٹہ ماسٹر کہنے لگا کہ:۔
"میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کے لیکچر ہندوستان اور ولایت میں سنے ہیں لیکن کسی میں میں نے وہ بات نہیں دیکھی۔ جو آج میں نے ان کے بیان میں دیکھی۔ بدوں پہلے سے نوٹ لکھے ہوئے اتنا طویل طویل بیان اور ایسا مدلل مربوط اور پھر اس قدر روانی کے ساتھ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنا"۔
۵۔ ڈیگ ریاست بھرت پور میں حضرت کا وعظ سن کر ایک تعلیم یافتہ آریہ افسر کہنے لگا کہ:۔
"مجھے حیرت ہوئی کہ ایک خالص مذہبی مسئلہ یعنی روزہ پہ تو وعظ تھا۔ لیکن ایسے مضامین تھے کہ ان کو ہر مذہب والا اپنے اصول پر منطبق کر سکتا ہے"۔
۶۔ کانپور میں ایک وکیل صاحب حضرت کا وعظ سن کر کہنے لگے کہ:۔
"آپ بھی کہاں مولویوں میں جا پھنسے۔ آپ اگر وکالت پاس کر لیتے۔ تو وکیلوں میں آپ کا کوئی نظیر نہ ہوتا"۔
۷۔ ایک صاحب دل عاقل نے حضرت کے وعظ کا یوں نقشہ کھینچا کہ:۔
"حضرت کا وعظ کیا ہوتا ہے۔ حلوۂ مشائخ ہوتا ہے"۔
۸۔ ایک بدعتی مولوی بودھ پور میں حضرت کا وعظ سن کر اپنے ہم مشربوں کو کہنے لگا کہ:۔
"آپ جانتے ہیں کہ میں مولود بھی ہوں۔ قیامیہ بھی ہوں۔ مگر انصاف اور حق یہ ہے۔ کہ جو تحقیق آج مولوی صاحب نے بیان فرمائی ہے۔ صحیح وہی ہے"۔

طباعت مواعظ چونکہ حضرت کے مواعظ عوام و خواص اور موافق و مخالف سب طبقوں میں نہایت مفید و مقبول ہونے لگے اس لئے حضرت کے مخلصین نے حضرت کے ایما یا تحریک کے بغیر از خود انہیں قلمبند کر لینے کی کوشش شروع کر دی۔ چونکہ حضرت بہت روانی اور تیزی سے بیان فرماتے تھے۔ جن میں دقیق علمی مسائل ہوتے تھے۔ اسلئے مواعظ کو قلمبند کرنے کے لئے ایک صاحب کو مختصر نویسی کی تعلیم دلائی گئی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر مولوی حکیم محمد مصطفےٰ نے حضرت کے

مواعظ عربی میں بطور مختصر نویس قلمبند کرنے شروع کئے جنہیں وہ بعد میں اردو میں منتقل کر دیتے اور بعض قدر
مواعظ ضبط تحریر میں لائے جانے وہ حضرت کی خدمت میں نظر ثانی کے لیے پیش کیے جاتے تاکہ
اگر کسی مقام پر کوئی سہو و خطا ہو۔ تو درستی ہو جائے۔ نظر ثانی کے بعد اس نام سے جو حضرت وعظ کا رکھتے
اسے شائع کر دیا جاتا اور ساتھ ہی بہ نمونہ ذیل ہر وعظ پر ایک گوشوارہ بنا دیا جاتا تاکہ اس کی نوعیت بمقام
اور تاریخ کا پتہ چل سکے:-

کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر میں ہوا	کس ہیئت پر ہوا یعنی بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کس کی درخواست پر ہوا	کیا مضمون تھا	وعظ کا کیا عنوان قائم ہوا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کس نے قلمبند کیا	سامعین کی تخمیناً تعداد کیا تھی	متفرقات

اگرچہ مواعظ کے قلمبند کرنے کا شوق مخلصین میں حضرت کی وعظ گوئی سے بہت دیر بعد پیدا ہوا مگر
پھر بھی ۳۶۲ وعظ حضرت کے تصدیق و تصحیح شدہ حالت میں موجود ہیں اور یہ اب تک رسالہ "الابقاء" میں جو
کراچی سے کتب خانہ اشرفیہ مولوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی شائع کرتا ہے۔ مکرر مسلسل اور متواتر شائع
ہوتے رہتے ہیں۔ اس رسالہ میں سوائے حضرت کے مواعظ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ جنہیں پڑھ کر ہزاروں
گمراہ راہ پر آ رہے ہیں۔ ہر وعظ پڑھنے والوں پر ایسے نقوش چھوڑ جاتا ہے جو ان کی کایا پلٹ دیتا ہے
مثلاً وعظ "روح الارواح" کو دیکھ کر بعض درویش جو شریعت اور طریقت کو جدا جدا سمجھتے تھے یہاں تک
کہ نماز بھی نہ پڑھتے تھے۔ وہ اپنے عقائد سے تائب ہو کر نماز کے عادی بن گئے۔ مولود شریف کے
متعلق مواعظ "تلیخ الصدور" اور "بدر البدور" پڑھ کر بعض مقتدرین کی بھی غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور ان کے
عقائد درست ہو گئے۔ بلکہ وہ دوسروں کی بھی اصلاح عقائد کرنے لگے۔ حالانکہ انہوں نے نہ کبھی
حضرت کی زیارت کی نہ رجوع کیا۔ اسی طرح وعظ "راحت القلوب" کے مطالعہ سے بہت سے ایسے
پریشان حال مطمئن اور متوجہ بحق ہو گئے۔ جن کی زندگی کو مصائب و حوادث نے تلخ بنا دیا تھا۔

مقبولیتِ مواعظ

حضرت کے مطبوعہ مواعظ عام طور پر بڑے بڑے متکبرین۔ ملحدین۔ نو تعلیم یافتہ مسلمان
ہندوؤں۔ عیسائیوں اور شیعوں اور وہابیوں کے حلقوں میں بھی بڑی دلچسپی کے
ساتھ پڑھے جاتے دیکھے گئے۔ شیعوں کے بعض مجتہدین خود صاحب اشرف السوانح سے حضرت
کے مطبوعہ مواعظ منگا کر ان کے مضامین سے اپنی مجلسوں کو گرم کرنے اور رونق دینے۔ اور اکثر واعظین
صرف حضرت کے وعظ یاد کر کے لوگوں کو سناتے اور ان کی نظروں میں مقبول ہو کر معقول معاوضے حاصل کرتے

اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ہم سے بھی بعض وکلاء حضرت کے مواعظ لے کر پڑھتے رہتے ہیں۔

شرفِ اولیت یہ شرف و فضیلت صرف حضرت تھانویؒ کو ہی حاصل ہے کہ حق تعالیٰ نے امت محمدیہ کی اصلاح کے لئے ان کے بعض مخلصین کے دل میں مواعظ قلبند کر کے طبع کرانے کا خیال پیدا فرمایا۔ جس کی وجہ سے آج ہمارے پاس اتنی بڑی تعداد میں حضرت کے خطباتِ موعظت۔ مقالاتِ حکمت اور مجادلاتِ معدلت موجود و محفوظ ہیں۔ حالانکہ مشاہیر اسلام میں سے کسی کے اس قدر خطبات اس طرح مطبوع اور مقبول نہیں ہوئے ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

معمولاتِ وعظ

سادہ لباس میں آنا حضرت تھانویؒ عام مقررین اور واعظین کی طرح وعظ کے وقت پرتکلف لباس پہن کر جانے کے عادی نہ تھے۔ جس حال میں ہوتے۔ اسی طرح بے تکلف چلے جاتے۔ شملہ میں ایک وعظ کے موقع پر حضرت کو سادہ لباس میں دیکھ کر ایک تہذیب یافتہ نے منتظم جلسہ سے کہا کہ تمہارے علماء کا لباس کیسا ہے؟ جیسے پاخانہ سے نکل کر آئے ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ لباس پر نظر رکھنے کی بجائے وعظ پر کان رکھیں۔ وعظ ختم ہونے پر جب انہوں نے اس سے کیفیت پوچھی تو کہنے لگے کہ:-

> میری حماقت تھی۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ جیسا لباس ہے۔ ویسا ہی وعظ ہوگا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس نکلا۔ سبحان اللہ! کیا بیان تھا۔ لباس سے ہرگز معلوم نہ ہوتا تھا۔ کہ یہ اتنا بڑا شخص ہے"

حضرت تھانویؒ کے کانوں میں بھی کسی طرح یہ بات پہنچ گئی۔ تو دوسرے وعظ میں آپ نے اس اعتراض کا لطیف پیرایہ میں جواب دیتے ہوئے فرمایا:-

> "مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض صاحبوں کو ہم لوگوں کا لباس پسند نہیں آیا۔ خیر میں اس وقت اس میں تو کلام نہیں کرتا۔ کہ وعظ کہنے کے لئے لباس کا اچھا ہونا ضروری ہے یا نہیں یہ اپنا اپنا مذاق ہے۔ میں ان کی خاطر یہ مان لیتا ہوں کہ واعظ کو اچھا لباس پہن کر وعظ کہنا چاہیئے اور اس کو اس مصلحت پر محمول کرتا ہوں کہ اچھے لباس سے وقعت ہوتی ہے اور متکلم کی وقعت سے کلام کی وقعت ہوتی ہے۔ جس سے اس کا اثر بڑھتا ہے

مگر سوال یہ ہے کہ وہ لباس آخر کہاں سے آئے ظاہر ہے کہ اچھے لباس کے لئے کافی رقم کی ضرورت ہو گی۔ جس کے لئے مولویوں کی موجودہ آمدنی کافی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس کی سہل صورت یہ ہے کہ جہاں وعظ ہو۔ وہاں کے حضرات واعظوں کے لئے اپنی پسند کا لباس بھی تیار کرا رکھیں۔ جب کوئی وعظ آئے وہی لباس پہنا کر وعظ کہلوایا جائے اور جب وہ وہاں سے چلنے لگے۔ تو وہ لباس اتروا لیا جائے تاکہ دوسرے موقع پر کام آئے۔"

خلوص سے بیان کرنا آپ مجسمۂ اخلاص تھے۔ ہمیشہ اپنے سے زیادہ دوسروں کے مفاد پر نظر رکھتے تھے۔ اسلئے جو کچھ بھی فرماتے خلوص سے فرمایا کرتے تاکہ سامعین متاثر و مستفیض ہو سکیں۔ کیونکہ ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

ایک دفعہ آپ جودھپور میں وعظ فرمانے لگے۔ تو ایک خیر خواہ نے مشورۃً عرض کیا کہ چونکہ یہاں کے لوگ دیوبندیوں کو وہابی کہتے ہیں۔ اسلئے آپ امام ابوحنیفہؒ کے ہی فضائل بیان فرماویں تاکہ ان کا شبہ رفع ہو جائے۔ آپ نے صاف انکار کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ میں اپنی مصلحت کے لئے وعظ کہوں۔ تاکہ لوگ مجھے حنفی سمجھیں حالانکہ وعظ سامعین کی مصلحت کے لئے ہونا چاہیئے۔"

فرمائشی وعظ نہ کرنا حضرت کو فرمائشی وعظ کہنے کی قطعًا عادت نہ تھی اور نہ ہی کسی کا فرمائشی مضمون درمیان میں بیان کرتے تھے۔ بلکہ جو کچھ اُس وقت منجانب اللہ القا ہوتا بیان فرما دیتے۔ اگر بدوران بیان فرمائشی مضمون کے بیان کرنے کا کوئی قرینہ نکل آتا۔ تو پھر اس کا بلا تکلف ذکر فرما دیتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے فرمائش کی کہ حضرت وعظ میں ذرا ڈھولکی والوں کی بھی خبر لینا۔ تو آپ نے یہ عذر فرمایا کہ:۔

"میں کسی کی خبر نہیں لیتا۔ یہ میری عادت کے خلاف ہے۔ جو میری سمجھ میں آئیگا۔ بیان کرونگا۔"

معاوضہ نہ لینا آپ وعظ کا معاوضہ بھی نہ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ جس ہدیہ میں بھی صورتِ معاوضہ پیدا ہو جاتی۔ اس سے بھی اعراض فرماتے۔ ایک مرتبہ نواب صدیق حسن خاں کی صاحبزادی صفیہ بیگم نے کانپور میں حضرت سے وعظ کہلوایا۔ وعظ ختم ہونے کے بعد اس نے ایک معتدبہ رقم پیش کی۔ جسے آپ نے قبول نہ فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ یہ معاوضہ نہیں ہے۔ فرمایا:۔

"صورت تو معاوضہ کی سی ہے۔ دیکھنے والوں کو تو یہی شبہ ہوگا۔ پھر کسی کو بلا ہدیہ دیئے وعظ کہلوانے کی ہمت نہ ہوگی"۔

اس پر وہ کہنے لگیں کہ اچھا کھانا ہی کھا لیجئے۔ فرمایا:۔

"گھر بھیج دیجئے۔ تاکہ اس میں بھی معاوضہ کی سی صورت پیدا نہ ہو۔ کیونکہ میں مہمان دوسری جگہ ہوں"

یہ محض قدیمی تعلقات کی بنا پر ان کی دلجوئی کے لئے فرمایا۔ ورنہ اس کی بھی عادت نہ تھی۔

نعم البدل دینا

حضرت اس قدر حساس تھے کہ جو کوئی بھی تھوڑی بہت خدمت کرتا۔ اسے ضرور کسی نہ کسی صورت میں فیض پہنچاتے۔ جس کی وجہ سے سفر میں آپ کا یہ معمول ہوگیا تھا۔ کہ جہاں بھی جاتے۔ وعظ ضرور فرماتے۔ اور اس کی وجہ یہ بتلاتے کہ

"بلا وعظ کہے کسی جگہ جا کر روٹیاں کھانے میں شرم آتی ہے"۔

بلا ضرورت وعظ نہ کہنا

آپ کا یہ بھی معمول تھا کہ اگر آپ سے پہلے کوئی دوسرا عالم مناسب موقع تقریر کر دیتا۔ تو بربنا رعایت و اعتراف آپ قطعاً وعظ نہ فرماتے۔ کہ جو ضروری مضمون تھا وہ سنا دیا گیا ہے۔ اب تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ ایسا سوائے اہل حق کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ کہ وعظ کے لئے جس کو بلایا جائے۔ اسے موقع ہی نہ دیا جائے۔ اور وہ اس پر ملال کی بجائے مسرت کا اظہار کرے۔ ایک دفعہ الہ آباد میں حضرت کے وعظ کا اعلان ہوا جس کی وجہ سے کافی مجمع جمع ہوگیا۔ حضرت کے وعظ سے قبل مولوی سلیمان پھلواروی نے حضرت سے اجازت لے کر کچھ کہنا چاہا۔ جوش کے عالم میں تقریر طول پکڑ گئی۔ جب انہوں نے بیان ختم کیا۔ تو حضرت نے بطور اعترافِ حقیقت سامعین کے اصرار کے باوجود بدیں وجہ وعظ فرمانے سے انکار کر دیا کہ:۔

"مولانا نے ضروری باتیں تو سب فرما دی ہیں۔ میرے بیان کی کیا ضرورت ہے۔ اب جو مجھ سے اصرار ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ میں ایسے مضامین ڈھونڈ کر بیان کروں جو مولانا سے رہ گئے ہوں اور ان سے اچھے ہوں۔ یہ تو ایک معاوضہ اور مقابلہ کی صورت ہے۔ لہٰذا اب میں بیان نہ کروں گا"۔

جانبداری نہ کرنا

حضرت کو بارہا ایسے مقامات پر بھی وعظ فرمانا پڑا۔ جہاں اور جماعتوں یا دو مدرسوں کے درمیان باہمی کشاکشی تھی۔ مدعو کرنے والوں کا یہ خیال ہوتا کہ حضرت

کچھ ایسی باتیں فرماویں گے کہ اختلاف رفع ہو جائیں گے۔ مگر حضرت ایسے نازک موقعوں پر بڑی احتیاط فرماتے تھے۔ اور جانبداری کے احتمال کی وجہ سے اختلافی امور پر کچھ نہ فرماتے تھے۔ کیونکہ اختلافیات کے متعلق بیان کرنے کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس فریق کے خلاف روئے سخن ہوتا ہے۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ دوسرے فریق کی طرف داری کر رہا ہے۔ اور ان لوگوں نے انہیں اپنی طرف کر لیا ہے اسلئے اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا چنانچہ حضرت اس ضمن میں فرمایا کرتے تھے کہ وعظ میں سوائے مصلحت عامہ کے اور کوئی غرض نہیں چاہیے

ترغیب کو ترجیح دینا حضرت کے مواعظ میں ترغیب کا پہلو ہمیشہ نمایاں ہوتا تھا۔ کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ :-

"آج کل کی طبیعتوں کو دیکھتے ہوئے یہ تجربہ ہے کہ شوق دلانے والے مضامین سے زیادہ نفع ہوتا ہے۔ بہ نسبت خوف دلانے والے مضامین کے۔ اس واسطے میں ترہیب کے مضامین زیادہ بیان نہیں کرتا۔ ترغیب کے مضامین زیادہ بیان کرتا ہوں"

(الباطن ص۶۱)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔

"اتنی بات تو ہے کہ بحمد اللہ بیان کے وقت یہ نیت ضرور ہوتی ہے کہ اے اللہ ایسا مضمون بیان ہو۔ جو ان لوگوں کی ضرورت کا ہو۔ جس سے ان کی اصلاح ہو جائے۔ اسے چونکہ علم غیب ہے۔ وہ سب کی حالت جانتے ہیں۔ اس نیت کے بعد وہ ضرورت و حالت کے مطابق مضمون دل میں ڈال دیتے ہیں کہ آج یہ بیان کرو" (ذم النسیان ص۱۵)

دورِ سفر

ضرورتِ سفر حضرت تھانویؒ طبعاً خلوت پسند تھے۔ اسلئے بچپن اکثر ہمشیرہ کے ساتھ گھر کے اندر کھیل کود میں گذرا۔ اور طالب علمی کے زمانہ میں فارغ اوقات اپنے کمرہ میں گذار دیتے عام میل ملاپ اور ہجوم سے بوجہ خلل معمولات و یکسوئی آپ کی طبیعت بہت گھبراتی تھی۔ اسلئے سفر پر حضر کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر بغرض اصلاح امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ بطور حجۃ اللہ فی الارض تبلیغ احکام الٰہیہ کے لئے بڑے بڑے لمبے سفر فرمائے۔ ہندوستان و پاکستان کے کونہ کونہ میں پہنچ کر کتاب و سنت کی روشنی میں رد بدعات و رسومات فرماتے رہے۔ اور جب ایک مرتبہ سفر میں نکلتے تو پھر

مسلسل درخواستوں کی وجہ سے مہینوں واپسی نہ ہوتی۔
اگرچہ زیادہ تر سفر صرف تبلیغی سلسلہ میں کئے۔ مگر چند سفر بزرگانِ دین کی زیارت۔ مریضوں کے علاج عیادت اور حج بیت اللہ کے لئے بھی فرمائے۔ بلا ضرورتِ شرعیہ اور واقعیہ یا کسی کی وجاہت کے زیر اثر کبھی کوئی سفر نہیں فرمایا۔

آغازِ سفر درسیات سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے پہلا سفر ماہ صفر ۱۳۰۱ھ میں کانپور کا فرمایا یہاں آپ مدرس ہو کر تشریف لے گئے تھے۔ اس عرصہ میں آپ رنگون۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ کراچی۔ گجرات۔ مارواڑ۔ ڈھاکہ۔ حیدرآباد دکن۔ علاقہ سندھ اور بہاولپور۔ اعظم گڑھ۔ گورکھپور۔ غازی پور بنارس۔ شملہ۔ لاہور اور دیگر سینکڑوں شہروں اور قصبوں میں پہنچ کر لوگوں کو ارشادات و ملفوظات پند و نصائح اور فیضِ صحبت و اسوۂ حسنہ سے مستفیض و مستفید فرماتے رہے۔

اہمیتِ سفر عام دستور کے مطابق آپ کبھی خالی الذہن ہو کر سفر نہیں فرماتے تھے۔ دورانِ سفر میں آپ ہر موقع پر احکامِ شریعتِ مقدسہ اور اصولِ حسنِ معاشرت کی نہ صرف خود سختی سے پابندی فرماتے تھے۔ بلکہ اپنے ہمراہیوں اور ملاقاتیوں سے بھی پابندی کراتے تھے۔ جس سے اہلِ نظر ہم سفر سبق حاصل کرتے تھے۔ اور احکام و آدابِ سفر معلوم کرتے تھے۔ گویا آپ کی ہر حرکت باعثِ برکت ہوتی تھی۔ اور گمراہوں کو راہ پر لاتی تھی۔

درخواستہائے سفر حضرت تھانوی ؒ کے فیضِ عام کا شہرہ چونکہ دور دراز تک پہنچ چکا تھا۔ اسلئے اطراف و جوانب سے شائقین و طالبین اس کثرت سے طلبی کی درخواستیں بھیجتے رہتے تھے کہ ان کے انبار لگ جاتے تھے۔ . . . .

. . . .

ان کی کثرت کا اندازہ صرف اس ایک امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر حضرت طلبی کی درخواستوں کا دس فیصدی حصہ بھی منظور فرماتے۔ تو سال کے ۳۶۵ دنوں میں آپ کو ایک دن بھی وطن مالوف میں رہنا نصیب نہ ہوتا۔ جو آپ کی محبوبیت و مقبولیت کی بیّن دلیل ہے۔ اسلئے آپ بہت ہی اصرار کے بعد بعض شرائط دنیوی کے تحت خاص خاص اور ضروری درخواستوں کو منظور فرماتے۔

ہنگامی سفر زندگی کے آخری لمحات انتہائی امتحان و آزمائش کے ہوتے ہیں اور شیطان اس وقت بڑے بڑے اربابِ علم و فضل پر بھی اپنے ترکش کا آخری تیر چلانے کے لئے بیقرار رہتا۔ اسلئے حضرت کے بعض مخلصین کی سفرِ آخرت کے وقت انتہائی خواہش ہوتی۔ کہ ان کا انتقال

حضرت کی موجودگی میں ہو جب ایسے مریضوں کی درخواست سفر پہنچتی۔ تو حضرت بالکل بے قرار ہو جاتے اگرچہ عادۃً بہت ہی کم درخواستہائے سفر کو شرفِ قبولیت بخشتے تھے۔ مگر ایسی درخواستوں کو بجز کسی خاص مجبوری کے کبھی مسترد نہ فرماتے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود
گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

سفر پر روانہ ہو جاتے اور اکثر مریضوں کی حضرت کی موجودگی میں دم نکلنے کی آرزو پوری ہو جاتی۔ جن مریضوں کی تمنائے زیارت کا علم ان کے انتقال کے بعد ہوتا۔ تو حضرت کو بہت قلق ہوتا۔ اور فرماتے "اگر مجھ کو اطلاع ہو جاتی۔ تو ضرور جا کر ان کی اس تمنا کو پوری کرتا"

ایک مرتبہ بریلی کے ایک معزز، ذی علم، رئیس کو مرض الموت میں وساوس شیطانی نے اس قدر آگھیرا کہ انہیں سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہونے لگا۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ کو بلایا گیا۔ آپ فی الفور تھانہ بھون سے بریلی پہنچے۔ اور نوعیتِ وساوس معلوم کر کے ایسی تسلی بخش تقریر فرمائی۔ کہ وہ ہشاش بشاش حضرت کی موجودگی میں اس دنیا سے رخصت ہوئے

والیانِ ریاست کیلئے سفر

حق تعالیٰ نے چونکہ حضرت کو مقبولیتِ عامہ بخشی تھی۔ اسلئے گاہے گاہے والیانِ ریاست بھی حضرت کو بڑے اشتیاق و اصرار سے سفر کی تکلیف دیتے رہتے تھے۔ مگر آپ کبھی ان کے اثر و اقتدار کے تحت ان کی درخواست قبول نہ فرماتے تھے۔ بلکہ انہیں احکام شریعت کی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے خصوصی شرائط کے تحت ان کی درخواستوں کو شرفِ قبولیت بخشتے تھے۔

شرائط قبولیت

ایک دفعہ ڈھاکہ کے مشہور و معروف نواب سلیم اللہ خاں نے جن کی دعوت کے واسطے اور گورنر مشتاق رہتے تھے۔ اور بالا شرط منظور کرتے تھے۔ حضرت تھانویؒ کو بڑے اشتیاق سے مدعو کیا۔ تو آپ نے ان کی امارت و وجاہت کے پیش نظر قبولیتِ دعوت کے لئے حسب ذیل شرطیں لکھیں۔

۱۔ کسی قسم کا نقد یا غیر نقد ہدیہ نہ دیا جائے۔
۲۔ کسی خاص مضمون پر وعظ کہنے کی فرمائش نہ کی جائے۔
۳۔ قیام کا انتظام ایوانِ خاص سے جدا ایسی جگہ ہو۔ جہاں عام مسلمان بے تکلف آجا سکیں
۴۔ خود اپنی ملاقات کے لئے کوئی خاص وقت متعین کر لیں جس میں کوئی اور شخص شریک

نہ ہو۔ تاکہ جانبین سے بے تکلف افادہ و استفادہ ہو سکے۔

نواب صاحب بھی بڑے سمجھدار، سلیم الفطرت اور اسم بامسمی تھے۔ شرائط کو پڑھ کر ان کی حکمت و نادرت صحت و مصلحت پر عش عش کر اُٹھے: اور غلبہ اشتیاق میں بلا چون و چرا سب شرطیں منظور کر لیں۔

شاہانہ تزک و احتشام حضرت تھانوی عوامی یا مذہبی لیڈروں کی طرح شاندار استقبال جلسہ و جلوس اور زندہ باد کے نعروں کے قطعًا دلدادہ نہ تھے۔ اگر کوئی ازراہِ محبت ایسا انتظام بھی کرتا۔ تو حضرت منع فرما دیتے۔ نواب ڈھاکہ نے حضرت کا بھی اسی تزک و احتشام کے ساتھ استقبال کرنا چاہا جس طرح وہ وائسرائے کا استقبال کرنے کے عادی تھے۔ کہ پلیٹ فارم پر مخملی فرش بچھایا جائے۔ تمام راستوں کو رنگ برنگ کی جھنڈیوں اور خوبصورت دروازوں سے سجایا جائے۔ اور شاہانہ جلوس کی صورت میں حضرت کو دیوان خاص تک لایا جائے۔ واقعی حضرت ایسے ہی استقبال کے مستحق تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کے۔ کیونکہ یہ اپنے زمانہ کے مجدد تھے۔ مگر یہ سب کچھ چونکہ خلافِ شریعت تھا۔ اسلئے حضرت نے نواب صاحب کو اس کی اجازت نہ دی۔ اب انہوں نے دوسری درخواست بھیجی کہ ہمیں ایک جم غفیر کے ساتھ استقبال کی اجازت بخشی جاوے جو عمّالِ ریاست اور رؤسا شہر پر مشتمل ہوگا۔ حضرت نے لکھا کہ "یہ بھی خلاف طبیعت ہے" جس سے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مگر قدم قدم پر حضرت کی مصلحت آمیز اور سبق آموز ہدایات نواب صاحب کی گرویدگی میں نہ صرف اضافہ کر رہی تھیں۔ بلکہ ان کے دل میں حضرت کی عظمت بڑھا رہی تھیں۔ چنانچہ نواب صاحب بلا کسی اہتمام کے بہ نفس نفیس اسٹیشن پر پہنچے۔ اپنی خاص موٹر میں حضرت کو سوار کیا۔ حضرت کی خواہش کے باوجود حضرت کے ساتھ بیٹھنے سے عذر کر دیا۔ اور خود دوسری موٹر میں حضرت کی موٹر کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ حالانکہ وائسرائے کی آمد کے وقت ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر جایا کرتے تھے۔ مگر حضرت کے ساتھ بیٹھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور فرمایا کہ حضرت کے ساتھ بیٹھنا خلاف ادب تھا۔ گھر پہنچ کر بھی نواب صاحب خود خادموں کی طرح حضرت کی خدمت میں کھڑے رہے یہاں تک کہ کھانے کے وقت ہر ایک چیز خود اُٹھا اُٹھا کر حضرت کے سامنے رکھتے رہے۔

منتظم کی نخوت علامہ اقبال نے اس دور کو اپنے ایک مکتوب میں "دورِ بدتمیزی" قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تمرد و فرعونیت کے زمانہ میں عام طور پر اہل دین اور علماء حق کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر حضرت تھانویؒ یہ برداشت نہیں کرتے تھے کہ کوئی علماء حق کی شان میں ایسی ویسی بات کرے۔ کیونکہ اسے آپ اہل دین کی اور دین کی توہین سمجھتے تھے۔ اسلئے اگر کسی سے

ایسی غلطی ہو بھی جاتی۔ تو ایسا سبق پڑھاتے کہ پھر وہ عمر بھر نہ بھولتا۔

ڈھاکہ کے پہلے سفر کے بعد ایک کانفرنس کے سلسلہ میں نواب ڈھاکہ کے اشتیاق اور علماء دیوبند کے اصرار پر آپ کو دوبارہ ڈھاکہ جانا پڑا۔ مگر آپ نے بفراست دیکھ لیا تھا کہ وہاں ایک ایک ایسا واقعہ پیش آئیگا۔ جس کی ناگواری کی وجہ سے آپ کے لئے ان حضرات کا اخیر وقت تک ساتھ دینا مشکل ہو جائیگا۔ اسلئے آپ نے وہ سفر اپنے ذاتی خرچ پر فرمایا۔ تاکہ جس وقت چاہیں آزادی سے واپس آسکیں۔

ان حضرات نے کلکتہ سے ہو کر ڈھاکہ جانا تھا۔ اسلئے نواب صاحب کی طرف سے ان کے قیام و طعام کا کلکتہ میں شایانِ شان انتظام تھا۔ جس کے منتظم ایک رئیس اور نواب صاحب کے دوست تھے۔ باتوں باتوں میں وہ رئیس حضرت سے کہنے لگے کہ:۔

"آپ کے انکار کے بعد آپ کی تشریف آوری سے نواب صاحب کو بڑی مسرت ہوئی ہے۔ فرماتے تھے کہ آپ کی شرطیں بڑی سخت ہیں۔ جن کو قبول نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک تو یہی کہ کوئی ہدیہ پیش نہ کیا جائے۔"

حضرت نے فرمایا

"نہ دینے کی شرط کیا مشکل ہے۔ دینا تو دشوار ہو سکتا ہے نہ دینا کیا مشکل ہے۔"

رئیس نے کہا۔

"صاحب! جس سے محبت ہوتی ہے۔ اس کو تو ہدیہ دینے کے لئے جی چاہتا ہی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ اپنے محبوب کی خدمت نہ کی جائے۔"

حضرت نے جواب دیا۔

"یہ کیا ضروری ہے کہ محبوب کو اپنے گھر ہی بلا کر ہدیہ دیا جائے۔ اگر ایسا ہی شوق ہے۔ تو اس کے گھر جا کر یا گھر بھیج کر بھی تو ہدیہ دیا جا سکتا ہے۔"

رئیس ہونا اور بات ہے سلیقہ سے گفتگو کرنا اور بات ہے۔ اس منتظم کو بات کرنی نہ آئی۔ اور نخوت سے کہا کہ:۔

"جناب معاف فرمائیے۔ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔"

نخوت کا علاج حضرت تھانویؒ کو یہ کلمات سن کر بہت رنج ہوا۔ مگر آپ نے ناگواری ظاہر کئے بغیر نہایت

تہذیب سے اس رئیس کو مخاطب فرمایا کہ :۔

"آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ حضرات کنواں ہیں اور ہم پیاسے ؟ اور ہمارے دماغ میں یہ سمایا ہوا ہے کہ ہم لوگ کنواں ہیں اور آپ پیاسے ! اور اس کی ہمارے پاس دلیل بھی ہے کہ ضرورت کی دو چیزیں ہیں ۔ دین اور دنیا ۔ ان میں سے ہماری حاجت کی ایک چیز تو آپ کے پاس ہے ۔ اور آپ کی حاجت کی چیز ہمارے پاس ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری حاجت کی جو چیز آپ کے پاس ہے ۔ یعنی دنیا ۔ تو وہ اللہ تعالےٰ نے بقدر ضرورت ہمیں بھی دے رکھی ہے ۔ لیکن آپ کی حاجت کی جو چیز ہمارے پاس ہے ، یعنی دین ۔ وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں ۔ اسلئے آپ ہمارے محتاج ہوئے یا ہم آپ کے ؟ آپ پیاسے اور ہم کنواں ہوئے ؟ یا ہم پیاسے اور آپ کنواں ہوئے "۔

بس اس تازیانۂ حکمت کے لگنے کی دیر تھی کہ وہ رئیس شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگے ۔ اس ناگواری کے بعد حضرت نے وہیں سے قطع سفر کا ارادہ کر لیا ۔ کسی نے ٹیلیفون پر نواب صاحب کو بھی خبر کر دی ۔ انہوں نے حضرت کو ٹیلیفون پر بلانا خلاف ادب سمجھ کر ضروری تار دیا ۔ رفقاء سفر نے بھی اصرار کیا کہ آپ واپسی کا ارادہ ترک کر دیں ۔ مگر آپ نے کسی کی خاطر اپنا اصول نہ توڑا ۔ اپنے کرایہ پر تو گئے ہی تھے بڑی آزادی سے واپس آ گئے ۔ اور الہ آباد پہنچ کر نواب صاحب کو تار کا جواب دیا ۔ اس واقعہ سے فراست کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے جس کے مقابلہ میں کشف بہت متأخر ہے ۔ اس لئے اسکی حدیث میں فضیلت آئی ہے ۔

تعلیم تہذیب حضرت تھانوی نفسیات کے بڑے ماہر تھے ۔ اور مدعیانِ تہذیب جدیدہ سے منٹوں میں بد تہذیبی کا اقرار کرا لینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ۔ آپ کی ناگواری ۔ ناراضی ۔ سختی اپنی ذات کے لئے نہیں ہوتی تھی ۔ بلکہ مناسب موقع تعلیم تہذیب کے لئے ہوتی تھی ۔ اور آپ دعویٰ سے فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"جس کو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں اپنی تہذیب جدیدہ کا دعویٰ ہو ۔ کچھ دن میرے پاس رہ کر دیکھ لے ۔ اللہ تعالےٰ کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالےٰ خود اسی کے منہ سے کہلوا دونگا ۔ کہ واقعی ہم بد تہذیب ہیں ۔ اور حقیقی تہذیب وہی ہے جس کی شریعت مقدسہ نے تعلیم فرمائی ہے "۔

چنانچہ مظفر نگر کے سفر میں بھی آپ کو ایک ایسے ہی رئیس سے سابقہ پڑا جو بڑے بیباک ۔ زبان دراز

یہاں تک کہ بڑے بڑے حکام سے بھی نہ ڈرنے والے اور ان کے سامنے نہ جھکنے والے تھے۔ چونکہ ان کی عادت ہی ایسی بن چکی تھی۔ اسلئے انہوں نے کوتاہ اندیشی سے حضرت سے بھی بے ڈھنگی باتیں شروع کر دیں جس سے آپ کو ازحد تکلیف ہوئی۔ آپ نے انہیں مناسب الفاظ میں تنبیہ بھی فرمائی۔ مگر ریاست کے نشہ میں وہ کچھ نہ سمجھ سکے۔ اور نوبت ناگواری تک پہنچی۔ حضرت نے انہیں مجلس سے اُٹھ جانے کے لئے فرمایا۔ مگر وہ بیٹھے رہے۔ اس پر حضرت یہ فرماتے ہوئے۔ خود ہی اُٹھ کھڑے ہوئے کہ

"اگر آپ نہیں اُٹھتے۔ تو یہاں خود اٹھ جاتا ہوں۔ میں ایسے شخص کے ساتھ ہم نشینی بھی گوارا نہیں کر سکتا۔"

بس آپ کا اتنا فرمانا تھا کہ ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ دست بستہ کہنے لگے "حضرت آپ بیٹھے رہیں۔ میں خود ہی جاتا ہوں" اور اُٹھ کر چلے گئے۔ بعد ازاں انہوں نے حافظ صغیر احمد سے کہا کہ:

"میرا تو عمر بھر کے لئے علاج ہو گیا۔ میں علماء اور ملاؤں کو بہت ذلیل سمجھا کرتا تھا۔ اب ہر ایک مولوی اور ملانے کا ادب ولحاظ کرتا ہوں۔ کیونکہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں یہ بھی ایسا ہی نہ ہو۔ میں بڑے بڑے حکام سے بھی مرعوب نہیں ہوتا۔ اس روز مولانا سے اتنا مرعوب ہوا کہ ڈانٹ پڑنے کے بعد ایک لفظ بھی میرے منہ سے نہ نکل سکا۔"

اسی لئے حضرت مجذوب فرمایا کرتے تھے کہ اس ع

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

نواب رامپور کو سبقِ شریعت

ایک مرتبہ نواب رامپور نے قادیانیوں سے مناظرہ کا انتظام کیا اور اس غرض کے لئے علماء دیوبند کو مدعو کیا گیا۔ چنانچہ بہت سے اکابر علماء تشریف لے گئے اور اپنے حضرات کے اصرار پر حضرت نے بھی بادلِ ناخواستہ شرکت فرمائی۔ مناظرہ سے فراغت پانے کے بعد جب سب حضرات واپس ہونے لگے۔ تو نواب صاحب نے حضرت کو کچھ زیادہ رقم دینی چاہی۔ جو حضرت نے بواسطہ پیام یہ کہہ کر واپس کر دی کہ:-

"ریاست کو بیت المال میں سے زائد از ضرورت صرف کرنے کا شرعاً اختیار حاصل نہیں ہے۔"

اس سے نواب صاحب حضرت کے اصولِ شرعیہ کی پابندی سے بہت متاثر ہوئے۔ خواہ ان سے اس پر بعد میں عمل نہ ہو سکا ہو۔ مگر حضرت نے انہیں ایک ایسا سبق دیا۔ جو کوئی دوسرا نہ دے سکا۔ اور جس میں ان کی دنیوی اور اخروی فلاح ونجات مضمر تھی۔

امیر بہاولپور کو تعلیم دین

ایک سلسلہ میں نواب بہاولپور کی طرف سے حضرات علماء کو مدعو کیا گیا۔ ان میں حضرت تھانویؒ بھی شامل تھے۔ واپسی کے وقت نواب صاحب کی طرف سے سب حضرات کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ بطور خلعت اور پچیس پچیس روپے بنام دعوت عطا کئے گئے۔ اس وقت تو حضرت نے احترام نواب کے خیال سے سب کے ساتھ یہ رقم لے لی لیکن خلوت میں وزیر متعلقہ سے عذر فرمایا کہ:۔

"یہ رقم مجھ سے واپس لے لی جائے۔ کیونکہ یہ بیت المال میں سے دی گئی ہے جس کا میں مصرف نہیں"۔

انہوں نے عرض کیا کہ:۔

"چونکہ اس رقم کا کاغذات سرکار میں اندراج ہو چکا ہے۔ اسلئے اب اس کی واپسی کی کوئی صورت نہیں"۔

حضرت نے فرمایا۔

"خیر! اگر خزانہ میں واپسی نہیں ہو سکتی۔ تو اس رقم کو مقامی علماء اور طلباء میں صرف کر دیا جائے کیونکہ شرعاً بیت المال کے مصرف کے وہ قریب ہیں"۔

غرض جو کچھ حضرت کو ملا تھا۔ وہ آپ نے سب کا سب واپس فرما دیا۔ لیکن نہایت سلیقہ اور طریقہ سے جب یہ بات نواب صاحب کو معلوم ہوئی انہوں نے اس "عطائے تو بلقائے تو" پہ خفگی کی بجائے حسرت کا اظہار فرمایا۔

خلعت کی واپسی

ایسا ہی واقعہ آپ کو ریاست خیرپور سندھ میں پیش آیا۔ وہاں بھی آپ نے خلعت کی واپسی کا بھی عذر فرمایا۔ جس پہ وزیر متعلقہ نے کہا کہ نواب صاحب کو واپسی خلعت ناگوار ہوگی۔ تو حضرت نے فرمایا۔

"اگر یہ اندیشہ ہے تو ان کو معلوم ہی کیوں کرایا جائے۔ بلکہ جو نقد بعنوان خلعت ملا ہے اس کو مساکین میں تقسیم کر دیا جائے۔ کیونکہ وہ لوگ اس کے صحیح مصرف ہیں"۔

چونکہ حضرت کی نیت نیک ہوتی تھی۔ اسلئے حق تعالے آپ کو ایسے اتفاقی سوالات کا بر موقعہ ایسا جامع و مانع جواب الہام فرماتے تھے کہ دوسرے کو ماننے کے سوا کوئی چارہ ہی نظر نہ آتا تھا۔ اسی لئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"الحمد للہ! اب مجھے کسی جگہ خلاف شریعت یا خلاف طبیعت کرنے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا"۔

ایک نواب کا اقرارِ بدتہذیبی

ایک خاندانی معتدبہ ذی وجاہت رئیس اور نواب نے مبلغ دوسو روپیہ مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون کی امداد کے لئے بھیجے۔ جو بلا کسی چندہ کے توکلاً علی اللہ حضرت کی سرپرستی اور نگرانی میں خاص خانقاہ کے اندر قائم تھا۔ اس عطیہ کے ساتھ انہوں نے تشریف آوری کی درخواست بھی بھیج دی۔ حضرت نے یہ لکھ کر روپے واپس کر دیے کہ :۔

"اگر اس رقم کے ساتھ بلانے کی درخواست نہ ہوتی۔ تو مدرسہ کے لئے روپیہ لے لیا جاتا۔ اب اس اقتران سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ شاید مجھ کو ممنون کرنے کے لئے یہ رقم بھیجی گئی ہو۔ آپ کی یہ غرض نہ سہی۔ لیکن میرے اوپر تو طبعی طور پر اس کا یہی اثر ہوگا کہ میں آزادی کے ساتھ اپنے آنے نہ آنے کے متعلق رائے نہ قائم کر سکوں گا۔ کیونکہ انکار کرتے ہوئے شرم آئے گی۔"

نواب صاحب بھی بڑے فہمیدہ اور جہاں دیدہ تھے فوراً سمجھ گئے کہ عطیہ اور درخواست اکٹھی نہ بھیجنی تھی فوراً معذرت نامہ لکھا کہ :۔

"آپ کے متنبہ کرنے سے اب یہ معلوم ہوا کہ واقعی یہ مجھ سے سخت بدتہذیبی ہوئی۔ میں اب اپنی درخواست تشریف آوری واپس لیتا ہوں اور روپیہ مکرر ارسال خدمت کرتا ہوں براہِ کرم مدرسہ کے لئے قبول فرما لیا جائے۔"

حضرت نے پھر بخوشی قبول فرماتے ہوئے نواب صاحب کو لکھا :۔

"ابھی تک تو آپ میری ملاقات کے مشتاق تھے۔ اور اب آپ کی تہذیب اور شرافت نے خود مجھ کو آپ کی ملاقات کا مشتاق بنا دیا ہے۔"

کچھ مدت کے بعد نواب صاحب نے پھر تشریف آوری کے لئے درخواست بھیجی تو حضرت بخوشی اس شرط پر تشریف لے گئے کہ "کسی قسم کا ہدیہ پیش نہ کیا جائے گا۔"

محبت و مصلحت کا تصادم

جب آپ واپس آنے لگے۔ تو نواب صاحب کی والدہ ماجدہ نے جو آپ کی پیر بہن تھیں۔ تقریباً سو روپیہ خدمت میں پیش کرنا چاہا۔ اس پر آپ نے خلافِ شرط ہونے کا عذر فرمایا۔ نواب صاحب نے عرض کیا کہ شرط تو میرے ساتھ تھی۔ یہ والدہ صاحبہ کی طرف سے ہے۔ فرمایا :۔

"والدہ اور ولد میں کیا فرق ہے۔ گھر تو ایک ہی ہے۔"

نواب صاحب نے مجبور ہو کر کہا :۔

"حضرت اگر کسی کا جی ہی خدمت کرنے کو چاہے۔ تو آخر وہ کیا کرے"۔

فرمایا:۔

"میں خانہ بدوش تو نہیں ہوں۔ کہ میرا کوئی ٹھکانا نہ ہو۔ میرے ٹھکانے پر بھی تو تشریف لانا ممکن ہے"۔

چونکہ نواب صاحب ماشاءاللہ بڑے ہی سلیم الفطرت واقع ہوئے تھے اور ایک پرانے دینی خاندان کے مایۂ ناز فرزند تھے۔ اسلئے انہوں نے حضرت سے عام لوگوں کی طرح کچھ اصرار نہ فرمایا اور رخصت ہو رہے۔ پھر ایک معتد بہ مدت گزر جانے کے بعد خود تھانہ بھون آگئے اور تین گنیاں ہدیۃً پیش کیں۔ حضرت نے بڑی مسرت و احترام سے قبول فرمائیں۔

نواب صاحب کی یہ دانشمندی قابل داد تھی کہ انہوں نے حضرت کے ذہن کو گذشتہ واقعہ کی طرف منتقل نہ کرنے کے لئے اور قلب پر بار نہ ڈالنے کی غرض سے پہلی رقم کی مقدار بدل دی تاکہ وضعداری نہ سمجھی جائے۔ نواب صاحب کے مؤدب و مہذب ہونے کی وجہ سے اور ان کی اعلیٰ عقیدت کی بنا پر حضرت کے ان سے خصوصی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ کیونکہ حضرت کو با اصول لوگوں سے ملنے میں بڑی فرحت ہوتی تھی۔

ایک رئیسہ کا علاج

حضرت تھانویؒ کو بحالتِ سفر چونکہ مختلف المزاج لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا اسلئے ہر ایک کے مرض کا علاج روحانی بھی مختلف ہوتا تھا۔ ایک دنیادار رئیسہ نے دار الطلبہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور تیار کرایا۔ اور اس کے افتتاحی جلسہ کی تاریخ مقرر کرکے مہتمم صاحب کو لکھا کہ اپنے مدرسہ کے سرپرستوں اور دیگر اراکین کو اطلاع کر دیں کہ اس تاریخ پر مدرسہ میں آجائیں۔ مہتمم صاحب نے اس اطلاع کے ساتھ حضرت کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ تو آپ نے بایں وجہ شرکت فرمانے سے انکار کر دیا کہ:۔

"ان کو اس حاکمانہ لہجہ میں بلانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس طرح حکم نامہ بھیجکر بلانا خلافِ تہذیب ہے۔ یہ بھی کوئی بلانے کا طریقہ ہے۔ میں نہیں آؤنگا۔ کیا وہ کسی رئیس کو ایسے طریقہ سے دعوت دے سکتی تھیں"۔

مہتمم صاحب نے مدرسہ کی مصالح کی بنا پر تاویلاً اصرار کیا کہ یہ ان رئیسہ کا فعل نہیں۔ ان کے میر منشی کا ہے۔ اس پر حضرت نے لکھا۔

"پھر بھی یہ شکایت ہے کہ اس معاملہ کو بالکل میر منشی ہی پر کیوں چھوڑ دیا گیا۔ مسودہ خود دیکھ کر

منظوری دیتیں جس طرح حکام کے دعوت ناموں میں اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان کے بلانے پر تو میں اب نہیں آؤنگا۔ البتہ اگر آپ حکم دیں تو جو تیاں چٹخاتا ہوا سر کے بل حاضر ہونگا۔ مگر رئیسہ سے نہیں ملوں گا۔ نہ ان سے کوئی گفتگو بلا واسطہ یا بالواسطہ کروں گا۔"

[م]ولوی صاحب نے اس مشروط شرکت کو ہی غنیمت سمجھا اور حضرت کو تشریف آوری کے لئے لکھا چنانچہ [حض]رت وہاں تشریف لے گئے۔ بڑا پراثر وعظ فرمایا جس سے رئیسہ بھی متاثر ہوئیں۔ مگر وعظ فرمانے [ک]ے فوراً بعد حضرت کسی کو ملے بغیر یہاں تک کہ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کو بھی ملے بغیر چلے آئے۔ [ا]ور کسی کو کچھ کہنے سننے یا اصرار کرنے کا موقع نہ ملے۔ رئیسہ کو بھی اس واقعہ کا علم ہو گیا۔ اور انہوں [ن]ے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ علماء میں بھی ایسے خوددار لوگ ہوتے ہیں۔ اسلئے انہوں نے ملک بھر [م]یں جو مٹھائی تقسیم کی تھی۔ اس میں سے اپنا حصہ حضرت کو اسٹیشن پر یہ کہلا کر بھیجا کہ یہ مٹھائی عام تقسیم [کی] نہیں ہے خود میرے حصہ کی ہے اسلئے ضرور قبول فرما دیں اور واپس نہ فرما دیں۔ چونکہ رئیسہ صاحبہ [کو] اپنے باطنی مرض کا احساس ہو گیا تھا۔ اسلئے حضرت نے وہ قبول فرما لی اور اس طرح نہایت [خو]ش اسلوبی سے حضرت نے علماء کو بنظرِ حقارت دیکھنے والی کا ایسا علاج فرمایا کہ پھر وہ علماء کی بڑی [ع]زت کرتی رہی۔

[ا]نگریز کی دعوت

الافاضات الیومیہ کے ملفوظ ع۱۷۳ میں حضرت کا ارشاد درج ہے کہ مجھے اکثر اوقات انگریزوں کے ساتھ بھی سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر کبھی کوئی شر نہیں ملا ایک مرتبہ ایک دوست کے اصرار پر کلکتہ سے سیکنڈ کلاس میں سوار ہوا۔ اسی میں ریلوے کا ایک انگریز افسر بھی سوار ہوا۔ جسے اوپر کے تختہ پر جگہ ملی۔ کہنے لگا کہ ہم کو نیچے کے تختہ (سیٹ) پر تھوڑی سی جگہ کھڑکی کی طرف آپ دیدیں۔ ہم کو بار بار ریلوے کے انتظام کے لئے باہر آنا جانا پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہمارا کوئی حرج نہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔ وہ بیٹھ گیا جب کھانے کا وقت آیا۔ میں نے ان دوست کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ آپ کھانا کھائیں گے۔ کہا مجھ کو کیا عذر ہے۔ ہم نے کھانا بازار سے خرید لیا تھا۔ جو کچھ پتوں پر ملا تھا۔ ہم نے اس کو بھی اس خیال سے کہ برتنوں کو کون دھوتا پھریگا انہی پتوں پر کچھ کھانا رکھ کر دیدیا۔ جو اس نے بڑی خوشی سے لے کر کھایا۔ ایک صاحب پوچھنے لگے کہ برتن میں کھانا کیوں نہ دیا؟ میں نے کہا چونکہ پڑوسی تھا۔ اسلئے حق جوار ادا کیا۔ حق احترام ادا نہیں کیا کہ اسلام سے محروم تھا۔ وہ بردوان کے اسٹیشن پر اترا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو بہت تکلیف ہوا۔ ہماری وجہ سے۔ اور ہم کو آپ کی وجہ سے بہت آرام ملا۔"

ایک رفیق سفر کہنے لگے۔ اگر آپ برتنوں میں کھانا دیتے تو زیادہ شکریہ ادا کرتا۔ میں نے کہا کہ یہ بھی ممکن تھا کہ نہ کرتا۔ برتن میں کھانا دینے سے اپنے کو بڑا سمجھتا کہ ہمارا احترام کیا گیا ہے پھر شکریہ کی ضرورت ہی کیا محسوس ہوتی۔

تعظیمی رسوم کا خاتمہ ہر علاقہ میں ملنے جلنے۔ کھانے پینے اور تعظیم و تکریم کی مختلف رسومات رائج ہوتی ہیں۔

حضرت تھانوی اپنے سفر کے دوران میں جہاں جہاں بھی ایسے رسومات کو دیکھتے ان کے انسداد و استیصال کی طرف فوری توجہ دیتے اور اس تہذیب و تدبیر سے ان رسومات کے عادی لوگوں کو سمجھاتے کہ وہ فوراً حضرت کے فرمان سے متاثر ہو کر انہیں ترک کر دیتے۔

اعظم گڑھ میں یہ دستور تھا کہ حضرت کے ساتھ ایک جم غفیر کی بھی دعوت کی جاتی۔ حضرت تھانوی میزبان پر کسی قسم کا بار ڈالنے کے عادی نہ تھے۔ اسلئے کبھی کسی سے کوئی فرمائش نہ کرتے۔ پر تکلف کھانوں کی بجائے سادہ معمولی کھانوں سے خوش ہوتے۔ آپ نے وہاں کی اس رسم کے انسداد کی یہ ترکیب نکالی کہ جو شخص بھی دعوت کرتا۔ یہ قید لگا دیتے کہ "میں تنہا کھاؤں گا۔ اور محض خشکہ اور ارہر کی دال کھاؤنگا۔ کیونکہ وہاں بیلن کی روٹیوں کا رواج ہے۔ جو ذرا سخت ہوتی ہے۔ اور مجھے موافق نہیں آتی"۔ اس طرح آپ نے میزبان کو بہت بڑے بار سے بچا لیا۔

بنگال میں یہ رسم تھی کہ جو بھی ملنے آتا۔ آکر پاؤں کو چھوتا۔ جیسے پنجاب میں بھی اکثر پیروں کے ہاں دیکھا جاتا ہے۔ اس کے روکنے کی یہ ترکیب نکالی کہ اول آپ منع فرماتے جو اس کے بعد بھی آپ کے پاؤں پکڑتا تو اس کے لئے علاج بالمثل فرماتے یعنی آپ بھی فوراً اسکے پاؤں پکڑ لیتے۔ اور جب وہ شرمندہ ہو کر بند کرتا تو فرماتے:۔

"اگر یہ کوئی اچھی بات ہے۔ تو مجھے اس سے کیوں روکتے ہو۔ اور اگر بری بات ہے تو تم ایسی حرکت کیوں کرتے ہو"۔

بس دو چار مرتبہ ایسا کرنے کی دیر تھی کہ اس کی شہرت عام ہو گئی اور لوگوں نے اس بیہودہ رسم کو ترک کر دیا۔ ضلع اعظم گڑھ میں یہ دستور بھی تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کی سواری گزرتی تو چند لوگ آگے آگے ہٹو بچو کہتے ہوئے چلتے۔ جو کوئی آگے آتا ہوا دیکھتے اسے ہٹا دیتے۔ حضرت نے ان لوگوں سے فرمایا کہ:۔

"راستہ کسی کی ملک نہیں ہے سب کو چلنے کا برابر حق حاصل ہے یہ حرکت خلاف شرع

ہے۔ اس کو چھوڑنا چاہیئے۔ اور آئندہ ہرگز ایسا نہ کیا جائے۔"

بس لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور آئندہ کے لیئے یہ رسم موقوف ہو گئی۔

ایک جگہ یہ دستور تھا کہ لوگ پالکی کے ساتھ دائیں بائیں دوڑتے ہوئے چلتے۔ حضرت نے منع فرمایا کہ مجھ کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہم تو محبت سے ایسا کرتے ہیں۔ فرمایا پھر مجھے دکھلاتے کیوں ہو۔ دائیں بائیں نہ چلو۔ پالکی کے پیچھے چلو۔ جہاں سے مجھ کو نظر نہ آئے۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد جو حضرت نے مڑ کر دیکھا تو کوئی بھی نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ رسم محض دکھلاوے کے لیئے ہوتی ہے۔ مگر وہ بچارے کیا کرتے۔ کسی مقتدا نے کبھی انہیں ٹوکا ہی نہ تھا۔ وہاں یہ بھی دستور تھا کہ علماء ہندوؤں سے بات بھی نہ کرتے تھے۔ اور اگر کوئی علماء کی تعظیم کے لیئے نہ اٹھتا۔ تو اسے اہانت سمجھتے۔ حضرت جب ایک انگریزی سکول کے پاس سے گزرے تو دستور کے مطابق سب ہندو طلبا اور مدرسین تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ ان کا یہ سلوک دیکھ کر حضرت سکول کے اندر تشریف لے گئے۔ اور نہایت سادگی اور ملاطفت کے ساتھ سب سے ملے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ جس سے وہ لوگ بہت مسرور ہوئے اور تعجب کرنے لگے کہ ایسے بھی مولوی ہوتے ہیں۔

ایک جگہ دستور کے مطابق گاؤں کے چوہدری نے چندہ کر کے دو سو روپیہ حضرت کو نذرانہ دیا لیکن یہ ظاہر نہ کیا کہ یہ گاؤں والوں سے جمع کیا گیا ہے۔ اس کی مالی حالت سے حضرت کو شبہ ہوا کہ یہ از خود اتنا نہیں دے سکتا۔ اسلیئے حضرت نے پوچھا کہ یہ آپ کی طرف سے ہے یا اس میں اور بھی شریک ہیں۔ جواب ملا کہ اس میں دوسرے بھی شریک ہیں۔ فرمایا:۔

"ہدیہ محبت کے لئے ہوتا ہے جب دینے والے کو میں نہیں جانتا۔ تو مجھ کو ان کی محبت کیسے ہوگی۔ اسلیئے ہر ایک کی رقم اس کو واپس کر دو۔ پھر جس کو دینا ہوگا۔ ہر ایک خود آکر اپنے ہاتھ سے دیگا۔ جس سے مجھے پتہ چلیگا کہ یہ میرا محسن ہے اور مجھے اس سے محبت ہے۔"

چوہدری نے عذر کیا کہ اب تو آپ جا رہے ہیں۔ فرمایا:۔

"میں بہت قریب مقام پر جا رہا ہوں۔ جہاں پہنچنا سب کو آسان ہے۔ جس کو شوق ہو وہاں آکر ہدیہ دے۔"

مگر کوئی بھی ہدیہ دینے نہ آیا۔ کیونکہ وہاں یہ رسم تھی کہ اگر کوئی مولوی آئے اور اسے معقول نذرانہ نہ دیا جائے تو وہ برا مناتا تھا۔ مگر جب لینے والا ہی نہ لے تو پھر کسی کو پیچھے دوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

اعظم گڑھ کے ان واقعات کے سلسلہ میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"میں نے وہاں کی اور رسموں کو تو مٹا دیا۔ لیکن ایک رسم کے مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا، وہ یہ کہ جب کوئی عالم آتا۔ تو موضع کے اکثر لوگ یہاں تک کہ چھوٹے لڑکے بھی استقبال کے لئے دور تک آتے اور ایسا ہی رخصت کے وقت کرتے۔ وہاں کے لوگوں میں بہت ہی صلاحیت اور دینداری ہے۔ وہاں کے انگریزی خوانوں میں بھی خوش عقیدہ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے صرف معاش کے لئے انگریزی پڑھتے ہیں۔"

سفری مناظرے سفر میں اکثر ہر خیال کے لوگوں سے حضرت کا سابقہ پڑتا تھا۔ جن سے مختصر سے مناظرے بھی ہو جایا کرتے تھے۔ جو دو چار باتوں تک ہی محدود رہتے تھے۔ مثلاً ریاضی کے پروفیسر اور مشہور اہل قلم مولوی ذکاء اللہ مرحوم سے حضرت کی دہلی میں ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے مدرسوں میں طلبا میں کچھ لیاقت بھی پیدا ہوتی ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ پہلے مجھے لیاقت کا مفہوم معلوم ہو جائے تو جواب دوں۔ بس خاموش ہو گئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر جواب دیا۔ تو لیاقت کے مفہوم کا مدعی بن کر اس کا ثابت کرنا مشکل ہو جائیگا۔ یہ لوں گا تو دلدل میں پھنستا چلا جاؤں گا۔

آریہ کا اقرار کفر ایک سفر کے دوران میں آریہ سماج کے ایک لیکچرار نے حضرت کی باتیں سن کر آپ سے یہ سوال کیا کہ دو شخص ہیں۔ ان میں ایک مسلم ہے اور دوسرا غیر مسلم دونوں نے نیک نیتی سے کوئی نیک عمل کیا۔ تو اس عمل کا اجر دونوں کو یکساں ملیگا یا مختلف؟ حضرت نے فرمایا کہ:۔

"یہ سوال آپ کی دانشمندی اور تہذیب سے نہایت بعید ہے۔ کیونکہ آپ نے یہ ایک ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب آپ کے ذہن میں موجود ہے۔"

اس نے کہا:۔

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ اس کا جواب میرے ذہن میں موجود ہے؟"

آپ نے فرمایا۔

"جب اس جواب کے سب مقدمات آپ کے ذہن میں موجود ہیں تو وہ جواب بھی موجود ہے کیونکہ جب ملزوم موجود ہے۔ تو لازم کا وجود بھی ضروری ہے۔"

اس نے پھر سوال کیا کہ:۔

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ سب مقدمات میرے ذہن میں موجود ہیں۔"

فرمایا کہ:۔

"لیجئے! میں آپ ہی کے منہ سے اُن مقدمات کے موجود فی الذہن ہونے کا اقرار کرائے لیتا ہوں۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ مختلف مذاہب میں حق مذہب ایک ہی ہو سکتا ہے اس وقت اس کی بحث نہیں کہ حق مذہب کون سا ہے"۔

اس نے کہا:۔

"بیشک۔ حق تو ایک ہی مذہب ہو سکتا ہے"۔

حضرت نے فرمایا۔

"ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ جو آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہے۔ دوسری بات میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا مذہب حق والے کی مثال مطیع سلطنت کی سی اور باطل والے کی مثال باغی سلطنت کی سی نہیں؟"

اس کا بھی اس آریہ نے اقرار کیا اس دوسرے مقدمہ کو تسلیم کرنے کے بعد حضرت نے پھر اسے فرمایا

"کیا باغی کے سارے کمالات محض اس وجہ سے کہ وہ باغی ہے۔ نظر انداز نہیں کر دئے جاتے۔ اور کیا باوجود صاحب کمالات ہونے کے اُس کو عدالت سے سزا نہیں ملتی اور کیا وہ سزا عقل و انصاف کے خلاف ہوتی ہے؟"

جب اس نے ان سب باتوں کے صحیح ہونے کا اقرار کر دیا۔ تو اس پر حضرت نے فرمایا۔

بس یہ تینوں مقدمات آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہیں۔ تو اس کا نتیجہ بھی ضرور آپ کے ذہن میں ہے۔ اور وہی آپ کے سوال کا جواب ہے تو ایسی حالت میں آپکے سوال کا صاف یہ مطلب ہوا کہ میں اپنے منہ سے آپ کو کافر کہوں؟ سو ہماری شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ بلا ضرورت ہم کسی کو کافر کہیں"۔

اس آریہ نے خوش ہو کر کہا:۔

"واقعی مجھے اس کا شوق تھا کہ میں اپنے بارہ میں آپ کے منہ سے یہ لفظ سنوں ایسے منہ سے اپنے بارہ میں کافر کا لفظ سننے میں بھی مزہ آتا ہے"۔

حضرت نے جواب دیا۔

"خیر یہ آپ کے لئے تو خوبی ہے۔ لیکن میرے لئے سخت ناگوار بات ہے"۔

ترکِ سفر ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اتنا عرصہ صعوبتِ سفر برداشت کرنے کے

بعد یکایک حضرت کی آنت اترنے کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا جس کی وجہ سے آپ نے مجبوراً آمد و رفت
کے لئے کلیتہً سفر کرنا بند کر دیا۔ اور مشتاقانِ دید کے لئے حسب ذیل عذر نامہ چھپوا دیا جہاں سے
درخواست طلبی آتی یہ بھیج دیا جاتا۔ اور اس کے بعد کسی کو بلانے یا اصرار کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔

عذر نامہ اکثر احباب کو معلوم ہے کہ آنت اترنے کا عارضہ مجھ کو تیس برس سے زائد عرصہ سے ہے
مگر جب تک بدن میں کافی قوت رہی تکلیف کم تھی۔ اب قوت کم ہو جانے سے تین
برس سے زیادہ زمانہ ہوا کہ یہ حالت ہو گئی ہے کہ باوجودیکہ ایک سخت کمانی (جس کی سختی بعض اوقات
بہت ناگوار ہوتی ہے۔ اور جس کے نیچے ہوا نہ لگنے سے یا پسینہ آجانے سے کھال میں دانے بھی پیدا
ہو جاتے ہیں جن میں سوزش ہونے لگتی ہے۔ تو ایسی سخت کمانی) ہر وقت لگی رہتی ہے۔ مگر پھر بھی بکثرت
ایسا ہوتا ہے کہ (۱) کھانسنے سے (۲) دھسک اُٹھنے سے (۳) چھینکنے سے (۴) پکار کر بولنے سے
(۵) دیر تک کھڑے رہنے سے (۷) دور تک چلنے سے آنت اتر آتی ہے۔ بعض دفعہ تو ایک گھنٹہ میں
دو دو تین تین بار اترنے کی نوبت آجاتی ہے۔ جس کو اگر فوراً ٹھیک نہ کیا جائے۔ تو تکلیف اس قدر
بڑھ جاتی ہے کہ سہار نہیں ہو سکتی۔ اور بعض دفعہ اترتے ہی پیٹ اور سینہ کی رگیں کھنچنے لگتی ہیں جن
سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اور ٹھیک کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ پردہ کے مکان
میں لیٹ کر کپڑا ہٹا کر کمانی اتار کر ہاتھ کے دباؤ سے آنت کو چڑھا کر پھر کمانی لگائی جاوے۔ اور ظاہر
بات ہے کہ اس مجموعی حالت میں کسی طرح بھی سفر ممکن نہیں۔ اسی بنا پر اطبا اور ڈاکٹروں نے زیادہ
چلنے پھرنے بلکہ زیادہ دیر کھڑے رہنے کو بھی مضر بتلا رکھا ہے۔ اور خود مجھ کو بھی مضر ہونے کا شب
و روز مشاہدہ و تجربہ ہو رہا ہے۔ اسی لئے تین سال سے زائد زمانہ ہوا کہ میں نے کوئی چھوٹا یا بڑا
سفر نہیں کیا۔ بلکہ اگر کوئی عزیز دوسرے محلہ میں مر گیا۔ تو بذریعہ رقعہ اس کا پُرسہ دیدیا۔ خود نہیں جا سکا
اور چونکہ سبب اس کا جھلی کا پھٹ جانا ہے اور قاعدہ کی رو سے اب اس کا چڑھانا عادۃً غیر
ممکن ہے۔ اسلئے اس عارضہ کے جانے کی آیندہ بھی کوئی امید نہیں۔ چنانچہ متعدد ہندوستانی
بنگالی اور یورپین ڈاکٹروں کا اس پر اتفاق ہے کہ بجز اپریشن کے اس کا کوئی علاج نہیں۔ اور
اس پر بھی اتفاق ہے کہ اپریشن اس عمر میں خطرناک ہے۔ یہ سب مجموعی واقعات سفر سے میری دائمی
معذوری کو صاف ظاہر کر رہے ہیں۔ چونکہ بعض احباب جنہوں نے اس حالت کا مشاہدہ نہیں
کیا۔ اب بھی اپنی تقریبات وغیرہ میں میرے بلانے کی تحریک کیا کرتے ہیں۔ ان کی اطلاع کے لئے یہ
اعلان شائع کرتا ہوں۔ تاکہ میرے اس قوی عذر پر نظر فرما کر ایسی تحریک نہ فرماویں۔ والسلام اشرف علی۔ تھانہ بھون
۱۰ جمادی الثانی ۱۳۳۲ھ

حقیقتِ عذر چونکہ قدرت نے حضرت سے چلتے پھرتے جو کام لینا تھا۔ وہ پورا ہو چکا تھا۔ اور اب حضرت کو قطب الارشاد بنا کر ایک جگہ بٹھانا مقصود تھا جیسا کہ اکثر اولیاء اللہ کے ساتھ معاملہ رہا ہے۔ اسلئے غیب سے ایک عذر لاحق کر دیا گیا۔ جس میں بفضلہ تعالیٰ کوئی بڑی تکلیف بھی نہ تھی۔ اور دوسروں پر حجت قائم کرنے کے لئے وجہ بھی معقول اور قابل قبول تھی اس کے بعد آپ قطبِ زماں کی حیثیت سے اپنے مرکز پر ہی بیٹھے اور خلقِ خدا کو اپنے فیض سے بہرہ اندوز کرنے میں پہلے سے بھی زیادہ مشغول ہو گئے۔

سفرِ لاہور شوال ۱۳۴۳ھ کے بعد سے حضرتؒ نے سخت مجبوریوں۔ کبرسنی اور ضعف کے باعث ترکِ سفر کا مصمم ارادہ فرمالیا تھا۔ اور اس کے بعد کسی صورت میں بھی کسی کی درخواست منظور نہ فرمائی۔ لیکن پھر بھی اپنی ذاتی ضرورتوں اور اپنی وجہ سے دوسروں کو تکلیف سے بچانے کے لئے چار مرتبہ سفر کی زحمت گوارا کرنی پڑی۔ پہلا سفر غالباً ذی قعدہ ۱۳۵۳ھ اور دوسرا ۱۸ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۴ھ کو سہارنپور تک کا ہوا۔ جو صرف اپنے بڑے بھانجے مولوی سعید احمد صاحب مرحوم کی صاحبزادی کو سفر حج کے سلسلہ میں سہارنپور تک پہنچانے اور دوسری مرتبہ سہارنپور سے لانے کے لئے صرف ان کی خاطر سے بغایت شفقت و محبت برداشت کیا۔

ان دو مختصر سفروں کے بعد تیسرا اہم سفرِ لاہور کا اسلئے کرنا پڑا کہ حضرت کو عرصہ سے معدہ کی شکایت چلی آتی تھی۔ جس سے غذا کم ہو گئی تھی۔ اور وہ بھی ہضم نہ ہوتی تھی۔ چونکہ اوپر نیچے کے بعض دانت ٹوٹ گئے تھے۔ اسلئے خیال ہوا کہ شاید غذا پورے طور پر نہ چبائے جاسکنے کی وجہ سے ہضم میں فتور ہو کر معدہ خراب ہو گیا ہو۔ دانت بنوانے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اپنے مخلص خادم اور لاہور کے مشہور و تجربہ کار ڈاکٹر عزیز احمد جلال الدین صاحب سے دانت بنوانے کا فیصلہ کیا جو اس فن میں مہارت تامہ اور نہایت کمال رکھتے تھے۔ گو ڈاکٹر صاحب تھانہ بھون پہنچ کر یہ خدمت انجام دینے کے لئے تیار تھے۔ مگر آپ کی غیور اور با اصول طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا اور ۲۹ صفر ۱۳۵۷ھ مطابق ۳۰ اپریل ۱۹۳۸ء کو بروز شنبہ صبح کی گاڑی سے بقصدِ لاہور تھانہ بھون سے سہارنپور روانہ ہوئے۔

رفقاءِ سفر رفیقِ سفر صرف آپ کے بھتیجے مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اور شیخ فاروق احمد صاحب متوطن لندن تھے۔ شیخ فاروق احمد صاحب نے انگریزی میں شائع شدہ حضرت کی تصانیف کتب تصوف اور تذکرہ ہائے اولیاء پڑھنے کے بعد کوئی دو سال قبل لندن میں اسلام قبول کیا تھا اور حضرت

کی زیارت کا شوق رکھتے تھے۔ کہ خدا تعالیٰ نے کچھ ذرائع پیدا کر دیئے۔ جن کی وجہ سے وہ لندن سے ہندوستان آئے اور ریاست بہاولپور میں مقیم ہوئے۔ وہاں سے وہ اپنے قومی لباس کی بجائے اسلامی لباس میں یعنی سر پر ترکی ٹوپی قمیص کی بجائے کرتہ۔ کوٹ کی بجائے شیروانی۔ پتلون کی بجائے شلوار اور بوٹ کی بجائے جوتہ پہنے اور داڑھی بڑھائے نورانی شکل میں خانقاہ امدادیہ میں پہنچے وہ اگرچہ اردو۔ فارسی۔ عربی نہ جانتے تھے۔ مگر حضرت کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ کانوں میں پڑنے۔ رخ انور پر نظر جانے اور باطنی توجہ اور فیوض و برکات کے اثر سے ان کو اتنی تسکین قلب ہوتی تھی کہ ہر مجلس میں حاضر رہتے تھے۔ ان کے جذبات و کیفیات اور احساسات و سوالات حضرت تک اور حضرت کے جوابات و ملفوظات ان تک مترجمین پہنچاتے رہتے تھے۔ جن سے ان کو اتنے فوائد حاصل ہوئے کہ ضبط تحریر میں نہیں آسکتے۔

ایک اہم سبق | چونکہ یہ سفر ایک ذاتی ضرورت کے ماتحت کیا جا رہا تھا۔ اسلئے آپ نے اپنی روانگی کو پردۂ اخفا میں رکھا اور شروع سے ایسے انتظام کر دیئے کہ سوائے متعلقین کے دوسروں کو اس سفر کا علم نہ ہو سکے۔ چنانچہ سہارنپور اترنے کے بعد آپ سیدھے اپنے بھتیجے حامد علی صاحب اور محمود علی صاحب کے ہمراہ جو اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ حامد علی صاحب کے مکان پر اترے اور وہاں سے بلا اطلاع مدرسہ مظاہر العلوم میں تشریف لے گئے۔ بس آپ کا وہاں پہنچنا تھا کہ کسی پوشیدہ مقناطیسی کشش سے آناً فاناً مشتاقان زیارت کا اتنا ہجوم ہو گیا کہ مدرسۂ قدیم کی عمارت ناکافی ہو گئی۔ اور حضرت کو چند قدم چلنا دشوار ہو گیا۔ ہر شخص زیارت و مصافحہ کیلئے بیتاب تھا اور حضرت جتنے کہ ہاتھ بڑھائے ہر ایک کو مصافحہ کی سہولت بہم پہنچا رہے تھے۔ ہجوم لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اور وقت رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ادھر حضرت بھی اتنی دیر ہاتھ بڑھائے تھک رہے تھے۔ جسے دیکھ کر مولانا حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ نے مصافحہ کرنے والوں کو روکا۔ مگر حضرت نے خود ان کو روک دیا کہ نہیں کسی کو نہ روکا جائے۔ میری محبت ان کو لے آئی ہے۔ میں یہاں ملنے ملانے کو تو آیا ہوں۔ ناظم صاحب نے کہا کہ حضرت والا کو تکلیف ہو گی۔ فرمایا کبھی احباب کو ملنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ یہاں اور کام ہی کیا ہے۔ تھانہ بھون تو دوسرے مشاغل ہوتے ہیں۔ اسلئے وہاں انضباط اوقات ضروری ہے۔ ورنہ کوئی کام بھی نہ ہو سکے۔ یہ جو اتنا کام ہو گیا ہے وہ انضباط اوقات ہی کی بدولت ہے۔

جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا۔ تو اب ناظم صاحب نے کچھ سختی کرنی چاہی۔ تو حضرت نے

پھر روک دیا۔ اس پر ناظم صاحب نے کہا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت کو تکلیف ہو رہی ہے اور لوگ ہیں کہ نہیں مانتے اور نہ کچھ سنتے ہیں۔ یہ بھی کوئی انسانیت اور تہذیب ہے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ:۔

"دیکھئے جس کے سپرد انتظام ہوتا ہے۔ اس کو سختی کرنا ہی پڑتی ہے۔ بغیر اس کے کام نہیں چلتا۔ جو لوگ مجھ کو سخت کہتے ہیں۔ اب دیکھیں حقیقت میں میں سخت ہوں یا نرم حالانکہ حافظ صاحب بیچارے بہت نرم ہیں۔ لیکن انتظام کے لئے ان کو سختی کرنا پڑ رہی ہے۔ کوئی اجنبی آدمی اگر دیکھے تو اس کو تعجب ہوگا۔ کہ جس کی نسبت مشہور ہے کہ بہت سخت ہے۔ وہ کتنا نرم ہے اور جو نرم ہیں وہ سختی کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب تک میں تھانہ بھون میں ہوں۔ وہاں کے انتظام اور کام کا تعلق مجھ سے ہے۔ اگر میں سختی نہ کروں۔ تو کچھ کام بھی نہ کر سکوں اور یہاں ملنا ملانا یہی کام ہے۔ اسلئے سختی کی ضرورت نہیں۔ نرم ہوں اور ناظم صاحب چونکہ یہاں کے منتظم ہیں۔ اسلئے وہ یہاں بہت سخت معلوم ہوتے ہیں۔" (ارمغان جاوداں صہ۱۷۱)

دوسروں کی رعایت

حضرتؒ نے اپنے پروگرام کے مطابق سہارنپور سے دو بجے رخصت ہونا تھا۔ احباب نے تقاضا کیا کہ دو بجے کی گاڑی میں سخت گرمی ہوگی لہٰذا بعد مغرب طوفان میل سے تشریف لے جائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مولوی شبیر علی سے مشورہ کر لیا جائے۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ لاہور کے لوگ اس گاڑی سے انتظار کریں گے۔ اہل مدرسہ کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی تجویز کی جائے کہ یہاں زیادہ قیام کا موقع مل سکے۔ گھر میں آئی ہوئی نعمت و برکت کو جلد چھوڑنے کو کسی کا بھی جی نہ چاہے۔ اسلئے کسی نے تجویز کی کہ لاہور تار دے دی جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ قباحت نظر آئی۔ کہ رات کی گاڑی میں ہجوم زیادہ ہونے کی وجہ سے تکلیف ہوگی۔ اور اہل لاہور کی پریشانی علاوہ۔ اسلئے حضرت کی خواہش کے مطابق دو بجے دن کی ہی گاڑی سے روانگی طے پائی۔ جب حضرت کو اس کی اطلاع دی گئی۔ تو آپ نے فرمایا

"بہتر آرام تسلیم و انقیاد ہی میں ہے۔"

چنانچہ سہارنپور سے وقت مقررہ پر روانہ ہوئے۔ یہاں سے حامد علی صاحب۔ مولوی ظہور الحسن صاحب مولوی ولی محمد صاحب بٹالوی اور مولوی حافظ سلیمان صاحب ننگونی بھی حضرت کی اجازت سے رفقاء سفر میں شامل ہو گئے۔ اگرچہ خاص مصالح کی بناء پر حضرت نے روانگی سے پہلے اہل پنجاب عوام و خواص سب پر اس سفر کے مخفی رکھنے کا خاص اہتمام فرما لیا تھا۔ اور حضرت کی آمد کا صرف ڈاکٹر

عزیز احمد جلال الدین صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہٗ امرتسری کو علم تھا اور انہیں تاکید بھی تھی کہ آمد کو مخفی رکھنا ہے۔ مگر اس گاڑی میں دو ایک ایسے آدمی بھی تھے۔ جو لاہور جا رہے تھے اور ان کو حضرت کے ہم سفر ہونے کا علم ہو چکا تھا۔ جب وہ حضرت سے ملنے آئے تو حضرت نے انہیں فرمایا کہ :۔

"لاہور میں کسی سے نہ کہنا کہ میں یہاں آیا ہوں۔ اگر تم نے کہا۔ تو تمہیں گناہ ہوگا۔ اسلئے کہ تمہاری اطلاع پر لوگ میرے پاس آئیں گے اور ہجوم سے مجھے تکلیف ہوگی۔ اور میرے نہ مل سکنے سے ان کو تکالیف ہوگی۔ اور مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے۔"

(ارمغانِ جاوداں ص۱۷)

اس پر وہ لوگ بڑے حیران ہوئے کہ ہمارے مشائخ۔ علماء اور لیڈر تو جہاں جاتے ہیں روانہ ہونے سے پہلے اخبارات کے ذریعہ اپنے پروگرام سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں تاکہ شایانِ شان استقبال ہو۔ اور ان کے پروگرام کو شہرت دینے اور استقبال کرنے والوں کے ممنون ہوتے ہیں اور یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔

سلسلہ ملفوظات ہمیشہ کے معمول کے مطابق اس مرتبہ بھی آپ تیسرے درجہ میں سفر کر رہے تھے۔ اللہ کے فضل سے ایک ایسا ڈبہ مل گیا تھا۔ جو گو مختصر تھا۔ مگر آرام دہ۔ مسافر بھی کم تھے۔ چند ہندو اور دو ایک مسلمان اور بیٹھے تھے۔ جو حضرت اور حضرت کے ہمراہیان سے مراعات پیش آتے رہے۔ اور نماز بھی باجماعت ہوتی رہی جب گاڑی امرتسر پہنچی تو حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب بھی تنہا تشریف لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت ڈیوڑھے میں ہوں گے۔ لسلئے انہوں نے بھی ڈیوڑھے درجہ کا ٹکٹ خرید رکھا تھا۔ لیکن جب حضرت کے قریب آکر بیٹھے۔ تو ان کو جوشِ مسرت میں یہ بھی محسوس نہ ہو سکا۔ کہ یہ تیسرا درجہ ہے۔ اس بات کا انہیں لاہور جا کر علم ہوا۔

امرتسر سے لاہور تک ریل میں حضرتؒ کے ملفوظات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حضرت مفتی صاحب کا بیان ہے کہ معلوم ہوتا تھا گویا خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون کی سہ دری ہے وہی مسندِ رشد و ہدایت وہی مجمع وہی اہل حاجت۔ وہی نشست۔ وہی ہیبت۔ وہی منظر اور وہی حضرت والا حسب معمول تقریر فرما رہے ہیں۔ اس وقت زیادہ تر تذکرہ حضرت مفتی صاحب کے شاگرد مولوی یعقوب صاحب کی تحریر و بل اور عرضداشتوں کا رہا۔ اس کے علاوہ بھی علوم ظاہری و باطنی کا سلسلہ جاری رہا۔ کہ رات کے گیارہ بجے گاڑی لاہور پہنچی۔ ڈاکٹر کے صاحبزادے تو موجود تھے مگر خود ڈاکٹر صاحب نادارد

دریافت پر پتہ چلا کہ وہ رفع حاجت کے لئے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہیں۔ حضرت اور ان کے رفقا گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر بینچ پر بیٹھ گئے۔ سامان جب اکٹھا ہو کر گنا جا چکا تو ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے۔ حضرت نے مزاحاً فرمایا کہ:-

"آج تک تو یہ سنا تھا کہ خوف سے رفع حاجت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن لاہور آکر معلوم ہوا کہ ازدیادِ شوق میں بھی ایسا ہو جاتا ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب ان نفوس قدسیہ کا قافلہ اپنی کوٹھی پر لے گئے۔ جہاں گھر والوں کو بھی اس بات سے بے خبر رکھا ہوا تھا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں۔

دانتوں کا معائنہ

صبح کو ڈاکٹر صاحب نے دانتوں کا معائنہ کیا۔ حضرت نے انہیں فرما دیا کہ جو دانت موجود ہیں۔ ان کو باقی رکھنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے صرف ایک دانت ایسا پایا۔ جس کا طول تو قائم تھا مگر عمق اور کسی قدر عرض گھس کر اوپر سے بہت چپٹا اور نیچے سے نوکیلا ہو گیا تھا۔ جس کا وجود غیر معین ہونے کے علاوہ ناموزوں تھا۔ اور جبکہ دانت بن جانے کے بعد اور بھی ناموزوں ہو جاتا۔ اسلئے ڈاکٹر صاحب نے حضرت کو اطلاع کئے بغیر مولانا ظفیر علی صاحب کی موجودگی میں دانت دیکھتے دیکھتے وہ ایسی صفائی سے نکال لیا کہ حضرت کو احساس تک نہ ہوا۔ سانچہ لینے کے بعد حضرت والا نے جو آئینہ دیکھا۔ تو دانت موجود نہ پایا۔ اور حیرت سے فرمایا کہ یہاں کا دانت کہاں گیا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے وہ دانت پیش کر دیا۔ حضرت نے فرمایا کہ خواہش تو میری بھی تھی کہ یہ دانت نکل جائے۔ لیکن کہنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

قیام لاہور

لاہور میں آپ نے پورا ہفتہ قیام فرمایا۔ تمام ڈاک باقاعدہ یہاں پہنچتی رہی۔ سب معمولات روزمرہ تھانہ بھون کی طرح انجام پاتے رہے۔ پہلے چھ دن تو آپ نے اپنے علاج کے لئے وقف رکھے۔ آخری دن عام ملاقات کے لئے مخصوص فرمایا۔ اس عرصہ میں آہستہ آہستہ آپ کی آمد کی خبر کانوں کان پہنچتی پہنچتی عام لوگوں تک بھی پہنچ گئی۔ آپ کی اچانک بلا اطلاع آمد پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ زیادہ تر لوگوں نے یہی خیال کیا کہ آپ کانگریس اور مسلم لیگ میں صلح کرانے آئے ہیں۔ یہیں سے حضرت مولانا خیر محمد صاحب کو بھی جالندھر حضرت کی آمد کی اطلاع مفتی صاحب نے بھیجی۔ وہ بھی اس اچانک آمد پر بڑے حیران ہوئے۔ دوسرے روز روانہ ہو کر مولانا خیر محمد صاحب ۶ مئی کو شام کی گاڑی لاہور پہنچ گئے اور کوٹھی ایسے وقت پہنچے جبکہ حضرت نماز۔ نوافل اوراد وغیرہ سے فارغ ہو کر کمرہ کے اندر تشریف لے جا رہے

تھے۔ادب سے سلام عرض کیا۔حضرت نے انتہائی شفقت سے گلے لگا لیا معانقہ و مصافحہ کے بعد ہنس کر فرمایا کہ "میں نے کہا کہ میں کیوں "مناع للخیر بنوں"۔ مولانا نے نماز پڑھنی تھی۔نماز سے فارغ ہو کر اندر آئے حضرت نے "دودھ کا کاغذ" عنایت فرمایا۔اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب و مولانا خیر محمد کی درخواستوں پر امرتسر اور جالندھر واپسی کے وقت قیام کا وعدہ فرمایا۔

زیارتِ مزارات قیام لاہور کے دوران میں آپ سب سے پہلے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر بغرضِ فاتحہ خوانی تشریف لے گئے۔آپ وہاں صبح کو ایسے وقت پہنچے۔جبکہ زائرین کی کثرت تھی۔آپ حسب معمول صاحب مزار کی پائینتی کی طرف قدرے پیچھے ہٹ کر ہاتھ چھوڑے کھڑے کھڑے ایصال ثواب میں مشغول ہو گئے۔ڈاکٹر صاحب حضرت کے پیچھے کھڑے تھے کہ حضرت کو اس حالت میں کھڑے دیکھ کر ایک قوی ہیکل مجاور نے زوردار اور ہیبت ناک آواز سے پکارا کہ ہاتھ آگے باندھو۔مگر حضرت کو آواز کی طرف مطلق التفات نہ ہوا ڈاکٹر صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔مگر اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔اور وہ بدستور تند آواز میں یہی پکارتا رہا اور ہر مرتبہ اپنی آواز کو پہلے سے بلند کرتا رہا۔لیکن حضرت بدستور اُدھر متوجہ رہے فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ حضرت داتا گنج بخش:۔

"بہت بڑی شخصیت ہیں۔عجیب رعب ہے۔وفات کے بعد بھی سلطنت کر رہے ہیں"۔

دوسرے روز صبح کے ناشتہ کے بعد آپ جہانگیر کے مقبرہ پر تشریف لے گئے۔نورجہاں کے مزار کو دیکھ کر فرمایا کہ اول یہیں چلیں۔عوام تو اس قبر پہ کم آتے ہوں گے۔وہاں سے ہو کر جہانگیر کے مزار پر تشریف لے گئے۔بعد ازاں لاہور کے دیگر تاریخی مقامات شاہی مسجد، قلعہ، شالامار باغ، خانقاہ میاں میر وغیرہ کو دیکھا۔ڈاکٹر صاحب ان کی تاریخی حیثیت، تاریخی واقعات و حالات بتاتے گئے اور حضرت ہر چیز پر محققانہ نظر دوڑاتے گئے اور اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔

امرتسر کو روانگی ۸ مئی ۱۹۳۸ء کی صبح کو نماز فجر پڑھنے کے بعد حضرت مولانا محمد حسن صاحب حضرت تھانوی اور ان کے رفقاء کو بذریعہ موٹر و لاری لے کر امرتسر روانہ ہوئے وہاں پہنچنے کی دیر تھی کہ زائرین کا ہجوم ہو گیا۔مشتاقین پروانوں کی طرح ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔اور ملفوظات سننے کی کوشش میں ہمہ تن توجہ ہو کر علیٰ رؤسہم الطیر کا منظر پیش کر رہے تھے۔نماز عصر مسجد نور میں پڑھنے جا رہے تھے کہ گاماں پہلوان کی درخواست پر چند منٹ کے لئے ان کے مکان پر تشریف لے گئے۔وہاں سے قریب ہی حضرت مولوی نور احمد صاحب کی مزار پر فاتحہ

پڑھا۔ مسجد نور میں عصر کی نماز پڑھنے کے بعد موٹر پر خواجہ محمد صادق کے مکان پر کٹڑہ جیہاں سنگھ تشریف لے گئے۔ وہاں سے ہال بازار ہوتے ہوئے مسجد خیر الدین کو دیکھتے ہوئے لاہور روانہ ہو گئے۔ اور مغرب کی نماز لاہور جا کر پڑھی۔

امرتسر سے واپسی کے بعد آپ ۱۱ مئی تک لاہور رہے۔ اس عرصہ میں حضرت نے ملاقات کی اجازت عام فرما دی تھی۔ ہر شخص بلا تکلف حاضر ہو سکتا تھا۔ پھر تو زائرین اور مشتاقین نے دل بھر کر دولتِ دیدار حاصل کی اور فیوض و برکات سے مالامال ہوئے۔

لاہور پر امرتسر کو ترجیح

لاہور میں چونکہ آپ بغرض علاج تشریف لائے تھے۔ اسلئے آپ نے اپنی آمد و قیام کو پردۂ اخفا میں رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی یہاں تک کہ نماز بھی باجماعت کوٹھی پر ہی پڑھتے رہتے۔ کیونکہ مسافر کو مسجد کی حاضری اور جماعت کی حاضری معاف بھی ہے۔ سیر اور چہل قدمی کے لئے بھی اکثر اندھیرے میں نکلتے تھے۔ کیونکہ فرماتے تھے کہ "اگر کسی نے دیکھا۔ تو شہر میں عام اطلاع ہو جائے گی۔ عوام کے ہجوم کی وجہ سے اطمینان۔ بے تکلفی اور آسانی نہ رہے گی۔ تھانہ بھون میں آرام کہاں ملتا ہے۔ یہاں تو چند روز آرام کر لوں۔ آج کل لوگوں میں تہذیب تو ہے نہیں۔ الٹے سیدھے سوالات شروع کر دیتے ہیں۔ خواہ مخواہ جھک جھک ہوتی ہے۔ اسلئے بہتر یہی ہے کہ احتیاط کی جائے۔"

جس وقت ڈاکٹر صاحب نے حضرت مفتی صاحب کے ایما پر حضرت کی خدمت میں امرتسر تشریف لے جانے کی درخواست پیش کی تو حضرت نے درخواست منظور کرتے ہوئے فرمایا کہ وہاں اخفا کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک دن کا قیام ہوگا۔ نیز ذوقاً اہل امرتسر سے انس معلوم ہوتا ہے بخلاف لاہور کے جہاں کی یہ کیفیت ہے کہ موٹر سے گزرتے وقت عام سڑک پر جو لوگ نظر آتے ہیں ان کی ہیئت اور حال بتاتا ہے کہ وہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمچو ما دیگرے نیست۔ اسلئے یہاں کے عام لوگوں سے دل نہیں ملتا۔

عرض کیا گیا کہ اہل امرتسر کی خوش قسمتی ہے کہ آنجناب نے یہاں قدم رنجہ فرمایا ہے۔ ملاقات کی عام اجازت بخشی حالانکہ لاہور میں عام اجازت نہ تھی اس پر اول تو مزاحاً فرمایا کہ لاہور لاحول اور امرتسر امرت برسر۔ اور پھر فرمایا کہ میں بھی مسئلہ مختلف فیہا بن گیا ہوں کہ امرتسر والے تو کہیں گے کہ خوش خلق ہے جو کسی کو ملاقات سے روکتا ہی نہیں۔ اور لاہور والے کہیں گے کہ بڑا ہی سخت مزاج ہے کہ ملنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ حالانکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ لاہور میں کئی دن رہنا اور کام

کرنا تھا۔ اور امرتسر میں بجز ملاقات اور مصافحے کے کوئی کام ہی نہ تھا۔

لاہور میں ایک رات کو موٹر پر تفریح کے لئے تشریف لے جارہے تھے۔ تو ہر طرف بجلی ہی بجلی کی روشنی۔ اس کی کثرت اور اس کی قطار نظر آئی۔ اس پر فرمایا کہ "اس روشنی میں ظلمات ہیں۔ کیونکہ اس کو حق تعالیٰ سے انتساب نہیں"۔ روشنی سے گذر کر جب کھلے میدان میں اندھیرا آیا تو فرمایا کہ "اس ظلمت میں نور ہے"۔ امرتسر جانے سے قبل متعدد بار فرمایا کہ "مجھے امرتسر کے لوگوں سے محبت کی بو آتی ہے اور لاہور میں تو بجز الحاد اور دہریت کے کچھ نظر نہیں آتا"۔

لاہور سے واپسی کی اہل امرتسر کو قصداً اطلاع نہ کی گئی کہ حضرت کو ہجوم سے تکلیف ہوتی تھی۔ مگر بایں ہمہ جب گاڑی لاہور سے امرتسر پہنچی۔ کافی تعداد میں لوگ استقبال و زیارت کے لئے موجود تھے بعض تو حضرت کے ڈبہ میں داخل ہو گئے۔ اور حضرت کے داہنے دست مبارک سے مصافحہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جو باہر رہے ان کے لئے حضرت نے بایاں ہاتھ باہر کر دیا۔ جسے لوگوں نے چومنا شروع کر دیا۔ اس اثنا میں حکیم عبد الخالق صاحب نے پانی پیش کیا۔ فرمایا میں کس طرح پیوں۔ دونوں ہاتھ رکے ہوئے ہیں۔ اس پر باصرار داہنا ہاتھ گاڑی کے اندر سے خالی کرایا گیا۔ حضرت پانی بھی پیتے رہے۔ اور مشتاقین سے مصافحہ بھی کرتے رہے۔ کسی کو بھی منع نہ فرمایا۔ یہ عرض اہل امرتسر کے خلوص کا نتیجہ تھا۔ جو حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ کے فیض کا اثر تھا۔ جب حکیم صاحب نے حضرت کو لکھا کہ "اہل امرتسر حضور کی عنایت عامہ سے بہت خوش ہیں"۔ تو حضرت نے فرمایا کہ "میں خود ان کی محبت سے بے حد ممنون ہوں"۔

ورود جالندھر ۱۱ مئی کو پانچ بجے شام کی گاڑی سے آپ جالندھر روانہ ہوئے حضرت مولانا خیر محمد صاحب پہلے جالندھر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے صرف خواص کو بھی حضرت کی آمد کی اطلاع کی تھی۔ عام اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ نہ اس کی اجازت حاصل کی گئی تھی لیکن جب گاڑی اسٹیشن پر پہنچی تو استقبال کرنے والوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی۔ اردگرد کے قصبات سے لوگ بیس بیس کوس پیدل سفر کر کے آئے ہوئے تھے۔ حالانکہ گاڑی رات کے ساڑھے آٹھ بجے وہاں پہنچی تھی۔ مولانا حیران تھے کہ ان کو کس نے خبر کر دی۔ مگر کوئی سراغ نہ چلا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے جالندھر کے مضافات میں کسی نے منادی کرادی ہو۔ مولانا خیر محمد صاحب نے فرمایا کہ اس کو حضرت والا کی کرامت اور مقبولیت الہٰیہ کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ورنہ جالندھر کی تاریخ میں ایسا عام استقبال اور اژدہام یاد نہیں۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب پنجاب کے مشہور پیر و مولوی

جماعت علی شاہ کی آمد پر مریدین کی طرف سے منادی کرائی گئی تھی اور ترغیب بھی دی گئی تھی۔ تب گنتی کے آدمیوں سے زیادہ پلیٹ فارم پر نظر نہیں آتے تھے۔

ٹرین سے اترنے پر حضرت کو معلوم ہوا کہ نو تعلیم یافتہ طبقہ کچھ رسمی استقبال کرنا چاہتا ہے۔ تو فرمایا کہ میں کوئی لیڈر نہیں ہوں۔ ایک طالب علم ہوں۔ میرے لئے کسی خصوصیت کی ضرورت نہیں مشتاقین نے چونکہ حضرت کو مصافحہ میں مشغول کر لیا تھا۔ اسلئے حضرت کے دونو ہاتھ رکے ہوئے تھے کہ سوٹ بوٹ ہیٹ سے آراستہ ایک نو تعلیم یافتہ حضرت کے ہاتھ میں پھول دینے لگا۔ تو حضرت نے تیز لہجہ میں فرمایا کہ صورت تو مہذبوں کی سی ہے۔ لیکن کیا یہی تہذیب ہے کہ ایک مشغول شخص کے ہاتھ کو دوسری چیز میں مشغول کر دیا جائے۔ اور پہلے سے فراغت کا انتظام نہ کیا جائے۔ جب آپ موٹر میں سوار ہوئے۔ جسے ایک دوسرے خیال و عقیدہ و عمل کے صاحب از راہ محبت چلا رہے تھے۔ تو وہی پھول حضرت کو موٹر میں نظر آئے۔ فرمایا کہ اگر میں اس نو تعلیم یافتہ صاحب کو نہ روکتا۔ تو وہ یہ ہار میرے گلے میں ڈالنے کا ارادہ کر چکا تھا۔

جب حضرت نے مدرسہ خیر المدارس کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا تو عشا کی اذان ہو چکی تھی۔ نماز سے فارغ ہونے پر حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے ہمراہ مدرسہ کی چھت پر تشریف لائے جہاں مولانا کی طرف سے عشائیہ کا انتظام تھا۔ اور سولہ سترہ صلحا مدعو تھے۔

صبح اشراق سے فارغ ہو کر باہر تشریف لائے۔ مسجد میں زائرین کا مجمع تھا۔ جس کی کثرت کی وجہ سے ہر شخص اٹھ اٹھ کر حضرت کی زیارت کرنے کی کوشش کرتا۔ اس پر عرض کیا گیا کہ اگر کرسی پر تشریف رکھنا منظور فرمائیں تو سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے زیارت سے مشرف ہو سکیں گے۔ فرمایا یہ میری عادت کے خلاف ہے۔ اور منقول بھی نہیں۔ البتہ بیان کی حالت میں تو منقول ہے۔ مجمع لحظہ بلحظہ زیادہ ہو رہا تھا۔ اسلئے دوبارہ چارپائی کی اجازت چاہی گئی۔ تو فرمایا۔ اس میں مضائقہ نہیں یہ دیہاتی وضع ہے مگر اس پر میں اکیلا نہ بیٹھوں گا۔ دو چار اور بھی ہوں گے۔ چنانچہ فوراً چارپائی لائی گئی۔ جب اس پر کچھ بچھانے لگے۔ تو اس سے منع کر دیا۔ سرہانے کی طرف خود رونق افروز ہوئے۔ اور دوسری طرف یہ فرماتے ہوئے حضرت مولانا محمد حسن صاحب اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب کو بٹھلایا کہ مجھے اکیلے بیٹھتے شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ وہیں حضرت کے مخلص خادم میاں ظہور شاہ صاحب نے (جو آج بھی خیر المدارس ملتان میں رہتے ہیں) حضرت کی خدمت میں دو پیسے اور مٹھی بھر ستو کا ہدیہ پیش کیا۔ جسے حضرت نے بطور تبرک قبول فرما لیا۔ مگر اور کسی کا ہدیہ قبول نہ کیا۔

کیونکہ سفر میں ہدیہ قبول کرنے کی آپ کی عادت نہ تھی۔ گھنٹہ بھر مجلس قائم رہی اور ملفوظات کا سلسلہ جاری رہا۔ اور پونے نو بجے صبح کی گاڑی سے تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ وہاں جس مکان میں آپ تشریف فرما ہے۔ بلا مبالغہ ایک ماہ تک اسکے در و دیوار سے انوار محسوس ہوتے رہے۔

بیماری کا شدید حملہ

سفر لاہور سے واپسی کے بعد ابھی تھانہ بھون کے قیام کو پورا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ شب درمیان ۱۱-۱۲- جون ۱۹۳۸ء کو دو بجے کے قریب آپ پیشاب کے لئے اُٹھے۔ استنجا سے فارغ ہو کر کھڑے ہونے کا قصد فرمایا کہ یکایک دماغ خالی معلوم ہوا۔ اور اس کے بعد بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو خود کو زمین پر پایا۔ اسلئے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کھڑے کھڑے گرے یا بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہوئے۔ البتہ جس حالت میں بھی گرے۔ اس بری طرح گرے کہ داہنی پسلی۔ سر اور کہنی میں چوٹیں آگئیں۔ اسلئے اغلب یہی ہے کہ کھڑے ہونے کے بعد بے ہوشی طاری ہوئی جس سے آپ زمین پر آرہے۔ ورنہ اتنی سخت چوٹیں ممکن نہ تھیں۔ جب ہوش آیا تو پھر اجابت کا تقاضا ہوا۔ لیکن نقاہت بے حد تھی۔ بمشکل تمام خود اٹھ کر بیت الخلاء تشریف لے گئے۔ مگر کسی کو اطلاع نہ کی۔ کیونکہ آپ کا معمول تھا کہ جب تک خود کوئی کام کر سکیں یا انتہائی مجبوری نہ ہو۔ اس وقت تک کسی کو مطلع نہ فرماتے۔ تاکہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔

بیت الخلاء سے تو بفضلہ تعالےٰ بخیریت نکلے۔ یہاں تک کہ اندر چکر تک بھی نہ آیا۔ مگر باہر قدم رکھتے ہی اس قدر ضعف محسوس ہوا کہ ایک قدم اٹھانا بھی مشکل ہو گیا۔ مجبوراً زمین پر وہیں بیٹھ گئے مگر بیٹھا بھی نہ گیا۔ اسلئے وہیں زمین پر لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد ہمت کر کے نماز کے چبوترے پر جو قریب ہی تھا۔ جا کر لیٹ گئے۔ اب ہوش تو تھا۔ لیکن طاقت نہ تھی۔ اسی حالت میں خود اپنی نبضیں دیکھیں۔ ہرقلوں کا پتہ نہ چلتا تھا۔ بدن تمام سرد تھا۔ اور پسینے پر پسینہ آرہا تھا۔ جب اس حالت میں قدرے افاقہ ہوا۔ تو بمشکل تمام پلنگ پر پہنچے۔ اب تک تو دوسروں کو تکلیف نہ پہنچانے کے خیال سے ہمت خداداد سے کام لیتے رہے۔ مگر زمین پر گرنے اور لیٹنے سے جو مٹی وغیرہ لگ گئی تھی۔ اس سے طبیعت بے حد منغض تھی۔ اس لئے مجبوراً چھوٹی بیگم صاحبہ کو آواز دے کر جگایا۔ تاکہ پانی کا انتظام ہو جائے۔ تو غسل کیا جائے۔ حالانکہ اس وقت غسل کرنا اتنا ضروری نہ تھا کہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا مگر ایک لمحہ کے لئے بدن کو ناپاک رکھنا گوارا نہ کیا۔ اور اس ضعف کی حالت میں لیٹ کر غسل فرمایا۔

اس نازک حالت۔ شدید ضعف اور دورے کے وقت بھی اصول و انتظام کا برابر خیال رہا یہاں تک کہ استنجے سے فارغ ہونے کے بعد انتہائی نقاہت کے باوجود لوٹا جہاں سے اٹھایا تھا۔

وہیں رکھا۔ پانی جس گھڑے سے لیا تھا۔ اس کو دیکھ لیا کہ ڈھکا ہوا ہے یا نہیں۔ یہ نہیں کیا کہ جہاں استنجا کیا تھا لوٹا وہیں چھوڑ کر تشریف لے آتے۔ یا گھڑا کھلا ہوا رہتا۔ بلکہ بیگم صاحبہ نے پریشان ہو کر عزیزوں کو اس واقعہ کی اطلاع کرنی چاہی۔ مگر حضرت نے محض اس خیال سے کہ ابھی رات کا کچھ حصہ باقی ہے۔ تکلیف ہوگی۔ کسی کو خبر نہ کرنے دی۔ پھر بھی چند اعزہ کو خبر لگ گئی اور مولانا ظفر احمد صاحب مولانا شبیر علی صاحب وغیرہ صبح کی نماز سے پہلے پہنچ گئے۔

صبح ہونے پر حکیم بلایا گیا پھر ڈاکٹر کو بلا کر تشخیص کرائی گئی۔ آپ انگریزی ادویات کے مشتبہ ہونے کی وجہ سے ان کا استعمال نہ فرماتے تھے۔ ڈاکٹروں نے ہائی بلڈ پریشر (خون کا دباؤ) تشخیص کیا۔ اور سخت تاکید کے ساتھ کسی کام یا کسی قسم کی جنبش۔ یا کسی طرح کی فکر۔ رنج۔ غصہ یا شدید ضرورت کے سوا زیادہ بات کرنے کی ممانعت کردی اور غذا وغیرہ میں بہت احتیاط بتائی۔ اور تیمارداروں کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ فالج کا اندیشہ ہے۔ اس کا خطرہ قریب ہے۔ احتیاط بہت ضروری ہے۔

ڈاک کا انتظام چونکہ ڈاکٹر صاحب نے ڈاک کے کام کو دیکھ کر سختی سے منع کر دیا تھا۔ اسلئے جس روز سے دورہ پڑا تھا۔ ڈاک حضرت کو نہیں بھیجی جاتی تھی۔ بلکہ مولانا شبیر علی صاحب ڈاک کو دیکھ کر جواب میں یہ تحریر فرما دیتے تھے کہ "حضرت والا کو چند روز کے لئے ڈاکٹروں اور طبیبوں نے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اسلئے آج کل حضرت والا ڈاک بھی خود ملاحظہ نہیں فرماتے۔ آپ اس خط کو دس روز بعد ارسال فرما دیں۔ امید ہے۔ کہ حضرت اس وقت جواب عنایت فرمائیں۔ اور یوں تو بحمد اللہ حضرت والا کی طبیعت اچھی ہے"۔

دو روز تو یہ انتظام رہا۔ مگر اس سے حضرت کو سخت گرانی ہوئی۔ اور فرمایا کہ میرے تعلقات بعض لوگوں سے ایسے ہیں کہ ان کو اگر اس طرح اطلاع ملی۔ تو سخت پریشان ہوں گے اور مزاج پرسی کیلئے آجائیں گے۔ ڈاکٹر نے زیادہ ملنے جلنے سے منع کیا ہے۔ تو ان لوگوں کے آنے پر ایک ہجوم ہو جائے گا۔ اور ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل نہ ہو سکے گا۔ جس سے بجائے فائدے کے نقصان ہوگا۔ اس خیال سے جو دماغ پر آتا ہے۔ وہ خود مضر ہے۔ اسلئے یہ مناسب ہے کہ ڈاک مجھ کو دکھا دی جایا کرے اس میں جو خطوط ایسے لوگوں کے ہوں گے۔ ان کے جواب میں خود لکھوا دیا کروں گا۔ باقی خطوط کے جواب میں وہی اطلاع تحریر لکھ کر روانہ کر دی جایا کرے۔ چنانچہ ۱۴ جون سے ۲۴ جون ۳۸ء تک تو یہ معمول رہا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل تحریر چھپوائی گئی۔ سالکین کے خطوط کے جواب میں یہ بھیج دی جاتی۔ اور مقربین کے خطوط کے جواب اپنے قلم سے تحریر فرما دیتے۔

السلام علیکم۔ بوجہ ضعف مثل زیادتِ سن وغیرہ عرصہ سے مجھ میں کام کرنے کی طاقت نہ تھی۔ مگر اپنی ہمت سے کام کرتا تھا۔ آخرکار اس سے نقصان عظیم ہوا جس سے بعض سخت خطرناک حالات پیش آئے۔ اس سے میں نے خود بھی محسوس کیا۔ اور ڈاکٹروں طبیبوں نے بھی سخت تاکید کے ساتھ مشورہ دیا کہ کام کرنا بالکل چھوڑ دیا جائے۔ اسلئے میں نے ڈاک لکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ مگر طالبوں کی سہولت کے لئے ذیل میں اپنے چند مجازین کے نام لکھتا ہوں۔ جن کی طرزِ تعلیم پر مجھے اعتماد ہے۔ ان میں سے جن صاحب سے جی چاہے۔ اپنی تربیت متعلق کرلیں۔ لیکن صرف دریافت خیریت و طلب اجمالی دعا یا بعد تکمیل شرائط درخواست بیعت کے لئے دو سطریں لکھنے کی اجازت ہے والسلام

وہ نام یہ ہیں:-

۱۔ مولوی محمد عیسےٰ صاحب موضع محی الدین پور۔ ڈاکخانہ مینڈارہ ضلع الہ آباد

۲۔ مولوی حکیم محمد مصطفےٰ صاحب۔ محلہ کرم علی۔ میرٹھ شہر

۳۔ مولانا ظفر احمد صاحب (عثمانی) تھانہ بھون۔ ضلع مظفر نگر۔

۴۔ مولوی محمد حسن صاحب مسجد خیر الدین۔ امرتسر

۵۔ مولوی عبد الغنی صاحب مدرسہ روضۃ العلوم۔ پھولپور ضلع اعظم گڈھ

۶۔ مولوی خیر محمد صاحب مدرسہ خیر المدارس۔ جالندھر شہر

۷۔ مولوی وصی اللہ صاحب فتح پور تال نرجا۔ ضلع اعظم گڈھ

۸۔ حقداد خاں صاحب پنشنر۔ مولوی گنج لکھنؤ

۹۔ مولوی ولی احمد صاحب پنشنر۔ مولوی گنج لکھنؤ

۱۰۔ مولوی مسیح اللہ صاحب مدرسہ عربی جلال آباد ضلع مظفر نگر۔

۱۱۔ مولوی خدا بخش صاحب نواکھالوی۔ مدرسہ صوفیہ۔ پوسٹ بھیروا دہاٹ۔ چاٹگام

اور بھی بہت سے حضرات ہیں۔ جن کی فہرست اشرف السوانح حصہ سوم کے اخیر میں شائع ہوئی ہے۔ مگر نمونہ کے طور پر بعض ان اصحاب کے نام لکھ دیئے ہیں۔ جن سے جواب جلد مل جانے کی غالب توقع ہے۔ اگر ان کے علاوہ بوجہ مناسبت دوسرے مجازین سے رجوع کریں تو اجازت ہے فقط

(اشرف علی تھانہ بھون)

روانگی لکھنؤ بعد ازاں حکیم خلیل احمد صاحب سہارنپوری۔ حکیم محمد مصطفےٰ صاحب میرٹھی کے علاج اور ڈاکٹر عبد الصمد صاحب کانپوری کے مشورہ پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن ان کے علاج سے

جس قدر افاقہ ہوا وہ آگے نہ بڑھا۔ اور چونکہ بلڈ پریشر کا علاج ہی کوئی نہ جانتا تھا۔ اسلئے مخلصین کے مشورہ سے لکھنؤ بغرض علاج جانے کا فیصلہ فرمایا کیونکہ وہاں میڈیکل کالج۔ طبیہ کالج موجود تھے اور ڈاکٹری یونانی دونو علاج آسانی سے ہوسکتے تھے۔ چنانچہ پورے پندرہ سال بعد ۱۱ اگست ۳۸ء کو تھانہ بھون سے بارادہ لکھنؤ حضرت مع اہلخانہ و مولوی شبیر علی صاحب مولوی جمیل احمد صاحب مع اپنی اہلیہ و صاحبزادیوں کے سہارنپور روانہ ہوئے۔ ان کے علاوہ پیرجی ظفر احمد صاحب ڈپٹی علی سجاد صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی مع اپنے اہل و عیال کے بھی رفیق سفر تھے۔ ایک روز سہارنپور ٹھیرنے کے بعد ۱۱ اگست کو بذریعہ طوفان ایکسپریس لکھنؤ پہنچے

قیام لکھنؤ نوید گنج میں مولوی محمد حسن صاحب مالک انوار بک ڈپو لکھنؤ کے مکان پر قیام فرمایا۔ جہاں پہلے سے انتظام ہوچکا تھا۔ وہاں ڈاکٹر عبدالحمید صاحب پروفیسر میڈیکل کالج لکھنؤ کے مشورہ سے شفاء الملک حکیم عبدالمجید صاحب نے حضرت کا علاج شروع کیا۔ اور حضرت کے مزاج کے موافق دوائی کو نفاست سے تیار کرنے کا اہتمام حکیم سمیع اللہ خاں کے سپرد رہا۔ جو اس نفاست سے دوائی تیار کرتے کہ اس کو دیکھتے ہی طبیعت میں اس کے استعمال کرنے کی رغبت پیدا ہونے لگتی اور حضرت اکثر فرمایا کرتے کہ اس نفاست کو دیکھ کر بغیر ضرورت بھی دوا کے استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے۔

قیام لکھنؤ کے دوران میں بھی مشتاقانِ دید کا ہجوم ہونے لگا۔ تو حضرت نے معالجوں کے مشورہ کے مطابق اپنی قیامگاہ کے باہر ایک ضروری اعلان بدیں مضمون چسپاں کرادیا کہ جن صاحبوں کے ساتھ پہلے سے تعلقات کے خصوصیات ہیں۔ ان سے ملاقات اور بات چیت کرلوں گا۔ بقیہ حضرات سے عذر کردوں گا۔ اسلئے عام ملاقات بند کردی ہے۔ اسلئے دروازے پر کھڑے رہ کر میری مجلس پریشان نہ کریں کہ اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور یہ امر محبت کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ مخصوصین قیامگاہ کے باہر صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک اور پھر پانچ بجے سہ پہر سے گھنٹہ بھر دائیں جمع رہتے۔ اور حضرت جس کو چاہتے اندر بلالیتے اور باقی حضرت کی مرضی کو مقدم سمجھ کر خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ مولانا عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"انتظامات حضرت کے اس علالت کے زمانہ میں بھی قابل دید تھے نشست کے اوقات مقرر ہر آنے والے کے لئے حصول اجازت کی ضرورت۔ چھوٹی بڑی ہر شے میں ایک قاعدہ اور انتظام۔ مرض کے باوجود افادات مجلسی کی گرم بازاری اسی طرح تھی۔ صبح کی مجلس کہنا چاہیئے

کہ خواص تک محدود تھی۔ سہ پہر کی مجلس گویا عام تھی۔ کلمات حکمت و معرفت کی بارش تھانہ بھون ہی کی طرح ہوتی رہتی۔"
(حکیم الامت صہ ۵۲۲ و صہ ۵۲۵)

یہاں کے علاج سے جب افاقہ ہونا شروع ہوا۔ تو آپ معمولاً عصر کی نماز کے وقت مسجد خواص میں تشریف لے جاتے۔ بعد نماز عصر مغرب تک وہیں اجلاس فرماتے وہیں ڈاک دیکھتے وہیں دوائی پیتے اور ملفوظات سے حاضرین کو محو و بیخود بنائے رکھتے۔ مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ قریباً روزانہ شریک مجلس ہوتے اور اگر کسی روز کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکتے تو انہیں از حد صدمہ ہوتا۔

اس عرصہ میں عیادت کے لئے دور دراز ... سے بڑے بڑے علماء۔ رؤساء۔ امراء۔ وکلا آتے رہے۔ جن میں سے مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ مولانا جمال میاں خلف مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ نواب حافظ سر احمد سعید خاں صاحب چھتاری نواب حمید علی خاں صاحب باغپت اور نواب محمد اسماعیل خاں صاحب بیرسٹر میرٹھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

طبیعت سنبھلنے پر آپ نے مخصوصین کی دعوتیں بھی قبول فرمائیں۔ دوسروں کے ہاں تو دعوت پر ہی تشریف لے جاتے رہے مگر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ کے ہاں ان کی درخواست کے بغیر خود اپنی محبت و عنایت سے لکھنؤ سے روانگی سے دو روز قبل تشریف لے گئے اس عرصہ میں کانپور بھی تشریف لے گئے۔

شفاء الملک حکیم عبدالمجید کے مشورہ سے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور اہل لکھنؤ نے یہ شعر زبانِ حال کہتے ہوئے حضرت کو رخصت کیا کہ ؎

ہر کہ در محفل تو آمد خنداں آمد ہر کہ از بزم تو برخاستہ گریاں برخواست

حکیم شفاء الملک حکیم عبدالمجید صاحب کی مخلصانہ مساعی سے بفضلہ تعالےٰ صحت یاب ہو کر خنداں و فرحاں تھانہ بھون پہنچے۔

مقبولیتِ عامہ

اس کے بعد علاج کے سلسلہ میں آپ کو ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۲ء میں بھی لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر بار اہل لکھنؤ نے حضرت کا نہایت جوش و خروش اور اخلاص و محبت سے خیر مقدم کیا۔ اور آپ کی آرام و آسائش میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ آپکی اس غیر معمولی مقبولیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں:-

"حضرت کا آنا کسی "لیڈر" کا آنا نہ تھا۔ نہ پوسٹر چھپے۔ نہ اشتہارات تقسیم ہوئے نہ ڈگڈگی پٹی نہ رضا کاروں نے نعرے لگائے۔ نہ مقامی اخبارات میں آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس کے باوجود خلقت کا ایک میلہ صبح اور سہ پہر دونوں وقت لگا رہتا تھا! کوئی ملفوظات مبارک سے استفادہ کو آتا۔ کوئی مصافحہ اور دست بوسی پر ٹوٹا پڑتا۔ اور کسی کو محض شوق زیارت کھینچ کر لاتا۔ اولیاء اللہی میں جو ایک خاص قسم کی کشش، محبوبیت و مرجعیت ہوتی ہے اس کا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور بار بار دیکھ لیا ۳۸ھ میں بھی۔ ۳۹ھ اور اب ۴۱ھ میں بھی۔ جب حضرت بہت زیادہ معذور ہو چکے تھے۔ قد کمان بن چکا تھا۔ اور گردن پر اثر ضعف و پیرانہ سالی کا بہت زیادہ تھا۔"

(حکیم الامت ص ۵۰)

معمولاتِ سفر

سفر کی تیاری

حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے:۔

"میری عادت ہے کہ جو کام کرنا ہے۔ جلد اس سے قلب کو فارغ کر لیتا ہوں"۔

چنانچہ اس اصول کی بنا پر آپ روانگی سے قبل تمام گردوپیش کے حالات کا جائزہ لیتے۔ سفر کی غرض۔ مقدار اور مدت کا تعین فرمانے کے بعد ان تمام ضروری کاموں کو شب و روز مشغول رہ کر پہلے سے نپٹا لیتے۔ جن کا سفر کی وجہ سے ہرج ہونا لازمی ہوتا۔ تاکہ عین عجلت میں کوئی کام بقایا رہ نہ جائے۔ سواری کا انتظام روانگی سے بہت پہلے فرماتے۔ اگر سواری میں توقف ہوتا۔ تو مصلحتاً پیدل چل پڑتے۔

سفر کا سامان....

روانگی سے ایک روز قبل ضروری سامانِ سفر درست فرما لیتے تاکہ عین وقت پر وقت نہ ہو۔ یا کوئی چیز بھول نہ جائے۔ عام طور پر سردی کا سامانِ سفر یہ ہوتا۔

ایک بنڈل بستر جس میں بچھونا مع اوپر کی چادر کے۔ اور موٹی چھینٹ کا لحاف۔ ایک کنٹوپ دوہر بغیر روئی کے جس میں بند لگے ہوئے۔ جو رات کو سوتے وقت اور صبح کو تا فراغ از ضروریات، وضو وغیرہ اوڑھے رہتے۔ بعد ازاں عمامہ باندھ لیتے۔ بستر میں ایک تھیلی سنگین کپڑے کی ہوتی جس میں ایک زائد جوڑا جوتا ہوتا جو ہوا خوری کے وقت استعمال فرماتے۔ دوسرا جوتا زیر استعمال عام رہتا۔ بستر کے اوپر بستر پوش ہوتا۔ جسے چمڑے کے بستر بند میں باندھ دیا جاتا۔ چمڑے کا ایک بیگ ساتھ ہوتا۔ جس پر

لفظ محمد اشرف علی کندہ ہوتا۔ اس کی وجہ سے آپ کو بیگ کا بھی ادب کرنا پڑتا۔ اور حتی الامکان اسے نیچے یا جگہ بے جگہ نہ رکھنے دیتے۔ بیگ میں دو تین جوڑے کپڑے۔ مناجات مقبول اور چند دیگر کاغذات ہوتے اور ایک دستہ والی ٹوکری ساتھ ہوتی جس میں متفرق اشیا مثلاً مسواک۔ گھڑی دوا بشرط ضرورت۔ لوٹا۔ سرمہ دانی۔ خطوط کی تھیلی۔ دو کٹورے ایک پانی پینے کے لئے دوسرا دوائی پینے کے لئے اور بشرط ضرورت کھانا بھی ہوتا۔ گھڑی جیب میں رکھنے کی عادت نہ تھی اسلئے اسے پاؤں والی گلٹ کی ڈبیہ میں بند کر کے ٹوکری میں رکھتے اور رات کو سرہانے رکھ لیتے۔ اگر کھانا ساتھ لے جانے کی ضرورت ہوتی تو آٹے کی پوڑیاں۔ کچھ چپاتیاں۔ اور آلو قیمہ ساتھ لے لیتے سفر کی یہ حضرت کی مرغوب غذا تھی۔

سامان کا انتظام سامان کا بڑا انتظام رکھتے۔ اسٹیشن پر اترتے ہی سب سے پہلے سامان گنواتے اور جب تک ایک معین شخص کے سپرد نہ کر دیتے بے فکر نہ ہوتے۔ یہ نہ ہوتا کہ کوئی چیز کسی نے اٹھالی۔ کوئی چیز کسی نے لے لی۔ صرف ایک یا دو افراد کو اس سامان کا ذمہ دار قرار دے کر پھر مصافحہ وغیرہ کرتے۔ جائے قیام پر پہنچنے کے بعد بھی سب سے پہلے اسباب کا جائزہ لیتے۔ اور اس کو ٹھکانے لگوا کر بیت الخلا کا معلوم کرتے۔ تاکہ عین وقت پر بالخصوص رات کو دقت نہ ہو۔

بار برداری کی اجرت سامان اٹھوانے سے قبل قلیوں سے اجرت طے فرما لیتے۔ پھر سامان اٹھواتے۔ کیونکہ آپ ریلوے کی مقررہ کردہ اجرت پر سامان اٹھوانا جائز نہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ فرمایا کرتے تھے کہ دستور کوئی چیز نہیں ہے۔ مزدور کا خوش کرنا ضروری چیز ہے

محصول کی ادائیگی آپ بلا ادائے محصول کوئی چیز نہ لے جاتے۔ اگر ذرا بھی کسی چیز میں شبہ ہوتا کہ یہ مقررہ وزن سے زائد ہوگی تو آپ اسے فوراً وزن کراتے اور اس کا محصول ادا کرتے۔ اس کا اتنا اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ سہارنپور سے کانپور جاتے ہوئے کچھ گنے ساتھ تھے جب ادائیگی محصول کے لئے تلوانے لگے۔ تو کوئی تولے نہیں۔ یہاں تک کہ غیر مسلم بلا زمین ریلوے لے کہیں کہ حضرت آپ یونہی لے جائیے۔ تلوانے کی ضرورت نہیں۔ ہم گارڈ کو کہہ دیں گے۔ فرمایا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔ کہا گیا غازی آباد تک فرمایا۔ غازی آباد سے آگے کیا ہوگا۔ کہا گیا کہ یہ دوسرے گارڈ سے کہہ دیگا۔ اور وہ کانپور تک پہنچا دے گا۔ جہاں آپ کا سفر ختم ہو جائے گا۔ فرمانے لگے نہیں — وہاں ختم نہ ہوگا۔ بلکہ آگے ایک اور سفر آخرت بھی ہے۔ وہاں کا انتظام کیا ہوگا؟ یہ سن کر سب انگشت بدنداں رہ گئے۔ جن میں تعلیم یافتہ ہندو بابو بھی تھے۔ کہنے لگے کہ اس زمانہ میں بھی خدا کے ایسے ایماندار

بنا رہے موجود ہیں جو خدا سے ڈر کر احتیاط کرتے ہیں۔

کرایہ کی ادائیگی اس میں بھی آپ بڑے محتاط تھے۔ بلاٹکٹ اور بلا ادائے کرایہ سفر کرنے کے قطعاً عادی نہ تھے۔ نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے دیتے۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم حضرت کی زیارت کے لئے تھانہ بھون آیا۔ آپ اس وقت سفر پہ جا رہے تھے۔ اس لئے وہ تنگی وقت کی وجہ سے گارڈ کو کہہ کر بلاٹکٹ حضرت کے ساتھ سوار ہو گیا۔ اور دوسرے اسٹیشن نازنہ پہ گارڈ کو کرایہ دینے لگا۔ تو اس نے کہا معمولی کرایہ ہے۔ تم غریب آدمی ہو جاؤ۔ اس نے آکر حضرت سے کہا کہ یہ معاملہ ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ گارڈ ریلوے کمپنی کا ملازم ہے۔ ریل کا مالک نہیں ہے۔ اسلئے یہاں تک کا کرایہ برابر تمہارے ذمہ ہے۔ اتنے داموں کا ٹکٹ لے کر اسے پھاڑ دو تاکہ کمپنی کا حق ادا ہو جائے اور تم حق العباد سے بری ہو جاؤ۔ اس ڈبہ میں ایک انگریزی خواں رید مبلغ بھی بیٹھا تھا۔ اس نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا کہ میں تو خوش ہوا تھا کہ اس نے غریب پروری کھایا ہے مگر آپ کی تقریر سن کر محسوس کرتا ہوں کہ میری خوشی بے ایمانی کی تھی۔

ریلوے والوں کا اعتماد اسی وجہ سے حضرت اور حضرت کے متبعین کے متعلق ریلوے والوں کا اعتماد اتنا بڑھ گیا تھا کہ جب کوئی تقرصورت تھانہ بھون کی طرف جاتا ہوا دیکھتے۔ تو نہ اس کا ٹکٹ چیک کرتے اور نہ ہی اسے اسباب تلوانے پر مجبور کرتے یا روکتے ٹوکتے۔ بلکہ بڑے جزم سے کہتے کہ یہ تھانہ بھون مولانا کے پاس جا رہے ہیں وہاں جانے والے نہ بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہیں اور نہ سامان تلوائے بغیر سوار ہوتے ہیں۔

رفیق سفر ہمراہ رکھنا حضرت تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ:-
"میری عادت ہے کہ جب میں سفر کرتا ہوں تو اپنے ساتھ صرف ایک آدمی کو لیتا ہوں اور داعی کو پہلے سے اطلاع کر دیتا ہوں۔ تاکہ وہ آزاد رہے۔ داعی پر صرف میرا اور اس آدمی کا بار ہوتا ہے۔ پھر بعض دفعہ راستہ میں اگر بعض لوگ محبت کی وجہ سے ساتھ ہو لیتے ہیں تو میں ان سے صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ اپنا انتظام

میزبان پر بار نہ ڈالنا خود کریں۔ جہاں میرا قیام ہوگا وہاں آپ قیام بھی نہ کریں بلکہ سرائے وغیرہ میں جہاں آسانی ہو۔ وہاں ٹھہریں اور بازار سے اپنے کھانے کا انتظام کریں اور ملاقات کے لئے صبح و شام میرے پاس آجایا کریں جس سے میزبان کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ پھر اگر وہ از خود آپ کی دعوت کرے

تو آپ اپنے تعلقات کو دیکھ کر دعوت منظور کریں یا رد کریں۔ میرے طفیل بن کر کھانا نہ کھاتا اگر کسی وقت میزبان مجھ سے کہنے لگتا کہ میں آپ کے ان ہمراہیوں کی بھی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ تو میں صاف کہہ دیتا کہ میرے ساتھ کوئی نہیں۔ میں نے کسی کو نہیں بلایا اگر

کسی کا احسان نہ اٹھانا

آپ کو دعوت کرنا ہو۔ تو خود ان سے کہئے اور محض اپنے تعلقات پر جو چاہے کیجئے۔ میرے اوپر اس کا احسان نہ ہوگا۔ میں ان سے کہنا نہیں چاہتا۔ میری عام عادت یہی ہے۔ ہاں اگر کوئی بہت ہی مخلص ہوتا۔ تو وہاں میں اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتا۔ (ایوامرالقیامی صـ۲۶)

اسی طرح فرمایا کہ:۔

تھانہ بھون کے اسٹیشن والوں نے اور گارڈ وغیرہ نے (جاریا اسٹیشن بننے سے قبل) بہت دفعہ کہا کہ ہم تم کو قصبہ کے پاس اتار دیا کریں۔ مگر میں نے ٹال دیا اس کی تین وجوہات ہیں (۱) احسان سے بچنا (۲) امتیاز سے بچنا کہ لوگوں کی نظریں اٹھیں گی کہ یہ کون ہے جس کیلئے ریل بے موقع روکی گئی (۳) اور اتنی مسافت کے کرایہ کا حساب نہ ہوسکنا (خیرالصبور صـ۷)

معین سفر پہلے منگانا

ایک بار حضرت کسی جگہ بلائے گئے۔ حسب وعدہ آپ اس اسٹیشن پر جا اترے۔ اتفاق سے اسٹیشن پر ان کی طرف سے کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ جو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے رہبری کرتا۔ اسلئے آپ دوسری گاڑی سے اسٹیشن پر سے ہی واپس آگئے اور اس کے لئے آپ نے دستور بنا لیا۔ کہ:۔

"بلانے والے کے ذمہ ہے کہ وہ اپنا آدمی معیت کے لئے بھیج دیں۔ جو برابر ساتھ رہے تاکہ کسی مقام پر کوئی دقت نہ ہو۔ مگر وہ آدمی ایسا معزز نہ ہو جس سے بوقت ضرورت کوئی کام لینے میں حجاب معلوم ہو۔ مخدوم نہ ہو بلکہ خادم ہو۔ یا کوئی بے تکلف دوست ہو"۔ اس معمول کے اختیار کرنے سے آپ کو سفر میں بڑا آرام رہتا"۔

لباس سفر کی سادگی

حضرت تھانوی سفر میں کوئی خاص لباس پہننے کے عادی نہ تھے۔ نہ عبا۔ نہ قبا۔ نہ عمامہ۔ صرف کرتا۔ پاجامہ اور ٹوپی جو حضر میں استعمال کرتے وہی سفر میں بھی ساتھ لے جاتے۔ ایک بار حضرت معمولی زیر استعمال لباس میں ہی سفر پر جانے لگے تو ڈپٹی پیرانی صاحب نے مشورہ دیا کہ نیا جوڑا پہن لیا جائے۔ حضرت والا نے فرمایا کیوں۔ کیا کسی کو دکھانا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میرا یہ مطلب نہیں۔ بلکہ مصلحت یہی ہے کہ آپ ہمیشہ

ایسے لباس میں سفر کیا کریں کہ معتقدین آپ کو دیکھ کر مطمئن ہو جایا کریں کہ ماشاءاللہ فراخی ہے تنگدستی نہیں۔ اگر شکستہ حال دیکھیں گے تو یہی سمجھیں گے کہ آجکل ناداری ہے۔ لہٰذا خواہ مخواہ ہدایا دینے کا خیال پیدا ہوگا۔ حضرت نے فرمایا۔ واقعی نیت تو بہت اچھی ہے لیکن اس نیک مشورہ کے باوجود ہمیشہ مذاقِ فطری غالب رہا۔ اور سفر میں حضر کا ہی سادہ لباس استعمال کرتے رہے۔

سادگی کا نتیجہ چونکہ آپ لیڈرانِ عظام اور مولویانِ کرام کی طرح شان و شوکت سے سفر کرنے کے عادی نہ تھے۔ بلکہ ایک عام مسافر کی طرح سفر فرماتے تھے۔ اس لئے راستہ میں عجیب و غریب واقعات اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ تھانہ بھون آتے ہوئے سہارنپور کے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں ایک ٹوکری سامنے لئے بیٹھے تھے جس میں کھیرے تھے۔ جو کسی نے ہدیتہ دے دئے تھے۔ کیونکہ سہارنپور کے کھیرے بہت مشہور ہوتے ہیں۔ ایک دیہاتی جو ادہر سے گذرا تو پوچھا کہ یہ کھیرے کس بھاؤ دو گے؟ حضرت نے نہایت سادگی سے فرمایا یہ بکری کے نہیں ہیں اسی طرح ایک مرتبہ آپ پانی پت سے واپس ہو رہے تھے۔ آپ کے ساتھ صرف پہنچانے والا ایک شخص تھا۔ عام مسافروں کی طرح ڈبہ میں بیٹھے تھے۔ اسی ڈبہ میں ایک پنجابی بھی سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے حضرت سے پوچھا آپ کہاں تشریف رکھتے ہیں۔ فرمایا تھانہ بھون یہ سنتے ہی انہوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا آپ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کو بھی جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا ہی نام اشرف علی ہے۔ وہ حیران ہو کر حضرت کو اوپر نیچے سے دیکھنے لگا۔ کیونکہ اس نے حضرت کی شہرت سن کر اور تصانیف عالیہ دیکھ کر آپ کے متعلق کچھ عجیب ہی تصور جبہ و دستار اور عبا و قبا حشم و خدم کا باندھا ہوا تھا۔ اسے یقین نہ آیا اور مکرر پوچھا کہ کیا آپ ہی مولانا اشرف علی صاحب ہیں حضرت نے فرمایا کیا اس کا کوئی خاص حلیہ ہے۔ جس کو آپ مجھ پر منطبق نہیں پاتے اس پر گو وہ خاموش ہو گئے۔ مگر تسلی نہ ہوئی اور تردد باقی رہا۔ جسے رفع کرنے کے لئے انہوں نے آپ سے امتحاناً ایک علمی سوال کیا جس کا معقول۔ مدلل مفصل جواب پا کر انہیں یقین آیا۔ پھر بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ اسٹیشن پر اتر کر حضرت کا سامان اتارا اور مصافحہ کر کے بہت ہی مسرور و محظوظ ہوئے۔

نماز سفر کی باقاعدگی سفر میں ہمیشہ نماز پابندی وقت کے ساتھ ادا فرماتے اور اس میں بفضلہ تعالیٰ کبھی دقت واقع نہ ہوئی بلکہ اکثر ریل کے ڈبہ کے اندر بھی بڑی بڑی لمبی لمبی جماعتوں کے ساتھ نمازیں برابر ہوتی رہتیں۔ کیونکہ مسافروں کے ہجوم کے باوجود حضرت کے ڈبہ میں اکثر و بیشتر جگہ فارغ ہی رہتی جس سے سفر بہ اطمینان کٹتا۔ سفر میں نماز قصر ضرور فرماتے۔ بسا اوقات جلدی کی وجہ

سے سنتیں چھوڑ دیتے۔ کیونکہ فرمایا کرتے کہ:۔

"سفر میں سنت کا درجہ نفل کا ہو جاتا ہے۔ ضرورت کی حالت میں بالکل حذف کر دینا بھی جائز ہے اور ضرورت کے موقع پر بھی شرعی رخصتوں پر عمل نہ کرنا اپنے اوپر بلا ضرورت تعب ڈالنا ہے جو ایک درجہ میں حق تعالیٰ کی ناشکری ہے"۔

سفر کا شغل جتنے دن سفر کے لئے تجویز فرماتے۔ اتنے دن کے لئے ڈاک منگانے کا انتظام پہلے فرما لیتے۔ ہر جگہ سے گھر برابر خطوط جاتے رہتے کہ کسی کو تشویش نہ ہو۔ نیز ان مہمانوں کو اطلاع ملتی رہے۔ جو حضرت کی عدم موجودگی میں تشریف لائے ہوں۔ اسلئے دوران سفر ریل میں زیادہ تر وقت خطوط کے جوابات دیتے اور بشرط فرصت تصنیف کے کام میں مشغول رہنے میں گزارتے کیونکہ تصنیف کا کام اکثر سفر میں بھی جاری رہتا تھا۔ جس کے لئے بسا اوقات خادم اور کاتب خصوصیت کے ساتھ ہمراہ لے لیتے تھے۔

پروگرام کی پابندی سفر کے لئے آپ جو پروگرام بناتے اس کی پوری پابندی فرماتے۔ اور اس میں کسی کی خاطر کوئی تغیر تبدل نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ کانپور سے تھانہ بھون تشریف لا رہے تھے۔ راستہ میں ایک خادم نے بڑی منت سماجت کی کہ ایک دن کے لئے خورجہ اتر پڑیں۔ فرمایا کہ میں مظفر نگر سواری کے لئے لکھ چکا ہوں۔ اگر وقت پر نہ پہنچوں گا۔ تو وہاں بیجا تشویش ہو گی۔ کیونکہ بفضلہ تعالےٰ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں حسب اطلاع وعدہ پر نہ پہنچا ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ میں تار دے دیتا ہوں۔ فرمایا نہیں۔ بدنظمی پھر بھی باقی رہے گی۔ کیونکہ گاڑی کرایہ کی آئی ہوئی ہو گی۔ نہ معلوم وہ ٹھہرے یا نہ ٹھہرے۔ پھر دوسری گاڑی مل سکے یا نہ مل سکے۔ غرض بڑا خلل واقع ہو گا۔ پھر اطلاع کے بعد بروقت نہ پہنچنے میں کچھ نہ کچھ مایوسی اور حسرت تو ضرور ہوتی ہے۔ ہاں اگر خط لکھنے سے پہلے کہتے۔ تو میں ایسا ہی پروگرام بنا لیتا۔ یہ پابندی دوسروں کی رعایت کے لئے تھی۔ اپنی ذات کے لئے نہ تھی۔

تیسرے درجہ کو ترجیح غایت سادگی کی وجہ سے آپ بڑے درجوں میں بیٹھنے کے مشتاق اور عادی نہ تھے۔ عام طور پر تیسرے درجہ کے سفر کو ترجیح دیتے اور اس کی وجہ یہ فرماتے کہ تیسرے درجہ میں جو لطف و آرام ہے۔ وہ بڑے درجوں میں نہیں۔ کیونکہ تیسرے درجہ والے تو خود ہمارا لحاظ کرتے ہیں اور بڑے درجہ والے اپنی اینٹھ مروڑ ہی میں رہتے ہیں اسلئے ان کا ہمیں لحاظ کرنا پڑتا ہے کہ بے تکلف ہنس بول بھی نہیں سکتے۔ جب آپ رامپور قادیانیوں سے

مناظرہ کے سلسلہ میں اپنے اکابر کے ساتھ جا رہے تھے۔ تو سب کا ٹکٹ درمیانہ درجہ کا تھا۔ لیکن گاڑی میں ایک ڈبہ جو خالی نظر آیا۔ تو سب اسی میں بیٹھ گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ تیسرا درجہ ہے۔ تو حضرت نے فرمایا کہ مقصود تو آسائش ہے اور یہ درجہ خالی مل گیا ہے۔ ڈیوڑھے درجہ اس سے زیادہ کیا آسائش ہوگی۔ چنانچہ اسی ڈبہ میں بآرام سفر فرمایا۔

راحت کی تلاش غرضیکہ سفر میں بھی آپ راحت کے بہت متلاشی رہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں تو راحت کا عاشق ہوں۔ اور دوسروں کے واسطے بھی یہی اختیار کرتا ہوں۔ اس لئے جس درجہ میں آپ کو زیادہ راحت نظر آتی۔ اس ہی میں سفر کر لیتے۔ دنیوی تو کیا اُخروی درجوں پر بھی آپ کی نظر نہیں تھی۔ فرماتے تھے:۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ مجھے بھی درجوں کی ہوس نہیں ہوئی کہ مجھے جنت میں بڑا درجہ ملے میں اس بات پر بالکل خوش اور راضی ہوں کہ عذاب سے نجات ہو جائے۔ خواہ جنت میں جوتیوں کی جگہ مل جائے۔ اگر یہ نہ ہو۔ تو بھی بہت ہے" (الحفوظ صـ۱۹)

راحت کے غیبی سامان چونکہ آپ اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ خلق خدا کی خدمت اور بہتری کیلئے سفر کیا کرتے تھے۔ اسلئے حق تعالےٰ نے بھی حضرت کو ایسی ہمت اور قوت عطا فرمائی تھی کہ لمبے لمبے سفروں میں بھی ایسا تکان نہیں ہوا کہ جس سے ضروری کاموں میں خلل پڑے۔ اکثر دیکھا گیا کہ ساری ساری رات سفر کیا۔ جس میں نیند تقریباً آتی ہی نہیں۔ لیکن صبح کو گھنٹوں کھڑے ہو کر نہایت جوش کے ساتھ وعظ فرمایا۔ پھر جمع شدہ ڈاک کو بھی ختم کیا۔ حالانکہ رفقائے سفر کے حواس قلتِ نوم کی وجہ سے مختل ہو جاتے تھے۔ لیکن بفضلہ تعالےٰ حضرت پر اس کا کوئی معتدبہ اثر نہ ہوتا تھا۔ اور برابر وعظ ملفوظات وتحریر خطوط میں مشغول رہتے تھے اور اگر کہیں خفیف سا خلجان بھی پیدا ہوتا۔ تو قدرت کی طرف سے فوراً غیبی سامان ہو جاتا۔ جیسے جب حضرت چھوٹی پیرانی صاحبہ کو واپسی حج پر بمبئی سے لا رہے تھے۔ تو حضرت کی اہلیہ جو اس وقت بچی تھیں شدت تشنگی کی وجہ سے بیتاب ہونے لگی۔ اسٹیشن بہت دور تھا۔ سخت پریشانی ہوئی۔ کہ اب کیا تدبیر کی جائے کہ یکایک ریل راستہ میں ایسی جگہ رک گئی۔ جہاں نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ وہاں سے بالٹی میں پانی کھینچ کر بچی کو پلایا گیا۔ اور تمام رفقاء سفر اس انعامِ الٰہی پر حیران رہ گئے۔

مصافحہ کی سہولت حضرت جہاں بھی تشریف لے جاتے مشتاقانِ زیارت کا ہر جگہ ایک انبوہِ عظیم جمع ہو جاتا۔ یہاں تک کہ حضرت کے استقبال اور رخصت کے وقت

اسٹیشنوں پر اتنا ہجوم ہو جاتا کہ مسافروں کو چلنا دشوار ہو جاتا۔ پھر ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ مصافحہ تو ضرور کر لیں۔ ان کی سہولت کے لئے حضرت دونوں ہاتھ جدا جدا دو نو طرف بڑھا دیتے تھے۔ اور لوگ مصافحہ کرتے رہتے یا چومتے رہتے۔ اور حضرت سب پر نظر توجہ دوڑاتے رہتے۔ جب تک گاڑی تیز نہ ہو جاتی۔ یہ سلسلہ جاری رہتا۔

سفر میں ہدیہ نہ لینا

سفر میں آپ کسی سے ہدیہ قبول نہیں فرماتے تھے اور اپنے اس معمول کو غیر معمولی حالات میں بھی نہ توڑتے تھے اور مناسب موقعہ حسن تدبیر سے انکار فرما دیتے یا واپس فرما دیتے۔ جیسے دوسرا بھی برا محسوس نہ کرتا۔ بلکہ آپ کی شانِ استغنا کا گرویدہ ہو جاتا نواب ڈھاکہ سے یہ پہلی دفعہ ہی طے ہو گیا تھا کہ کسی قسم کا ہدیہ نقد یا غیر نقد نہ دیا جائیگا۔ اور نواب صاحب خدمت کرنے کے لئے کسی نہ کسی بہانہ کے متلاشی رہتے تھے۔ جس روز حضرت نے ان کی بچی کو بسم اللہ پڑھائی تھی۔ نواب صاحب نے بذریعہ رقعہ التجا کی کہ ہمارے خاندان میں قدیم سے یہ رسم چلی آتی ہے کہ بسم اللہ پڑھانے والے کی کچھ نقد سے خدمت کی جاتی ہے۔ ایسا نہ کیا جائیگا۔ تو میری سخت سبکی ہوگی۔ امید ہے کہ آپ میری سبکی کو گوارا نہ کرتے ہوئے کچھ ہدیہ پیش کرنے کی ضرور اجازت مرحمت فرما دیں گے۔ حضرت نے جواب دیا کہ:۔

"سبکی سے بچنے کی تو ایک بہت سہل صورت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ مجمع میں تو میں آپ سے لے لوں اور خلوت میں آپ کو واپس کر دوں۔ اس طرح آپ کی وضع بھی قائم رہے گی اور میری مصلحت بھی محفوظ رہے گی۔ اور میں یہ آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس واپسی کی عمر بھر کسی کو اطلاع نہ کروں گا۔"

اس کو نواب صاحب نے گوارا نہ کیا اور عرض کیا کہ:۔

"حضرت میں اپنی وضع کو آپ کی مصلحت پر قربان کرتا ہوں۔"

سفر سے عبرت پکڑنا

سفر سے آپ خود بھی عبرت پکڑتے تھے اور اس کی مثال دے کر دوسروں کو بدیں عبرت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"مجھے سفر کے وقت اکثر یہ خیال آیا کرتا ہے کہ اے نفس! ضرورت کی چیزیں تو بس اتنی ہی ہیں جتنی اس وقت سفر میں ساتھ ہیں۔ کہ دو چار کپڑوں کے جوڑے ہیں۔ بستر اور لوٹا ساتھ میں ہے۔ اب مجھے سفر کئے ہوئے دو ماہ ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کی کچھ بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو گھر میں بھری ہوتی ہیں۔ بلکہ سفر میں بھی بعض چیزیں جب غیر ضروری معلوم ہوئیں

تو گھر بھیج دی گئیں لیکن میں کیا کروں۔ میں تو بہت بچنا چاہتا ہوں کہ زیادہ بکھیڑا جمع نہ ہو
مگر حق تعالے میرے پاس بہت کچھ بھیجتے ہیں۔ میرے دوست احباب کے دلوں میں
ڈال دیتے ہیں۔ وہ بھی بہت سی چیزیں بھیج دیتے ہیں۔ جن کو واپس کرتا ہوں تو ان کا دل
بُرا ہوتا ہے۔ اور واپس نہ کروں تو خود بوجھ محسوس کرتا ہوں۔ اسلئے میں اپنی مملوکہ چیزوں
کا جائزہ لیتا رہتا ہوں۔ اور غیر ضروری اسباب کو نکالتا رہتا ہوں (الاشرف ع ۱۳)

بیعت و استفاضہ

تمہیداتِ نعمت گزشتہ صفحات میں یہ امر واضح کیا جا چکا ہے کہ مایوس الاولاد والدین کے گھر
بفضلہ تعالے حضرت تھانوی ایک برگزیدہ بزرگ کی دعا سے ہی تشریف لائے تھے۔ ان کی بزرگی کا اثر
حضرت کے بچپن میں نمایاں تھا۔ اس کی سرحد پار کر کے جب آپ نے علم کے میدان میں قدم رکھا تو آپ کو
غزالی و رازیٔ وقت اساتذہ مل گئے۔ جو صرف اپنے علوم و فنون میں ہی ماہر و یگانہ روزگار نہ تھے بلکہ
صاحبِ باطن اور شیخ کامل بھی تھے۔ اس کے ساتھ کاملین کی کشش اور بزرگوں کی توجہ بھی شاملِ حال
رہی۔ جس سے "انجذاب الی الحق اور انقطاع عن الخلق" کے آثار بڑھنے لگے۔ گویا کہ شروع سے ہی آپ
کی ظاہری و باطنی تربیت ایسے بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی۔ جو خود خدمتِ دین میں مصروف تھے۔
اور آپ کو اصلاحِ امت و تجدیدِ دین کے فرائض کی ادائیگی کے لئے تیار کر رہے تھے۔ مگر یہ سب
کچھ صرف تمہید ہی تمہید تھی۔

مربیٔ باطن جس کی تکمیل حق تعالے نے ایک ایسے بزرگ کے سپرد کر رکھی تھی۔ جو تھانہ بھون سے
ہزاروں میل دور اور کئی سمندر پار خود بیت اللہ میں بیٹھ کر فراست کی دوربین سے
حضرت تھانوی کی نقل و حرکت کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ یہ شیخ العرب والعجم۔ جامع شریعت و طریقت
مرجع العلماء والمشائخ۔ امامِ طریق۔ نمونہ سلف۔ جنیدِ زماں اور شبلی دوراں حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی
چشتی۔ صابری مہاجر مکی قدس سرہ العزیز تھے۔ حضرت تھانوی ابھی مدرسہ میں تعلیم ہی پا رہے تھے۔
کہ حضرت حاجی صاحب نے باشارۂ غیبی از خود حضرت تھانوی کے والد کو کہلا بھیجا کہ جب تم حج
کو آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو بھی ہمراہ لیتے آؤ۔ حالانکہ حضرت حاجی صاحب حضرت تھانوی کی
ولادت سے بھی بہت پہلے ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے جا چکے تھے۔ اور نہ

اس وقت تک بظاہر کوئی ایسے حالات پیدا ہوئے تھے۔ جن کی بنا پر حضرت کی شہرت مکہ معظمہ تک جا پہنچتی۔

شوقِ بیعت

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ آخر جو آپ مکہ معظمہ سے نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس کا اثر بھی تو کچھ ہونا تھا۔ سو وہ اس طرح ہویدا ہوا کہ حضرت حاجی صاحب کے خلیفہ اعظم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کسی سلسلہ میں مدرسہ دیوبند تشریف لائے۔ کچھ تو انکی شہرت آپ نے پہلے سن رکھی تھی۔ اور کچھ ان کے شیشہ دل نے اپنے شیخ کے انوار کا عکس ان پر ڈالا۔ تو آپ انہیں دیکھتے ہی پروانہ وار مصافحہ کے لئے دوڑے۔ راستہ میں مدرسہ کے نودرہ کی تعمیر کے لئے اینٹیں پڑی تھیں۔ آپ عجلت و شدت سے مجبور ہو کر راستہ سے جانے کی بجائے انہی پر سے کودتے پھاندتے جا رہے تھے کہ ایک جگہ پاؤں پھسل گیا جس سے زمین پر گرنے لگے۔ کہ حضرت گنگوہیؒ نے بڑھ کر تھام لیا اور گرنے سے بچا لیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ؏

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

بس اس ساقیِ معرفت نے اس تشنۂ طریقت کو تھامتے ہی آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ ایسی مے معرفت پلا دی کہ حضرت تھانویؒ فرمانے لگے کہ مجھے بیعت کر لیجئے۔ حالانکہ بقول آپ کے:۔

"میں اس وقت حقیقت و غایت بیعت سمجھتا ہی نہ تھا۔ مگر مولانا نے اس بنا پر کہ زمانہ طالب علمی شغل باطن مخل تحصیل علم ہوگا۔ بیعت کرنے سے انکار فرما دیا۔ مگر اس وقت میرے سامنے میرے ایک ہم سبق کو اس کی درخواست پر بیعت فرما لیا۔"

اس سے گو حضرت تھانویؒ کے شیشۂ دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ مگر اسے کسی مصلحت پر مبنی سمجھ کر خاموش ہوگئے اور وہ مصلحت سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ مولانا گنگوہی بچشم فراست دیکھ رہے تھے کہ انہوں نے میرا پیر بھائی بننا ہے۔ اس لئے مرید کیسے بناؤں۔ ورنہ جس طرح انہوں نے گرتے ہوئے کو تھام لیا تھا۔ اس طرح سینہ سے لگانے میں بھی کیا عذر ہو سکتا تھا۔ مگر تنبیہ کے بعد ما تند دیدہ حضرت نے حاجی صاحب کی تو صرف شہرت ہی سنی تھی۔ مگر اس قطب الارشاد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لئے ۱۲۹۹ھ میں جب مولانا گنگوہی تیسری بار حج مبارک کے لئے جانے لگے تو آپ نے ایک عریضہ حاجی صاحب کے نام لکھ کر ان کے ہاتھ بدیں مضمون بھیجا کہ آپ مولانا سے مجھے بیعت کر لینے کی سفارش فرما دیں۔ گو یہ لکھوائے ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں　　آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں،

غائبانہ بیعت حضرت حاجی صاحب نے مولانا گنگوہی سے اس عزلتیہ کے بارہ میں کچھ راز دنیاز کی باتیں کرنے کے لیے حضرت تھانوی کو وہیں بیٹھے بیٹھے غائبانہ طور پر بیعت فرما لیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

سفرِ حج حضرت تھانوی فارغ التحصیل ہو کر آخر صفر ۱۳۰۱ھ میں کانپور تشریف لا چکے تھے۔ گو ۱۲۹۹ھ میں آپ کی غائبانہ بیعت ہو چکی تھی۔ مگر مسندِ درس پر بیٹھنے سے قبل چونکہ کچھ مزید باطنی تربیت کی ضرورت تھی۔ اسلئے حسب خواہش حاجی صاحب شوال ہی میں آپ کے والد ماجد آپ کو ساتھ لے کر حج کو روانہ ہو پڑے۔ ابھی غازی آباد اسٹیشن تک ہی پہنچے تھے کہ وہاں آپ کے والد ماجد کے ایک ملاقاتی تحصیلدار نے بتایا کہ آج کل سمندر سخت طغیانی میں ہے۔ طوفان کی متواتر خبریں آرہی ہیں۔ اور ایسی حالت میں سفر بس اتنا ہی کہا تھا کہ آپ کے والد نے فرمایا بھائی اب تو روانہ ہو چکے ہیں۔ دعا کیجئے۔ اللہ مالک ہے۔ اور ادہر حضرت نے جوش میں آکر انہیں جواب دیا کہ سے

چہ غم دیوار امت را کہ باشد چوں تو پشتیباں
چہ باک از موج بحر آنرا کہ دارد نوح کشتیباں

سفر جاری رہا۔ اس عاشق کو جہاز بھی امامِ طریقت کی نسبت سے "سید ری" ملا۔ جس طرح حضرت کے جذبات میں طوفان و تلاطم تھا۔ ویسا ہی سمندر میں نظر آیا۔ موجوں کے تھپیڑوں کی تاب نہ لاکر یہ چھوٹا سا جہاز بار بار سطح آب پر سربسجود ہو جاتا۔ موجیں اس کے اوپر سے گزر کر مسافروں اور اسباب کو تر بتر کر دیتیں اور حجاج مصروف دعا نظر آتے جنہیں دیکھ کر جہاز کے عملے کے افراد کلمات کفریہ بکتے کہ نعوذ باللہ اللہ میاں اس وقت کیا کرلیں گے۔ مگر حضرت فرماتے تھے کہ چونکہ اللہ تعالےٰ کی راہ میں جا رہے تھے اسلئے الحمد للہ کہ باوجود اندیشۂ غرق کے قلب میں وحشت اور پریشانی مطلق نہ تھی۔ بفضلہ تعالےٰ جہاز بخیریت منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ اور ہم بعافیت دار الامان میں جا اترے۔

ادبِ مکہ معظمہ سرزمین مکہ پر قدم رکھتے ہی اس ارض پاک اور حرم محترم کے ادب وعظمت کا اس قدر غلبہ ہوا کہ وہاں تھوکنے میں بھی تامل ہونے لگا۔ اور جس وقت بیت اللہ پر پہلی نظر پڑی۔ تو ایسی کیفیتِ شوقیہ انجذابیہ پیدا ہوئی کہ حضرت فرماتے تھے کہ ایسی کیفیت میرے اوپر کبھی عمر بھر طاری نہیں ہوئی۔

اشتیاقِ مرشد حضرت تھانویؒ کی آمد سے حضرت حاجی صاحب کو دلی مسرت ہوئی جس کی وجہ سے بعد فراغ حج و زیارت مدینہ منورہ آپ نے از خود حضرت سے فرمایا کہ تم میرے پاس چھ ماہ رہ جاؤ۔ حضرت نے اس کی والد ماجد سے اجازت چاہی لیکن انہوں نے بوجہ شفقت پدری امر مفارقت کی اجازت نہ دی۔ جب حضرت نے اس امر کی اطلاع حضرت حاجی صاحب کو باظہار افسوس دی تو انہوں نے آپ کی تسلی کراتے ہوئے فرمایا کہ

"والد کی اطاعت مقدم ہے۔ اس وقت چلے جاؤ۔ پھر دیکھا جائیگا"۔

دست بدست بیعت اگرچہ حضرت حاجی صاحب نے آپ کو قبل از حج ہی بذریعہ خط از خود غائبانہ بیعت سے مشرف فرما لیا تھا۔ مگر اب اصالتاً حاضری پر دست بدست بیعت کا شرف بھی بخشا۔ جس وقت معتقدین کو حضرت حاجی صاحب بیعت فرما رہے تھے تو آپ نے حضرت کے والد ماجد سے بھی فرمایا کہ:۔

"میاں عبد الحق تم بھی مرید ہونے کو کہتے تھے۔ آؤ تم بھی آجاؤ"۔

تو انہوں نے نہایت سادگی سے فرمایا۔ نا حضرت نا۔ میں ابھی مرید ہونے کو تیار نہیں۔ میں تو بعد میں ہوں گا یہ فرما کر فوراً ایک سینی مٹھائی کی منگوائی اور ایک خوبصورت عمامہ اور پچیس روپے اوپر رکھ کر باادب پیش کر کے کہا کہ اب بیعت فرمائیے۔ حضرت حاجی صاحب نے ان کے خلوص کے پیش نظر وہ ہدیہ قبول فرما کر انہیں بھی بیعت فرما لیا۔ اور اس طرح باپ بیٹا دونوں بیعت ہو کر واپس وطن پہنچے ۱۳۰۲ھ میں واپس آنے کے بعد حضرت تھانویؒ درس و تدریس مواعظ و تبلیغ میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اور علمی شغل کا یہ سلسلہ ۱۳۰۷ھ تک جاری رہا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ذکر و شغل بھی فرماتے رہے۔

حضرت تھانوی کو شوق طریق باطن تو کم عمری سے ہی تھا اور بیعت کے بعد یعنی ۱۲۹۹ھ سے ہی ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے تھے۔ مگر وقت یہ پیش آئی کہ استفادہ باطنی اپنے شیخ سے اس وقت ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہ کئی سمندر پار ہزاروں میل دور مکہ معظمہ میں بیٹھے تھے ادھر مفارقت کی ایک گھڑی پہاڑ ہو رہی تھی۔ اس لئے حق تعالٰے نے آپ کی طلب صادق کو پورا کرنے کے لئے یہ سبب بنا دیا کہ اسی عرصہ میں آپ کے ماموں پیرجی امداد علی رحمۃ اللہ علیہ حیدرآباد سے وطن جاتے ہوئے حضرت کو ملنے کے لئے کانپور اتر پڑے۔ وہ اولیاء متہلکین میں سے تھے۔ بڑے ہی صاحب حال و قال بلکہ مغلوب الحال درویش تھے۔ طبیعت میں بڑی شوخی و بیباکی اور مزاج میں بے حد بیباکی و آزادی تھی

پابندِ صوم و صلواۃ ہونے کے علاوہ صاحبِ عرس و سماع بھی تھے۔ اور آلاتِ سماع ساتھ رکھتے تھے مقصودِ حقیقی کی طلب میں ایسے ایسے ریاضات و مجاہدات شاقہ کیئے ہوئے تھے کہ دماغ پگھل کر ناک سے بہنے لگا تھا۔ سوز و گداز کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس بیٹھتے ہی قلب میں ایک آگ سی لگ جاتی تھی اور دنیا سے نفرت اور تعلقات سے وحشت ہونے لگتی تھی۔ آپ اپنے "خال" کی وجہ سے اپنے صاحبِ قال بھانجے کے پاس نہ اُترے اور ایک سرائے میں اُتر کر آپ کو کہلا بھیجا کہ:۔

"اگر تم اپنی وضع کے خلاف نہ سمجھو۔ تو مجھ سے سرائے میں آکر مل جاؤ۔"

حالانکہ بوجہ بزرگی و رشتہ داری آپ بے تکلفی سے حضرت کے پاس آکر ٹھہر سکتے تھے۔ مگر ادب علم مانع ہوا۔ اسلیئے سیدھے حضرت کے پاس تشریف نہ لائے اور نہ حضرت کو یہ گوارا ہوا کہ انکی موجودگی میں وہ سرائے میں رہیں۔ اس لیئے آپ نے انہیں ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ تو فرمانے لگے:۔

"میاں تم عالم باعمل ہو۔ مجھے نہ لے چلو۔ دیکھنے والے کہیں گے کہ کسی بچے اور خبطی کو اپنے یہاں لے آئے ہیں"۔

گو حضرت نہ مانے اور انہیں ساتھ لے آئے۔ صرف انہیں ہی ساتھ نہ لائے .... ان کے آلاتِ سماع بھی ساتھ لائے۔ ان کی آمد۔ ان کی آتش بیانی اور اثرِ سوز و گدازِ نہانی سے وہ آگ بھڑک اُٹھی۔ جو حضرت کے سینہ میں طالب علمی کے زمانہ سے سلگ رہی تھی۔ اس لیئے حضرت تھانوی دل کی تڑپ اور شدتِ طلب سے مجبور ہو کر نیز اپنے پیرومرشد تک رسائی میں موانع دیکھ کر پیرجی کی طرف رجوع کر لیا۔

رجوع کی اطلاع

اگرچہ حضرت تھانوی کا تعلق بیعت براہ راست حضرت حاجی صاحب سے قائم ہو چکا تھا۔ لیکن ان کے خلیفۂ اعظم مولانا گنگوہی سے جو اعتقادِ قلبی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بدستور راسخ رہا۔ کچھ ان کی بزرگی کی وجہ سے کچھ ان کی توجہ کی وجہ سے کچھ حضرت حاجی صاحبؒ کی نیابت کی وجہ سے اور کچھ کرتے ہوئے کہ تھام لینے کی وجہ سے اسلیئے حضرت تھانویؒ ہمیشہ انہیں بھی بمثل اپنے مرشد کے سمجھتے تھے۔ جب کبھی کوئی مشکل ظاہری و باطنی یعنی علمی و عملی پیدا ہوتی۔ آپ بلا تکلف بطور ایک مرید کے ان کی طرف رجوع فرماتے۔ اور مولانا بھی ہمیشہ ان سے ازراہ شفقت مریدوں کا سا سلوک اور ازراہِ احترام پیر بھائیوں کا سا معاملہ فرماتے۔

چنانچہ اسی تعلقِ افاضہ و استفاضہ کی بنا پر آپ نے شورش عشق سے مجبور ہو کر اپنے ماموں پیرجی امداد علی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کرنے کی اطلاع اپنے شیخ کی بجائے ان کے خلیفہ اعظم

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو کردی۔ مگر وہ خط عوام غیر ذوی الافہام سے مخفی رکھنے کی خاطر عربی میں لکھا۔ جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"اے مولانا! خدا کی قسم میں اس زمانہ میں حیرت و جستجو کے سمندر میں غرق تھا اور ایسے شخص کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جو مجھے اس تکلیف اور پریشانی سے نجات دلائے۔ یکایک بغیر میرے قصد و ارادہ کے ایک منادی نے مجھے آواز دی کہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدے۔ میں تجھ کو اس بحر زخار سے نجات دلاؤں گا۔ چونکہ ڈوبتا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے کیونکہ وہ پریشان و متوحش ہوتا ہے اور میں تو اپنے حبیب و دستگیر اور اپنے طبیب سے اس طرح بچھڑا ہوا تھا کہ ہم میں سمندر حائل تھے۔ اسلئے میں نے اس منادی کی آواز پر لبیک کہی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیا۔ لیکن اس کے باوجود بحمد اللہ میں نے ایک دن بھی اکابر کے اس قول پر عمل کرنا نہ چھوڑا کہ خذ ما صفا ودع ما کدر جو اچھائی ہو لے لو اور برائی کو چھوڑ دو۔"

رجوع کا نتیجہ

حضرت پیرجیؒ ایسے صاحب سوز وگداز کی طرف رجوع کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہی آتش عشق اور بھی فروزاں ہو گئی۔ اب ذکر و شغل میں زیادہ مشغول رہنے لگے جس نے حضرت کا بالکل رنگ ہی بدل دیا۔ اور سارے تعلقات دنیوی کی خواہشات کو خاکستر بنا دیا۔ اور منادی ہو کر ایک عالم کو سوختہ و افروختہ کر دیا۔ حضرت نے بذریعہ عریضہ حضرت حاجی صاحب سے ترک ملازمت کا مشورہ طلب کیا۔ اگرچہ اشتیاق وصول الی اللہ بڑھ رہا تھا۔ مگر حضرت حاجی صاحب افادہ خلق اللہ کی خاطر آپ کو ترک ملازمت کی ممانعت کردی۔ اور اپنے ۲۲ محرم ۱۳۰۸ھ کے مکتوب گرامی میں لکھا:۔

نامۂ بہجت شمامۂ آں عزیز باتمیز رسید۔ از استماع حال ذوق و شوق آثار ترقی فہمیدہ۔ مسرت بر مسرت افزود۔ حق تعالےٰ برکت زیادہ کند۔ "بہ خلق اللہ فیض دینی رسانید۔ کہ ایں اقرب وصول الی اللہ است۔"

اور اس طرح آپ نے نہ صرف حضرت کو ترک تعلق دنیا سے منع فرمایا۔ بلکہ اہل اللہ کے طریق کو اہل تصوف کے طریق سے ممیز و ممتاز کرنے کے لئے اپنے طریق کی حقیقت بھی بیان فرمادی کہ ہمارے تئیں کتاب و سنت سے دوری اور غیر سنت سے گریز جائز نہیں۔ بلکہ دنیا کے اندر رہ کر خلق خدا کی خدمت دینی کرنا ہی وصول الی اللہ کا ذریعہ ہے۔

سفرِ حج ثانی

چنانچہ حضرت تھانویؒ نے اپنے شیخ کے حکم کے مطابق اپنا سلسلہ درس و تدریس جاری رکھا مگر جس شعلہ بار آتشِ عشقِ الٰہی کو حضرت پیر جیؒ اپنی توجہ اور اثر سے کچھ ٹھنڈا کر گئے تھے۔ وہ بجھائے نہ بجھی اور پھر بھڑک اُٹھی۔ جس کی وجہ سے آپ پسند آساب بے قرار رہنے لگے اور کچھ حضرت حاجی صاحب کا یہ پُر از اشتیاق فقرہ کہ "میاں اشرف علی تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ" تیر و نشتر کا کام کرنے لگا۔ ادھر آپ کے والد ماجد کی وفات سے وہ رکاوٹ بھی جاتی رہی جس کی وجہ سے آپ حضرت حاجی صاحب کے پاس سفرِ حج میں مطابق ہدایت کے لئے نہ ٹھہر سکے تھے۔ اسلئے آپ نے چھ ماہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں گزارنے کے ارادہ سے اپنے آپ کو درس و تدریس کے مشاغل سے فارغ کر دیا اور پورے دس سال بعد مکہ معظمہ کو روانہ ہو گئے۔ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچتے ہی وہ سارا اضطراب و التہاب سکون و اطمینانِ قلب میں تبدیل ہو گیا۔ اور حضرت حاجی صاحب کو آپ کے آنے کی مسرت بالکل اسی طرح ہوئی۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے ملنے سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو حاصل ہوئی تھی۔

اشتیاقِ جانبین

وہاں پہنچتے ہی حضرت تھانویؒ حضرت حاجی صاحب کی توجہات خاص کے مرکز بن گئے۔ صرف مرکز ہی نہ بنے دو جان یک قالب ہو گئے۔ شیخ مرید کے لئے مضطرب اور مرید شیخ کے لئے بے قرار۔ بس ذرا ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوئے کہ سازِ اضطراب بجنے لگتا جس سے بزبانِ حال تو من شدی من تو شدم کی آواز آنے لگتی۔ حضرت تھانوی بیٹھے بیٹھے اشتیاقِ زیارت سے مجبور ہو کر حضرت حاجی صاحب کے اوقاتِ خلوت میں ہی حاضرِ خدمت ہو جاتے اور معذرت کرنے لگتے کہ میں اس وقت خلوت میں مخل ہوا۔ اور حاجی صاحب بہ نہایت عنایت خصوصیت فرماتے کہ "خلوت از اغیار نہ از یار"۔ حضرت تھانوی جب مزارات کی زیارت کو نکل جاتے تو حاجی صاحب انتظار کی گھڑیاں گنتے رہتے لوٹ آتے ہی حضرت سے تاخیر کا سبب پوچھتے۔ آپ فرماتے کہ مقاماتِ مقدسہ و مزارات کی زیارت کرنے چلا گیا تھا۔ تو یہ فرما کر مطمئن ہو جاتے۔ کہ "جائے بزرگاں بجائے بزرگاں" غرضیکہ اس طرح افاضہ و استفاضہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حاجی صاحب کی غایت شفقت دیکھ کر لوگ متعجب ہو کر ان سے پوچھتے کہ یہ کون ہیں تو آپ فرماتے کہ یہ میرے پوتے ہیں۔ کیونکہ حاجی صاحب حضرت کے دور کے رشتہ دار بھی تھے۔ اور جس کی تحقیق خود حضرت تھانویؒ نے بھی ضروری نہ سمجھی۔ کیونکہ وہ اس روحانی رشتہ کی نسبی رشتہ کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔

آغازِ تربیت حضرت حاجی صاحبؒ کی یہ دلی خواہش تھی کہ حضرت تھانویؒ ہر لحاظ سے آپ کے مشابہ ہو جائیں۔ اسی لیے حاجی صاحب نے حضرت کی تربیت بالکل اس انداز سے شروع فرمائی۔ جس طرح باپ بچے کو بغرض تربیت ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے اور بچہ بھی ہر حالت میں باپ کی انگلی پکڑے اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس لیے حاجی صاحب نے آپ کے لیے جلوت و خلوت کا امتیاز ہی اڑا دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود حضرت کے مرتبہ کے تحفظ کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ کیونکہ بقول حضرت تھانویؒ :-

"حضرت حاجی صاحب کو اس کا بہت خیال رہتا تھا کہ میرے متوسلین کو کوئی تحقیر کی نظر سے نہ دیکھے۔ اسلیے خدام پر بہت ہی شفقت اور ان سے بہت ہی تعلق تھا۔"

مشاہدۂ سماع ایک بار سلسلۂ شاذلیہ کے ایک شیخ نے حضرت حاجی صاحب اور ان کے خدام کی دعوت کی۔ جو حاجی صاحب نے اس شرط پر منظور فرمائی کہ اس میں سماع بھی ہو۔ اس پر بعض ظاہر بین علماء نے جو حلقۂ خدام میں داخل تھے۔ شرکتِ دعوت سے عذر کر دیا۔ مگر حضرت ع

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

پر عمل فرماتے ہوئے بلا تامل ساتھ ہو لیے۔ بعض حضرت سے پوچھ بیٹھے کہ یہ کیا؟ فرمایا ع

محتسب گر مے خورد معذور دارد مست را

غرضیکہ شیخ و مرید دونوں وہاں جا پہنچے۔ قبل از طعام اس شیخ کے خدام حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے ان میں سے ایک نے کسی اسم الٰہی کا ذکر شروع کیا۔ جو سُنت کہلاتا۔ اس کے ساتھ دوسروں نے بھی آواز ملا کر ذکر کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک ایک اسم کا ذکر کر کے سب خاموش ہو جاتے۔ پھر منشد کچھ توحیدیہ عشقیہ اشعار دلکش لہجہ میں پڑھتا۔ اس کے بعد کسی دوسرے اسم کا ذکر شروع ہو جاتا غرضیکہ سماع کیا تھا۔ ایک پر لطف و پر کیف مجلسِ ذکر الٰہی تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد حضرت سے حاجی صاحب نے پوچھا کہ کچھ لطف آیا۔ عرض کیا بہت لطف آیا۔ فرمایا کہ "بس یہی سماع تھا۔ جس سے ہمارے دوستوں کو خواہ مخواہ وحشت ہوئی۔ میں نے توقف۔" یہ شرط لگائی تھی تاکہ میں آپ کو دکھلا دوں کہ سماع کی کیا حقیقت ہے۔"

تعلیمِ شکر حضرت حاجی صاحب حضرت تھانوی کو بربنائے محبت "میاں اشرف علی" سے خطاب فرمایا کرتے تھے اور قدم قدم پر تعلیم دیتے رہتے تھے۔ ایک بار ٹھنڈا پانی نوش

فرماکر فرمایا:۔

"میاں اشرف علی، پانی جب پینا۔ ٹھنڈا پینا تاکہ ہر بن مُو سے الحمدللہ نکلے۔ ورنہ زبان تو الحمدللہ کہے گی۔ لیکن دل الحمدللہ کہنے میں شریک نہ ہوگا۔"

اثر افاضہ صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں:۔

"ادھر حاجی صاحب کی قوتِ افاضہ ادھر حضرت والا کی قابلیتِ استفاضہ، بس تھوڑے ہی دنوں میں باہم اس درجہ مناسبت ہوگئی کہ حضرت حاجی صاحب بے ساختہ یہ فرمانے لگے کہ بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو۔ اور جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے جب کبھی حضرت والا کی کوئی تحریر یا تقریر دیکھنے یا سننے کا اتفاق ہوتا۔ تو خوش ہوکر فرمانے لگتے۔ کہ جزاکم اللہ تم نے تو بس میرے سینہ کی شرح کر دی اور اگر دوران علوم و معارف میں کوئی کچھ سوال کرتا۔ تو بجائے خود جواب دینے کے حضرت والا کی طرف اشارہ فرما دیتے۔ کہ ان سے پوچھ لینا۔ یہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ حالانکہ حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ میں غایت ادب سے حضرت کے سامنے ہمیشہ خاموش ہی بیٹھا رہتا تھا اور بہت ہی کم کبھی ضرورت ہی کے وقت کچھ بولنے کا اتفاق ہوتا تھا۔"

یہ حضرت حاجی صاحب کی بصیرت باطنی کا کرشمہ تھا۔ جو اپنے نورِ فہم اور فراست ایمانی سے حضرت کی سخن فہمی اور معنی شناسی کو معلوم کر لیتے تھے۔

آتشِ حسد حضرت کی حد سے بڑھتی ہوئی شفقت۔ عنایت اور توجہ نے دوسروں کو حضرت کا حاسد بنا دیا۔ شیخ و مرید کے تعلقات بوجہ غایت مناسبت جب اس مقام پر پہنچ گئے ؎

من تو شدم تو من شدی۔ من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم۔ تو دیگری

تو انہوں نے آتش حسد کو تیز تر کر دیا۔ اور بعض حاشیہ نشینوں نے خبثِ باطنی کی وجہ سے حاجی صاحب کو حضرت سے بدظن کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب نے سرسید احمد خاں مرحوم کو نصیحت کے طور پر خط لکھنا چاہا۔ اور اس کے لئے مسودات طلب فرمائے۔ بہت سے حاشیہ نشینوں نے اپنے اپنے مسودات پیش کئے۔ جو حاجی صاحب کو پسند نہ آئے پھر انہوں نے حضرت سے مسودہ پیش کرنے کو فرمایا۔ جب آپ لکھ کر لے گئے تو بہت پسند فرمایا۔ مگر حاسدوں نے خواہ مخواہ یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ سرسید بدگمانی کریں گے کہ حضرت مولانا گنگوہی

کے ایما پر یہ خط لکھا گیا ہے اور یہ بدگمانی مولانا کے لئے مضر ہو گی۔ اسلئے اس کا بھیجنا خلافِ مصلحت ہے۔ اگرچہ حاجی صاحب کا اس پر اصرار تھا کہ یہ خط مفید رہے گا۔ مگر انہوں نے حضرت کی نرم خوئی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی بات منوالی اور وہ خط نہ بھیجنے دیا۔ لیکن حاجی صاحب بدستور یہ فرماتے رہے کہ:۔

"اگر وہ خط بھیج دیا جاتا۔ تو امید تو تھی کہ اصلاح ہو جاتی۔ لیکن ہمارے دوستوں کی رائے نہ ہوئی"

چونکہ اس خط سے فیض یاب ہونا سرسید کے مقدر میں نہ تھا اسلئے حاسدوں کی تدبیر کامیاب رہی۔

خط بنام سرسید

اس خط کا مسودہ یہ تھا جو حضرت نے رسالہ "اصلاح الخیال" کے اخیر میں شائع کر دیا تھا۔

"بخدمت عالی مرتبت مجمع اخلاق و الطاف سلمہم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

ہر چند کہ مجھ کو آپ سے معروفی نیاز حاصل نہیں۔ مگر آپ کے اخلاق کے اوصاف سن کر غائبانہ تعلق ہے۔ جس نے اس عرض کی جرأت دلائی۔ آپ میری گمنامی و ناشناسائی پر نظر نہ فرمائیں بلکہ انظروا الی ما قال ولا تنظروا الی من قال کو پیش نظر رکھئے۔ اب بنام خدا شروع کرتا ہوں۔

مکرما! جہاں تک آپ کی مساعی و تصانیف کو غور کر کے دیکھا۔ یوں معلوم ہوا کہ آپ کو دو چیزیں مقصود ہیں۔ خیر خواہی اسلام و خیر خواہی مسلمانان نے اس پر مجبور کیا کہ جو اعتراضات مذہب اسلام پر مخالفین کے ہیں۔ ان کے جواب دیئے جائیں۔ اور خیر خواہی مسلمانان اس امر کا باعث ہوئی کہ مسلمان جو حضیضِ تنزلی (پستی) میں گرے ہیں ان کو ترقی پر پہنچایا جائے۔ ان دونوں مقصودوں کے مستحسن ہونے میں کسی منصف کو کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر غور طلب امر یہ ہے کہ اس کے ذرائع اور وسائل کیا ہیں؟ اس کی تعیین باعث اختلاف خیالات و جمہور اہل اسلام ہے۔ آپ نے اسلام کے اوپر سے اعتراض رفع کرنے کی یہ صورت ٹھہرائی کہ جو تحقیقاتِ جدیدہ ہیں۔ ان میں کلام نہ کیا جائے۔ بلکہ جس طرح بن پڑے اسلام کو اس پر منطبق کیا جائے۔ اور منشا اس تجویز کا صرف یہ دلیل ہے کہ تحقیقاتِ جدیدہ مطابق واقع کے ہیں۔ اور اسلام مطابق واقع کے نہیں۔ دوسرے مقدمہ کے تسلیم کرنے میں تو کسی مسلمان کو گنجائش نہیں۔ رہا۔ پہلا مقدمہ! وہ محل کلام ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے کہ سب تحقیقات جدیدہ صحیح ہیں؟ تمثیلاً بعض امور کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً

(۱) فلاسفہ کی تحقیق ہے کہ آسمان کوئی مجسم چیز نہیں۔ بھلا اس کی صحت پر کونسی دلیل قائم ہے۔ اگر یہ رنگ جو نظر آتا ہے آسمان نہ ہو۔ اس سے آگے بہت دور موافق حدیث صحیح کے پانچ سو برس کی مسافت پر پہلا آسمان موجود ہو۔ اس سے آگے اور سماوات ہوں تو کونسی دلیل عقلی سے قطعی کی مخالفت لازم آتی ہے۔

(۲) ان کی تحقیق ہے کہ اصحاب کہف اور یاجوج ماجوج اور جن موافق عقائد اسلام موجود نہیں اس کی کیا دلیل ہے؟ اگر کہیے کہ باوجود تلاش جن نہیں ملے یا نظر نہیں آسکے۔ تو جہان میں کسی چیز کا نہ ملنا یا نظر نہ آنا دلیل اس کے عدم کی نہیں ہوتی۔ امریکہ کا حال پہلے معلوم نہ تھا۔ سیاحانِ ارض کو پتہ تک نہ لگا تھا۔ اور معتبر اخبار سے ثابت ہے کہ نئے نئے جزیرے نکلتے آتے ہیں تو کیا یہ مقامات اس وقت معدوم تھے۔ رہا یہ کہ جن شہروں کے نام مفسرین نے لکھے ہیں۔ وہاں نہیں ملے۔ (حالانکہ ان کے آثار اب ظاہر ہوئے ہیں ۱۲ منہ) تو اول حق تعالیٰ میں قدرت ہے کہ باوجودیکہ انہیں مقامات میں موجود ہوں۔ پھر محجوب کردیے جاویں۔ چنانچہ عنقریب بحث معجزہ میں یہ مضمون آتا ہے۔ بعد تسلیم ان مقامات میں نہ سہی اور کہیں ہوں۔ نصوص کی کیوں تاویل کی جاوے؟

(۳) فلاسفہ حادیہ نے معجزات انبیاء کا انکار اس وجہ سے کیا ہے کہ یہ خلاف فطرت ہے۔ اس پر کونسی شافی دلیل موجود ہے؟ جس سے نصوص کو مصروف عن الظاہر کیا جاوے۔ رہا یہ کہ خلاف فطرت ہے۔ اس فطرت کی ماہیت آج تک متعین نہیں ہوئی۔ جس سے کوئی قاعدہ منضبط ہوسکے۔ نہ یہ کسی دلیل قطعی سے ثابت ہوا کہ فطرت کے خلاف کیوں محال ہے۔ اگر فطرت کی حقیقت عادت الٰہی ٹھیرایئے اور دلیل استحالہ تخالف میں یہ ٹھیرایئے کہ عادۃ الٰہی وعدۂ فعلی ہے۔ اس کا خلاف مثل وعدۂ قولی کے محال ہوگا۔ تو اول تو ان دونوں مقدموں میں کلام ہے کیونکہ عادت الٰہی اول وعدہ نہیں۔ یہ امر دلیل طلب ہے۔ دوسرے عادت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر روز واقع ہوا کرے۔ بعض امور میں یہ بھی عادت ہو کہ گاہ گاہ واقع ہوجاتا ہو اور معجزات اسی قبیل سے ہوں۔ اس سے استدلال کا جواب بھی ہوگیا۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ اور لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا یہ جب ہے کہ ان آیات کے وہی معنی تسلیم کرلئے جاویں۔ جو آپ فرماتے ہیں اور اگر دوسری توجیہ کی جاوے۔ جیسا کہ مفسرین محققین نے کی ہے تو وہ توجیہ آپ کی تاویلات سے زیادہ بعید نہیں۔ اس وقت استدلال ہی صحیح نہیں۔ جواب کی کیا حاجت ہے۔ دوسرے یہ کہ ریل۔ تار برقی۔ فوٹوگراف۔ ٹیلیفون وغیرہ

کیا کیا ایجاد ہوا۔ آپ انصاف سے فرمایئے کہ اگر یہ چیزیں کسی نے نہ دیکھی ہوں اور آپ کا قاعدہ
کہ خلاف عادۃ محال ہے۔ اس کے نزدیک مسلم ہو۔ تو وہ ان چیزوں کے وجود کا اس قاعدہ کی رو
سے انکار کرے گا یا نہیں؟ ضرور انکار کریگا۔ پس اگر وہ قاعدہ صحیح ہے تو آپ کو بھی ان چیزوں کا انکار
ضروری ہے بلکہ صانع عالم کا ماننا بھی ضروری نہ ہوگا۔ اگر ان چیزوں کا وجود مسلم ہے تو قاعدہ سے دستبردار ہونا ضروری
ہے اگر یہ شبہ ہو کہ یہ چیزیں مستند الی الاسباب ہیں تو معجزہ بلا سبب ایک فعل ہوجاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے
اسباب دنیاویہ اختیاریہ للعباد میں انحصار اسباب کا کسی دلیل سے ثابت ہونا چاہیئے۔ حق تعالےٰ
کی مشیت اور حکم کتنا بڑا سبب ہے اس کے سبب ہونے میں کیا خرابی عقلی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ
انبیاء سے معجزہ ہر قسم کا صادر ہونا ممکن ہے پھر کیوں نصوص کی تاویل کی جاوے۔ یہی حال دوسری
تحقیقات جدیدہ کا ہے کہ اکثر اس میں مخدوش اور مبنی بر تخمین و تقلید ہیں۔ البتہ اگر کوئی دلیل عقلی ایسی
ہو کہ اسکے تمام مقدمات برہانی ہوں یا مشاہدہ صحیحہ ہو۔ جس میں احتمال غلط فہمی کا نہ ہو اور پھر کوئی
نص ظاہراً اس کے مخالف معلوم ہو۔ اس وقت اس نص میں تاویل مناسب ضرور ہے۔ مثلاً نصوص
قرآنیہ سے ید اور وجہ وغیرہ حق تعالےٰ کے لئے ہونا ظاہراً معلوم ہوتا ہے۔ اور دلیل قطعی سے انتفاء
اجزا ثابت ہے۔ ان لفظوں میں البتہ تاویل کی گئی۔ اور تاویل میں بھی یہ شرط ہے کہ موافق قواعد عربیہ
و شرعیہ ہو۔ ورنہ وہ تحریف ہے۔ آپ کی تاویلات اولاً بلا ضرورت ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا ثانیاً قواعد
عربیہ کی پابندی نہ قواعد شرعیہ کی۔ پہلے علماء نے بھی فلاسفہ کے جواب دیئے ہیں۔ مگر اس طرح کہ اول
ان کی تحقیقات کو منہدم کیا۔ اور جس تحقیق کو بالکل صحیح پایا۔ اس جگہ مناسب تاویل کی۔ اسی جگہ سے معلوم
ہوگیا۔ کہ آپ نے جو اکثر احادیث نبویہ کو غیر معتبر ٹھہرایا ہے۔ اس کی بھی کوئی دلیل نہیں۔ اگر دلیل
مخالفت دلیل عقلی ہے تو معلوم ہوچکا کہ دلیل عقلی سے مراد دلیل قطعی ہے۔ نہ کہ دلیل وہمی۔ ورنہ
اس دلیل عقلی کی تعیین مشکل ہوجاوے گی۔ پس کون بعض عقل کو اس کا معیار قرار دینگے۔ کیونکہ عقول
میں تفاوت فاحش ہے۔ پھر ہر شخص کی عقلی تحقیق جدا ہے۔ اور سب کو صحیح ماننا پڑے گا۔ اس
میں تو اجتماع نقیضین و التقارضین لازم آویگا۔ مثلاً بطلیموس اور فیثاغورس حرکت و سکون زمین
و آسمان میں مختلف ہیں۔ افلاطون اور ارسطو حدوث و قدم ارواح میں متخالف ہیں۔ پھر ایک تحقیق
تو ضرور غلط ہوگی۔ ہر گاہ تحقیق عقلی کی غلطی بھی ممکن ہوئی۔ تو آپ کو کیسے وثوق ہوا کہ آپ کی دلیل عقلی
ایسی ہی صحیح ہے کہ لابد نص میں تاویل ہی واجب ہے۔ معلوم ہوا کہ ایسے کی عقل ان امور میں قابل
وثوق نہیں۔ جن کی نبوت و اخبار عن الواقع مسلم ہے۔ ان کی خبر قابل اعتبار ہوگی۔ عقل کا کام اتنا ہی

ہے کہ توحید و رسالت کہ اصول عقلیہ میں سے ہیں۔ سمجھ لے آگے فروع ہیں زمام اختیار بدست
حاکم حقیقی اور اسکے خلیفہ اعظم کر دیا ہے۔ دیکھئے جب سلطان وقت بعد تدبر و تفکر کے اپنے کسی
حاکم کی معرفت کوئی قانون ملک میں جاری کرے۔ رعایا کو اس کی تحقیق کی تو ضرورت ہے کہ یہ
سلطان ہے اور فلاں شخص اس کا حاکم۔ تاکہ بے اصل منادی پر جو کسی نے براہ بغاوت یا براہ تمسخر
شہر میں کردی ہو عمل نہ کرلیں۔ اور جب دو نو امر محقق ہو گئے۔ تو اب اس قانون میں غور کرنا کہ ہماری
عقل کے خلاف تو نہیں محض ناجائز ہے۔ اگر ایسا کیا اور اپنی عقل کا اتباع کر کے قانون کا انکار
کیا۔ یا تاویل بعید کی۔ تو معذور نہ ہوگا۔ اگر یہ باب مفتوح ہو۔ تو ملک میں قوانین کا جاری ہونا فوت
ہو جاوے اور بغاوت عالمگیر ہو جائے۔ یہی حال حاکم حقیقی کے قوانین کا سمجھنا چاہیئے۔ اور
اگر انکار حدیث اس بنا پر ہے کہ ان میں کسی قدر اختلاف ہے تو اتنا غور فرمایئے کہ تواریخ و اخبار
میں اختلاف ہوتا ہے یا نہیں؟ ہرگاہ اختلاف موجود ہے۔ پھر چاہیئے کہ کوئی تاریخ و خبر معتبر نہ ٹھہرے
جیسے مورخین راویان اخبار کے معتبر ہونے کو دیکھ کر مان لیتے ہیں اور اختلاف کو مضر تسلیم نہیں سمجھتے
ایسے ہی حدیث میں رواۃ اسناد کے حالات اسماء الرجال سے تحقیق کر کے اس کے ساتھ یہ عمل درآمد
کریں۔ تو کیا حرج ہے۔

اس تقریر سے غالباً آپکے تمام خیالات کا جو باعث ایسی تحریرات کے ہوئے جواب آگیا ہے
علاوہ اس کے ہر کارے دہر مردے تحقیقات دینیہ میں گفتگو کرنا اور لوگوں کا کام تھا۔ آپ اس جملہ سے
یہ نہ سمجھیئے کہ میں آپ کے علم و عقل کا منکر ہوں۔ یہ بات نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہر امر میں اس شخص
کی وقعت و تاثیر ہوتی ہے۔ جس سے اس کا پہلے سے اعتبار ہو۔ علماء محققین کی تحقیقات مسلمانوں
میں معتبر سمجھی گئی ہیں۔ اور وہ لوگ کم و بیش اس کام کو کرتے رہے ہیں۔ وہ اس خدمت کے لئے
کافی تھے۔ دوسرے یہ کہ ہر فن کے لئے ہر زمانہ میں اس کے مناسب لوازم و خواص و آثار ہوتے
ہیں۔ اول تو ہر زمانہ میں نہیں۔ . . . . تو اپنے زمانہ میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تحقیق
مسائل کے لئے اتنی چیزیں ضروری ہیں کہ وہ شخص عالم مشہور ہو۔ متقی پرہیزگار ہو۔ یہی شغل زیادہ
ہو۔ لوگ اس کو دیندار و فہیم سمجھتے ہوں۔ دنیا میں زیادہ آلودہ نہ ہو اور جس شخص میں یہ صفات نہ
ہوں۔ اس کو اس میدان میں قدم نہ رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ سعی لاطائل و جہد باطل ہے۔ پر جیسی حالت
اس وقت آپ کی ہے۔ ایسی حالت پر آپ کی کوئی تحقیق صحیح بھی ہوتی۔ تب بھی سکوت فرمانا چاہیے
تھا۔ کیونکہ ایسی حالت میں بولنا۔ اور بولنا بھی ایسا جو سارے جہان کے خلاف ہو۔ بیٹھے بٹھلائے

اپنے مسلمان بھائیوں میں تفرقہ ڈالنا ہے۔ جس کو آپ سب سے زیادہ ناپسند کرتے ہیں۔ اور تعجب ہے کہ اس تفرقہ کے سبب عظیم پر آپ غور نہیں فرماتے۔

یہاں تک تو خیر خواہی اسلام پر عرض کیا گیا۔ دوسرا امر مسلمانوں کی خیر خواہی اور ان کی ترقی کی تدبیرات کرنا ہے۔ اس کے مستحسن ہونے میں کسی کو کلام نہیں کرتا۔ ہاں اس کے متعلق جو تدابیر کی جاتی ہیں۔ وہ البتہ غور طلب ہیں۔ خلاصہ تمام تر آپ کی کارروائیوں کا یہ ہے کہ انگریزی میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت و استعداد حاصل کر کے بڑے بڑے عہدوں اور حکام تک رسائی اور قوم میں وقعت حاصل کریں۔ میں اس میں زیادہ گفتگو کرنا نہیں چاہتا کہ انگریزی پڑھنا بحالت موجودہ کیسا ہے اور اس کا اثر کھلی آنکھوں مذہب پر کہاں تک پڑ رہا ہے کیونکہ اولاً اس میں بحث طویل ہے دوسرے علماء سے تحقیق ہو سکتی ہے۔ صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ اول تو قومی ترقی انگریزی پڑھنے پر منحصر نہیں۔ میری رائے میں اگر ترقی وقعت مطلوب ہے۔ تو ترقی مالی اس کا ذریعہ ہے۔ اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ علم و کمالات پر کسی کی بھی نظر نہیں۔ الا ماشاء اللہ عوام میں حکام میں مالدار کا اعتبار ہے۔ اس کی عزت ہے اس کو خطاب و القاب ملتے ہیں اکثر مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ مجسٹریٹی وغیرہ عہدے بھی مل جاتے ہیں۔ مشورۂ حکام میں بھی شریک کئے جاتے ہیں خواہ انگریزی کا ایک حرف بھی نہ جانتے ہوں اور اگر ترقی مال مطلوب ہے۔ تو تجارت و صنعت سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہر شخص ہر وقت میں پیشہ ور اور تاجر کا محتاج ہے۔ تعلیم انگریزی خواں فیصدی دس جمعیت سے ہوں گے اور اہل صنعت و تاجر فی صدی دس پریشان ہوں گے اگر بجائے تعلیم انگریزی صنائع کی تعلیم کا اہتمام فرمائیے۔ تو قوم کو زیادہ نفع ہوتا ہے۔ ثانیاً اگر فرض کر لیا جاوے کہ قومی ترقی انگریزی کی تعلیم میں منحصر ہی ہو۔ سرکاری مدارس کیا کچھ کم تھے۔ جو جناب کے مدرسہ کی حاجت ہوئی؟ اگر یہ وجہ بتلائی جاوے کہ ان مدارس میں مذہبی خیالات خراب ہو جاتے ہیں اس لئے ایسے مدرسہ کی ضرورت ہوئی۔ جہاں مذہبی تعلیم بھی ہو۔

گویا میں سچ کہتا ہوں۔ اور آپ بھی دل میں جانتے ہوں گے کہ سرکاری مدارس کے تعلیم یافتہ ایسے بدعقیدہ نہیں۔ جیسے اس مدرسہ کے اکثر تعلیم یافتہ ہیں۔ اگر نماز و وعظ کے انتظام کو آپ فرض کریں تو یہ خوب جان لیں کہ جب تک آپ کے خیالات نہ بدلیں گے۔ آپ کے متبعین کی وہی کیفیت رہے گی۔ ثالثاً یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ اس مدرسہ کی ضرورت ہی ہے۔ اور اسی مدرسہ سے ترقی دین و دنیا کی ہو سکتی ہے۔ تو اس صورت میں انصاف سے دیکھئے۔ ترقی کے مستحق زیادہ کون لوگ ہیں۔

امراء یا غربا؟ امرا کو تو پہلے سے ترقی حاصل ہے۔ آپ کی مطلوبہ ترقی نہ سہی۔ مگر کسی قسم کی تو ہے۔ جو ان کے لئے زیادہ اہتمام کرنا تحصیل حاصل کی قبیل سے ہے۔ البتہ غربا اس کے زیادہ مستحق تھے۔ غریب بچوں کو مدرسہ میں داخل کیا جاتا۔ ان کے مصارف کی کفالت کی جاتی۔ ان کی تعلیم و تربیت کر کے معزز عہدوں پر ممتاز کراتے۔ ان کے دل سے دعا نکلتی۔ خیر اگر قبولِ دعا کوئی چیز نہیں۔ تو ان کے دلوں کو راحت تو پہنچتی۔ یہ تو آپ کے نزدیک بھی محمود چیز ہے۔ اب تو تحقیق ہوا ہے کہ غریب کا گذر وہاں مشکل ہے۔ پھر ہمدردی قومی، خیر خواہی مسلمانان کہاں رہی؟ پھر امرا نے پڑھ کر ترقی بھی کی۔ تو اول تو تعلیم میں کس قدر صرف ہوتا ہے خصوصاً جو لوگ کہ یہاں سے ولایت جاتے ہیں جو آپ کے نزدیک عین صلاح ہے۔ ان کا اس قدر صرف ہوتا ہے کہ اس رقم کا بڑا گاؤں آ سکتا ہے یا تجارت کر کے اس کا بڑا کارخانہ بن سکتا ہے جس میں اس شخص کی استعداد کے قریب کے لوگ کارکن مقرر ہو سکتے ہیں۔ اس سے بھی قطع نظر کر لی جاوے۔ تو مبلغ ترقی یہ ہے کہ بیرسٹر ہو گئے یا کوئی حکومت مل گئی۔ اگر بیرسٹر ہیں تو انہوں نے ستانا شروع کیا۔ جو دو قومی بھائی لڑیں۔ کہ ہماری ضرورت رفع ہو۔ ان کی مراد پوری ہوئی۔ کسی نے ان کو مقرر کرنا چاہا۔ تو ایک پیشی کے دو چار سو روپیہ علی قدر اپنے مال کے اس سے فرمایا۔ اس نے کچھ کم کیا تو خفا ہو کر نکالنے کا حکم دیا۔ صاحب الغرض مجنوں۔ اس نے معذرت کر کے وہ رقم قبول کی۔ اور جہاں سے ہو سکا۔ توڑ جوڑ کر بند و بست کر کے ان کا رومال بھر دیا۔ خدا کی قدرت پہلی پیشی میں بحث تمام نہ ہوئی۔ دوسری تاریخ مقرر ہوئی اس تاریخ میں بھی وہی رقم مانگی گئی۔ غرض دو تین پیشیوں میں اس کا۔ اس کے اعزہ کا گھر لٹ[۱] گیا بھلا یہ کیا ترقی و ہمدردی ہے کہ دس گھر اجڑ کر ایک آباد کیا جاوے۔ اگر حکومت مل گئی تو عقائد پہلے سے خراب ہو چکے ہیں۔ قبر و حشر فسانہ بے معنی ہے۔ پھر خدا کا خوف کس لئے۔ تہذیب اخلاق میں یہ قوت ہرگز نہیں کہ امور مذمومہ سے روک سکے۔ یہ برکت مذہب ہی میں ہے کہ بعض لوگ اپنے آقا کی ناخوشی سے کہ وہ عذاب قبر و دوزخ ہے ڈر کر منہیات سے بچتے ہیں۔ سو اس شخص کو مذہب مانع رہا نہیں۔ اخلاق میں یہ قوت نہیں۔ پھر ایسا شخص جو کچھ کرے۔ ظلم کرے۔ رشوت لے۔ ناحق فیصلہ کرے۔ پرانی عداوت نکالے۔ جو کرے تعجب نہیں۔ ایک عاقل نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ جو شخص اپنے مذہب کا پابند نہ ہو۔ وہ لائق حکومت کے نہیں۔ اور اگر کسی کے اخلاق ایسے ہی مہذب ہو گئے ہوں

---

[۱] حضرت نے تو قیاس یا فراست کی بنا پر اس طبقہ کا یہ حال لکھا۔ مگر احقر مؤلف اپنے ۴۴ سالہ کچہری کے تجربوں کی بنا پر اس فیصلہ کی اپنی دید سے حرف بحرف تائید کرتا ہے۔

جو سب امور سے مانع ہو جاوے۔ تو یہ شاذ و نادر ہے۔ والنادر کالمعدوم۔ بہر حال جو کارروائی مسلمانوں کی ترقی کے لئے اس وقت ہو رہی ہے۔ وہ سراسر خرابی در خرابی سے بھری ہوئی ہے پس نہ خیر خواہی اسلام کے اصول صحیح ہیں۔ نہ خیر خواہی مسلمانان کے ذرائع راست ہیں۔ یہ تو بھلا ان امور کا ذکر تھا جن کا اثر دوسروں کو پہنچتا ہے۔ اب جو امور آپ کی ذات خاص سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو بھی بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ سب سے اول عقائد کی درستی ہے۔ اگر کچھ شبہات انسان کو واقع ہو جاویں۔ تعجب نہیں۔ مگر خدا کے فضل سے اس زمانہ میں اہل علم محققین جامع معقول و منقول شبہات رفع کرنے والے موجود ہیں۔ اول وجہ مولانا محمد علی صاحب تحصیلدار مرحوم کی تحریرات میرے نزدیک آپ کے اصولی و فروعی شبہات کے جواب کے لئے کافی ہیں۔ اصرار کو کام نہ فرمائیے۔ نظر انصاف سے اس کو دیکھ کر اپنے خیالات درست فرما لیجئے۔ اور یہ خیال نہ فرمائیے کہ آپ اپنی مشہور تصنیفات کے کس طرح خلاف کہیں۔ آپ کی انصاف پسند طبیعت پر اس خیال کا احتمال نہیں۔ آپ نے بہت سی غلطیوں کا اقرار بھی فرمایا ہے مثلاً حدیث فاطمہ میں تجارت فاطمہ دہی جو یرتیہ کا تجارت فاطمہ ہی ہے۔ وجویرتیہ لکھا گیا۔ پھر آپ نے نہایت انصاف و خوبی کے ساتھ اس سے رجوع کر کے طبع کر دیا۔ اگر اب بھی اپنے خیالات کو صحیح کر کے اعلان فرما دیجئے۔ تو آپ کا اعلیٰ درجہ کا کمال ظاہر ہو۔ جمہور اہل اسلام کہ وہ تعداد میں آپ کے مدعیان اتباع سے بہت زیادہ ہیں۔ آپ کے محب و مخلص بن جاویں۔ اس وقت ان کو ترقی کی تدبیر جو بتلاویں۔ وہ قبول کرنے کو دل سے تیار ہوں۔ اور آخرت میں ثواب ملے۔ اپنے صحت عقائد کا بھی اور بہت سے لوگوں سے محفوظ رہنے کا اور بعضوں کے عقائد درست ہو جانے کا بھی۔ جو غایت محبت و اعتماد سے آپ کے رجوع کرنے سے وہ بھی رجوع کر لیں۔ دوسرے نماز کی پابندی جماعت کے ساتھ ضروری ہے۔ خود نماز کی پابندی فرض ہے۔ اور جماعت سنت مؤکدہ اللہ و رسولؐ کی محبت جو مقتضیٰ اسلام کا ہے۔ وہ اسی کو مقتضیٰ ہے کہ نہ فرض چھوٹے۔ نہ سنت۔ تیسرے اصلاح لباس میں میں زیادہ دلائل بیان نہیں کرتا۔ صرف ایک مختصر سی بات کہتا ہوں۔ کہ مرد اگر عورت کا لباس پہن لے تو کیوں معیوب ہے۔ اسی وجہ سے ایک مذہب کی ایک قوم دوسرے مذہب کے لوگوں کا لباس و وضع اختیار کریں۔ تو کیا بے موقع نہیں۔ چوتھے خدا تعالیٰ نے آپ کو ہر قسم کی استطاعت دی ہے۔ حج بنص قرآنی فرض ہے۔ خدا اور رسول کی محبت کا مقتضا یہ تھا کہ اگر فرضاً اسلام میں حاضری فرض و سنت بھی نہ ہوتی۔ تب بھی بمقتضائے محبت دربار خدا اور رسول میں ہر استطاعت والے کو حاضر ہونا ضرور تھا۔ نہ کہ حاضری مکہ کی فرض اور حاضری مدینہ طیبہ کی سنت۔ پھر کس قدر نازیبا ہے کہ عمر میں ایک بار بھی تشریف

دلادیں جس وقت لندن کا سفر کیا تھا۔ آتے جاتے اگر ان سے سیدھے تشریف لے جاتے۔ ترکیب مشکل تھا۔ اب ہمت کیجئے۔ اور سامانِ سفر کر لیجئے۔ اور روزہ۔ زکوٰۃ ایک مخفی عبادت ہے۔ مجھ کو اس کی اطلاع نہیں۔ خدا کرے آپ پابند ہوں۔ ورنہ وہ بھی فہرست معروضات بالا میں شامل سمجھیں۔

خلاصہ تمام معروضات کا یہ ہے کہ اب آپ کا اخیر وقت ہے۔ بجز عقائد و اعمال کے کوئی اس سفر آخرت کا ساتھی نہیں۔ اپنے "چند روزہ رفقاء کو رخصت کیجئے۔ خواہ ظاہراً بھی خواہ صرف دل سے اور اس دائمی رفیق کو ساتھ لیجئے یعنی عقائد و اعمال کی اصلاح فرمایئے کیونکہ اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون ؎

نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

آخر میں یہ عرض ہے کہ اس التماس نامہ میں اگر کوئی لفظ خلاف مزاج سامی سرزد ہوا ہو۔ مزاج ناشناسی پر حمل کر کے معذور سمجھیں۔ تعصب و عناد پر محمول نہ فرماویں۔ کہ بخدا باعث تحریر صرف خیرخواہی و دلسوزی ہے اور عرض ہذا اگر مقبول خاطر عاطر ہو۔ اور امید ہے کہ ہو۔ تو اس نیاز مند کو مطلع فرما کر مسرور فرماویں۔ ورنہ کچھ حاجت تحریر جواب نہیں زیادہ نیاز۔ فقط"

یہ خط جسے حاسدوں نے بلطائف الحیل محض اس وجہ سے سرسید تک نہ جانے دیا کہ وہ حضرت تھانویؒ کا لکھا ہوا تھا۔ آج بھی سرسید مرحوم کے ہم خیال طبقہ کے لئے سرمایہ بصیرت ہے۔

سپردگی کتب حضرت تھانویؒ چونکہ حضرت حاجی صاحب کے منظور نظر تھے۔ اسلئے حاجی صاحب نے نہایت خصوصیت کی وجہ سے اپنا کتب خانہ حضرت تھانوی کے سپرد کرنا چاہا۔ مگر آپ نے عرض کیا۔

"حضرت کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ ان کو لے کر میں کیا کروں گا۔ اپنے سینۂ مبارک سے کچھ دولت عطا فرمایئے"۔

انہوں نے حضرت تھانویؒ کو بطلبِ فیض روحانی مغلوب الحال دیکھ کر جوش سے فرمایا ؎

"ہاں میاں! ہاں!! سچ ہے۔ کتابوں میں کیا رکھا ہے ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن سینہ را از نورِ حق گلزار کن"

چنانچہ اس وقت تو حاجی صاحب نے آپ کے انکار پر اصرار نہ فرمایا۔ تاکہ آپ کی دل شکنی نہ ہو لیکن کچھ عرصہ بعد ان کتابوں کا پلندہ بنوا کر ہندوستان جانے والے ایک رئیس کے ہاتھ حضرت کو بھیجنے لگے

دامِ حسد لیکن بعض حاسدین نے فوراً ان کتابوں کے متعلق ایک جعلی وقف نامہ تیار کر کے اور

کسی خفیہ ذریعہ سے حضرت حاجی صاحب کی مہر اس پر ثبت کر کے حاجی صاحب سے کہا کہ آپ یہ کتابیں حضرت تھانوی کو نہیں بھیج سکتے۔ یہ مال وقف ہے۔ حاجی صاحب بار بار کہیں کہ میں نے وقف نہیں کیں۔ مگر وہ بھانپ گئے کہ کیا معاملہ ہے۔ اسلئے اس وقت تو انہوں نے مصلحتاً ان کی روانگی روک دی مگر مرض الموت میں مولانا محمد سعید صاحب کیرانوی کو وصیت فرمائی کہ وہ کتابیں حضرت تھانوی کو بھیج دی جاویں۔ اور اگر وہ نہ لینا چاہیں تو پھر مدرسہ صولتیہ (مکہ معظمہ) میں رہیں۔ چنانچہ مولانا نے اس بارہ میں حضرت تھانوی کو خط لکھا۔ جو گم کر دیا گیا یا گم ہو گیا۔ اسلئے وہ مدرسہ میں ہی رہیں جب اس واقعہ کا بعد میں حضرت کو علم ہوا تو فرمانے لگے کہ اگر وہ خط مجھ کو مل بھی جاتا۔ تو تب بھی میں یہی تجویز کرتا کہ وہ وہیں مدرسہ میں ہی رہیں۔ اس طرح آپ نے کم ظرفی کے مقابلہ میں وسیع الظرفی دکھائی۔ اور جو بات شروع میں حضرت حاجی صاحب سے فرمائی تھی کہ کتابوں میں کیا رکھا ہے اس پر اخیر وقت تک استقامت دکھائی۔ حالانکہ معاملہ دینے کا نہیں بلکہ لینے کا تھا۔

واپسی وطن حاجی صاحب کی خواہش حضرت تھانوی کو پورے چھ ماہ اپنے پاس ٹھہرانے کی تھی۔ مگر چھ ماہ گذرنے سے قبل ہی حضرت تھانوی نے وہ تمام دولتیں جو بحیثیت ایزدی حضرت حاجی صاحب سے حاصل کرنی تھی۔ کر چکے تھے۔ بلکہ اخذ بیعت کی اجازت کے علاوہ حاجی صاحب کے جانشین اور خلیفہ خاص بھی بن چکے تھے۔ جس کی وجہ سے حاسدین حضرت کو حاجی صاحب کی نظروں میں گرانے کے درپے ہو گئے۔ اسلئے حضرت فرماتے ہیں کہ میں چاہا کرتا تھا کہ حضرت میرے اوپر اتنی شفقت و عنایت سب کے سامنے نہ فرمایا کریں تو اچھا ہو۔ آخر میں حاسدین سے حضرت کو اتنا اندیشہ لاحق ہوا کہ آپ وہاں چھ ماہ پورے کرنے سے ہفتہ عشرہ قبل ہی انشراح کی حالت میں واپس روانہ ہو پڑے۔

دو وصیتیں حضرت تھانوی کو حاجی صاحب نے واپسی سے قبل دو وصیتیں فرمائیں۔

(۱) میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر ایک حالت پیش آئے گی۔ اس وقت عجلت مت کرنا۔

(۲) جب کبھی بھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو۔ تو پھر کسی دوسری جگہ تعلق نہ کرنا۔ بلکہ توکل بخدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔

حالانکہ محرم ۱۳۰۱ھ میں انہوں نے ایک مکتوب میں حضرت کو ترک تعلق سے منع فرمایا تھا لیکن چونکہ تلوین کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اور تمکین کا دور شروع ہو گیا تھا۔ اسلئے اب حاجی صاحب نے تھانہ بھون

چلے جانے کا اشارہ فرمایا۔

ساعتِ سعید حضرت حاجی صاحب کے حضرت تھانوی کو اپنا خلیفہ و جانشین بنانے منصب ارشاد و تلقین پر متمکن فرمانے کے واقعہ پر خسرو دربار اشرفیہ حضرت مجذوبؒ صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں کہ:-

"اللہ اللہ! وہ کیسی مسعود و مبارک اور خلاصہ ازمنہ ساعت تھی۔ جس میں ایک قطب الارشاد حکیم الامت۔ مجدد دین ملت ایک شیخ العرب والعجم کے دست مقدس و مبارک سے دنیائے اسلام سے رسوم و بدعات کو مٹانے اور اسلام کو اس کی اصلی صورت میں دکھانے مسلمانوں کو افراط و تفریط سے ہٹانے۔ جادۂ مستقیم پر لانے۔ علوم و معارف کے دریا بہانے۔ عوام و خواص سب کو متمتع و مستفید فرمانے۔ فیوض و برکات ظاہری و باطنی کو شرقاً و غرباً پھیلانے۔ بڑے بڑے عقدہ ہائے لاینحل اور پیچیدہ پیچیدہ مسائل علمیہ و عملیہ کی گتھیاں سلجھانے۔ بندگان خدا کو صحیح آداب عبودیت و اصول معاشرت سکھانے اور مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان اور انسانوں کو صحیح معنی میں انسان بنانے تعلیم و تہذیب اسلامی کی خوبی و متانت کو عالم آشکارا اور تعلیم جدیدہ و تہذیب نو کی ملمع کار و نظر فریب چادر زرنگار کو پارہ پارہ کر کے اس کی دھجیاں اڑانے اور نئی روشنی کی مخفی ظلمات کھلی آنکھوں دکھلانے۔ اہل دنیا کے قلوب میں اہل دین کا سکہ بٹھانے۔ دین و اہل دین۔ علم دین اور اہل علم دین کی وقعت بڑھانے اور بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھکانے۔ شبہات جدیدہ کو اصول منطق و فلسفہ ہی کی بنا پر باطل ٹھہرانے اور بڑے بڑے مدعیان منطق و فلسفہ سے بھی کتاب و سنت کے احکام و اخبار و عقائد حقہ منوانے۔ اعلاء السنن میں احادیث تائیدیہ جمع کرا کے فقہ حنفی کو چار چاند لگانے۔ ہزاروں بے نمازیوں سے نماز پڑھوانے۔ سود خواروں سے سود اور دیگر ناجائز آمدنی والوں سے ناجائز آمدنیاں ترک کرانے۔ اہل حقوق کے حقوق دلانے جملہ اہل معاصی سے معاصی ظاہرہ باطنہ چھڑوانے بڑے بڑے مہلک امراض روحانیت کے نہایت سہل سہل اور تیر بہدف معالجات اور نادر نادر طرق اصلاح بتانے۔ نہایت باریک باریک مکائد نفس سمجھانے۔ بڑے بڑے مہلکات طریق کی طرف توجہ دلانے اور ہلاکت باطنی سے بچانے۔ تصوف کو بجائے اس کے موجودہ معتوعی عبا و قبا کے اس کا

صدیوں کا اترا ہوا اصلی خرقہ دیرینہ پہنانے اور سالکین کو سلف صالحین کے برگزیدہ اور
بالکل مطابق کتاب وسنت طریق پر جو مدت دراز سے متروک تھا۔ پھر چلانے ترغیب
وترہیب کے پُراثر مضامین سے روتوں کو ہنسانے اور ہنستوں کو رلانے۔ بالخصوص آیات
وبشارات رحمت سنانے۔ ہزارہا مایوسین کی ڈھارس بندھانے۔ نامرادوں کی مرادیں بر
لانے۔ صدہا طالبین کہ جن میں ہر اعلیٰ وادنیٰ طبقہ اور پیشہ کے افراد شامل ہیں۔ محبوب
حقیقی تک بہ اقرب طرق پہنچانے۔ غرضیکہ ہر شعبۂ دینی خصوصاً تفسیر وتصوف کے متعلق
ہر ضروری خدمت بہ احسن وابلغ وجوہ بجالانے کے لیے سریر آرائے منصب ارشاد
ہوا۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ دین محمدی علیٰ صاحبہ السلام والتحیۃ کی
ازسرنو تجدید اور رسوم قبیحۂ قدیمہ وبدعات سیئہ دیرینہ کی تردید آئندہ اسی کی بدولت ہونا تھی
یہ واقعہ دنیا کے اہم ترین واقعات سے بھی زیادہ اہم واقعہ تھا۔"

تائید غیبی

حضرت مجذوبؒ نے جو کچھ فرمایا۔ اس کی تائید غیبی اس طرح سے ہوگئی کہ جس وقت
حضرت تھانوی مکہ معظمہ سے واپس ہونے لگے تو بخشی نذیر حسین مرحوم کانپوری جو
ایک دیندار صالح شخص تھے اس نے خواب میں دیکھا کہ حضرت والا مکہ معظمہ سے ہندوستان تشریف لے
آئے ہیں اور جس وقت جہاز سے اترے ہیں۔ دفعتہً سارے ہندوستان میں ایک روشنی سی
پھیل گئی ہے اور تاریکی سی جو اس سے قبل بحالت خواب محسوس ہورہی تھی۔ یک بیک دور ہوگئی
ہے۔ چنانچہ یہ خواب خود حضرت کی مجلس میں حاجی بشیر لکھنوی نے بروایت بخشی نذیر حسین کانپوری
بیان کیا۔ جس کی صداقت کی دلیل حضرت کی مابعد کی ساری زندگی ہے۔ جو آپ نے افاضہ ظاہری
وباطنی میں گذار دی۔

اشتیاق استقبال

اہل کانپور جو حضرت تھانویؒ پر پروانہ وار قربان ہوتے تھے۔ اور آپ
کی چھ ماہ کی طویل مفارقت کے سبب بہت ہی اداس وپریشان ہورہے
تھے۔ حضرت کی واپسی کی خبر سن کر بہت مسرور ہوئے اور حضرت کے شایانِ شان استقبال کرنے
کا اہتمام کرنے لگے۔

کمال عبدیت

جس کا حضرت تھانوی کو قوی احتمال تھا۔ لیکن چونکہ حضرت اپنی شان کو بالکل
مٹا کر عبدیت کاملہ کے شرف سے مشرف ہوکر اپنے پیرومرشد سے واپس تشریف

لا رہے تھے۔ اس لئے آپ نے نہایت اہتمام سے اپنی آمد کی تاریخوں کو پردۂ راز میں رکھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ اور اچانک بلا اطلاع خود بخود دبار سرابیں آ پہنچے۔ جس سے مشتاقین و مخلصین کو بڑی حیرت اور حسرت ہوئی۔ استقبال کے سارے ساز و سامان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ یہاں تک کہ کوئی اسٹیشن تک بھی نہ پہنچ سکا۔ آپ کی آمد کی خبر بجلی کی طرح شہر میں پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ اور حضرت کی بدلی ہوئی حالت کو بنظر حیرت دیکھنے اور کہنے لگے کہ "یا اللہ کس حال میں گئے تھے۔ یہ کیا ہو گیا؟ اب تو رنگ ہی کچھ اور ہے۔" کیونکہ

حالتِ تمکین حضرت کا ایک تو وہ زمانہ تھا کہ

"نہایت سرخ و سفید ہشاش بشاش۔ خوبصورت اور چمکتے ہوئے پٹہ دار بال۔ خوش لباس ایسے کہ گویا ہر وقت دولھا بنے رہتے تھے۔ اور جوانی کا وہ عالم تھا۔ جس کو کہتے ہیں کہ شباب پھٹا پڑتا ہے۔"

اور جب حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں رہنے کے بعد واپس تشریف لائے تو

"چہرہ بالکل زرد اور اداس۔ پژمردہ و ژولیدہ حال۔ نہ بالوں میں تیل کا اہتمام۔ نہ کنگھی کا التزام۔ نہ اچکن۔ نہ انگرکھا۔ نہ پیچک نہ بیل بوٹے۔ صرف سادہ کرتہ اور پاجامہ۔ غرضیکہ حضرت والا کو باطنی باغ و بہار نے ظاہری بناؤ سنگار سے بالکل بے پروا کر دیا تھا لیکن اس خستہ حالی پہ ہزاروں بناؤ سنگار قربان ہوتے تھے۔ اور پہلے سے زیادہ کشش ہوتی تھی۔"

اور آپ کی ہیئت بزبانِ حال پکار رہی تھی ؎

قبا وا کردہ و کاکل پریشاں کردہ می آید
یہ بیں ایں بے سر و ساماں چہ ساماں کردہ می آید

لطفِ سادگی لوگوں نے اپنے قصدِ اہتمامِ استقبال کا ذکر کیا۔ تو فرمانے لگے کہ "اسی وجہ سے میں بے اطلاع آیا ہوں"۔ لوگوں نے کہا کہ چونکہ گھر کے لوگ بھی ہمراہ تھے اسٹیشن پر بڑی زحمت ہوئی ہوگی۔ فرمایا کہ:۔

"زحمت کچھ بھی نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ اتفاق سے پلیٹ فارم پر ہی ایک ڈولی مل گئی۔ اس میں گھر کے لوگوں کو سوار کر کے اور اسباب کو ایک قلی کے حوالے کر کے اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ اور سواری میں بیٹھ کر یہاں پہنچ گیا۔ اس سے مجھے

بھی زحمت نہ ہوئی اور اتنے سارے مسلمان بھی تکلیف سے بچ گئے۔ ورنہ تکلفات میں کلفت ہی کلفت تھی۔ سادگی میں جو بات ہے وہ تکلیف میں کہاں"۔

سلسلۂ توجہ حضرت تھانویؒ حاجی صاحبؒ سے واپس آنے کے بعد بھی ان کی توجہات و عنایاتِ خاص کا مرکز رہے۔ جیسا کہ مکتوبات امدادیہ کے حسب ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے:۔

۱۔ آپ کے کوائف باطنی سن کر بہت جی خوش ہوا۔ اللہ تعالےٰ کا ہزار ہزار احسان ہے کہ آپ کو یہ نعمت عطا فرمائی۔ آپ کے سب حالات ماشاء اللہ محمود ہیں۔ انشاء اللہ آپ کو خود ان کی محمودیت معلوم ہو جائے گی۔ خدا کا شکر بجا لایئے اور اس سے زیادتی کے شب و روز طالب رہیئے۔

۲۔ تم کو چاہیئے کہ ہمیشہ اپنے حال سے اور جو کوئی کیفیت جدید اپنے زمرہ والوں میں پیش آئے۔ اس سے مطلع کرو۔

۳۔ وہ مسبب الاسباب ہے سب سامان آپ کے درست کر دے گا۔ انشاء اللہ آپ کو کوئی تردد نہ کرنا پڑے گا۔

۴۔ اپنے کام میں لگے رہو۔ خدا خود ہادی و مددگار رہے۔ خاک سے کیمیا کر دے۔ تو کچھ عجب نہیں

۵۔ دین کو خوب مضبوط پکڑنا۔ دنیا خود ہی اچھی صورت میں خدمت کو حاضر رہے گی۔ اپنے مقصد کا خیال سب پر مقدم رکھنا چاہیئے۔

۶۔ کوائف معلوم ہوئے نہایت خوشی حاصل ہوئی۔ انشاء اللہ تعالےٰ یوماً فیوماً ازدیاد انوار باطنی ہوگی۔ اور خلق اللہ کو آپ کے ذریعہ سے فائدہ عظیم ہوگا۔ ہر وقت ایک خیال خاص تمہاری طرف رہتا ہے۔

۷۔ باطن فقیر ہر وقت آپ کے ساتھ بلکہ آپ کے پاس ہے۔ محبت قلبی چاہیئے۔ اس کی بدولت سب کچھ ہوتا ہے۔

۸۔ میرا تعلق خاطر تمہاری جانب مصروف ہے۔

۹۔ آپ کے لئے ایک عبا سبز رنگ بدست شاہ بہاء الدین صاحب دستی روانہ کیا گیا ہے قبول فرما دیں اور اپنے تصرف میں لاویں۔

۱۰۔ آپ سے خلق کثیر کو فائدہ ہوگا۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ وقت آخر ہے۔ دعا خاتمہ کا طالب

ہوں۔

۱۱۔ فقیر کے حق میں دعائے حسن خاتمہ کریں۔

مکتوباتِ امدادیہ کے استقصار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب پر حضرت تھانوی کا تمام تر مستقبل بوجہ فراست ایمانی بالکل منکشف تھا جس کا ثبوت ان پیشگوئیوں سے ملتا ہے۔ جن سے مکتوبات بھرے پڑے ہیں۔

حاجی صاحب صرف مکتوبات کے ذریعہ ہی توجہ نہیں فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ گاہے گاہے حاجیوں کی زبانی بھی حضرت کو اس عنوان سے سلام بھیجا کرتے تھے۔ کہ

"ہمارے مہین (دقیقہ رس نکتہ شناس اور لطیف المزاج) مولوی سے سلام کہہ دینا۔"

غرضیکہ حضرت حاجی صاحب کی توجہات و عنایات بعض حیثیتوں کے اعتبار سے جس نوعیتِ خاص کی حضرت تھانویؒ پر تھیں۔ ویسی کسی خادم پر نہ تھیں۔ کیونکہ آپ کو ہی ان کا سجادہ نشین بننا تھا۔

شرفِ جانشینی چونکہ علم الٰہی میں یہ طے ہو چکا تھا۔ کہ حضرت تھانویؒ نے ہی حضرت حاجی صاحب کا جانشین ہونا تھا۔ اسلئے حاجی صاحب کی خاص نظر عنایت اخیر تک حضرت پر رہی۔ آپ کے تمام حالات ظاہری و باطنی سے باخبر رہ کر اس وقت کا انتظار کرنے لگے کہ آپ کو وہ مقام جانشینی کب نصیب ہوگا۔ چنانچہ جب حق تعالیٰ کے فضلِ خاص سے حضرت کو وہ مقامِ باطنی حاصل ہو گیا۔ تو آپ نے حاجی صاحب کو اس کی اطلاع دی۔ ان دنوں آپ بیمار تھے۔ یہ خبر سنتے ہی اتنی مسرت ہوئی کہ افاقہ محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ اپنے مکتوب مورخہ ۲۵ صفر ۱۳۱۶ھ میں لکھتے ہیں:۔

"سلام علیکم۔ چو دورِ خاطری گر از چشم دوری بدل حاضری۔ راحت نامہ مشعر احوال باطنیہ العزیزہ مع کوائف متعلقہ وصول ہوا۔ آپ کے مژدۂ ترقیات باطنیہ نے کمال مسرور کیا۔ اللہ تعالیٰ شب و روز ترقی مزید فرماوے۔ میں ہر وقت دست بدعا ہوں۔ گو اس وقت میری طبیعت اچھی نہ تھی۔ مگر آپ کی کیفیت سن کر بہت جی خوش ہوا۔ جس سے افاقہ ظاہری ہونے لگا۔"

اس مقام کے حاصل ہونے کے کچھ عرصہ بعد آپ حسب وصیت حضرت حاجی صاحب تھانہ بھون تشریف لے گئے جس کی اطلاع پر حضرت حاجی صاحب نے مورخہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ کو یہ مکتوب روانہ

فرمایا:-

"بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا۔ آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سر نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں۔ اور خیال رہتا ہے۔"

جب آپ حاجی صاحب کی خواہش کے مطابق مدرسہ و مسجد کو آباد کر چکے اور سلسلہ رشد و ہدایت جاری ہو گیا۔ تو پھر آپ کو جانشینی کی یوں نوید دی کہ:-

"خط آپ کا پہنچا۔ نہایت مسرت ہوئی۔ اللہ آپ کو جمیع مقاصد دارین سے فیض یاب کرے۔ اور محبت اور خیال آپ کا بیان کرنا حاجت نہیں۔ دل کو دل سے راہ ہے ..... عزیزم ..... کو سلسلۂ بیعت عثمانی میں داخل کیا ہے۔ آپ ان کو شغل اذکار بتا دیں۔ آپ کافی ہیں۔ جو طالب ہو۔ اُن سب کو ذکر و اشغال بتانے کی اجازت عامہ آپ کو ہے۔ میرا ہر وقت خیال آپ کی طرف ہے" (مکتوب مورخہ ۱۱ محرم الحرام ۱۳۱۶ھ)

اس اجازت عامہ کے بعد آپ نے حضرت کو جانشینی کی اطلاع اپنے آخری مکتوب مورخہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ میں یوں دی کہ:-

"اب مناسب حال ہر شخص کی آپ خود تعلیم کریں ..... اب تو آرزو یہی ہے کہ اللہ تعالٰے اس دار فانی سے جلد بلا لے۔ فقیر جملہ احباب کے لئے دعا کرتا ہے اللہ تعالٰے فائز المرام کرے۔ گفتگو کی طاقت نہیں۔ ضعف کی یہ حالت ہے کہ ایک جانب سے دوسری جانب کروٹ لینا مشکل ہے۔"

اور اس آخری خط کے دو ماہ بعد حضرت حاجی صاحب اس دار فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے اور حضرت تھانوی نے بالکل الٰہی کے طریق پر سلسلۂ فیض جاری کر دیا۔

غلبۂ حال

راہِ سلوک انسان کو جس طرح دنیوی اور دینی ترقی کے لئے مختلف مدارج سے گزرنا پڑتا ہے اسی طرح اسے اصلاح ظاہر و باطن کے لئے بھی مختلف منازل طے کرنی ہوتی ہیں اصلاح باطن کے سلسلہ میں وہ جن راستوں سے گزرتا ہے۔ انہیں اصطلاح صوفیہ میں راہ سلوک کہتے

ہیں۔ اور جن منازل پر پہنچتا ہے : انہیں مقامات کہا جاتا ہے اور ہر مقام مقامِ ماسبق سے ارفع ہوتا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی راہ یا مقام ایسا نہیں جس کی کتاب وسنت سے نشاندہی نہ ہوتی ہو۔

اس راہ کی اولین منزل مرادیت ہے۔ یعنی فطرۃً مناسبتِ تامہ مقدرۃً اہلیت متوقعہ اور ازلاً محبوبیتِ عامہ حاصل ہونا۔ جس پر حضرت تھانوی عالمِ ارواح سے ہی جادۂ پیما تھے۔ اسکی دوسری منزل شوق کہلاتی ہے۔ یعنی جس جس محبوب چیز کا من وجہ علم ہو اور من وجہ علم نہ ہو۔ اس کو بکمالہ جاننے اور دیکھنے کی خواہش طبعی ہونا۔ اور اس کے سلسلہ میں محبت پیدا کرنا۔ یہ شوق ہی تھا۔ جس نے حضرت تھانوی کے دل میں علم اور اہل علم۔ دین اور اہل دین کی محبت پیدا کر دی۔ اور جو حضرت تھانوی کو اربابِ ولایت و معرفت کی خدمت میں کشاں کشاں لے جاتا رہا۔ اس سے اگلی منزل انس کہلاتی ہے۔ حضرت تھانوی کے الفاظ یہ ہیں :-

"جو چیز من وجہ ظاہر اور معلوم ہو اور من وجہ مخفی اور مجہول ہو۔ اگر وجوہ مخفیہ پر نظر واقع ہو کر اس کے ادراک کی خواہش ہو۔ اس کو شوق کہتے ہیں۔ اور اگر وجوہ معلومہ پر نظر واقع ہو کر اس پر فرح و سرور ہو اس کو انس کہتے ہیں۔ یہ فرحت کبھی یہاں تک غالبہ کرتی ہے کہ مطلوب کے صفات جلال پیش نظر نہیں رہتے اور اس وجہ سے اس کے اقوال و افعال میں کسی قدر بے تکلفی ہونے لگتی ہے۔ اس کو انبساط اور ادلال کہتے ہیں"۔ (تعلیم الدین صہ ۶۸)

چنانچہ جب حضرت تھانوی اپنے شیخ کی خدمت بابرکت میں جا کر رہنے لگے۔ تو ان کی نظرِ توجہ سے وہ شوق مبدل بہ انس ہو گیا۔

ان کیفیاتِ لطیفہ کے بھی مختلف مقامات ہوتے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے ارفع ہوتے ہیں۔ مثلاً بقول حضرت تھانوی اگر۔

"بسط کے بعد قبض لاحق ہو گیا۔ تو یہ قبض اس بسط سے ارفع ہو گا۔ اور اگر اس قبض کے بعد پھر بسط ہو گا۔ تو یہ بسط اُس قبض سے بھی نیز پہلے بسط سے بھی ارفع ہو گا"۔

غلبۂ شوق

حضرت تھانویؒ جب اپنے شیخ کے پاس رہ کر فیوض ظاہری و باطنی سے اپنا دامنِ مراد بھر لائے۔ تو اس نے شوق کو تیز تر کر دیا۔ جو پہلے شوق و انس سے ارفع و اعلیٰ ثابت ہوا۔ چنانچہ صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں کہ :-

"حضرت پر اپنے پیر و مرشد کی خدمت سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد پھر کیفیت شوقیہ الٰہیہ کا نہایت جوش و خروش کے ساتھ ورود ہوا۔ اور حالت سابقہ نے عود کیا۔ مگر اب کی بار اُس کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ قبل حاضری جو کیفیت شوقیہ تھی۔ اس میں اضطراب تھا۔ اس میں اشتیاق۔ اُس میں پریشانی تھی۔ اِس میں انبساط۔ اُس کی لذت ایک گونہ ناگوار تھی۔ اس کی خوشگوار۔ وہ سیر الی اللہ تھی۔ یہ سیر فی اللہ۔ وہ درد و سوزش طریق تھی۔ یہ طواف کعبۂ مقصود۔ وہ عدم وصول سے ناشی تھی یہ وصول سے۔ وہ وقت طلب تھا۔ یہ وقت وصول تھا۔ وہ زمانِ ہجر تھا۔ یہ زمانِ وصال۔ وہ دورِ حسرت تھا یہ دورِ شوق۔ وہ تلوین تھی۔ یہ تمکین۔ وہ حالت مشاہدہ سے قبل کی تھی۔ یہ بعد کی۔ دوا نہ عشق کا تھا۔ یہ اثر حسن۔ بمصداق قطعہ حضرت حافظ شیرازیؒ ؎

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت   واندراں برگ و نوا خوش نالہ ہائے زار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست   گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

غرض اس مرتبہ کی بے چینی بخلاف پچھلی مرتبہ کی بے چینی کے بڑے مزے کی بے چینی تھی۔ کیونکہ یہ بے چینی غایت انس مع اللہ سے ناشی تھی گویا شوق و انس دونوں سے مرکب تھی اور بجائے آثار اضطراب آثار اشتیاق نمایاں تھے جس کا یہ اثر ہوا کہ مدرسہ کا رنگ ہی بدل گیا۔ درسی کتابوں کا سبق ہو رہا ہے۔ اور ادنیٰ مناسبت سے تصوف کے مضامین کی دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں اور طالب علموں پر کیفیت جذبیہ طاری ہو رہی ہے۔ بہت سے مدرسین اور طلبہ نے ذکر و شغل شروع کر دیا۔ اور حالات عجیبہ و کیفیات غریبہ کا ورود ہونے لگا۔"

(ص ۲۱۰ جلد ا)

اثرِ توجہ اس ذوق و شوق کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت تھانویؒ نے حلقۂ توجہ قائم کر دیا جس سے مدرسہ خانقاہ میں تبدیل ہو گیا۔ اُس وقت کے جوش و خروش کے متعلق خود حضرت فرمایا کرتے تھے۔ کہ "بس جی یہ چاہتا تھا کہ ساری دنیا کو ذاکر و شاغل اور ولی کامل بنا دوں"۔ یہ کیفیت صرف حضرت کی ہی نہ تھی۔ بلکہ جس پر بھی حضرت کی توجہ ہوتی۔ وہی صاحبِ حال ہو جاتا۔ بقول حضرت مجذوبؒ اس زمانہ میں حضرت کے قوی الحال اور باکمال خلیفہ لطف الرسولؒ کی یہ حالت تھی کہ اکثر کسی شعر یا کسی بات پر ایسی شدید کیفیت طاری ہوتی کہ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے۔

بے اختیار چیخنے چلانے لگتے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے۔ ایک مرتبہ وہ حضرت مجذوبؒ کے ساتھ منصوری جارہے تھے۔ جب چڑھائی چڑھ چکے۔ تو بہت تکان محسوس کرنے لگے اور ناگواری کی شکایت کی۔ جس پر حضرت مجذوبؒ نے فرمایا ؎

یہ شکوہ بے وفائی کا یہ رونا کج ادائی کا
سزا ہے دل لگانے کی مزہ ہے آشنائی کا

بس اس شعر کے سنتے ہی تکان و تعب تو دور ہوگیا۔ مگر جوش و خروش سوار ہوگیا۔ اور چیخ مار کر وجد میں رقص کرنے لگے۔ غرضیکہ ان کی مغلوبیت کا یہ عالم تھا کہ حضرت تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ اس قدر خوف و خشیت کا غلبہ میں نے کسی پر نہیں دیکھا۔ جب وہ غلبہ حال میں باتیں کرتے۔ تو ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے ان کا اس وقت کلیجہ پھٹا جارہا ہو۔ حضرت تھانویؒ کے اس ابتدائی جوش و خروش کو وہ اخیر وقت تک نہ بھول سکے۔ بلکہ اکثر اس توجہ کے طالب رہتے تھے۔ جس پر حضرت بغرض تسلی فرمایا کرتے تھے کہ:-

"وہ کیفیات سابقہ نفسانی تھیں اور موجودہ کیفیات لطیفہ روحانی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں وہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس زمانہ کی توجہ کے آثار کی مثال ایسی تھی۔ جیسے بڑے زور کی بارش ہو کر ایک دریا سا بہہ گیا۔ اور پھر نہ بادل رہا۔ نہ پانی۔ زمین بدستور خشک کی خشک اور آج کل کی کیفیات کی ایسی مثال ہے۔ جیسے لگاتار پانی کی پھوار برس رہی ہو۔ جس کو جھڑی لگ جانا کہتے ہیں۔ گو دیکھنے میں تو پھوار ہے۔ جو زور کی بارش کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ زمین کے اندر پیوست ہوتی چلی جارہی ہے۔ ریلے کی طرح نہیں کہ ایک ساتھ بہتا ہوا نکل گیا۔ اور زمین کے اندر کچھ اثر ہی نہ پہنچا زمین تو کاشت کے قابل ایسی ہی ہلکی ہلکی اور جمی ہوئی بارش سے ہوتی ہے۔"

چونکہ حضرت کی توجہ سے اکثر طلبا ذاکر و شاغل ہو گئے تھے۔ اسلئے ان میں عام طور پر ایسی کیفیات کا مشاہدہ ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن ایک ایسا طالب علم جس نے حضرت کی دیکھا دیکھی ان کے مشورہ کے بغیر ذکر و شغل شروع کردیا تھا۔ ایک مولوی صاحب سے بوستاں کا سبق پڑھ رہا تھا۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے ؎

نہ دوری دلیل صبوری بود ۔ کہ بسیار دوری ضروری بود

تو اس پر ایسی شدید کیفیت طاری ہوئی کہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہوئے بازار کو نکل گئے جو بھی ملتا۔

خواہ مسلم خواہ غیر مسلم سب کو کہتا کہ پڑھو لا الٰہ الا اللہ۔ اس کے اثر کا یہ حشر تھا کہ ہندو بھی بے اختیار ہو کر لا الٰہ الا اللہ کہنے لگتے۔ اس کی حالت غیر دیکھ کر اس کے ماموں پریشان ہونے لگے۔ حضرت نے فرمایا کہ "میاں پریشان ہونے کی کیا بات ہے آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ آپ کا بھانجہ ولی ہو گیا۔" جب کسی طرح بھی اس کیفیت میں کمی واقع نہ ہوئی۔ تو حضرت نے ایک صاحبِ تصرف درویش میاں خاکی شاہ کے پاس سلب کیفیت کے لئے بھیجا۔ انہوں نے کہا:-

"یہ عجیب بات ہے کہ گولی تو ماردی خود۔ اور اب نکلوانے بیٹھے ہیں مجھ سے۔"

غرضیکہ انہوں نے اس پر توجہ کا عمل کر کے دوسرے روز پھر آنے کو کہا۔ رات کو اس طالب علم کو سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی۔ جو فرما رہے تھے کہ "اس فقیر سے کہہ دینا کہ کیا تیری شامت آئی ہے۔ جو اس نعمت کو سلب کرتا ہے۔" حضرت نے جب یہ خواب سنا۔ تو اسے درویش کے پاس جانے سے روک دیا۔ اور اس کے لئے سماع تجویز کر کے ایک صاحب سماع صوفی سے کہا کہ اسے ذرا اپنے ہاں لے جا کر سماع میں شریک کریں۔ اگرچہ یہ ہمارے مسلک کے خلاف ہے لیکن بغرض دوا ایسا کیا جا رہا ہے۔ مگر حضرت کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ آلات سے سماع سنتے ہیں اس لئے جب وہ لڑکا وہاں پہنچا۔ تو آلاتِ سماع دیکھ کر بہت بگڑا۔ کہ یہ کیا واہیات بات ہے۔ مجھے کیوں معصیت میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ میں ان سب کو توڑ دوں گا۔ گویا وہ دیوانہ بھی فرزانہ نکلا۔ اور بھاگ کر حضرت کے پاس آ گیا۔ اس پر حضرت نے اسے ایک خوش آواز بنگالی طالب علم کے سپرد کیا۔ جس کی آواز میں بڑا سوز و گداز تھا کہ اسے خلوت میں لے جا کر کچھ اشعار سنا دو۔ اس نے حضرت خسرو کی یہ غزل سنانی شروع کی کہ

از ہجر تو دل کباب تا کے، جاں در طلبت خراب تا کے
در مصحفِ روئے او نظر کن خسرو غزل و کتاب تا کے

اس کو سنتے ہی وہ وجد میں آیا۔ اور بڑے زور سے تا کے۔ تا کے کہتا رہا۔ یہاں تک کہ دل کی ساری بھڑاس نکل گئی۔ اور مکمل سکون نصیب ہو گیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر شرفِ زیارت بخشا اور فرمایا کہ تم کسی سے بیعت ہو جاؤ۔ اس نے عرض کیا کہ حضور کس سے؟ فرمایا "جس سے اعتقاد ہو۔" چنانچہ اس نے حضرت سے یہ خواب بیان کیا۔ آپ نے بھی اس کی تعمیل کرنے کو فرمایا کہ جس سے اعتقاد ہو بیعت ہو جاؤ۔ اس نے کہا کہ مجھے تو آپ سے اعتقاد ہے۔ لہٰذا آپ بیعت فرما لیجئے۔ چونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا۔ اسلئے آپ نے بیعت کے تمام ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر

اسے فوراً بیعت کر لیا۔ غرضیکہ حضرت کی توجہ ایسی ہوتی تھی کہ دیولسنے بھی فرزانے ہی رہتے تھے۔ اور ولایت کے ایسے مقامِ رفیع پہ پہنچ جاتے تھے کہ خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بہ مسرت انکی دستگیری فرماتے تھے۔

کیفیتِ اضطرابیہ مقاماتِ محصلہ میں حضرت کو رسوخ حاصل ہو گیا۔ تو اب مقاماتِ متوقعہ کی طلبِ شدید کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور پھر وہی کیفیتِ اضطرابیہ والتہابیہ عود کر آئی۔ جو مکہ مکرمہ کے قیام سے پہلے تھی۔ لیکن ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ کیونکہ وہ کیفیتِ طلبِ ابتدائی سے ناشی تھی۔ اور یہ طلبِ مزید سے۔ مگر یہ تشنگیٔ طلب حقیقت شناس ولایت آشنا ہونے کے باوجود بھی پہلے سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اسلئے آپ کو حسبِ سابق اپنے پیر و مرشد کے سمندر پار ہونے کی وجہ سے کسی دستگیری کی فوری اور شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ مگر سوائے اپنے شفیق ماموں پیر جی امداد علیؒ کے اور کوئی ایسا ولی اللہ نظر نہ آیا۔ جو ایسے وقت میں دستگیری کر سکتا اسلئے آپ نے پھر بامرِ مجبوری ان کی طرف رجوع کیا۔ مگر ان کی توجہ خاص سے پورا افاقہ نہ ہوا۔ بلکہ وہ عارضی ثابت ہوا۔ کیونکہ پیر جی کی حالت بے تکلف شریعت پر منطبق نہیں ہوتی تھی۔ اسی لئے ہونے والے محیٔ سنت۔ ماحیٔ بدعت اور مجددِ ملت کی طبیعت یہ رنگ قبول نہ کر سکی۔

چونکہ اس اضطراب کا اصل سبب حسبِ ارشاد حضرت تھانویؒ حصولِ مقصود کی غایتِ عجلت اور احوال و کیفیاتِ غیر اختیاریہ کی شدیدِ طلب و رغبت تھی۔ اس لئے یہ اضطراب اتنا بڑھا کہ سارے مشاغل سے دل اچاٹ ہو گیا۔ نہ درس و تدریس سے دلچسپی رہی نہ افاضہ ظاہری و باطنی کا شوق رہا۔ مشاہرہ پانے کی وجہ سے درس و تدریس کا فرض تو بدستور انجام دیتے رہے مگر وعظ و تلقین وغیرہ کا شغل قطعاً بند کر دیا۔ کہ جب انسان کو اپنی ہی فکر پڑی ہوئی ہو۔ اسے دوسرے کی فکر کا کب ہوش رہتا ہے۔ اسلئے آپ نے سب غیر ضروری مشاغل ترک کر کے یکسوئی اختیار کر لی۔

غلبۂ عبدیت یکسوئی اختیار کرنے کے بعد چونکہ آپ نے وعظ کہنا موقوف کر دیا۔ جس کے اہل کانپور بے حد دلدادہ و گرویدہ اور شروع قیامِ کانپور سے ہی لذت چشیدہ تھے اسلئے وعظ کے موقوف ہونے سے اہل کانپور میں سخت ہلچل مچ گئی۔ جو تشنگانِ علوم و معارف اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہتے تھے۔ وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگے مختلف اطراف سے حضرت پر وعظ کہنے کے لئے زور ڈالا جانے لگا۔ یہاں تک کہ خود بانیٔ مدرسہ جامع العلوم عبد الرحمن خاں مرحوم و مغفور جو ایک معمر اور صالح بزرگ تھے۔ حضرت کی خدمت میں بے تابانہ پہنچے۔ اور والہانہ

شعر پڑھا ؎

نصابِ حسن درحدِّ کمال است   زکاتم دہ کہ مسکین و فقیرم

مگر حضرت نے غلبۂ عبدیت سے بے حال ہو کر نہایت دردناک لہجہ میں فرمایا کہ:۔

"حضرت میں تو خود ہی فقیر ہو رہا ہوں۔ دوسرے کو کیا دوں"

کیونکہ حضرت سمجھتے تھے کہ وعظ کہنے میں بھی ایک صورت ترفع اور دعویٰ کی ہوتی ہے۔ اسلئے غلبۂ عبدیت کی وجہ سے اس کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

غلبۂ توحید۔ اسی زمانہ میں حضرت کے مدرسہ کا سالانہ جلسہ ہوا۔ جس میں باہر سے بھی علماء کرام تشریف لائے۔ جب اراکین مدرسہ کی درخواستِ وعظ کی شنوائی نہ ہوئی۔ تو وہ اکابر علماء کو ساتھ لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے واسطہ سے وعظ نہ کہنے کے فیصلہ پر نظرِ ثانی کی درخواست کی۔ ان حضرات نے بھی کم از کم مدرسہ کے جلسہ کے لئے وعظ کہنے کیلئے اصرار فرمایا۔ اس سے حضرت کو بہت تنگی ہوئی۔ ان کے ادب و احترام اور اپنی مجبوری و معذوری کی وجہ سے زبان سے اقرار یا انکار کی ہمت تو نہ ہوئی۔ لیکن گردن جھکا کر رونے لگ پڑے۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر مولانا ظہور الاسلام فتحپوریؒ کا دل پانی پانی ہو گیا۔ اور بے اختیار کہہ اٹھے ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا   ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اصرار سے روک دیا کہ بس انہیں اب کچھ نہ کہو۔ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ ایک موقعہ پر لوگوں نے مولوی شاہ سلیمان پھلواروی سے بھی سفارش کرانی چاہی۔ جو وہاں آئے ہوئے تھے۔ مگر انہوں نے سفارش کرنے سے بایں وجہ انکار کر دیا کہ:۔

"اگر ایسی حالت میں اس شخص سے وعظ کہلوایا۔ تو بس ممبر پر بیٹھتے ہی اس کے منہ سے جو پہلا لفظ نکلے گا۔ وہ "انا الحق" ہو گا۔ ایسی حالت میں اصرار مناسب نہیں"

غرضیکہ حضرت تھانویؒ کا سکوت اس بات کا مصداق تھا کہ ع خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید۔

چنانچہ حضرت خود فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"اس زمانہ میں مجھ پر توحید کا بہت غلبہ تھا۔ اسلئے میں نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ نہ جانے منہ سے کیا نکل جائے۔ جس سے عوام کو غلط فہمی ہو کر دینی نقصان پہنچ جائے۔ صرف مولوی محمد اسحاق صاحب بردوانی سے (جو ایک فہیم و جید عالم اور حضرت کے معتقد

خاص شاگرد تھے، ان مضامین توحید کو جو قلب پر وارد ہوتے تھے۔ خلوت میں بیان کر دیتا تھا۔ اُس زمانہ میں اُن پر شانِ علمی غالب تھی۔ اور تصوف سے زیادہ متاثر نہ تھے۔ لیکن پھر بھی ان پر اتنا اثر ہوتا تھا کہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے تھے۔ اور میرے مضامین کی تصدیق پر مضطر ہو جاتے تھے۔"

گویا حضرت کو غلبۂ حال میں بھی مصلحتِ عامہ کا اتنا خیال تھا کہ اپنی زبان روک رکھی تھی۔

اعتراض و اعتراف

غلبۂ حال کے اسی زمانہ میں آپ عید کے موقع پر وطن تشریف لائے اور بعد نماز عید حسب عادت اہل قصبہ درگاہ شاہ ولایتؒ میں بموجودگی مجمع عام بغرض فاتحہ حاضر ہوئے۔ وہاں سب کے سامنے ایک صاحب نے حضرت سے اعتراضاً کہا کہ آپ کو اپنے ماموں پیرجی امداد علیؒ سے رجوع نہ کرنا چاہیئے تھا۔ یہ آپ کی شانِ علمی کے خلاف ہے۔ کیونکہ پیرجی کے حالات مطابق شریعت نہیں۔ حضرت تھانویؒ قیل و قال کرنے اور اعتراض کا جواب دینے کی بجائے سارے مجمع کے سامنے معترض کے قدموں پر گر پڑے۔ اور قطع نزاع کے لئے اعترافِ قصور کرتے ہوئے فرمایا:-

"ہاں صاحب ہاں! میں واقعی سرتاپا قصور و خطا ہوں۔ خدا کے لئے معاف کیجئے۔ قیل و قال نہ کیجئے۔ بس رہنے دیجئے۔ میں خود ہی تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس سے بھی زیادہ برا ہوں جتنا آپ مجھے سمجھ رہے ہیں۔"

یہ صورتِ حال صرف غلبۂ عبدیت نے پیدا کر رکھی تھی۔ ورنہ حضرت تھانویؒ نے پیرجی صاحب کی طرف دوبارہ جو رجوع کیا۔ اس کی معقول وجوہات موجود تھیں۔

وجوہِ رجوع

۱۔ خود حاجی صاحب کی طرف سے اس کی اجازت تھی۔ جو اکثر اپنے متوسلین سے فرمایا کرتے تھے کہ:-

"سب صاحبان سن لیں۔ میں اپنا بندہ نہیں بنانا چاہتا۔ خدا کا بندہ بنانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ خدا مقصود ہے۔ شیخ مقصود نہیں۔ میرے پاس جو کچھ تھا۔ وہ حاضر کر دیا۔ اگر اس سے زیادہ کی طلب ہو۔ تو میری طرف سے عام اجازت ہے۔ جہاں سے چاہیں مقصود حاصل کریں اور اگر کسی دوسرے شیخ سے بیعت کی ضرورت ہو۔ تو بیعت کی بھی اجازت ہے۔"

۲۔ اسی لئے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ:-

"مجھے اس زمانہ میں بہت ہی زیادہ شوقِ طلب عارض تھا۔ اور گو میں نے اپنے ذہن میں

طے کر رکھا تھا کہ اخیر میں اپنے حضرات ہی سے بالخصوص ہندوستان میں حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز سے رجوع کرونگا۔ لیکن اس احتمال پر کہ شاید کوئی خاص دولت اور جگہ بھی ہو۔ تو لاؤ اسے بھی حاصل کر لیں۔ اور یہ حضرات تو اپنے ہی ہیں۔ تو ان سے تو آخر میں بہر حال رجوع کرنا ہی ہے۔ اور اگر اپنے حضرات سے پہلے رجوع کر لیا۔ تو پھر کسی دوسرے سے رجوع کرنا باعث بے ادبی ہوگا۔"

۳۔ حاجی صاحب سے خط و کتابت کرنے کے لئے بوجہ بعد مکانی بہت طویل مدت درکار تھی۔ اور یہاں عجلت طلب اور پے در پے تغیرات احوال کا یہ مقتضا تھا کہ جلد جلد عرض حال کیا جائے اور جہاں کہیں سے بھی ہو۔ جلد سے جلد مقصود حاصل کیا جائے۔

اسلئے آپ کا پیر جی صاحب کی طرف رجوع کرنا جبکہ وہ آپ کے قریبی رشتہ دار یعنی ماموں بھی تھے کوئی غلط اقدام نہ تھا۔ مگر اب حضرت تھانوی اس مقام پر پہنچ چکے تھے۔ جو پیر جی کی دسترس سے باہر تھا اس لئے ان کی تدابیر سے افاقہ و تسلی کی بجائے پریشانی و اضطراب میں متواتر اضافہ ہوتا گیا جس سے حضرت تھانوی بہت گھبرائے اور تمام صورت حال سے اپنے شیخ حضرت حاجی صاحب کو مطلع کیا۔

اضطراب شیخ جس سے ان کو بھی انتہا پریشانی ہوئی۔ حضرت کا خط لے جانے والے کا بیان ہے کہ:۔

"جس وقت آپ کا خط حاجی صاحب نے پڑھا۔ تو بہت گھبرائے۔ کبھی گھر کے اندر تشریف لے جاتے اور کبھی باہر تشریف لے آتے۔ اور بار بار فرماتے کہ "جوان آدمی ہے۔ غلبہ ہو گیا ہے تحمل نہیں ہو سکا۔ مگر میں اتنی دور ہوں کیا کروں"۔ میں نے عرض کیا کہ میں جلدی جانے والا ہوں۔ یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور اس خط کا جواب لکھوا کر میرے حوالے کیا۔ اور زبانی فرمایا کہ ان سے کہہ دینا کہ جب تک تمہارا یہ خادم زندہ ہے۔ کیوں کسی دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہو۔"

اس کے باوجود شیخ سے اپنے مرید کی حالت زار دیکھ کر تحمل نہ ہو سکا۔ اور فوراً خواب میں آکر فرمایا کہ "پیر جی کے پاس نہ بیٹھا کرو۔ ورنہ خارش ہو جائے گی"۔

سامان تسکین جونہی خط کا جواب لانے والے واپس وطن پہنچے۔ حضرت تھانوی ان کی آمد کی خبر سنتے ہی پروانہ وار گرمی کے موسم میں عین دوپہر کے وقت جبکہ سخت لو چل رہی تھی۔

اور دھوپ تیز تھی۔ ان کے پاس پہنچے۔ خط اور پیغام وصول کیا۔ خط کھولا تو اس میں لکھا تھا۔

"بعد دعوات ترائد ذوق و شوق مع الجمعیت و انشراح و انبساط خاطر تو اضح باد۔ خط آں عزیز رسید۔ کیفیت حالات معلوم شد۔ نوشتہ بودند کہ از تدبیر (پیرجی صاحب) قدرے افاقہ دست دادہ است۔ ایں چنیں افاقہ ظنی و مستعار است۔ قیام پذیر نیست۔ در قلق نزد صاحب موصوف اجازت طلبیدہ بودند۔ از طرف فقیر اجازت است اما اوراد و اشغال مختلف بحالت تلوین ہم زیان است۔ زیرا کہ اثر ہر یک جداگانہ است ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ بدانکہ باعث تفرقہ و تشویشات خاطر بچند وجہ فرمودہ اند۔ الی قولہ ایں علاج در ضیاء القلوب از صفحہ ۲۵ تا صفحہ ۵۵ مرقوم است۔ بعمل آرند۔ انشاء اللہ تعالیٰ طبیعت صلاح و فلاح پذیر خواہد شد۔ خاطر جمع دارند۔ ثم الی قولہ باقی حالات ایں جا زبانی مولوی عبد الرزاق صاحب معلوم خواہد شد۔

... فقط (مکتوبات امدادیہ نمبر ۲۳)

حضرت حاجی صاحب کی دعا و توجہ اور پیغام و خط کا اتنا اثر ہوا کہ حضرت فرماتے تھے:۔

"تدابیر مرقومہ مکتوب کے استعمال کی ضرورت ہی واقع نہ ہوئی۔ زبانی پیغام سنتے ہی اور خط پڑھتے ہی تسلی ہو گئی۔ مغرب تک مطلع بالکل صاف تھا۔ اور پریشانی کا نام و نشاں بھی نہ رہا۔ کامل سکون ہو گیا۔"

اس طرح حضرت حاجی امداد اللہؒ نے کئی سمندر پار بیٹھے ہوئے حضرت کو بعجلت تمام بحر تحیر و توحش سے نکال کر ساحل سکون پر پہنچا دیا۔

اطلاعِ انقطاع

ساحلِ مراد پر پہنچتے ہی حضرت تھانوی نے پیرجی صاحب سے قطع تعلق کر لیا۔ اس کی انہیں اطلاع کرنی ضروری تھی تاکہ وہ بھی اپنی توجہ ہٹا لیں۔ مگر ادب مانع تھا۔ آخر ضرورتِ شرعیہ غالب آئی اور ایک تبلیغی خط کے ذریعہ آئندہ تعلق استفاضہ و استفادۂ باطنی رکھنے سے بربنائے شریعت مقدسہ صاف عذر فرما دیا۔ یہاں تک کہ بحیثیت مقتدائیت بمصلحتِ حفظ عوام قرابتِ قریبہ کے باوجود آمد و رفت بھی ترک کر دی۔ اس اطلاع کے باوجود پیرجی صاحب نے ایک خط کے ذریعہ آپ کو مطلع کیا کہ:۔

امانتِ علیؓ

"مجھے ایک چیز حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سینہ بسینہ بطور امانت پہنچی تھی تم جوان صالح تھے۔ اور اس امانت کے اہل تھے۔ میں نے تمہیں وہ امانت

دینی چاہی تھی۔ لیکن تم نے لینا ہی نہ چاہا۔ اگر اب بھی لینا چاہو۔ تو میں وہ امانت تمہیں دینے کو تیار ہوں۔"

جس کے جواب میں حضرت نے لکھا:-

"اگر وہ چیز شریعت کے موافق ہے۔ تو میں لینے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر وہ سرمو بھی شریعت کے خلاف ہے۔ تو مجھے اس سے معاف رکھیں۔"

اعترافِ حقیقت غرضیکہ اس طرح حضرت تھانویؒ نے ہمیشہ کے لئے پیرجی سے قطع تعلق کر لیا۔ لیکن ادب ہمیشہ غائبانہ بھی بلحوظ رکھا۔ اور آپ کے ماموں صاحب نے بھی اس قطع تعلق کو محسوس نہ کیا۔ بلکہ اپنے ایک مرید کو لکھا۔ جس نے بعد وہ خط خود حضرت کو دکھایا کہ:-

"بوجہ اختلاف مشرب ان (حضرت تھانویؒ) کی صحبت میں بیٹھنا تو مناسب نہیں۔ لیکن بے ادبی کبھی نہ کرنا۔ وہ اپنا کارِ منصبی انجام دے رہا ہے۔ جو شریعت کی رو سے اس پر واجب ہے۔"

اثرِ اُنس حضرت حاجی صاحب کی تدبیر سے جب آپ کا شوق مبدل بہ اُنس ہو گیا۔ تو اس نے اپنا یہ اثر دکھانا شروع کیا کہ:-

ہر کہ از حق انس گیرد از خلق وحشت گیرد

اور بقول مولانا رومی اس کا یہ نتیجہ نکلا ؎

تا بدانی ہر کرا ایزد بخواند   از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

چنانچہ اُنس مع اللہ کے ساتھ وحشت عن الخلق بھی روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے حضرت تھانوی کو کانپور جیسے محبوب مقام اور درس و تدریس جیسے دیرینہ و دلچسپ شغل سے بھی متوحش کر دیا۔ اور حضرت کو ہر طرح کامل و مکمل بنا کر خالص افاضۂ باطنی کے لئے منجانب اللہ وقف کر دیا۔

ترکِ تعلق اس طرح حضرت حاجی صاحب کی یہ پیشگوئی پوری ہو گئی کہ:-
"عجب کانپور سے دل برداشتہ ہو۔ تو تھانہ بھون جا بیٹھنا"

پہلے تو حضرت حاجی صاحب کی اس پیشگوئی پر حضرت تھانوی کو بہت حیرت ہوئی تھی۔ اور آپ نے پریشان ہو کر ان سے عرض کیا تھا کہ:-

"حضرت یہ کیوں فرماتے ہیں؟ میرا دل بھلا کانپور سے کیوں برداشتہ ہونے لگا۔ مجھے تو وہاں کے لوگوں کی محبت اور برتاؤ نے اس قدر مانوس کر دیا ہے کہ میں نے کانپور کو

ہمیشہ کے لئے اپنا وطن ہی بنا لینا تجویز کر رکھا ہے۔"
اور اس کے ساتھ ہی اپنے دل کو یوں تسلی دی تھی کہ
"یہ حضرت نے بہت ہی اچھی قید لگا دی۔ نہ میرا دل کبھی کانپور سے برداشتہ ہو گا
نہ ترک کانپور کی نوبت آئے گی۔"
گر قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ جس بات کا اس وقت حضرت کو یقین نہ آرہا تھا۔ اسے حضرت حاجی صاحب
چشم فراست سے بخوبی دیکھ رہے تھے کہ ایک دن یہ نوبت آکے رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور
حضرت تھانوی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پورے چودہ سال بعد شغل درس و تدریس اور تعلق کانپور
بمصداق ع۔

قال را بگذار مرد حال شو

ہمیشہ کے لئے ترک کر بیٹھے۔

ترکِ ملازمت

چودھویں صدی کے مجدد حضرت تھانوی چودھویں صدی کے آغاز میں ہی یعنی صفر ۱۳۰۱ھ میں
بسلسلہ ملازمت مدرسہ کانپور تشریف لائے تھے۔ جبکہ آپ کی جوانی کا آغاز تھا۔ ابھی ریش مبارک نہ
آئی تھی۔ جس کی وجہ سے ادائل میں باریش طلبا آپ سے سبق پڑھتے ہوئے شرماتے تھے۔ اور
پورے چودہ سال بعد یعنی صفر ۱۳۱۵ھ میں آپ نے "حال" کے تقاضہ پر "قال" کا شغل ترک کرنے کا
قطعی فیصلہ کر لیا جس کا انہیں کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا۔ بلکہ جب آپ کے شیخ نے کانپور سے دل
برداشتہ ہونے کی طرف اشارہ فرمایا۔ تو آپ نے حیرت و استعجاب کا اظہار فرمایا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا
ہے۔ اسے تو میں وطن بنانا چاہتا ہوں۔

مجبوریِ روانگی جب آپ ترک تعلق پر آمادہ ہوئے۔ تو اہل کانپور کی دل شکنی کا خیال دامنگیر ہوا
جو چودہ برس سے آپ کے حسن معاملہ، حسن اخلاق، حسن تعلیم اور حسن تبلیغ کی وجہ
سے آپ کو اپنا رہبر اور امیر سمجھتے تھے۔ اور ساتھ ہی نظام مدرسہ کے درہم برہم ہونے کا اندیشہ لاحق
ہوا۔ جو چودہ برس سے آپ کے زیر اہتمام چل رہا تھا۔ ادھر دل کے ہاتھوں اتنے مجبور ہو چکے تھے
کہ کانپور کے قیام کی ایک ایک گھڑی پہاڑ معلوم ہوتی تھی۔ اور آپ یہاں سے جانے کیلئے سینہ آسا

بے قرار تھے۔ حضرت کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا۔ تو ممکن ہے وہ اپنے ذاتی مفاد پر مصلحتِ عامہ کو قربان کر دیتا مگر حضرت تھانوی ہمیشہ ذاتی مفاد پر مصلحتِ عامہ کو ترجیح دینے کے عادی تھے۔ اسلئے آپ نے اپنے ارادہ ترک تعلق کو پردہ اخفا میں رکھ کر روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

تدبیرِ فراغت چونکہ حضرت تھانوی کو کانپور سے تھانہ بھون کھینچنا مشیتِ الٰہی میں طے شدہ تھا۔ اسلئے حق تعالیٰ نے کچھ اسباب غیب سے پیدا کر دیئے ـــــ اور کچھ تدابیر حضرت کو بروقت سمجھا دی گئیں۔ تاکہ حضرت باطمینان یہاں سے اس طرح واپس جا سکیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور اصرار و تکدر کی نوبت نہ آئے۔ چنانچہ:-

۱۔ غیبی امداد تو یہ ہوئی کہ اس عرصہ میں مدرسہ کی آمدنی کم ہو گئی۔ جس کی بناء پر آپ نے مدرسہ سے تنخواہ لینی بند کر دی۔ اراکین مدرسہ نے اسے محسوس کیا۔ کہ جب آپ تنخواہ نہ لیں گے۔ تو مدرسہ سے تعلق کم کر دیں گے۔ اور خود بھی مالی خسارہ میں رہیں گے۔ اسلئے انہوں نے حضرت کے تنخواہ نہ لینے کی مخالفت کی۔ مگر آپ نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ:-

"مدرسہ پر سب سے زیادہ بوجھ میری پچاس روپیہ تنخواہ کا ہے۔ اسلئے جب تک مدرسہ کو کافی آمدنی نہ ہونے لگے گی۔ میں تنخواہ نہ لوں گا"

۲۔ اس وقت نہ صرف مدرسہ کا تمام اہتمام آپ کے سپرد تھا۔ بلکہ صدر مدرس بھی آپ ہی تھے اس منصب سے خود کو علیحدہ کرنے کے لئے آپ نے یہ تجویز کی کہ ماہانہ روئیداد کار کردگی میں بحیثیت مہتمم یہ اعلان شائع کرا دیا کہ:-

"مدرسین کو بہت دنوں سے ترقیاں نہیں دی گئیں۔ لہٰذا مدرس اول (یعنی خود حضرت) کو تو سرپرست مدرسہ بنایا جاتا ہے۔ اور ان کی جگہ موجودہ مدرس دوئم مولوی محمد اسحاق صاحب بردوانی کو مدرس اول مقرر کیا جاتا ہے۔ اور اسی ترتیب سے سب مدرسین کو ترقی دی جاتی ہے"

اس پر بھی بعض حضرات کو شبہ ہوا اور وہ اس تجویز کی مخالفت کرنے لگے لیکن حضرت نے ان کو لمصلحت اخفا فرمایا کہ:-

"آپ لوگ میری ترقی اور میری سرپرستی کو پسند نہیں کرتے"

اس پر وہ لاجواب ہو گئے۔

۳۔ اسباق کے انتظام کے لئے۔ آپ نے قریب الفراغ طلباء کے اسباق یہ کہہ کر اپنے ذمہ لے

لئے کہ

"اُن کے اسباق مختلف اساتذہ کے پاس ہیں اور وہ زیادہ وقت نہیں دے سکتے ان کو زیادہ وقت کی ضرورت ہے تاکہ جلدی فارغ ہو سکیں۔ اور میرے پاس کافی وقت ہے۔ اسلئے انکے اسباق مجتمعاً میں اپنے ذمہ رکھتا ہوں۔"

تاکہ آپ کے چلے جانے سے کسی طالب علم کا مطلق حرج نہ ہو۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ قریب الفراغ طلبہ کے اسباق سے تو بعد فراغ سبکدوشی ہو جائے گی اور پھر کوئی سبق آپ کے پاس نہ رہ جائے گا۔ اور بقیہ طلبا بدستور دیگر مدرسین سے پڑھتے رہیں گے۔

۴۔ یہ مراحل طے کرنے کے بعد آپ نے اپنی نشست بدلنے کے لئے یہ صورت اختیار کی کہ مدرسہ کی عمارت کو چھوڑ کر مسجد میں آ گئے اور وہیں بیٹھ کر پڑھانا شروع کیا اور اسکی وجہ یہ بیان کی کہ

"فارغین کی جماعت بڑی ہے۔ ان کے لئے مدرسہ کی درسگاہ تنگ ہے۔ نیز چونکہ میں تنخواہ نہیں لیتا۔ مجھ کو مسجد میں تعلیم دینا جائز ہے۔ لہٰذا میں تو مسجد میں پڑھاؤں گا۔ اور میری درسگاہ میں مولوی محمد اسحاق صاحب بردوانی مدرس اول ہو کر پڑھائیں گے۔"

۵۔ اس لطافت کے ساتھ آپ نے مولوی محمد اسحاق صاحب کو ہر طرح مدرس اول اور گویا اپنا قائم مقام بنا کر مدرسہ ان کے سپرد کر دیا۔ یہاں تک کہ بعض انتظامی امور بھی جو آپ سے متعلق تھے۔ وہ بھی کم فرصتی کا عذر ظاہر کر کے اس قید کے ساتھ ان کے سپرد کر دئے کہ آخر میں نام میرا ہی لکھا جائے بقلم اپنے۔ یعنی اشرف علی بقلم محمد اسحاق۔ تاکہ لوگوں کو قطع تعلق کا شبہ نہ ہو۔

جب آپ کے طلبا فارغ التحصیل ہو گئے۔ اور آپ کے ذمہ کوئی سبق بقایا نہ رہا۔ تو آپ نے اپنے مجوزہ پروگرام کے مطابق یہ عذر رخصت لے لی کہ:۔

"اتنی بڑی جماعت کو فارغ التحصیل کرنے میں مجھ کو بہت مشقت اٹھانی پڑی ہے جس سے تکان ہو گیا ہے۔ لہٰذا اب مجھے کچھ دن آرام لینے کی ضرورت ہے۔"

اور اپنا تمام سامان گٹھڑیوں میں بند کر کے ایک کمرہ میں مقفل کر دیا تاکہ جو یہ اُٹھانے کے لئے آئے اسے پریشان نہ ہونا پڑے۔ اور منگوانے میں سہولت رہے۔ اور ساتھ اسلئے نہ رکھا کہ خواہ مخواہ شبہ ہوگا۔ اور اس طرح خود کو ہر طرح سے آزاد کر کے کسی کو قطع تعلق کی اطلاع کئے بغیر کانپور سے تھانہ بھون کو روانہ ہو گئے۔ فرماتے تھے کہ:۔

مسرتِ واپسی | جس وقت کانپور سے ریل چلی۔ اس وقت میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی

بس ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے قید سے رہائی ہو گئی ہو۔ اور اللہ تعالے کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔"

جب اس امر کی اطلاع آپ کے شیخ حضرت حاجی صاحب کو پہنچی تو انہوں نے خوش ہو کر لکھا کہ:

"بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے آئے۔ امید ہے کہ آپ سے خلق کثیرہ کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا۔ آپ ہمارے مدرسہ کو از سرِ نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں۔ اور خیال رہتا ہے" (مکتوبات نمبر ۳۶ - ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ)

تعلق سرپرستی تھانہ بھون تشریف لانے کے بعد آپ نے کئی بار تک اپنے واپس نہ آنے کے قصد سے اہل کانپور کو مطلع نہ کیا۔ مگر بحیثیت سرپرست مدرسہ کے حالات برابر دریافت فرماتے رہے اور مشورے دیتے رہے۔

قطع تعلق جب آپ کو ہر طرح سے اطمینان ہو گیا کہ مدرسہ کے سب کام اچھی طرح سے چل رہے ہیں اور اب کسی کام میں آپ کی عدم موجودگی کی وجہ سے خلل پڑنے کا اندیشہ نہیں۔ تو اس وقت آپ نے ان کو مطلع کر دیا کہ اب میرا ارادہ واپس آنے کا نہیں ہے اور حضرت حافظ شیرازی کا یہ شعر لکھ دیا ۔

از قیل و قال مدرسہ حالے دلم گرفت — یک چند نیز خدمت معشوق می کنم

سعی لاطائل بس اس خبر کا پہنچنا تھا کہ اہل کانپور میں غم و اندوہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر شخص انگشت بدندان رہ گیا کہ یہ کیا ہوا؟ انہوں نے حضرت کو واپس لانے کی بہت سی تدابیر کیں۔ یہاں تک لکھ دیا کہ آپ مدرسہ کا کام نہ کریں۔ صرف یہاں قیام پذیر رہیں اور پچاس روپے تنخواہ بھی لیتے رہیں ان کے اصرار پر حضرت نے انہیں خشک جواب دینے کی بجائے لکھا کہ:۔

"میں نے وطن کی سکونت حضرت حاجی صاحب کے ایما پر اختیار کی ہے۔ آپ نے جو کچھ لکھنا ہو۔ انہیں لکھیں"۔

چنانچہ اربابِ اشتیاق نے حضرت حاجی صاحب کو بھی مکہ معظمہ میں بڑی منت سماجت سے لکھا کہ وہ حضرت کو واپس کانپور تشریف لانے کے لئے لکھیں۔ مگر وہ اپنی تجویز کے خلاف کیسے لکھ سکتے تھے اسلئے انہوں نے اپنے مکتوب نمبر ۹۴ مورخہ ۱۵ محرم ۱۳۱۷ھ میں حضرت کو لکھا کہ:۔

"کانپور سے آپ کے وہاں کے قیام کے بارہ میں خط آیا تھا۔ جواب ان کو لکھ دیا گیا تھا آپ کو بھی تحریر ہے کہ فقیر کے نزدیک مستقل قیام آپ کا تھانہ بھون میں ضروری ہے باقی

تعطیل وغیرہ کسی فرصت کے وقت یا جس وقت طبیعت کچھ گھبرائے۔ تو کانپور بھی دورہ کریں۔ اور ان لوگوں کی خبرگیری کریں۔ اور طالب کے لئے تو تھانہ بھون کانپور سے کچھ دور نہیں ہے۔ چنانچہ کانپور بھی یہی مضمون جواب میں لکھا گیا ہے۔"
چنانچہ اس کے بعد وہاں کے لوگ جب بھی حضرت کو بلاتے تو آپ بڑی خوشی سے وہاں جاتے۔ کیونکہ ان حضرات کی محبت اور خلوص کی وجہ سے حضرت کو وہاں کے لوگوں سے بہت محبت تھی۔
غرضیکہ اس طرح حضرت نے کمال دانشمندی اور حسن تدبیر سے ملازمت ترک کر کے افاضۂ ظاہری کا دور ختم کر کے افاضۂ باطنی کا دور شروع کر دیا۔

دورِ خشیّت

تقاضائے بشریّت

نبوت۔ ولایت۔ حکومت انعامات الٰہیہ میں سے ہیں جنہیں ان اعزازات خصوصی سے نوازا جاتا ہے۔ ان کی جبلت میں بدو فطرت سے ہی ایسی خوبیاں پیدا کر دی جاتی ہیں۔ جو ان مناصب جلیلہ کا بار گراں برداشت کرنے اور ان کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں انسان کی ہر وقت ممد و معاون رہتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی اسے زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے وقت بحیثیت انسان موسمی تغیرات کی طرح قلبی تغلبات سے متاثر اور آلام، مصائب اور عقبات و بلیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان تاثرات و کیفیات یا عقبات و بلیات میں بمصداق حصہ بقدر جثہ اپنے ظرف و رتبہ کے مطابق حصہ پاتا ہے۔ اسی لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ:-

"لوگوں میں سب سے زیادہ مصائب انبیاء کرام پر آئے ہیں اور ان کے بعد پھر درجہ بدرجہ جو ان سے زیادہ مماثلت رکھتے تھے۔"

ایسے حالات کا صدور تعلیم و تربیت آزمائش و امتحان ترقی درجات کے لئے ہی ہوتا ہے۔
انسان کا کعبۂ مقصود حصول راحت ہے۔ جونہی اس کے سکون و اطمینان میں ذرہ بھر بھی خلل واقع ہوتا ہے وہ فوراً مضطرب و بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور ان اسباب کو رفع کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے۔ جو اس کے سکون کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ اس فکر میں اسے دنیا کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ دراصل یہ غافل انسان کے لئے فکر عقبیٰ کی ایک یاددہانی ہوتی ہے۔ کہ جب

تم چند روزہ زندگی کی قلیل ترین عرصہ کی تکلیف کی تاب نہ لاکر حال سے بے حال ہو رہے ہو۔ تو تم آخرت کی دائمی زندگی سے کیوں غافل ہو۔ اگر وہاں بھی خدانخواستہ اسی طرح کسی مصیبت میں گرفتاری ہوگئی۔ تو پھر کیا حشر ہوگا۔ جبکہ یہاں تو رفع مصائب کے لئے ہر قسم کی سعی ممکن ہے۔ اور وہاں اس کا کوئی امکان نہیں۔ پس جب اس نقطہ پاسکہ پر انسان کی توجہ مرکوز ہوتی ہے۔ تو وہ اس وقت کے حشر و نشر کے تصور سے کانپ اٹھتا ہے۔ جس سے غلبۂ حال طاری ہو جاتا ہے جسے اصطلاح صوفیہ میں "تغیراتِ احوال" کہتے ہیں۔ اور اس کے وقوع کے لئے کوئی بڑے سے بڑا مقام بھی مانع نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت تھانوی خود فرماتے ہیں کہ:-

"کاملین پر بھی کبھی غلبۂ حال ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ منافی کمال نہیں ہوتا۔ بلکہ حضرات انبیاء علیہم السلام پر بھی کبھی ان حضرات کی شان کے موافق غلبۂ حال طاری ہوا ہے۔ چنانچہ یوم بدر میں حضور سرورِ کائنات سردارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ابتہال کے ساتھ دعا فرمائی تھی۔ وہ بھی غلبہ حال سے ناشی تھی۔ بلکہ گاہ گاہ فرشتوں سے بھی غلبۂ حال منقول ہے۔ حالانکہ ان میں انفعالِ بشری نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا فرعون کے منہ میں کیچڑ ٹھونسنا روایت ترمذی میں مذکور ہے۔ لیکن صاحبِ مقام پر جو غلبۂ حال طاری ہوتا ہے۔ اس میں وہ حدود سے خارج نہیں ہوتا۔ بخلاف صاحبِ حال کے وہ کبھی حدود سے خارج بھی ہو جاتا ہے۔ مگر اس کو گناہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ بوجہ مغلوبیت وہ اس وقت مرفوع القلم ہوتا ہے۔"

اثرِ کیفیات

حضرت تھانوی بھی چونکہ سلوک کی منازل طے کر رہے تھے۔ اور بفضلہ تعالیٰ حالت باطنی میں ایک مستحکم کیفیت تمکین و رسوخ پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن صاحب مقام ہو جانے کے باوجود بھی تغیراتِ کیفیات سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ جو لوازم سلوک سے ہے۔ چنانچہ ایک روز آپ مسجد تھانہ بھون میں وعظ فرما رہے تھے۔ بدورانِ وعظ آپ نے نہایت جوش وکیف کے ساتھ مثنوی شریف کے اشعار پڑھے۔

اے حریفاں راہ ہا را بست یار   آہوئے لنگیم و او شیرِ شکار
جز کہ تسلیم و رضا کو چارۂ   در کفِ شیرِ نرِ خوں خوارۂ

بس دوسرے شعر کا پڑھنا تھا کہ بے اختیار زور سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور وہ بیتاب نہ صرف خود مضطرب رہے بلکہ سامعین کو بھی بے قرار رکھا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کیفیت غلبۂ

ہیبت سے ناشی تھی۔ بقول صاحب اشرف السوانح :-

"وہ کیفیت بھی کس قوت کی کیفیت ہوگی۔ جس نے حضرت تھانویؒ جیسے کوہ استقلال کو بعد حصول تمکین تمام بھی از جا رفتہ کردیا۔ کیوں نہ ہو۔ صاحب مقام کے بھی صبر و سکون کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب اس پر کسی ایسی قوی کیفیت کا ورود ہوتا ہے جس کی قوت اس کی حد سے فوق ہوتی ہے۔ تو اس سے فی الحال مغلوب ہوجاتا ہے لیکن فی المآل جلدی ہی پھر اس پر غالب آجاتا ہے۔ امتداد نہیں ہونے پاتا۔ زیادہ استبداد ہوتا ہے۔ اور اس قسم کا غلبہ بھی کبھی کبھی ہوتا ہے۔ بکثرت نہیں ہوتا۔ اور اگر ایسی قوی کیفیت کا ورود غیر صاحب مقام پر ہو تو اس کی جان کے لالے پڑجائیں غرض اس قسم کا غلبہ حال منافی تمکین نہیں۔ بلکہ اس کو بھی باعتبار حقیقت ایک درجہ کی تمکین ہی کہنا زیبا ہے۔"

آثارِ خشیت ترکِ ملازمت کے بعد جب حضرت تھانہ بھون میں مستقل قیام کی نیت سے سکونت پذیر ہوئے تو انس مع اللہ کا اس قدر غلبہ ہوا کہ ملنے جلنے والوں سے وحشت ہونے لگی۔ جس کی وجہ سے آپ نے آبادی چھوڑ کر باہر کسی سنسان جگہ میں نشیمن بنانے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ آپ بزرگوں کے اشارہ کے بغیر کوئی قدم بھی نہ اُٹھاتے تھے۔ اور خلق اللہ سے بے مروتی بھی گوارا نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے آبادی کو چھوڑنے کے سلسلہ میں مولانا گنگوہیؒ سے اجازت طلب کی۔ مولانا نے اس کی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ ہمارے بزرگوں کا یہ طریق نہیں۔ اور نہ ایسا کرنا مناسب ہے۔ البتہ اگر لوگوں سے ملنے جلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور حرج اوقات ہوتا ہے۔ تو پھر مروت اور لحاظ لازمی نہیں۔ اس پر آپ نے قصبہ سے باہر نکل جانے کا ارادہ تو ترک کردیا لیکن زیادہ تر وقت خلوت ہی میں اپنے محبوب حقیقی سے راز و نیاز میں گزارنے لگے۔ ہمہ تن مشغول بحق ہوگئے اور نہایت اطمینان و سکون اور انشراح و انبساط کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔ چونکہ یہ منزل بھی کوئی آخری منزل نہ تھی۔ اسلیے جب انس مع اللہ کے درجات عالیہ طے ہوگئے۔ تو اب اگلی منزل کا سفر شروع ہوا۔

قبض و ہیبت اس دور کے آغاز کا بہانہ یہ بنا کہ آپ کی بڑی اہلیہ صاحبہ کے خالو کو دشمنوں نے تہہ تیغ کردیا۔ جس کی تجہیز و تکفین آپ کے ہی زیر اہتمام و نگرانی ہوئی۔ بدوران غسل مرحوم مظلوم کے زخم رسیدہ سر اور ان کی نعش کے حسرتناک منظر نے حضرت کے پرسوز و گداز قلب کو مجروح کردیا۔ دفن سے فارغ ہوکر آئے۔ تو مستورات کے رونے دھونے کی آواز نے ان تازہ

زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا جس سے سخت اضمحلالِ قلبی عارض ہو گیا۔ اور اختلاج کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ ابھی یہ اثر زائل نہیں ہوا تھا کہ آپ کو ایک اور عزیز کی موت پر سسرال جانا پڑا۔ جس نے پچھلے تاثرات میں اور اضافہ کر دیا جس سے قلب ماؤف و متاثر ہوا۔ ایک رات جب تہجد کے لئے وضو کرنے لگے تو یکایک بلا اختیار ایک "خطرہ منکرہ" وارد ہوا۔ اور چند الفاظ نے سکون و اطمینان کی زندگی میں ایک تلاطم برپا کر دیا۔ جس سے خوفِ آخرت کچھ اس انداز سے طاری ہوا کہ زندگی سے بیزار ہو گئے۔ اور خود کشی تک کے وسوسے آنے لگے۔ یہاں تک کہ خود فرماتے تھے۔ کہ ایک بار ایک صاحب ملنے آئے۔ ان کے پاس اس وقت بندوق بھری ہوئی تھی۔ بار بار جی میں آتا تھا کہ ان سے کہہ دوں کہ خدا کے لئے فیر کر کے میرے ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کر دو۔ کیونکہ میں اس حالت کو بُعد اور اس بُعد کے وہم سے اپنے آپ کو فرعون اور ہامان سے بھی بدتر سمجھتا تھا۔ حالانکہ اپنے مومن اور ان کے کافر ہونے کا یقین تھا۔ اور چونکہ یہ ذوقیات ہیں اس لئے تقریبِ فہم کے لئے اس سے زیادہ تشریح نہیں کر سکتا بس یوں سمجھتا تھا کہ جس بلا میں وہ لوگ مبتلا تھے۔ اس سے تو ایمان لانے کے بعد ان کا چھٹکارا ہو سکتا تھا۔ جس بلا میں میں مبتلا ہوں۔ اس سے سالہا سال بھی خلاصی ممکن نہیں بڑی مشکل یہ تھی کہ اگر ذکر کرنے بیٹھتا جو کہ قرب کی حالت تھی۔ تو ساتھ ساتھ وہ خطرہ منکرہ بھی عود کر آتا۔ اور اگر خود خطرہ سے بچنے کی غرض سے ذکر کو منقطع کرنا چاہتا۔ جو کہ بُعد تھا۔ تو اس کو بھی دل کسی طرح گوارا نہ کرتا گویا یہ حالت تھی ؎

من شمع جانگدازم تو صبح دل کشائی — سوزم گرت نہ بینم میرم چو رُخ نمائی
نزدیک آنچنانم دور آنچنان کہ گفتم — نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی

غرض سخت کشمکش میں مبتلا تھا۔ اور ایسی شدید حالت تھی کہ باوجود صحتِ بدنی کے موت کو حیات پر ہزار ہا درجہ ترجیح دیتا تھا۔

اسبابِ خطرہ حضرت تھانویؒ نے جنہیں حق تعالےٰ نے حکیم الامت بنا کر بھیجا تھا۔ اپنے مرضِ خطرہ منکرہ کے اسباب کی تشخیص بھی خود کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس خطرۂ منکرہ کے اس درجہ مؤثر ہو جانے کے تین سبب تھے۔ اول تو پے در پے صدمات (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) نے قلب کو پہلے سے گداز اور زخمی کر رکھا تھا جس کی وجہ سے اس میں تاثر و انفعال کی کیفیت اور قبولِ خطرہ کی استعداد بدرجہ اتم پیدا ہو گئی تھی۔ پھر جب اس خطرہ منکرہ کا وقوع ہوا۔ تو قلب بوجہ غایت ضعف و اضمحلال نہ اس کی مدافعت کر سکا نہ مقاومت۔ لہٰذا وہ دلنشین ہو کر رہ گیا۔ دوسرا سبب یہ ہوا کہ میں نے بعد ترک

تعلق کا ہے۔ ترکِ اشغالِ مباحہ میں بہت زیادہ مبالغہ کیا تھا۔ اور تعلقات سے اپنے قلب کو بالکل یکسو اور فارغ کر لیا تھا۔ حالانکہ بعد میں تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ اتنا مبالغہ مضر ہوتا ہے۔ کیونکہ ادھر تو قلب کو خالی کر لیا گیا۔ اور اُدھر چونکہ عالمِ غیب کوئی مشاہد چیز نہیں۔ دوسری شے اس میں اُسی قوت اور تمکن کے ساتھ بھری نہ جا سکی۔ لہٰذا اس خلوئے قلب کی حالت میں شیطان کو وساوس ڈالنے کا بسہولت موقع مل گیا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا تیار کر لیا گیا۔ تو اس کو ابلیس نے چاروں طرف سے گھوم پھر کر دیکھا۔ اور جب اس کو اندر سے خالی پایا۔ تو اس سے خوش ہوا کہ اس کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ یہ اپنے قابو میں نہ ہوگا۔ (یعنی جب یہ خالی ہے تو میں اس کے اندر آسانی سے حلول کر سکوں گا۔ چنانچہ مشہور بھی ہے "خانۂ خالی را دیو میگیرد")

تیسرا سبب شدتِ تاثر کا یہ تھا کہ وہ خطرۂ منکرہ صورۃً کمالِ محبت کے منافی تھا۔ اسلئے نے انتہا شاق گذرا۔ حالانکہ ایسے خطرہ پر جو صورۃً کمالِ محبت کے منافی نظر آتا تھا۔ اس درجہ غم و اندوہ کا طاری ہونا بموجب ارشادِ نبوی "ذاک صریح الایمان" خود کمالِ محبت پر دال تھا۔ لیکن کمالِ محبت میں تو صورتہً بھی مضطرب کر دینے کے لئے کافی ہوتی ہے ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود ... گر ز باغِ دل خلالے کم بود

تدابیرِ انسداد

حسنِ اتفاق سے یہ ابتلا اِنہیں ایام میں پیش آیا تھا۔ اس لئے صبح اُٹھتے ہی حضرت تھانوی مولانا گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رات کا واقعہ بیان کیا۔ تو مولانا نے اس کے انسداد کی یہ تدبیر بتلائی کہ "اس کی طرف التفات نہ کیا جائے"۔ چنانچہ حضرت واپس تھانہ بھون آ گئے۔ چونکہ ابتدائی حملہ تھا۔ اور قلب میں انفعال کی کیفیت حد درجہ پیدا ہو گئی تھی۔ اسلئے وہ خطرۂ منکرہ برابر عود کرتا رہا۔ بلکہ روز بروز زور پکڑتا گیا جس سے کیفیت انفعالیہ میں اور بھی ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اختلاجِ قلب کے دورے پڑنے لگے اور چند ہی دنوں میں ایسے کمزور ہو گئے جیسے مدتوں کے مریض ہوں۔

انہی دنوں حکیم مولوی محمد صدیق گنگوہی اپنے مطب یعنی گڈھی پختہ سے تھانہ بھون آئے ہوئے تھے۔ ان سے بغرضِ معالجہ رجوع کیا۔ اور اپنا قارورہ ملاحظہ کے لئے بھیجا۔ حکیم صاحب قارورہ کو دیکھتے ہی چونک پڑے اور حیرت سے کہا کہ "یہ شخص زندہ کس طرح ہے؟ کیونکہ قارورہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ حرارتِ غریزیہ بالکل فنا ہو چکی ہے"۔ قارورہ لے جانے والے مولوی محمد یونس مرحوم نے جو حضرت کے شاگرد اور حضرت سے ہی بیعت تھے۔ واپس آ کر ازراہِ سادگی یہی الفاظ

دہرا دیئے۔ جس سے قلب پر اور بھی اثر پڑا۔ جسے زائل کرنے کے لئے حضرت نے انہیں ڈانٹا۔ کہ کہیں مریض سے بھی ایسی بات کہی جاتی ہے۔ جس سے وہ بہت نادم ہوئے غلطی کا اقرار کر کے کہا کہ اب کیا ہو، فرمایا کہ اس قارورہ کو لے جاؤ۔ اور تھوڑی دیر بعد لوٹ کر مجھ سے کہو کہ حکیم صاحب کے پاس پھر قارورہ لے گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میری پہلی رائے غلط تھی۔ یہ تو اچھے خاصے ہیں۔ کوئی اندیشہ کی بات نہیں۔ اس پر مولوی صاحب نے طالب علمانہ اشکال پیش کر دیا۔ جب آپ خود ہی یہ بات سمجھا کر واپس بلا رہے ہیں تو اس سے کیا ہوگا۔ فرمایا تمہیں اس سے کیا۔ میں جیسے کہہ رہا ہوں تم ویسا کرو۔ کیونکہ الفاظ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اثر رکھا ہے۔ چونکہ قلب کی حالت اس وقت بہت نازک تھی۔ اور وہ ذرا ذرا سی بات سے اثر پذیر ہوتا تھا۔ اس لئے اس تدبیر سے اس وحشت میں کمی ہوگئی۔ جو پہلی خبر سے پیدا ہوگئی تھی۔ مگر حکیم صاحب کے علاج سے کوئی نفع نہ ہوا کیونکہ کوئی مرض حسی تو تھا نہیں۔

چونکہ آپ انشاءاللہ امراض باطنی کے خود حکیم تھے۔ اور اسباب مرض تشخیص کر چکے تھے۔ اس لئے اب اپنا علاج بھی خود ہی کرنا شروع کیا۔ خود طبیعت کو علوم مشاغل مباحہ سے دور کرنے کے لئے بندوق مستعار لے کر باہر نکل جاتے اور بلا نشانہ فائر کرتے۔ جس کی آواز سے طبیعت میں فرحت ہوتی۔ اور اسکے ساتھ ہی دوستوں سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔ اور کبھی کبھی سفر میں نکلنے لگے۔ ان تدابیر خارجہ کے ساتھ ساتھ ان حالات سے حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت حاجی امداد اللہؒ کو آگاہ فرماتے رہتے اور ان سے درخواست دعا کرتے رہتے۔ مولانا گنگوہی تو دعا و توجہ کے باوجود بھی اسی پر مصر رہے کہ خطرات کی طرف التفات نہ کرو۔ جو بقول حضرت تھانویؒ ان کے امام فن ہونے کی دلیل تھی۔ اور ساتھ ہی تسلی کے لئے خطوط بھی لکھتے رہتے۔ جو مکاتیب رشیدیہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مکتوب میں مولانا لکھتے ہیں:-

"آپ کا خط موصول ہو کر کاشف ما فیہ ہوا۔ اگر یہ خوف و حزن امور آخرت سے ہے وجہ فی الواقع امور آخرت سے ہی تھا، تو محمود ہے۔ بزرگوں کو ایسی خوف سے بڑی بڑی شدت سے قبض واقع ہوا حتیٰ کہ بعض نے جان بھی دیدی۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں ؎

جانِ صدیقاں ازیں حسرت بریخت کاسماں برفرقِ ایشاں خاک بیخت

پس ایسی حالت اور اس صورت میں تو جائے شکر ہے۔ نہ جائے غم۔ امام غزالیؒ اسی غم میں بیت المقدس میں دس سال تک پریشان اور محزون رہے کہ اطبا ان کے

علاج سے عاجز ہو گئے۔ آخر ایک یہودی طبیب نے ان کو دیکھا اور تشخیص کی کہ ان کو کوئی حسی مرض نہیں ہے۔ بلکہ خوفِ آخرت ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ پس فرحت ہو کہ حق تعالے نے آپ کو یہ دولت دی ہے۔ ایسے حزن پر ہزار فرحت قربان! اور اس حالت کی موت شہادتِ کبریٰ ہے۔ اور اگر کوئی امر دیگر ہے۔ تو اس کا جواب بدوں دریافت حقیقت حال میں نہیں لکھ سکتا۔ اور یہاں آنے کے باب میں جو آپ استفسار فرماتے ہیں۔ تو بقولے ع او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔ مگر معہذا اگر آپ تشریف لاویں گے۔ تو خود بھی نفع کی امید رکھتا ہوں کہ صحبتِ علمائے حسین قدر میسر آوے غنیمت ہے۔ فقط والسلام

مکتوب ثانی میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"آپ کے خط سے کیفیت معلوم ہوئی۔ میں آپ کے لئے دعائے خیر کرتا ہوں۔ وسوسۂ مذکورہ میں اندیشۂ سوءِ خاتمہ بھی منجملہ اوہام ہے۔ اس کو حتی الوسع دفع کرتے رہیں اور اجر و تکفیر سیئات بھی یقینی ہے۔ انشاء اللہ الکریم ۱۵ شعبان ۱۳۱۶ھ

اسی عرصہ میں حضرت حاجی صاحب کی طرف سے جو مکتوبات آتے رہے۔ ان میں وہ تحریر فرماتے رہے کہ

۱۔ الحمد للہ کہ آپ کے قلب کی حالت بہت اچھی ہے۔ یہ مقام خوف و رجا ہے۔ اسی کو ہیبت و انس کہتے ہیں۔ کبھی ہیبت کبھی انس کا غالب ہو جاتا ہے۔ دونوں کو ایک سمجھنا چاہیے

(مکتوب نمبر ۱۴ مورخہ یکم رجب ۱۳۱۶ھ)

۲۔ خط آپ کا دوسرا بھی پہنچا۔ حالت آپ کی بہت اچھی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ کچھ ضرر نہ ہوگا۔ فقیر دعا کرتا ہے۔ (مکتوب نمبر ۱۵ مورخہ ۱۹ رجب ۱۳۱۶ھ)

۳۔ آپ کی حالت بہت اچھی ہے۔ پہلے بھی لکھ دیا گیا ہے اس قسم کی گھاٹیاں طالب کو آیا کرتی ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ سب سے پار ہو جاؤ گے۔ فقیر دعا کرتا ہے۔ انہ سمیع قریب

(مکتوب نمبر ۱۶ مورخہ ۸ شعبان ۱۳۱۶ھ)

۴۔ آپ کی حالت بہت اچھی ہے۔ اللہ تعالے مبارک کرے۔ جو کچھ بقیہ قبض ہے وہ بھی انشاء اللہ رفع ہو جائیگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مخلصین سے کرے۔

(مکتوب نمبر ۱۷ مورخہ ۲۲ شوال ۱۳۱۶ھ)

ان تدابیر سے بفضلہ تعالے ایک سال سے جو حالتِ ہیبت طاری تھی ہمیشہ کے لئے دور ہو گئی۔

حقیقتِ ہیبت جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابتدائً نزولِ وحی سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ تو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے حضور کی بہت تسلی فرمائی تھی۔ اسی طرح اس غلبۂ ہیبت کے زمانہ میں جب پریشانی زیادہ بڑھتی تو حضرت اپنا غم غلط کرنے کے لئے اپنی غم گسار جانثار رفیقِ حیات بڑی بیگم صاحبہ سے اپنے پر درد حالات بیان فرماتے۔ جو حضرت کی باتوں کا نہایت مناسب اور تسلی بخش جواب دیتیں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ان کے جوابات سے بہت تسلی ہوتی تھی۔ محترمہ بیگم صاحبہ نے اس ابتلا کی ایک بہت ہی اچھی مثال دی۔ فرمایا کہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے کسی کو کہیں جانا ہو۔ اور راستہ باغ کے اندر سے ہو۔ لیکن اس کے برابر ہی جھاڑ جھنکار بھی ہوں۔ اور وہ اتفاق سے جھاڑ جھنکار میں ہو کر چلنے لگا۔ تو کانٹوں کی وجہ سے اس کا تمام بدن لہولہان ہو گیا۔ اور نہایت پریشانی اٹھانی پڑی لیکن راستہ برابر قطع ہوتا رہا۔ اور آگے چل کر پھر وہ اسی پر بہار راستہ پر پڑ گیا۔ ایسے شخص کو تکلیف تو بیشک سخت ہوئی۔ لیکن قطع مسافت میں کوئی حرج واقع نہیں ہوا اور اس تجربہ سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ دوسروں کی بہت اچھی طرح سے رہبری کر سکے گا۔ اور اگر کوئی سالک اس قسم کی پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا۔ تو وہ اس کو بہت آسانی کے ساتھ اس سے نکال سکے گا۔ اس مثال سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ

"مبتلائے قبض و ہیبت کو تکلیف تو بے شک سخت ہوتی ہے۔ لیکن قطع طریق میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا"

خود حضرت نے مبتلائے ہیبت سالکین کے خطوط کے جوابات میں حقیقت ہیبت سے یوں پردہ اٹھایا کہ:۔

"یہ تغیرات طبعی و نفسانی ہیں نہ کہ روحانی و قلبی۔ سو ایسے تغیرات مضر تو کیا نافع ہی ہوتے ہیں۔ عجب کا علاج ان سے ہو جاتا ہے اور عبدیت کی حقیقت کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے فنا و تہیدستی دائمی الیقین ہو جاتی ہے۔ فی الحقیقت یہ قبض کی قسم ہے جس کی بہ منفعتیں ہیں۔"

"اکابر صحابہ پر یہ حالت گزری ہے۔ صحیح بخاری میں ستر صحابہ کی نسبت ہے کاهم یخاف النفاق علی نفسہ۔ مخاطب (حضرت تھانوی) پر بھی یہ حالت گذری ہے جس سے ہزاروں منافع حاصل ہوتے ہیں۔ فعال عجب۔ مشاہدہ قدرت معاینہ عجز خود وغیرہ ذالک"۔

"محققین نے اس کو بسط سے ارفع کہا ہے اس سے اخلاقِ رذیلہ کا معالجہ زیادہ ہوتا ہے"
"گو عینِ قبض کے وقت وہ منافع معلوم نہ ہوں۔ مگر بعد میں اکثر معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر معلوم نہ بھی ہوں۔ تب بھی حاصل تو ضرور ہو جاتے ہیں۔ اور حصول ہی مقصود ہے نہ کہ اس حصول کا علم"۔

(تربیت السالک باب پنجم)

شدتِ ہیبت

حضرت تھانوی پر جو حالتِ ہیبت طاری ہوئی۔ وہ تصور میں بھی نہیں لائی جا سکتی گویا ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل — کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

والا معاملہ تھا۔ البتہ اس کی شدت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس حالت کے پورے پندرہ سال بعد ۵ محرم الحرام ۱۳۳۲ھ کو ایک سالک نے اپنی سخت ترین باطنی پریشانیوں کے متعلق حضرت کو ایک طویل خط لکھا جس کے جواب میں حضرت نے لکھا کہ:۔

جو مضائق و مصاعب و عقبات و بلیات آپ نے لکھی ہیں۔ یہ تو سو حصوں میں سے ایک حصہ بھی نہیں جو بعض کو پیش آتے ہیں۔ اس وقت مجھ کو بعض احوال یاد آ گئے اور سر سے پاؤں تک اس نے مجھ کو ہلا دیا۔ مشکل سے خود کو سنبھال کر لکھنے کو موقوف نہیں کیا۔۔۔۔ الخ

(الانتباہ لاھل الاصطفاء)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس کیفیت کے محض تصور نے اتنی طویل مدت گزر جانے کے بعد حضرت جیسے کوہِ استقلال کو سر سے پاؤں تک ہلا دیا۔ اس کے عین وقوع کے وقت حضرت پر کیا گزری ہوگی یہ سب امانتِ خداوندی اور توجہ بزرگانِ دین کا نتیجہ تھا کہ حضرت تھانوی اس شدت کو برداشت کر گئے۔ ورنہ اگر کوئی دوسرا ان کی جگہ ہوتا۔ تو ضرور بد حواسی میں اپنا نقصانِ جان و ایمان کر بیٹھتا۔

علتِ ہیبت

غلبہ ہیبت کی یہ حالت بلا وجہ نہ تھی۔ چونکہ حضرت تھانوی کو مسندِ ارشاد پر بٹھانا مقصود تھا۔ اسلئے حق تعالے نے آپ کو نشیب و فراز طریق کا ذاتی تجربہ کرانے اور اس میں ماہرِ کامل بنانے کی غرض سے آپ پر یہ حالتِ ہیبت طاری فرمائی تھی تاکہ مسندِ ارشاد پر بیٹھنے کے بعد ایسے سالکین کے معالجہ روحانی میں آپ کو کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت تھانوی بطورِ تحدیثِ نعمت فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"مجھ کو چونکہ سخت سے سخت حالات پیش آ چکے ہیں۔ اسلئے احوالِ باطنی کا ایسا تجربہ ہو گیا ہے۔ کہ کسی سالک کی کتنی ہی الجھی ہوئی حالت ہو۔ اور وہ کیسی ہی باطنی پریشانی

میں مبتلا ہو بحمد اللہ مجھ کو اس کے معالجہ کے باب میں ذرا بھی تردد لاحق نہیں ہوتا۔ اور بفضلہ تعالیٰ ایسی ایسی تدبیریں ذہن میں آجاتی ہیں کہ ان کے استعمال سے وہ نہایت سہولت اور سرعت کے ساتھ اس حالت سے نکل جاتا ہے۔ بالخصوص وساوس وخطرات کی تشخیص ماہیت اور تجویز علاج میں تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ایسی بصیرت عطا فرمادی ہے کہ آجکل کم لوگوں کو ہوگی ولا فخر۔"

اس ارشاد کے تائیدی واقعات "تبویب تربیت السالک" باب پنجم میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

رشد و ہدایت

اہمیت دعوت وارشاد

جس طرح کسی چیز کے موجد پر اس چیز کا نقص یا خامی واضح ہوتی ہے۔ جو دوسرے کو معلوم نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح خالق پر بھی اپنی مخلوق کی خلقی کمزوریاں اور خامیاں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ جن کا کوئی دوسرا احاطہ نہیں کرسکتا۔

قرآن پاک کے استقصار سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود بہ الفاظِ خالق بڑا تنگ دل۔ بے صبر۔ ناشکرا، جھگڑالو اور نادان واقع ہوا ہے۔ اس کی ہدایت ورہنمائی کے لئے جو کتاب ہدایت نازل ہوئی۔ وہ خود صاحبِ کتاب کے الفاظ میں نہایت آسان۔ عام فہم، واضح مفصل اور اپنی تفسیر آپ ہے۔ مگر متذکرہ بالا انسانی کمزوریوں کے پیش نظر اس کتاب کو پڑھانے اور سمجھانے کی غرض سے حق تعالیٰ کی طرف سے ایک معلم الکتاب بھی بھیجا گیا۔ تاکہ یہ جھگڑالو انسان اپنی خواہش کے مطابق اس کی تشریح و تعبیر نہ کرنے لگے۔

نبی کریم قرآن کے الفاظ میں رؤف و رحیم تھے اور فطرۃً منزہ عن الخطا اس کے ساتھ ہی رقیق القلب، وسیع الظرف متحمل مزاج، بردبار۔ صابر و شاکر اور دانا و بینا تھے۔ ان کی پشت پر مہر نبوت عیاں۔ رخ انور پہ نور نبوت درخشاں۔ اشارۂ انگشت پہ قمر رقصاں۔ یہاں تک کہ مخالفین بھی ان کے امین و صادق ہونے میں متفق اللسان تھے۔ سلیم الفطرت انسانوں کے لئے ان کے ہر ارشاد پر ایمان بالغیب نہ لانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر انہی میں سقیم الفطرت انسان بھی موجود تھے اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی خلقی کمزوریوں کے پیش نظر ان جھگڑالو اور نادان انسانوں کے سمجھانے کے لئے ازراہ ترحم اس شفیق و رحیم کو اس بات کی مزید تاکید بھی کردی۔ کہ آپ جب ان

تک میرا پیغام پہنچائیں اور سمجھائیں ۔ ادع الیٰ سبیل ربّک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن سے کام لیں یعنی ان نادانوں کو اپنے رب کی طرف پر حکمت باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ بلائیں اور اچھے طریقہ سے ان کو سمجھائیں ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ رشد و ہدایت کا فریضہ کتنا اہم اور کتنا نازک ہے ۔ اور اس کے لئے صاحب دعوت ارشاد کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے ۔

تربیتِ خاص چونکہ حضرت تھانوی کو بھی حق تعالےٰ نے اس منصب جلیلہ پر فائز فرمانا تھا ۔ اسلئے آپ کی تربیتِ خاص کے خصوصی اسباب پیدا کئے گئے ۔ آپ کا ایک بزرگ کی دعا اور برکت بشارت سے وجود میں آنا ۔ صالحین کی طرح بچپن گزارنا ۔ غزالی دورانِ وقت اساتذہ کاملین سے تعلیم پانا ۔ زمانہ طالب علمی میں وعظ و تبلیغ کی مشق فرمانا ۔ اکابر صالحین کا غائبانہ آپ کو مرکزِ توجہ بنانا ۔ بزرگانِ دین سے فیوض ظاہری و باطنی حاصل کرنا ۔ شیخ العرب والعجم سے روحانی تربیت پانا ۔ قبض و ہیبت کی دشوار گذار وادی سے بخیر و خوبی پار ہو جانا ۔ تحریر و تقریر میں جذب و تاثیر کا پیدا ہونا ۔ اور عنداللہ و عندالناس مقبول و محبوب ہونا ۔ اس بات کی بین دلیل تھی کہ قدرت نے آپ سے کوئی مہتم بالشان کام لینا ہے ۔

ترغیبات امدادیہ تربیت کے اس اہتمام خصوصی کے ساتھ ساتھ آپ کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ آپ کو اپنے مکتوبات میں دعوت و ارشاد کے لئے تھانہ بھون تشریف لانے کی نہایت لطیف پیرایہ میں ترغیب و تلقین فرمارہے تھے کہ :۔

"۱۔ آپ لوگ یعنی علماء ورثۃ الانبیاء ہیں ۔ آپ لوگوں کو اللہ تعالےٰ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے پیدا کر کے بڑے درجے عنایت کئے ہیں ۔ بس اپنے مقصود کا خیال سب پر مقدم رکھنا چاہیئے ۔ یعنی دین کو خوب مضبوط پکڑنا چاہیئے ۔ دنیا خود ہی اچھی صورت میں خدمت کو حاضر رہے گی ۔ (مکتوب امدادیہ نمبر ۳)

۲۔ جب تک یہاں (کانپور) کا تعلق خدا تعالےٰ کو منظور ہے ۔ رکھئے ۔ بعد ازاں محض توکل بخدا خدا کا نام لے کر تھانہ بھون میں بیٹھ جایئے اور کسی نوع کا کوئی تعلق ظاہری نہ کیجئے ۔ (مکتوب امدادیہ نمبر ۳۵)

۳۔ آپ ہمارے مدرسہ اور مسجد کو از سر نو آباد کریں ۔ آپ سے خلائق کثیرہ کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا ۔" (مکتوب امدادیہ نمبر ۳۵)

خواہش رشیدیہ جب آپ کانپور سے تعلق قطع کر کے ۱۳۱۵ھ میں مستقل قیام تھانہ بھون کے ارادہ سے آ گئے۔ تو حضرت حاجی صاحب کے خلیفہ خاص حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بمسرت دعاء یہ خواہش فرمائی کہ:۔

"بھائی میرا جی تو تب خوش ہوگا۔ کہ جب تمہارے پاس کچھ اللہ اللہ کرنے والے بھی جمع ہو جائیں گے۔ اور طالبین بکثرت رجوع کرنے لگیں گے"۔

مولانا نے نہ صرف دعا پر ہی اکتفا نہ کیا۔ بلکہ اپنے مریدین کو بھی اصلاح و تربیت کے لئے حضرت تھانوی کی خدمت میں بھیجنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح آپ کے شیخِ طریقت ہونے کا عملی اعتراف فرمایا۔

بشاراتِ منامیہ ادھر اطلاعِ عام کے لئے صالحین کو عالمِ خواب میں بشارات دی جا رہی تھیں کہ:۔

۱۔ حضرت تھانوی اپنے دور کے اخص علماء و صلحا میں سے ہیں۔

۲۔ ان کا مسلک عین مطابقِ سنتِ نبوی ہے۔

۳۔ اس دورِ خرافات و بدعات کے لئے انہیں ہی مسندِ ارشاد پر فائز ہونا ہے۔

جن کی تائید مندرجہ ذیل رویا صادقہ سے ہوتی ہے جو "صدق الرویا" اور "تبویب تربیت السالک" باب مبشرات سے نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ "احقر نے حضور (حضرت تھانوی) کو خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ گفتگو فرما رہے ہیں اور بھی بہت سے علماء حاضر ہیں لیکن سب کی طرف سے حضور ہی سوال فرماتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جواب ارشاد فرماتے ہیں اور سب سے اقرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضور ہی کو دیکھا"۔

۲۔ "احقر نے دیکھا کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم .... ایک راستہ سے چلتے ہیں اور ان کے پیچھے آنحضور (حضرت تھانوی) اور اُن کے بعد بندہ۔ غرضیکہ تینوں ایک ساتھ چلتے ہیں"۔

۳۔ "کل شب میں نے ایک خواب دیکھا کہ حضور پر نور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت تشریف لائے۔ ہم سب کھڑے ہونے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سب کو بیٹھنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ آپ اور جو تخت پر بیٹھے تھے۔ یا تو اترنے لگے اور یا صدر کی جگہ سے ہٹنے لگے۔ حضور نے آپ کو فرمایا کہ آپ یہیں تشریف رکھیں اور حضور

بھی ایک طرف تخت پر تشریف فرما ہوئے ..... الخ

انعاماتِ الٰہیہ

ان خصوصی حالات میں آپ منصبِ ارشاد پر فائز ہوئے۔ چونکہ اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد حکمت و سیاست سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ جیسا کہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے۔

"شیخ کو انبیاء علیہم السلام کا دین۔ اطباء کی تدبیر اور بادشاہوں کی سیاست حاصل ہو تو اس وقت اس کو استاد کامل کہا جا سکتا ہے۔"

اس لئے حق تعالٰے نے حضرت تھانویؒ کو ان تینوں صفات کا بھی نمایاں طور پر جامع بنا دیا تھا تاکہ وہ بآسانی رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دے سکیں۔ اور یہ الٰہی انعامات الٰہیہ کا نتیجہ تھا کہ:-

(۱)

انبیائی تعلیم

دربار اشرفیہ میں نہ تو روایتی صوفیوں کی طرح دعوے کئے جاتے تھے نہ مجذوبوں کے سے احکام جاری ہوتے تھے۔ نہ کشف و کرامات کے چرچے سننے میں آتے تھے۔ نہ خوابوں اور کیفیتوں کے تذکرے ہوتے رہتے تھے۔ نہ فرائض کی طرح ذکر و شغل کا اہتمام نظر آتا تھا۔ بلکہ وہاں ہر وقت اور ہر حال میں کتاب و سنت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جو دراصل روحِ تصوف اور جانِ طریقت ہے۔ اسی لئے ایک مرتبہ حضرت تھانوی نے فرمایا تھا کہ:-

"یہاں تو ملّا پن ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ درویشی کیا چیز ہے۔ طالب علم ہیں۔ صاحب علم بھی نہیں۔ بس قرآن و حدیث پر عمل کرنا بتاتے ہیں۔ پھر اس میں جو کچھ کسی کو ملنا ہوتا ہے مل جاتا ہے۔ اور الحمدللہ ایسا ملتا ہے کہ ما لا عینٌ رأت ولا اذنٌ سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر مگر ظاہر میں کچھ نہیں۔ نہ ہُو حق ہے نہ وجد و حال ہے اور نہ کشف و کرامت۔"

"میرے ہاں ضربیں لگوانے کا دستور نہیں کہ تھوڑی دیر محنت کر لی۔ پھر آزاد پھرتے رہے میرے یہاں تو وہ آوے۔ جس کو رات دن اپنے نفس پر آرے چلانے ہوں۔ اور قدم قدم پر یہ فکر ہو کہ کون سا کام جائز ہے اور کون سا ناجائز۔"

یہاں تک کہ بعض صوفیاء کرام کی طرح آپ کے ہاں توجہ دینے کا بھی قطعاً کوئی التزام نہ تھا۔ بلکہ آپ نے ایک دفعہ اس کی بڑے زور سے تردید بھی فرمائی کہ:-

"مجھے تو اپنے ہی فکر سے فرصت نہیں۔ دوسروں کی طرف ہر وقت متوجہ رہنے کی مجھے

کہاں توفیق! میں تو اس توجہ متعارف کو تکلف ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے تو اپنی توجہ کو سب طرف سے ہٹا کر ایک خاص شخص کی جانب جو مخلوق ہے۔ ہمہ تن متوجہ ہو جانے میں غیرت آتی ہے۔ کیونکہ یہ حق تو خاص اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ کہ سب طرف سے توجہ ہٹا کر بس اسی ایک ذات واحد کی طرف ہمہ تن متوجہ رہا جائے۔ البتہ دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تعلیم کرنا اور دل سے یہ چاہنا کہ طالبین کو نفع پہنچے۔ اور ان کی دینی حالت درست ہو جائے۔ یہ توجہ کا ماثور طریق ہے۔ اور یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اور یہ نفع اور برکت میں بھی توجہ متعارف سے کہیں بڑھ کر ہے۔"

بایں ہمہ اکثر لوگوں کا گمان بلکہ یقین تھا کہ جو لوگ حضرت سے طریقہ کے ساتھ اپنی اصلاح کے لئے رجوع کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب انہی کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ان کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا ہے۔ اور وہ اپنے قلوب میں بھی حاضرانہ یا غائبانہ بلاکسی ظاہری سبب کے کیفیات خاصہ محسوس کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب حضرت کی نظر و توجہ کا ہی نتیجہ ہے چنانچہ اس طبقۂ خیال کے لوگوں کے شبہات کے ازالہ کے لئے آپ نے فرمایا کہ:۔

"یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بغیر قصداً توجہ کئے ہوئے اثر کیسے ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض قلوب ہی کے اندر تعدیہ کی صفت رکھی ہے۔ جیسے کہ گو آفتاب کا یہ قصد نہیں ہوتا۔ کہ اس کا نور دوسروں کو پہنچے۔ لیکن پھر بھی اس کا نور دوسروں کو پہنچتا ہی رہتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر یہ صفت رکھ دی ہے کہ جو شے اسکے مقابل میں آجاتی ہے۔ وہ منور ہو جاتی ہے۔"

یہ صرف کتاب و سنت کے اتباع کامل اور انبیائی طریق پر تعلیم و تربیت کرنے کی برکت تھی کہ حضرت کے قصد و ارادہ کے بغیر بھی لوگوں کو حضرت سے فیض پہنچتا رہتا تھا۔ حضرت سے تعلق اصلاح قائم کرنے کے بعد وہ اتباع شریعت کا اہتمام کرتے رہتے تھے اور انہیں ہر وقت جائز و ناجائز کی فکر دامنگیر رہتی تھی۔ جس سے لوگ فوراً سمجھ جاتے تھے کہ یہ حضرت تھانوی کے مرید ہیں۔

چنانچہ ایک دفعہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک معمر جہاں دیدہ بزرگ امیر شاہ خاں بھی مقیم تھے۔ جو بڑے بڑے بزرگوں کی زیارت اور صحبت یافتہ تھے۔ ان سے مجذوب صاحب نے پوچھا کہ یہ لالٹین جو آپ روشن کئے ہوئے ہیں۔ مدرسہ کی تو نہیں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا تم مولانا اشرف علی کے مرید ہو؟

حضرت مجذوبؒ نے فرمایا جی ہاں! اس پر خانصاحب نے فرمایا کہ :-

"مَیں نے ایسی باتوں کا خیال مولانا ہی کے مریدوں میں دیکھا ہے۔ اسلئے پہچان گیا تھا کہ تم مولانا کے مرید ہو"۔

اسی طرح فتح پور کے ایک صاحب نے جو حضرت تھانوی سے بیعت تھے۔ صاحب اشرف السوانح سے اپنے ان پڑھ معمار کا ذکر کیا کہ جب سے وہ حضرت تھانوی سے بیعت ہوا ہے۔ اس کو یہ فکر لگی رہتی ہے کہ جس رفتار سے ٹھیکہ کا کام کیا جاتا ہے۔ اسی رفتار سے امانی کام بھی ہونا چاہیے یہ واقعہ بیان کر کے انہوں نے اعترافاً کہا کہ :-

"حضرت مولانا کا یہ اثر ہم نے ضرور دیکھا ہے کہ جس کو حضرت سے تعلق ہو جاتا ہے اس کو شریعت پر عمل کرنے کا بہت اہتمام ہوتا ہے اور وہ ہر وقت جائز و ناجائز کا خیال رکھتا ہے"۔

یہ اسی اتباع و انقیاد کا نتیجہ تھا کہ حضرت کا قریب قریب ہر منتسب بفضلہ تعالےٰ مقتدا کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور لوگ اس کے افعال سے تمسک کرتے تھے۔ جس کا حضرت تھانوی نے بمسرت ان الفاظ میں ذکر فرمایا تھا کہ :-

"اللہ تعالےٰ کا فضل ہے کہ میرے یہاں حقیقت طریق سے کوئی ناواقف نہیں اور یہ میرے کھرے پن کی بدولت ہے۔ ورنہ میرے یہاں بھی غلط مبحث ہو جاتا۔ اب جتنے ہیں۔ ان پر بفضلہ تعالےٰ اطمینان تو ہے اور میرے نزدیک تو قریب قریب ہر شخص قابل اجازت ہے میں سب کو اجازت دے دیتا ۔ لیکن مصالح دینیہ کا مقتضا یہ ہے کہ صاحب اجازت میں کسی نہ کسی قسم کی کچھ ظاہری وجاہت بھی ہو۔ دینی یا دنیوی۔ مثلاً اہل علم ہو یا کسی معزز طبقہ کا فرد ہو تا کہ اس کی طرف رجوع کرنے میں کسی کو عار نہ ہو اور نہ طریق کی بے وقعتی ہو"۔

(۲)

حکیمانہ تدابیر مطب اشرفیہ میں بقول مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی :-

"نسخے بڑے بڑے بدحال مریضوں کو بھی ملتے تھے۔ یہ نہ تھا کہ اس دربار میں صرف ارادو انقیاد آئیں اور محض ذکر و شغل کی تعلیم لے کر چلے جائیں۔ یا فقط شب بیدار۔ تہجد گزار حاضر ہوں اور اوراد و تسبیحات میں اضافہ کر کرا کے واپس ہو جائیں۔ یہاں گنجائش اسی وسعت قلب۔ اسی خلق و لطف کے ساتھ اشقیاء و اشرار کی بھی تھی"۔

(حکیم الامت ص۵۵)

حکیم الامت کی نظر ہمیشہ مریض کی مرضی پر نہیں بلکہ مریض کی مرض پر رہتی تھی۔ وہ اپنے پرائے میں قطعاً کوئی امتیاز نہ فرماتے تھے۔ بسلسلہ اصلاح اپنے مخلصین۔ نیازمند اور خادموں کو ضرورت کے وقت دینی ضرر سے بچانے کیلئے بالکل اسی طرح روکتے ٹوکتے تھے۔ جس طرح دوسروں کو اور جہاں روکنے ٹوکنے کی ضرورت نہ سمجھتے وہاں بالکل محبت و شفقت سے پیش آتے اور بڑی خوبی سے دلجوئی فرماتے۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں کہ:۔

"تسکین قلب کا تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک اتھاہ سمندر ہر وقت بہہ رہا ہے۔ بدتر سے بدتر اپنی حالت پیش کیجئے۔ اور جواب میں تسکین و تسلی ہی حاصل کیجئے۔ مایوس کرنا تو گویا حضرت جانتے ہی نہ تھے" (حکیم الامت صـ۱۲۷)

اسی طرح علاج میں مریض کی قوت برداشت اس کے مذاق اور دلچسپی کی بھی خاص رعایت فرماتے تھے۔ سب کے لئے ایک ہی نسخہ نہیں دیا جاتا تھا۔ بلکہ جو ہی کوئی طالب آتا۔ تو آپ اپنے نورِ فراست سے مناسبت و عدم مناسبت کا حال معلوم کر کے اس کا ویسا ہی علاج شروع فرما دیتے۔ اگر دیکھتے کہ اسے آپ سے مناسبت نہیں ہو سکتی۔ تو آپ اس کا اور اپنا وقت ضائع کئے بغیر اسے فی الفور فرما دیتے کہ آپ اپنا علاج کسی دوسری جگہ سے کرائیں اور اگر کوئی رہنمائی کی درخواست کرتا۔ تو اسے اس کے مناسب حال کسی بزرگ کا پتہ بتا دیتے۔ اسے تو زبردستی ڈالنے کی کوشش نہ کرتے۔ اور جس سے مناسبت معلوم ہوتی اسے ٹھہرا لیتے۔ اس سے موجودہ معمولات دریافت فرماتے اور ان میں ہی مناسب کمی بیشی فرما کر اوراد تجویز فرماتے۔ آپ اس کی وجہ یہ بتلاتے تھے کہ

"پرانے معمولات سے چونکہ انس ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان کو چھوڑنے کو بھی دل گوارا نہیں کرتا۔ اور ان سے دلچسپی بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں بلا ضرورت ان کو نہیں چھڑواتا۔ نیز قدیم معمولات میں مداومت کی بدولت ایک خاص برکت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب مرحوم لکھنوی کو میں نے فقط تلاوت قرآن کی کثرت تجویز کی۔ تو وہ شگفتہ ہو گئے۔ اور کہنے لگے کہ یہ تو بالکل آپ نے میرے مذاق کی چیز بتلا دی۔ مجھے تو تلاوت سے بہت ہی دلچسپی ہے۔ اسی طرح ایک صاحب کے لئے میں نے کثرت نوافل تجویز کی۔ تو انہوں نے بھی یہی کہا"

ایسے واقعات چونکہ روزمرہ پیش آتے رہتے تھے۔ اسلئے حاضرین مجلس کو حضرت کے صاحب کشف ہونے کا بالکل یقین ...... ہو گیا تھا۔ جس کی حضرت بتاکید یہی نفی فرمایا کرتے تھے

کہ:-

"بات یہ ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کو کوئی کام لینا ہوتا ہے اس کو اس کام کی سمجھ بھی عطا فرمادیتے ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام میرے سپرد فرما رکھا ہے۔ اسلئے وہی میری دستگیری فرماتے ہیں۔ ورنہ میں کیا چیز ہوں"۔

علاوہ ازیں حضرت کے ہاں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ ذکر و شغل کی لذت میں پڑکر کوئی تارک الدنیا نہ ہو جائے۔ بلکہ پورے خلوص و تزکیہ قلب کے ساتھ امکان بھر حقوق اللہ ادا کرے۔ فرائض و واجبات میں حتی الوسع غفلت نہ برتے۔ اللہ کے بندوں سے میل ملاپ رکھے۔ ماں باپ۔ بہن بھائی۔ بیوی بچوں۔ استاد شاگرد۔ ملازم آقا۔ دوست احباب اور ہمسائے کے حقوق پہچانے اور امکان بھر ادا کرے۔ بلا ضرورت دنیا کے مخمصوں اور دوسروں کے قضیوں میں نہ پڑے۔ بلا وجہ کسی کی دلآزاری۔ دل شکنی نہ کرے۔ اپنے احتساب و اصلاح کی فکر میں رہے اور موجودہ ذرائع معاش کو اس وقت تک ترک نہ کرے۔ جب تک اس سے بہتر ذریعہ معاش حاصل نہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ آپ ایسی ملازمتوں کے اختیار کرنے کی بھی اجازت دے دیتے تھے۔ جن کا اختیار کرنا بظاہر محل نظر ہوتا۔ بشرطیکہ کسی نہ کسی مجتہد کے قول سے اس کے جواز کی گنجائش نکل سکتی۔ کیونکہ تنگی معاش میں آپ شدید دینی ضرر محسوس فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے خواجہ عزیز الحسن مجذوب کو نشیات و مسکرات کے محکمہ آبکاری کی انسپکٹری قبول کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ کیونکہ اس وقت اور کسی نوکری کی امید نہ تھی۔ اور جونہی اس سے بہتر نوکری ڈپٹی کلکٹری کی صورت نکل آئی۔ تو آپ نے فوراً اسے قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ حسن اتفاق ایسا کہ ڈپٹی کلکٹری میں انہیں قانون کے ہاتھوں مجبور ہو کر خلاف شرع فیصلے کرنے پڑے۔ جس سے طبیعت پر بوجھ پڑنے لگا۔ ادھر ذکر و شغل میں انہماک بڑھا۔ ادھر ملازمت کی مستقلی کے لئے امتحان لازمی قرار دیا گیا۔ جس کی طرف بوجہ ذکر و شغل طبیعت راغب نہ ہوتی تھی۔ اسلئے انہوں نے امتحان نہ دینے کے سلسلہ میں حضرت کو خط لکھا آپکے جواب یہ:-

"ہمت نہ ہاریئے۔ گو طبعاً ناگوار ہو۔ لیکن دل کو بہ تکلف متوجہ کر کے امتحان کو پاس ہی کر لینے کی کوشش کیجئے اور پریشانی کو پاس نہ پھٹکنے دیجئے ع حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد۔ امتحان کو ضرور پاس کر لینا چاہیئے تاکہ اہل دنیا کی نظر میں ذلت نہ ہو۔ اس مردار دنیا کو حاصل کر لینے کے بعد ہی چھوڑنا چاہیئے۔ تارک الدنیا ہونا چاہیئے

نہ کہ منزدک الدنیا۔ اگر آپ امتحان پاس نہ کر سکے اور علیحدہ کر دیئے گئے۔ تو آپ ڈپٹی کلکٹری کو کیا چھوڑیں گے۔ خود ڈپٹی کلکٹری ہی آپ کو چھوڑ دے گی۔ حالانکہ ہونا چاہیئے برعکس"۔

چنانچہ خواجہ صاحب نے بہمت امتحان پاس کر لیا۔ اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹری چھوڑ دی کیونکہ خلاف شرع فیصلے کرنے آپ سے ممکن نہ تھے۔ اور اس کے بعد انسپکٹر آف سکولز مقرر ہو گئے۔ غرضیکہ جس جرم میں سرسید مرحوم مطعون تھے۔ وہ جرم یہاں بھی روا تھا۔ فرق صرف مصلحت و حکمت کا تھا۔ حضرت تھانویؒ بذیل دین ایسی ملازمتوں کے اختیار کرنے کی اجازت و ترغیب دیتے تھے اور سرسید بذیل دنیا لوگوں کو سرکاری ملازمتوں کے لئے آمادہ اور تیار کرتے رہتے تھے۔

یہ حضرت تھانوی کی حکیمانہ تدابیر کا ہی اثر تھا کہ لوگوں کو بے اختیار آپ کی طرف کشش ہونے لگتی۔ جہاں جاتے لوگ بہت بڑی تعداد میں آپ کے گرد جمع ہو جاتے۔ راستہ کے ہجوم دبلے مرقع مصافحوں سے تنگ آکر آپ لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی دیتے۔ لیکن پھر بھی لوگ آپ پر پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتے۔ اور ایک جم غفیر ساتھ ہو جاتا۔

(۳)

شاہانہ سیاست دنیوی سلطنتوں کی طرح دینی ریاست بھی اصول سیاست پر ہی چلتی ہے بادشاہ کی طرح مصلح کی بھی ایک ذاتی زندگی ہوتی ہے اور ایک جماعتی اور اصول سیاست کے تحت دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ رعایا عموماً دین ملوک پر چلتی ہے۔ اسلئے اصولی طور پر بادشاہوں کو ایسے حالات پیدا کرنے لازمی ہوتے ہیں جن سے رعایا کے اخلاق و عادات پر اچھا اثر پڑے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ نظم و نسق بھی قائم رکھنا پڑتا ہے اور سعی صلاح و فلاح بھی جاری رہتی ہے۔ اس غرض کے لئے مختلف قسم کے اصول و ضوابط پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ کہیں نرمی سے کام نکل آتا ہے اور کہیں سختی سے کام نکالنا پڑتا ہے۔ کیونکہ مختلف مزاج اور خیال کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور جن مصالح پر راعی کی نظر ہوتی ہے۔ رعایا کی نظر شاذونادر ہی ان تک پہنچتی ہے۔ اسلئے رعایا کو راعی کے انتظام میں کم ہی عمل دخل ہوتا ہے بعینہ یہی حالت دربار اشرفیہ میں تھی۔

حضرت تھانویؒ مصلح ہونے ہوئے بھی بشری اور خلقی کمزوریوں سے منزہ نہ تھے۔ دوسروں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ انہیں خود اپنی ذات کی اصلاح کی بھی فکر دامنگیر رہتی تھی۔ تا کہ ان سے کوئی ایسا فعل سرزد

نہ ہو جو عند اللہ و عند الرسول ناپسند اور عند الناس مضر و ہلاک ثابت ہو۔ اسلئے آپ نے اپنی اصلاح کے لئے بھی وہی طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ جو دوسروں کے لئے مفید سمجھتے تھے۔ جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے کہ:۔

"جب میں اپنے اندر کوئی امر قابلِ اصلاح محسوس کرتا ہوں۔ تو اس کے متعلق بھی وعظ کہہ دیتا ہوں۔ اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بیان کے وقت جوش ہوتا ہے۔ جس سے قلب پر اثر پڑتا ہے۔ نیز شرم بھی آتی ہے کہ جس بات کی نصیحت اوروں کو کر رہے ہیں۔ خود بھی تو اس پر کاربند ہونا چاہیئے۔ "وعظ الغضب" اسی مصلحت سے ہی کہا گیا تھا۔"

اپنے اور دوسروں کی اصلاح کے اس عمومی طریقِ کار کے علاوہ مخصوص حالات میں آپ کا طریق اس سے مختلف تھا۔ اور وہ بھی سنت اللہ سے ناشی تھا۔ جس کی رو سے اکثر و بیشتر مشاہیر حکماء کو اس مرض سے موت دی گئی۔ جس کے وہ ماہر حکیم تھے۔ اس خصوصی طریق کی وضاحت آپ کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ:۔

"اکثر میرا طریقِ اصلاح یہ ہے کہ جس شخص کو جس فن میں کمال کا دعویٰ ہوتا ہے۔ پہلے میں اس کو اُس فن میں مغلوب کر کے دکھا دیتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ فن مقصود ہو۔ پھر تو مجھے حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اصلاحی امور میں بھی اس کو اپنا تابع بناؤں۔ پھر اس کو بھی ایسے شخص کے تابع بن جانے میں عار نہیں ہوتی۔ منازعت کا حق نہیں رہتا اور نہ تعلیم پر شبہ ہوتا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی آپ کی طرف سے اس بات کی سخت تاکید تھی۔ کہ ان کے طریق کار میں کوئی مخل یا مزاحم نہ ہو۔ کہ یہ اصولِ سیاست کے خلاف ہے۔ اس لئے آپ فرماتے تھے کہ:۔

"امورِ تربیت میں میری رائے میں کسی کو مزاحمت نہیں کرنی چاہیئے۔ بس میں جس کے ساتھ جو معاملہ کروں۔ میرے سب احباب کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ شخص اس معاملہ کا ہی اہل ہے۔"

ایک دفعہ آپ الٰہ آباد میں پالکی گاڑی پر سوار ہوئے۔ اس وقت خواجہ عزیز الحسن مجذوب اور آپ کے محبوب ترین بھانجے مولانا سعید احمدؒ یعنی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے حقیقی بڑے بھائی آپ کے ساتھ تھے۔ مولانا سعید احمد سے آپ کو کس قدر محبت تھی۔ اس کا اندازہ آپ کے اس بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ

"مجھ کو ان کے ساتھ سب سے زیادہ محبت تھی۔ جس کو عشق کہہ سکتے ہیں"۔

مگر اتنی گہری محبت آپ کے طریق اصلاح میں حائل نہ ہو سکی۔ کیونکہ مولانا سعید احمد بوجہ قرابت دادی آپ کے ساتھ ہی پالکی کے اندر بیٹھ گئے تھے۔ اور خواجہ عزیز الحسن مجذوب اندر جگہ نہ ہونے کے سبب بوجہ مرید ہونے کے ہانکنے والے کے برابر بیٹھ گئے۔ حضرت تھانوی چونکہ بات بات اور قدم قدم پر سبق دینے کے عادی تھے۔ اور وہ اپنے بھانجے کے مزاج سے بخوبی واقف تھے جو بقول حضرت تھانوی"

"نہایت شاندار لباس پہنتے تھے۔ اور دماغ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ کہا کرتے تھے کہ اگر نوکری ہو۔ تو کم از کم ہزار روپیہ ماہوار کی تو ہو"۔

اسلئے آپ نے خواجہ صاحب کو تو اندر بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور مولانا کو باہر جا کر ان کی جگہ پر بیٹھنے کا امر فرمایا۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی نشست آداب قرابت داری کے بالکل خلاف تھی۔ مگر آپ کی نظر اس وقت قرابت و محبت پر نہ تھی۔ بلکہ اصلاح نفس پر تھی۔ جو اصل مقصود تھا۔ اسلئے آپ نے ازالۂ شبہ کے لئے اس وقت خواجہ صاحب سے فرمایا کہ

"اس میں دونوں کی مصلحت ہے۔ ان کی تو یہ مصلحت ہے کہ ان میں تواضع پیدا ہو۔ اور آپ کی یہ مصلحت ہے کہ آپ میں ضرورت سے زیادہ تواضع پیدا ہو کر ترقی معکوس نہ ہونے لگے یعنی آپ کو یہ عجب نہ ہونے لگے کہ میں کس قدر متواضع ہوں"۔

یہ حضرت کی اس عجیب و غریب سیاست کا ہی نتیجہ تھا کہ مولانا سعید احمد کی تو بقول حضرت یہ حالت ہو گئی کہ

"بالکل مٹ کر فانی ہو گئے اور اپنے آپ کو چماروں اور بھنگیوں سے بھی زیادہ ذلیل و خوار سمجھنے لگے۔ اور نہایت سادہ وضع میں رہنے لگے۔ یہاں تک کہ انتقال کے بعد جب ان کے کپڑے بغرض تقسیم ترکہ نکالے گئے۔ تو ان کی سادگی دیکھ کر سب کو حیرت و حسرت ہوتی تھی۔ بلکہ خود مجھے بھی ان کپڑوں کی حالت دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں رونا آتا تھا"۔

اور حضرت مجذوبؒ تو اپنے عشق و محبت کی وجہ سے خسرو ثانی اور تعلیم و تربیت کے فیض سے خلیفہ خاص بن گئے تھے۔ اس مجذوبی عشق کی کیفیت خود مجذوب صاحب کی زبانی ہی لطف دے گی وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"مشرف بہ بیعت ہو جانے کی برکت سے احقر کے اندر بھی بفضلہٖ تعالےٰ بہت زیادہ فکر جائز و ناجائز پیدا ہو گئی تھی۔ جس کے بعض واقعات اوپر ذکر کئے گئے ہیں۔ اور حضرت والا کے ساتھ عشق و محبت کا تو وہ عالم تھا کہ اس کو سن کر ایک ناآشنائے محبت اور ناواقفِ طریق دیوانگی سے تعبیر کرے گا۔ اور ایک بے ذوق اور روکھا پھیکا شخص مضحکہ اڑائیگا۔ لیکن میں بمصداق

گرچہ بدنامیست نزدِ عاقلاں　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

ان دونوں قسم کے لوگوں کی کچھ پروا نہ کر کے اپنے اُن محبوب حالات کو بھی جو حضرت والا کی فرطِ محبت میں مجھ پر طاری ہوئے تھے۔ اہلِ محبت اور اہلِ ذوق کی ضیافت طبع کے لئے ضرور عرض کروں گا۔ اور اگر کوئی ناآشنائے محبت ایسی محبت کو دیوانگی سے تعبیر کرے گا۔ تو میں اس سے یہ کہہ دونگا ع اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد۔ اگر کوئی بے ذوق ایسی محبت پر مضحکہ اڑائیگا تو میں اس کو ترکی بہ ترکی یہ جواب دونگا ع چہ داند بوزنہ لذتِ ادراک۔

اس مختصر مگر ضروری تمہید کے بعد میں اپنے مذکورہ بالا محبوب حالاتِ محبت میں سے بھی بطور نمونہ بعض حالات کو بلحاظ کیفیت قلبیہ یہ اشعار پڑھتا ہوا بیان کرتا ہوں کہ

ما اگر قلاش گر دیوانہ ایم　　مستِ آں ساقی و آں پیمانہ ایم

گفتگوئے عاشقاں در کارِ رب　　جوششِ عشق است نز ترکِ ادب

ایک بار عشق و محبت کے جوش میں حضرت والا سے بہت جھجکتے اور شرماتے ہوئے دبی زبان سے عرض کیا کہ حضرت ایک بہت ہی بیہودہ خیال دل میں بار بار آتا ہے جس کو ظاہر کرتے ہوئے بھی نہایت شرم دامنگیر ہوتی ہے۔ اور جرأت نہیں پڑتی۔ حضرت والا اس وقت نماز کے لئے اپنی سہ دری سے اٹھ کر مسجد کے اندر تشریف لے جا رہے تھے۔ فرمایا کہیے کہیے۔ احقر نے نہایت شرم سے سر جھکائے ہوئے عرض کیا کہ میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں عورت ہوتا حضور کے نکاح میں۔ اس اظہارِ محبت پر حضرت والا غایت درجہ مسرور ہو کر بے اختیار ہنسنے لگے اور یہ فرماتے ہوئے مسجد کے اندر تشریف لے گئے کہ یہ آپ کی محبت ہے ثواب ملیگا۔ ثواب ملیگا انشاء اللہ

حضرت والا اب تک اس واقعہ محبت کو بھولے نہیں۔ اپنی مجلس شریف میں احقر کے
اس محبت آمیز قول کو بہ لطف نقل فرما فرما کر مزاحًا فرمایا کرتے تھے کہ غنیمت ہے۔
اس کے برعکس کی خواہش نہیں کی۔

احقر کو اس زمانہ میں حضرت والا کی محبت کا اس قدر جوش تھا۔ کہ بس یہ جی چاہتا تھا۔
کہ بغل میں حضرت والا کی کتابیں ہوں اور ہر کس و ناکس۔ اہل و نا اہل۔ بلکہ در و دیوار۔
شجر و حجر۔ کو غرض سب سے دیوانہ وار حضرت کا تذکرہ کرتا پھروں اور سب کو حضرت
کی کتابیں سناتا پھروں۔"

یہ عشق و محبت اور تعلیم و تربیت کا جوش و خروش اسی سیاستِ صالحہ کا نتیجہ تھا۔ جس کا روزانہ
دربار اشرفیہ میں مشاہدہ ہوتا رہتا تھا۔ دراصل حضرت مجذوبؒ نے مذکور الذکر واقعہ بیان کر کے تو حضرت
کے سینکڑوں مجازین و مسترشدین اور ہزاروں منتسبین کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت مولانا
سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے فاضل اجل اور مورخ اسلام کی بھی بالکل یہی کیفیت تھی۔ گویا حضرت
سیاست سے لوگوں کو اپنا گرویدہ نہ بناتے تھے۔ بلکہ سیاست کی محبت لوگوں کو حضرت کی گرویدگی پر مجبور کر دیتی تھی۔
غرضیکہ حضرت ہر شخص کے ساتھ اس کے حسبِ حال اخلاص و محبت سے سیاست برتتے تھے
جہاں سختی کی ضرورت محسوس کرتے تھے سختی فرماتے تھے اور جہاں نرمی کی ضرورت سمجھتے تھے۔ وہاں
نرمی فرماتے تھے۔ بلا ضرورت شدت کے اور بلا مصلحت نرمی برتنے کے قطعًا عادی نہ تھے چنانچہ
ایک مرتبہ ایک لڑکے کو اس کے باپ وغیرہ حضرت کی خدمت میں لائے کہ اس کا ایک بازاری عورت
سے تعلق ہو گیا ہے۔ ساری جائداد تباہ کئے جا رہا ہے۔ اسے سمجھا دیجئے۔ حضرت نے اپنے نورِ بصیرت
سے اس کے تمام کوائف کا فی الفور جائزہ لے لیا۔ اسے نہ مارا نہ ڈانٹا۔ بلکہ نہایت محبت و پیار
سے اسے رشتہ داروں سے الگ کر کے مسجد کے اندر تنہائی میں لے گئے اور اسکے ہمدرد و ہمراز بن
کر فرمانے لگے۔ کہ "میاں ان لوگوں کو عشق کی کیا خبر۔ یہ کیا جانیں کہ کسی کے دل کو کیا لگی ہوئی ہے
تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ آخر وہ کونسی مجبوری ہے۔ جس کی وجہ سے نہ تو تم کو اپنی عزت و آبرو کا خیال
ہے۔ نہ اپنی جائداد کی تباہی کی پرواہ ہے" یہ باتیں ابھی ہو ہی رہی تھیں کہ اس کے اقربا وہاں آ کر
سننے لگے۔ کہ تخلیہ میں کیا بات ہو رہی ہے۔ آپ نے ان کو ڈانٹا کہ "یہ کیا واہیات حرکت ہے تم اپنا
کام کرو۔ اب میں جانوں یا یہ جانیں۔ تمہیں بیچ میں دخل دینے سے کیا مطلب"۔ اس پر وہ اپنا سا منہ
لے کر باہر چلے گئے۔ اور اس لڑکے کو حضرت کی ہمدردی و خیر خواہی کا یقین ہو گیا۔ جب اس کے

اقربا باہر چلے گئے۔ تو حضرت نے پھر اپنا سوال شفقت آمیز لہجہ میں دہرایا تو اس نے آپ کی ہمدردی سے متاثر ہو کر صاف صاف کہہ دیا کہ پہلے تو مجھے واقعی اس سے محبت تھی۔ لیکن اب تو محض نباہنے کی خاطر نباہ رہا ہوں۔ کیونکہ ایک بار پیران کلیر شریف میں اس نے مزار شریف پر مجھ سے عہد لیا تھا کہ میں ہمیشہ اس سے تعلق رکھونگا اور اس کو نہ چھوڑونگا۔ اور خانقاہ کے مجاور نے ہم کو قسم کھلائی اب مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے اس سے تعلق توڑ لیا۔ تو میرے اوپر کوئی وبال نہ آجائے۔ کیونکہ ایک بزرگ کے مزار پر قسم کھائی ہے۔

یہ حقیقت سننے کے بعد حضرت نے اس سے سوال کیا کہ تم مجھے اپنا خیرخواہ بھی سمجھتے ہو یا نہیں؟ اس نے کہا بیشک۔ آپ نے دوسرا سوال کیا کہ تم مجھے سچا بھی سمجھتے ہو یا نہیں؟ اس نے اس کا بھی اقرار کیا اس پر حضرت نے فرمایا کہ:-

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم اس عہد کو نہ توڑو گے تب تو وبال آئیگا۔ اور اگر توڑ دو گے تو اس کی وجہ سے ہرگز کسی قسم کا وبال نہ آئیگا۔ ایسے عہد کا توڑنا ہی واجب ہے البتہ چونکہ عہد کر لینے سے قسم ہو گئی ہے۔ اسلئے قسم کے توڑنے کا کفارہ دینا پڑیگا۔ اور وہ کوئی ایسی بات نہیں آسانی سے دیا جاسکتا ہے۔"

اس پر وہ کہنے لگا کہ بس اب میری تسلی ہو گئی ہے اب میں اس کو چھوڑ ہی دونگا۔ آپ مجھے صرف ایک بار اس کے پاس جانے کی اجازت دیدیں کہ میں اس کو اطلاع کر آؤں کہ اب مجھ کو تجھ سے کوئی تعلق نہیں یہ اجازت اسلئے چاہتا ہوں کہ اس کو میرا انتظار نہ رہے۔ کیونکہ اس کو انتظار میں رکھنا ایک قسم کی بے مروتی ہے نہ معلوم بیچاری کب تک میرا انتظار کرتی رہے اسکی حضرت نے اسے مصلحت اجازت اس شرط پر دیدی کہ سوا اطلاع کے اور کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ جب اس کے اقربا کو اس اجازت کا پتہ لگا تو وہ کہنے لگے کہ حضرت یہ تو اس کا محض بہانہ ہے۔ آپ سے بھی کس چالاکی سے ملنے کی اجازت لے لی یہ آنا جانا نہ چھوڑیگا۔ حضرت نے انہیں ایک اور ڈانٹ بتائی کہ تمہیں کیا خبر۔ مجھے ان پر اطمینان ہے چنانچہ وہ وہاں سے چلے گئے اور کچھ دنوں کے بعد اس کے والدین نے خانقاہ میں آکر شیرینی تقسیم کی کہ واقعی ان کے لڑکے کا اس عورت سے تعلق چھوٹ گیا ہے۔

اب اس نرمی کے معاملہ میں سختی کا معاملہ دیکھئے کہ تھانہ بھون کے قریب کا ایک پابند صوم و صلوٰۃ ایک برہمنی بیوہ پر مفتون ہو گیا۔ اور دودھ لینے کے بہانہ سے روزانہ وہاں جا کر نظر بازی کرتے لگا۔ اسے اس بلا میں گرفتار دیکھ کر اس کے ایک دوست نے اسے حضرت تھانویؒ کے پاس جانے کا مشورہ دیا

چنانچہ وہ وہاں حاضر ہوا۔ اور ایک پرچہ لکھ کر حضرت کے پیش کیا کہ:۔

"مجھے اس سے اس قدر محبت ہو گئی ہے کہ اگر وہ مجھے اپنا پیشاب بھی پلائے تو بلا کراہت پی لوں"

حضرت نے اسے نرمی سے فرمایا کہ وہاں نہ جایا کرو۔ اس نے کہا کہ میں تو قصداً جاتا ہوں۔ اس پر حضرت کو غصہ آیا اور بے تحاشا ایک تھپڑ رسید کیا اور بڑے زور سے ڈانٹ کر فرمایا کہ:۔

"نالائق جب تو قصداً بد پرہیزی کرتا ہے تو مجھ سے علاج پوچھنے کیوں آیا ہے؟ جھلے میں جا۔ اپنے ہاتھوں کلہاڑی مارنے کا میں کیا علاج کروں"

بس اس تھپڑ نے اس کے نفس پر تازیانہ کا کام کیا۔ اس کے دماغ سے خناس نکل گیا اور اس نے ہمیشہ کے لئے وہاں جانا بند کر دیا۔

غرضیکہ اس طرح حضرت ہر ایک کی طبیعت اور مزاج کے موافق نرمی گرمی سے اس کی باطنی امراض کا علاج فرماتے رہتے تھے۔ اور ایسا کرنا آپ کا اختیاری معاملہ نہ تھا۔ بلکہ قطعاً غیر اختیاری معاملہ تھا۔ دستِ قدرت ہی اس وقت مزاج کو نرم گرم کر دیتا تھا۔ چنانچہ اس غیبی امداد کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ:۔

"سختی کا طرز میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے اور مجھے بعد کو بڑی کلفت و ندامت بھی ہوتی ہے اور رہ رہ کر سوچا کرتا ہوں کہ بجائے اس طرح کہنے کے اس طرح بھی کہہ سکتا تھا۔ بجائے یوں سمجھانے کے یوں بھی سمجھا سکتا تھا۔ بجائے اس تجویز کے یہ تجویز بھی کر سکتا تھا۔ لیکن عین وقت پر مصلحتِ اصلاح کا ایسا غلبہ ہوتا کہ اور کوئی مصلحت پیش نظر رہتی ہی نہیں۔ اور یہ جبھی تک ہے جب تک میں نے اپنے ذمہ اصلاح کی خدمت سمجھ رکھی ہے اور اگر کبھی اس سے قطع نظر کر لی۔ تو پھر میں انشاء اللہ تعالیٰ خوش اخلاق بھی بن کر دکھلا دونگا۔ میرا اصلی مذاق تو یہی ہے کہ کسی سے کچھ تعرض ہی نہ کروں اور بقول احمد جامؒ اپنے آپ کو سب سے یکسو رکھوں ؎

احمد تو عاشقی بہ مشیخت ترا چہ کار

دیوانہ باش سلسلہ شد شد نہ شد نہ شد۔

یہ وہ حالات تھے جن کے تحت آپ مسند ارشاد پر بیٹھے اور تا زیست ہمہ تن تزکیہ و تصفیہ خلق اور رشد و ہدایت کے کام میں مشغول رہے جس کی تفصیل کے لئے ایک الگ دفتر کی ضرورت ہے ؛

بہارِ زندگی

کچھ ہوش ہے۔ تو چشمِ حقیقت نگر سے دیکھ
مخمور! ذرّے ذرّے میں حسنِ الٰہ ہے

(حفیظ جالندھری)

شمائل

حلیہ | نورانی صورت۔ گندمی رنگ۔ فراخ چہرہ۔ گول اور بھرا ہوا۔ سر بڑا مگر موزوں۔ پیشانی متوسط
آنکھیں نہایت شرمیلی نیچی اور اندر سرخ ڈورے۔ ابرو گنجان مگر خمیدہ۔ دہن متوسط۔ دندان
پیوستہ۔ لب پتلے۔ بینی موزوں۔ سینہ کشادہ۔ قد درمیانہ۔ ہاتھ قوی اور پُر گوشت۔ شانے اور بازو
بھرے ہوئے۔ ہڈیوں کے جوڑ بڑے بڑے اور ابھرے ہوئے۔ گردن نہ بہت پتلی نہ بہت موٹی نہ
بہت اونچی۔ ہاتھوں کی انگلیاں نہ بہت لمبی نہ بہت موٹی نہ پتلی۔ ہتھیلیاں نہایت نرم۔ پاؤں کی
ایڑیاں بھاری۔ ڈاڑھی بھری ہوئی اور گنجان۔

بال | سر کے بال نہ بالکل سیدھے نہ بہت گھنگریالے۔ ان کی وضع مختلف اوقات میں مختلف رہی
جوانی میں پٹھے تھے۔ اس وقت مانگ اور کنگھی وغیرہ کی عادت تھی۔ ان کو دھونے وغیرہ
کی پابندی سے پٹھے کٹوا دیئے۔ پھر صرف قینچی سے بال کتروانے کی عادت آخر تک رہی۔ ڈاڑھی
کے بال کچھ سیاہ اور کچھ سفید۔ سینہ پر بال زیادہ۔

چال | چال نہ بہت تیز۔ نہ ہی بہت آہستہ۔ اور جب کوئی ہمراہی ہوتا۔ تو اس کی رعایت چال میں
ضرور فرماتے۔ کیونکہ تمام افعال میں اپنے مقابلہ میں دوسرے کی آسائش کو ترجیح دیتے
تھے۔ قدم نہ بڑے بڑے رکھتے تھے نہ منتشر نہ چھوٹے چھوٹے۔ بناوٹ سے حضرت کی طبیعت
کو مس ہی نہ تھا۔ اور ترک لایعنی اس درجہ طبیعت میں داخل تھی کہ اگر غور سے دیکھا جاتا۔ تو چال
ڈھال۔ جملہ حرکات و سکنات اور تمام اقوال و افعال میں کوئی چیز بھی ایسا نہ تھا جو حیا اور وقار کی وجہ
سے خالی ہو۔ اور جس میں شرعی اور عقلی دونوں قسم کی حکمت بلکہ متعدد حکمتیں جمع نہ ہوں یعنی حکیم الامت
کا لقب حضرت کے لئے بالکل اسم بامسمیٰ تھا ؎

اے قبائے رہنمائے راست بر بالائے تو
علم و حکمت را شرف از گوہر والائے تو

آواز | آواز نہ اتنی پست تھی۔ اور نہ اتنی بلند کہ ناگواری پیدا ہو جائے۔ بلکہ نہایت شیریں اور مردانی

تھی۔ خشوع اور جذبۂ محبت آواز سے ہی پیدا تھا۔ چلّا کر بات کرنے کی قطعًا عادت نہ تھی بقدرِ ضرورت جہر کے ساتھ کلام فرماتے اور وعظ میں تمام مجمع کو آواز پہنچتی تھی۔

مزاج مزاج دموی مائل بحرارت تھا۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے اعضا کی خوشنمائی۔ جسم کا دہرا ہونا۔ انفعال کا اعتدال اس کے دلائل ہیں۔ مزاج میں حرارت کچھ تو طبعی زیادہ تھی۔ جیسا کہ دموی مزاج کا مقتضا ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ عنفوانِ شباب میں کسی طبیب نے سنکھیا کا دہواں پلایا تھا۔ اس وجہ سے مبردات کا استعمال مفید اور مرغوب تھا۔ پھر ذکرِ الٰہی اور جوشِ محبتِ خداوندی نے حرارت میں اور اضافہ کر دیا۔ لیکن یہ حرارت چونکہ حرارت غریبہ نہیں ہوتی۔ بلکہ حرارت غریزی کی بھی روح ہوتی ہے۔ اس واسطے بجائے یبوست بڑھانے کے لطافتِ مزاج، قوت۔ صحتِ ادراک۔ سلامتِ فہم۔ نورانیتِ حواس اور اعتدالِ افعال کا باعث ہو گئی۔

قوت ورنہ جس قدر کام حضرت کے دماغ سے لیا گیا تھا۔ قوی سے قوی خلقت کا انسان بھی کرتا تو دماغ کبھی کا ختم ہو جاتا۔ اور اختلالِ حواس بلکہ جنون کی نوبت آجاتی۔ ماہرین اس پر متفق تھے کہ ایسے قوی الجثہ۔ صحیح الفہم اور سلیم الحواس آدمی کم ہوتے ہیں۔

گفتگو نہ تیز۔ نہ ٹھہر ٹھہر کر بلکہ بہت صاف کرتے تھے۔ جس میں تسلسل ہوتا تھا۔ گنجلک مطلق نہ ہوتی تھی۔ اگر خود ضرورت سمجھتے یا کوئی سوال کرتا۔ تو پھر بات دہرا دیتے تھے۔ ورنہ گفتگو اتنی واضح اور صاف فرماتے تھے کہ دہرانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ اس لئے دہرانے کی عادت نہ تھی مجالس میں بشاش اور گویا رہتے تھے۔ جیسے دریائے معارف وحقائق جوش وخروش سے بہہ رہا ہو جس کی وجہ سے اتنے کثیر ملفوظات اور مواعظ جمع ہو گئے۔ جن سے لاکھوں انسان فیض یاب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

تفکّر عام مجالس میں کبھی متفکر نظر نہیں آتے تھے۔ البتہ حسب حالات باطنی خلوت میں کبھی کبھی متفکر رہتے تھے۔ ویسے اکثر مسرور ہی دکھائی دیتے تھے۔

اشارہ کرنے کے قطعًا عادی نہ تھے۔ جو کچھ بھی کہنا ہوتا۔ زبان سے صاف فرماتے۔

تبسّم مجالس میں چہرہ پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ ہنسی کی بات پر ہنستے بھی تھے ہنسانے بھی تھے۔ گر مطابق سنت قہقہہ مار کر کبھی نہ ہنستے تھے۔

ہیبت اعضا کے تناسب۔ چہرہ کی نورانیت اور آنکھوں کی سرخی نے جسمانی خوبی کے علاوہ ایسا رعب پیدا کر دیا تھا کہ جلدی کسی کو بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ گر تہذیب و تواضع

اور شرافت۔ بے تکلفی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ جو لوگ ہیبت کے مارے بات کرتے ڈرتے تھے وہ بھی بات کرنے کے بعد دل وجان سے نثار ہونے لگتے تھے۔ گویا مَنْ لَمْ یَرَهٗ هَابَهٗ وَاِذَا رَاٰهُ اَحَبَّهٗ کے پورے مظہر تھے۔ مجموعی حالت جسم کی خوش قطع واقع ہوئی تھی کہ جو لباس پہنتے وہی موزوں ہو جاتا۔ جس وضع و حالت میں ہوتے زیبائی یکساں جلوہ گر ہوتی۔ جس مجمع میں جاتے نظروں کے کیمرے فوراً حضرت کی طرف رخ کر لیتے۔ اور سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ کا نظارہ ہونے لگتا۔ اقوال۔ افعال اور معمولات سے اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا ظہور ہونے لگتا۔

غذا

ماش کی دال اور گوشت مرغوب غذا تھی۔ اکثر ایک وقت میں ایک کھانا کھاتے اور زنانخانہ میں کھاتے۔ اگر مہمان کے ساتھ کھانا ہوتا۔ تو کبھی مکان کے اندر کسی حصہ کا پردہ کرا کر اور اسے اندر بلا کر کھانا کھاتے۔ رات کو آدھ سیر دودھ اکثر نوش فرمایا کرتے۔ بلا اشتہار صادق کھانا نہ کھاتے تھے۔ مجمع کے ساتھ خواہ ایک آدمی ہو۔ کھانے کی مقدار کا اندازہ نہیں رہتا تھا۔ اور تنہا بے فکری سے مگر اندازہ سے زیادہ نہیں کھاتے تھے۔ مطابق سنت مختلف کھانوں سے قطعاً رغبت نہ تھی۔ جو چیز مل جاتی۔ وہی کھا لیتے اور طبیعت خوش ہو جاتی ناشتہ کرنے کی قطعاً عادت نہ تھی۔

لباس

عام طور پر کرتہ صرف گھٹنوں تک لمبا۔ پاجامہ شرعی۔ ٹوپی چوگوشہ۔ جوتہ سلیم شاہی کرتے کے نیچے میل خوری بنڈی سردی میں۔ چھ کلی کی اچکن پہننے کا عام معمول تھا جو اس طرف کے شرفا اکثر پہنا کرتے ہیں اور وہ بھی صرف سردی سے بچنے کے لئے۔ ورنہ صرف کرتہ۔ پاجامہ پہنتے۔ سردی میں عمامہ باندھتے۔ مگر گرمی میں بوجہ حرارت مزاج عمامہ کا متحمل نہ ہوتا تھا۔ اس لئے عام طور پر... چوگوشیہ ٹوپی۔ کرتہ اور پاجامہ میں ہی رہتے۔ خواہ کیسے ہی بڑے سے بڑے مجمع میں بھی جانا ہوتا۔ معمولی پوشاک نہ بدلتے۔ سردی میں موزے بھی پہنتے تھے۔

شلوار قمیض۔ کوٹ یا چوغہ کبھی نہیں پہنا۔ بلکہ اپنے اسلاف کی طرح ہمیشہ سادہ لباس میں رہتے تھے۔ نہ اچکنوں کے عادی اور نہ چوغوں کے دلدادہ تھے۔ جیسے اکثر علما کا معمول ہے اور کوٹ قمیض۔ شلوار کا تو ذکر ہی کیا۔ آپ کو دیکھنے والا لباس سے آپ کو صرف ایک دیندار مسلمان تو سمجھ سکتا تھا۔ مگر عالم یا شیخ سمجھنا تو درکنار۔ بعض اوقات تو ایسا سادہ لباس ہوتا تھا کہ لوگ لکھا

پڑھا آدمی بھی بمشکل سمجھتے تھے۔ مگر

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور　　کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

بس پیشانی کا نور ہی سب کچھ عیاں کر دیتا تھا۔ باوجودیکہ اپنے کو بہت چھپاتے تھے۔ مگر چھپ نہ سکتے تھے۔ خود کو جتنا مٹاتے تھے۔ حق تعالیٰ اتنا ہی سربلند فرماتے جاتے تھے ان جیسی سادگی آج کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے موجودہ زمانہ کے لوگ اپنے اکابر کو سادہ سمجھتے ہوں۔ مگر جس نے آپ کو دیکھا ہے۔ وہ یہی کہتا ہے کہ

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے　　چہ کنم کہ چشم یک بیں نہ کند بہ کس نگاہے

سیر سیر کرنا آپ کے معمول میں داخل تھا۔ مگر پیدل۔ جب تک معذوری (جو اخیر عمر میں ہو گئی تھی) نہ ہوتی۔ روزانہ صبح کو تین چار میل پیدل چلتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ "حفظ صحت کی مصلحت کسی مستحب کی تحصیل سے مقدم ہے۔ مثلاً صبح کی ہوا خوری کے لئے جنگل کی طرف جانا مسجد میں اشراق کی نماز کے لئے تا طلوع آفتاب بیٹھے رہنے سے افضل ہے۔"　　(کمالات اشرفیہ صفحہ ۲۶۲)

سواری آپ سواری کے شوقین نہ تھے۔ اکثر پیدل چلنے کے عادی تھے۔ یہاں تک کہ اسٹیشن سے مکان تک بھی اکثر پیدل ہی آجایا کرتے تھے۔

اخلاق

صفاتِ فاضلہ حضرت تھانویؒ کی صفاتِ فاضلہ بے شمار ہیں۔ اور اگر ہر صفت کے شواہد بھی بیان کئے جائیں۔ تو اس کے لئے دفتر کے دفتر بھی شاید ناکافی ہوں ؎

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں　　بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

صاحب "اشرف السوانح" نے بیان کردہ واقعات کی بنا پر آپ کی صفاتِ حمیدہ کی حسب ذیل فہرست مرتب کی ہے:-

(۱) ادب (۲) اخلاص (۳) استقلال (۴) استغنا (۵) استقامت (۶) استحضار (۷) اعتدال (۸) احتیاط (۹) امانت (۱۰) ایثار (۱۱) برکت (۱۲) بصیرت (۱۳) تدبر (۱۴) توکل (۱۵) تقویٰ (۱۶) تواضع (۱۷) تاثر (۱۸) ترحم (۱۹) تہذیب (۲۰) تدین (۲۱) تیقظ (۲۲) تحمل (۲۳) حیا (۲۴) حکمت (۲۵) خشیت

(۲۶) غیرت (۲۷) سخاوت (۲۸) شجاعت (۲۹) ذہانت (۳۰) قناعت (۳۱) ذکاوت (۳۲) متانت (۳۳) فراست (۳۴) عبدیت (۳۵) محبت (۳۶) شفقت (۳۷) مروت (۳۸) شکر (۳۹) صبر (۴۰) درگزر (۴۱) زہد (۴۲) رفق (۴۳) عدل (۴۴) سادگی (۴۵) ہمدردی (۴۶) دلسوزی (۴۷) دانشمندی (۴۸) انضباط اوقات (۴۹) اہتمام حقوق (۵۰) اہتمام اصلاح امت (۵۱) آزاد طبعی (۵۲) اہتمام دین (۵۳) احاطہ نظر (۵۴) بے ساختگی (۵۵) بلند نظری (۵۶) ترک مالایعنی (۵۷) تعلق مع اللہ (۵۸) تصلب فی الدین (۵۹) حسن خلق (۶۰) حسن معاشرت (۶۱) حسن تدبر (۶۲) حفظ حدود (۶۳) حفاظت امت (۶۴) حق پسندی (۶۵) حقیقت پسندی (۶۶) حق گوئی (۶۷) خیرخواہی (۶۸) خوش طبعی (۶۹) خلوت وجلوت (۷۰) فراخ حوصلگی (۷۱) حاضر جوابی (۷۲) اولوالعزمی (۷۳) سہولت پسندی (۷۴) خوش انتظامی (۷۵) وسعتِ خیال (۷۶) صنعت شناسی (۷۷) رسائی فہم (۷۸) شانِ تحقیق (۷۹) شانِ تربیت (۸۰) مخالفتِ نفس (۸۱) نگرانیِ نفس (۸۲) قوتِ حافظہ (۸۳) لطافتِ طبع (۸۴) رعایتِ جذبات (۸۵) صفائی معاملات (۸۶) زندہ دلی (۸۷) رقیق القلبی (۸۸) دقتِ نظر (۸۹) رجوع الی الحق (۹۰) ملکۂ تحریر و تقریر (۹۱) سلامتِ صدر (۹۲) سلامت فطرت (۹۳) رضا و تفویض (۹۴) مجاہدہ و مراقبہ (۹۵) بیم و رجا (۹۶) قلتِ کلام (۹۷) شانِ کرم (۹۸) شانِ تحقیق (۹۹) اصابت رائے

ان صفاتِ حمیدہ کے تائیدی واقعات کچھ تو آپ کو اس کتاب میں مختلف ابواب میں منتشر حالت میں ملیں گے۔ اور کچھ درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

ادب ادب تمام حسنات و برکات کا سرچشمہ ہے۔ اسی لئے حضرت تھانویؒ اپنے استادوں بزرگوں اور بڑوں کا انتہائی ادب کرتے تھے۔ اور کسی کو ایک منٹ کے لئے بھی ناراض ہونے کا موقع نہ دیتے تھے۔ چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ:-

"الحمد للہ میں نے اپنے بزرگوں کے ساتھ کبھی ظاہرا یا باطنا اختلاف نہیں کیا۔ اور ہر طرح ادب ملحوظ رکھا۔ حالانکہ مجھ کو سینکڑوں احتمالات سوجھتے تھے۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ ہم کیا جانیں۔ اور اگر کبھی کوئی بات سمجھ میں بھی نہ آتی۔ تب بھی دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیتا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ کوئی بات بھی بلا سمجھے نہ رہے۔ در اصل طالبِ تحقیق کے لئے پہلے تقلید ہی ضروری ہے۔ بعدہٗ تقلید کی برکت سے تحقیق کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے جیسے اگر بچہ اپنے استاد کی تقلید نہ کرے اور پڑھاتے وقت اسے کہے کہ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے۔ ب نہیں ہے تو بس وہ پڑھ چکا؟" (کمالات اشرفیہ صـ۲۰۱)

ادب کے معاملہ میں آپ ہم مسلک اور مختلف المشرب بزرگوں میں قطعاً کوئی امتیاز نہیں فرماتے تھے۔ جب آپ خانوادۂ نقشبندیہ کے بزرگ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن قدس سرہ العزیز کو دوسری بار ملنے کے لئے مراد آباد کو روانہ ہوئے تو آپ نے سوچا کہ:۔

"ہم لوگوں کے اعمال اچھے نہیں۔ اور اکثر بزرگوں کو قلب کی تاریکی کا احساس ہو جاتا ہے۔ مولانا بھی شاید اسی وجہ سے ڈانٹ ڈپٹ فرمایا کرتے ہوں۔ اسلئے اپنے قلب کو پاک و صاف کر کے حاضر خدمت ہونا چاہیئے"

یہ خیال آتے ہی آپ سواری سے اتر پڑے۔ وضو کیا۔ اور استغفار پڑھتے ہوئے پا پیادہ اس طرف چل کھڑے ہوئے۔ حالانکہ وہ گرمی کا موسم تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اور آپ روزہ سے تھے۔

احتیاط احتیاط انسان کو بہت سے مضرات و مفاسد سے بچا لیتی ہے۔ اسی لئے حضرت ہر معاملہ میں احتیاط فرمانے کے عادی تھے۔ یہ اس احتیاط کا نتیجہ تھا کہ:۔

۱۔ آپ نے اس بات کی تاکید کر رکھی تھی کہ اگر کوئی عورت خط لکھے۔ تو شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنے خاوند کے دستخط کرا کے بھیجے۔ ورنہ اپنے کسی محرم کے دستخط کرائے۔ شوہر کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے محرم کے دستخط معتبر نہیں سمجھتے تھے تاکہ بصورت اختلاف عنقا میاں، بیوی میں بعد میں لڑائی نہ ہونے لگے۔ کہ ان کو کیوں خط لکھا۔ فرماتے تھے کہ:۔

"میں میاں بیوی میں خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کو اپنے ساتھ خط و کتابت رکھنے سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں"

۲۔ بیعت کے لئے مستورات کے سفر کو نا پسند فرماتے تھے اور خط کے ذریعہ بیعت کرنے کو ترجیح دیتے تھے اور اگر کوئی مستورہ دربار اشرفیہ تک پہنچ جاتی۔ تو اس سے اس وقت تک گفتگو نہ فرماتے جب تک اس کا کوئی محرم پاس نہ بٹھا لیتے۔

۳۔ کثرت مشاغل، ضعف قویٰ اور نو واردین کی بے اصولی باتوں سے تکلیف پہنچنے کے سبب مخلصین نے تجویز کی کہ کوئی معین مقرر فرما لیا جائے۔ جو متفرق کاموں کے علاوہ نئے آنے والے کے حالات سن کر ان کی ضروری باتوں سے آپ کو آگاہ کر دیا کرے۔ تاکہ ان کی بے تمیزی و بے اصولی سے جو تکلیف پہنچتی ہے۔ اس سے نجات مل جائے۔ مگر آپ نے اس وقت اس خیال سے اس تجویز کو منظور نہ کیا کہ:۔

"اس کا دماغ خراب ہو جائیگا۔ وہ اپنے آپ کو مقرب سمجھنے لگے گا۔ اس سے لوگوں کو

طرح طرح کی اذیتیں پہنچیں گی۔ ان سے فرمائشیں کیا کرے گا۔ اس طرح لوگ اس کو مقرب سمجھ کر حاجات و معروضات کا واسطہ بنائیں گے۔ اور خوشامدیں اس کی خدمت کریں گے یہ امر الغالب ہے۔ مجھے ساری تکلیفیں تو گوارا ہیں۔ لیکن یہ گوارا نہیں کہ اس کا بھی دینی نقصان ہو۔ اور دوسروں کو بھی تکلیف پہنچے۔"

پھر آپ نے اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا:-

"اور تو اور حضرت مولانا گنگوہیؒ کے ایک خادم تھے۔ جو عامی تھے۔ مگر خادم خاص سمجھے جاتے تھے۔ وہ خود مجھ سے فرمائشیں کیا کرتے تھے۔ اور وہ بھی قیمتی قیمتی چیزوں کی۔ گنگوہ ہی میں نہیں بلکہ یہاں تھانہ بھون آ آ کر بھی۔ چونکہ محبوب کے کوچہ کا کتا بھی محبوب ہوتا ہے۔ اسلئے میں ان کی فرمائشیں پوری کرتا تھا۔ ویسے وہ تہجد گذار۔ ذاکر و شاغل آدمی تھے۔ مگر قرب کی وجہ سے ان کو یہ مرض لاحق ہو گیا۔ ایسے ہی حاجی عابد حسینؒ کے ایک مقرب تھے۔ ایک شخص نے ان سے ملاقات کرنی چاہی تو اس نے اس سے کہا کہ روپیہ دو۔ ابھی ملاقات کرا دیتا ہوں۔ اس شخص نے خود یہاں آکر مجھ سے کہا کہ تمہارے ہاں یہ اچھا قاعدہ ہے کہ کسی کی روک ٹوک نہیں۔ براہ راست معاملہ ہے۔ پس اپنی تجربہ کی بنا پر میں نے اپنے یہاں کسی کو مقرب یا دخیل نہیں بنا رکھا۔"

بعد میں جب حدیث شریف سے اس کا جواز معلوم ہو گیا اور تکلیف بھی ناقابل برداشت ہونے لگی۔ تو اس وقت آپ نے باصرار اعزہ و خدام ایک بواب مقرر کر لیا۔ اور دوسرے ملازمین کی طرح سخت تاکید کر دی کہ وہ کسی سے ہدیہ قبول نہ کرے اور دینے والوں کو بھی بذریعہ اعلان مطلع کر دیا کہ اسے کچھ نہ دیا جائے۔ اور اگر کسی کو کچھ دینے پر اصرار ہو۔ تو وہ میرے ذریعہ سے دے۔ میں خود کسی حاجت کے بہانہ اس کو پہنچا دوں گا۔ مگر اس پر آپ کا نام ظاہر نہ کروں گا۔ ورنہ یہ دینے والوں کی طرف سے بے التفاتی برتے گا۔ اس احتیاط کے علاوہ آپ خود بھی اس پر کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ اور اسے بھی حضرت کی سخت گیریؒ سے بے عنوانی کی کبھی ہمت نہ ہوتی۔

استغناء استغناء بھی آپ کی طبیعت کا ایک خاصہ خاص تھا۔ اور آپ اس ارشاد نبوی کے مظہر تھے لا اسئلکم علیہ من اجران اجری الا علی اللہ کہ میں تم سے قطعاً کوئی اجر نہیں چاہتا میرا اجر صرف اللہ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو امراء وزراء اور رجال دولت تو کیا عوام سے بھی استغناء تھا

اور آپ دوسروں کی طرح نام نہاد حلم و مروت سے قطعًا کام نہ لیتے تھے اور جس سے کوئی بیہودہ یا ناگوار حرکت ہوتی تو اسے فورًا مجلس سے اٹھا دیتے تھے۔ مگر اس اُٹھا لینے میں بھی اسے کوئی نہ کوئی سبق ایسا مل جاتا۔ جو عمر بھر نہ بھولتا۔ جس کی پیچھے مثال گذر چکی ہے۔

عوامی استغنا سے مشکل تر مالی استغنا ہے۔ اور خصوصًا ایسے زمانہ میں جبکہ رائج الوقت پیری مریدی نے ایک مستقل معاشی فن کی حیثیت اختیار کر کے لوگوں کو "دینے کا عادی" بنا دیا ہو۔ یہ بہت ہی دشوار امر ہے۔ اسی لئے آپ کے ہاں ہدایا قبول کرنے کی بڑی سخت حدود و قیود تھیں اور اس وقت تک کسی سے کچھ قبول نہ فرماتے تھے۔ جب تک یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ اسے کوئی غرض نہیں ہے۔ حتیٰ کہ دعا کی بھی آپ کا یہ معمول صرف اپنی ذات کے لئے ہی نہ تھا۔ بلکہ مدرسہ خانقاہ کے لئے بھی۔ تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے مدرسہ کے لئے دو سو روپے بھیجے۔ جو آپ نے قبول فرما کر مدرسہ کے حساب میں جمع فرما لیے۔ کیونکہ جونہی کوئی رقم آتی تھی۔ آپ فورًا اسے اسی مد کی تھیلی میں رکھ کر اسی مد کے حساب میں جمع فرما دیتے تھے۔ اور حساب کے معاملہ میں جو احتیاط یہاں برتی جاتی تھی۔ اس کی مثال کسی ادارہ میں بھی نہ ملتی تھی۔ چنانچہ دوسرے سال بھی اُس نے دو سو روپے بھیج دیئے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ اگر سال گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی رسید نہ آئی۔ تو آئندہ بند کر دوں گا۔ اس پر آپ نے منی آرڈر وصول نہ فرمایا اور صاف لکھ دیا کہ "تم آئندہ سال بند کرو گے۔ ہم امسال ہی بند کرتے ہیں"۔

امراء سے استغناء کا یہ عالم تھا کہ جہاں حیدر آباد دکن جانے والے اکثر علماء و مشائخ والیٔ دکن کی خدمت میں باریابی اور وظیفہ و منصب کی آرزو لے کر جاتے تھے۔ وہاں حضرت کو ملنے سے بھی عار تھا۔ جس کی تفصیل خود حضرت کی زبانی لطف دے گی۔ فرماتے تھے کہ:۔

"اہل علم کے لئے یہ بات بہت ہی ناپسندیدہ ہے کہ وہ امراء سے خلط کریں۔ اس لئے غرباء کو جو مصلح سے نفع ہوتا ہے۔ امراء سے وہ بھی گیا ہو جاتا ہے۔ قلوب پر مصلح کا وہ اثر نہیں رہتا۔ مجھ کو حیدر آباد دکن میں ایک دوست نے مدعو کیا تھا۔ دیوبند کے بعض احباب خاص اہل علم نے مشورہ دیا کہ وہاں نواب صاحب سے ملاقات ضروری ہے میں نے کسی کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہاں پہنچ کر سات ہی روز گزرے تھے کہ فلاں نواز جنگ کا ایک پرچہ آیا جس میں لکھا تھا کہ عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا۔ مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نصیب نہ ہوئی۔ برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ فلاں فلاں

وقت اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی ہے۔"

یہ فلاں نواز جنگ صاحب اس وقت نواب کی ناک کے بال اور ارکانِ سلطنت میں سے تھے۔ آپ نے انہیں لکھا۔

"بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہل دین کی نسبت عظمت ہے مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی کہ اس میں فہم سے کام نہ لیا گیا جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا۔ اس کو تو اپنے اوقاتِ فرصت بتلا کر پابند کیا گیا۔ اور خود آزاد رہے یہ کونسی فہم و تہذیب کی بات ہے۔"

اس پر نواز جنگ صاحب نے اپنی بدفہمی کی معافی چاہی اور لکھا کہ حضرت والا ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرمادیں۔ حضرت نے اس پر ایک اور سبق دیدیا کہ:-

"اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا۔ مردہ بدست زندہ کی طرح مہمان میزبان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اسلئے سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر اختیاری ہے۔ آپ ساتھ رہیں جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں۔ ملاقات کرلیں۔"

اس پر انہوں نے لکھا کہ بدفہمی پر بدفہمی ہوتی چلی جارہی ہے۔ میں نہ اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں جس وقت فرصت ہوگی۔ حاضر خدمت ہو کر زیارت سے مشرف ہوجاؤں گا۔ اگر فرصت نہ ہوئی تو لوٹ آؤں گا۔ جب حضرت نے دیکھا کہ سبق کارگر ہوا ہے۔ تو پھر انہیں دلجوئی کے طور پر لکھا:-

"اب پورے فہم سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے اس قدر مسرت ہوئی۔ کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا۔ اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو تو آپ تشریف لے آئیں۔ ورنہ مجھ کو اجازت فرمایئے۔ خود حاضر ہوجاؤں گا۔"

اس افہام و تفہیم کی غرض آپ نے اپنی مجلس میں یہ بیان فرمائی کہ:-

"میرا طرز عمل اس لئے تھا کہ یہ دنیا کے بعض قدر بڑے لوگ ہیں۔ اہل دین کو بے توقیر سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ دکھلانا تھا کہ اہل علم و دین کی یہ شان ہے کہ پہلے تو تذلل سے بچنا مقصود تھا۔ مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کرچکے۔ تو اب کھنچنا تکبر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ دونوں سے محفوظ رکھا۔"

غرضیکہ وہ صاحب خود آئے۔ اہل مجلس میں بعضوں نے دور سے دیکھ کر کہا کہ فلاں صاحب آرہے ہیں۔

حضرت ڈاک لکھ رہے تھے برابر لکھتے رہے۔ جس وقت انہوں نے پہنچ کر السلام علیکم کہا۔ تب حضرت مخاطب ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"میں نے سلام علیکم کا جواب دیا۔ اور کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ بیچارے بہت ہی جھینپ رہے تھے دوزانو ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے برابر جگہ دے کر کہا بھی کہ اس طرف آجایئے۔ اس پر کہا کہ مجھ کو یہیں آرام ملے گا۔ کچھ دیر بعد میرے سوال پر نواب صاحب کی بیدار مغزی اور انتظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے اس کے بعد کہا کہ اگر نواب صاحب سے ملاقات ہو جائے۔ تو بہت مناسب ہے۔

میں نے پوچھا کہ یہ خواہش آپ کی ہے یا نواب صاحب کی۔ کچھ سکوت کے بعد کہا میری خواہش ہے۔ میں نے سوال کیا کہ جس وقت آپ نے ملاقات کے مناسب و نامناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا۔ اس پر بھی ضرور غور فرمایا ہوگا۔ کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟ کیا نواب صاحب کا۔ میں نے کہا کہ نفع نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جا رہی ہے۔ طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب بنایا جا رہا ہے۔ اس پر کوئی جواب نہ دیا۔

اب میں خود اس کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ اس صورت میں کہ میں خود ملاقات کو جاؤں مضرت ہی مضرت ہے۔ نفع کچھ نہیں۔ اگر ملاقات کو گیا تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا تو اس صورت میں ان کو مجھ سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ ہاں ان سے مجھ کو نفع ہو سکتا ہے اس لئے کہ جو چیز ان کے پاس ہے وہ مجھے ملے گی۔ یعنی دنیا۔ وہ بقدر ضرورت بحمد اللہ میرے پاس بھی ہے اور جو میرے پاس ہے وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں۔ یعنی دین۔

اور اگر میں گیا بھی۔ اور جو ان کے پاس ہے (یعنی دنیا منصب وظیفہ وغیرہ) وہ مل بھی گئی۔ تو اس صورت میں ایک خاص ضرر بھی ہے۔ اگر قبول کرتا ہوں۔ تو اپنے مسلک کے خلاف اگر قبول نہیں کرتا۔ تو آداب شاہی کے خلاف۔ کیونکہ قبول نہ کرنے میں ان کی سبکی اور اہانت ہو گی اور چونکہ میں اس وقت اُن کے حدود میں ہوں۔ اس کی پاداش میں اخراج وغیرہ جو چاہیں۔ میرے لئے تجویز کر سکتے ہیں۔ تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہوگا اور میرا نقصان ہوگا۔

یہ امر بھی شانِ سلاطین کے خلاف ہے کہ وہ اپنی رعایا کے مدعو کئے ہوئے شخص سے ملاقات کریں۔ اس میں کم فہم لوگ اُن کو تنگدلی کی طرف منسوب کریں گے۔ جس میں ان کی اہانت ہے کہ کیا خود نہیں مدعو کر سکتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ خیر اس میں ہے کہ نہ میں ان کے پاس جاؤں نہ وہ میرے پاس آئیں۔ اگر ان کا جی چاہے۔ تو تھانہ بھون سے مجھ کو بلالیں میں خاص شرائط طے کر کے آجاؤں گا۔ کچھ عذر نہ ہوگا۔"

یہ سن کر۔۔۔ نواز جنگ کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور کہا کہ:۔
"ان چیزوں پر تو ہم لوگوں کی نظر بھی نہیں پہنچ سکی۔"

اسی لئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:۔
"اُمراسے علماء کا خلط کرنا، ملنا جلنا، اس میں امراء کا تو کوئی (معتد بہ) نفع نہیں۔ بلکہ اہل علم کے اور غرباء کے دین کا نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے میں اس کو ناپسند کرتا ہوں۔"
(افاضات الیومیہ حصہ چہارم ص ۵۶۲ تا ۵۶۳)

استقلال

حق تعالیٰ نے آپ کو اتنی قوتِ استقلال بخشی تھی کہ بڑے بڑے حادثات میں بھی از جارفتہ نہیں ہوتے تھے۔ نہ ایسے مواقع پر اپنے ضروری مشاغل و معمولات میں کوئی معتد بہ فرق آنے دیتے تھے۔ نہ بشرہ سے غیر معمولی صدمہ کا اظہار ہوتا تھا۔ البتہ مقتضائے بشریت طبعی قلق ضرور ہوتا مگر اس پر بھی بڑا تحمل فرماتے تھے۔

آپ کو اپنے بڑے خواہرزادہ مولانا سعید احمدؒ سے اتنی محبت تھی کہ عشق کی حد تک پہنچ چکی تھی جب ان کا انتقال ہوا۔ تو ان کی موت کے صدمہ سے فرماتے تھے کہ قلب میں بار بار یہ تقاضا پیدا ہوتا ہے کہ کام چھوڑ کر قبر پہ جاؤں۔ لیکن میں بتکلف اس تقاضے کو روکتا ہوں۔ اس کے مقتضا پر عمل نہیں کرتا۔ اور اپنے آپ کو برابر کاموں میں مشغول رکھتا ہوں۔ کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ اگر ایک بار اسکے تقاضے پر عمل کیا۔ تو پھر عادت پڑ جائے گی۔ یہ عزم و استقلال اس مراقبہ کا نتیجہ تھا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی۔ حاکم ہونے کی حیثیت سے تو انہیں اپنی مخلوق محکوم کے ظاہر و باطن میں ہر طرح کے تصرفات فرمانے کا ہر وقت کامل اختیار اور پورا حق حاصل ہے کسی کو مجال نہیں کہ چون وچرا کر سکے۔ اور حکیم ہونے کے اعتبار سے ان کا ہر تصرف حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ گو وہ حکمت ہماری سمجھ میں بھی نہ آوے۔ چونکہ بفضلہ تعالیٰ اللہ جلشانہ کا حاکم اور حکیم ہونا اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہے۔ اس لئے بڑے سے بڑے

حادثہ میں بھی جس کو پریشانی کہتے ہیں۔ وہ الحمدللہ مجھ کو کبھی نہیں ہوتی۔ طبعی اثر ہونا اور بات ہے"۔

اعتدال قوم اس وقت افراط و تفریط کے جس دور سے گذر رہی ہے۔ اس کا نقشہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"قوم عجیب افراط و تفریط کے مرض میں اندھا دھند مبتلا ہے۔ کسی سے خوش ہوئے تو اسے پوجنے لگے۔ خفا ہوئے تو گالیاں دینے اور لعنت برسانے لگے۔ گویا ان کا لیڈر یا امیر فرشتہ ہو۔ اور اگر فرشتہ نہیں۔ تو پھر شیطان کے ادھر کوئی درجہ نہیں۔ توازن و اعتدال کا گویا قحط پڑ گیا ہے۔ اور اشخاص و رجال کو ان کے صحیح مقام پر رکھنا ہم لوگ بھول ہی گئے ہیں"۔
(حکیم الامت صـ۹۱)

مگر حضرت تھانوی کے ہاں یہ بات نہ تھی۔ بلکہ بقول مولانا دریابادی:۔

"حضرت کے ہاں دنیوی حکام۔ رؤسا۔ عہدہ داروں کے ساتھ معاملات میں بھی خاص اعتدال ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ یعنی نہ ان لوگوں کی طرف گرنا جیسا کہ بعض مشہور آستانوں اور خانقاہوں میں دستور سا پڑ گیا ہے۔ اور نہ ان سے اپنے کو بالکل کھینچے رکھنا جیسا کہ بعض غیر محقق مشائخ نے تقویٰ و درویشی کا مقتضا سمجھ لیا ہے"۔ (حکیم الامت صـ۲۱۱)

چنانچہ ایک مرتبہ ایک خلاف شرع تحریک کے سلسلہ میں بڑے بڑے ذی وجاہت حضرات حضرت کی خدمت میں گفتگو کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ جن کو ہر قسم کی دنیوی جاہ حاصل تھی۔ حضرت نے بڑے اعزاز و اکرام سے بٹھایا۔ گفتگو فرمائی۔ اور وہ حضرت کو دل کو بہت ہی متاثر و محظوظ ہوئے۔ آپ سے رخصت ہو کر جب یہ واپس جانے کے لئے اسٹیشن پر پہنچے۔ تو حضرت بھی ٹہلتے ہوئے ان کے پیچھے انہیں چھوڑنے کے لئے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ جو صرف دس منٹ کے فاصلہ پر تھا۔ وہ حضرت کو دیکھ کر بہت ہی شرمندہ ہوئے۔ حضرت نے ان کے احساس شرمندگی کو دور کرنے کے لئے فوراً فرمایا کہ:۔

"میں آپ صاحبان کے تشریف لانے کے وقت تو استقبال کے لئے حاضر نہ ہوا کہ اس وقت حاضری کا منشا جاہ ہوتا ہے اور اس وقت رخصت کرنے کے لئے حاضر ہونے کا منشا چاہ ہے۔ کیونکہ آپ حضرات کی محبت اور اخلاق نے میرے دل میں آپ صاحبان کی محبت پیدا کر دی ہے اور ساتھ اسلئے نہ آیا کہ آپ صاحبان مجھ کو آنے ہی نہ دیتے"۔

انکسار حضرت تھانوی پرلے درجہ کے منکسر المزاج تھے۔ مشہور آفاق ہونے کی وجہ سے لوگوں نے

آپ کے جاہ وجلال کے متعلق عجیب عجیب تصورات قائم کر رکھے تھے۔ اسلئے ایک دن آپ کے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی نے آپ سے کہا کہ اب آپ بڑے آدمی سمجھے جاتے ہیں معمولی آدمی نہیں رہے۔ کم سے کم سیکنڈ کلاس میں سفر کیا کریں۔ حضرت نے جواب دیا:۔

"میں کیا کروں۔ یہ میری طبیعت کے خلاف ہے۔ میں ریل میں گنواروں۔ بھنگیوں اور چماروں کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔ شان کیا چیز ہے۔ دو دن بعد بھنگی چمار بھی مٹی ہوں گے اور میں بھی۔"

(کمالات اشرفیہ ص۲۷۵)

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ایک مرتبہ خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ مرض کا مفصل حال حکیم الامت کی خدمت میں بہ امید و استدعائے علاج پیش کیا۔ اس کے جواب میں لکھا:۔

"میں کیا۔ میری حکمت کیا۔ عوام کے لقب دینے سے کیا ہوتا ہے۔ لیکن خدمت سے عذر نہیں۔"

(حکیم الامت ص۲۲۸)

ایک دوسرے خط میں مولانا موصوف نے لکھا کہ کبھی بعض چیزوں کو دیکھ کر اور سن کر دل یہ کہنے لگتا ہے کہ بس یہ بھی ہمارے ہی جیسے بشر ہیں۔ اس کے جواب میں لکھا کہ:۔

"یہ بالکل مطابق واقع ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ واقع کے قریب ہے اگر اس میں یہ قید نہ ہوتی کہ "ہم ہی جیسے" تو مطابق واقع کے ہوتا۔ اور اب قدرے واقع سے بعید ہو گیا۔ کیونکہ واقع میں تو میں دوسروں سے بھی کم ہوں اور یہ کوئی تکلف نہیں اس پر حلف کر سکتا ہوں۔ کیونکہ اپنی حالت کا خود اوروں سے زیادہ مشاہدہ کرتا ہوں۔" (حکیم الامت ص۳۰۲)

ایثار حضرت تھانویؒ مدت دراز تک مدرسہ دیوبند کے سرپرست رہے مگر آخر میں کچھ اختلاف پیدا ہو گئے۔ ایسی حالت میں آپ نے دنیاداروں کی طرح اس منصب سے چمٹے رہنے کی بجائے کمال نیک نفسی سے خود کو اس منصب سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور استعفےٰ دے دیا۔ جسے ارکان مدرسہ نے نامنظور کر دیا۔ اس پر حضرت نے خود کو اس منصب سے معزول کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ چونکہ آپ کو علم تھا کہ ارکان مدرسہ اس علیحدگی کو بھی گوارا نہ کریں گے۔ اس لئے آپ نے مولانا عبدالماجد دریا بادی کو اس سلسلہ میں ۸ راکتوبر ۱۹۳۵ء کو یہ خط لکھا:۔

از اشرف علی عفی عنہ

بخدمت مکرمی جناب مولوی عبدالماجد صاحب سلمہٗ

السلام علیکم۔ ایک ناگوار تکلیف بادلِ ناخواستہ خلافِ عادت دے رہا ہوں۔ آپ کی عنایت سے

امید ہے کہ گوارا فرمائیں گے۔ یہ ایک مسودہ دارالعلوم کی باضابطہ خدمت سے یکسوئی کا ہے۔ جس کو مدرسہ میں بھی بھیج چکا ہوں۔ مگر وہ شاید شائع نہ فرمائیں۔ یا جلدی شائع نہ فرما دیں اور خیر خواہانِ مدرسہ کے سکون کے لئے ضرورت ہے کہ جلدی اشاعت ہو۔ اس لئے آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ جس پرچہ میں مصلحت سمجھیں۔ شائع فرما دیں۔ خواہ الصدق میں یا کسی اور میں۔ میرا تعارف مدیران جرائد سے خاص طور پر نہیں۔ اس لئے شاید میرے لکھنے سے شائع نہ کریں۔ آپ کے ایسے صاحبوں سے تعلقات ہیں۔ یہ بھی اختیار ہے خواہ اپنی رائے کے ساتھ شائع فرما دیں یا بدون رائے کے۔ اور رائے میں بھی بالکل آزاد ہیں۔ بس اتنا لحاظ ضروری ہے کہ مدرسہ کو گزند نہ پہنچے۔ بلکہ اگر کسی قدر مدرسہ کی خدمت کی ترغیب ہو۔ تو مصلحت ہے۔ ورنہ نہ نفع ہو نہ ضرر۔ والسلام" (حکیم الامت ص۶۲۳)

اس خط کے ساتھ جو اعلان بغرض اشاعت روانہ فرمایا وہ یہ تھا:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم الایۃ

حامداً و مصلیاً۔ احقر اشرف علی اس آیت کی بنا پر عرض رسا ہے۔ چونکہ آج کل مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے ارکان میں نیز بعض مسائل انتظامیہ میں غیر معمولی اختلاف ہے جس کو بنا بر حسن ظن اختلاف اجتہادی کہنا احوط ہے اور منجملہ ان مسائل کے احقر کی سرپرستی کی نوعیت کا مسئلہ بھی ہے جو میری آزادی پسند طبیعت پر سب سے زیادہ گراں بھی ہے۔ اور آئندہ ناگوار آثار کے ترتب کا بھی احتمال ہے۔ اس لئے احتیاطاً و اخذاً بالعزیمہ حضرت سیدنا حسن رض کی سنت کے اتباع میں نفس پرستی ہی سے اپنے کو معزول کرتا ہوں۔ جو حقیقت میں تجدید اعادہ استعفاء سابق ہے۔ امید ہے کہ اس کے بعد بقیہ مسائل جلد ہی سہولت سے حل ہو جاویں گے۔ لیکن مدرسہ کی ہر خدمت مفید ورنہ سے انشاء اللہ تعالیٰ تقاعد نہ ہوگا۔ واللہ الموفق فقط تھانہ بھون ۱۴ رجب جمعہ ۱۳۵۲ھ (حکیم الامت ص۶۲۳)

مولانا عبدالماجد اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

حضرت عالی ظرفی اور شرافتِ نفس کے بادشاہ تھے۔ خود تنگ ہو کر مدرسہ سے الگ ہو رہے ہیں۔ مگر یہ گوارا نہیں کہ مدرسہ کو کسی طرح بھی ضرر پہنچے۔ بلکہ کوشش اسی کی ہے کہ ہو سکے تو نفع ہی پہنچ جائے۔ یہ شرافتِ نفس مولانا کا حصہ تھی۔" (حکیم الامت ص۶۲۴)

ایسے ایثار کا نمونہ ارباب اقتدار کی بجائے اہل حق میں ہی نظر آ سکتا ہے۔

توکل حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ:۔
"توکل یہ ہے کہ تدبیر کرکے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ تدبیر مباح ہو۔ اور اس میں انہماک نہ ہو۔ غیر متصرف حقیقی سے قطع نظر کرنا اور یہ قطع نظر اعتقاداً کرنا تو فرض ہے اور عملاً اسباب ظنیہ کے ترک سے بشرط تحمل مستحب ہے۔ اور جو اسباب عادۃً یقینی یا مثل یقینی کے ہیں۔ ان کا ترک کرنا معصیت ہے بجز اہل حال کے کہ ان کو اس کی بھی اجازت ہے اور یہ سب تفصیل اسباب دنیویہ میں ہے۔ اسباب دینیہ کو ترک کرنا توکل نہیں"۔ (کمالات اشرفیہ صـ۴۲ و صـ۱۱۵)

حضرت تھانویؒ کی تمامتر زندگی اسی حقیقت کی مظہر رہی۔ مالی توکل کی تفصیل تو "باب معیشت" میں آرہی ہے۔ مالی توکل کی یہ کیفیت تھی کہ بمبئی میں حضرت پر ایک دفعہ قاتلانہ حملہ ہوا۔ احباب کے تقاضہ کے باوجود آپ نے تھانہ پر کوئی رپورٹ وغیرہ نہ کی۔ اور صبح بلاکسی احتیاطی تدبیر کے کھلے بندوں بازاروں میں پھرتے رہے۔ اسی طرح بریلی میں جو آپ کے معاندین کا مرکز تھا۔ آپ اصرار کے باوجود آزادانہ پھرتے رہے۔ اور دل میں کسی خوف کو جاگزیں نہ ہونے دیا۔ چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ:۔

"بمبئی میں بہت مخالفین ہیں۔ مگر وہاں بھی لوگوں نے اصرار کیا کہ بیان کیجئے۔ میں نے وہاں بھی کھل کر بیان کیا۔ اور ہر جگہ کھلے بندوں آزادی کے ساتھ ادھر ادھر آتا جاتا رہا۔ تنہا بھی جمع کے ساتھ بھی۔ اسی طرح بعض احباب نے بریلی میں منع بھی کیا یہاں معاندین اور مخالفین کی بہت بڑی کثرت ہے۔ حفاظت کا کچھ انتظام کرکے کہیں آنا جانا چاہیئے اس طرح اِدھر اُدھر نہ پھرنا چاہیئے۔ لیکن میں نے کہہ دیا کہ یہ سب فضول اوہام ہیں بلا حکم خدا کچھ نہیں ہوسکتا۔ اور اگر خدا کو ہی منظور ہو۔ تو پھر لاکھ حفاظت کیجئے۔ کیا ہوسکتا ہے"۔

تقویٰ تقویٰ کے لئے صرف زہد و ورع ہی کافی نہیں بلکہ معاملات و معاشرت میں صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ غایت ہے معرفت کی۔ کہ دنیا کی دل میں قدر نہ ہو اس سے دل کو خالی رکھے اور بے ضرورت سامان جمع نہ کرے۔ اسلئے حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ:۔
"دنیا کو آدمی جس قدر مختصر کرے۔ اسی قدر راحت ہے"۔ (کمالات اشرفیہ صـ۱۶۴)
"جس کی نظر اللہ اور ما عند اللہ پر ہے۔ اس کی نظر میں سونا چاندی تو کیا دنیا وما فیہا بھی

کچھ نہیں۔ حضور نے اپنے لئے۔ اپنے جگر گوشوں اور خاص لوگوں کے لئے دنیا کو پسند نہیں فرمایا۔ اور ایک دینار بھی رکھنا گوارا نہ فرمایا۔" (کمالات اشرفیہ ص ۳۱۰)

حضرت تھانویؒ کا شروع سے اخیر تک اسی پر عمل رہا۔ آپ عرفی عبادات سے زیادہ معاملات و معاشرت میں متقی تھے۔ جس کی نظیر تاریخ مشاہیر پیش نہیں کر سکتی۔

آپ پر خوف محاسبہ اتنا طاری تھا کہ ۱۳۰۵ھ میں آپ نے والد ماجد کے انتقال کے بعد اور ترکہ وصول کرنے سے قبل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے دریافت فرمایا کہ اگر جائیداد نہ رکھوں۔ تو کیسا ہے؟ مولانا نے لکھا:۔

"اگر رکھو رخصت ہے۔ نہ رکھو جب بھی حق تعالیٰ روزی سے تم کو پریشان نہ کرے گا"

اس پر آپ نے اپنے حصہ کی متروکہ اراضی کی نقد قیمت لے لی جس سے مکان بنوایا اور حج ثانی کیا۔ حالانکہ وہ جائداد مستقل آمدنی کا ذریعہ تھی۔ مگر اس کو قبضہ میں رکھنے سے بہت سے حقوق کی ادائیگی کا بوجھ بڑھ جاتا تھا۔ اور ایک دن اس کا حساب دینا پڑتا تھا۔ اسی لئے آپ کی نظر پائی پیسہ سے زیادہ پائی پائی کے حساب لینے والے پر رہتی تھی۔ جس کی کچھ تفصیل حالات سفر میں گذر چکی ہے۔ کچھ معاملات و معمولات کے باب میں آئے گی۔ یہاں صرف دو مزید واقعات کا ذکر اس ضمن میں کر دینا کافی ہوگا۔

(۱) آپ کو نواب ڈھاکہ نے اونچے درجہ کا کرایہ روانہ کیا۔ مگر آپ نے تیسرے درجہ میں سفر کیا کیونکہ وہاں اونچے درجہ کی نسبت آپ کو زیادہ آرام معلوم ہوا۔ اس طرح موصولہ رقم کا کافی حصہ بچ رہا۔ جو آپ نے نواب صاحب کو اس صورت میں واپس کر دی کہ نواب صاحب کی طرف سے اس رقم کی ٹین کی چادریں خرید کر مسجد کے وضو خانہ کا سائبان بنوا لیا اور نواب صاحب کو لکھ دیا کہ بقیہ رقم واپس کرنا آپ کے احترام کے خلاف تھا۔ اور واپس نہ کرنا اپنی وضع کے خلاف تھا۔ اسلئے ایسا کیا گیا۔

(۲) ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد نے خط نہ ملنے کی اطلاع دی۔ اس کے قریب ہی زمانہ میں حضرت کو انہیں ایک ضروری خط لکھنا پڑا جس کا ذکر "ایثار" کے ضمن میں گذر چکا ہے۔ آپ نے وہ خط رجسٹری کرنے کی بجائے اس پر کم ٹکٹ لگا کر اسے بیرنگ بنا دیا اس طرح پیسے بھی کم خرچ ہوئے اور خط پہنچنے کا امکان رجسٹری سے بھی کچھ زائد ہو گیا۔ گو ان دو پیسوں کا بوجھ آپ نے مکتوب الیہ پر ڈالنا گوارا نہ کیا۔ حالانکہ یہ معمولی بات تھی۔ مگر تھی بے اصولی۔ اس لئے آپ نے اس خط میں دو ٹکٹ ڈال کر لکھ دیا کہ :۔

" میں نے خط کو حفاظت کے لئے بیرنگ کر دیا ہے۔ اگر ڈاک والے رکھ لیں۔ تو ٹکٹ حاضر

ہے۔ اگر ڈھول سے نہ لیں۔ ان ٹکٹوں کو چاک کر دیجئے (تاکہ محصول ہمارے ذمہ بقایا نہ رہے) اگر چاک کرنے کو دل گوارا نہ کرے۔ تو کسی خط میں جو خاص اس غرض کے لئے نہ بھیجا جائے۔ مجھ کو اطلاع کر دی جائے۔ میں خرید کر کے چاک کر دونگا" (حکیم الامت ص۲۶۳)

اس پر مولانا عبد الماجد لکھتے ہیں:۔

"خط میں ٹکٹوں کے بارہ میں احتیاط کا کمال۔ سچ یہ ہے کہ تقویٰ و تدین کا اب تک نام ہی سنا تھا عملی نمونہ حضرت ہی کے ہاں دیکھا" (بحوالہ صدر)

حیاء حیاء کا حضرت تھانویؒ پر اتنا غلبہ تھا کہ فرماتے تھے:۔

"حیاء کے غلبہ سے کبھی ایسا ہو جاتا کہ پیر پھیلا کر سونا مشکل ہو جاتا۔ اور بیت الخلاء میں ستر کھولنا اور کبھی ذرا دیر باعث شرم معلوم ہوتا ہے۔ یہ حالت رفیعہ ہے۔ پھر غلبہ کے بعد اعتدال ہو جاتا ہے۔ جو اس سے ارفع ہے"

یہی وجہ تھی کہ آپ کسی عورت سے دوبدو ہو کر بے تکلف گفتگو نہ فرما سکتے تھے۔ سواری پر بیٹھتے وقت حتی الامکان ایسی جگہ بیٹھتے جہاں سامنے کوئی اور نہ بیٹھا ہو۔ کیونکہ اس سے آپ کو طبعاً الجھن ہوتی تھی ریل گاڑی گذرتے وقت عام دستور کے مطابق نظر اٹھا کر مسافروں کو نہ دیکھتے تھے کہ مبادا کسی عورت پر نظر پڑ جائے۔ بیعت کے وقت اکثر عورتوں کی حضرت کے سامنے بے پردہ آنے کی خواہش ہوتی۔ بلکہ ان کے سرپرست بھی اس پر مصر ہوتے۔ اور آپ ان کو ڈانٹ دیتے۔

ایک مرتبہ ایک بڑی ریاست کی وزیر زادی اپنے شوہر کے ساتھ بغرض بیعت تھانہ بھون حاضر ہوئیں اور آپ کی چھوٹی اہلیہ محترمہ کی معرفت بے پردہ حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرت نے صریحاً انکار کرنا خلاف مصلحت سمجھا کیونکہ

"اگر آزاد لوگوں کو حکم شرعی بتایا جاتا ہے۔ تو وہ اس کی بے قدری کرتے ہیں۔ اور انکے دل کو بات نہیں لگتی۔ بلکہ شریعت کا نام سن کر عجب نہیں کہ شریعت کے متعلق کچھ طعن یا استخفاف کا کلمہ کہہ بیٹھیں"

اسلئے حضرت تھانوی جو تدبر کے بھی بادشاہ تھے۔ یہ لطیف تدبیر فرمائی کہ "اگر ان کو کچھ کہنا سننا نہ ہو۔ تو خیر اجازت ہے۔ میں خود اپنی نظریں نیچی کر لوں گا۔ میرا کیا حرج ہے۔ اور اگر انہوں نے کچھ کہنا سننا ہو۔ تو میری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے کہ میں کسی عورت سے دوبدو گفتگو کرتے ہوئے شرماتا ہوں اگر تم مجھ سے چہرہ کو کھول کر گفتگو کرو گی۔ تو میں گفتگو ہی نہ کر سکوں گا۔ میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ لہذا اگر گفتگو

دلجوئی

حضرت تھانویؒ گو اصلاحی امور میں قدرے سختی سے کام لیتے تھے۔ مگر طالبین و سالکین کی باطنی پریشانیوں کے دور میں اور عین یاس کی حالت میں ایسی تسلی اور دلجوئی فرماتے تھے کہ آپ کی تحریر پڑھتے یا تقریر سنتے ہی وہ اپنے اندر بھی حالاً حالتِ تسلی محسوس کر لے لگتے تھے۔ اور ایسے مختصر مؤثر اور دل نشین پیرایہ میں تسلی دیتے تھے کہ الجھی ہوئی طبیعت فوراً سلجھ جاتی تھی۔ جیسا کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے۔

۱۔ ایک صاحب نے حسرت بھرے لہجہ میں کہا کہ حضرت جو کچھ صفائی باطن حضور کی صحبت کی برکت سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ حضرت سے جدا ہونے کے بعد کدورات دنیا میں پھنس کر رفتہ رفتہ سب غت ربود ہو جاتی ہے۔ یہ کیفیت سن کر آپ نے تسلی آمیز لہجہ میں فرمایا کہ:۔

"جی پھر مضائقہ ہی کیا ہے۔ آپ اپنے کپڑے میلے کر ڈالتے ہیں۔ دھوبی ان کو دھو دیتا ہے آپ پھر میلے کر ڈالتے ہیں۔ دھوبی پھر دھو دیتا ہے۔"

۲۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میرے قلب کی بڑی ڈانواڈول حالت ہے۔ فرمایا کہ "اصلی قلب تو آپ ہی کا ہے کیونکہ قلب کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو ایک حالت پر نہ رہے منقلب ہوتا رہے۔"

۳۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ انضباط اوقات کا پختہ عزم کر لیا تھا مگر ٹوٹ گیا۔ جواب میں فرمایا۔ "غیر اختیاری وقت میں بھی اطاعتِ تحت کا مسئلہ حل ہوا کہ انسان تقدیر حق کے سامنے عاجز ہے۔ کہ ارادہ تو کیا تھا کہ ضبط اوقات کا اور ہو گیا۔ خبط اوقات۔ انشاءاللہ اس مسئلہ کا منکشف ہونا بھی ترقی کا زینہ ہے۔

۴۔ ایک صاحب نے لکھا کہ اس دفعہ حاضر خدمت ہونے سے جو کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ پہلے کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ مگر افسوس کہ وہ اب رفتہ رفتہ زائل ہو گئی ہے۔ آپ نے لکھا کہ "کسی کیفیت کا طاری ہونا اور چندے جاری رہنا یہ بھی بسا غنیمت ہے۔ ہمیشہ رہنے کی چیز تو صرف عقل اور ایمان ہے۔ باقی سب آمد و رفت ہے۔"

صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں کہ:۔

"موافقین اور مخالفین منتسبین اور غیر منتسبین سب کو اقرار ہے کہ حضرت کے ہاں طالبین کی بڑی تسلی ہوتی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں اپنے حضرات کے سلسلہ کے ایک شیخ نے اپنے کچھ الجھے ہوئے حالات بغرض حل اپنے ایک دوسرے ہم سلسلہ شیخ کو لکھے۔ تو مرقوم الذکر شیخ نے باوجود حضرت والا سے بعض امور میں سخت اختلاف ہونے کے فرمایا کہ "ایسے الجھے ہوئے حالات کا حل تو بس تھانہ بھون میں ہی ہو سکتا ہے۔ سچ ہے۔ الفضل ما شهدت به الاعداء"

رجوع الی الحق یہ ایک ایسی صفت ہے جو بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ ورنہ عام طور پر خود رائی کے تحت لوگ قبولِ حق سے گریز کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی اس معاملہ میں سب سے پیش پیش تھے۔ "ترجیح الراجح" کا سلسلہ قائم کرنے کے علاوہ (جن کا ذکر اگلے باب "عادات" میں آرہا ہے) آپ نے بعض اعتراضات کا جواب لکھنے کا باضابطہ انتظام فرمالیا تھا جس کا مجموعہ "حکایات الشکایات مع روایات الحکایات" کے نام سے شائع ہوا۔

آپ پر اگر کوئی کسی قسم کا علمی اعتراض کرتا۔ اور وہ قابل قبول ہوتا۔ تو اس کو قبول فرما کر اپنی تحقیق سابق سے بلا تامل رجوع کر کے اپنا "رجوع ترجیح الراجح" میں شائع فرمادیتے۔ تاکہ دیکھنے والے خود جس کے قول کو چاہیں ترجیح دے سکیں۔

اگر اعتراض معاندانہ ہوتا۔ تو اس کی مطلق پروا نہ کرتے اور نہ اپنی برأت جتلانے کی کوشش کرتے اگر ایسا اعتراض بذریعہ جوابی خط کے موصول ہوتا تو بجائے اپنا تبریہ فرمانے کے نہایت ہی استغنا کا جواب اس عنوان سے تحریر فرماتے کہ معترض کو اپنے اعتراض کے بالکل لغو اور ناقابل التفات ہونے کا احساس ہوجاتا۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنے خط میں بہت ہی بے ہودہ اعتراضات لکھ کر بھیجے۔ تو آپ نے اسے جواباً لکھا کہ:-

"مجھ میں اس سے بھی زیادہ عیوب ہیں۔ مگر مجھے تو اپنے عیوب کی اشاعت کی توفیق نہیں ہوتی۔ تم ان کو مشتہر کردو۔ تاکہ لوگ دھوکا میں نہ رہیں"۔

صرف ایک مرتبہ ایک علمی سوال کے ساتھ معاندانہ اعتراض بھی آیا۔ تو اس اجتماع کی وجہ سے موخوالذکر اعتراض کے متعلق بھی وہی معاملہ فرمایا۔ جو علمی رنگ کے اعتراضات سے فرماتے تھے یعنی ان اعتراضات کو مع جوابات اس مصلحت دینیہ کی بنا پر شائع فرمادیا کہ:-

"بنارعقیدت و عدم عقیدت کے متعلق لوگ دھوکا میں نہ رہیں۔ اور ان سب اعتراضات کو مع ان کے جوابات کے دیکھ کر آزادی سے جو چاہیں فیصلہ کریں اور جو چاہیں رائے قائم کریں"۔

اس سلسلہ میں حضرت کے مذاق کی تفصیل اس کتاب کے تیسرے حصہ "اصولِ زندگی" میں آپ کو ملیگی۔

منت شناسی آجکل تو منت شناسی یا ادائے حق کا جذبہ سرے سے ہی نایاب نظر آتا ہے مگر حضرت تھانوی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے سارے کمالات کو حضرت حاجی امداداللہ قدس سرہ کی طرف منسوب فرماتے تھے اور نہایت ذوق سے فرمایا کرتے تھے

کہ "مجھے تو اپنی حالت اچھی طرح معلوم ہے آنحضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضری سے قبل بھی تو میں تحصیل علوم اور مدرسی کئے ہوئے تھا۔ لیکن وہ باتیں جو حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری کے بعد ذہن میں آنے لگیں۔ وہ اس سے پہلے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آتی تھیں۔ لہذا یہ حضرت حاجی صاحبؒ کا فیض نہیں تو اور کیا ہے۔ اور بقائے فیض کی شرط یہ ہے کہ اپنے شیخ کے ساتھ عمر بھر اعتقاد اور امتنان کا تعلق قائم رکھا جائے۔"

ہمدردی آج کل زبانی انسانی ہمدردی کا تو عام چرچا ہے مگر عملی ہمدردی کا جذبہ عنقا ہے۔ مگر حضرت تھانوی کے قول و فعل میں کبھی تضاد نہیں پایا گیا۔ آپ کے ہاں صرف زبانی ہمدردی کا دستور ہی نہ تھا بلکہ عملی ہمدردی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ اپنے سفر بہاولپور کے سلسلہ میں فرمایا کہ جب میں بہاولپور گیا۔ تو سخت گرمی تھی۔ جیل خانے کے قیدیوں کو پنکھا کھینچنے کے لئے بلایا گیا پہلے یہ بات مجھے ناگوار گزری اور چاہا کہ ان کو واپس کر دوں لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ جیل کی زندگی سے ان بے چاروں کو تھوڑی دیر کے لئے اس ذریعہ سے رہائی تو مل جاتی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے ان کو واپس کر دینے کا خیال تو دل سے نکال دیا۔ اور انتظار کرتا رہا جب سب لوگ چلے گئے۔ تو میں نے ان قیدیوں سے کہا کہ پنکھا بند کر دو۔ پھر جی چاہے تو سو رہو۔ یا بیٹھے رہو۔ کیونکہ بیگار لینا جائز نہیں ہے۔ جب کھانا آیا۔ تو ان قیدیوں کو بھی کھانا دلوایا۔ پھر تو ہر قیدی یہ خواہش کرتا تھا کہ میں بلایا جاؤں۔"

عادات

دوستی کو ترجیح آپ کی عادت تھی کہ جو حضرات آپ سے دوستانہ یا عقیدت مندانہ تعلقات استوار کئے ہوئے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ فقہی مسائل میں آپ کے فرمودات سے اختلاف بھی کرتے جاتے تھے۔ صرف اختلاف ہی نہ کرتے تھے بلکہ ان پر اصرار بھی کرتے تھے۔ تو آپ ازرہ شفقت دوسروں کی طرح ان کو دھتکار نہ دیتے تھے۔ بلکہ انہیں ایسے معاملات میں دوسرے بزرگانِ دین کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دیتے تھے تاکہ دوستی بھی قائم رہے اور ان کی اصلاح بھی ہوتی رہی۔ ایسا سوائے مردانِ حق کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ کہ اپنے مرید باصفا کو کہے کہ عقیدت تو مجھ سے رکھو اور معاملات دوسرے سے۔ یہ شرف صرف آستانِ اشرفیہ کو ہی حاصل تھا۔ کیونکہ وہاں

دکانداری نہ تھی۔ ایمانداری تھی۔

حضرت تھانوی کی فہرست میں ایسے بہ تین بزرگ تھے۔ جو عقیدت کے ساتھ فقہی مسائل میں اختلاف بھی کرتے تھے۔

۱۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ

۲۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی

۳۔ حضرت مولانا عبدالباری ندوی

ان حضرات کا علم و فضل کے لحاظ سے جو مقام ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ پھر ماسوائے سید صاحب کے دونو فلسفی تھے اور یہی علم و فضل فلسفہ ہی اختلاف کی جرأت پیدا کر رہا تھا جس کا مولانا عبدالماجد نے ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے :۔

"حضرت کی تصانیف۔ ملفوظات۔ مواعظ کے مطالعہ کا سلسلہ برابر تیزی۔ سرگرمی و مستعدی سے جاری تھا۔ خوب خوب نکتے ملتے تھے۔ بڑی بڑی بشیرتیں حاصل ہوتی تھیں۔ برسوں کے جمے ہوئے عقائد و خیالات پر بار بار نظر ثانی کرنی پڑتی تھی۔ بعض بعض مسائل پر طبیعت بھڑک اٹھتی تھی۔ زبان بے سبے اختیار داد اور دعا دونو نکالتیں۔ دل کبھی کبھی انہیں غزالی وقت ٹھہراتا۔ اور کبھی چپکے چپکے اللہ سے اُن کی عمر و صحت میں برکت طلب کرنے لگتا۔ غرض عقیدت و عظمت کی ہر منزل دل میں گھر کئے ہوئے تھی۔ اس پر بھی طبیعت کی کجی کہیئے یا فہم کی کمی یا شاعر کی زبان میں ع

ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

سیاسیات تو پھر خیر دور کی چیز تھی۔ فقہیات تک میں انقیاد کامل اور سو فیصدی انقیاد کا درجہ کسی طرح حاصل نہ ہوا سیاسیات میں تو یہ "غیر مقلدی" خوب نمایاں تھی۔ فقہیات میں بھی کچھ ایسی شاذ نہ تھی۔"

(حکیم الامت ص۱۳۰)

پھر یہ حضرات سوالات بھی ایسے کرتے تھے۔ جن کی معقولیت میں بظاہر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً مولانا عبدالماجد نے آپ کو اپنا ایک اشکال ان الفاظ میں بھیجا :۔

"ملفوظات "حسن العزیز" جلد ۲ ص۲۳۹ پر یہ عبارت نظر آئی کہ ایک شخص تھے۔ اصحاب فقہ سے۔ انہوں نے اپنا پیا د اصحاب حدیث میں کسی کے یہاں دیا۔ انہوں نے قید لگائی کہ تم کو دفع یدین وغیرہ کرنا ہوگا۔ انہوں نے منظور کر لیا۔ ایک بزرگ نے فرمایا کہ اس

شخص کے بارے میں مجھے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت اس کا ایمان نہ سلب ہو جائے محض مردار دنیا کے لئے ایسی چیز کو یا تحقیق ترک کر دیا۔ جس کو دین سمجھتا تھا۔
سوال یہ ہے کہ دفع بدین اس شخص کے نزدیک معصیت تو نہ تھا۔ پس غیر افضل تھا۔ تو اگر ایک مقصد مباح کے لئے اس نے ایک سنت کی بجائے دوسری سنت پر عمل شروع کر دیا۔ تو اس میں سلب ایمان کے اندیشہ کی کون سی بات پیدا ہو گئی؟"
سوال کی اہمیت و شدت اس کی عبارت سے واضح ہے اور کسی غیر حکیم کے ماتھے پر تیوڑ لانے کے لئے کافی ہے۔ مگر آپ نے اس فلسفی کے اس سوال کا ایسا حکیمانہ جواب دیا کہ اسے آئندہ کے لئے اپنے فلسفہ پر ایمان نہ رہا۔ آپ نے لکھا:۔

"یہ قصہ رد المختار شرح در مختار باب التعزیر قبیل باب السرقہ میں مذکور ہے۔ اور یہ بزرگ ابوبکر جوزجانی ہیں۔ جن کے قول کو خلاف تحقیق کہنے میں مبادرت نہیں ہو سکتی۔ اور وہ تحقیق انما الاعمال بالنیات سے ظاہر ہے۔ کیونکہ بنا اس ترک سنت کی دوسری سنت کا من حیث السنت اختیار کرنا نہ تھا۔ بلکہ محض جیفہ دنیا کا دین پر ترجیح دینا تھا جس کی حقیقت استخفاف دین اور استعظام دنیا ہے۔ اور اس کا وہی اثر ظاہر ہے۔ جو ان بزرگ نے فرمایا۔ ورنہ سوال کے سب مقدمات لمانہ بقصد دنیا۔ میں بدرجہ اولیٰ جاری ہیں۔ کیا دنیا بھی مباح ہو جائیگا؟"

اس کافی وشافی جواب کے ساتھ آپ نے انہیں اپنے دستور العمل سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا:۔

"میں نے مدت سے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جن احباب سے محض دوستی ہے۔ ان سے عقائد واحکام میں گفتگو نہ کروں گا۔ یا تو خیریت کی اطلاع و استطلاع کا تعلق رکھوں گا یا دعا کا اور یا معالجہ نفسیات کی تحقیق کا۔ اور ایسے احباب کی فہرست میں جناب کا اور مولانا عبد الباری صاحب (ندوی) اور جناب سید سلیمان صاحب (ندوی) کا نام ذہن میں تجویز کیا ہے۔ ان دونوں صاحبوں کو بھی اس کی اطلاع دے چکا ہوں۔ ایسی تحقیقات کے لئے مولانا حسین احمد صاحب و مولانا انور شاہ صاحب کی طرف توجہ دلاتا ہوں ۔"

(حکیم الامت ص۳۴۱)

یہ مباحث بہت گنجائش رکھتے ہیں۔ ان میں کلام کہیں ختم نہیں ہوتا۔ دوستیوں میں ایسا کلام جو کبھی ختم نہ ہو۔ کشاکشی کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے ایسے بزرگ سے تحقیق

مناسب ہے جس سے زیادہ کلام نہ کیا جا سکے" (ایضاً ص۱۳۶)

"اب بے تکلفی کے سبب اپنی اس تجویز کا راز بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر فن میں اس شخص سے پوچھنا چاہیئے جس میں اس شخص کے ماہر ہونے پر اعتماد ہو سکے۔ یہ اس کی قدر اجل ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ مجھ کو فقہیات میں ماہر نہیں سمجھا جاتا۔" (ایضاً ص۱۳۶)

مزید برآں کا یہ جواب پڑھ کر اس ماہر فلسفی کو وجد آ گیا اور بے ساختہ ان کی زبانِ قلم سے نکلا:-

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

الله تعالیٰ آپ کی عمر میں اتنی برکت تو ضرور عطا فرمائے کہ جب تک ہم طالبین و مسترشدین کا جی چاہے ہمارے درمیان ارشاد و افادہ کے لئے سلامت باکرامت بنے رہے۔" (ایضاً)

آپ کے دستور العمل کی ندرت دیکھئے کہ تحقیق مسائل دین کے لئے مولانا حسین احمد صاحب کی طرف رجوع کرنے کا امر فرما رہے ہیں جن سے سیاسی مسائل پر آپ کو شدید اختلاف تھا۔ جو آپ کی وسعت قلبی اور وسیع الظرفی پر دال ہے۔ اور اس کی کرامت دیکھئے کہ مولانا عبد الماجد جیسے ماہر فلسفی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:-

"فقہ اور فقہا دونوں کے خلاف تو تعصب کا رنگ برسوں سے جما ہوا تھا اور ہر فقیہ اپنے خیال میں ذرا کٹھ ملا تھا۔ یہ علم مولانا ہی کی مجلس میں بیٹھ کر اور ان کی زبان سے مختلف فقہی مسائل کی توضیح و تشریح بار بار سن کر حاصل ہوا تھا کہ فقہا کی جماعت حمقا کی نہیں۔ درحقیقت حکما کی جماعت ہوتی ہے اور فقہ اٹکل پچو باتوں کا نام نہیں قرآن و سنت ہی کی حکیمانہ تشریح و استنباط کا نام ہے۔" (ایضاً ص۱۳۲)

مخالفین سے حسن سلوک

اب تقریر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ متذکرہ صدر واقعہ تو اس بات کا شاہد ہے کہ آپ نے محض دوستی برقرار رکھنے کے لئے اپنے معتقد خاص کو اختلافی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دی۔ جن سے آپ کو شدید سیاسی اختلاف تھا۔ گر شدت اختلاف کے باوجود آپ کو اپنے معتقد خاص کے مقابلہ میں اپنے مخالف کی رعایت کتنی مطلوب تھی۔ اس کی حقیقت مندرجہ ذیل واقعہ سے کھلتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی سے وجہ اختلاف کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت تھی۔ جسے مولانا مدنی فرض بتلاتے تھے۔ اور جس کے مولانا تھانوی نہ صرف "تارک" تھے بلکہ مخالف بھی تھے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی کو حضرت تھانوی نے ہی اس زمانہ میں جبکہ ابھی مولانا مدنی نے مسلمانوں

کی شرکت کانگریس کو فرض قرار نہیں دیا تھا۔ ترغیب دے کر اور مولانا مدنی کو تاکید فرما کر مولانا عبدالماجد کو ان کے ہاتھ پر بیعت کرایا تھا۔ حالانکہ خود سلسلہ بیعت رکھتے تھے۔ مولانا عبدالماجد کے گو ضابطہ کے مرشد مولانا مدنی تھے۔ اور وہ ان سے فیوض ظاہری و باطنی بھی حاصل کر رہے تھے۔ مگر رشد و ہدایت کے سلسلہ میں ان کا قلبی رجحان زیادہ تر حضرت تھانوی کی طرف تھا۔ جب ان ہر دو بزرگوں کے سیاسی اختلاف بڑھے۔ تو اس حکیم فطرت نے مولانا عبدالماجد کو مشورہ دیا کہ :۔

"معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کانگریس کی شرکت کو فرض فرماتے ہیں۔ اس صورت میں معلوم نہیں اپنے خاص متعلقین کے لئے "تارکین فرض" سے خاص تعلقات رکھنے کو عقلاً یا شرعاً یا طبعاً پسند فرماتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے خاص عقیدت رکھنے والوں پر لازم ہے کہ مولانا سے ایسے طریقہ سے کہ مولانا اپنا اصلی خیال ظاہر فرما دیں۔ ضرور تحقیق کر لیں۔ کہ مجھ جیسے تارکِ فرض سے اُن صاحبوں کا ملنا ان کے قلبِ لطیف پر گراں تو نہ ہوگا۔ کیونکہ گرانی کی صورت میں باطنی فیوض منقطع ہو جاتے ہیں۔ جو ضررِ عظیم ہے۔ اور اگر ملنا گراں ہو تو چند روز کے لئے مجھ سے ملنا بند کر دینے سے ضرر کچھ نہیں۔ پھر جب موقع ہوگا۔ عود ہو جائیگا۔ اور میں زمانہ بے تعلقی میں بھی دعا گو رہوں گا۔"

(حکیم الامت ص ۱۶۱)

دوست کے مفاد اور مخالف کے مزاج کی اس سے بڑھ کر رعایت اور کیا ہو سکتی تھی۔ آپ نے صرف مشورہ پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ استصواب بھی خود ہی تجویز کر کے بھیجا کہ :۔

"اشرف کا ایک فتویٰ ممانعتِ شرکت کانگریس میں نظر سے گذرا۔ جس سے انگریزوں کو قوت پہنچنے کا احتمال ہے۔ اسلئے ملنے کو دل نہیں چاہتا۔ لیکن چونکہ پہلے سے ملنا تھا۔ اسلئے شبہ یہ ہوتا ہے کہ شاید نہ ملنا مضر دین ہو۔ اس صورت میں اولیٰ کیا ہے ملنا یا نہ ملنا۔ ملنا مضر ہوگا یا نہ ملنا؟"

(ایضاً ص ۱۷۲)

اس ہدایت نامہ اور استصواب نامہ کا اس نستعلی کے قلب و دماغ پر کیا اثر پڑا۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہمیں تو صرف اتنا دیکھنا ہے کہ حضرت تھانوی کا اپنے مخالفین سے کس قسم کا سلوک اور برتاؤ تھا؟ سیاسی مخالف سے حضرت کی رعایت و سلوک کی مثال آپ کے سامنے گذر چکی ہے۔ اب ایک مثال اب آپ کے مذہبی مخالف سے حسن سلوک کی پیش کی جاتی ہے۔

حضرت تھانوی کے حاشیہ نشینوں میں ایک بزرگ ایسے بھی تھے جو زبان اور قلم دونوں

کو بے لگام رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف حضرت کی بعض تحریروں کی تنقید و تنقیص کرتے بلکہ کچھ غیر ضروری باتیں بھی کر گزرتے۔ جو حضرت کے معتقدین پر گراں گزرتیں۔ آخر مولانا عبدالماجد نے ہی انکے خلاف حضرت تھانوی کو شکایت لکھ بھیجی۔ جس کے جواب میں آپ نے لکھا:۔

"وہ عنایت کرتے ہیں اور میں رعایت۔ آپ کو شاید اس کا علم نہ ہوا ہو کہ وہ میری تحریرات پر بھی ایسی ہی آزادی سے کلام کرتے ہیں۔ جن میں اگر مضمون صحیح ہوا قبول کر کے اپنے قول کو واپس لے لیتا ہوں۔ ورنہ قبول نہیں کرتا۔ لیکن بُرا نہیں مانتا۔ صرف نیت پر نظر کر کے۔"

دشمنوں سے درگذر مخالفین سے ایسے نرم۔ مہذب اور متین سلوک کی مثال شاید تاریخ مشاہیر پیش نہ کر سکے۔ مخالفین سے ایسا نرم سلوک کرنے کے ساتھ ساتھ آپ ان لوگوں کے جذبات کا بھی بڑا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ایک اور موقعہ پر آپ نے ایک ایسی شکایت کے جواب میں لکھا:۔

"میں اپنے مخالفین اور موذیوں (ایذا دینے والوں) کے جذبات کی بھی رعایت کرتا ہوں۔ کہ ان پر نیک نیتی کا بھی احتمال رکھتا ہوں۔ اور صبر تو ہر حال میں کرتا ہوں۔ احمد رضا خاں (دیوبندی) کے جواب میں کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ کافر خبیث۔ ملعون سب کچھ بنتا رہتا ہوں۔

ابھی ابھی ایک عنایت فرما کا خط آیا تھا۔ اس میں مجھ کو گدھا تک لکھا ہوا ہے مگر میں ان مراقبات کو اپنا امام بناتا ہوں:۔

۱۔ اپنی زبان قلم یا قلب کو ملوث کیا۔ میرا کیا بگڑا۔ رہا رنج وہ کوئی بگاڑ نہیں محض خیال کے تابع ہے۔

۲۔ ممکن ہے اس شخص کی نیت اچھی ہو۔ مثلاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ اس لئے وہ معذور ہو گو ہم بھی اس لئے معذور ہوں کہ ہم اپنے کو حق پر سمجھتے ہوں یا اپنی غلطی بھی نظر بند ہو۔ مگر اصلاح کا طریق ہماری رائے میں اس سے سہل اور اسلم ہو۔

۳۔ اگر اس نے ہم کو ناحق بھی رنج دیا۔ تو اپنی عاقبت خراب کی۔ ہم کو صبر کا ثواب ملا۔

۴۔ نیز ایسے واقعات سے بھی بعض اوقات اپنی کوتاہیوں پر نظر ہو کر اصلاح کی توفیق ہو جاتی ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو۔ تو کم از کم معتقدین کی عنایت سے جو عجب و کبر پیدا ہو گیا تھا یا

ہو سکتا تھا: اس کا ازالہ یا انسداد ہو جاتا ہے۔

۵۔ نیز خود بھی ایسے مخاطبات اپنے سے سرزد ہو جاتے ہیں۔ اپنی ناگواری سے ان کی ناگواری سامنے آجاتی ہے۔ اور ایسے مخاطبات سے اجتناب کی توفیق ہو جاتی ہے

(حکیم الامت ص۱۸۵)

احکم الحاکمین کا حکم ہے کہ دوسروں کے متعلق زیادہ بدگمانی سے کام نہ لو کہ یہ گناہ ہے اور رحمۃ للعالمین کا ارشاد ہے کہ خطا کا جواب عطا سے دو۔ مخالفین کی مخالفت اور ان کی انتہا درجہ کی ایذا رسانی کے مقابلہ میں ان کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے حضرت تھانوی نے ان سے نپٹنے کے جو متذکرہ بالا اصول بنا رکھے تھے۔ وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ مگر ایسی عالی ظرفی اور شرافتِ نفس کا ثبوت آپ کو بڑے بڑے مدعیان رشد و ہدایت کے ہاں نہیں ملے گا۔ کیونکہ انتقام و انتظام کی بد صلاحیتیں کسبی نہیں۔ وہبی تھیں اور یہ الٰہی کی برکت تھی کہ اگر کوئی شخص آپ سے اپنے مخالفین سے افہام و تفہیم کی درخواست کرتا۔ تو آپ اس سے انکار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ بعض شرائط ضابطہ کے ساتھ فوراً تیار ہو جاتے۔ جیسا کہ واقعہ ذیل سے ظاہر ہے۔

مفاہمت میں مسابقت ہندوستان میں جس قدر سیاسی طوفان آئے۔ ان میں خلافت اور کانگریس کی سول نافرمانی کی تحاریک یادگار زمانہ تھیں۔ سول نافرمانی کی تحریک میں متعدد علماء کی ایک جماعت بھی کانگریس کے ہمنوا تھی۔ جن میں سے مولانا محمد علی جوہر پیش پیش تھے۔ مگر مولانا اشرف علی تھانوی اصولی طور پر اس کے مخالف تھے۔ اس وقت بعض مخلصین ایسے بھی تھے جو ایک طرف تو مولانا محمد علی سے عقیدت رکھتے تھے اور دوسری طرف انہیں حضرت تھانوی سے محبت تھی۔ ان پر یہ امر بہت گراں گذرتا تھا کہ دین و ملت کے ان دو خادموں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع رہے۔ کیونکہ اس اختلاف نے ان کی اپنی حالت نازک بنا رکھی تھی کہ وہ اپنے سیاسی مقتدا کا کہا مانیں یا اپنے مذہبی پیشوا کی پیروی کریں۔ اسلئے ان میں سے بعض نے ان کے درمیان مفاہمت و مصالحت کی خاطر ان کی آپس میں افہام و تفہیم کرانے کی کوشش کی۔ اور ان میں سب سے زیادہ حصہ مولانا عبدالماجد صاحب نے لیا۔ جن کے دل میں مولانا محمد علی کی عظمت و محبت اگر مولانا تھانویؒ سے زیادہ نہ تھی۔ تو کم بھی نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے جرأت کر کے حضرت تھانویؒ سے کہہ ہی دیا کہ:۔

حضرت! ایک مرتبہ تو ملاقات حضرت اور مولانا محمد علی کے درمیان ہو ہی جانا چاہیئے حضرت

تو سفر کرنے سے رہے۔ اجازت ہو تو ان کو کبھی کبھی اپنے ہمراہ یہاں لے آؤں جیسا آپ کی خدمت میں گستاخ ہوں۔ ویسے ہی انہوں نے بھی منہ لگا رکھا ہے۔ امید کیا بلکہ یقین ہے کہ عرض رائیگاں نہ جائے گی۔ انشاءاللہ کچھ تو غلط فہمیاں دونوں طرف کی ملاقات ہی سے دور ہو جائیں گی۔" (حکیم الامت صفحہ ۱۲۶)

حضرت تھانوی ان "بزرگوں" میں سے نہ تھے۔ جو کسی سے اختلاف رائے کی وجہ سے اس کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوں۔ بلکہ وہ تو ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ اور مخالفین کو بھی سینے سے لگانے سے انکار نہ کرتے تھے۔ چونکہ حکیم روحانی تھے۔ اسلئے ایسے مواقع پر بھی حکمت ہی سے کام لیتے تھے۔ حضرت تھانوی نے پہلے تو از راہ تواضع و انکسار فرمایا کہ:۔

"وہ بڑے آدمی ہیں۔ یہاں کہاں آئیں گے۔ یہاں آنے کی انہیں دعوت دینا ہرگز مناسب نہیں۔ بڑی زحمت ہوگی"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہیں ملنے سے انکار نہ تھا۔ مگر وہ ان کو تکلیف دینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ کہ دہلی سے چل کر تھانہ بھون تک آئیں۔ ایسی فضا میں اگر مولانا عبدالماجد حضرت تھانوی سے درخواست کرتے کہ اچھا آپ خود ہی جا کر ملیں۔ تو وہ یقیناً اس سے بھی انکار نہ کرتے۔ مگر وہ غایت محبت و عقیدت کی وجہ سے اتنی جرأت نہ کر سکے اور فوراً کہا:۔

اُس سے حضرت کو کیا بحث۔ لانے والا اور بلانے والا تو میں ہوں۔ اُن کے آنے کی ساری ذمہ داری میرے سر میں صرف آپ کی اجازت چاہتا تھا۔ رہی ان کی زحمت و تکلیف۔ تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تکلیف وہ مقامات اور ٹھیٹھ دیہات میں جانے اور ٹھہرنے کے وہ عادی ہیں۔ ان کی زحمت کا تو خیال بھی نہ فرمائیے"

اس وقت اگر حضرت تھانوی کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ تو وہ اس میں فخر محسوس کرتا۔ اور فوراً مان جاتا۔ مگر اس مصلح اور حکیم نے عجیب ضابطہ کا جواب دیا فرمایا:۔

"عرصہ ہوا فلاں صاحب نے بھی اس قسم کی تحریک کی تھی۔ پہلے تو میں نے ان کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ بڑے آدمی کو یہاں بلانا مناسب نہیں۔ لیکن ان صاحب کے اصرار پر میں نے جو کہا تھا۔ وہی آپ کے سامنے دہرائے دیتا ہوں۔ میری تجویز ہے کہ اگر وہ تشریف لائیں تو اتنا وقت بہرحال دیں کہ درمیان میں ایک رات یہاں گزار سکیں۔ پہلے دن جب وہ تشریف لائیں گے۔ میں اُٹھ کر ان کی تعظیم کروں گا۔ عزت سے اپنے قریب ہی بٹھاؤں گا

لیکن اتنی عنایت وہ کریں کہ مسائل پر وہ اس روز گفتگو نہ فرمادیں۔ بلکہ میرے معروضات خاموشی کے ساتھ بلاقصد جواب سن لیں۔ آدمی ذہین ہیں۔ اگر طبیعت فوراً جواب پر آمادہ ہوگئی۔ تو میری ہر بات کا کچھ نہ کچھ جواب دیتے ہی جائیں گے اور میری کوئی بات بھی قبول نہ کریں گے۔ بس اس وقت صبر و خاموشی سے سن لیں۔ شب میں آرام کریں۔ اور طبیعت کو خلوئے ذہن کے ساتھ میرے معروضات پر سوچنے کا موقعہ دیں پھر دوسرے روز جو چاہیں اور جتنی دیر تک چاہیں۔ ارشاد فرمائیں۔ میں بھی اسی خاموشی کے ساتھ سننے کو تیار ہوں گا۔" (حکیم الامت ص۱۲۲)

آپ جس خوشی سے مولانا سے افہام و تفہیم کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں مولانا محمد علی کی طرف سے ایسا مظاہرہ نہ کیا گیا۔ جیسا کہ مولانا عبدالماجد کے اپنے ان الفاظ سے ظاہر ہے:۔

"ڈلی جا۔ خوش خوش یہ پیام میں نے اپنی طرف سے مولانا محمد علی کو پہنچایا۔ اور عرض کیا کہ تھانہ بھون کا پروگرام میرے وہاں قیام کے زمانہ میں بنا ئیں۔ اس پر مولانا خوشی سے آمادہ تو خیر کیا ہوتے کچھ نیم راضی سے ہو چلے ہے" (بحوالہ صدر)

قانون قدرت بسا اوقات یوں بھی جاری ہوتا ہے کہ اگر انسان کسی کار خیر کی طرف نیم دلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تو اسے قبول نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کے ذرائع مسدود کر دیئے جاتے ہیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مولانا عبدالماجد کی تدبیر تقدیر کے ہاتھوں پٹ گئی۔ عین اسی زمانہ میں مولانا محمد علی کی طبیعت زیادہ علیل ہوگئی۔ جس کی وجہ سے وہ دہلی سے شملہ چلے گئے۔ وہاں سے وقت موعود کی کشش نے انہیں بھوپال اور بمبئی کا چکر دے لندن پہنچا دیا۔ جہاں سے وہ اپنے آقا و مولا کے دربار میں جا پہنچے۔

مخالفین کیلئے دعائے خیر

مولانا تھانوی انتقام سے زیادہ انتظام کے عادی تھے۔ اور انتظام بھی ایسا جس کے مؤثر ہونے کی ضمانت خود ناظم کائنات کی طرف سے موجود۔ یعنی دعا جس کا سرور کائنات کے ہاں بھی مخالفین کے لئے خاص اہتمام تھا۔ چنانچہ جب حضرت تھانوی کو مولانا محمد علیؒ کی علالت کی خبر ملی۔ تو آپ نے یہ خبر پڑھ کر مولانا عبدالماجد کو لکھا کہ "اس سے میرا دل دکھا۔ دل سے دعائے خیر کرتا ہوں"۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جب وفات کی خبر پہنچی۔ تو انہوں نے ان کے لاڈلے مولانا عبدالماجد کو یہ تعزیتی خط لکھا:۔

"مکرمی السلام علیکم

محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے۔ بیان نہیں کر سکتا۔ خدا جانے کتنی دفعہ دعا

کر چکا ہوں۔ اور کر رہا ہوں۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے۔ صرف ایک صفت۔ مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ اسلئے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں۔ اشرف علی"

(حکیم الامت صفحہ ۱۲۹)

اپنے مخالفین کی تکلیف پر حضرت تھانوی کا دل دکھنا۔ اور ان کی مخالفت کے علی الرغم ان کی کسی صفت محمودہ کی وجہ سے ان سے محبت کرنا اور دست بدعا رہنا۔ آپ کے کردِ عظیم ہونے پر دال ہے۔

حضرت تھانویؒ کا یہ سلوک اپنے ہر مخالف سے تھا۔ خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ تحریکِ خلافت کے بڑے پرجوش کارکن اور جمعیتہ العلماء کے ممتاز رکن۔ خوش بیان مقرر۔ عالم۔ شیخ مولانا عبدالماجد قادری بدایونی غالی قسم کے صوفیا میں سے تھے۔ مگر ان کا دل حضرت تھانوی کی نسبت صاف نہ تھا۔ اکثر وہ آپ کا ذکر نازیبا اور نا ملائم الفاظ میں کرنے کے عادی تھے۔ جب ۱۹۳۱ء کے اخیر مہینہ میں ان کا انتقال ہوا اور اس کی اطلاع حضرت تھانوی کو ہوئی۔ تو آپ نے اطلاع دینے والے کو لکھا:۔

"ایک محب اسلام و اہل اسلام کی مفارقت ناسوتی کا علم ہو کر قلق ہوا۔ رائے کا اختلاف میری نظر میں کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔ اصول اور نیت پر نظر رہتی ہے۔ سو مرحوم کے متعلق اس کے خلاف کوئی بات نہیں سنی گئی۔ اسلئے خاص قلق ہے۔ اللہ تعالے اُن کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرما دیں اور اُمت کو ان کا نعم البدل عطا فرماویں۔ مجھ سے جو فرمائش ان کی گفت و شنید معاف کرنے کے متعلق فرمائی ہے۔ میں اسکا اسلئے بھی شکر گذار ہوں کہ اس میں دو مسلمانوں کا بھلا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے قلب میں بحمد اللہ تعالے کسی کی طرف سے غل نہیں ہے۔ اور ایسی گفت و شنید میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کو گناہ بھی نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ روایات کے تحت میں معذور ہیں۔ اسلئے معافی کی حاجت بھی نہیں۔ لیکن اس سے آپ کی طبیعت خوش نہ ہوگی۔ اسلئے آپ کے مذاق کا اتباع کرکے صریح الفاظ میں دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ میں نے سب کچھ ان کو معاف کیا۔ آپ بھی معاف فرمادیں۔"

(حکیم الامت صفحہ ۲۲)

اپنے مخالف کے نعم البدل کی دعا کرنا یہ صرف حضرت تھانوی پر ہی ختم تھا۔ اسلئے تو خسرو دربار اشرفیہ

خواجہ عزیزالحسن مجذوبؒ فرمایا کرتے تھے ؎

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور　　تم سے جہاں میں لاکھ سہی۔ تم مگر کہاں۔

مخالفین کا ادب احترام ۱۹۲۹ء میں مسٹر ہربلاس شاردا نے مرکزی اسمبلی میں کم سنی کی شادی کے انسداد کے لئے ایک مسودہ قانون پیش کر رکھا تھا کہ ایک مخصوص سن تک پہنچنے سے قبل لڑکے اور لڑکیوں کی شادی جرم قرار دی جائے۔ بعض نافہم مسلمانوں نے اس قانون کے مسلمانوں پہ اطلاق کی تحریک کر دی۔ چونکہ عمر ازدواج کی قید مداخلت فی الدین تھی۔ اسلئے مسلمانوں نے اس کے خلاف خوب شور مچایا۔ جلسے کئے۔ قراردادیں پاس کیں حضرت تھانوی ایسے جلسوں جلوسوں میں شرکت کے عادی نہ تھے۔ مگر آپ کے مخالفین مخالفت کے باوجود آپ کی شرکت ضروری سمجھتے تھے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۲۹ء کو زیر صدارت مولانا محمد علیؒ کانپور میں اس ایکٹ کی مخالفت میں ایک عظیم الشان جلسہ ہونا قرار پایا۔ جس میں شمولیت کے لئے انہی مولانا عبدالماجد قادری بدایونی نے حضرت تھانوی کی خدمت میں اپنی طرف سے یہ خصوصی دعوت نامہ شرکت جلسہ کے لئے بھیجا۔

"ذوالمجد والکرم عظیم القدر جناب مولانا شاہ اشرف علی صاحب

السلام علیکم۔ فقیر عبدالماجد القادری البدایونی عارض مدعا ہے

ضروریات مذہب و حالات اسلامیہ کا تقاضا ہے کہ میں جناب سے گذارش کروں کہ ۲۲ دسمبر کو کانپور تشریف لا کر قانون خلاف شریعت کے انسداد و امحار کی مجلس میں اپنے مذہبی اور عالی خیالات سے ہماری امداد فرمایئے۔

میں سنتا ہوں کہ جناب سفر کے کم عادی ہیں اور موسم بھی تلخ ہے۔ شاید مسافت بھی زیادہ جناب کے حالات و اوقات بھی مشغول اور گھرے ہوئے ہیں۔ مگر باوجود اس کے جو امر داعی باعث زحمت دہی بنا رہا ہے۔ وہ ایک اور فقط ایک ہے یعنی خدمت تحفظ شریعت۔ اور اس کے لئے ہر طبقہ کے مسلمانوں کا ایک مرکز ثقل اشرف پر مجتمع ہو جانا۔ یقین ہے۔ اس امر کی اہمیت کا ممتاز لحاظ فرما کر اور فقیر کی تحریک کو درجۂ اختصاص و قبول دے کر محض دین و مذہب کے لئے۔ باوجود مشاغل کثیرہ یا اعذار واقعیہ تکلیف سفر گوارا فرمائی جاوے گی۔ اور نوید تشریف آوری سے اطلاع بخشی جائے گی۔

میرا مسلک عمل۔ اس مقصد و جہاد کے لئے ہر محافظ و خادم شریعت اور مخالف قانون زیر

نظر (شارد ا ایکٹ) کو وسعتِ قلب کے ساتھ شریک کار و رفیق عمل بشیر نا پیر بنا تا ہے اس کی اہمیت آپ کے ذہن و فکر میں بھی مجھ سے کم نہ ہوگی۔ اور یقین ہے کہ اس بار آپ غیر معمولی ہمت سے کام لے کر اپنے عزم صمیم اور شرکت کے وعدہ سے مطلع فرما دیں گے۔

مطبوعہ دعوت نامہ بھی حاضر کیا جائیگا۔ مگر یہ عریضہ فقیر کے خصوصی جذبات کا ترجمان ہے۔

فقیر عبد الماجد القادری البدایونی از کانپور۔ بانس منڈی

یہ خط اس زمانہ میں حضرت کی خدمت میں بھیجا گیا تھا جب کہ آپ آنت اترنے کی وجہ سے ہر قسم کا سفر ترک کر چکے تھے۔ اور مدعو کرنے والوں کی اطلاع کے لئے ایک باضابطہ معذرت نامہ بھی چھپا رکھا تھا جو خاص و عوام میں تقسیم بھی ہو چکا تھا۔ اسکے علاوہ ترکِ سفر کے اور عذرات بھی معقول تھے۔ جن کا خود مولانا بدایونی کو اعتراف تھا جیسا کہ خط کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اسلئے آپ نے مندرجہ ذیل خصوصی معذرت نامہ انہیں روانہ کیا:۔

"از ناکارہ و آوارہ اشرف علی عفی عنہ

بہ گرامی خدمت عالی درجت مخدومنا مطلبنا ادام اللہ تعالیٰ افاداتہم وافاضاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

باوجود میرے نا قابلِ خطاب ہونے کے مجھ کو خطاب سے سرفراز فرمانا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا اور کس طرح شکریہ ادا کروں۔ بجز اس کے کہ ؎

از دست گدائے بینوا ناید ہیچ ۔۔۔ جز آنکہ بصدقِ دل دعائے بکند

جس خدمت کے لئے مجھ کو ارشاد ہوا ہے۔ اول تو اس کا دینی خدمت ہونا۔ پھر مزید براں جناب کا حکم ہونا فی نفسہ کسی عذر کا متحمل نہیں۔ لیکن اگر کوئی عذر حد عذر سے متجاوز ہو کر حدِ عجز تک پہنچ گیا ہو۔ غالباً اس کا پیش کر دینا نقص امر نہ ہوگا۔ اس غرض سے چھپا ہوا عذر نامہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ اور بجائے شرکت جسمانی کے شرکت روحانی پر جس کا ظہور بصورت دعا ہو رہا ہے۔ اکتفا کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اور علاوہ دعا کے اور خطابات متعلقہ کے متعلق شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کو اپنے کچے چٹھے کا کاشف اور شفیع بناتا ہوں ؎

آں را کہ عقل و ہمت و تدبیر و رائے نیست　　　خوش گفت پردہ دار کسے در سرائے نیست

والسلام از تھانہ بھون ۱۴ رجب ۱۳۵۲ھ

حضرت تھانویؒ کے متعلق بقول مولانا دریابادی مولانا بدایونی کے دل میں :-

"بالکل صفائی نہ تھی۔ اول تو عقائد میں دیوبندی و بریلوی اختلاف مدتوں سے پشتوں سے سد راہ بنا ہوا تھا۔ نوبت تکفیر تک آ چکی تھی۔ پھر ذاتی طور پر سیاسی اختلافات بھی شدید قسم کے حائل رہ چکے تھے۔" (حکیم الامت ص ۹۷)

ایسے حالات میں ایسے مخالف کی زبانِ قلم سے اعترافاً حضرت تھانوی کے حق میں "ذوالمجد الکریم عظیم القدر" کے الفاظ نکلنا خواہ ضرورتاً ہی سہی جہاں آپ کے "کریم عظیم" ہونے کی تائید غیبی ہے وہاں اپنے سے کم عمر اعتقادی و سیاسی مخالف کو "بگرامی خدمت۔ عالی درجت۔ مخدومنا معظمنا ادام اللہ تعالٰے افادتہم و افاضاتہم" سے خطاب کرنا اور اس کے عقائد کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے خود کو "ننگ کارہ۔ آوارہ۔ اشرف علی" لکھنا اور انتہائی محبت و شفقت سے جواب دینا اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ آپ کے دل میں اپنے مخالفین کا کتنا احترام تھا۔ اگر ہر شخص اپنے مخالف سے ایسے احترام و احسان کا مظاہرہ کرے۔ تو بہت سی خرابیاں دیکھتے دیکھتے دور ہو جائیں۔

مفتریوں سے مروّت حق تعالٰے جنہیں محبوب و مقبول بناتا ہے۔ ان کے حاسد بھی بڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ حضرت تھانوی کے بدخواہوں کا ایک طبقہ تو وہ تھا جو انہیں کافر۔ زندیق۔ ملعون وغیرہ بنانے میں مصروف رہتا تھا اور دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ان میں حضرت تھانوی کے خلاف ان کی بعض تحریروں کا غلط مطلب بیان کر کے آپ کے خلاف افترا و بہتان لگانے میں مصروف رہتا تھا جس سے آپ کے خیر خواہوں کو سخت روحانی تکلیف پہنچتی۔ گروہ بالا بالا ہی حقائق کی روشنی میں ان کی تردید و تکذیب کر دیتے۔ مگر بعض اس کی شکایت خود حضرت تھانوی سے ہی کرتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مولانا دریابادی نے حضرت تھانوی کو لکھا کہ :-

"پچھلے دنوں جناب والا سے متعلق عجب عجب اتہامات سننے میں آئے ایک صاحب نے ایک مشہور مولوی صاحب کے حوالہ سے بیان کیا کہ جناب نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ جب تک جسم پر ولایتی کپڑے کا کوئی جزو نہ ہوگا۔ نماز درست نہ ہوگی معاذ اللہ۔ ایک دوسرے صاحب نے بیان کیا کہ آپ نے بیان القرآن میں سورۃ المائدہ

کی آیت وَلَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً کے تحت میں گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ موالات و مودت فرض قرار دی ہے۔ پہلے افترا کی تو زبانی تردید کر کے خاموش رہا۔ اس دوسرے افترا کی تردید اصل تفسیر سے اقتباس دے کر آپ کی ہفتہ کے پرچہ "سچ" میں کر رہا ہوں"۔

جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:۔

"یہ آپ کی محبت ہے۔ مگر مجھ کو تو طبعاً اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس اتہام میں نہ اُن کا ضرر نہ میرا۔ بلکہ جواب دینے میں ان کا یہ ضرر ہے کہ اب تو وہ اتہام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر مطلع ہو کر قبول نہ کریں گے۔ تو عاصی ہوں گے۔ تو ایک مسلمان کو عاصی بنانا کیا فائدہ ہے" (حکیم الامت صـ۲۳۲)

اس طرح آپ نے اپنی دشمن نوازی سے مخالفوں کی افترا پردازیوں کی تردید کا ایک لطیف پیرایہ میں ہمیشہ کے لئے دروازہ بند کر دیا۔

متوسلین کی وکالت

ایک طرف تو حضرت تھانوی کو اتنا بھی گوارا نہ تھا کہ جو ان پر افترا و اتہام کے تیر و نشتر چلانے کے عادی ہیں ان کی تردید کر کے ان کے معاصی میں اضافہ کیا جائے۔ دوسری طرف وہ اس بات کے عادی تھے کہ جو لوگ ان کی بجائے ان کے منتسبین یا متوسلین کو گشتنی و گردن زدنی ٹھہراتے۔ وہ ان کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتے ایک مرتبہ مولانا حسین احمد صاحب نے سیاسی اختلافات کے سلسلہ میں اپنے مرید خاص مولانا عبدالماجد دریابادی کو یہ خط لکھا:۔

"آنجناب کی توجہات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ واقعہ یہی ہے کہ یہ ناکارہ تو حضرت تھانوی دامت برکاتہم کا نہایت معتقد اور ان کی تعظیم و احترام کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ اُن کی قابلیت اور ان کے کمالات کے سامنے اتنی بھی نسبت نہیں رکھتا جو کہ طفل دبستان کو افلاطون سے ہو سکتی ہے۔ البتہ تحریک حاضرہ سے متعلق جو چیزیں وہاں سے شائع کرادی جاتی ہیں۔ اور وہاں کے متوسلین جو کچھ گاتے ہیں وہ نہایت دلخراش ہیں۔ میں مولانا کو اپنا مقتدا اور اپنے اکابرین میں سے سمجھتا ہوں"۔ (ح۔۱۔صـ۲۵۱)

اگرچہ اس خط میں ہر طرح کا ادب و احترام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مگر ایک شاید قسم کا الزام بھی ساتھ ہی لگا دیا گیا ہے کہ تحریک سول نافرمانی سے متعلق چیزیں وہاں سے شائع کرادی جاتی ہیں جس سے

یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدانخواستہ حضرت تھانوی اس تحریک کے مخالفین کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ جیسا وہ چاہتے لکھ کر دیتے تھے۔ چنانچہ اس کا حضرت تھانوی نے وہ تاریخی جواب دیا کہ ان کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا۔ تو شاید نہ دے سکتا۔ مولانا عبدالماجد نے یہ خط حضرت تھانوی کو "بہ صد مسرت و انبساط" بھیج دیا تھا۔ جس کے جواب میں حضرت تھانوی نے انہیں لکھا:۔

"میں تو اس قابل نہیں۔ خود ان کی بزرگی ہے۔ مگر بزرگی پر نظر کرکے یوں جی چاہتا ہے کہ میری سوانح عمری میں دوسروں کی اشاعت اور دلخراشی کا ذکر نہ فرمایا جاوے اور اگر ان میں میں بھی حصہ لیتا ہوں۔ خواہ فعلاً یا رضاً تو خود میری اصلاح فرمائی جاوے اور میری ہی طرف منسوب فرمایا جاوے۔ کیونکہ متوسلین کے آثار متعدیہ دونوں طرف مشترک ہیں۔ گو میں اپنے جمود ذہن کے سبب ایسے آثار سے متاثر نہیں ہوتا۔ بہرحال میں خود کسی کا شاکی نہیں۔ اور سب کی شکایات سر پر رکھتا ہوں اور باعث ان سطور کی تحریر کا محض انبساط اور ناز اور بے تکلفی ہے۔ آپ کی خدمت میں بھی اور مولانا کی خدمت میں بھی حسب ضرب المثل اذا جاءت الالفة رفعت الکلفة۔ نہ کہ شکایت یا حکایت یا روایت" (بحوالہ صدر)

تنقیص پر اعتراف حضرت تھانوی اپنے متوسلین کی جائز وکالت میں تو پیش پیش تھے مگر جہاں خود ان کی ذات پر اعتراضات کیے جاتے۔ وہاں مدافعت کی بجائے مساعت یعنی چشم پوشی سے کام لیتے۔ حالانکہ اپنی صفائی یا برأت حقائق کی روشنی میں بآسانی کر سکتے تھے۔ مگر دوسرے کے خجل ہوتے کے اندیشہ سے کہہ دیتے تھے کہ معصوم تو میں بھی نہیں حضرت تھانوی کا ایک مقالہ الاعتدال فی متابعۃ الرجال اخبار "سچ" لکھنؤ میں شائع ہوا تو اس پر ایک صاحب نے مدیر سچ کی وساطت سے حضرت تک اپنے الزامات ان الفاظ میں پہنچائے:۔

"حضرت مولانائے محترم کا مضمون نہایت شوق سے پڑھا۔ الحمدللہ۔ دل سے بیساختہ دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالےٰ حضرت مولانا کی عمر اور دل و دماغ میں بہت بہت وسعت اور برکت دیں۔ اور مسلمانوں کو ان کے ملفوظات و افادات سے مستفیض ہونے کی توفیق آمین ثم آمین۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت کو اللہ نے عجیب و غریب جامعیت عطا فرمائی ہے۔ برکف جام شریعت الخ یہ مولانا ہی کی شان ہے شریعت و طریقت دونوں کا ہی سررشتہ کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اور ان دونوں کے واجبی احترام

میں ذرا بھی فرق نہ آنے پائے۔
لیکن خود حضرت مولانا کا طرزِ عمل اپنی اس تعلیم سے مختلف کیوں نظر آتا ہے۔ آپ کے علم و مشاہدہ میں متعدد واقعات ایسے ہوں گے کہ ادنیٰ سے اختلاف پر مولانا سخت ناخوش ہو گئے۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انقباض اور تکدر محض طبعی رہا بلکہ اس کا اثر تعلقات تربیت پر پڑا۔ ایک آدھ مثال میرے علم میں ایسی ہے کہ حضرت نے ایک صاحب علم و فضل اور غایت درجہ معتقد سے محض اتنی بات پہ قطع تعلق فرما دیا کہ انہیں ایک اجتہادی فرعی مسئلہ بلکہ اس کے ایک جزئیہ میں دیانتہً مولانا سے اختلاف تھا۔ ایسے واقعات کی کیا توجیہ کی جائے"؟
حضرت تھانویؒ نے اس کے جواب میں مدیر سچ کو لکھا کہ:-
"اصل میں تو میرا مذاق ایسے سوالات کا جواب دینے کا نہیں۔ کیونکہ اپنی ذات کے متعلق جواب دینا مرادف ہے کہ ہم اس نقص سے بری ہیں۔ سو ایسا دعویٰ کرنا خود فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ کے خلاف ہے۔ اس لئے ان کو اتنا ہی جواب کافی ہے مگر آپ پر کشف واقعہ کی غرض سے اتنا جواب کافی اور دے سکتا ہوں کہ کوئی بات کا جواب ہو نہیں سکتا۔ نہ مجھ کو کوئی ایسا واقعہ یاد۔ اگر ان سے اس صاحب علم و فضل کا نام اور اس اجتہادی فرعی مسئلہ کی تعیین اور نوعیت اختلاف کی تحقیق فرما لیجئے اور مجھ کو بھی یاد آ جائے۔ تو بے تکلف عرض کر دوں گا۔ خواہ اُن کی غلطی ہو۔ خواہ میری غلطی ہو"
(حکیم الامت ص ۳۵۵)

شاکی سے شفقت

ایسی ہی شکایت ایک دفعہ خود مدیر سچ نے ۱۹۲۲ء میں حضرت سے ان الفاظ میں کی:-
"مولوی ۔ ۔ ۔ صاحب سے میری ملاقات ۱۲-۱۵ سال کی ہے۔ صالح دیندار تو انہیں ہمیشہ ہی پایا تھا۔ اب کی حیدر آباد میں ان کی کثرتِ عبادت دیکھ کر براہ راست سوال کر بیٹھا بیعت سے متعلق پہلے تو ٹالا۔ پھر آخر کو کھلا۔ بڑی پردرد روئیداد تھی اُن کے اور اُن کے شیخ کے موجودہ تعلقات کی نوعیت کہ بجز اُن کی حرماں نصیبی کے اور کس چیز سے تعبیر کروں۔ اللہ سے دعا ہے کہ اب ان کے حال پر رحم ہو اور جس چشمہ فیض تک ان کی رسائی ہو چکی تھی۔ اس سے وہ پھر سیراب ہونے لگیں۔

یہ دعا تو اس سے تھی۔ جو معصوموں اور بے کاروں دونوں کی سنتا ہے۔ باقی جناب والا کی خدمت میں گذارش صرف اتنی ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو جناب کی ذات کے ساتھ خلوص و عقیدت اب تک جوں کی توں ہے اور اپنی معتوبی و مہجوری کا ذکر اس حسرت کے ساتھ کرتے تھے کہ دل اُن کی ہمدردی میں بے اختیار ہو جاتا تھا۔"

شکایت و سفارش کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو قصور سراسر حضرت تھانوی کا ثابت کیا گیا ہے۔ مگر حضرت تھانویؒ نے بہ کمال شفقت یہ جواب لکھا:۔

"میں خود ان کو صالح سمجھتا ہوں۔ مگر صالح کے چند اقسام ہیں۔ اعتقاد تو سب اقسام سے ہے مگر مناسبت بعض ہی اقسام سے ہے۔ آپ کی خیر خواہی و رحم دلی میں تو شبہ نہیں لیکن اس میں کچھ کام ان کے کرنے کا بھی ہے۔ انہوں نے نہیں کیا۔ اور نہ مجھ سے پوچھا۔ کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیئے۔ اب آپ غور فرمایئے۔ اس حالت میں میرے ذمہ کیا ہے۔ کیا وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اپنے مرض پر صرف حسرت کافی ہے یا معالجہ بھی ضروری ہے۔ آپ نے تو اتنا بھی فرمایا۔ انہوں نے اتنا بھی نہ کیا۔" (ح۔ ا۔ ص ۱۵)

تربیت میں شدت حضرت تھانوی صرف پیر روشن ضمیر یا مشیر با تدبیر ہی نہ تھے۔ حکیم و معلج بھی تھے۔ جو ان کا اصل منصب تھا۔ اب ایک حکیم کے لئے یہ بڑا مشکل ہوتا ہے کہ وہ علاج کے وقت مریض کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کی خواہشات کی رعایت کرے۔ کہ دوا میٹھی ہو۔ کڑوی نہ ہو۔ پرہیز ضروری قرار نہ دیا جاوے۔ یا اپریشن کے وقت نشتر اور چھری سے کام نہ لیا جاوے۔ ظاہر ہے کہ جو حکیم ایسا کرے گا۔ وہ ہمدرد نہ ہوگا۔ بے درد ہوگا۔ اگر کوئی حکیم شربت و مفرحات کی جگہ تلخ و ترش ادویات دیتا ہے۔ یا اگر کوئی سرجن پھوڑوں کو چیرتا پھاڑتا ہے۔ اور نشتر کو اندر ہی اندر گہرائیوں میں اتارتا چلا جاتا ہے۔ تو وہ ایسا بے دردی۔ شقاوت یا قساوت سے نہیں کرتا۔ بلکہ وہ محض مریض کی ہمدردی۔ ہوا خواہی —— اور دلسوزی کے جذبہ سے کرتا ہے۔ تاکہ مواد فاسدہ خارج ہو کر یہ جلد صحت یاب ہو جائے۔ ایسے موقع پر مریض کا ہائے ہائے یا چیخ و پکار کرنا لازمی ہے اور اگر مریض حکیم سے انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود اپریشن کرانے کے بعد اس کی آئندہ کے لئے مرہم پٹی کرانے سے اس لئے احتراز کرے کہ حکیم نرمی کی بجائے سختی سے کام لیتا ہے۔ تو اس صورت میں حکیم کا کیا قصور ہو سکتا ہے حضرت تھانوی کی بدنامی کا باعث زیادہ تر ان کی یہی حکمت ہے اور ان کو بدنام کرنے والے غیروں سے

زیادہ اپنے ہیں جو نافہمی و ناوانی کے باعث خواہی نخواہی کہے دیتے تھے کہ:۔

"یہ کوئی کٹر قسم کے مولوی ہیں۔ تشدد میں بسے ہوئے۔ تقشف میں رچے ہوئے۔ بات بات پر گھڑکی۔ قدم قدم پر جھڑکی۔ فلاں عمل حرام۔ فلاں عمل باعث یہ چیز ناجائز وہ چیز معصیت۔" (ح۔۱۔ص۲)

حالانکہ بقول مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی:۔

"مولانا کا تشدد یا ظاہری تشدد جو کچھ بھی تھا۔ وہ اصلاح کی غرض سے اور ان ہی لوگوں کے لئے تھا۔ جو خود طالب اصلاح ہو کر آتے تھے۔ یہ نہ تھا کہ کوئی شخص محض ملاقات یا مخصوص عملی تحقیق کے لئے آئے۔ اور اس پر بے تحاشہ دارو گیر، زجر و ملامت ہونے لگے۔" (حکیم الامت ص۱۴۰)

مولانا نے ایسے لوگوں کی فلاح کے لئے جو بغرض اصلاح آتے۔ چند قاعدے اور ضابطے بنا رکھے تھے۔ جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی آپ ان قاعدوں کے نفاذ اور ان ضابطوں کی پابندی مریدوں۔ طالبوں۔ اور متوسلوں سے سختی سے کراتے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ آپ کو برا بناتے تھے۔ اگر آپ مریض کے مرض پر نظر رکھنے کی بجائے مریض کی مرضی پر چلتے۔ تو یقیناً پھر بدنام نہ ہوتے مگر اس کی توقع حضرت تھانوی ایسے مصلح سے رکھنی عبث تھی۔ چنانچہ اس کی وضاحت انکے اپنے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ:۔

"امر اجتہادی ہیں کیونکہ کسی کو دبایا جائے اگر آج کوئی شافعی یا غیر مقلد مجھ سے بیعت ہو (اور ہیں بھی) تو میں ان کو ترک اجتہادیہ میں کیسے مجبور کر دوں۔ گو طبیعت کے بھی خلاف ہو۔ جیسے خود ترک تقلید میرے ذوق کے بالکل خلاف ہے اور طبعاً گراں بھی۔ مگر میں زور سے نہیں کہہ سکتا۔ البتہ جو مخل تربیت ہو۔ اس میں سختی کرتا ہوں۔ اور بدنام ہوں۔" (حکیم الامت۔ ص۲۹۳)

پھر لطف یہ ہے کہ اس بدنامی کا آپ پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ جیسا کہ خود فرماتے تھے:۔

۱۔ "بدنامی کا تو مجھ پر بحمداللہ دانہ خردل کے برابر بھی اثر نہیں ہوتا۔" (ح۔۱۔ص۱۵۵)

۲۔ "مجھ کو جیسا چاہیں۔ اور جو چاہیں کہہ لیں۔ انشاءاللہ دلگیر نہ ہوں گا" (ح۔۱۔ص۱۵۱)

اگر آپ ایسا نہ کرتے تو پھر اصلاح و تربیت کا فریضہ کبھی ادا نہ کر سکتے۔

عمل میں مداومت | بااخلاق و بامروت ہوتے ہوئے ہر کام کو ہمیشہ اپنے وقت اور اپنے موقعہ

پر کرنا بہت بڑی کرامت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ملنے والا ناواقفیتِ اوقاتِ مشغولیت کی وجہ سے ایسے وقت آجاتا ہے۔ جو کسی خاص کام کے لئے مخصوص ہوتا ہے معمول کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ آنے والی شخصیت بھی ایسی ہوتی ہے کہ اس کا ادب و احترام لازم ہوتا ہے۔ اور اخلاق و مروت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان وہ کام چھوڑ کر خود آنے والے کے استقبال و احترام میں مشغول ہوجائے۔ ایسا کرنے سے اس کام کی مداومت میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ جسے معلم الاخلاق صلی اللہ علیہ وسلم نے بے برکتی پر محمول فرمایا ہے۔ اسلئے ایسے مواقع پر بفضلِ ایزد متعال حضرت تھانوی اخلاق و مروت سے مغلوب نہ ہوجاتے تھے۔ اور نہ ہی ایسے معزز مہمان کو خواہ مخواہ ضابطہ کی پابندی کا شکار بناتے۔ بلکہ ایسے اوقات میں آنے والے کی مدارات بھی کرتے اور معمول کی مداومت کو بھی برقرار رکھتے تاکہ اس میں بے برکتی نہ ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کے استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ آپ کے مہمان ہوئے۔ آپ نے ان کی راحت و آرام کے تمام انتظامات کئے ہی تھے کہ آپ کی تصنیف و تالیف کا وقت آگیا۔ تو آپ نے اپنے معمول کو جاری رکھنے کے لئے اپنے استاد محترم سے بصد ادب عرض کیا کہ:۔

”حضرت میں اس وقت کچھ لکھا کرتا ہوں۔ اگر حضرت اجازت دیں تو کچھ دیر لکھ کر بعد کو حاضر ہوجاؤں۔“

حضرت شیخ الہند نے معمول کی مداومت پر خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے فوراً اجازت دیدی کہ:۔

”ضرور لکھو۔ میری وجہ سے اپنا حرج نہ کرو۔“

گو اس روز آپ کا کام میں دل نہیں لگا۔ لیکن بے برکتی کے خوف سے ناغہ نہیں ہونے دیا۔ تھوڑا سا لکھ کر پھر حاضر خدمت ہوگئے۔

عزم و استقامت حضرت تھانوی کو جہاں دوسروں کے لئے ہر قسم کی آسانیاں پیدا کرنے کی فکر رہتی تھی۔ وہاں وہ خود ہر قسم کی دشواریاں برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ آپ کے عزم و ارادہ اور ثبات و استقامت پر حوادثِ ارضی و سماوی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اور نہ ہی عمر کا تقاضا یا طبعی کمزوری مانع ہوتی تھی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں برسات کا موسم ختم ہونے کے بعد سہارنپور و مظفرنگر کے اطراف میں ایسی بے فصلی مگر شدید بارش ہوئی جیسے آسمان سے پانی کے دریا بہا دئے گئے ہوں۔ تھانہ بھون بھی اس کی لپیٹ میں تھا۔ وہاں

کوئی خاص پختہ سڑکیں تو تھی نہیں۔ معمولی کھڑنجے کی سڑکیں تھیں۔ جن پر کثرتِ باران کی وجہ سے ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ پانی چل رہا تھا۔ حضرت تھانویؒ کے مکان سے مسجد کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ مکان سے مسجد تک پہنچنے کا ایسا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ جس پر گھٹنے گھٹنے پانی نہ ہو۔ خانقاہ میں بڑے بڑے عالم۔ فاضل۔ مرید۔ مہمان موجود۔ مگر ان میں سے اکثر نے اپنی اپنی جگہ ہی مختصر سی جماعتیں کرالیں کہ رات کے اندھیرے میں موسلا دھار بارش کے اندر مسجد تک کون جائے اگر اس عالم میں مسجد تک جانے والا کوئی نکلا تو وہ صرف ۷۲ سالہ بوڑھے جواں ہمت حضرت تھانویؒ تھے۔ عشا کی نماز مسجد میں باجماعت پڑھ کر اس موسلادھار بارش میں پانی کو چیرتے ہوئے واپس گھر پہنچے۔ اور جب صبح ہوئی۔ تو بارش کی شدت اتنی بڑھی کہ لوگ الاماں والحفیظ پکار رہے تھے۔ خود خانقاہ والوں کے لئے سائبان کے سایہ میں چند منٹ چل کر مسجد کے دالان تک پہنچنا دشوار ہو رہا تھا۔ مگر یہ پیرمرد پھر ٹخنوں تک پائجامہ چڑھائے اور ایک مضبوط ڈنڈا اٹھائے پانی کو چیرتے پھاڑتے مسجد میں پہنچ رہے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر مولانا عبدالماجد کی زبان قلم سے بے ساختہ نکلا کہ:۔

"اہل طریق سچ کہتے ہیں کہ رسوخ فی الدین اگر حاصل کرنا ہے۔ تو محض کتابیں کافی نہیں بزرگوں کی صحبت میں عرصہ تک رہ کر ان کے عملی نمونوں سے سبق حاصل کرنا ضروری ہے"
(حکیم الامت ص ۲۹۵)

سفارش میں احتیاط

فطری طور پر ہر صاحبِ غرض کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا کام جلد نکل آئے۔ خواہ منت سے۔ خواہ رشوت سے۔ اور خواہ سفارش سے۔ سفارش کے لئے اربابِ غرض گوشہ نشینوں تک کو بھی آرام و اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیتے حضرت تھانویؒ بھی اس "خدمت" سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ انہیں بھی گاہے گاہے اس کام کیلئے مجبور کر ہی دیا جاتا تھا۔ مگر اس معاملہ میں وہ انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اول تو ناجائز یا بے جا سفارش کبھی نہیں کرتے تھے۔ جائز اور حق معاملات میں بھی سفارش اس انداز سے کرتے تھے کہ جس سے سفارش کرتی ہے۔ اس کی طبیعت پر بار نہ پڑے۔ اور فرائض منصبی کی انجام دہی میں مداخلت نہ ہو۔ چنانچہ آپ اس سلسلہ میں فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"لوگ اس بارہ میں صرف ایک پہلو کو دیکھتے ہیں۔ یعنی صاحبِ غرض کا کام کسی طرح نکل جائے۔ اور اس رُخ پر غور ہی نہیں کرتے کہ جس حاکم یا صاحبِ اختیار کے پاس

سفارش کی جا رہی ہے۔ اس کی طبیعت پر کیا بار پڑے گا۔ کسی کا کام نکال دینا ایک امر مستحب ہے لیکن مسلمان کو اذیت قلب سے بچانا تو درجہ واجب میں ہے۔ استحباب کے لئے یہ ترک واجب کیسے جائز ہوگا۔"

نظر کی اس گہرائی کے ساتھ احتیاط کے انتہائی مقام کا اندازہ ان کے حسب ذیل سفارش نامہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

از اشرف علی عفی عنہ

بخدمت مکرمی جناب ڈپٹی صاحب دام لطفہم

السلام علیکم۔ ایک صاحب میرے ملنے والے ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں۔ ان کے ایک عزیز کا مقدمہ آپ کے اجلاس میں ہے۔ مجھ کو واقعہ معلوم نہیں۔ دوسرے پرچہ پر مجمل یادداشت ۔ ۔ ۔ ۔ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ میری عادت اپنے عنایت فرماؤں کو مجبور کرنے کی نہیں لیکن جائز رعایت سے مسلمان کو نفع پہنچانا مستحسن ہے۔ یہ دونوں پرچے چاک فرما دیجئے والسلام

از تھانہ بھون

حقوق العباد کا خیال

آپ کو ہر وقت یہ خیال دامنگیر رہتا تھا۔ اس خیال نے اتنی اہمیت حاصل کر لی تھی کہ آپ نے اپنی وفات سے تقریباً سترہ برس پہلے ۳ر اپریل ۱۹۲۶ء کو ایک معذرت نامہ چھپوا کر تقسیم کرایا۔ جس پر لکھا تھا:۔

"یہ احقر انقر ارذل کام کا اکثف۔ نام کا اشرف۔ تمام ان حضرات کی خدمت میں جن کا کوئی حق میرے ذمہ ہو۔ خواہ وہ حق مالی ہو (جس کا احتمال ضعیف و قلیل ہے) اور خواہ وہ حق غیر مالی ہو۔ جیسے کسی کو ناحق کچھ کہہ لیا ہو۔ یا انتقام میں حد مساوات سے متجاوز ہو گیا ہو۔ یا کسی کو ناحق بدنی ایذا پہنچائی ہو۔ (اور ایسے غیر مالی حقوق کا احتمال قوی اور کثیر ہے) ان سب اہل حقوق کی خدمت میں دست بستہ۔ نہایت لجاجت و سماجت سے درخواست کرتا ہے کہ ان حقوق کا خواہ مجھ سے عوض لے لیں۔ (بشرطیکہ مدعی کا صدق میرے دل کو لگ جائے) اور خواہ حسبۃً للہ معاف فرما دیں۔ میں ان دو حالتوں میں ان کا شکر گزار رہوں گا۔ کہ مجھ کو محاسبہ آخرت سے بری فرمایا۔ اور معافی کی صورت میں دعا بھی کرتا رہوں گا کہ میرے ساتھ مزید احسان فرمایا۔ خدا کے واسطے اہل حقوق میری حیات تک خواہ اپنے گزشتہ اور آئندہ حقوق معاف

فرمادیں۔ خواہ شرعی طریق اور شرائط پر اس کا عوض بالمثل لے لیں اور حیات کے بعد معاف ہی فرمادیں"۔

اور جن کے ذمہ آپ کے حقوق تھے ان کو یوں بشارت دی۔

"امیدِ عفوِ خداوندی میں اپنے حقوق غیر مالیہ جو کسی کے ذمہ ہوں۔ بلا استثناء سب کو معاف کرتا ہوں۔ اور حقوق مالیہ میں غیر مستطیع کو اجازت دیتا ہوں کہ مجھ سے خاص طور پر گفتگو کرے۔ انشاء اللہ کوئی سبیل سہل نکال دوں گا۔ خواہ معافی خواہ تخفیف خواہ مہلت یا کچھ اور۔

پھر کو اس دعا پر ختم کیا کہ

اب آخر میں ناظرین سے اس دعا کی درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالے قبل مغفرت تمام حقوق و مظالم سے اداءً یا ابراءً سبکدوش فرمائے اور ایمان پر خاتمہ فرما دے اور اور آخرت میں ہر قسم کے مواخذہ سے محفوظ فرما دے ویرحم اللہ عبداً قال امینا۔

اس پر یہ تاکید بھی درج تھی:۔

خود بھی ملاحظہ فرمائیے اور جہاں تک ممکن ہو دوسروں کو بھی دکھا کر ثواب لیجئے۔ میری حیات میں بھی اور بعد حیات بھی۔ (العذر و النذر)

گرانی سے گریز آپ طبعًا اس بات کے عادی تھے کہ آپ کی وجہ سے کسی پر گرانی نہ ہو۔ نہ خیالی نہ دفعی۔ نہ قولی نہ فعلی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک صاحب سینکڑوں میل چل کر تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ میں محض اصلاح و تربیت کے لئے جاتے ہیں اور فرصت کے ایسے اوقات کے متلاشی رہتے ہیں۔ جب آپ کی خدمت میں حاضری کا موقع مل سکے۔ آپ ان کو بلانے کے لئے خادم کی زبانی پیغام بھیجتے ہیں:۔

"میں اس وقت خالی ہوں۔ اگر آپ کو بھی فرصت ہو۔ اور جی چاہے۔ تو آجایئے"۔

اور کبھی اس مضمون کا رقعہ بھیجتے ہیں کہ:۔

مکرمی۔ السلام علیکم۔ میں اس وقت فارغ ہوں۔ اگر جی چاہے۔ تشریف لایئے لیکن اگر اس وقت کوئی شغل ایسا ہو جس کا انقطاع تشویش کا سبب ہو تو تکلیف نہ کیجئے۔ دوسرا وقت مل جائیگا۔ اشرف علی

اس معمول کی نسبت آپ اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

احقر کا طرز طبعی یہ ہے کہ جس امر میں شبہ بھی ہو کہ دوسرے پر گرانی ہوگی۔ گو وہ خدمت اور تعظیم ہی کیوں نہ ہو۔ اس امر کو اختیار نہیں کرتا۔ کوئی امر جو کسی کی آزادی میں مخل ہو نہیں کیا۔" (حکیم الامت صفحہ ۸۳)

کبھی یوں فرماتے تھے کہ:۔

خود بھی بار بار بطور تحدث بالنعمت کے کہا کرتا ہوں کہ یہاں کسی پر کوئی گرانی نہیں ڈالی جاتی نہ خیالی۔ نہ واقعی۔" (حکیم الامت صفحہ ۱۰۱)

رجوع کا اہتمام حضرت تھانوی ہر معاملہ میں وسیع الظرف تھے۔ عفو و درگذر میں بھی اور غلطی کے اعتراف میں بھی۔ غلطی کا اعتراف آپ محض دفع الوقتی کے لئے نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس کا آپ کے ہاں باقاعدہ انتظام تھا۔ ۱۳۲۹ھ سے ایک رسالہ "النور" خانقاہ امدادیہ اشرفیہ سے زیر ادارت مولانا شبیر علی صاحب ہر قمری مہینہ کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اس میں حضرت تھانوی کے ہر قسم کے جدید مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ اس رسالہ میں ایک مستقل عنوان "ترجیح الراجح" بھی تھا۔ حضرت کو جب کبھی اپنی تحقیق سابق میں کچھ ترمیم کرنی ہوتی یا کسی قسم کی تصحیح کرنی ہوتی تو وہ اس عنوان کے تحت شائع کی جاتی اور وہ ترمیم، تنسیخ یا تصحیح بڑی ہی اصطلاحی قسم کی ہوتی۔ جیسے حضرت تھانوی نے بہشتی زیور میں کہیں نظر بد کا یہ علاج تحریر فرمایا ہوا تھا کہ اس کی شرمگاہ کو دھو کر مریض پر پانی چھڑکا جائے۔ ایسا ہی حضرت سے بہت قبل حضرت شاہ عبدالحق دہلوی بھی لکھ چکے تھے ــــــ ایسے محققین کی تحقیقات کی خامیاں نکالنے اور ان میں موشگافیاں پیدا کرنے والے بھی ہر دور میں موجود ہوتے ہیں چنانچہ ایک صاحب نے لکھا کہ اس علاج میں حدیث نبوی کے لفظ "داخلۃ الازار" سے آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ جس کے معنی شرمگاہ کے کئے گئے ہیں۔ تو اس کے جواب میں آپ نے فوراً لکھا کہ:۔

"میرے ذہن میں تو یہی تفسیر ہے۔ اگر کسی نے اس کے خلاف لکھا ہو تو میں رجوع کرلوں گا۔" (حکیم الامت صفحہ ۲۶۳)

چنانچہ اس نکتہ کی صحت کے لئے مولانا عبدالماجد صاحب نے جو اعتقاد کامل رکھنے کے باوجود حضرت کی علمی تحقیقاتوں پر برملا شبہات پیش کرتے رہتے تھے۔ فوراً "داخلۃ الازار" کی نسبت قاموس۔ صراح۔ اور لسان العرب وغیرہ سے حوالہ جات تلاش کر کے بھیج دیئے جس

پرآپ نے لکھا:۔

"میں نے بھی احتیاطاً مجمع البحار میں دمل وغسل کے مادہ میں دیکھا ہے۔ مختلف فیہ تغیر ہے۔ البتہ ترجیح غسل ثوب ہی کی تفسیر کو ہے۔ مجھ کو کبھی شبہ ہی نہ ہوا تھا۔ اب ترجیح الراجح میں لکھوا دیا ہے۔ اور وقت پر شائع ہو جائیگا۔ اور یہ ترجیح تو قواعد روایت سے ہے۔ لیکن قواعد درایت سے ترجیح معنی مجازی کو معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس تدبیر میں بقیہ مغسولات سب اعضا ہیں۔ دوسرے اگر کوئی صاحب ازالہ نہ ہو تو وہاں یہ تدبیر مکمل نہ ہوسکے گی۔" (حکیم الامت ص۲۶۹)

اس طرح ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد صاحب نے لکھا کہ:۔

"جناب والا کے ترجمہ قرآن میں جزاء المحسنین وغیرہ کے مواقع پر جزاء کا ترجمہ "پاداش" سے فرمایا گیا ہے۔ آج کل بیان القرآن کی نظرثانی جاری ہے۔ بہ ادب گذارش ہے کہ اس لفظ پر بھی نظرثانی فرمائی جائے۔ پاداش فارسی میں تو بیشک مطلق جزاء کے معنی میں ہے۔ لیکن اردو میں اس کا استعمال میری فہم ناقص میں عموماً ذم ہی پر آتا ہے، اگر خیال والا میں بھی یہ تحقیق طلب ہو۔ تو کسی صاحب زبان سے مشورہ فرما لیا جائے (حکیم الامت ص۳۲۱)

حضرت نے بلا قیل وقال اس کے جواب میں لکھا:۔

"میں کس کو ڈھونڈھتا پھروں گا۔ میرے جی کو یہ مشورہ لگ گیا۔ لفظ صلہ بدل دیا گیا اور یہ معلوم نہیں کہ آیا ہر جگہ یہی ہوا ہے۔ یا صرف اسی آیت میں اگر دو چار مواقع ذہن میں ہوں تو اطلاع فرمانے سے تلاش سے بچ جاؤنگا۔" (حکیم الامت ص۳۲۲)

مناظرہ سے نفرت طالب علمی کے زمانہ میں تو حضرت تھانوی مناظروں کے بڑے شوقین تھے۔ اور ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ مگر مسند ارشاد پر بیٹھنے کے بعد آپ کی طبیعت مناظروں اور مباحثوں سے نفرت کرنے لگی۔ فرماتے تھے کہ:۔

"مجھے جتنا اس زمانہ میں مناظروں کا شوق تھا۔ اب بوجہ مضرتوں کے اتنی ہی اس سے نفرت ہے۔"

کیونکہ تجربہ سے ثابت ہو چکا تھا کہ عام طور پر مناظرے نیک نیتی سے نہیں کئے جاتے۔ ان کا مقصد خواہی نخواہی دوسرے فریق کو نیچا دکھانا ہوتا ہے۔ اور اس کی تہہ میں اغراض فاسدہ ہوتی ہیں۔

جن کی وجہ سے بجائے نفع کے ضرر واقع ہوتا ہے۔ کج بحثی۔ ہٹ دھرمی کی عادت پڑ جاتی ہے اور حقیقت شناسی کی استعداد جاتی رہتی ہے۔

چندے سے احتراز "درس و تدریس" کے باب میں "غیرتِ دینی کے تقاضا" کے تحت آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت تھانوی نے بحیثیت مدرس مدرسہ کے لئے چندہ مانگنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ آپ اسے غیرت دینی کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور تحریکِ خاص سے دباؤ ناجائز کی صورت پیدا ہوتی تھی۔ اسلئے آپ نے ملازمت سے استعفار دے دیا مگر چندہ مانگنا گوارا نہ کیا۔

حضرت تھانوی کا موقف یہ تھا کہ:۔

"میں چندہ کی تحریک کا مخالف نہیں ہوں۔ مگر طریق کا مخالف ہوں۔ میرے نزدیک طریق یہ ہے کہ اس کی تحریک رؤسا کریں۔ مولوی نہ کریں۔ کیونکہ رؤسا خود بھی دیتے ہیں اور ان کی تحریک سے کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اور مولوی چونکہ خود نہیں دیتے اسلئے شبہ ہوتا ہے کہ اپنے کھانے کے واسطے کر رہے ہیں"۔ (کلمۃ الحق ص ۳۲)

چنانچہ اگر کسی مقصد کے لئے آپ خود چندہ دیتے تھے۔ تو اس کے لئے دوسروں سے مانگنے میں بھی گریز نہ کرتے تھے۔ آپ کے قیام کانپور میں جب وہاں قحط پڑا۔ تو آپ نے اپنے ہمسایوں کو اس بلائے ناگہانی سے بچانے کے لئے کئی بار چندہ کیا۔ جیسا کہ آپ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے:۔

"میں خود بھی وہاں (کانپور) کے غرباء کی خاص خاص مواقع پر امداد کرتا رہتا تھا۔ ایک بار قحط پڑا تو حقوق جوار کی بنا پر میں نے کئی بار چندہ کر کے غرباء کو اناج اور کپڑا تقسیم کیا"۔

مشورہ میں احتیاط مشورہ دینے کے معاملہ میں آپ بڑے محتاط تھے۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا۔ کہ آج کل مشورہ دینے میں بڑی خرابی یہ ہے کہ معتقدین بوجہ غلو فی الاعتقاد کے مشورہ کے متعلق یہ غلط عقیدہ رکھتے ہیں کہ شیخ کے قلب میں مضر یا غلط بات آ ہی نہیں سکتی۔ اور اس میں یقینی خیر سمجھتے ہیں۔ اور اس کے خلاف کرنے میں یقینی ضرر سمجھتے ہیں اس احتیاط کی دوسری وجہ یہ فرماتے تھے کہ:۔

"لوگوں کو مشورہ کی حقیقت معلوم نہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اگر دو شقوں میں تردد ہوا اور ہر شق میں مصالح و مفاسد جمع ہوں۔ اور خود کسی شق کو ترجیح نہ دے سکے۔ تو دونوں شقوں کو اور ان کے منافع و مضار کو اور تردد کی وجہ کو پیش کر کے مشورہ طلب

کرلے۔ اب لوگ نہ دو فریق تحریر کرتے ہیں اور نہ شقوں کے منافع و مضار تحریر کرتے ہیں۔ میں خالی الذہن ہوتا ہوں۔ تو کیسے مشورہ دوں۔ فی الواقع اس میں عقیدہ کا فساد ہے یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ شخص جو کہہ دیگا۔ وہی خیر ہوگا۔ تو ان کی نیت مشورہ کی ہوتی ہی نہیں"۔ (کلمۃ الحق ص ۱۵)

دنیوی امور کے متعلق مشورہ دینے میں آپ عموماً عذر فرما دیتے تھے۔ کیونکہ حضرت کو نہ ایسے امور سے دلچسپی تھی۔ نہ ایسے امور کا تجربہ ہوتا تھا۔ اگر کسی خصوصی موقع پر مشورہ دیتے بھی۔ تو اکثر اس عنوان سے کہ "اگر آپ کی جگہ میں ہوتا۔ تو یہ کرتا"۔

معاملات

تربیت گاہ آج کل عام طور پر یہ سمجھ دیا گیا ہے کہ اسلام صرف نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کی تعلیم اور حشر و نشر جنت و دوزخ وغیرہ کے متعلق خبریں دیتا ہے۔ اس کا معاملات و معاشرت سے کوئی تعلق ہی نہیں اس لئے جو چاہو کرو۔ جس طرح چاہو رہو۔ ہر طرح کی آزادی ہے۔ اگر بعض کو بعض معاملات میں بعض اصولوں کی پابندی کا خیال بھی آتا ہے۔ تو وہ غیر قوموں کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اور اتنا معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس معاملہ میں اسلام کیا تعلیم دیتا ہے۔ اور نہ ہی ہمارے ہاں سرکاری یا غیر سرکاری۔ مذہبی یا غیر مذہبی اداروں میں کہیں بھی اسلامی اخلاق و آداب و معاملات معاشرت کی عملی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔ حالانکہ یہ نصوص صریحہ سے ثابت ہے کہ منجملہ اجزائے دین کے تصحیح معاملات بھی ہے۔ بلکہ بعض اعتبار سے یہ اہم جزو ہے۔ اور سب سے زیادہ کوتاہی اور بے التفاتی بھی اسی سلسلہ میں برتی جاتی ہے۔ اسی لئے حضرت کے ہاں اس کا زیادہ اہتمام تھا۔ جیسا کہ آپ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ:-

"مجھے علم پڑھانے لکھانے کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں ہے۔ جس قدر تہذیب اخلاق و دیانت پر نظر ہے۔ کیونکہ پڑھنے لکھنے کا تو ہر جگہ انتظام ہوتا ہے۔ لیکن اخلاق کی طرف کسی کو خیال نہیں۔ اس طرح میں اپنے متعلقین یعنی جو لوگ میرے ذریعہ سے داخل سلسلہ ہیں ان کے لئے اوراد و وظائف و اذکار و اشغال کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں کرتا۔ جتنا اخلاق کی درستی کا اہتمام کرتا ہوں۔ کیونکہ اخلاق کا سنوارنا زیادہ ضروری ہے۔ کوئی ذکر و شغل کرتا ہو تو مجھے

اس وقت تک اس کی قدر نہیں ہوتی۔ جب تک کہ اس کے اعمال درست نہ ہوں"۔
یوں تو ہندوستان میں بڑے بڑے جلیل القدر اولیاء کرام گزرے ہیں جو اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق اصلاحِ امت کے فریضہ میں مشغول رہے۔ مگر کسی نے "خانقاہ امدادیہ" جیسی کوئی ایسی تربیت گاہ قائم نہ کی۔ جس میں کتاب و سنت کے مطابق صرف معاملات و معاشرت کی عملی تعلیم و تربیت دی جاتی ہو۔

رازِ کامیابی اس تربیت گاہ کی کامیابی اور اس کے تربیت یافتگان کی مثالی زندگی کا راز صرف یہ تھا کہ اس کا ناظم الامور جن اصول و قواعد کی پابندی دوسروں سے کراتا تھا۔ ان کا خود بھی پابند تھا۔ عوام تو کیا خواص بھی چونکہ معاملات و معاشرت کی اسلامی تعلیمات سے ناآشنا تھے اس لئے ان پر حضرت تھانوی کی تربیتی پابندیاں بہت گراں گزرتی تھیں۔ اور وہ ان کی حقیقت و اہمیت معلوم کرنے کی بجائے ناحق حضرت کو بدنام کرنا شروع کر دیتے تھے۔ جیسا کہ حضرت کے اس بیان سے ظاہر ہے۔

"کوئی یہاں رہ کر واقعات کو بنظرِ غور و انصاف دیکھے۔ تو اس کو حقیقت منکشف ہو جائے معترضین کا زیادہ حصہ اہلِ سماع ہیں۔ اہلِ مشاہدہ نہیں۔ مشاہدہ میں تو ہر واقعہ کی ترتیب سامنے ہوتی ہے۔ جس سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اور میں فقط دوسروں کو ہی اصولِ صحیحہ کا پابند نہیں بناتا۔ بلکہ اپنے آپ کو بھی پابند کرتا ہوں اور یہ تکلف یا بہ تصنع نہیں بلکہ اللہ کا شکر ہے کہ اصولِ صحیحہ کی پابندی میرا مقتضائے طبعی ہو گیا ہے یہاں تک کہ اکثر اہلِ معاملہ کو میری رعایتِ اصول کا علم بھی نہیں ہوتا۔ لیکن میرے قلب کو تو تسلی ہوتی ہے کہ میں نے اصولِ صحیحہ کی رعایت کی کسی کو جتانا تھوڑا ہی مقصود ہے"۔

وجہِ حاضری یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانوی بیعت کے لئے تو کسی کا خانقاہ میں آنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اصلاح و تربیت کے لئے کم از کم ایک مرتبہ کی حاضری لازمی قرار دیتے تھے۔ تاکہ آنے والے پر آپ کے مزاج۔ مسلک۔ بے تکلفی۔ سادگی۔ صفائی۔ آزادی۔ رعایت مروت۔ شفقت۔ محبت۔ سخاوت۔ شجاعت۔ غشیت۔ عبدیت۔ استقامت وغیرہ کا حال روشن ہو جائے۔ اسی لئے آپ بعض تبرعی خصلتوں پر قصداً عمل فرماتے۔ جیسے کبھی کبھی نوافل کا بیٹھ کر پڑھ لینا۔ اکثر بچوں سے خوب ہنسنا بولنا اور مزاح فرمانا۔ غصہ کی باتوں پر خوب کھل کر غصہ فرمانا اور دور دراز سے نہایت عقیدت مندانہ حاضر ہونے والوں کو بھی خلافِ اصول امور پر بلا ادنیٰ پروائے زوالِ عقیدت"

نہایت آزادی سے روک ٹوک دینا۔ تاکہ آنے والے تمام حال وقال دیکھ لیں اور آپ کو ضرورت سے زیادہ عابد وزاہد نہ سمجھیں۔

اس سے دوسرا فائدہ یہ تھا کہ حضرت اپنی مجلس عام میں طالبین کے خاص خاص خطوط کے خاص خاص مضامین مع جوابات کے حاضرین مجلس کو بلا اظہار نام سناتے رہتے تھے۔ اور ان کی غلطیوں پر زبانی توضیح فرماتے رہتے تھے۔ جس سے حاضرین کو اپنی اصلاح کرانے کا صحیح طریق معلوم ہو جاتا تھا۔ اور اپنی اصلاح کے متعلق خط وکتابت کرنے اور اپنے امراض نفس کے پیش کرنے کا سلیقہ آجاتا تھا۔ اور دور سے حقائق پر روایات کا جو کہر سا پڑا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ قریب آکر دیکھنے سے وہ خود بخود ہٹ جاتا تھا۔

اعترافِ مخالفین حضرت کا چونکہ ہر قول اور ہر فعل مطابق کتاب وسنت ہوتا تھا۔ اسلئے اس اتباع کامل کی برکت سے دیکھنے والوں پر بھی گہرا اثر پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مخالفین کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ نہ صرف حضرت تھانوی بلکہ ان کے منتسبین بھی صحیح المعاملہ ہیں۔

ایک مرتبہ ایک غیر مقلد کسی کام کے سلسلہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ واپس جاکر انہوں نے اپنے مشاہدہ کی بنا پر اپنے ایک ملنے والے سے کہا کہ:-

"ہم لوگوں میں تو اتباع سنت کا فقط دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اتباع سنت تو ہم نے وہاں دیکھا ایک کتاب کی ضرورت ہوئی۔ تو خود اٹھ کر کتب خانہ سے لائے۔ کسی سے نہیں کہا کہ لے آؤ۔ اپنا کام خود کیا کہ دوسرے کو تکلیف نہ دی۔ سبحان اللہ! کیا اتباع سنت ہے اور کتنی تواضع ہے کہ بلا تکلف خود اٹھ کر لے آتے"۔

انہوں نے اس بات کا حضرت سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ انہیں اس معمولی سی بات پر بھی بڑا تعجب ہوا۔ میرے ہاں تو روز کا یہی معاملہ ہے۔ میں تو سب کی اتنی رعایت کرتا ہوں کہ ان کی نظر دقائقِ رعایت تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ جس کی تائید آپ کے حسب ذیل ارشادات وملفوظات سے ہوتی ہے۔

اہل خانہ سے معاملہ ۱۔ سہواً کبھی خلاف ہو گیا ہو۔ تو ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی گھر میں کھانا کھا کر یہ کہا ہو کہ برتن اٹھالو۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ برتن اٹھا لو۔ گو وہ محکوم ہیں۔ لیکن انکی حاکمیت کا جو ان کو گھر میں اپنے محکومین پر حاصل ہے۔ لحاظ رکھتا ہوں۔ کیونکہ محکومین کا بھی احترام چاہیئے۔ پھر چاہے وہ خود اٹھالیں یا کسی اور سے اٹھوالیں۔ میں نوکرانی سے بھی خود

کسی کام کے لئے نہیں کہتا۔ بلکہ میں تو گھر میں کہہ دیتا ہوں اور وہ نوکرانی سے کہتی ہیں۔ کیونکہ نوکرانی براہِ راست انہی کی محکوم ہے۔ اس میں بھی ان کی حاکمیت کو محفوظ رکھتا ہوں۔ نیز اجنبی عورت سے بلا ضرورت خطاب بھی ایک درجہ میں خلافِ حیا ہے۔

۲۔ گھر میں جو چیز اٹھاتا ہوں بعد فراغت اس کو وہیں جا کر رکھتا ہوں۔ جہاں وہ رکھی تھی۔ تاکہ جس نے رکھی ہے۔ وہ پریشان نہ ہو۔ اور اس کو ڈھونڈھنا نہ پڑے۔

۳۔ گھر میں رات کو سوتے وقت احتیاطاً لوٹا میں پانی بھر کر رکھ لیتی ہیں۔ اگر کبھی مجھے پانی کے استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ تو میں پھر لوٹا کو بھر کر اسی جگہ رکھ دیتا ہوں۔ تاکہ اگر ان کو ضرورت ہو۔ تو لوٹا بھرا ہوا ہی ملے۔ دوبارہ ان کو نہ بھرنا پڑے۔

اقربا سے معاملہ

۱۔ مولوی شبیر علی سے بڑھ کر میرا کس پر زور ہوگا۔ میری اولاد ہیں۔ بھتیجے ہیں اور بچپن سے ہی میرے پاس رہتے ہیں۔ لیکن میں ان کی بھی اتنی رعایت کرتا ہوں کہ جب کبھی مجھ کو ان سے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ تو ان کو اپنے پاس نہیں بلاتا کہ نہ معلوم کسی ضروری کام میں مشغول ہوں بلکہ میں خود ہی اُٹھ کر ان کے پاس جاتا ہوں۔ یہاں تک اگر وہ خود کسی کام سے میرے پاس آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور مجھے بھی ان سے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ تو میں اس وقت ان سے کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ جب وہ اپنی جگہ واپس پہنچ جاتے ہیں۔ تب اُن کے پاس جا کر جو بات کہنی ہوتی ہے۔ کہتا ہوں۔ تاکہ جب وہ میرے پاس کسی ضرورت سے آیا کریں۔ تو آزادی سے آیا کریں۔ اس کا خطرہ بھی نہ ہو کہ اگر میں وہاں جاؤنگا۔ تو میرے ذمہ کوئی نہ کوئی کام لگا دیا جائے گا۔

۲۔ میرے چھوٹے گھر میں کے والد پیرجی ظفر احمد صاحب ...... میرے ساتھ اپنے پیر کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ لیکن میرے قلب میں ان کی ویسی ہی عظمت ہے۔ جیسی خسر کی ہونی چاہئے اور جیسی اپنے بڑے خسر صاحب کی تھی۔ لیکن پیرجی صاحب کو اس کا علم بھی نہیں۔ نہ مجھ کو یہ اہتمام ہے کہ ان کو اس کا علم ہو۔ مجھے تو اپنی تسلی کرنی ہوتی ہے کہ میں ان کا حقِ عظمت ادا کر رہا ہوں۔ ان پر کوئی احسان تھوڑا ہی رکھنا ہے۔

۳۔ حسن العزیز جلد الملفوظ نمبر ۱۷۸ میں خواجہ عزیز الحسن صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

ایک بار احقر کے یہاں حضرت کی دعوت تھی۔ حضرت کے ایک عزیز نے ذکر سے پانی اس طرح مانگا کہ پانی لاؤ۔ حضرت نے فوراً تنبیہہ فرمائی کہ میزبان کے نوکر سے ایسے حاکمانہ لہجہ میں پانی نہیں مانگنا چاہیئے۔ بلکہ اخلاق کے ساتھ کہنا چاہیئے کہ تھوڑا پانی عنایت کیجئے۔

۴۔ایک بار حضرت کے مردانہ کمرہ میں چند مہمان حضرت کے ساتھ کھانا کھانے کو پہنچے۔ وہاں حضرت کے ایک عزیز اپنے بچہ کو لئے چارپائی پر لیٹے تھے۔ حضرت نے ترش رو ہو کر فرمایا کہ یہ کیا بدتہذیبی ہے کہ چند بھلے آدمی تو نیچے بیٹھے ہوں اور تم چارپائی پر لیٹے رہو (پھر فرمایا) کہ میں اپنے عزیزوں کو اپنے ساتھ خود بہت بے تکلف رکھتا ہوں کیونکہ ان کو میرے ساتھ بے تکلفی کے برتاؤ کرنے کا حق ہے لیکن مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں ہوتا کہ میرے مہمانوں کے ساتھ بے تہذیبی کا برتاؤ کیا جائے۔

۵۔ اشرف المعمولات کے ملفوظ نمبر ۲۸ میں درج ہے کہ حضرت نے فرمایا:۔

کہ بفضلہ تعالیٰ جیسا ہم سب بھائیوں میں اتفاق ہے۔ ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب علیحدہ علیحدہ ہیں کسی کا کوئی بار دوسرے پر نہیں۔ حتیٰ کہ میں نے تو اس کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ حتی الامکان بھائیوں سے کوئی چیز عاریتہً بھی نہیں لیتا۔ بلکہ اگر وہ چیز کرایہ کی ہوئی۔ تو کرایہ پر لیتا ہوں۔ چنانچہ جب تک ریل نہ تھی۔ اس وقت جب کبھی گاڑی کی ضرورت ہوتی۔ تو اپنے بھائی کی گاڑی بھی کرایہ پر لیتا تھا۔ اس کا نفع یہ تھا کہ اگر کبھی ان کو خود ضرورت ہوتی۔ تو وہ صاف کہہ دیتے تھے کہ اس وقت گاڑی خالی نہیں ہے۔ کیونکہ جانتے تھے کہ اس سے بھائی کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ کیونکہ کرایہ ہر حال میں دینا ہوگا۔ اگر میں عاریتہً لیتا۔ تو ہرگز وہ اس صفائی سے نہ کہہ سکتے اور اس سے طبیعت پر گرانی ہوتی۔

اسی طرح میں اپنے بھائی کے نوکروں سے بھی کوئی کام نہیں لیتا کہ ممکن ہے کبھی تنگ دلی پیدا ہو۔ نیز جلانے کی لکڑی کہ جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایک بار ان کے یہاں بہت بچ گئیں میں نے وہ بھی بہ قیمت لیں۔ کیونکہ اس سے مفت خوری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ آج لکڑیاں آئیں۔ کل پیاز آئے گی۔ پرسوں ترکاری آئے گی۔" وقس علیٰ ہذا

اہل خصوصیت سے معاملہ مزید فرمایا کہ اگر اہل خصوصیت کو بھی اپنے کسی کام کے لئے کچھ لکھتا ہوں تو جوابی خط بھیجتا ہوں۔

مہمانوں سے معاملہ کوئی کیسا ہی محبوب مہمان ہو اور اس کے ٹھہرانے کو کتنا ہی جی چاہتا ہو کبھی میں اس کی مرضی کے خلاف اصرار نہیں کرتا۔ اور جب جانے کو کہتا ہے۔ تو نہایت فراخ دلی سے کہہ دیتا ہوں کہ جیسی مرضی ہو اور جس میں راحت ہو۔

میں کھلانے پر بھی اصرار نہیں کرتا اور اسے بہت برا سمجھتا ہوں۔ کیونکہ کسی کو بے بھوک کھلانا زہر دینا ہے۔ لوگوں میں یہ عام مرض ہے کہ اصرار کر کے کھلایا کرتے ہیں۔

طالبین سے معاملہ بفضلہ تعالیٰ بمصلحت طالب یہ خاص رعایت صرف میرے ہی یہاں ہے کہ جس کے ساتھ مناسبت پیدا ہونے کی مجھ کو توقع نہیں رہتی۔ میں اس سے صاف کہہ دیتا ہوں کہ کسی دوسرے سے رجوع کرو۔ اور یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ اگر کسی مصلح کا پتہ مجھ سے پوچھا جائیگا تو میں بتلا دونگا۔ اور اگر اس پر وہ نام پوچھتا ہے۔ تو میں وہ بھی بتا دیتا ہوں۔ اس عین قطع تعلق کے وقت بھی اس کی اتنی رعایت کرتا ہوں کہ سارا بوجھ اس پر نہیں ڈالتا۔ اور میں جو عدم مناسبت کی صورت میں قطع تعلق کر لیتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بغیر مناسبت کے شیخ سے نفع نہیں ہوتا۔

اسی طرح میں جو کسی طالب سے قطع تعلق کرتا ہوں تو اس کے نقص کی وجہ سے نہیں بلکہ باہم مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے۔ ورنہ درحقیقت میں تو اس کو اپنے سے ہزار درجہ افضل سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اپنی حالت تو جیسی ہے معلوم ہے۔ اس کے بارہ میں خبر نہیں ممکن ہے وہ عند اللہ مقبول ہو۔ اسی بنا پر میں ہر مسلمان کو اپنے سے افضل سمجھتا ہوں اور قطع تعلق اس کے نفع کی خاطر کرتا ہوں جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرما دینا مصرح ہے ھٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ جس کی بنا محض عدم مناسبت ہی تھی۔ نہ کہ کوئی معصیت۔

غرض عدم مناسبت کی صورت میں بھی طالب کو اپنے ہی ساتھ الجھائے رکھنا کہ اپنی جماعت میں کمی نہ ہونے پائے۔ اس کو میں خیانت سمجھتا ہوں۔ یہاں تک کہ بعضوں کو میں نے دیکھا کہ کسی بزرگ سے بھی ان کو مناسبت نہ ہوتی۔ اور نہ کسی سے مناسبت ہونے کی توقع رہی۔ تو ان کے لئے بھی میں نے ایک راہ نکال دی۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ اس میں کوئی طالب محروم نہیں رہ سکتا۔ ان کے لئے میں نے یہ طریقہ تجویز کیا کہ تم ضروری احکام کا علم حاصل کرتے رہو خواہ مطالعہ سے۔ خواہ اہل علم سے پوچھ پوچھ کر۔ اور سیدھا سادہ نماز روزہ کرتے رہو جو امراض نفس تم کو اپنے اندر محسوس ہوں۔ ان کا علاج جہاں تک ہو سکے اپنی سمجھ کے موافق خود کرتے رہو۔ اور جو موٹے موٹے گناہ ہیں ان سے بچتے رہو۔ اور تقیہ سے استغفار کرتے رہو اور دعا بھی کرتے رہو۔ کہ اے اللہ ان کا بھی مجھے احساس ہونے لگے۔ اور ان کے معالجات بھی میری سمجھ میں آنے لگیں۔ اور اگر مجھ میں سمجھنے کی استعداد نہ ہو۔ تو بلا اسباب ہی محض اپنے فضل سے ان عیوب کی اصلاح کر دیجیے۔ بس یہ بھی نجات کے لئے کافی ہے۔ اور نجات ہی مقصود ہے۔"

حضرت کا یہ طریق بھی عین سنت نبوی کے مطابق ہے کیونکہ ایک دفعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم سے ایک بدوی نے پوچھا کہ میرے لئے اسلام کا کیا حکم ہے۔ حضور نے اسے قریبًا ایسی ہی باتیں بتلائی تھیں۔

ممکن ہے بعض قارئین کے دل میں مناسبت وعدم مناسبت کا فرق معلوم کرنے کا شوق پیدا ہو۔ ان کے لئے حضرت تھانوی کا مندرجہ ذیل ارشاد راہنمائی کے لئے کافی ہوگا فرمایا کہ:۔

"بعض نے مجھ سے سوال کیا کہ شیخ کے ساتھ مناسبت ہونے نہ ہونے کی علامت کیا ہے تو میں نے ان سے کہا کہ گو یہ امر ذوقی ہے۔ لیکن میں الفاظ میں اس کی تعبیر کئے دیتا ہوں مناسبت کی علامت یہ ہے کہ شیخ کے کسی قول یا فعل پر شیخ کے خلاف طالب کے قلب میں کوئی اعتراض باستثنا جزم یا تردد یعنی احتمال صحت جانبین کے ساتھ پیدا نہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر اس کے کسی قول یا فعل کی تاویل بھی سمجھ میں نہ آئے۔ تب بھی اس کی طرف سے دل میں انکار پیدا نہ ہو۔ بلکہ اپنے آپ کو یوں سمجھایا جائے۔ کہ آخر یہ بھی تو بشر ہے اگر اس کا کوئی قول یا فعل گناہ بھی ہو۔ تب بھی کیا ہوا۔ توبہ سے یا محض فضل سے اس کی معافی ہو سکتی ہے۔"

اسے حضرت کا کمال سمجھئے یا کرامت کہ امور وجدانیات یعنی تردد و خطرہ کے درمیان ایسا دقیق فرق بیان فرمایا۔ جو بڑے بڑے ارباب علم وفضل بھی نہیں بتلا سکتے۔

عامۃ المسلمین سے معاملہ

اس سلسلہ میں آپ کا ارشاد ہے کہ:۔

میں نے خانقاہ میں قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ نہ کسی سے دوستی بڑھاؤ۔ نہ دشمنی پیدا کرو۔ نہ زیادہ مجلس آرائی کرو۔ کیونکہ یہ مجلس آرائی فساد کی جڑ ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ دین میں انتظام نہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ترمذی شریف کے باب الشمائل میں مروی ہے کہ کان لہ عتاد فی کل شیئ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر امر میں ایک ضابطہ مقرر تھا۔ (اشرف المعمولات ۲۳ و ۲۴)

میری عادت ہے کہ اول تو حتی الوسع کسی کی چیز عاریت نہیں لیتا۔ اور اگر کبھی کسی مجبوری سے کوئی چیز لینی پڑی۔ تو فراغت کے بعد اس کو فورًا ہی پہنچا دیتا ہوں تا کہ قلب مطمئن ہو جائے۔ اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔

میری یہ بھی عادت ہے کہ اگر مستعار چیز کسی وجہ سے جلدی واپس نہ کر سکوں۔ تو اس کی بہت حفاظت کرتا ہوں۔ اور گھر میں سب چیزوں سے علیحدہ محفوظ جگہ میں اس کو رکھ دیتا ہوں اور گھر میں سب کو منع کر دیتا ہوں کہ اس کو استعمال نہ کریں۔ کیونکہ اس کا استعمال درست نہیں۔ فقہا نے لکھا ہے کہ

اگر کوئی شخص دوسرے کے پاس کھانا بھیجے۔ تو اس کے برتن میں کھانا کھانا جائز نہیں۔ کیونکہ اجازت نہیں ہے۔ البتہ اگر کھانا ایسا ہو۔ کہ برتن کے بدلنے سے متغیر ہو جائے۔ تو اس قرینے کی وجہ سے اجازت سمجھی جائے گی۔ مگر اب تو لوگ بدون تقاضا کے برتن واپس ہی نہیں کرتے۔ بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر چلے جاتے ہیں۔ یا چند روز کے بعد انکار ہی کر دیتے ہیں۔

ایک روز میں نے قصابوں کو بلایا اور پوچھا کہ ہمارے ہاں تم گوشت غریبوں کے بھاؤ سے کیوں نہیں دیتے؟ قصابوں نے کہا کہ آپ مولوی صاحب ہیں۔ میں نے کہا کہ بس میری مولویت کا نرخ چار پیسے ہوا۔ سچ سچ ایمان سے بتلاؤ کہ اگر میں باوجود مولوی ہونے کے اس قوم میں نہ ہوتا۔ بلکہ کسی غریب قوم میں ہوتا۔ جب بھی تم اس نرخ سے دیتے۔ قصابوں نے کہا حضور آپ کے سامنے مکر و فریب کہاں چلتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اُس وقت تو ہم اس بھاؤ نہ دیتے۔ میں نے کہا ایسا گوشت کھانا حرام ہے۔ ہم کو تو جولاہوں، تیلیوں کے بھاؤ سے دیا کرو۔ تو ہم لیں گے۔ ورنہ گوشت کھانا چھوڑ دیں گے۔ قصابوں نے بڑا اصرار کیا۔ میں ہرگز نہ مانا۔ اس روز سے ہمارے ہاں روزانہ سیر گوشت آتا ہے۔ یہ ظلماً ارزاں گوشت خریدنا ریاست نہیں ہے۔ اس ریاست کی حقیقت عنقریب معلوم ہو جائے گی۔

ہمراہی سے معاملہ | ساتھ چلنے والے کے لئے اچھا راستہ چھوڑ دیتا ہوں اور سڑک کے کنارے کنارے چلتا ہوں تاکہ دوسرے چلنے والے کو تکلیف نہ ہو۔

مریدوں سے معاملہ | فرمایا کہ حکیم محمد ہاشم صاحب مرحوم کو مجھ سے بہت ہی تعلق تھا۔ یہاں تک کہ آخر میں مجھ سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ لیکن جب کبھی مجھ کو اپنا کوئی حال کہنا ہوتا۔ تو گو بعض اوقات بوجہ ضعف تکلف بھی ہوتا۔ لیکن خود اُن کے گھر جا کر اپنا حال کہتا۔ وہ بہت شرمندہ ہوتے لیکن میں کہہ دیتا کہ اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ جو محتاج ہو اسی کو محتاج الیہ کے پاس آنا چاہیئے نہ کہ برعکس۔ البتہ جب گھڑیوں کی نبض دکھانی ہوتی۔ تو پھر بے تکلف ان کو بلا لیتا تھا۔ کیونکہ وہ موقع مجبوری کا ہوتا۔ وہاں اصول صحیحہ کا یہی مقتضا تھا۔

نوکروں سے معاملہ | فرمایا کہ نوکروں کو دو کام ایک ساتھ نہیں بتاتا۔ پہلے ایک بتاتا ہوں۔ جب اس سے فراغت ہو جاتی ہے۔ پھر دوسرا تاکہ ایک دم بار نہ پڑے اور یاد رکھنے کی زحمت نہ ہو۔ یاد رکھنے کی زحمت کو خود برداشت کرتا ہوں۔ ان پر بوجھ نہیں ڈالتا اگر کوئی کام الجھن کا ہوتا ہے۔ تو اس میں خود بھی شریک ہو جاتا ہوں تاکہ انہیں کچھ سہولت ہو جائے۔

اگر کوئی کام اتفاقاً ہی سے انجمن کا ہوتا ہے۔ تو اول اپنے ہاتھ سے اس کا اشکال رفع کر کے اور اس کو خود ترتیب دے کر مرتب صورت میں نوکروں کے سپرد کرتا ہوں تاکہ اس کا کرنا ان کو سہل ہو جائے اس طرح جس سے کوئی کام لیتا ہوں۔ مثلاً کوئی مضمون نقل کرانا ہوا۔ تو اس مضمون کو اس طرح واضح صورت میں حوالہ کرتا ہوں کہ ناقل کو کسی طرح کی الجھن نہ ہو۔ پارسلوں کے ذریعہ سے جو میں نے ہدایا بھیجنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ نوکروں کو پارسل لانے کی زحمت نہ ہو۔

ملازموں کو تنخواہ بھی توقیر سے دیتا ہوں پھینک کر نہیں دیتا۔ جیسا کہ متکبرین کا شعار ہے۔ بلکہ ان کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔

جب گھر کے لوگ نہیں ہوتے۔ اور صبح کو ملازم کے ساتھ گھر سے باہر جانا ضروری ہوتا ہے تو ملازم کے بیدار ہونے کے بعد قصداً کسی کام میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ تاکہ وہ باطمینان اپنی ضروریات سے فارغ ہو جائے اور میرا تہیہ اور انتظار دیکھ کر اس کو عجلت نہ ہو۔

غرضیکہ بہت سی جزئیات ہیں۔ کہاں تک بیان کی جائیں۔ کیا ان حالات میں یہ کہنا سو فیصدی صحیح نہیں کہ ع

تجھ سے جہاں میں لاکھ سہی۔ تو مگر کہاں

اس مختصر تفصیل سے بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی :-

"یہ تو بہر حال معلوم ہی ہو گیا ہوگا کہ حضرت اُس رنگ کے صوفی صافی بالکل ہی نہ تھے جس میں درویشی کے معنے یہ سمجھے جاتے ہیں کہ انسان خلق سے بالکل کنارہ کر کے تنہا کسی جنگل میں رہنا شروع کر دے اور انسان سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے" (حکیم الامت ص۱۹۷)

معمولات

پابندیٔ معمولات جیسا کہ آپ اوراق ماسبق میں ملاحظہ کر چکے ہیں کہ حضرت تھانوی کے ہاں ہر بات اور ہر کام کے لئے اصول و قواعد مقرر تھے۔ اسی طرح آپ کے معمولات بھی سنتِ نبوی کے مطابق باقاعدہ و باضابطہ تھے۔ اور آپ کی مرتب و منظم زندگی میں شاذ ہی کوئی ایسا موقع آیا ہو۔ کہ کسی معمول میں فرق آگیا ہو۔ ورنہ جس طرح روزانہ سورج اپنے وقت پر طلوع اور غروب ہوتا

ہے۔ وہاں بھی بالعموم یہی حالت تھی۔

معمولِ روزمرہ حضرت تھانوی نماز خود پڑھایا کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ بار بار امام بدلنے سے جماعت کے نظم میں فرق آجاتا ہے۔ اگر کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے مسجد آنے میں دیر ہوجاتی۔ تو اصرار کرکے دوسرے امام سے نماز پڑھوا دیتے اور خود وضو وغیرہ سے فارغ ہوکر بعد میں مقتدیوں میں شامل ہوجاتے۔ آپ نے یہ اصول مقرر فرما رکھا تھا کہ وسیع وقت میں زیادہ سے زیادہ تین، دو منٹ انتظار کیا جائے۔ اور غیر وسیع وقت میں اتنا بھی نہیں تاکہ مقتدیوں کا حرج یا ان کو تکلیف نہ ہو۔ اکثر عادت صبح کی نماز میں کسی قدر طویل قرأت کی تھی مثلاً سورۃ دہر اور منافقین۔ وقس علی ہذا۔

بعد نماز فجر سب سے پہلے خانقاہ میں مقیم طالبین و سالکین کا جو گروہ ذکر و شغل میں مشغول رہتا۔ ان کے کام کی طرف متوجہ ہوتے۔ یہ لوگ اپنے اپنے باطنی حالات لکھ لکھ کر سہ دری میں لگے ہوئے لیٹر بکس میں ڈال دیتے۔ بعد نماز فجر حضرت خود اپنے ہاتھ سے اسے کھولتے۔ ایک ایک پرچہ کو پڑھ کر ہر ایک کے مناسبِ حال اس پہ جواب اور ہدایتیں لکھ کر پرچوں کو مسجد کے منبر پہ رکھا دیتے تھے۔ مگر اس سلسلہ میں یہ تاکید تھی کہ ان کے پرچوں یا خطوں کو اوپر نیچے نہ رکھا جائے بلکہ الگ الگ رکھا جائے۔ تاکہ ہر شخص نظر ڈالتے ہی اپنا پرچہ بالفانہ پہچان کر اٹھا لے۔ اور اسے تلاش کی زحمت نہ ہو۔

اس سے فارغ ہوکر کلام مجید کی تلاوت فرماتے۔ اکثر چھوٹی حمائل ہاتھ میں لے کر سیر دہوا خوری کے لئے آبادی سے باہر نکل جاتے۔ چاشت سے لے کر قریب دوپہر تک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے مجلس خاص منعقد فرماتے۔ اس کا پہلے دستور نہ تھا۔ جب سے مولانا عبد الماجد دریابادی تھانہ بھون حاضر ہونے لگے۔ تب سے ان کی خاطر اس مجلس کا انعقاد شروع ہوا۔ جسے بعد میں مستقل کردیا گیا۔ اس میں عموماً اہل تخصیص ہی ہوتے۔ بڑا مجمع کبھی نہ ہوتا۔

انبٹے سہارن پور کی طرف سے گاڑی آتی۔ زیادہ ڈاک اسی سے آیا کرتی تھی۔ اسٹیشن چونکہ وہاں سے دوہی فرلانگ پر تھا۔ اس لئے گاڑی کی آواز سن کر کبھی گھڑی دیکھ کر چند منٹ بعد آپ اٹھنے کا قصد فرماتے۔ اور بڑے ہی بے تکلفانہ انداز میں حاضرین سے یہ کہہ کر اجازت چاہتے کہ:۔

"ذرا گھر ہو آؤں یا اجازت ہو تو ذرا گھر ہو آؤں"۔

اور ڈاک دیکھنے۔ کھانا کھانے اور تھوڑی دیر سستانے کے لئے زنانخانہ میں تشریف لے جاتے۔

جو وہاں سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔

دو سوا دو گھنٹے بعد جب ظہر کی اذان ہوتی۔ تو آپ واپس تشریف لاتے۔ نماز سے فارغ ہو کر سہ دری میں آ بیٹھتے۔ اسی وقت سے مجلس عام شروع ہو جاتی۔ جو عصر کی اذان تک رہتی۔ اور اذان ہوتے ہی برخاست ہو جاتی۔

نماز عصر سے فارغ ہو کر آپ واپس گھر تشریف لے جاتے۔ اگر کسی نے کوئی خاص بات کرنی ہوتی یا کسی کو بیعت کرنا ہوتا۔ تو اس کے لئے مغرب کے بعد بھی باہر تشریف لاتے۔

معمولِ عبادت حضرت کے ہاں عبادات کا اہتمام بھی بالکل معمول نبوی کے مطابق تھا۔ ان میں قطعاً کوئی غیر معمولی فرق نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت کی شہرت سننے والے بھی حضرت کے معمولاتِ عبادت جاننے کے بہت مشتاق تھے۔ اور بعض صرف اتباع کی غرض سے معلوم کرنا چاہتے تھے کہ چونکہ یہ بہت بڑے بزرگ ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں عبادات کا بھی خاص اہتمام ہوگا۔ چنانچہ ایک اہل علم کے ایسے ہی استفسار کے جواب میں حضرت نے فرمایا:-

"اول تو معمولات بزرگوں کے ہوتے ہیں۔ میں تو ایک طالب علم آدمی ہوں۔ بجز اوراق سیاہ کرنے کے میرے معمولات ہی کیا ہوتے۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی صاحب معمولات بھی ہو۔ تو اس کے معمولات کی تفتیش اس لئے بھی عبث ہے کہ اتباع امتی کے افعال کا نہیں ہوتا۔ صرف انبیاء علیہم السلام کے افعال کا ہوتا ہے۔ یا جس کے افعال کے اتباع کا سنت میں امر وارد ہوا ہو۔ جیسے حضرات خلفاء راشدین یا اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ غرضیکہ باستثناء مذکورہ غیر نبی کی تعلیماتِ قولیہ کا اتباع ہوتا ہے۔ نہ کہ اس کے معمولات فعلیہ کا۔ کیونکہ ممکن ہے۔ بلکہ غالب ہے کہ اس کے معمولات فعلیہ اس کی خصوصیات میں سے ہوں اور وہ اتباع کرنے والے کے مناسب حال نہ ہوں۔ مثلاً اگر ان کی مقدار زیادہ اور متبع کے تحمل سے باہر ہوئی۔ تو اس کو وہ مضر ہوں گے۔ اسی طرح اگر کسی صاحبِ معمولات کے معمولات اس کی خصوصیتِ حال سے کم ہوئے تب بھی ان کا اتباع دوسروں کو مضر ہوگا۔ جیسے کتابوں میں لکھا ہے کہ ابدال کی نماز بہت مختصر ہوتی ہے۔ گویا بالنقص۔ اور ان کے ظاہری اعمال نافلہ بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ تو جو اس درجہ کا نہ ہوگا۔ اس کے لئے یہ کمی معمولات مضر ہوگی۔

بہر حال کسی کے معمولاتِ فعلیہ کا اتباع نہیں چاہیئے۔ اور جب اتباع نہیں کرنا۔ تو پھر

پوچھنا بھی ایک فعلِ عبث ہے بلکہ اس تفتیش میں صاحبِ معمولات کے انقباض کا احتمال ہے۔ کیونکہ ممکن ہے وہ اپنی بعض عبادات کو اوروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہو۔ اس لئے تفتیش نہیں چاہیئے۔ اتفاق سے علم ہوجائے تو اور بات ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی بلا پوچھے ان پر عمل ہرگز نہ کرے۔ البتہ انبیاء کے اقوال و افعال سب متبوع ہیں تاوقتیکہ کوئی تخصیص کی دلیل قائم نہ ہو۔"

معمول اوقاتِ نماز حضرت کے ہاں اوقاتِ نماز کا بھی خوب انتظام تھا۔ بڑے اہتمام کے ساتھ دھوپ گھڑی کے حساب سے نقشہ تبدیلی اوقات بنا رکھا تھا۔ اور اور اس کو چھپوا بھی دیا تھا۔ ایک روز قبل نماز کی اوقات کی تبدیلی کا اعلان بذریعہ مؤذن کرا دیا جاتا تھا۔ اور مسجد میں بھی موجودہ اوقاتِ نماز کا نقشہ ہر وقت آویزاں رہتا تھا۔ گھڑی جلد جلد دھوپ گھڑی سے ملائی جاتی تھی۔ تاکہ زیادہ تفاوت نہ ہونے پائے۔

عیدین کی نمازوں کے وقت کا اعلان کچھ دن قبل آویزاں کرا دیا جاتا تھا۔ بالخصوص جمعہ پیشیں کے دن۔ تاکہ دیہات سے آنے والوں کو بھی وقت کا علم ہو جائے۔ عیدین کی نماز کا وقت قصبہ کی عیدگاہ کے وقت سے بہت مقدم ہوتا تھا تاکہ یہاں کی جماعت میں کم پہنچ سکیں۔ اور وہاں کی جماعت میں زیادہ۔ لیکن پھر بھی مجمع بہت زیادہ ہو جاتا تھا۔ چونکہ نماز عیدالاضحیٰ میں تعجیل مستحب ہے اور نماز عیدالفطر میں تاخیر۔ اسلئے ان دونوں نمازوں کے اوقات میں بھی فرق رکھا جاتا تھا یعنی عیدالاضحیٰ کی نماز طلوع آفتاب کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہوتی تھی۔ اور عیدالفطر کی دو گھنٹہ بعد۔

معمول ماہِ رمضان ماہِ رمضان میں عام طور پر عوام تو کیا خواص کے بھی معمولات بدل جاتے ہیں مگر حضرت کے ہاں قطعًا ایسا نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ عام تاثر کے ماتحت ایک مرتبہ غالبًا ۱۹۳۰ء میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اس سلسلہ میں حضرت کو لکھا کہ:-

"معلوم نہیں ماہِ مبارک (رمضان) میں حضرت کا نظامِ اوقات کیا رہتا ہے؟"

جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:-

"کچھ بھی نہیں۔ جو پہلے ہوتا ہے۔ وہی رہتا ہے۔ ایک آدھ سیپارہ کی تلاوت اکثر بڑھ جاتی ہے۔ لیکن مجلس عام اور ڈاک کا انتظام بالکل بحال رہتا ہے"۔ (ح۔ ا۔ ص۱۲۵)

"شنید" بعض اوقات ارباب "دید" کو بڑا پریشان کرتی ہے۔ مشہور و معروف مصنف اور عالم مولانا عبدالسلام

صاحب ندوی نے دسمبر ۱۹۳۳ء کو مولانا عبد الماجد کی خدمت میں ایک طویل استفسار بھیجا کہ:۔

"ماہ رمضان میں اہل قدرت کے دسترخوان تو گویا رنگین غذاؤں کا گلدستہ بن جاتے ہیں دعوتوں کا ہنگامہ گرم ہو جاتا ہے۔ روزہ کشائی کی رسم تو خالص شادی کی تقریب بن جاتی ہے۔ یہ حالت معمولی دنیاداروں کی نہیں۔ علماء و صوفیہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔" (حکیم الامت ص۳۶۶)

پھر ایک مرکز تصوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

"مغرب سے سحر کے وقت تک تمام لوگ جو اس مرکز سے روحانی فیض اٹھاتے ہیں۔ بیدار رہتے ہیں۔ اور زیادہ تر عمدہ غذاؤں کا لطف اٹھاتے ہیں۔ تراویح سے پہلے تراویح کے بیچ میں اور تراویح کے بعد تین بار چائے کا دور چلتا ہے۔ چونکہ آپ نے زیادہ تر علماء صوفیہ کا فیض اٹھایا ہے۔ اسلئے براہ کرم مجھکو اور ادارہ ناظرین "سچ" کو اس معاملہ میں اپنی معلومات سے فائدہ پہنچایئے۔ اور یہ بتایئے کہ اس کی سند کیا ہے اور یہ حالت مقاصد صوم کے منافی ہے یا نہیں۔" (حوالہ مذکور)

مولانا عبد الماجد ان دنوں "صدق" کی بجائے "سچ" نکالا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا ہندوستان کے سب سے بڑے روحانی مرکز یعنی خانقاہ امدادیہ سے بھی تعلق تھا۔ اس لئے انہوں نے اس "روحانی مرکز" کا اشارہ اس طرف ہی سمجھا اور وہ مضمون بجنسہ حضرت تھانوی کی خدمت میں ایک عریضہ کے ساتھ بھیج دیا۔ مضمون کا جواب تو حضرت نے بعنوان "کلمۃ القوم فی حکمۃ الصوم" میں لکھا۔ جو تحقیق مطالب و جامعیت بیان کے لحاظ سے اپنا نظیر آپ تھا۔ اور "سچ" میں شائع کر دیا گیا تھا۔ بلکہ "حکیم الامت" کے صفحات ۲۲۷ تا ۲۳۴ پر بھی درج ہے۔ لیکن ہمارے لئے حضرت کا وہی جواب کافی و شافی ہے۔ جو آپ نے مولانا عبد الماجد صاحب کے عریضہ کے جواب میں لکھا کہ ماہ رمضان کے متعلق جو کچھ مضمون نگار نے لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں:۔

"یہاں کوئی بات نہیں ہوتی۔ عام عادت یہ ہے کہ نماز سے پہلے معمولی طور پر فرداً فرداً کھانا کھا لیتے ہیں جس میں نہ اجتماع ہوتا ہے۔ نہ اہتمام ہوتا ہے۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر اپنے کام میں یا آرام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نہ چائے کا دور ہوتا ہے نہ اور کسی قسم کا اہتمام ہوتا ہے۔ اپنے طور پر کسی کو چائے کی عادت ہو۔ وہ انتظام کر لیتا ہوگا۔ جس کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔" (حکیم الامت ص۲۲۳)

معمولِ مجلس جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت روزانہ تین مرتبہ مجلس منعقد فرماتے تھے پہلی بعد نماز صبح طالبین کے لئے۔ دوسری بعد چاشت مخصوصین کے لئے۔ تیسری بعد نماز ظہر عامۃ المسلمین کے لئے۔ ان میں کیا کچھ ہوتا تھا۔ اس کی تفصیل مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہ لکھی ہے:-

"دوسری نشست چاشت کے وقت شروع ہوتی۔ اس میں عموماً اہل تخصیص ہی ہوتے باتیں ہر قسم کی ہوتی رہتیں۔ گفتگو کا بیشتر حصہ مولانا خود فرماتے۔ لیکن ہم لوگوں کو بھی بے تکلف بولتے جاتے۔ پوچھنے پاچھنے۔ سوال وجواب کرنے کی اجازت تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی سائل کے سوال پر یا خود ہی مولانا کسی فقہی۔ کلامی۔ تفسیری یا سلوکی مسئلہ پر کوئی مستقل ومسلسل تقریر ذرا لمبی فرما دیتے۔ جسے حاضرین بڑے انشراح قلب کے ساتھ سنتے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا۔ عموماً اور بیشتر یہ تھا کہ معمولی طرز پر دوستوں کے درمیان جیسے گفتگو ہوا کرتی ہے۔ ویسی رہتی۔ اور بغیر اس کے کہ سننے والوں کے دماغ پر کسی قسم کا بار پڑے۔ اور بغیر اس کے کہ وہ محسوس بھی کرنے پائیں کہ انہیں کوئی خاص تعلیم دی جا رہی ہے۔ خدا جانے کتنے مسائل۔ کتنی کام کی باتیں۔ باتوں باتوں میں اُن کے کان میں پڑ جاتیں۔ (حکیم الامت ص۸۵)

تیسری نشست عام بعد ظہر اس سہ دری میں ہوتی۔ اور مجمع اچھا خاصہ ہو جاتا۔ ڈاک کثرت سے ہوتی۔ روزانہ اوسط ۳۰-۴۰ خطوط کا تھا۔ یہ وقت جواب لکھنے کا ہوتا حضرت خطوط کے جوابات لکھتے جاتے (کبھی کوئی خط اہل تخصیص کو مع اپنے جواب کے سنا بھی دیتے) لوگوں سے گفتگو بھی کرتے جاتے۔ اور جو اہلِ حاجت تعویذ و نقوش کے طالب ہو کر آتے۔ ان کی حاجت روائی بھی کرتے جاتے۔ حاضر دماغی کی ایسی مثال بھی کمتر دیکھنے میں آئی۔ (۶-۱-ص۱۸۵)

عتاب کے منظر بھی اس مدت میں بار بار دیکھے۔ مولانا کے ہاں کوئی چیز راز کی یا پوشیدہ نہ تھی۔ یہ منظر اکثر وہی بعد دوپہر والی مجلس عام میں پیش آتے۔ مولانا بڑے ہی لطیف الحس اور ذکی الحس تھے۔ کسی بے ڈھنگی بے قاعدہ بات کی برداشت نہ تھی۔ لوگ آتے اور ذرا بھی بے قاعدہ باتیں کرتے۔ کہ مورد عتاب ہو جاتے۔ تکلف اور مصنوعی ادب وتعظیم تو گویا حضرت کی چڑ تھی۔ لوگ عموماً اسی کے عادی۔ خیر جس پر جو گذرنا ہوتی گذر جاتی

لیکن اتنا فائدہ بہرحال ہوتا۔ کہ خود اس کو بھی آئندہ کے لئے سبق مل جاتا اور دیکھنے والوں کو بھی ہدایت ہو جاتی۔ مجذوب کے اس مصرع میں کہ ع

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

شاعری نہیں۔ واقعہ بیانی ہے۔ مجلس میں سب سے زیادہ ڈھیٹ اور ہر لحاظ بھی نامہ سیاہ تھا۔ بارہا عین عتاب کے وقت، مجرم کی طرف سے کچھ عرض معروض کی جرأت کر گزرتا۔ حضرت کا کمال حلم تھا کہ تبسم کے ساتھ نرم لہجہ میں کچھ جواب ارشاد فرما دیتے۔" (ح۔۱۔ ص۹۲)

لطف یا کمال یہ تھا کہ علالت کے دوران میں بھی معمولاتِ مجلس میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا۔ آپ کو بغرضِ علاج چونکہ کئی مرتبہ لکھنؤ جانا پڑا۔ یہاں مولانا عبدالماجد صاحب بھی اکثر پہنچ جایا کرتے چنانچہ وہ علالت کے زمانہ کے معمولات مجلس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"انتظامات حضرت کی اس علالت کے زمانہ میں بھی قابلِ دید تھے۔ نشست کے اوقات مقرر۔ ہر آنے جانے والے کے لئے حصول اجازت کی ضرورت۔ چھوٹی بڑی ہر شے میں ایک قاعدہ اور انتظام"۔ (ح۔۱۔ ص۵۲۳)

"شدید ضعف و نقاہت ولاغری کے باوجود افادات عالیہ جاری ہیں۔ صبح سویرے کی نشستہ مختصر اور بعد ظہر کی طویل اور بڑی۔ دونوں مجلسوں میں گویا حکمت و عرفان کا دریا جاری رہتا ہے۔ اور حکیمانہ و عارفانہ مسائل و مضامین مسلسل بیان ہوتے رہتے ہیں۔ مصلح ملت و حکیم الامت کی کوئی بات اصلاحی شان سے خالی نہیں ہوتی یہاں تک کہ اپنے مرض کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ عیادت کرنے والوں کو جو جو جوابات مرحمت فرماتے ہیں۔ اپنے کو جس شان تسلیم و رضا کے ساتھ طبیب حاذق و مشفق کے سپرد کئے ہوئے ہیں۔ ان سب میں اصلاحی پہلو اور بہت سے سبق۔ ہر دیکھنے والے کو ہر وقت ملتے رہتے ہیں۔ اور لطائف و ظرائف کا سلسلہ طبیعت کے اس قدر بے کیف و مضمحل ہونے پر بھی منقطع نہیں۔" (ح۔۱۔ ۵۲۷)

معمول مکاتبت | مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:۔

"ڈاک لانے والی اصل گاڑی سہارنپور کی طرف سے دوپہر یا ذرا قبل تھانہ بھون ٹاؤن اسٹیشن پہنچتی اور کچھ دیر بعد ڈاک کی تھیلی اسٹیشن سے ڈاک خانہ پہنچ

جاتی۔ کچھ منٹ چھانٹنے میں لگتے اور اس کے بعد مولانا کی ڈاک ٹین کے جنگلے میں بہ حفاظت روانہ ہو جاتی۔ ڈاک کا اس قدر اہتمام تھا کہ حضرت کے تنخواہ دار ملازمین (یہ تعداد میں عموماً دو رہا کرتے) میں سے ایک صاحب ضرور وقت مقررہ پر ڈاک خانہ پہنچ جاتے۔ اور پوسٹ مین (ڈاکیہ) کے ذریعہ سے تقسیم کا انتظار کئے بغیر اُسے لے کر چستی و مستعدی کے ساتھ حاضر خدمت ہو جاتے۔ حضرت کبھی تو اس وقت تک سہ دری میں تشریف رکھتے ہوتے اور کبھی زنان خانہ تشریف لے جا چکے ہوتے۔ ڈاک آتے ہی جن تحریروں سے حضرت مانوس ہوتے خصوصاً پوسٹ کارڈ۔ ان کو اُسی وقت پڑھ ڈالتے۔ اور ڈاک کا جواب اُسی کے دو گھنٹے کے بعد بعد ظہر کی مجلس کیلئے اٹھ رہتا۔ خطوط کی تعداد روزانہ ۳۰۔۳۵ سے کیا کم ہوتی۔ بعض دن اور زیادہ۔ پھر خط بھی مختصر یا چند سطری نہیں۔ بڑے لمبے چوڑے اور فقہ۔ سلوک۔ کلام وغیرہ کے مسائل سے متعلق۔ اب حضرت ہیں اور خطوط کا پشتارہ۔ اردگرد حاضرین بزم حلقہ کئے ہوئے خواص بھی۔ عوام بھی۔ مسئلے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے چھڑے ہوئے۔ حضرت لوگوں سے مخاطب بھی ہیں۔ حاجت مندوں کو تعویذ بھی لکھ لکھ کر دیتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی خط کا جواب اُسی حاشیہ پر یا بین السطور تحریر کرتے جا رہے ہیں۔ جواب کی جامعیت سبحان اللہ۔ جوابات جس طرز کے ہوتے۔ اس کی مثالیں تو اوپر کے صفحات میں دو چار نہیں۔ بکثرت گذر چکیں۔ اللہ اللہ دماغ کتنا حاضر پایا تھا۔ عموماً یہ سارے جوابات اس طرح قلم برداشتہ لکھ دیئے جاتے اور اتنے جامع و محققانہ ہوتے کہ دوسروں سے شاید پورے غور و فکر کے بعد نہ بن پڑتے۔ خال خال خط ایسے بھی ہوتے۔ جن کو جوابات کے لئے مولانا دوسروں کے حوالے کر دیتے۔ یہ وہی خط تھے جن میں حوالوں کی ضرورت ہوتی۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ ابھی یہ انبار نپٹنے نہ پاتا کہ دوسری ڈاک سہ پہر کو دہلی کی طرف سے بھی آ جاتی اور دو چار خط اس میں بھی ہوتے۔ جواب کے لئے یہ التزام رہتا کہ حتی الامکان سب دوسرے ہی دن نکل جائیں۔ اور یہ منظر بھی ان آنکھوں نے دیکھا ہوا ہے کہ دن ختم ہو گیا اور حجم و ضخامت والی ڈاک ختم نہ ہو پاتی۔ اب مولانا اس سن و سال میں بعد نماز مغرب و اوراد مغرب۔ لالٹین سامنے رکھ اور قلم ہاتھ میں لے بیٹھ گئے ہیں۔ اور رات گئے تک کام کر کے ڈاک کو اپنے ہاتھ سے

ختم ہی کر کے اُٹھتے ہیں۔" (حکیم الامت ص۱۹۶-۷)

اس ڈاک کو جلد نپٹانے کی وجوہ حضرت کے ملفوظات کی رو سے یہ تھیں:۔

۱۔ فرمایا کہ حدیث میں جو اجابت الداعی آیا ہے۔ میں خطوں کے جواب دینے کو بھی اس کے عموم میں داخل سمجھ کر جواب دینے کو حتی المقدور ضروری سمجھتا ہوں۔ اور جلد دیتا ہوں۔ لوگوں کو اس کا بہت کم خیال ہے۔ (مقالات حکمت ملفوظ ۲۳)

۲۔ اسی لئے آپ روز کی ڈاک روزانہ نکالنے کے عادی تھے۔ کہ ڈاک کا کام باقی رہ جاتا تو نیند نہ آتی۔ فرماتے تھے کہ

"اگر میں سونا بھی چاہوں۔ تو سو نہیں سکتا۔ جب تک کہ ڈاک کو اتنا نہ نمٹا دوں کہ وہ قابو میں آجائے

چنانچہ سفر میں اکثر ایسا ہوتا کہ آدھی آدھی رات تک وعظ فرماتے اور اس سے فارغ ہو کر ڈاک لے کر بیٹھ جاتے۔ اور جب تک اسے ختم نہ کر لیتے ہرگز نہ سوتے۔ بعض اوقات تو سفر میں کئی کئی دن کی ڈاک جمع ہو کر اکٹھی ملتی تھی۔ تو عشاء کے بعد سے صبح کی اذان تک ڈاک لکھنے میں مشغول رہتے تھے۔ اور آپ کے پاس جواب لکھنے کے لئے کوئی محرر یا مختصر نویس نہیں ہوتا تھا۔ یہ سب کام خود فرماتے تھے۔ مولانا عبدالماجد لکھتے ہیں کہ:۔

"مولانا کا دستور یہ تھا کہ خط کا جواب عموماً فوراً ہی مرحمت فرماتے تھے۔ ہاں خط کا مضمون ہی الجھا ہوا ہو یا جواب کے لئے کتابوں کی الٹ پلٹ کی ضرورت ہو۔ تو اس کی بات دوسری تھی۔ مولانا کی ڈاک گڈی کی گڈی ہوا کرتی تھی۔ لیکن مولانا جواب ایک ایک کا اپنے ہی قلم سے لکھتے۔ آخر تک جب تک ضعف نے بالکل ہی معذور نہ کر دیا۔ یہی روش قائم رہی"۔

(ح۔ا۔م ص۶)

"خط کا جواب فوراً دینا مولانا کی اگر کرامت نہیں۔ تو نظم و ضبط کا اعلیٰ ثمرہ اور عزم و ہمت کا حیرت انگیز کرشمہ تو ضرور ہے"۔ (ح۔ا۔م ص۱۱۹)

آپ کو خط بھیجنے کا طریق یہ تھا کہ خط جب بھیجا جاتا۔ تو لفافہ کے اندر ایک جوابی لفافہ بھی پتہ لکھا ہوا ملفوف کرنا ہوتا۔ اور اصل خط پر جواب کے لئے ایک چوتھائی حصہ خالی چھوڑنا پڑتا۔ جس پر آپ جواب تحریر فرماتے۔ اور اُسی لفافہ میں جواب کے ساتھ اصل خط بھی واپس آجاتا۔ عموماً جواب اسی ہی خط پر تحریر فرما دیتے۔ اس سلسلہ میں ایک دفعہ فرمایا:۔

"میرے پاس ڈاک کثرت سے آتی ہے۔ لیکن جس قدر دقت پتہ لکھنے میں ہوتی ہے

جواب خط لکھنے میں نہیں ہوتی۔ کیونکہ بعضے تو خط کے شروع میں پتہ لکھ دیتے ہیں۔ بعضے درمیان میں لکھتے ہیں۔ بعضے آخر میں لکھتے ہیں۔ بعضے ایسا کرتے ہیں کہ لفافہ پر کچھ پتہ لکھتے ہیں اور خط کے اندر اس کے خلاف۔ بعض پتہ لکھنا ہی بھول جاتے ہیں بعض میری یادداشت پر بھروسہ کر کے کہ کسی پہلے خط کا لکھا ہوا یاد ہوگا۔ نہیں لکھتے بعض لکھتے ہیں مگر وہ پڑھا نہیں جاتا۔ مناسب یہ ہے کہ ایک لفافے پر اپنا پتہ لکھ کر خط کے اندر رکھ دیں۔ اگر خط میں لکھا جائے۔ تو نام اور پتہ شروع ہی میں لکھے۔ نام کا شروع میں لکھنا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ اہل یورپ کا بھی اسی پر عمل ہے۔ جنہیں آج معلم الاخلاق سمجھا جاتا ہے۔" (مقالات حکمت حصہ پنجم ملفوظ ۲۰۶)

فرمایا

"میں اپنے شاگردوں کو بھی اگر خط لکھتا ہوں۔ تو اپنے کام کے لئے جوابی خط بھیجتا ہوں۔ بعض لوگ کسی کو اگر اپنے ہی کام کے لئے خط لکھتے ہیں تو بھی ٹکٹ کا بار منسوب الیہ پر ڈالتے ہیں۔ جو خلاف عقل ہے کہ ایک تو وہ جواب دینے کی زحمت گوارا کرے۔ دوسرے ٹکٹ کا بار بھی برداشت کرے"۔

(مکالات حکمت حصہ ششم ملفوظ ۹۲)

طالب علمی کے زمانہ میں جب آپ ایک دفعہ ایک استفتار کا طویل جواب لکھ لائے تو آپ کے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا "معلوم ہوتا ہے تم کو فرصت بہت ہے۔ اور ہم تو اس وقت دیکھیں گے جب خطوں کا ڈھیر کا ڈھیر تمہارے سامنے رکھا ہوگا۔ اور پھر بھی تم اتنے لمبے جواب لکھو گے"۔ گویا اس وقت کے کام کی تربیت آپ کے صاحب فراست استاد نے اسی وقت شروع کرادی جس کی وجہ سے آپ جامع و مختصر جواب دینے کے عادی ہو گئے تھے۔ چنانچہ اتنے لمبے چوڑے خطوط کے جواب دینے کے سلسلہ میں آپ کا اپنا ارشاد ہے:۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ روزانہ کی ڈاک اسی دن پوری ہو جاتے۔ آج کا کام کل پر نہ رہے کیونکہ اگلے دن پھر دوسری ڈاک آجاتی ہے۔ اور یہ صورت تو مختصر ہی جوابات میں ہو سکتی ہے۔ لیکن الحمد للہ میرے جوابات باوجود اختصار کے کافی ہوتے ہیں کسی جزو سوال کا جواب رہ نہیں جاتا"۔ (ذم النسیان ص۲۶)

اس کی مزید وضاحت آپ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ:۔

"میں نے مختصر الفاظ سے طالب علمی کے وقت میں بہت علوم حل کئے ہیں۔ مجھے ابتداء سے اختصار محبوب ہے۔ کچھ طبیعت ہی اختصار پسند واقع ہوئی ہے جس کا سبب میری کاہلی بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مجھے طویل طویل کاموں کی ہمت نہیں پڑتی۔ خیر کچھ ہی سبب ہو۔ باقی یہ تجربہ بالکل صحیح ہے کہ بعض دفعہ مختصر الفاظ سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں۔ اور میں نے تو اس سے بہت ہی کام لیا ہے۔" (الاسعاد والابعاد صـ۲۳)

ڈاک کے معمولات کے سلسلہ میں جو ایک خاص بات حضرت کے ہاں مروج تھی اور جس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ تھی کہ:-

"مجھ کو یہ واقعہ بکثرت پیش آتا ہے کہ ڈاک میں اکثر خطوط ایسے آجاتے ہیں۔ جن کی ٹکٹوں پر مہر نہیں ہوتی۔ مگر میں سب سے پہلے ایسے ٹکٹوں کو چھڑا کر چاک کر ڈالتا ہوں اس کے بعد خط پڑھتا ہوں۔ گو میں خلوت میں ہوتا ہوں۔ اگر میں اس ٹکٹ کو دوبارہ استعمال کروں تو کسی کو پتہ بھی نہ چل سکے۔ مگر خدا تو دیکھتا ہے۔" (مواعظ التبلیغ صـ۲۳)

نیز حضرت کا یہ بھی معمول تھا کہ اگر کسی مقام سے متعدد خطوط مختلف اشخاص کے آتے۔ تو سب کا جواب ایک ہی ڈاک میں روانہ فرماتے تاکہ وہاں پہنچنے میں تقدیم و تاخیر نہ ہو۔ اور ایک دوسرے کو ناز کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ نہ کسی کی دل شکنی ہو۔

معمول ملاقات جس زمانہ میں حضرت سفر فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں حضرت کا یہ معمول تھا کہ جن جن تاریخوں میں جو جو صاحب اپنے آنے کی اطلاع کرتے۔ ان ملاقاتیوں کے نام اپنے پاس لکھ لیتے۔ تاکہ ان تاریخوں میں سفر نہ کیا جائے۔ اور آنے والے کو مایوسی نہ ہو۔ اس لئے بلا اطلاع آنے کی حضرت کی طرف سے عام ممانعت تھی۔

حضرت کو تعارف وغیرہ کی گفتگو کرنے میں تو واردین کی طرف سے بالعموم بہت اذیتیں پہنچتی تھیں جس سے جانبین کو کلفت ہوتی تھی۔ اور ضعف پیری کی وجہ سے تو آخر میں اس اذیت کا بالکل تحمل دشوار ہو گیا تھا۔ اور صحت پر بُرا اثر پڑنے لگا تھا۔ اسلئے اعزہ و خدام نے حضرت پر بواب یعنی دربان مقرر کرنے کا زور دیا تاکہ اس کے واسطہ سے گفتگو کی جائے۔ مگر حضرت نے بدیں وجہ شروع میں اس کی ممانعت فرمائی کہ اس سے شانِ مخدومیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں بعض مصالح کی بناء پر یہ تجویز منظور فرمائی اور اس کی تائید متعدد احادیث سے بھی نکل آئی۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں بھی بڑے بڑے صحابہ کو خاص وقت میں بدون توسط بواب کے رسائی نہ ہوتی (اس پر تحقیق اشرف السوانح

جلد سوم صلا و صلا پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے) چنانچہ باب منفرد کرنے کے بعد جو بھی نیا ملاقات کے لئے آتا۔ وہ پہلے باب کے ذریعہ اپنا ضروری تعارف کراتا۔ اور جب سب ابتدائی مراحل طے ہو جاتے اس وقت حاضر خدمت ہونے کی اجازت ملتی۔ جس سے جانبین کو بڑی سہولت اور راحت ہوتی۔

اگر حضرت کو اپنے عزیزوں کے ہاں ملاقات کی غرض سے جانا ہوتا۔ تو ان کے گھروں میں بھی اس وقت تشریف نہ لے جاتے (نہ از خود نہ بلانے سے) جب تک ان گھروں کا کوئی محرم مرد یا شوہر ساتھ نہ ہوتا۔

معمولِ استیذان حضرت کا اپنے گھروں میں جانے کا ہمیشہ یہ معمول رہا کہ پہلے کنڈی کھٹکھٹاتے پھر کسی کا نام لے کر پکارتے۔ اور جب تک اندر سے بلایا نہ جاتا۔ انتظار فرماتے رہتے۔ اگر کوئی بچہ بلا لیتا۔ تو اس کے بلانے کو کافی نہ سمجھتے۔ جب تک کوئی بڑا نہ بلاتا اندر تشریف نہ لے جاتے۔ چونکہ آپ کو کسی کی ادنیٰ تکلیف بھی گوارا نہیں تھی۔ اور ہر وقت راحت رسانی خلق کی فکر میں مستغرق رہتے تھے۔ اس لئے اگر مستورات پردہ کرنے میں عجلت کرتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ تو نہایت شفقت سے فرماتے کہ کچھ جلدی نہیں۔ اطمینان سے پردہ کر لیں۔ میں کھڑا ہوں۔

کسی کے گھر تشریف لے جاتے وقت اگر اندر پہلے سے بھی پردہ ہوتا۔ تب بھی احتیاطاً صاحب خانہ سے فرما دیتے کہ پھر دیکھ لیا جائے کہ پردہ ہے یا نہیں۔

غرضیکہ جب تک پورا اطمینان نہ ہو جاتا۔ تب تک مکان کے اندر تشریف نہ لے جاتے۔ پھر بھی احتیاطاً صاحبِ خانہ کو پہلے داخل ہونے کے لئے فرماتے۔ مبادا کسی نے ابھی تک پردہ نہ کیا ہو تو وہ مطلع کر دے۔

معمولِ بیعت حضرت تھانوی کا معمولِ بیعت مندرجہ ذیل ملفوظات سے ظاہر ہے:۔

۱۔ فرمایا کہ بزرگوں کے اخلاق بہت بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے انکے ہاں بہت نرمی برتی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کسی کی روک ٹوک نہیں کرتے۔ اس سے مسلمانوں کو ضرر ہوتا ہے۔ اسلئے ان کی اصلاح کے خیال سے میرے یہاں ایک گونہ سختی برتی جاتی ہے۔ پس جس کو جو نسا مذاق پسند ہوتا ہے۔ وہ وہاں چلا جاتا ہے۔ دوسروں کے ہاں نہ بیعت میں تنگی نہ مریدین کے افعال پر گرفت۔ اور نہ معمولات و قواعد معین ہوتے ہیں۔ مگر میرے ہاں ہر بات قاعدہ سے ہوتی ہے۔ جو بعض طبائع پر ناگوار گذرتی ہیں۔ (معمولات اشرفیہ صلا)

۲۔ جس وقت مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی

کو بیعت کرانے کے لئے حضرت تھانویؒ سے سفارش فرمائی۔ تو اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا:-

"اچھا تو آپ کے فرمانے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحب مجھ سے بیعت کرنا چاہتے ہیں
میں تو خیال کر رہا تھا کہ آپ ہی مناسب ہوں گے۔ باقی میرا معمول تو آپ کو معلوم ہی ہوگا
میں بہت سی مصلحتوں کی بناء پر عجلت اس باب میں پسند نہیں کرتا میں تو یہ چاہتا ہوں
کہ جو صاحب اس کے خواہشمند ہوں۔ ان کا اور میرا سابقہ کم از کم چھ ماہ کا رہ لے اور
جانبین ایک دوسرے کو خوب جانچ اور پرکھ لیں۔ قیام اگر طویل مدت تک نہ رہ سکے
تو کم از کم مراسلت ہی رہے۔ بغیر طویل سابقہ کے۔ ایک دوسرے کی مناسبت کا
علم نہیں ہو سکتا۔ اور اس طریق میں اہم اور مقدم شرط مناسبت ہی ہے۔ بغیر اس کے
محض بزرگی یا حسن اعتقاد بالکل ناکافی ہے۔ آپ میرا یہ پیغام ان حضرات کو پہنچا دیجیگا۔"

اصول کی پابندی ہو تو ایسی ہو۔ مرید ہونے والے کوئی بچے نہ تھے۔ ماشاءاللہ دونوں صاحب علم اور
فلسفی تھے۔ آپ کے علم و فضل۔ شیخیت و خشونت کا شہرہ سن کر ہی گئے تھے۔ اور سفارش
کے لئے خود ایک شیخ الحدیث اور شیخ طریقت کو لے گئے۔ جنہیں حضرت تھانویؒ بقول مولانا
عبدالماجد اس طرح ملے:-

"دعا مانگ کر جوں ہی حضرت اٹھے ہیں، نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر
پڑ گئی۔ ان کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے۔ اور بڑے التفات سے ملے
تعظیم و تکریم مولانا حسین احمد صاحب کی طرف سے تو خیر ہوتی ہی۔ عادت طبعی ہونے کی
بناء پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بناء پر بھی۔ لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا تھا۔ کہ ادھر سے
بھی آداب و رسم تعظیم و تکریم میں کوئی کمی نہ تھی۔" (حکیم الامت ص۱۶)

مگر جب بات معاملہ کی آئی۔ تو آپ نے مروت پر قاعدہ کو ترجیح دی۔ کیونکہ خود مرید ہونے والے کے
قول کے مطابق:-

"حضرت کے بدنام کرنے والوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ آپ بڑے خشک مزاج اور
تند خو تھے۔ اس جھوٹ میں صرف اتنا سچ ہے کہ مریدوں۔ طالبوں متوسلوں پر۔ ان
ہی کی اصلاح و فلاح کی خاطر آپ قاعدوں کے نفاذ میں۔ ضابطوں کی پابندی میں
یقیناً سخت تھے۔ لیکن خود ان قاعدوں اور ضابطوں کے بنانے میں ہرگز سخت نہ تھے بلکہ
وہ قاعدے ضابطے تو ہوتے ہی ہر فریق کی راحت و سہولت کیلئے تھے۔" (حکیم الامت ص۲۰)

۳۔ فرماتے تھے کہ میں ایسے شخص کو مرید نہیں کیا کرتا جس کا مجھے ادب کرنا پڑے۔ بلکہ ایسے کو مرید کرتا ہوں جس کو جو جی چاہے کہہ سکوں۔ (مقالات حکمت حصہ ہفتم۔ ملفوظ ع۸۷)

۴۔ فرمایا کہ لوگوں نے بیعت کو خراب کر دیا ہے۔ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ اس میں کچھ قیود رکھنی چاہیئیں۔ یہ نہیں کہ جو آئے۔ انکار ہی نہیں۔ میں نے اس غرض کے لئے ایک پرچہ ہدایات چھپوا رکھا ہے۔ (جس کا ذکر حصہ سوم میں اپنے مقام پر آئے گا) جو آتا ہے۔ اس کو یہ پرچہ دے دیتا ہوں اگر اس نے منظور کیا۔ تو بیعت سے انکار نہیں۔ ورنہ جہاں چاہے۔ جائے۔ یہ اچھا ہے کہ بجائے سو (مریدوں) کے دس ہوں۔ مگر ہوں کام کے۔ (مقالات حکمت حصہ سوم ملفوظ ع۶۳)

۵۔ فرمایا کہ جو شخص مجھ سے بیعت کی درخواست کرتا ہے تو میں اول اسے کتابیں دیکھنے کو لکھ دیتا ہوں بالخصوص مواعظ کے مطالعہ کے لئے اکثر لکھتا ہوں۔ اور اس سے بہت نفع ہوتا ہے۔ جب کوئی کتابیں دیکھ لینے کی اطلاع دیتا ہے۔ تو پھر اس سے دریافت کرتا ہوں کہ کتابیں دیکھنے کے بعد تم نے اپنی حالت میں کیا تغیر کیا؟ اس سے وہ نفع ہوتا ہے۔ جو برسوں کے مجاہدوں سے بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اصل چیز فکر ہے جب انسان فکر میں پڑتا ہے۔ تو اسے راستہ کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لئے میں اول ہی گفتگو یا خط و کتابت میں طالب کے سر پر بوجھ رکھ دیتا ہوں جس کی وجہ سے اسے فکر پیدا ہوتی ہے۔ اور اس فکر کی وجہ سے راستہ خود بخود منکشف ہونے لگتا ہے۔ مگر لوگوں کو اس کی قدر نہیں۔ (ملفوظ مزید المجید ع۱۰۴)

معمول ہدیہ

ہدیہ کے متعلق آپ کے معمولات کا حسب ذیل ملفوظات سے بخوبی پتہ چلتا ہے:۔

۱۔ فرماتے تھے کہ ہدیہ پیش کرنے والے اپنے مذاق کا اتباع کرتے ہیں۔ حالانکہ پیش نظر اس شخص کا مذاق رکھنا چاہیئے۔ جس کے سامنے ہدیہ پیش کیا جا رہا ہے اور بہتر تو یہ ہے کہ کسی طریقہ سے اس کا عندیہ پہلے سے معلوم کر لیا جائے۔ اور یہ معلوم کر دیا جائے کہ اسے ضرورت یا رغبت آج کل کس چیز کی زیادہ ہے یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہدیہ مقدار۔ تعداد یا قیمت میں بہت زائد نہ ہونا چاہیئے۔ ہمیشہ پیش کرنے والے کی حیثیت کے اندر ہی ہو۔ اگر بہت زائد یا بالکل بلا ضرورت ہوگا۔ تو قبول کرنے والے پر ایک بار ہو جاتا ہے۔ (حکیم الامت ص۲۹۵)

۲۔ میں نے اپنا یہ معمول مقرر کر لیا ہے۔ کہ جو نیا شخص آتا ہے۔ اس سے ہدیہ نہیں لیتا۔ البتہ اگر قرائن قویہ سے خلوص ثابت ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ رسم پرست لوگوں نے اس ہدیہ لے جانے کی یہ وجہ نکالی ہے کہ اگر پیر کے پاس خالی ہاتھ جاویگا۔ تو خالی ہاتھ آئیگا۔ (تجارت آخرت ص۲۳)

۲۔ فرمایا کہ جو اصحاب و احباب میرے لئے تحائف و ہدایا لاتے ہیں۔ مناسب ہے کہ لانے سے پہلے مجھ سے دریافت فرمالیا کریں۔ پوچھنے سے شرماتے نہیں۔ دوستوں سے شرمانا کیسا۔ میں انہیں منع نہیں کروں گا۔ مگر پوچھنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہدیہ کے حدود کی رعایت حاصل ہو سکے گی۔ ورنہ جب اس کو حدود سے خارج دیکھوں گا۔ عذر کردوں گا۔ اور قانون کے تحت مروت کو چھوڑنا پڑے گا۔ کیونکہ قانون اور مروت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ گو میرے قوانین وضوابط کو خلاف مروت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی قدر بعد میں معلوم ہوتی ہے۔ جب مفاسد پیش آتے ہیں۔

(ملفوظات ہفت اختر ع۱۲۲)

۳۔ میرا قاعدہ ہے کہ آس پاس کے گاؤں والوں کی جمعہ کی مہمانی موقوف ہے۔ نیز ایسے لوگ جو جمعہ کو ہدیہ لاتے ہیں۔ وہ بھی قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اکثر لوگ جمعہ کی نماز پڑھنے آتے تھے اور خواہ مخواہ مہمان بن کر ٹھہرتے تھے۔ جس سے دقت ہوتی تھی۔ اسلئے یہ قاعدہ رکھا گیا۔ کہ جس کو مجھے ملنا مقصود ہو۔ وہ جس وقت چاہے۔ آئے۔ سر آنکھوں پر۔ اس کے لئے کوئی قاعدہ نہیں ہوگی۔ اور جمعہ کو ہدیہ قبول کرنا اسلئے موقوف رکھا گیا کہ اس میں خود غرضی تھی۔ کہ مہمانی تو موقوف ہو اور ہدیہ قبول ہو۔ اسلئے مہمانی کے ساتھ اسے بھی موقوف کر دیا۔

پھر بعض لوگ آکر پہلے ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ پھر کوئی اپنا کام بتا دیتے ہیں۔ یہ بہت ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ جب کوئی کام لینا ہے۔ مثلاً وعظ یا تعویذ وغیرہ بے تکلف لو۔ اس کے ساتھ کچھ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کوئی خرید و فروخت کی دکان تھوڑا ہی کھول رکھی ہے۔ جب کوئی ہدیہ دے کر کام کرانا چاہتا ہے۔ تو میں کام تو کر دیتا ہوں۔ لیکن ہدیہ واپس کر دیتا ہوں۔ اگر کوئی محض محبت سے ہدیہ دے تو اس کے قبول کرنے میں مضائقہ نہیں کیونکہ اس کا قبول کرنا سنت ہے: مبادلہ کی صورت اچھی معلوم نہیں ہوتی۔

(مقالات حکمت حصہ ہفتم ملفوظ ع۶۵)

۴۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے بذریعہ ریلوے پارسل حضرت کی خدمت میں کوئی چیز بھیجی۔ پارسل وصول کرتے وقت بابو نے چار آنہ دستوری کے طلب کئے اور رسید دینے سے انکار کیا۔ اس پر ارشاد فرمایا کہ:۔

"اب ہم کوئی پارسل ہی نہ لیا کریں گے۔ سب واپس کر دیا کریں گے۔ یہ ہمارے پاس ہدیئے آتے ہیں۔ بیعنا نہیں آتے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے پاس سے اس قسم کے بیہودہ مصارف گوارا کریں۔ ہمارے پاس بلا مؤنت جو کچھ آئے گا۔ لے لیں گے۔ ورنہ واپس کر دیں گے

اسی لئے میں نے مولوی عبداللہ صاحب سے کہہ دیا ہے کہ جو پرچہ ہدایات لوگوں کی اطلاع کے لئے چھپنے والا ہے اس میں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ آئندہ کوئی صاحب ذیل کے ذریعہ ہمارے نام کوئی چیز روانہ نہ کریں۔ ہمیں دقت ہوتی ہے۔"

اس کے بعد فرمایا کہ

"لوگ سمجھتے ہیں کہ مولوی کھانے کمانے کے ہی لوگ ہیں۔ آئی ہوئی چیز کبھی واپس نہ کریں گے۔ ان کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ میرا بڑا مقصود یہ ہے کہ اہل علم کی ذلت نہ ہو۔ اسی لئے میں نے پارسلوں کی ممانعت کردی ہے۔"

چنانچہ اس روز کے بعد جو پارسل آئے۔ ان کی بلٹی واپس کردی اور جب لوگوں کو "پرچہ ہدایات" کے ذریعہ حضرت کے اس معمول کا علم ہوگیا۔ تو انہوں نے پارسل بھیجنے بند کردیئے۔ اس سے عیاں ہے کہ حضرت کے دل میں دنیا کی کچھ وقعت نہ تھی۔ ورنہ وہ اس طرح آئی ہوئی نعمت کو واپس نہ کرتے۔ اور یہی اللہ والوں کی پہچان ہے۔ دنیا خود چل کر ان کے پاس آتی ہے وہ دنیا کے پیچھے نہیں دوڑتے۔ اور انہی کے ہاں رہ کر ہی دین و دنیا کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اہل دنیا۔ دولت دنیا سمیٹنے کے لئے ہزاروں پاپڑ بیلتے ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے حتی الامکان بخل سے کام لیتے ہیں۔ مگر اہل اللہ کے ہاں جن پر حقیقت دنیا روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ دولت دنیا سے انتہائی بے رغبتی برتی جاتی ہے۔ جیسا کہ متذکرہ بالا ملفوظات سے ظاہر ہے۔ اور راہ خدا میں اتنی کشادہ دلی سے خرچ کرتے ہیں۔ جس کی مثال اہل دنیا میں ملنی ممکن نہیں۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل معمولات سے ظاہر ہے۔

معمول خیرات حضرت تھانوی کا ابتداہی سے یہ معمول تھا کہ علاوہ صدقات واجبہ کے اپنی آمدنی کا چوتھائی حصہ مصارف خیر میں بطور صدقات نافلہ صرف فرمادیتے تھے۔ جس کی اس زمانہ میں نظیر ملنی ناممکن ہے۔ اس ضمن میں آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:-

صدقات نافلہ کے لئے اپنی تنخواہ یا آمدنی کا کچھ حصہ مثلاً فی روپیہ ایک پیسہ یا دو پیسہ آنہ۔ دو آنہ۔ چار آنہ۔ جتنا بھی بے تکلف نکال سکیں۔ ایک معین مقدار مقرر کرکے نکالتے رہنا چاہیئے۔ تاکہ ضرورت کے موقع پر نفس کشاکشی نہ کرے۔ بلکہ ایسے موقع کا منتظر رہا کیسے۔ کیونکہ مصارف خیرات کے لئے اپنے پاس رقم جمع ہونے کی صورت میں کشاکشی نفس سے سبکدوش ہوکر طبیعت خود بخود مصارف خیر کی فکر اور تلاش میں رہے گی۔ اور اس

کے خرچ کرنے میں مسرت محسوس ہوگی۔ لیکن مقدار معین کرنے وقت زبان سے کچھ نہ کہے۔ ورنہ نذر ہو جائے گی۔ اور اس رقم کا مصارف خیر پر خرچ کرنا واجب ہو جائیگا۔ صرف دل ہی دل میں سوچ لے کہ میں محض اپنی سہولت کے لئے انتظاماً اپنی آمدنی کا فلاں حصہ مصارف خیر میں صرف کرنے کے لئے مقرر کرتا ہوں لیکن اپنے ذمہ واجب نہیں کرتا۔"

کسی کی مالی امداد کرتے وقت آپ اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ اس کو حرص یا مفت خوری کی عادت نہ پڑ جائے۔ جب وہ اپنی تمام تدابیر ختم کرنے کے بعد صاحب احتیاج رہتا۔ تب اس کی امداد فرماتے اور وہ بھی ایک ساتھ نہیں۔ تاکہ اسے بے فکری نہ ہو جائے۔ اور جو کچھ تھے اس کی دل سے قدر ہو۔ چنانچہ جن کی اعانت کرتے ان کو بھی یہ فرماتے کہ:۔

"بھائی یہاں توکل کا معاملہ ہے۔ میرے پاس کوئی خزانہ تو جمع ہے نہیں۔ اگر کوئی شخص مصارف خیر کے لئے کوئی رقم بھیج دیتا ہے۔ اور وہ میرے اصول کے مطابق ہوتی ہے تو مستحقین پر خرچ کر دیتا ہوں۔ اور تھوڑی تھوڑی سب مستحقین کی خدمت کرتا ہوں۔ اسلئے میری اعانت کے بھروسہ پر نہ رہو۔"

وقتاً فوقتاً جو حضرات مصارف خیر کے لئے رقوم بھیجتے وہ اسی صورت میں قبول فرماتے۔ جو اصول صحیحہ اور قواعد شرعیہ کے مطابق ہوتیں (جس کی تفصیل انشاء اللہ حصہ سوم میں آئے گی) ورنہ نہایت استغنا کے ساتھ قبول کرنے سے صاف انکار فرما دیتے۔ جب کوئی بڑی رقم مصارف خیر کے لئے آتی۔ تو اس کا حساب از خود رقم بھیجنے والے کے پاس روانہ فرما دیتے۔ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ فرمایا کہ:۔

"اس مدرسہ میں متفرق مدوں میں چندہ آتا ہے۔ میں نے سب کے لئے متفرق تھیلیاں تیار کر رکھی ہیں۔ اور سب کا حساب جداگانہ ہر وقت صاف اور پاکیزہ رکھتا ہوں اور آمدنی اور باقی کو لکھتا ہوں۔ خواہ چند پیسے ہی ہوں۔" (مقالات حکمت حصہ پنجم ملفوظ ۱۷۹)

لیکن اگر کوئی خود حساب طلب کرتا۔ تو اسے یہ لکھ کر رقم واپس بھیج دیتے۔ کہ جس کو ہم پر اطمینان نہیں۔ وہ ہم سے یہ خدمت ہی کیوں لے۔

رقوم موصولہ کے صرف کرنے میں آپ بہت تعب فرماتے۔ صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں کہ اس وقت۔

"کہیں مستحقین کی فہرستیں تیار ہو رہی ہوتیں۔ کہیں تخمینے لگائے جا رہے ہوتے۔ کہیں تعمیم کے لئے نظامِ عمل تجویز کیا جا رہا ہوتا۔ کہیں کارِ خیر کی تعیین کے متعلق تحقیق فرمائی جا رہی ہوتی۔ لیکن بلا اظہار نام معطی۔ تاکہ لوگ اس کو جا بجا کر تماشا نہ کریں۔ غرض کیا مجال کہ کوئی بے عنوانی یا بدانتظامی یا بے اصولی ہونے پائے۔ کیونکہ جو خدمت حضرت والا اپنے ذمہ لیتے تھے۔ اس کا پورا حق ادا فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت والا کے ہاتھوں بڑے بڑے کام اس سکون اور حسنِ انتظام سے انجام پاتے۔ کہ نہ کوئی ہلچل نظر آتی نہ ضروریات روزمرہ میں کوئی خلل واقع ہوتا۔ نہ کسی قسم کی کوئی گڑبڑ ہونے پاتی حضرت والا خود فرمایا کرتے تھے کہ جو علمی کام اور جگہ بڑے بڑے محکموں کے ذریعہ سے اور ہزاروں روپوں میں ہو سکتے۔ وہ یہاں بفضلہ تعالےٰ چند غربا کے ذریعہ سے اور تھوڑے سرمایہ سے ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔"

اختیاری رقوم سے حضرت نے علاوہ دیگر ضروری کارہائے خیر کے بعض مساکین و مستحقین کی ماہوار تنخواہ بھی مقرر فرما رکھی تھی۔ جو تیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

معمولِ کفایت حضرت نے جہاں اپنی آمدنی کا چوتھائی حصہ خیرات کے لئے مخصوص فرما رکھا تھا وہاں کفایت شعاری کا بھی خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بے قدری نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے تھے جس کا اندازہ اس واقعہ سے لگا لینا کافی ہوگا۔ کہ آپ کے ہاں جو بکثرت دستی یا بذریعہ ڈاک پارسل اور لفافے آتے تھے۔ آپ ان کی سُتلی۔ ڈورا۔ پن۔ چھوٹی کیلیں۔ ٹین کے ڈبے۔ بوتلیں۔ زنبیلیں وغیرہ سب محفوظ فرما لیتے تھے۔ جنہیں عام طور پر بیکار سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اور حسب ضرورت ان چیزوں کو پھر استعمال میں لایا کرتے تھے۔ اسی طرح پیکٹوں پر سے جو دبیز کاغذ اترتے۔ وہ تعویذ وغیرہ لکھنے کے لئے رکھ لئے جاتے یا پھر پیکٹوں کے لئے ہی استعمال کئے جاتے۔ اور عام لفافے الٹوا کر دوبارہ استعمال کے لئے رکھ لئے جاتے۔ جن میں سے مقیمین خانقاہ کو بھی اپنے حالات لکھنے کے لئے لینے کی اجازت تھی۔ بقیہ ردی کے کاغذ ایک بکس میں جمع ہوتے رہتے۔ اور وہ خواہشمند لوگوں کو دئے جاتے جو انہیں پانی میں گلا کر ٹوکنی وغیرہ بنا لیتے یا دیگر جائز مصرف میں لے آتے۔

جب سرکاری دفتروں میں کاغذوں اور لفافوں کی کفایت کا اول اول مسئلہ پیش ہوا تھا۔ تو حضرت کے بھائی منشی اکبر علی مرحوم نے جو اس وقت ایک کورٹ شدہ ریاست کے منیجر تھے۔ انگریز کلکٹر سے

جوان کا افسر تھا۔ حضرت کی اس لفافہ الٹنے کی ترکیب کے مطابق لفافے الٹ کر پیش کئے۔ تو اس نے اس ترکیب کی بڑی تعریف کی کہ ہمارے منیجر نے یہ بہت اچھی صورت کفایت شعاری کی ایجاد کی ہے اور اس کو سرکاری محکموں میں جاری کرنے کے احکام صادر کئے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ:-
ہمارے بعض مسلمان بھائی تو اس پر بخل کا اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ایک انگریز نے اس کی اتنی قدر کی۔ لیجئے اب تو سفید چمڑی والوں کی بھی جن کی آج کل ہر بات قابل تقلید سمجھی جاتی ہے۔ تصدیق ہو گئی کہ یہ بخل نہیں بلکہ حسن انتظام اور کفایت شعاری ہے"۔

معمول امانت حضرت ہر امانت کو جدا رکھتے تھے۔ کیونکہ مخلوط ہو جانے کی صورت میں شرعاً احکام بدل جاتے ہیں۔ پھر امانت امانت نہیں رہتی۔ بلکہ قرض ہو جاتی ہے۔
چنانچہ ایک دفعہ ایک پارسل تولنے کے لئے کچھ زیادہ روپوں کی ضرورت ہوئی۔ تو حضرت نے دو امانتوں میں سے کچھ روپے نکال کر مجذوب صاحب کے حوالے کئے۔ جن کی پہچان یہ رکھی کہ ایک امانت میں سے تو سب ملکہ کی تصویر والے روپے نکالے۔ اور دوسری امانت سے بادشاہ کی تصویر والے روپے نکالے۔
اسی طرح جب مختلف مدات کی رقوم بذریعہ منی آرڈر یا کسی دوسرے ذریعہ سے موصول ہوتیں۔ تو آپ ہر مد کی رقم کو اسی مد کی تھیلی میں رکھتے جاتے۔ اور ہر رقم کے متعلق ضروری یادداشت فی الفور لکھ لیتے۔
گویا بفضلہٖ تعالیٰ ہر معاملہ کے وقت اس کے شرعی احکام سب سے پہلے مستحضر ہو جاتے تھے اور ایسی ایسی دقیق جزئیات تک فوراً نظر پہنچ جاتی تھی۔ کہ جن کی طرف آجکل عموماً کسی کا التفات نہیں ہوتا۔ الا ما شاء اللہ۔

معمول جواب حضرت کا یہ بھی معمول تھا۔ کہ سوال کا جواب تشقیق سے نہیں دیتے تھے۔ بلکہ پہلے ضروری استفسارات کر کے کوئی شق متعین کرا لیتے تھے۔ پھر اس شق کا جواب دیتے تھے کیونکہ تشقیق کے ساتھ جواب دینے میں لوگ اس جواب کے منطبق کرنے میں غلطیاں کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ فاسد اغراض کے لئے اس شق کے مدعی بن جاتے ہیں جو ان کی غرض کے موافق ہوتی ہے۔
اسی طرح آپ متنازع فیہ امور کا جواب ایسا تحریر فرماتے تھے کہ متنازعین میں سے کوئی

اس کو اپنے نزاع کا آلہ کار نہ بنا سکے۔ مثلاً ایک سوال آیا کہ:-

سوال:- اہل حدیث جو اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہتے ہیں۔ اور لباس وغیرہ میں احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ آئمہ عظام کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور آئمہ کرام کے حق میں سوء ادب اور گستاخی کو حرام سمجھتے ہیں۔ رفع یدین اور آمین بالجہر بھی کرتے ہیں۔ علماء کرام حنفیہ کی جانب سے ان پر فتوے تکفیر وتبدیع کے لگائے جاتے ہیں۔ اور ان کے رسوا کرنے کے لئے رضاخانیوں کے رسائل پھیلائے جاتے ہیں حالانکہ علماء کرام دیوبند کی تصانیف میں کافی اصلاح موجود ہے۔ اور وہ وہ بہتانات واتہامات ان پر لگائے جاتے ہیں۔ جن کا وجود نہیں ہوتا۔ لہذا مسائل حسب ذیل کا جواب تحریر فرمادیں۔

(۱) اہل حدیث مسلمان ہیں یا کافر (۲) اہل حدیث سنی ہیں یا بدعتی (۳) اہل حدیث کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں (۴) اہل حدیث کو سلام کرنا جائز ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

حضرت نے اس کا یہ جامع ومانع جواب لکھا کہ:-

جواب:- اگر حنفیہ کا وہی عمل ہے جو سوال میں مذکور ہے۔ تو حکم ظاہر ہے۔ جواب کی حاجت نہیں۔ اور اگر واقعہ بدل کر لکھا ہے۔ تو دوسرے فریق کا بھی بیان درج سوال ہونا چاہیئے۔ بدوں اس کے جواب مفید نہیں۔

ایسے اکثر کئی سوالات آتے رہتے۔ جن کا حضرت ایسا ہی جامع جواب دیا کرتے۔

معمول علاج حضرت بلا طبیب کے مشورہ کے کسی کی بتائی ہوئی دوا استعمال نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ اگر کسی طبیب کے زیر علاج ہوں۔ اور کوئی دوسرا طبیب بھی کچھ تجویز کرنے لگے تو اس سے صاف فرمادیتے تھے کہ میں اپنے معالج کو یہ نسخہ دکھا کر بعد اجازت استعمال کروں گا۔ اور اگر کسی مرض کی حالت میں ازراہ محبت محبین اپنی اپنی تجویز پیش کرتے۔ تو فرماتے کہ:-

"بھائی فلاں حکیم میرے معالج ہیں۔ تم ان سے کہہ دو۔ انہیں سمجھا دو۔ اگر وہ مناسب سمجھیں گے۔ تو مجھے اس کے استعمال کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ کیونکہ میری عادت ہے کہ میں جب بیمار پڑتا ہوں۔ تو کوئی ایک طبیب اپنے علاج کے لئے تجویز کر لیتا ہوں اور پھر اس کی رائے پر چلتا ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو کس کس کا علاج کروں۔ کیونکہ محبت میں ہر ایک شخص کچھ نہ کچھ ضرور بتانے لگتا ہے:-" (طب ابراہیم ص۳۶)

غرضیکہ اس طرح نہ آپ کسی کی دل شکنی فرماتے اور نہ اپنا اصول توڑتے تھے۔

غایتِ صحبت

لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا ارشاد ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اور حکیم الامت علامہ اقبال نے مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں اسی مضمون کو اس مصرع میں ادا کیا ہے کہ ؏

علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

ایک مرتبہ حکیم محمد حسن قرشی نے علامہ اقبال سے دریافت کیا کہ آپ کے اس مصرع میں "نظر" سے کیا مراد ہے۔ تو علامہ اقبال نے فرمایا "صحبت" (ملاحظہ ہو ملفوظات اقبال ص۶۸)

اہل اللہ کی صحبت حاصل کرنے کی ..... اس لئے تاکید کی جاتی ہے کہ ان کے پاس رہنے سہنے سے ہر شعبۂ زندگی کے متعلق عملی تجربات و مشاہدات ہوتے رہتے ہیں۔ جن سے اصلاح و تربیت ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی جو حضرت تھانوی کے "زیر نظر" رہے اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھتے ہیں کہ:۔

"صحبت بابرکت کی ایک خاص برکت یہ تھی کہ اپنی کوتاہیاں۔ اپنے عیوب۔ اپنے گناہ مشاہدہ میں آجاتے تھے اور بغیر اس کے کہ مولانا خطاب خاص سے مخاطب فرمائیں۔ یا صراحتہً کسی کو اس کے کسی عیب کی طرف توجہ دلائیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جیسے غفلت کے پردے نگاہوں سے از خود ہٹتے جاتے ہیں۔ اور عمر بھر کی عادتیں بے نقاب نظر آنے لگتی تھیں"۔ (حکیم الامت ص۱۰۵)

مشائخ اور بزرگوں کی صحبت کا حاصل لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ کچھ وظیفے سیکھ لیں یا بہت سے بہت یہ کہ کچھ ذکر و شغل کی مشقیں کر لیں۔ خانقاہ اشرفی کے متعلق دوسروں کا تجربہ جو کچھ بھی ہو۔ اپنا تجربہ تو یہ ہوا کہ مریض کو مرض کا احساس برابر ہو جاتا۔ اور جہل خواہ باقی رہ جائے۔ لیکن جہل مرکب سے نجات بہر حال مل جاتی۔ مریض کو اپنے تندرست ہونے کا زعم و پندار باقی نہ رہ جاتا۔ اور جہاں تک ذاتی زندگی کا تعلق ہے۔ دین اور دینداری کا ہر شعبہ بیدار ہو جاتا ہے"۔ (حکیم الامت ص۱۰۶)

معیشت

سرچشمۂ معاش اسلام معاش کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات کو قرار دیتا ہے۔ جن کا ارشاد ہے کہ زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی روزی میرے ذمہ ہے۔ جس کو جتنی چاہتا ہوں دیتا ہوں۔ اس مسئلہ میں قناعت و توکل کی یوں تعلیم دی کہ کتنے جانور ہیں جو اپنی روزی کندھوں پر اٹھائے نہیں پھرتے، مگر ان میں سے کوئی بھی بھوکا نہیں سوتا۔ ہر ایک کو روزی مل جاتی ہے۔ اس لئے روزی کے معاملہ میں انسان کو اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جتنی حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے لازمی ہے۔ مگر انسان ان فرائض کی طرف تو دھیان نہیں دیتا۔ اور روزی کمانے کے لئے ساری عمر حیلے بہانے کرتا رہتا ہے۔

برکتِ تولد حضرت تھانوی کی پیدائش کے بعد آپ کے والد ماجد اپنے زر و مال میں زیادتی اور برکت محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ وہ فرماتے تھے کہ :-

"یہ لڑکا بہت خوش قسمت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی ہر تقریب کے موقعہ پر مجھے اللہ تعالےٰ نے اتنا دیا کہ میں نے دل کھول کر خرچ کیا"۔

افراطِ زر کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے آپ کی شادی کے موقع پر (پرانی مروجہ رسم کے ماتحت) خوب فراخی سے خرچ کیا۔ پیسوں کے علاوہ روپے بھی بکھاور کئے اہل قصبہ کی بڑی پُرتکلف اور شاندار دعوت کی۔ جس کے دور دراز تک چرچے سنے گئے۔

فکرِ معاش حضرت تھانوی کے والد نے آپ کو دینی تعلیم کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ اور آپ کے چھوٹے بھائی کو انگریزی تعلیم دلانے کا اہتمام کیا۔ آپ کی تائی صاحبہ کو یہ بات ناگوار گذری اور انہوں نے ازراہِ ہمدردی آپ کے والد ماجد سے کہا کہ :-

"بھائی تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے۔ وہ تو خیر کما کھائے گا۔ بڑا عربی پڑھ رہا ہے وہ کہاں سے کمائیگا؟ اس کے گذر اوقات کی کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ جائیداد تو ورثاء میں تقسیم ہو کر گذارے کے قابل نہیں رہے گی"۔

چونکہ آپ کے والد ماجد کی نظر اسباب کی بجائے مسبب الاسباب پر تھی۔ اس لئے انہوں نے بڑے جوش سے فرمایا :-

"بہا بھی صاحب! تم کہتی ہو۔ یہ عربی پڑھ کر کھ ئیگا کہاں سے؟ خدا کی قسم! جس کو تم کما نے والا سمجھتی ہو۔ ایسے اس کی جوتیوں سے لگے پھریں گے۔ اور یہ ان کی جانب رخ بھی نہ کرے گا۔"

بشارتِ آسودگی حضرت تھانوی نے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں خواب دیکھا کہ "ایک تالاب جس میں پانی کی بجائے چاندی فوارے کی طرح ابل رہی ہے۔ آپ کے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے"۔ اس کا آپ نے اپنے استادِ خاص حضرت مولانا محمد یعقوب سے ذکر کیا تو انہوں نے آپ کو بشارت دی کہ "انشاء اللہ تعالے دنیا تمہارے پیچھے پیچھے پھرے گی۔ اور تم اس کی طرف رُخ بھی نہ کرو گے"۔

شکایتِ برادر آپ کے والد ماجد بھی ماشاء اللہ بڑے صاحبِ بصیرت تھے۔ آپ جو کچھ خرچ کے لئے مانگتے وہ فوراً دے دیتے اور اس کا کوئی حساب نہ لیتے لیکن اپنے چھوٹے لڑکے منشی اکبر علی کو جو کچھ دیتے۔ اس کا باقاعدہ حساب لیتے۔ جو انہیں ناگوار گذرا۔ اور آخر کار انہوں نے اپنے والد ماجد سے شکایت کر ہی دی کہ بڑے بھائی کو تو بلا حساب خرچ دیا جاتا ہے اور مجھ سے پائی پائی کا حساب لیا جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ:-

"بیٹا مجھے اس (اشرف علی) پر رحم آتا ہے۔ وہ جو کچھ مجھ سے لیتا ہے۔ میری زندگی تک ہے۔ میرے بعد یاد رکھو۔ وہ میرے مال و متاع سے بالکل علیحدہ رہے گا۔"

بفضلہ تعالے یہ سب پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئیں اور آپ کو روزی کے سلسلہ میں کبھی پریشان نہ ہونا پڑا۔

تنخواہِ ملازمت آپ کے فارغ التحصیل ہونے کی دیر تھی کہ صفر ۱۳۰۱ھ میں آپ کو مدرسہ کانپور کی ملازمت مل گئی۔ اور پچیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ جو اس وقت کے لحاظ سے کچھ ایسی کم نہ تھی۔ مگر حضرت کی قابلیت کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی حضرت اسے معقول سمجھ کر فرماتے تھے کہ:-

"طالب علمی کے زمانہ میں خیال کیا کرتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دس روپلے کی مدرسی اپنی ضروریاتِ معاش کے لئے کافی رہے گی۔ پانچ روپلے اپنے خرچ کے لئے اور پانچ روپلے گھر کے خرچ کے لئے۔ بس اس سے زیادہ کی تنخواہ پر کبھی نظر ہی نہ جاتی تھی۔ نہ اس سے زیادہ کا اپنے کو مستحق سمجھتا تھا۔"

گویا آپ کو شروع سے ہی آپ کے خیال اور ضرورت سے زیادہ تنخواہ ملنی شروع ہو گئی۔ جو بعد ازاں پچاس روپے ماہوار تک پہنچ گئی اور اخیر ملازمت تک یہی تنخواہ وصول فرماتے رہے۔

ترکِ ترکہ آپ کے والد ماجد نے ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی اور کافی ترکہ چھوڑا۔ اس میں سے:۔
۱۔ آپ نے موروثی اراضی چھوڑ دی اور اس میں سے کچھ حصہ نہ لیا۔

۲۔ اپنے دادا صاحب کی متروکہ اراضی کی آپ نے رقم لے لی۔ اس سے مکان بنوایا جس پر پانچ ہزار روپیہ لاگت آئے۔ چونکہ آپ کی بڑی اہلیہ محترمہ کا مہر بھی پانچ ہزار تھا۔ اس لئے وہ مکان ان کو مہر میں دے دیا اور جو روپیہ بچا۔ اس سے حج پر تشریف لے گئے۔ اور اس میں سے کچھ بھی پس انداز نہ ہوا۔

۳۔ آپ کے والد صاحب کا جو روپیہ بنک میں موجود تھا۔ اسے آپ مشتبہ سمجھتے تھے۔ اور اپنے جدِ اعلیٰ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح (جو دس حصوں میں اگر ایک حصہ مشتبہ پاتے۔ تو سب کو ترک کر دیتے تھے) اس سے حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ مگر انکار کرنے سے قبل اس کی مزید تصدیق کر لے کے لئے حضرت مولانا گنگوہی سے استفسار بھی فرما لیا کہ اگر یہ جائیداد نہ رکھوں۔ تو کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا "اگر رکھو۔ رخصت ہے۔ نہ رکھو۔ جب بھی حق تعالےٰ روزی سے تم کو پریشان نہ کرے گا" اس سلسلہ میں ایک روز مولانا گنگوہیؒ کے خادم خاص مولانا محمد یحییٰ نے حضرت کی موجودگی میں مولانا سے عرض کیا کہ "حضرت ان کو اپنے والد کا متروکہ روپیہ جو بنک میں پڑا ہے۔ لینے کی اجازت کیوں نہیں دیتے" مولانا نے فرمایا "اگر کوئی تقویٰ اختیار کرے۔ تو کیا میں اس کو روکوں" جس سے حضرت کا کمال استغنار ظاہر ہے کہ فتویٰ کے باوجود تقویٰ کے پیش نظر ترکہ پر لات مار دی۔

تاکیدِ شیخ آپ کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ نے آپ کو اپنے مکتوب نمبر ۹۲ مورخہ ۱۶ جمادی الاول ۱۳۱۲ھ میں ہدایت فرمائی تھی کہ:۔

"جب تک یہاں (کانپور) کا تعلق خدا کو منظور ہے۔ رکھئے۔ بعد ازاں پھر تھانہ بھون میں محض توکل بخدا۔ خدا کا نام لے کر بیٹھ جائیے۔ اور کسی ذریع کا کوئی تعلق ظاہری نہ کیجئے۔ وہ خود مسبب الاسباب ہے۔ سب سامان آپ کے درست کر دیگا۔ انشاء اللہ تعالےٰ کوئی تردد نہ کرنا پڑے گا"

حضرت تھانوی نے اس قسم کی طبیعت پائی تھی کہ آپ نہ کسی کے لئے بار بننا چاہتے تھے اور نہ کسی کے زیر بار احسان ہونا چاہتے تھے۔ بلکہ خدمت دین کے لئے اتنے حریص تھے۔ کہ

آپ نے مدرسی کی تنخواہ لینے سے بھی بچنے کے لئے دہلی جا کر طب کی تعلیم حاصل کرنی شروع کردی تاکہ اسے ذریعہ معاش بنایا جائے لیکن جب مخلصین نے آپ کو اپنے تجربہ کی بنا پر یقین دلایا کہ اس صورت میں آپ اتنی خدمتِ دین نہ کر سکیں گے۔ جو موجودہ صورت میں کر رہے ہیں۔ تو پھر آپ کو طوعاً و کرہاً وہاں سے واپس آنا پڑا۔ قناعت و سیرچشمی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اپنی کسی کتاب کا حقِ تصنیف نہ لیا۔ حالانکہ ایک اخباری اندازہ کے مطابق اگر آپ اپنی کتابوں کا حق تصنیف لیتے۔ تو پچاس ساٹھ لاکھ روپیہ ترکہ میں چھوڑ جاتے۔ اب جبکہ یہ حکم آیا کہ ترک ملازمت کے بعد سیدھے تھانہ بھون پہنچیں اور کوئی ذریعہ معاش اختیار کئے بغیر محض توکلاً علی اللہ بیٹھ جائیں، اور کوئی تردد نہ کریں۔ وہ مسبب الاسباب خود سب سامان کر دیگا۔ تو اس نے حضرت تھانوی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ کہ حکم طبیعت کے خلاف تھا۔ انکار اتباع کے خلاف تھا۔ بلکہ توکل نہ کرنے سے تو رزاقِ مطلق کی رزاقیت کے انکار کا احتمال تھا کہ نعوذ باللہ وہ بلا سبب رزق دینے پر قادر نہیں۔

آزمائش و امتحان

اسلئے آپ بلا تردد تھانہ بھون آکر توکلاً علی اللہ بیٹھ گئے۔ اور افاضۂ باطنی میں معروف ہو گئے اور ساتھ ہی متفروض بھی جس سے طبیعت کے تقاضا کی تائید ہوتی تھی کہ بلا ذریعہ معاش نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا۔ تو یقیناً اس کے پائے ثبات میں لغزش آجاتی۔ مگر اس کوہِ استقلال کی جبین پر بل تک نہ آیا۔ البتہ حسب دستور "اطلاع و اتباع" آپ نے حضرت حاجی صاحب و مولانا گنگوہیؒ کو اس حالت سے مطلع کر دیا۔ حضرت حاجی صاحب نے تو اس اطلاع پر یہ لکھا کہ:۔

"آپ کے استقامت اور توکل میں کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ظاہری اور باطنی فیض میں روزافزوں ترقی فرمائے" (مکتوب نمبر ۲۷۔ ۶ رجب ۱۳۱۵ھ)

مگر مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہو تو تمہارے لئے مدرسہ دیوبند میں تحریک کروں۔ حضرت نے نہایت ادب سے کہا:۔

"میرا تو اس وقت عرض کرنے کا مقصد صرف دعا ہے۔ باقی حضرت حاجی صاحبؒ نے بعد ترک تعلق کا ہنوز کسی اور جگہ کوئی تعلق کرنے کی ممانعت فرمادی ہے۔ اگر حضرت کی یہی تجویز ہے۔ تو میں اس کو بھی حضرت حاجی صاحب ہی کی تجویز سمجھوں گا اور یہ سمجھونگا کہ حضرت حاجی صاحب ہی نے اپنی پچھلی تجویز کو منسوخ فرما کر اب یہ تجویز فرمادی ہے۔

کیونکہ تجویز مؤخر ناسخ ہوتی ہے۔ تجویز مقدم کی"۔

یہ سنتے ہی مولانا گنگوہی نے فوراً گھبراتے ہوئے لہجہ میں فرمایا کہ نہیں نہیں۔ اگر حضرت حاجی صاحب نے ممانعت فرمائی ہے تو میں ہرگز اس کے خلاف مشورہ نہیں دیتا۔ میں دعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ قرض سے سبکدوش فرمائے۔ ورنہ اگر اس پیکر استقلال کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ تو وہ یقیناً مولانا گنگوہی کی تجویز منظور کر لیتا۔ غرضیکہ جب حضرت تھانوی کے پائے استقلال میں اس قرض کی پریشانی کی وجہ سے کوئی تزلزل نہ آیا۔ اور آپ توکل پر مستقل رہے۔ تو بفضلہ تعالیٰ قرض سے بھی جلد سبکدوشی ہوگئی۔

فراخی رزق

تنگی رزق کی آزمائش کے بعد آپ کو فراخی رزق کا امتحان پیش آیا۔ جو پہلے امتحان سے بھی سخت تھا۔ کیونکہ انسان تنگی کی حالت میں تو کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیتا ہے اور تحمل و برداشت سے کام لیتا ہے۔ مگر فراخی رزق کی صورت میں استقلال کے ساتھ اعتدال پر رہنا اور سیم وزر کی بارش میں اسے آفت جان کر اپنا دامن بچا لینا یہ کسی بڑے ہی صاحب ظرف کا کام ہے۔ ورنہ دنیا کے اسی موڑ پر بڑے بڑے ارباب تقدس وتقویٰ کو گرتے دیکھا۔

اب صورت حال یہ پیدا ہوگئی کہ آپ تو افاضہ باطنی میں مصروف تھے اور چاروں طرف سے دنیا بار بار لا لا کر آپ کا محاصرہ کر رہی تھی۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک چپڑاسی سے لے کر والیان ریاست تک سب کی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ حضرت کچھ قبول کر لیں۔ مگر حضرت نے کمال استغناء کے ساتھ انہیں قبول کرنے کے لئے ایسی کڑی شرطیں لگا رکھی تھیں۔ جن کی نظیر کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔ اکثر بڑی بڑی رقمیں اور قیمتی اشیاء واپس فرماتے رہتے۔ اور جو کچھ قبول فرماتے وہ محض

۱۔ دینے والے کے اخلاص کی وجہ سے

۲۔ اس خوف کی وجہ سے کہیں حق تعالیٰ ناراض نہ ہو جائیں کہ ہم بھیجتے ہیں اور یہ رد کر دیتا ہے اور

۳۔ اتباع سنت کی وجہ سے۔

قبول فرمایا کرتے۔ اور اس طرح جو آمدنی ہوتی۔ اس کا ایک چوتھائی تو خیرات کر دیتے۔ اور بقایا رقم جب تک ضروری مصارف پر خرچ نہ فرما لیتے چین نہ آتا جس کی تفصیل دعائے بزرگاں کے باب میں بضمن امیری و فقیری گذر چکی ہے۔ کیونکہ آپ کو طبعاً روپیہ پیسہ سے محبت نہ تھی۔ ورنہ نہ ترکہ ترک کرتے اور نہ حق تصنیف چھوڑتے۔

غرضیکہ آپ کا یہ "دور توکل" تین باتوں کا مظہر رہا۔

۱۔ انسان شیخ محقق کی رائے کے بغیر اسباب کو نہ چھوڑے۔

۲۔ اگر وہ خدمتِ دین کو مقصدِ حیات بنا لے۔ تو حق تعالےٰ دنیا کو اس کا خادم بنا دیتا ہے۔

۳۔ اس دورِ فتن و انحطاط میں انسان اس وقت تک سکون و اطمینان سے خدمتِ دین و خلق سرانجام نہیں دے سکتا۔ جب تک کہ اسے معاشی تفکرات سے بے فکری نہ ہو۔

اسلئے اگر آپ کے اس دور کو دنیا کے لئے درسِ عبرت کا دور کہا جائے۔ تو بے جا نہ ہوگا۔

خوراک

حضرت تھانوی مالِ مشکوک سے بہت بچتے تھے۔ اور مالِ حرام سے انتہائی نفرت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ

"ادنیٰ شبہ کی صورت میں بھی احتراز فرماتے تھے" (خیر العبور ص۱۰۱)

ناشتہ کی آپ کو قطعًا عادت نہ تھی۔ فرماتے تھے کہ

"الحمدللہ میں نہ پان کھاتا ہوں۔ نہ چائے پیتا ہوں۔ نہ ناشتہ کا عادی ہوں۔ تاکہ میزبان کو کوئی کلفت نہ ہونے پائے" (مواعظ التبلیغ ص۸)

رات کو آدھ سیر دودھ پینے کا اکثر معمول تھا۔ کھانا بلا اشتہائے صادق نہ کھاتے تھے۔ ذرا بھی پیٹ میں ثقل معلوم ہوتا۔ تو کھانا ملتوی فرما دیتے تھے۔

فرماتے تھے کہ:۔

"میری یہ بھی عادت ہے کہ مجھے مختلف قسم کے کھانوں سے رغبت نہیں۔ ایک چیز جو ہاتھ آجائے۔ اس کو کھا لیتا ہوں اور اس سے طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔

نیز میری یہ بھی عادت ہے کہ مجمع کے ساتھ خواہ ایک ہی آدمی ہو۔ کھانے کی مقدار کا اندازہ نہیں رہتا۔ اور تنہا خوب بے فکری سے کھاتا ہوں۔ اور اندازہ سے زیادہ نہیں کھایا جاتا"۔ (خیر العبور ص۹۲)

آپ کے اول الذکر معمول کو سن کر مولوی ابوالحسن صاحب نے عرض کیا کہ حضرت سنت بھی یہی ہے

فرمایا:۔

"یہ بات تو بڑوں کو نصیب ہوتی ہوگی۔ کہ سنت سمجھ کر ایسا کریں۔ ہاں شکر ہے کہ حق تعالےٰ کی بڑی نعمت ہے کہ طبیعت ہی ایسی دی ہے۔ کہ وہ اس طریق کو پسند کرتی ہے جو موافق سنت ہو" (بحوالہ صدر)

جس کی تائید مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ:۔

"ایک مسلمان رئیس میرے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ سے بوٹی نیچے

تختہ پر گر پڑی۔ تو انہوں نے اسے بوٹ سے بنچ کے نیچے پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور میں نے خواجہ (عزیز الحسن) صاحب سے کہا کہ ذرا اس بوٹی کو اٹھا کر پانی سے دھو لیجئے۔ اور دھو کر مجھے دے دیجئے۔ اسے میں کھاؤں گا۔ خواجہ صاحب نے اسے دھویا۔ اور دھو کر کہنے لگے کہ اگر کوئی دوسرا شخص کھالے۔ تو اجازت ہے؟ میں نے کہا ہاں اجازت ہے۔ تو خواجہ صاحب نے وہ خود کھالی۔ وہ رئیس بعد میں کہتے تھے کہ اس عملی تنبیہ کا مجھ پر ایسا اثر پڑا کہ میں کٹ کٹ گیا اور اس دن سے میں نے کبھی گرے ہوئے لقمہ کو زمین پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ صاف کر کے کھا لیتا ہوں"۔ (مواعظ التبلیغ ص۶۵)

حج ثانی کے موقعہ پر جب آپ کا جہاز واپس بمبئی پہنچا۔ تو ایک سیٹھ نے مسافر خانہ میں تقسیم کرنے کے لئے حاجیوں کے واسطے کھانا بھیجا۔ آپ کے بعض ہمراہیوں نے وہ کھانا یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ ہم محتاج نہیں۔ اسلئے اللہ واسطے کا کھانا نہیں لیتے۔ حضرت نے مزاحاً فرمایا بھائی ادھر لاؤ۔ ہم تو اللہ واسطے کا ضرور لیں گے یہ لوگ شیطان کے واسطے کا لیں گے۔ اللہ واسطے کا نہیں لیتے۔ جب حضرت نے وہ کھانا لے لیا۔ تو دوسروں کو بھی لینا پڑا۔ حضرت نے فرمایا کہ اللہ واسطے کا یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ محتاج سمجھ کر دیتے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بلا عوض اور بلا غرض ہے۔ ورنہ کیا تقسیم کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ حجاج میں اکثر غنی بھی ہوتے ہیں"۔

مہمان نوازی حضرت تھانوی بڑے مہمان نواز تھے۔ مہمان کو بڑی فراخی کے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔ ملازمین کو حکم تھا کہ ریل گاڑیوں کے آنے کے بعد آکر پتہ لیں کہ کوئی مہمان تو نہیں آیا۔ اکثر مہمانوں کو تو خانقاہ ہی میں کھانا بھیج دیا جاتا تھا۔ بعض خاص مہمانوں کو گھر پر بلا کر اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔ اگر خود کو بھوک نہ ہوتی۔ تو ہرگز تکلف نہ فرماتے اور خود عذر فرما کر ان کو کھانا کھلا دیتے۔ بعض دفعہ کھانے میں تو شریک نہ ہوتے۔ لیکن کھانے کے وقت مہمان کے پاس بیٹھے رہتے۔ اگر مختلف مرتبہ کے مہمان ہوتے۔ تو ملازم کو تاکید فرما دیتے کہ ہر ایک کو الگ الگ کھانا دیا جاوے۔ تاکہ اگر کوئی مہمان کسی دوسرے کے ساتھ کھانا گوارا نہ کرے تو اس کو تنگی نہ ہو۔ اگر وہ خود اکٹھا کھانا چاہتے۔ تو ان کو اختیار تھا۔

ایک مرتبہ ایک بہت بڑے نواب مہمان ہوئے۔ ان کے مرتبہ کے مطابق بہت سے کھانے

بکوا تے۔ ان کے احساس تکلف پر فرمایا کہ بفضلہٖ تعالیٰ کوئی چیز باہر سے نہیں منگوانی پڑی یہاں تک کہ گوشت بھی گھر کے مرغ کا ہے۔ نیز اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میں آپ کو دکھا دوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بفضلہ کھلانے پینے کو کافی دے رکھا ہے۔ تاکہ آپ کو مسرت بھی ہو۔ اور میری طرف سے بے فکری بھی ہے کہ خدا تعالیٰ نے سب سامانِ راحت عطا فرما رکھا ہے اور میں آپ کے ہدیہ کا حاجت مند نہیں ۔"

پوشاک آپ سادہ لباس پہننے کے زیادہ عادی تھے۔ جس کی وضاحت معمولاتِ سفر اور معمولاتِ وعظ میں کی جا چکی ہے۔

نیند آپ اکثر عشاء کے بعد سو جاتے تھے۔ بشرطیکہ وعظ نہ کہنا ہو۔ یا ڈاک نہ بقایا ہو۔ سونے کے سلسلہ میں آپ نے گھر میں اس بات کی تاکید کر رکھی تھی کہ عشاء کے بعد ایسی بات نہ پوچھی جائے جس میں سوچنا پڑے۔ کیونکہ نیند جاتی رہتی ہے۔ یہ نہ صرف اس حدیث کے خلاف ہے جس میں عشاء کے بعد قصہ یا باتوں سے منع کیا گیا ہے بلکہ جعلنا اللیل سکنا کے بھی خلاف ہے کہ کسی ایسی چیز کی طرف توجہ دلانا جو سکون و آرام کے خلاف ہو (مقالاتِ حکمت حصہ ہفتم ملفوظ ۶۵)

معاشرت

حقیقتِ معاشرت قرآن و حدیث میں جس قدر آدابِ معاشرت بیان کئے گئے ہیں۔ بقول حضرت تھانویؒ:۔

ان دلائل میں مجموعی طور پر نظر کرنے سے بہ دلالتِ واضحہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے حد درجہ پر اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے کہ کسی شخص کی کوئی حرکت کوئی حالت دوسرے شخص کے لئے ادنیٰ درجہ میں بھی کسی قسم کی تکلیف و اذیت یا ثقل وگرانی یا ضیق و تنگی یا تکدر و انقباض یا کراہت و ناگواری یا تشویش و پریشانی یا توحش و خلجان کا سبب و موجب نہ ہو۔ اور شارع علیہ السلام نے صرف قول و فعل سے ہی اس کے اہتمام کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ خدام کو قابلِ اعتبار بنانے کو ان آداب کے عمل کرنے پر مجبور بھی فرمایا ہے۔ اور ان سے کام لے کر بھی بتلایا ہے۔

چنانچہ ایک صحابی ایک ہدیہ لے کر آپ کی خدمت میں بدوں سلام و استیذان داخل ہوئے۔ آپ نے فرمایا:۔

"باہر واپس جاؤ۔ اور السلام علیکم۔ کیا میں حاضر ہوں؟ کہہ کر پھر واپس آؤ۔"

اور فی الحقیقت حسن اخلاق مع الناس کا ایک اساسی بھی ایک امر ہے کہ کسی کو کسی سے ایذا یا کلفت نہ پہنچے۔ جس کو حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہٖ (رواہ البخاری)

اور جس امر سے اذیت ہو۔ گو وہ صورۃً خدمت مالی یا جانی ہو یا ادب و تعظیم ہو۔ جو عرف میں حسن خلق سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس حالت میں وہ سب سوءِ خلق میں داخل ہے کیونکہ راحت رسانیِ خلق ہے۔ مقدم ہے خدمت پر۔ اور قشر بلا لب کا بیکار ہونا ظاہر ہے اور گو شعائر ہونے کے مرتبہ میں باب معاشرت و آب عقائد و عبادات کے ذریعہ سے مؤخر ہے۔ لیکن اس اعتبار سے کہ عقائد و عبادات کے اخلال سے اپنا ہی ضرر ہے۔ اور معاشرت کے اخلال سے دوسروں کا ضرر ہے۔ اور دوسروں کو ضرر پہنچانا اپنے نفس کو ضرر پہنچانے سے اشد ہے۔ اس لحاظ سے اس کو اُن دونوں پر تقدم ہے۔ آخر کوئی بات تو ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے سورۃ فرقان میں الذین یمشون علی الارض ھونا واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما کہ جو لوگ زمین پر متواضع چلتے ہیں جب ان سے جاہل کوئی بات چیت کرتے ہیں۔ تو وہ اچھی بات کہتے ہیں کہ دال ہے حسن معاشرت پر۔ ذکر میں مقدم فرمایا۔ صلوٰۃ و خشیت و اعتدال فی الانفاق و توحید پر۔ جو کہ باب طاعات مفروضہ و عقائد سے ہیں۔ اور یہ تقدیم علی الفرائض تو محض بعض وجوہ سے ہے۔ لیکن نفل عبادت پر اس کا تقدم من کل الوجوہ ہے۔" (آداب معاشرت)

عزّ و شرف

حق تعالیٰ کو چونکہ حضرت تھانویؒ سے اصلاحِ امت مسلمہ کا عظیم الشان کام لینا تھا۔ اسلئے انہوں نے آپ کو خصوصی عزّ و شرف بھی بخشا۔ جس کی آپ کو زمانہ طالب علمی میں ہی یوں بشارت دی گئی۔ کہ ایک رات حضرت تھانوی نے خواب میں دیکھا۔ جو حضرت نے "اصدق الرؤیا" میں شائع بھی فرما دیا تھا۔ کہ:۔

"ایک مردانہ مکان ہے۔ جیسا حضرت استاذی مولانا محمود الحسن صاحب کا ہے اس کے چبوترہ پر ایک بزرگ بہت لطیف اور نازک۔ بہت سفید کپڑے پہنے ہوئے ایک

مکلف چارپائی اور مکلف بستر پر تشریف رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے ایک پرچہ لکھ کر اور مہر لگا کر دیا۔ یہ مہر پرچہ کے تمام جانب جابجا لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس کو پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ "ہم نے تم کو عزت دی"۔ اور مہر میں تھا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر اسی خواب میں ایک دنیا دار کے مردانہ مکان میں ایک دنیوی حاکم کو میز کرسی لگائے دیکھا۔ اس نے بھی ایک پرچہ اسی طرح لکھ کر اور مہر کر کے دیا۔ اس میں بھی یہی مضمون تھا کہ "ہم نے تم کو عزت دی"۔ مگر مہر کے حروف پڑھے نہ جاتے تھے۔

اس کی تعبیر حضرت کے استاذِ خاص حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے یہ فرمائی کہ:-

"انشاء اللہ تعالیٰ دین اور دنیا دونوں کی عزت نصیب ہوگی"۔

چنانچہ بفضلہ تعالیٰ ایسا ہی ہوا۔ حق تعالیٰ نے افاضۂ خلق کے لئے آپ کو مرجع خلائق بنا دیا جس وجہ سے بڑے بڑے مشائخ۔ علماء۔ فضلاء۔ صلحاء۔ شرفاء۔ امراء۔ رؤساء۔ حکماء۔ وکلاء۔ ادباء اور شعراء آپ کی طرف رجوع کر کے فیض یاب ہوتے رہے۔ اور فیض یاب ہونے کے بعد دوسروں کو بھی فیض پہنچاتے رہے۔ یہ سلسلہ فیض رسانی اب تک جاری ہے اور انشاء اللہ اسی طرح جاری رہیگا۔

اکتسابِ فیض چونکہ یہ فریضہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت ہی اہم تھا۔ اسلئے حضرت نے باوجود بشارت عز و شرف و تائید ایزدی بر بنائے بشریت خود کو کبھی بھی بزرگوں کی دعا و توجہ سے مستغنی نہ سمجھا۔ حالانکہ ارباب عزت و ثروت کا یہ عام دستور ہے کہ وہ کسی دوسرے کو خواہ وہ ان سے کتنے درجہ ہی فضیلت کیوں نہ رکھتا ہو۔ اپنے سے بڑا نہیں سمجھتے۔ مگر حضرت تھانویؒ نے اس امر کے باوجود کہ بزرگانِ دین کی خود بخود آپ پر نظر و توجہ خاص تھی۔ ہر ضرورت کے موقع پر یہاں تک کہ بعد تکمیل سلوک بھی بلا تامل اپنے پیر و مرشد کے علاوہ اپنے بڑے رتبہ کے پیر بھائیوں سے عرض حال کر کے مشورے لیتے تھے۔ اور ان سے برابر فیض حاصل کرتے رہتے تھے۔ اور اس میں کبھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ جس کی برکت سے کار اصلاح میں آسانی رہی۔

راحت رسانی چونکہ حضرت تھانوی کو مرجع خلائق ہونے کی وجہ سے ہر وقت ہر قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ اور ان سے مختلف قسم کے معاملات پیش آتے رہتے تھے۔ اسلئے آپ ان کی راحت رسانی کے لئے ہر ہر کوتاہی کی نہایت تدقیق کے ساتھ قولی اور عملی تعلیم فرماتے رہتے تھے۔ اور آپ کا ہر فعل متذکرہ بالا ہر قول کا آئینہ دار تھا۔ اور اس معاملہ میں اس درجہ سے اہتمام تھا کہ بلا خوف لومۃ لائم رات دن لوگوں کو نہایت اہتمام کے ساتھ اسکے

متعلق روک ٹوک فرماتے رہتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں کسی کی رورعایت نہ کرتے تھے۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو۔ جس کی کئی مثالیں مختلف مقامات پر آچکی ہیں۔ تعلیم و اصلاح معاشرت اور راحت رسانی خلق کی وجہ سے بعض کم فہم اور کوتاہ اندیش حضرت کو سخت گیر اور تندمزاج ظاہر کرتے رہتے تھے۔ حالانکہ حضرت کی تعلیم اصلاح معاشرت بالکل سنت نبوی کے مطابق تھی۔ مگر چونکہ عوام و خواص شریعت کی بجائے بدعات کے عادی ہو چکے تھے۔ اسلئے ان پر یہ گراں گزرتی تھی۔ مگر بمصداق ع

خلقے بطعن و گفتگو۔ عاشق بکارِ خویشتن

آپ نے کبھی ایسے لوگوں کی طعن و تشنیع کی پروا نہ کی۔ اور اپنے فرضِ اصلاح میں شب و روز منہمک رہے۔

خدمت خلق یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت تھانوی طبعًا خلوت پسند تھے۔ بچپن میں ہمشیرہ کے ساتھ گھر کے اندر کھیلنا۔ زمانہ طالب علمی میں ہم عمر ہم رشتہ طلبار و رفقار و اعزہ سے میل ملاپ نہ رکھنا۔ فارغ اوقات میں اساتذہ کی خدمت میں یا کمرہ کے اندر اکیلے بیٹھے رہنا۔ سفر کے دوران میں لوگوں کو استقبال وغیرہ کی اجازت نہ دینا۔ مولانا گنگوہیؒ سے آبادی چھوڑ دینے کی اجازت طلب کرنا۔ آخر زمانہ تک وحشت عن الخلق رہنا اور آپ کا یہ فرمانا کہ:-

"اب تو تعلقات سے بہت وحشت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مجمع زیادہ نہ ہو۔ اپنے ہم خیال کچھ لوگ ہوں اور یادِ حق میں بقیہ زندگی گزرے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اکثر یہ بہانہ کر کے اٹھ جاتا ہوں کہ گھر ہو آؤں۔ بات یہ ہے کہ مجمع سے جی بہت گھبراتا ہے۔"

(کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۲)

آپ کی وحشت عن الخلق انس مع الخالق پر دال ہے اس حالت میں لوگوں کا نافہمی کی وجہ سے آپ کو غیر ضروری باتوں میں الجھانا اور ناواجب کاموں سے ستانا اور آپ کو تغیر کا دورہ ہو جانا اور آپ کا لوگوں سے ملنا ملانا ترک کر لینے کو خلافِ مروت سمجھنا اور خدمتِ خلق میں شب و روز مصروف رہنا ایک بہت بڑی کرامت ہے۔ ورنہ جب انسان خود ہی ہر وقت اپنی فکر میں مبتلا ہو۔ اسے دوسروں کی جانب توجہ کرنے کی قطعًا ہمت و فرصت ہی نہیں ہوتی۔

چنانچہ دورِ وحشت میں جبکہ مطلقًا وحشت عن الخلق ہوگئی تھی۔ آپ نے بیعت لینا اور تعلیم تلقین کرنا موقوف فرما دیا تھا۔ کیونکہ بلا توجہ خاص اثر ناممکن ہے۔ مگر اس زمانہ میں بھی اکثر طالبین

بیعت کے لئے اصرار کرتے۔ اس عالمِ دلگیری میں بھی حضرت کو افادۂ خلق کا اتنا خیال تھا کہ آپ ازراہِ تدین ایسے طالبین سے صاف فرمایا کرتے کہ:-

"ایسی حالت میں مجھ سے رجوع کرنا بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ میں تو اپنے غم میں مبتلا ہوں"۔

لیکن لوگ پھر بھی اصرار کرنے سے باز نہ رہتے۔ حضرت کو ان کی دل شکنی سے سخت کوفت ہوتی چنانچہ اسی حالت میں آپ نے بریلی کے ایک صاحب کو اس کے اصرار پر ازراہِ مروت بیعت فرمالیا۔ مگر حضرت کے ارشاد کے مطابق اسے کوئی نفعِ اصلاح نہ ہوا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ موافق تو بجائے خود رہے۔ ناموافق و نامساعد حالات میں بھی حضرت نے خدمتِ خلق میں کبھی کوتاہی نہ فرمائی بلکہ اسے فرضِ عین کی طرح انجام دیتے رہے۔

وسعتِ نظر اصلاحِ امت کے منصبِ جلیلہ پر فائز ہونے کے بعد آپ کی نظر میں مسلمانوں کی قریباً ساری بدانتظامیاں روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئیں۔ جو ان کے زوال کا باعث تھیں۔ کیونکہ بقول حضرت تھانویؒ:-

"مسلمانوں کے ہاتھوں سے جو سلطنت گئی ہے۔ وہ بدنظمی ہی کی وجہ سے گئی ہے سلطنت کفر کے ساتھ تو جمع ہو سکتی ہے لیکن بدانتظامی کے ساتھ ہرگز جمع نہیں ہو سکتی اسلئے بوجہ شامتِ اعمال مسلمانوں کے اندر سے سلطنت کا مادہ ہی نکال دیا گیا ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانوی مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں شریک ہونے کی بجائے ان کی اصلاحِ اخلاق و معاشرت کی طرف ہی ہمہ تن متوجہ رہے اور صوفیاء کرام کی طرح لوگوں کو ذکر و شغل میں مشغول نہ رکھا۔ جیسا کہ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:-

"میری نظر ذکر و شغل پر اس قدر نہیں جس قدر کہ اصلاحِ اخلاق و معاشرت پر ہے کیونکہ ان کا تعلق دوسروں سے ہے"۔

اصلاحِ معاشرت غرضیکہ حضرت تھانوی نے بحیثیت حکیم الامت اور مجدد الملت اس شعبۂ زندگی کی اصلاح کی طرف اس قدر اہتمام اور اس قدر تفصیل کے ساتھ توجہ فرمائی کہ ایسی توجہ صدیوں سے نہ ہوئی تھی۔ اور جب ہم آپ کے اصلاحی کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو حیران ہو کر رہ جاتے ہیں کہ بعثت عن الخلق کے باوجود اس قدر کام ایک انسان سے کس طرح ممکن تھا، چنانچہ حضرت کو خود بھی اس پر حیرت تھی جس کی وجہ سے ایک بار فرمایا کہ:-

مجددِ ملت تو غیر کیا۔ لیکن مجددِ معاشرت میں ضرور ہوں"۔

حضرت تھانوی نے جن جن آداب معاشرت کی تعلیم فرمائی۔ وہ اتنے کثیر ہیں کہ ان کا احصاء ممکن نہیں جنہیں شوق ہو۔ وہ حضرت کی تالیفات و تصنیفات اور مکتوبات و ملفوظات میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ البتہ عنوان کی مناسبت و تقاضا سے بمصداق مشتے نمونہ از خروارے چند واقعات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ جن سے اندازہ لگایا جا سکے گا کہ جن امور کو ہم بڑی اہمیت بھی نہیں دیتے۔ وہ حضرت کی نظر میں کتنی اہمیت رکھتے تھے۔

باریک بینی ایک دفعہ ایک صاحب نے ازراہِ خدمت قبل از نماز صبح حضرت کے وضو کے لئے پانی کا لوٹا بھر کر اور اس پر حضرت کا ذاتی مسواک رکھ کر مسجد میں رکھ دیا۔ اتفاق سے آپ باوضو آئے۔ اور لوٹے کو اس طرح پڑا دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس نے بھر کر اس طرح رکھا ہے۔ بڑی تفتیش کے بعد جب اس خدمتگزار کا پتہ لگا۔ تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس سے فرمایا کہ تم نے محض احتمال پر کہ شاید میں وضو کروں لوٹا بھر کر رکھ دیا۔ اور یہ احتمال نہ ہوا کہ شاید وضو ہو۔ اگر میری نظر نہ پڑتی۔ تو یہ یونہی پڑا رہتا اور اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھاتا۔ جبکہ اس پر مسواک بھی رکھ دی گئی۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ کسی نے اپنے لئے رکھا ہے۔ لہٰذا اسے کوئی دوسرا استعمال نہ کرے اسلئے ایسی چیز کا بلا ضرورت محبوس رکھنا جو مفادِ عامہ سے متعلق ہو۔ جائز نہیں ثانیاً دوسرے کی چیز یعنی مسواک کو احتمالاً بلا ضرورت ایک محفوظ جگہ سے اٹھا کر غیر محفوظ جگہ پر رکھ دینا۔ اور اس کی نگرانی نہ کرنا کہ بعد فراغ اسے اپنی پہلی جگہ پر رکھا جائے۔ اس کو ضیاع کے خطرہ میں ڈالنا ہے۔ اسلئے تمہاری یہ خدمت کتنے ناجائز امور اور کلفتوں کا سبب ہوئی۔ آئندہ ایسا نہ کیجئے۔ اگر شوق ہے تو اجازت لے کر کرو۔ یا جس وقت دیکھو کہ وہ وضو کے لئے آ رہا ہے۔ اس وقت مضائقہ نہیں۔ ورنہ بیقاعدہ خدمت سے بجائے راحت کے الٹا کوفت ہوتی ہے۔ ایسی خدمت کی باریک خرابیوں کا احاطہ کرنا حضرت تھانوی پر ہی ختم تھا۔ بس اسی طرح آپ بات بات اور قدم قدم پر باریک بینی سے کام لیتے تھے۔

نکتہ آفرینی ایک مہمان نے ہدیہ کے دو روپے چپکے سے حضرت کے قلمدان پر بلا اطلاع رکھ دئے عصر کے وقت قلمدان تنہا چھوڑ کر نماز پڑھنے چلے گئے۔ نماز کے بعد کسی ضرورت کے سلسلہ میں قلمدان منگایا تو اس میں دو روپے پڑے دیکھ کر تردد سا ہوا کہ یہ کہاں سے آ گئے۔ آخر دریافت شروع ہونے پر اس صاحب نے بتلایا کہ میں نے ہدیہ کے رکھے تھے۔ اس پر آپ نے

وہ روپے واپس کر دیئے اور فرمایا کہ جب تم ہدیہ دینا نہیں جانتے۔ تو ہدیہ دینا کوئی ضروری ہے دینے کا یہ طریقہ ہے؟ ہدیہ تو راحت و مسرت پہنچانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ جب اس کی تحقیقات میں اتنا وقت ضائع ہوا۔ اور اس قدر پریشانی ہوئی۔ تو اس کے دینے سے فائدہ۔ اس کی غرض تو فوت ہو گئی۔ ثانیاً اگر قلمدان میں سے کوئی لے جاتا۔ جس کی نہ تمہیں خبر ہوتی اور نہ مجھے۔ تم تو اس گمان میں رہتے کہ میں نے دو روپے دیئے ہیں۔ اور میں اس سے ذرا بھی فائدہ نہ اٹھاتا۔ اور میرے سر پہ مفت کا احسان رہتا۔ ثالثاً اگر کوئی لے بھی جاتا اور پھر میرے ہی ہاتھ آتے۔ تب بھی مجھے یہ کیسے معلوم ہوتا کہ یہ کس نے دیئے اور کس کو دیئے۔ اور جب نہ معلوم ہوتا۔ تو چند روز امانت رکھنے کا مجھ پہ بار رہتا۔ پھر لقطہ کی مد میں خرچ کر دیا جاتا۔ اور کتنی تکلیف ہوتی۔ سیدھی بات یہ ہے کہ جس کو دینا ہو۔ اس کے ہاتھ میں دے۔ اگر مجمع میں دینے سے لحاظ معلوم ہو۔ تو تنہائی میں دے اگر تنہائی میسر نہ ہو۔ تو کہہ دے کہ میں تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جب تنہائی ملے اس وقت دیدے۔ اور مہدی الیہ کو مناسب ہے کہ اس ہدیہ کو ظاہر کر دے۔ خواہ مہدی کے ہوتے ہوئے۔ خواہ اس کے چلے جانے کے بعد جبکہ اس کے شرمانے کا خیال ہو۔

بظاہر یہ کتنی معمولی سی بات تھی۔ مگر حضرت نے کتنے کتنے اہم اور سبق آموز نکالے۔

خبر گیری

ایک دفعہ ایک صاحب حضرت کے پاس آئے۔ آپ نے فوراً دریافت فرمایا کہ کیسے تشریف لائے؟ کچھ فرمانا ہے؟ جواب دیا کہ جی نہیں۔ ویسے ہی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا جب جانے لگے تو نماز مغرب کے فرض اور سنت کے درمیان تعویذ کی فرمائش کر دی۔ اس پہ حضرت نے فرمایا کہ ہر کام کے واسطے ایک موقع اور محل ہوتا ہے۔ یہ وقت تعویذ کا نہیں ہے جب آپ تشریف لائے تھے۔ تو میں نے استفسار کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ویسے ہی ملاقات کے واسطے آیا ہوں۔ اب اس وقت یہ فرمائش کیسی۔ اسی وقت پوچھنے کے ساتھ ہی آپ کو فرمائش کرنی چاہیئے تھی۔ لوگ اس کو ادب سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بڑی بے ادبی ہے۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ دوسرا شخص ہمارا تابع ہے۔ جس وقت چاہیں فرمائش کریں۔ اس کی تعمیل ہونی چاہیئے۔ اب آپ ہی ذرا غور کریں کہ مجھ کو اس وقت کتنے کام ہیں ایک تو سنن و نوافل پڑھنا۔ پھر ذاکرین و شاغلین کو کچھ کہنا۔ ان کی سننا۔ مہمانوں کو کھانا کھلانا۔ افسوس کہ فی زمانہ دنیا سے بالکل ادب و تہذیب مرتفع ہو گیا ہے۔ اب تعویذ کے لئے پھر تشریف لایئے۔ یاد رکھئے انسان جہاں جائے اول مقصود کا ذکر کر دے۔ بالخصوص پوچھنے پر۔ میں تو ہر شخص کے آنے ہی دریافت کر لیتا

ہوں کہ اکثر اہلِ حوائج آتے ہیں۔ اور بعض اشخاص بوجہ شرم وحیا خود نہیں کہہ سکتے یا مجمع کی وجہ سے پوشیدہ بات ظاہر نہیں کرسکتے۔ پوچھنے سے وہ بتادیتے ہیں یا کہہ دیتے ہیں کہ خلوت میں کہنے کی بات ہے۔ جب میں موقع پاتا ہوں علیحدہ۔ اُن کو بلا کر سن لیتا ہوں۔ اور جب آدمی کچھ منہ سے ہی نہ بولے تو خبر کیسے ہوسکتی ہے۔ مجھے علم غیب تو ہے۔ نہیں۔

گو بظاہر حضرت نے اس کی خوب خبر لی۔ مگر خبر لینے میں بھی حضرت کی خبر گیری کا پہلو کتنا روشن ہوگیا۔ اور کتنا اچھا سبق مل گیا۔

دلسوزی ایک طالب علم سے ایک ملازم کی نسبت دریافت کیا گیا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے کہا کہ سو رہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی کوٹھڑی میں جاگتا ہے۔ اس پر طالب علم کو فہمائش کی کہ اول تو تخمین پر ایک بات کو تحقیق سمجھنا غلطی ہے۔ اگر خود اس کو غیر تحقیقی سمجھتے تھے۔ تو مخاطب پر اس کے تخمینی ہونے کو ظاہر کرنا چاہیئے تھا۔ یوں کہتے کہ شاید سو رہے ہوں۔ اور یہ بھی علیٰ سبیل التنزل کہا جاتا ہے۔ ورنہ اصل جواب تو یہ تھا کہ معلوم نہیں میں دیکھ کر بتلاؤں گا۔ پھر تحقیق کر کے صحیح جواب دیتے۔ دوسرے اس میں یہ خرابی ہے کہ اگر مجھ کو اس کا جاگنا بعد میں معلوم نہ ہوتا۔ اور اس خیال میں رہتا کہ وہ سوتا ہے۔ تو بعض اوقات بلکہ مجھ کو بہت اوقات ایسے مواقع پر بھی خیال ہوتا ہے کہ بلا ضرورت سوتے آدمی کو جگانا۔ بے آرام کرنا۔ بے رحمی ہے۔ اور اس خیال سے نہ جگاتا اور ممکن ہے کہ اس وقت اس سے کسی ضروری کام میں حرج ہو جاتا۔ گو وہ ضرورت شدت کے درجے تک نہ ہوتی۔ مگر اس حرج کو اس لئے گوارا کر لیا جاتا کہ سوتے کو جگانا اس سے زیادہ ناگوار تھا۔ پھر جب بعد میں معلوم ہوتا کہ وہ سوتا نہ تھا۔ اب اس حرج کی ناگواری کا قلب پر اثر ہوتا۔ اور راوی پر غصہ آتا۔ تو یہ تمام تر پریشانیاں اس بات کی بدولت ہوتیں کہ بلا تحقیق ایک بات کہہ دی تھی۔ اس کی ہمیشہ احتیاط رکھنی چاہیئے۔"

جس سے ظاہر ہے کہ حضرت کتنی دلسوزی سے ذرا ذرا سی بات سے سمجھانے کے لئے کتنے اہم نکات پیدا فرماتے تھے۔

سبق آموزی ایک طالب علم نے مدرسہ ہی میں ایک دفعہ میں کپڑے کی ضرورت دکھلا کر دوسرے طالب علم کے ہاتھ بھیجا۔ حضرت نے درخواست کنندہ کو بلا کر اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ کوئی کام نکل آیا تھا۔ اسلئے دوسرے کے ہاتھ بھیجا۔ اس پر فہمائش کی کہ ایک تو اس میں قلتِ ادب ہے کہ باوجود ہر وقت ایک جگہ رہنے کے محض بہ سبب ایک کام نکل آنے کے نہ کہ بہ سبب

. . . . خجالت و حیا کے ڈر کہ وہ بھی ایک درجہ میں عار ہوتا ہے، خود آکر استدعا نہیں کی۔ دوسرے کے ہاتھ پیغام بھیجا۔ جو کہ مساوات کے درجہ میں ہوتا ہے۔ دوسرے اس میں بے رغبتی کی صورت ہے کہ بیگار سی ٹال دی۔ تیسرے اس میں دوسرے سے خدمت لینا ہے۔ ابھی سے مخدومیت سیکھتے ہو۔ اور یہ بھی کہا کہ اس بے تمیزی کی سزا یہ ہے کہ چار روز کے لئے یہ درخواست واپس کرتا ہوں۔ پھر اپنے ہاتھ سے دینا۔ چنانچہ چوتھے روز پھر اس نے اپنے ہاتھ سے درخواست دی۔ جو حضرت نے خوشی سے منظور فرمالی۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت تھانوی اصلاحی سبق اس انداز سے دیتے تھے کہ وہ ہمیشہ کے لئے دل پہ نقش ہو کر رہ جاتا تھا۔

وسعت و ندارت

متذکرہ بالا مختلف النوع مثالوں سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت تھانوی کا اصلاح معاشرت کا نظام کتنا وسیع اور کتنا عجیب تھا کیونکہ

الف۔ اس محبوب خلائق کو روزانہ مختلف المزاج اور مختلف الخیال لوگوں سے کسی نہ کسی سلسلہ میں ضرور واسطہ پڑتا تھا۔ ہر ایک سے کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہو جاتی جو کتاب و سنت یا اخلاق و آداب کے معیار پر پوری نہ اترتی۔ جس کی وجہ سے حضرت کو تنبیہ و فہمائش کرنی پڑتی اور یہ سلسلہ اخیر وقت تک جاری رہا۔

ب۔ چونکہ ایسے مواقع اصلاح اتفاقی طور پر پیدا ہوتے تھے اور ایسے افراد کو اُسی وقت بمصداق قصہ زمین برسر زمین۔ تعلیم اصلاح دینی لازمی اور مفید ہوتی تھی۔ اسلئے حضرت تھانوی غور و فکر کے لئے وقت نکالے بغیر بلا تامل اور فی الفور انہیں ٹوکتے۔ اور اسی وقت تنقیح قائم کر کے اس کے جملہ مضرات و مفاسد اس انداز سے بیان فرما دیتے کہ وہ کالنقش فی الحجر ہو جاتے۔

ج۔ وعظ و تقریر سے اگرچہ انسان اچھا اثر لیتا ہے۔ مگر وہ اتنا دیرپا نہیں ہوتا۔ جتنا اس طریق اصلاح کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ہر شخص کے ظاہری و باطنی حالات عین مشاہدہ میں آجاتے ہیں جس سے نہ صرف معالج کو علاج کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ بلکہ مریض کو بھی معتدبہ فائدہ ہوتا ہے۔ جو کسی دوسرے طریق سے ممکن نہیں۔

اسی لئے حضرت تھانوی لوگوں کو ان کی درخواست پر سفر و حضر میں دوسرے مشائخ کی طرح فی الفور بیعت نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"جو اعتقاد محض وعظ سن کر پیدا ہوا ہو۔ وہ معتبر نہیں۔ کیونکہ وعظ میں تو اچھی اچھی باتیں

کہی جاتی ہیں۔ اعتقاد وہ معتبر ہے۔ جو روزمرہ کے افعال و عادات دیکھنے کے بعد پیدا ہو۔ اور ان کا کما حقہٗ مشاہدہ معتقد فیہ کے مستقل جا ئے قیام پر ہو سکتا ہے جس کو بیعت کا شوق ہو وہ میرے وطن میں آئے تاکہ جانبین کو ایک دوسرے کی جانچ کا اطمینان سے موقع مل سکے۔ نیز اس سے طلب کا امتحان بھی ہو جائیگا۔ غرض امر بیعت میں ہرگز عجلت نہ چاہیئے۔ یہ گاجر مولی کی بیع نہیں کہ پیسہ ڈالا اور جھٹ خرید لی"

حُسن

تقسیم قدرت حق تعالیٰ کے انعامات کی تقسیم بدوں حکمت و مصلحت نہیں ہوتی۔ وہ جسے جس انعام کا مستحق سمجھتا ہے اسے وہی عطا کرتا ہے۔ کسی کو علم عطا کرتا ہے۔ کسی کو حلم۔ کسی کو جمال دیتا ہے۔ کسی کو جلال اور کسی کو کمال۔ کسی کو ان ساری خوبیوں سے محروم رکھتا ہے اور کسی میں یہ ساری خوبیاں جمع کر دیتا ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشا۔

ان خوبیوں کے خالق نے مولانا اشرف علی تھانوی کو صرف نام کا ہی اشرف بنا کر نہ بھیجا تھا۔ بلکہ انہیں صفات حسنہ میں بھی اشرف بنا دیا تھا۔ جن میں سے بعض کی تجلیات آپ گذشتہ اوراق میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اور بعض اس باب کی مناسبت سے درج ذیل کی جاتی ہیں۔

حسن جمال حضرت تھانویؒ کے حسن جمال کے متعلق ایک مختلف المشرب بزرگ کے مرید باتمیز نقاد و فلسفی ایڈیٹر و ڈائریکٹر مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی "پہلی ملاقات کے تاثرات" میں لکھتے ہیں کہ:-

"سن۔ لیکن خوش رو۔ نظریں نیچی۔ چال متین۔ نورانی چہرہ۔ نورانی داڑھی۔ زیادہ سفید کچھ سیاہ۔ اور شاید اسی نورانیت کی مناسبت لباس بھی خوب سفید براق۔ سر پہ نازک سی گول اکہری ٹوپی جسم پر لمبا کرتا۔ نازک و نفیس غالباً تنزیب کا۔ تاریکی ابھی کچھ باقی تھی اور ذرا فاصلہ بھی تھا۔ نگاہ سے نگاہ ملنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ کہنا چاہیئے کہ صرف جھلک ہی دیکھنے میں آئی تھی۔ اس پر بھی دلکشی۔ رعنائی۔ زیبائی بہ حیثیت مجموعی ایسی محسوس ہوئی کہ زبان نہ سہی۔ دل بے اختیار آواز سے ہی اٹھا ع

قربان یک نگاہ تو عمر دراز ما،

تاریکی میں فاصلہ سے صرف ایک جھلک میں رعنائی وزیبائی دیکھنے کے بعد وہ اپنا قریبی مشاہدہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:۔

"حضرت اپنی خاص سہ دری میں، دو میان میں شرقی غربی دیوار سے متصل ڈیسک کے سامنے ایک مسند نما فرش پر تشریف فرما ہاتھ میں تسبیح۔ ایک چھوٹی گھڑی سامنے ڈیسک پر قلمدان وغیرہ کے ساتھ رکھی ہوئی۔ دوسری بڑی گھڑی (دھوپ گھڑی کے حساب سے) دیوار میں لگی ہوئی۔ داخلہ والے در پر حضرت کا نظام نامہ اوقات لگا ہوا۔ غافل انسان کو وقت کی قیمت اور اہمیت کا سبق دینے والا۔ بائیں طرف مولانا (حسین احمد صاحب) بٹھائے گئے۔ اور اس کے بعد ہم۔"

"بیٹھنے بٹھانے سب کے آداب قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے۔ ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ۔ ہر بات میں نظم و آہنگ...... خوب باتیں ہوئیں۔ مخاطب روزنامہ "ہمدرد" کا ڈائریکٹر تھا۔ سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو آئی۔ حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہوگئیں۔"

"مولانا کی مرتب و منظم زندگی کا نظارہ پہلی بار ہوا۔ مکالمت پر شفقت نشست باوقار عام مہمانوں۔ دوستوں۔ ملنے جلنے والوں کے حق میں تو آپ خلق مجسم تھے۔ خشونت وتنگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی راحت وسہولت کے ایسے ایسے جزئیات تک کی رعایت رکھتے۔ جہاں تک خود ان کی نظر بھی نہ پہنچ سکتی۔"

"کچھ دیر بعد حضرت نے اپنے دوسرے معمولات پورے کرنے کے لئے ہم لوگوں سے رخصت چاہی۔ اس التجا اور لجاجت کے لہجہ میں کہ گویا وہ چھوٹے ہیں اور ہم لوگ بڑے۔"

"یہ ہنستا ہوا چہرہ اور مسکراتا ہوا بشرہ کسی خشک مزاج کا ہو سکتا ہے؟ کم وبیش ۱۵ سال اس منظر پر گذر چکے ہیں۔ اور معلوم ہو رہا ہے۔ بات کل کی ہے۔ دماغ پر نقش اتنا گہرا اور دل پر نا تو اتنا زبردست کم ہی ہوتا ہے۔" (حکیم الامت)

حسن جلال آپ حد درجہ شفیق ورحیم تھے۔ مگر اس شفقت ورحمت کے باوجود عوام وخواص تو کجائے خود رہے۔ بڑے بڑے ارباب علم وفضل آپ کے رعب اور ہیبت سے ڈرتے بلکہ لرزتے تھے۔ حسن کی حقیقت دو لفظوں میں صرف اتنی تھی کہ آپ ہیبت حق کے مظہر تھے مولانا

عبدالماجد دریابادی اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی ہندوستان کے چوٹی کے محققین میں سے ہیں۔ جو تحقیق و تدقیق۔ تنقید و تنقیص۔ تزدید اور تغلیط میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مگر جب یہ حضرات بھی اس صاحب تعلیم و تبلیغ کے سامنے جاتے۔ تو بس تسلیم و رضا کا مجسمہ بن جاتے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات پہلی بار جب تھانہ بھون گئے اور شرف اشرف سے باریاب ہوئے۔ تو ان پر کیا گذری اس کی کہانی خود ان کی زبانی ہی لطف دے گی۔

مولانا عبدالماجد لکھتے ہیں :-

"حضرت ہم تینوں کو لئے ہوئے صحن مسجد سے چار قدم چل کر بیٹھے۔ سہ دری کے آگے والے سائبان کے نیچے۔ جہاں سنتیں پڑھنے کا معمول تھا۔ میں اس مصلے سے کوئی دو قدم ہٹ کر بیٹھا۔ اب اخلاق و التفات ہم تینوں سے فرداً فرداً شروع ہوا۔ اشفاق و الطاف کی تفصیل اب کہاں یاد۔ اتنا یاد ہے کہ بار بار فرماتے تھے اچھی طرح بیٹھئے" "کھل کر بیٹھئے"۔ یہاں ہیبت شروع سے دل میں بیٹھی ہوئی تھی لطف و کرم کا ہر فقرہ اس کیفیت کی افراط میں اعتدال پیدا کرتا جاتا تھا۔ از خود بولنے اور کسی بات کے شروع کرنے کی ہمت بھلا کیا ہوتی۔ غنیمت یہی تھا کہ سوال کا جواب کسی طرح دیئے جاتا۔ ہونٹ خشک۔ زبان میں کچھ لکنت سی۔ رعب و ہیبت کی اس کیفیت کا تجربہ اپنی یاد میں دو ہی بار ہوا۔ ان میں پہلی بار تو یہی۔ اور دوبارہ دوسرے سال مجاہد اعظم حضرت شیخ احمد سنوسیؒ کے مواجہہ میں کہ معظمہ میں۔ ہیبت حق کا لفظ مثنوی کے اس شعر میں عمر فاروقؓ کی ذات پاک کے سلسلہ میں نظر سے گذر چکا تھا ؎

ہیبت حق ست ایں از خلق نیست

ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست

ہیبت حق کے معنی جو کچھ تھوڑے بہت روشن ہوئے۔ وہ ان ہی دونوں موقعوں پر"۔

(حکیم الامت صفحہ ۱۹)

مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلمبند کئے :-

"دیوبند و تھانہ بھون میں حاضری ہوئی۔ تھانہ بھون کا حال کیا عرض کروں۔ رات کو ۱۱ بجے پہنچا۔ ایک دوسری مسجد میں اترا۔ صبح بعد نماز اُس پیر محبوب کے آگے آیا جو یہ ابن تیمیہ حنت اپنے ہر ہر انداز میں صرف مظہر جمال تھا۔ عنایتوں کا عجیب و غریب سلسلہ

آخر تک جاری رہا۔ بڑی بڑی مہربانیاں۔ بڑی بڑی سرفرازیاں رہیں۔ کچھ علمی وقرآنی معاملات بھی پیش پڑے۔ فرطِ ادب نے حافظہ خراب کردیا۔ بولنا چاہتا تھا۔ گر نہ بولا گیا۔ پھر بھی کچھ تو پوچھ ہی لیا۔" (حکیم الامت صــ۴۰۹)

حضرت تھانویؒ کی نظر سے جب ان کا یہ تاثر گذرا۔ تو آپ نے اس پر حاشیہ لکھا کہ:۔

"وہ ایک بات لکھنا بھول گئے۔ وہ سب سے زیادہ مزہ دار ہے۔ وہ یہ کہ میں نے ان سے چلتے وقت تعریفاً عرض کیا تھا۔ کہ اب امید ہے کہ بھوت کا ڈر نکل گیا ہوگا یہ اشارہ ہے اُن کے اس والہانہ ارشاد کی طرف کہ جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے"۔

یہی وہ حالات تھے جنہوں نے مولانا دریا بادی جیسے فلسفی کو یہ کہنے پر مجبور کردیا کہ:۔

"مصرعہ سنا ہوا اہزاد مرتبہ کا تھا "شنیدہ" اور "دیدہ" کے درمیان فرق کا درجہ اب بالکل واضح ہوا۔ رعب وہیبت کی کیفیات میں اب خاصہ فرق آگیا تھا۔ اولہ حاضری کے بعد معلوم ہوگیا تھا کہ مولانا محض نور کے بنے ہوئے۔ اور تقدس کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے۔ کروبیوں میں نہیں۔ آب وگل سے ترکیب پائے ہوئے۔ انسانی دل بشری جذبات رکھنے والے انسان ہیں۔ بالمومنین رؤف رحیم کے سچے جانشین۔ ضرورت کے وقت اور مصلحت کے ماتحت جتنے بھی سخت اور سخت گیر ہوجائیں لیکن اپنی عام طینت وخلقت کے لحاظ سے رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کے مصداق ہیں .... حاضری ہوئی تھی عظمت وعقیدت کے جذبۂ بے پناہ کے ساتھ۔ واپسی ہوئی۔ تو اس ذخیرہ میں ذرہ بھر کمی کے بغیر محبت کے عنصر کی آمیزش کے ساتھ بشیٌ متکلم میں متکلم کی صراحت نوبہ رحمت سے کتنی لبریز اور حاویۂ شفقت کی کیسی آئینہ دار ہے"۔ (حکیم الامت صــ۲۱۴)

حسنِ قرأت

حضرت تھانویؒ کلامِ پاک کی تلاوت کے وقت لہجہ کی طرف قطعاً التفات نہ فرماتے تھے۔ بلکہ مخارج کی صحت پر متوجہ رہتے تھے۔ مگر اس کے باوجود لہجہ میں ایک ایسی کشش تھی کہ سننے والے بے حد متاثر اور محظوظ ہوتے تھے۔ اور اہلِ دل پھڑک اُٹھتے تھے اس لئے ایک ماہر فلسفی نے متاثر ہو کر یہ تجویز پیش کی تھی کہ حضرت کی قرأت کو گراموفون میں بھر لیا جائے چونکہ یہ شرعاً ناجائز تھا۔ اس لئے روک دیا گیا۔

پانی پت کے قاری دنیا میں مشہور ہیں۔ اور انہیں اپنی قرأت پر بجا طور پر ناز ہے۔ مگر جب حضرت تھانوی پانی پت تشریف لے گئے۔ تو وہاں کے قراء نے حضرت کی صحتِ مخارج کی بہت تحسین فرمائی

ایک دفعہ لکھنؤ میں صبح کی نماز حضرت نے خود پڑھائی۔ اتفاق سے اس جماعت میں لکھنؤ کے مشہور و معروف مدرسۂ قرأت کے بانی مولانا عین القضاۃ بھی کھڑے تھے صبح کی نماز میں حضرت خاص طور پر طویل قرأت کرتے تھے۔ جب مولانا نے نماز میں حضرت سے کلام پاک سنا۔ تو بس قرأت کے عاشق ہو گئے۔ اور بعد نماز حضرت سے خاص طور پر قرآن سنانے کی درخواست کی۔ اس پر حضرت ان کی خدمت میں تشریف لے گئے اور پورے تین رکوع سنا دیئے۔ تاکہ ان کا جی بھر جائے جی کیا بھرنا تھا۔ شہید قرأت ہو کر رہ گئے۔ کہنے لگے "آپ قرآن کیا پڑھتے ہیں۔ ذبح کرتے ہیں"۔ یہ آواز کی دلکشی کا اثر تھا۔ کہ طویل قیام میں بھی لوگ اکتا نہ جاتے تھے۔ بلکہ بعض رقیق القلب مقتدی پر تو شدت کے ساتھ نماز میں گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ اسی لئے مولانا دریا بادی لکھتے ہیں:-

"اس عاصی محض کو اپنی عمر میں اتفاق ہندوستان۔ عرب و مصر کے اچھے اچھے قاریوں کے سننے کا ہوا ہے۔ مشہور و غیر مشہور دونوں قسم کے۔ بعض باکمالوں کی داد بھی دل کھول کر دی ہے۔ بعض سے طبیعت متاثر بھی بہت ہوئی ہے۔ لیکن اس درجہ مؤثر لہجہ۔ اتنے خوبصورت۔ لہل۔ شاید ہی کبھی کسی کے سننے میں آئے ہوں۔ ہر لفظ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سانچے میں ڈھلا ہوا نکل رہا ہے۔ اور پھر سادہ و بے تکلف۔ کہیں سے شبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ کہ کوئی شخص فن کے قواعد کے لحاظ سے ادا کر رہا ہے۔ صاف یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ قدرتی لہجہ اور طبعی لحن ہے۔ نماز کے طویل قیام میں میں بڑا کچا اور بودا ہوں یہ قرأت اشرفی کا اعجاز تھا۔ کہ طویل قرأت سے بھی جی اکتا نا کیسا۔ جی یہی چاہنے لگا کہ ابھی اور سنتے جایئے۔ ادھر قرأت ختم ہوتی جاتی تھی۔ اور ادھر حسرت باقی رہتی جاتی تھی"۔

(حکیم الامت صـ۱۶)

ایک مقام پر جہاں اہل نظر جمع تھے۔ حضرت نے صبح کی نماز پڑھائی۔ تو ایک صاحب کہنے لگے کہ:-

"موسیقی کے قاعدہ سے آپ کی قرأت میں بھیرویں کی کیفیت تھی۔ جو صبح کی ایک سہاگنی راگنی کا نام ہے"۔

(آثار جامعیت از سید سلیمان ندوی)

حسن اخلاص

حق تعالے کا ارشاد ہے کہ جو کوئی میری رضا جوئی کے لئے نیک کام کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تو میں اسے اجر عظیم دیتا ہوں۔ اور مومن کا معاون ہوتا ہوں۔ یہ اجر و امداد دنیا میں "از دل خیزد و بر دل ریزد" کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ کہ حق تعالے اپنے مخلص اور مومن بندوں کے کلام میں اثر و تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے دوسرے فی الفور متاثر ہوتے ہیں۔ بخلاف اسکے

جو لوگ محض ذاتی اغراض کے لئے ایسے کام کرتے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر مدلل ہونے کے باوجود بے اثر ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی کے مواعظ حسنہ کے نتائج کو اگر جمع کیا جائے۔ تو ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ بڑے بڑے منکر، ملحد، فاسق۔ ناجی ہمیشہ کے لئے طالب مولیٰ اور تائب و تارکِ معاصی ہو گئے۔ ان کی ہدایت کا باعث صرف اس مردِ مومن کا اخلاص تھا جس نے اپنا دستور العمل بنا رکھا تھا کہ:۔

"جب میں کسی کو کچھ نصیحت کرتا ہوں۔ تو میں دل سے چاہا کرتا ہوں کہ یہ ایسا ہی ہو جائے۔"

حسنِ استدلال پھر جہاں اخلاص کے ساتھ قوتِ استدلال بھی موجود ہو۔ تو وہ سونے پر سہاگہ کا اثر کرتی ہے۔ حق تعالےٰ نے حضرت تھانوی کو دولتِ اخلاص کے ساتھ قوتِ استدلال بھی بخشی تھی کہ وہ اس کے ذریعہ مخالف کو موافق بنا لیتے تھے۔ یا کم از کم وہ مخالفت سے باز آجاتا تھا۔ یا اپنی غلطی کا احساس کر لیتا تھا یا شرمندہ ہو جاتا تھا۔

متحدہ ہندوستان میں شملہ اختیار و اقتدار اور امارت و ثروت کا مرکز رہا ہے۔ نشہ اقتدار کی وجہ سے ان میں سے اکثر تعلیم جدید اور نشۂ اقتدار کے اثر سے علماء کرام کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ بلکہ ان کی تضحیک کرنے سے بھی باز نہ آتے تھے۔

ایک مرتبہ چند علماء دیوبند شملہ تشریف لے گئے۔ بعض مخلصین نے ان حضرات سے وعظ کی فرمائش کی۔ ان میں حضرت مولانا انور شاہ رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت تھانوی بھی موجود تھے۔ حضرت شاہ صاحب سے "اعجاز قرآن" پر تقریر کرنے کی فرمائش کی گئی۔ اُدھر علمی مضمون اِدھر شاہ صاحب کا تبحر۔ ایسے دقیق مضامین بیان فرمائے۔ جو نو تعلیم یافتہ حضرات کی سمجھ میں نہ آسکے۔ حضرت شاہ صاحب کی تقریر کے بعد ان نافہموں نے اعتراض کیا کہ:۔

"مولانا کو یہاں تشریف لانے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ مدرسہ دیوبند ہی میں بیٹھ کر علماء کے سامنے کیوں نہ وعظ کہہ لیا۔"

ان کا یہ تبصرہ کسی طرح حضرت تھانوی کے کان میں بھی جا پہنچا۔ دوسرے وقت میں حضرت تھانوی کی باری تھی۔ جو مخالف کے قول سے استدلال کرنے میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تقریر میں اس اعتراض کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"یہ اعتراض ہی لغو ہے۔ آپ لوگ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ مضمون ہی آپ

نے ایسا دیا تھا۔ جو علمی تھا۔ اور جس کو اتنا سہل نہیں کیا جا سکتا تھا کہ سب سمجھ سکیں اور جتنا سہل کیا جا سکتا تھا۔ اتنا بھی قصداً نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اس میں ایک بڑی مصلحت تھی۔ یہاں یہ بھی دکھانا تھا کہ جب آپ علمار کے اردو کلام کو بھی نہیں سمجھ سکتے تو قرآن و حدیث کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ اور ان سے مسائل مستنبط کرنا تو بڑی بات ہے اب تو آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ امور دینیہ میں رائے زنی کرنے کے آپ صاحبان ہرگز اہل نہیں"

حسنِ اعتدال اس عنوان کے تحت سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا ایک مضمون تبرکاً شامل کیا جاتا ہے جس کا ذکر دیباچہ میں آچکا ہے۔

"افراط و تفریط سے ہٹ کر جس مسئلہ میں بھی زندگی کے جس شعبہ میں بھی آپ اعتدالی روش اختیار کریں گے۔ اچانک معلوم ہوگا۔ کہ آپ تنہا رہ گئے۔ اور آپ کے ساتھ کوئی باقی نہ رہا۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ اکثریت عموماً نقطہ اعتدال سے ہٹ کر انحرافی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں اعتدال پر قائم رہنے والوں کے ساتھ کوئی نہ ہو۔ یا ہوں تو تھوڑے سے بہت آدمی ہوں تعجب کی بات نہ ہوگی۔ آج کتنے ہیں۔ جو حکیم الامت قدس سرہٗ سے عقیدت رکھتے ہیں لیکن مولانا کی طبیعت کا جو رنگ تھا۔ ذیل کی چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) عام طور پہ سمجھا جاتا ہے کہ مولانا ضوابط و قوانین کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے جن لوگوں کے مزاج میں سختی ہے۔ اپنی سختیوں میں ہمیشہ وہ مولانا کے اسی اصول سے تسلی حاصل کرتے ہیں۔ خیال یہ کر لیا گیا ہے کہ رعایت کا مولانا کی فطرت میں کوئی عنصر نہ تھا۔ مگر یہ تو لوگوں نے سمجھا ہے۔ خود مولانا کا حال یہ تھا کہ آپ کی مجلس مبارک میں کبھی ادھر ادھر کی خبروں کا ذکر لوگ چھیڑ دیتے۔ بعض سختی پسندوں نے عرض کیا کہ حضرت کی مجلس اس قسم کی چیزوں کا تذکرہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی کہا کہ بعضوں کو اس پر اعتراض بھی ہے کہ مشائخ اور صوفیہ کی مجلسوں میں حقائق و معارف کے سوا ادھر ادھر کی عام خبروں کا تذکرہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا نے فرمایا:۔

"کوئی میرے پاس آکر بات کرے اور میں منہ موڑ لوں تو اس کو صدمہ نہ ہوگا"

پھر اپنی معتدل فطرت کے فطری مذاق کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:۔

"زائد از کار باتوں کی برائی میرے نزدیک دل شکنی سے کم ہے" (کمالاتِ اشرفیہ ص۲۰)

یہ آخری الفاظ مولانا تھانوی ہی کے ہو سکتے ہیں۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ ان کو قریب سے دیکھنے والے بھی تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ جائیں گے۔ مگر کیا کیجئے کہ یہی واقعہ ہے۔ لوگ اس کا خیال نہیں کرتے کہ خود اعدل خلق اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ عمل اس باب میں کیا تھا۔ معمولی بڑھیا ہاتھ پکڑ کر دیر تک اپنی غیر ضروری باتوں میں مشغول رکھتی۔ اور آپ ہنستے رہتے۔ کیا صحیح حدیثوں میں یہ نہیں آیا ہے۔ مولانا ہی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہ مذاق تھا کہ ملنے والے جب تک بیٹھے رہتے۔ ان سے گفتگو کرتے رہتے۔ مقصود یہی تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے۔ تو بے رخی کا احساس دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جو عموماً موجب دل شکنی بن جاتا ہے۔ مجلس نبوی کی خصوصیت صحابہ کرام کیا بیان کرتے تھے۔

یضحك ما یضحکون ویتعجب مما یتعجبون۔ — لوگ جن باتوں پہ ہنستے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ان پر ہنستے۔ جن باتوں پر لوگ تعجب کرتے۔ آپ بھی تعجب فرماتے۔

دل شکنی ہی کا خیال تو تھا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معانقہ کرنے والے کا ہاتھ خود نہیں چھوڑتے جب تک کہ وہی نہ چھوڑتا۔ کسی سے رخ نہ پھیرتے۔ جب تک وہی نہ پھیر لیتا۔ خود حکیم الامۃ قدس سرہ اپنا ایک خواب بیان فرماتے تھے کہ ملکہ وکٹوریہ جس زمانہ میں زندہ تھی۔ آپ نے خواب میں اس کو دیکھا۔ ایک ایسی گاڑی پر جس میں نہ گھوڑے ہیں۔ اور نہ آگ نظر آتی تھی (موٹر کار اس وقت تک ایجاد نہیں ہوئی تھی) بہرحال خواب میں معلوم ہوا کہ ملکہ مولانا سے کہہ رہی ہے کہ اسلام ہی حق مذہب مجھے معلوم ہوتا ہے۔ البتہ ایک شبہ مجھے ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام مذاق لوگوں سے کیوں کرتے تھے۔ نبوت تو بڑی چیز ہے۔ عام تہذیب میں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا خواب ہی میں حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے ملکہ سے کہا کہ لوگوں کو مانوس بنانا مقصود تھا۔ ورنہ آپ کے رعب کی وجہ سے لوگ کھل کر آپ سے دل کی باتیں نہیں کہہ سکتے تھے۔ ملکہ یہ جواب سن کر مطمئن ہوگئی۔ دیکھا آپ نے مولانا کی نظر کہاں پہنچی۔ بیداری میں نہیں۔ خواب میں بھی دماغ وہیں پہنچا تھا۔ جہاں اس کو پہنچنا چاہیئے۔

۲۔ عام طور پر مولانا کے جس مذاق کو لوگوں نے مشہور کیا ہے۔ اس کے حساب سے آپ ہی بتایئے کہ اس سوال کا جواب یعنی ایک داڑھی منڈانے والے کے ساتھ لڑکی کا رشتہ کر دوں یا نہ کروں۔ ایک صاحب نے یہ لکھتے ہوئے سوال کیا کہ داڑھی والے جو ملتے ہیں۔ تو دال روٹی کا ان کے یہاں

اطمینان نہیں اور جہاں اس کی تھوڑی بہت امید ہے۔ وہاں خرابی یہ ہے کہ ڈاڑھی منڈانے والے لڑکے ملتے ہیں۔ مولینا کے مذاق شناسی کے مدعی خود سوچیں کہ اس کا وہ کیا جواب دیں گے۔ مگر سنئے مولینا نے کیا جواب دیا:۔

"میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں پوری دینداری ڈاڑھی والوں میں بھی نہیں۔ پس ایک ڈاڑھی منڈانے کا گناہ کر رہا ہے۔ دوسرا شہوت پرستی کا گناہ کر رہا ہے۔ تو نری ڈاڑھی لے کر کیا کریں گے۔" (کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۳۳۹)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے بڑے نکتے کی طرف اس میں اشارہ فرمایا ہے۔ لوگوں نے خاص خاص گناہوں کو پکڑ لیا ہے۔ گویا گنہگار ہونے نہ ہونے کا معیار بس صرف وہی ہے۔ ان ہی گناہوں میں ایک ڈاڑھی بھی ہے۔ ایک شخص غیبت کرتا ہے۔ بدنظر ہے۔ امرد پرست ہے۔ لیکن لمبی ڈاڑھی رکھتا ہے۔ اس پر لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اور ایک بے چارہ ان عیوب سے بری ہے، صرف ڈاڑھی منڈانے کا گناہ کرتا ہے۔ تو سمجھا جاتا ہے کہ ڈاڑھی والے صاحب سے اس ڈاڑھی منڈے کو کیا نسبت؟ ڈاڑھی والوں کے گناہ کیا اس سے کم ہیں؟ پھر ایک ڈاڑھی پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ مولانا نے صحیح فرمایا ہے کہ ڈاڑھی منڈانے کے سوا اور باتیں اگر لڑکے میں اچھی ہوں تو اس کو گوارا کر لیا جائے۔ بلکہ اس برتاؤ سے اغلب ہے کہ ڈاڑھی کا مسئلہ بھی اس کی سمجھ میں آجائیگا۔ ورنہ جو طریقہ لوگوں نے ڈاڑھی کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ منڈانے والوں کی ضد کو اس طریقہ سے اور بڑھا رہا ہے۔

۲۔ مولینا چونکہ خود مولوی تھے۔ اسلئے مولویوں کا خیال ہوگا کہ انگریزی تعلیم یافتوں پر ضرور وہ مولویوں کو ترجیح دیتے ہوں گے۔ اور اس میں شک نہیں کہ عربی خوان مولویوں کا مولینا خاص طور پر احترام فرمایا کرتے تھے۔ مگر ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ انگریزی دانوں میں اور جتنی باتیں بھی ہوں۔ لیکن

"ان کی گفتگو میں مزہ آتا ہے۔ کیونکہ یہ سمجھ میں آنے سے مان لیتے ہیں"۔ (کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۲۲۹)

لیکن مولویوں کے اس طریقہ کو کہ جو بات منہ سے نکل گئی۔ اس کی پچ نکالتے چلے جاتے ہیں سخت ناپسند فرماتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا فقرہ "اڑیل ٹٹو" بھی اس قسم کے مولویوں کے متعلق نقل فرمایا اور کہا کہ "جمود و اصرار بڑی چیز ہے"۔ پھر حکمت کی بات یہ فرمائی کہ غلطی پر اصرار آدمی کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کر دیتا ہے۔ لوگ اس شخص کی تعریف کرتے ہیں جو اپنی غلطیاں مان لیتا ہے

ہو۔ اور انگریزی خواں بے چارے تو بہرحال مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ اسلامی گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ غیر مذاہب کے لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ کیا تھا۔ اس قصے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ جب اعظم گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ راستہ میں کسی سکول کے سامنے سے گذر ہوا۔ جہاں زیادہ تر ہندو اساتذہ تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے گذرتا دیکھ کر سارے ہندو اساتذہ اور طلبہ بھی تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس حال کو دیکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

"میں وہاں رکا۔ اور ان سب سے ملا۔ لوگوں سے میں نے مصافحے کئے"۔

پھر خصوصیت کے ساتھ ارشاد ہوا کہ:۔

"ایک ایک سے ملا حتیٰ کہ ہندوؤں سے بھی اور مزاج پرسی کی" (کمالات اشرفیہ ص۲۷۵)

آپ کو معلوم ہوا کہ مولویوں کا عام قاعدہ ہے کہ اس مدرسہ کے سامنے سے جب گزرتے ہیں۔ تو جیسے حضرت کے ساتھ مدرسہ والوں نے برتاؤ کیا تھا۔ ایسی برتاؤ کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ تو عام طور پر مولوی لوگ ان ہندوؤں کی طرف متوجہ ہونا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ تو حضرت نے اس تنگ دل ملا کا ذکر کیا جس کے وعظ میں ایک غیر مذہب کا آدمی جو شاید ہندو ہی تھا۔ شریک ہو گیا تھا مجلس میں ہندو کو دیکھ کر ملا صاحب آپے سے باہر ہو گئے گرجنے لگے کہ "نکالو اس کافر مردود کو" (ص۳۷۷)

۵۔ بعض خاص نوعیت کے مسائل کے متعلق مشہور کر دیا گیا ہے کہ دیوبند کی طرف منسوب ہونے والے علماء کا ان مسائل میں یہ خیال ہے۔ حتیٰ کہ بے جانے بھی لوگ سمجھ جاتے ہیں۔ کہ دیوبندی مولوی اس کا یہ جواب دے گا۔ مثلاً یہ سوال کہ "یا رسول اللہ" کے کہنے کا مسلمانوں میں عام رواج جو پایا جاتا ہے۔ دیوبندی مولوی اس کو کبھی جائز نہیں کہہ سکتا۔ مگر سنئے، دیوبندیوں کے پیشوا کا کیا خیال تھا۔ فرمایا کہ:۔

"شوقاً والتذاذاً ماذون فیہ ہے" (کمالات ص۵)

یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے قلوب کا جو اشتیاقی تعلق ہے۔ اس تعلق کا اظہار یا رسول اللہ سے کوئی اگر کرتا ہو یا۔ یا رسول اللہ کہنے میں اس کو لذت ملتی ہو۔ تو مولانا ایسی صورت میں "یا رسول اللہ" کہنے کی اجازت دیتے تھے۔ البتہ استعانۃً و استغاثۃً فرمایا کہ جائز نہ ہوگا۔

ایسے سینکڑوں مسائل اور امور ہیں۔ جن کے متعلق لوگوں کے عام خیالات اور توقعات کے قطعاً مخالف چیزیں مولانا کے کلام میں ملتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان چیزوں کو قائم کیا جائے غلط فہمیوں کے ازالہ کے سوا خود مولانا کے عقیدت مندوں کے بہت سے غلط خیالات کی اس سلسلہ

سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں ۔ اصلاح ہو سکتی ہے ۔
افسوس کہ مولینا کی زندگی کے بہت سے گوشے جب تک زندہ رہے ۔ غایت اخفاء کی وجہ سے پوشیدہ رہے ۔ خیال تو کیجئے ۔ آج ہندوستان کے سب سے بڑے مہاتما کا یہ کمال سمجھا جاتا ہے کہ دلی کی "بھنگی بستی" میں آکر ٹھہرتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ جس قوم میں تاریخ کے نامعلوم زمانے سے "چھوت چھات یا لامساسیت" کا عارضہ پھیلا ہو ۔ اس قوم کو بھنگیوں کی بستی میں بلوانا اور پوجا پاٹ میں ان کو شریک کرانا ہے بڑا کمال ۔ لیکن اس کمال میں اس سے نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے ۔ اور اس سے بھی گہری بات وہ ہے ۔ جس کی طرف امام غزالیؒ نے لباس کی بحث میں اشارہ کیا ہے کہ نمائش صرف اچھے کپڑوں ہی کے پہننے میں نہیں ہے ۔ بلکہ اس سے بھی بڑی ریاکاری یہ ہے کہ پھٹے پرانے گودڑ اور پیوند در پیوند لگے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا مقید کر دیا جائے کہ جب تک وہ نہ ملیں کپڑے ہی نہیں پہنیں گے ۔ اسی طرح یہ ضد کہ اتروں گا تو بھنگیوں ہی کی بستی میں اتروں گا ۔ مجھے تو نہیں بھی بجائے بڑائی کے کچھ اس قسم کی بات نظر آتی ہے ۔ جو عموماً چھوٹے لوگوں میں پائی جاتی ہے ۔ آخر آپ اس شخص کو کیا کہیں گے ۔ جس نے التزام کر لیا ہو کہ کھاؤں گا تو جو ہی کی روٹی کھاؤں گا ۔ قورمہ اور پلاؤ پر اصرار کرنے والوں میں اور اس جو کی روٹی میں اپنی غذا کو منحصر کرنے والوں میں کیا فرق ہے ۔

خیر! دوسروں سے مجھے کیا بحث! ا میں تو مولانا کے متعلق عرض کر رہا تھا ۔ خود ہی فرماتے تھے کہ میرے بھائی اکبر علی نے مجھ سے ایک دن کہا کہ اب تمہارا شمار ہندوستان کے بڑے آدمیوں میں ہے ۔ اسلئے چاہیئے کہ سفر کم از کم سیکنڈ کلاس میں کیا کرو ۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے اس مشورہ کو سن کر میں نے عرض کیا :-

"کیا کروں ۔ میری طبیعت کے خلاف ہے ۔ میں ریل میں گنواروں اور بھنگی چماروں کے ساتھ بیٹھتا ہوں ۔"
(کمالات ص۲۷۵)

اسی طرح آج عام انسانی ہمدردی کا دنیا میں کتنا چرچا ہے ۔ لیکن مولانا نے خود اپنا حصہ جو یہ بیان کیا ہے کہ بہار پور گیا ہوا تھا ۔ گرمی سخت تھی ۔ جیل خانے کے قیدیوں کو پنکھا کھینچنے کے لئے بلایا گیا ۔ مولانا فرماتے ہیں کہ پہلے یہی بات مجھے ناگوار ہوئی ۔ اور چاہا کہ ان کو واپس کر دوں ۔ لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا ۔ کہ جیل کی زندگی سے ان بے چاروں کو تھوڑی دیر کے لئے

اس ذریعہ سے رہائی تو مل جاتی ہے۔ یہ سوچ کر واپس کر دینے کا خیال تو دل سے نکال دیا تھا کرتا رہا جب سب لوگ چلے گئے۔ تو میں نے ان قیدیوں سے کہا کہ :-

"پنکھا بند کر دو۔ پھر جی چاہے سو رہو۔ یا بیٹھے رہو۔ کیونکہ بیگار لینا جائز نہیں"۔

فرمایا کہ

"کھانا آیا۔ تو ان قیدیوں کو کھانا دلوایا۔ پھر تو ہر قیدی اس کی خواہش کرتا تھا کہ میں بلایا جاؤں"۔

حسن تاثیر جہاں اخلاص۔ استدلال۔ اعتدال موجود ہو۔ وہاں اثر و تاثیر بھی لازمی ہے جس کا اندازہ حضرت تھانوی کے مطبوعہ مواعظ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جن کو پڑھ کر لوگ اصلاح پذیر ہو رہے تھے اور آئے دن بکثرت اس امر کے حضرت کو خطوط موصول ہوتے رہتے تھے کہ مطبوعہ مواعظ کے مطالعہ سے بے حد نفع ہوا اور بالکل کایا پلٹ گئی۔ چنانچہ خود صاحب اشرف السوانح کسی زمانہ میں بڑے "اپ ٹوڈیٹ جنٹلمین" تھے۔ اپنے مشاہدہ کی بناء پر لکھتے ہیں کہ :-

"سینکڑوں انگریزی دان جو دین سے بالکل آزاد اور فیشن کے بے حد دلدادہ تھے مطالعہ مواعظ کی برکت سے پکے دیندار اور پورے مُلّا بن گئے۔ نہ کوٹ پتلون رہا۔ نہ تصویردار کمرہ رہا۔ نہ کرزن فیشن رہا۔ ایسے بہت سے حضرات کو خود احقر بھی جانتا ہے۔ جو کسی زمانہ میں سرتاپا انگریزی فیشن میں رہتے تھے۔ اور ملحدانہ عقائد رکھتے تھے۔ لیکن اتفاق سے حضرت والا کا کوئی وعظ نظر سے گذر گیا۔ تو پھر ایسا چسکا لگا کہ سینکڑوں کی تعداد میں دیکھ ڈالے۔ اور حالت کی بالکل ہی کایا پلٹ ہی ہو گئی یہاں تک کہ حضرت والا کے مجاز طریقت ہو گئے"۔

حسن تسخیر جس کی زبان فیض ترجمان میں حق تعالےٰ اثر و تاثیر رکھ دے اس سے قلوب کا مسخر ہونا لازمی امر ہے۔ حضرت تھانوی جس کسی سے بھی التفات کے ساتھ دو باتیں فرماتے اسے اپنا گرویدہ بنا لیتے۔ یہاں تک کہ غیر مذہب والوں کو بھی حضرت کی جانب بے اختیار میلان اور کشش ہوتی رہتی۔ جس کے صدہا واقعات موجود ہیں۔ کانپور میں تو محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ بعض ثقہ لوگوں کو بھی یہ شبہ ہو گیا تھا کہ حضرت کو کوئی تسخیر کا عمل آتا ہے۔ چنانچہ خانوادہ نقشبندیہ کے بطل جلیل مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی کے ایک مرید کو اس بات پر اصرار تھا کہ مولانا گنج مراد آبادی اور حضرت تھانوی کے پاس کوئی تسخیر کا عمل ہے۔ جبھی تو دلوں کی طرف ایک

دنیا کھچی چلی آتی ہے۔ وہ حضرت کے زبردست سر ہوئے کہ ہمیں بھی وہ عمل بتا دیجئے۔ حضرت تھانوی نے ہر چند انکار کیا۔ بلکہ قسم بھی کھائی کہ مجھ کو تسخیر کا کوئی عمل نہیں آتا۔ محض خدا کا فضل ہے کہ لوگوں کے دلوں میں میری محبت ڈال دی ہے لیکن ان کی تسلی نہ ہوئی۔

اسی کانپور میں ایک بہت بوڑھے دبنگ پٹھان ہزبر خاں نامی رہتے تھے۔ جن کو شہر میں بڑی وجاہت حاصل تھی۔ پہلے خود رئیس تھے اب ایک رئیس کے کارندہ تھے۔ مگر آن بان وہی تھی۔ ہر ایک کو ڈانٹ ڈپٹ لیتے تھے۔ ایک بار عشرۂ محرم میں حضرت کو "نصیحت" کرنے آئے کہ:۔

"یہاں کانپور میں شاہ سلامت اللہ صاحب کا دستور تھا۔ کہ اسی عشرہ میں شہادت نامہ پڑھا کرتے تھے۔ آپ بھی پڑھیں۔ اگر آپ نہ پڑھیں گے تو لوگوں کو بدگمانی ہوگی کہ یہ اس کے منکر ہیں۔"

حضرت نے فرمایا:۔

"یہ تشبہ بالروافض کی بنا پر ناجائز ہے۔"

اس پر وہ بگڑ کر کہنے لگے:۔

"افسوس ہے ہم تو نفع اور مصلحت کی بات بتاتے ہیں اور اس کو بھی نہیں مانا جاتا۔"

حضرت نے جواب دیا کہ:۔

"افسوس ہے جو بے علم ہیں۔ وہ بھی آج کل اہل علم کو مشورہ دینے لگے ہیں کہ ہم سے پوچھ پوچھ کر دین کے کام کیا کرو۔"

اس پر وہ خفا ہو کر چل دئے کہ اچھا ہے نہ ملتے۔ تھوڑی دور جا کر پھر لوٹے اور کہا کہ "بڑی مشکل ہے ہماری بات بھی نہیں مانتے اور اب ہم جانا چاہتے ہیں۔ تو جانے بھی نہیں دیتے۔ قدم ہی نہیں اٹھتے۔ نہ جانے کیا کر دیا۔"

انہوں نے حضرت سے معافی چاہی۔ جب معاف کرا لیا۔ تب اطمینان کے ساتھ واپس لوٹے۔

حسن تقریر وعظ و تقریر میں حضرت تھانوی اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ عام واعظوں کی طرح آپ پہلے سے کسی مضمون کو تیار کر کے نہ آتے تھے۔ بلکہ اس موقع پر حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ القا ہوتا۔ اس پر بدون تیاری، بولنا شروع کر دیتے۔ اور نہ عام واعظوں کی طرح یہ حالت تھی کہ بلا لحاظ اصل مضمون جو کچھ ذہن میں آتا گیا۔ بلا ترتیب بیان کرتے چلے گئے اور جہاں چاہا

ختم کر دیا۔ جبکہ آپ کی تقریر ایسی فصیح و بلیغ، شستہ و برجستہ اور جامع و مانع الفاظ کا مرقع ہوتی کہ سننے والے :۔

"ایسا محسوس کرتے جیسے کوئی زبردست محقق اور جید عالم نے نہایت فرصت میں اور نہایت غور و خوض کے ساتھ کسی ایک ہی خاص دقیق اور مفید علمی و عملی مضمون پر نہایت مبسوط اور مربوط جامع و مانع مقالہ تصنیف کیا ہے اور وہی پڑھ کر سنا رہا ہے۔"

تقریر میں اس درجہ روانی ہوتی کہ کوئی کتنا ہی زود نویس کیوں نہ ہو۔ اس کو لفظ بہ لفظ قلمبند کر ہی نہ سکتا۔ چنانچہ ایک صاحب کو فن مختصر نویسی کی تعلیم دلائی گئی تھی۔ تاکہ مواعظ بالفاظہا ضبط کئے جا سکیں۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لئے مولانا حکیم محمد مصطفیٰ جو حضرت کے شاگردان رشید میں سے تھے۔ حضرت کی تقاریر کے عربی میں بطور مختصر نویس نوٹ لیتے تھے اور پھر اسے اردو کا جامہ پہنا کر حضرت سے تصحیح کراتے تھے۔

بڑے بڑے زبان دانوں کو جن میں ایک بڑے شاعر اور غالب کے شاگرد بھی تھے بہ حیرت یہ کہتے سنا گیا تھا کہ :۔

"یہ الفاظ مولانا کو نہ جانے کہاں سے مل جاتے ہیں۔"

اور کانپور کے ایک وکیل صاحب سے تو نہ رہا گیا۔ اور وہ تقریر کے بعد وفور جوش سے ان الفاظ میں حضرت سے مخاطب ہوئے ؎

تو مکمل از کمال کیستی　　　تو منور از جمال کیستی

حضرت نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ :۔

"میرے بھی جی میں تو آیا تھا۔ کہ اس کے جواب میں یہ کہہ دوں ؎

من مکمل از کمال حاجیم　　　من منور از جمال حاجیم

لیکن شرم آئی کہ کیوں خواہ مخواہ کمال اور جمال کا دعویٰ کروں۔"

حسن تحریر

حضرت تھانوی کو حق تعالیٰ نے ایسی قوت بیانیہ عطا فرمائی تھی کہ آپ کی نثر بھی بسا اوقات نظم کا لطف دیتی تھی۔ جس کے چند نمونے درج ذیل ہیں :

ا۔ جن کے دوسرے بار میرے ذمہ ہیں۔ یعنی اصلاح و تربیت وغیرہ۔ ان کا یہ فعل بار میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اور جن کا کوئی بار ہی نہیں۔ ان کا بار بار ایسا کرنا بھی بار نہیں اور

اس لطافت کے ساتھ تو اہل بار کا بھی بار نہیں رہتا۔ اور آپ تو اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔"

۲۔ آپ کے اس لطف سے مجھ کو لطف ہوا اور اس لطف میں یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ ....

کے اس لطف کو باقی رکھے اور اس بقا کی شرائط میں سے عدم سوال بھی ہے۔ اسی میں علاوہ لطف کے تعب کی بھی کمی ہے۔ متکلم کو بھی۔ مخاطب کو بھی۔

تین سطروں میں "بار" اور "لطف" کے بار بار کے استعمال نے ثقالت سے زیادہ لطافت پیدا کر دی ہے

۳۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنے ایک خواب کو سات سطروں میں ختم کیا جو اپنے جامع و مانع طرز تحریر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان سات سطروں کا جواب حضرت نے پانچ لفظوں میں بالکل شاعرانہ انداز میں دیا کہ

"مبارک! زیارت بھی۔ استفادہ بھی۔ حیرت بھی۔ معرفت بھی۔"

بچی کی صحت کی اطلاع پر انہیں تحریر فرماتے ہیں:۔

"مبارک! مجھ کو اس وقت تین خوشیاں ہیں۔ بچی کی صحت کی۔ آپ کی طمانیت کی۔ گھر میں کی جمعیت کی۔"

۴۔ ایک اور خط کے جواب میں انہیں لکھتے ہیں:۔

"اگر یہی طرز رہا۔ تو دیکھنے والے پر زیادہ تعب ہو گا۔ جس کا شاید کوئی متحمل نہ ہو سکے بعض کم فرصتی کے سبب۔ بعض کم ہمتی کے سبب۔"

اس (کام) کی واقعی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ کام ایسا ہو گا کہ قیامت تک امت آپ کی منت کش اور یہ کوشش آپ کے لئے جنت کش ہو گی۔"

۵۔ ایک اور خط کا جواب یوں دیتے ہیں:۔

"انتظار تو اسی کا تھا۔ مگر اس سے یاس تھا۔ اسی لئے اس کا پاس نہیں کیا۔"

۶۔ "مجھ کو تو حظ ہوتا ہے اور بد دل اتنی بیباکی کے بحث کی بیباقی نہیں ہوتی۔"

غرضیکہ حضرت کی تصنیفات و تالیفات۔ مواعظ و مضامین اور ملفوظات و مکتوبات کے بحر بے پایاں میں ایسے گہر ہائے سخن اتنی فراوانی سے بکھرے نظر آتے ہیں کہ جو بھی چاہے بلا دقت دامن تصنیف بھر لے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک پرانے بزرگ شاعر حضرت کے مطبوعہ مواعظ کے لطیف مضامین سن کر صاحب اشرف السوانح سے فرمانے لگے:۔

"مولیٰنا تو نثر میں نظم کا لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ گویا نثر میں شعر فرماتے ہیں۔"
نیز حضرت کی تحریر میں ایک یہ خوبی بھی تھی کہ وہ جگہ کم گھیرتی تھی۔ اور پھر صاف پڑھی جاتی تھی۔ آپ نے ۲ فروری ۱۹۴۳ء کو مولانا عبدالماجد صاحب کے نام ایک جوابی کارڈ روانہ فرمایا۔ اس کارڈ کے ایک رخ پر حسب ذیل مضمون نہایت خوبصورتی کے ساتھ سمایا ہوا تھا:۔

"مکرمی دام لطفہم و عرفانہم
السلام علیکم۔ محبت نامہ نے محبت کا ممنون اور ناقیب (مرشد۔ محقق۔ مفسر۔ عارف) سے بے حد خجل فرمایا۔ میں بے تکلف اپنے لئے ایک لقب جس میں نہ تواضع ہے نہ ترفع۔ خود تجویز کرتا ہوں۔ یعنی مؤلف تھانوی۔ اگر سب جگہ یہی بدل دیا جائے۔ تو اس سے بھی ممنون ہوں۔ ورنہ ہمیشہ کے لئے آنکھ اونچی نہ ہو گی۔

صلاح کار کجا و من خراب کجا

باقی مناجات مقبول کے متعلق جو کلمات اس کے امتیاز کے تحریر فرمائے ہیں۔ وہ ادعیہ کے مادہ اور ترتیب کے اعتبار سے بالکل صحیح ہیں۔ مگر میرا اس میں کیا دخل۔ اس کے جو دو ماخذ ہیں حصن حصین اور حزب الاعظم یہ سب ان کے جامع کا کمال ہے۔ باقی میرا اودھیہ تو صرف اتنا ہے ؎

چو مسوش بر سر دکان رونا خوش سند

مگر جب آپ کے حسن ظن کی دولت اس کی بدولت حاصل ہوئی۔ اس لئے اس کو فال نیک سمجھوں گا۔ اور درخواست کروں گا کہ میرے حال سقیم پر اس طرح ہمیشہ توجہ رہے۔ زیادہ کیا عرض کروں۔" (حکیم الامت ص۵۹۵)

حسن تقریظ کسی غیر اختلافی مسئلہ کو خوش اسلوبی سے بیان کر دینا اتنی بڑی بات نہیں۔ جتنی اختلافی مسئلہ کو اس طرح بیان کرنا کہ اختلاف بھی ظاہر ہو جائے۔ تبلیغاً اس کی اہمیت بھی مخالف پر واضح ہو جائے۔ اور مخالف کی طبیعت بارھی محسوس نہ کرے اور حسن ظن کا پہلو بھی نمایاں رہے۔ اس میں حضرت تھانوی کو خصوصیت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تقریظ سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو آپ نے ۵ رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ کو اپنے ایک محترم پیر بھائی حضرت شیخ الاسلام مولانا انوار اللہ خان فضیلت جنگ علیہ الرحمۃ استاد نظام دکن کی سوانح حیات مسمیٰ بہ مطلع الانوار مصنفہ علامہ مفتی محمد رکن الدینؒ پر حسب درخواست ابوالخیر نظامیہ تحریر فرمائی۔ آپ نے تحریر

فرمایا کہ :-

"جستہ جستہ مطالع الانوار سے منور ہوا۔ حضرت مولانا میرے پیر بھائی تھے۔ بڑے ہونے کی حیثیت سے مجھ پر ادب لازم ہے اور بھائی ہونے کی حیثیت سے بے تکلفی کی بھی اجازت ہے۔ ان ہی دو حیثیتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ رائے ظاہر کرتا ہوں جو کہ جامع ہے۔ ادب و بے تکلفی کی کہ رسالہ قابل اسوۂ حسنہ بنانے کے ہے۔ مگر اعمال و مسائل اختلافیہ کے حصہ کا اس اتخاذ اسوہ سے استثنار رائے کے درجہ میں بعض کے لئے، اور عمل کے درجہ میں سب کے لئے، اقرب الی الاحتیاط ہے عجب نہیں اگر حضرتؒ بھی اس معروضہ پر مطلع ہوتے، تو اگر مجھ کو ماجور بھی نہ خیال فرماتے تب بھی ماذور بھی نہ سمجھتے، بلکہ معذور قرار دیتے۔ باقی حضرتؒ کے لئے اور حضرت کی تمام جماعت کے لئے دل سے اور خلوص سے دعا کرتا ہوں۔ اَللّٰهُمَّ کُنْ لَهُمْ وَاجْعَلْهُمْ لَكَ

اور اپنے لئے بھی اس دعا کا طالب ہوں۔"

حسن تفہیم مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی حضرت تھانوی کے پیر بھائی تھے۔ مگر وہ مسائل اجتہادیہ مثلاً سماع وغیرہ میں حضرت سے اختلاف رکھتے تھے۔ اور حضرت تھانوی حق بات کہنے میں کہیں بھی نہ ٹلتے تھے۔ خواہ وہ کتنے درجہ کا بھی بزرگ کیوں نہ ہو۔ مگر اختلافی مسئلہ کی اہمیت کو ذہن نشین کرانے کے لئے ہمیشہ ایسا لطیف اور متواضعانہ پیرایہ اختیار کرتے تھے کہ جس سے مخاطب پر گرانی نہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ مولانا ممدوح نے ازراہ بے تکلفی حضرت سے فرمایا کہ آپ کبھی رودولی تشریف نہیں لاتے۔ حضرت نے فوراً فرمایا کہ آپ کبھی لے ہی نہیں جاتے۔ فرمایا میں تو کہتا ہوں۔ چلیئے۔ حضرت تھانوی نے جواب دیا کہ :-

"حضرت توجہ فرما کر مجھ میں اہلیت تو سماع کی پہلے پیدا فرما دیں اور اپنا سا بنا دیں تاکہ میں بھی شرکت کا اہل ہو جاؤں۔ درحقیقت لے چلنا تو یہ ہے۔"

حسن تدبیر مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ آپ کے روحانی بزرگوں میں سے تھے جو مولانا گنگوہی کے خلیفہ اعظم تھے۔ جن کے متعلق حضرت نے ایک رسالہ "خوانِ خلیل" بھی تصنیف فرما کر شائع کیا تھا جس میں انکے خصائل حمیدہ درج تھے۔ انہیں حضرت تھانوی سے ازحد محبت تھی اور حضرت کو ان سے بے حد عقیدت تھی۔ حضرت انہیں اپنی طرف زیادہ متوجہ کرنا چاہتے تھے مگر زبانی کہنا خلافِ ادب سمجھتے تھے۔ اسلئے آپ نے اس کی ایک عجیب ترکیب نکالی جس کا "خوانِ خلیل"

میں خود ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ :-

"گاہ گاہ غریب خانہ کو بھی اپنے اقدام سے مشرف فرماتے تھے۔ مجھ کو یاد ہے کہ غالباً جب اول بار تشریف آوری ہوئی تو احقر نے جوش محبت میں کسی قدر تکلف بھی کیا اور اہل قصبہ میں سے بھی بعض عمائد کو مدعو کر دیا۔ کہ عرفاً یہ بھی معزز ضیف کا اکرام ہے۔ ان بعض عمائد نے میری اس خدمت کا یہ حق ادا کیا کہ بعد جلسہ دعوت کے مجھ کو بدنام کیا کہ طالب علم ہو کر اتنا تکلف کیا۔ پانچ چھ کھانے والوں کے سامنے بہتر یا باسٹھ برتن تھے۔ میں عدد بھول گیا۔ کہ کونسا فرمایا تھا۔ اس روایت سے قبل مجھ کو تکلف کی مقدار کی طرف التفات بھی نہ ہوا تھا) مولانا نے مزاحاً فرمایا کہ یہ تکلف کیوں کیا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کا سبب خود حضرت ہی ہیں۔ اگر کثرت کرم فرماتے تو ہرگز تکلف نہ کرتا۔ یہ تقلیل سبب ہے اس تکثیر کا۔ اس کے بعد آمد کی تکثیر ہو گئی۔ اور تکلف کی تقلیل"۔

اسی طرح ایک اور موقعہ پر حضرت تھانوی بہلی میں سوار ہو کر گنگوہ تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں ان کی نظر اپنے استاد خاص مولانا شیخ محمد پر پڑی۔ جو پیدل جا رہے تھے۔ آپ مولانا کی طبیعت سے بخوبی واقف تھے کہ اگر انہیں بہلی میں بیٹھے بیٹھے سواری کی دعوت دی۔ تو قبول نہ فرمائینگے اسلئے فوراً اوباً بہلی سے اتر آئے۔ اور عرض کیا کہ حضرت بہلی میں کافی جگہ ہے سوار ہو جائیں لیکن مولانا راضی نہ ہوئے۔ آپ اصرار کرنے کی بجائے یہ کہتے ہوئے کہ بہتر ہے جس میں راحت ہو۔ میں اصرار نہیں کرتا۔ خود بھی پیادہ پا ان کے ساتھ ہو گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ :

"یہ تو اصرار سے بھی بڑھ کر ہے۔ مجھ کو تو عادت ہے۔ تم کو پیادہ پا چلنے میں تکلیف ہوگی تم سوار ہو لو"۔

حضرت نے عرض کیا کہ :-

"حضرت یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ آپ چلیں۔ اور میں سواری پر بیٹھوں۔ میرا تو سواری پر بٹھانا آپ کے قبضہ میں ہے"۔

اس پر وہ بلا اصرار محض حضرت کی حسن تدبیر سے بہلی میں بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔

حسن تطبیق کلام الٰہی اور احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بظاہر بہت سے تشابہات و تعارضات موجود ہیں۔ ان کی تطبیق و تفہیم عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ بسا اوقات

بڑے بڑے عالم بھی ایسے مقامات پر آکر ہچکچا جاتے ہیں۔ مگر حضرت تھانوی کو ایسی مشکلات کو دفعتہً حل کر دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات بڑے بڑے عالم فاضل ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا خلیل احمدؒ کو ایسا اشکال پیش آگیا۔ مولانا مخدوم اور حضرت تھانوی میں علم و فضل کے لحاظ سے جو فرق تھا۔ اس کے متعلق خود حضرت تھانوی کا فرمان ہے کہ:۔

"میں ہر طرح چھوٹا تھا۔ عمر میں بھی، طبقہ میں بھی اور علم و عمل میں تو مجھ کو کوئی نسبت ہی نہ تھی"

اس کے باوجود مولانا نے حضرت سے دریافت فرمایا کہ:۔

"حدیث میں ہے لن یغلب اثنا عشر الفا عن قلتہ اور اس میں کوئی قید مذکور نہیں۔ تو کیا یہ مطلق ہے؟ اور ہر صورت کو شامل ہے؟ گو مقابلہ میں لاکھوں کافر ہوں۔ یا یہ کسی اور دلیل سے مقید ہے۔ اطلاق پر یہ اشکال ہے کہ بہت جگہ اس عدد سے زیادہ ہونے کی صورت میں بھی مسلمان مغلوب ہو گئے ہیں۔"

حضرت تھانوی نے فی البدیہہ فرمایا کہ:۔

"ظاہر حدیث کا تو اطلاق یہی ہے۔ اور بدون دلیل قوی کے تقیید کی کوئی وجہ نہیں۔ اور مسلمانوں کا کہیں مغلوب ہونا کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ جہاں مسلمان مغلوب ہوئے ہیں۔ سبب اس کا کوئی علت ہے نہ کہ قلت۔ اور وہ علت خواہ کوئی امر ظاہر ہو۔ جیسے ناتفاقی خواہ کوئی امر باطن ہو۔ جیسے عجب ونظر الی الاسباب وغیرہما، جیسا غزوہ حنین میں مسلمان بارہ ہزار اور کفار چار ہزار تھے (کما فی الجلالین) مگر اول میں مسلمان مغلوب ہو گئے جس کا سبب عجب بالکثرت تھا (کما فی القران المجید اذا اعجبتکم کثرتکم) پھر آخر میں وہی مغلوب غالب ہو گئے (کما قال اللہ تعالیٰ ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین وانزل جنود الم تروھا) یہ انزال سکینہ مشروط ہے زوال سبب مغلوبیت کے ساتھ وہ عجب ہے اور یہ زوال توبہ ہے۔"

حضرت تھانوی کا یہ جواب سن کر مولانا صرف مسرور ہی نہ ہوئے بلکہ اس تطبیق کو پسند بھی فرمایا۔

حسن تحقیق حضرت حافظ احمد حسین شاہ جہان پوریؒ شاہ جہان پور کے بڑے رئیس ہونے کے علاوہ صاحب سلسلہ بزرگ تھے۔ اور مستجاب الدعوات تھے ایک دفعہ ان کی بددعا سے ایک شخص دفعتہً مر گیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی اس کرامت پر خوش ہوتے ــــ ان پر خوف طاری ہو گیا کہ مبادا میری گرفت ہو جائے۔ اسلئے محقق دوراں حضرت تھانویؒ کی خدمت میں رقعہ لکھ کر پوچھا کہ مجھے

قتل کا گناہ تو نہیں۔ حضرت تھانویؒ نے انہیں لکھا کہ:۔

"اگر آپ میں قوت تصرف ہے اور بددعا کرنے کے وقت آپ نے اُس قوت سے کام لیا تھا۔ یعنی یہ خیال قصداً اور قوت سے کیا تھا۔ کہ یہ شخص مرجائے۔ تب تو قتل کا گناہ ہوا اور چونکہ یہ قتل شبہ عمد ہے۔ اسلیئے دیت اور کفارہ واجب ہوگا۔ اور اگر ایسا نہیں۔ تو قتل کا گناہ تو نہیں ہوا۔ لیکن اس صورت میں یہ دیکھا جائیگا کہ کس بات پر بددعا کی تھی۔ اور کیا بددعا کی تھی۔ اور آیا وہ بات اس درجہ کی تھی۔ کہ اس قسم کی دعا کا آپ کو شرعاً حق حاصل تھا۔ اگر وہ دعا حق تھی۔ تو بددعا کا بھی گناہ نہیں ہوا۔ ورنہ بددعا کا گناہ ہوا۔"

اُس جواب سے ان کی پوری تشفی ہوگئی۔ حضرت تھانوی اس واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"اس قسم کا سوال بس عمر بھر میں ایک انہیں نے کیا تھا۔ جس سے ان کا غایت درجہ اہتمام تقویٰ ثابت ہوتا ہے۔"

حسنِ خطاب

انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ وہ عام طور پر حق بات سننے کی تاب نہیں لاسکتا۔ مگر بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں حق کہے بغیر چین نہیں آتا۔ جس سے لازمی طور پر کچھ تلخی پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے اسلیئے گفتگو کے دوران میں اس انداز سے اظہارِ حق کرنا جس سے دوسرے کی ذرا بھی دل آزاری نہ ہو۔ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ حضرت تھانویؒ اس معاملہ میں ہمیشہ تہذیب سے کام لیتے اور اس طرح حق بات کہہ دیتے کہ مخاطب ناراض ہونے کی بجائے خوش ہوجاتا۔

الہ آباد کے مرد درویش محمد شاہ ولایتیؒ مسائل اختلافیہ میں عملاً کسی قدر تسامح کرتے تھے۔ اُن کا مسلک صلح کل تھا۔ اسلیئے بوجہ درویش ہونے کے احتیاط کرنے والوں سے بھی منازعت نہ کرتے تھے۔ جب حضرت تھانوی انہیں ملنے کے لئے گئے۔ تو انہوں نے آپ سے اعتراضاً پوچھا کہ

"مولوی اس آیت کا ترجمہ کرو۔ لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ"۔

حضرت تھانوی ان کا مطلب سمجھ گئے۔ اور فوراً فرمایا کہ:۔

"حق تعالیٰ نے فَلَا تُنَازِعْهُمْ نہیں فرمایا۔ بلکہ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فرمایا ہے۔ یعنی اہل باطل کو چاہیئے کہ وہ کبھی اہلِ حق سے منازعت نہ کریں۔ اہلِ حق کو ممانعت نہیں فرمائی کہ

وہ بھی اہل باطل سے منازعت نہ کریں۔ اہل حق کو تو چاہیئے کہ اہل باطل کی مخالفت کریں۔"

یہ جواب سن کر شاہ صاحب بجائے ناخوش ہونے کے بہت خوش ہوئے۔ اور دعائیں دیں اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے حضرت تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ:-

"الحمدللہ میں اظہارِ حق میں کسی کے سامنے کبھی چوکا تو نہیں ہوں۔ لیکن کسی کے ساتھ بے ادبی بھی نہیں کی۔"

یہی وجہ ہے کہ آپ جب کبھی کسی مسئلہ اختلافیہ پر گفتگو فرماتے۔ تو اس طرح خطاب فرماتے کہ مخالف بھی عش عش کر اٹھتا۔

حسن ظن حضرت شاہ جہان پوری بعض فرعی اجتہادی مسائل از قسم سماع وغیرہ میں حضرت تھانوی سے مخالف المشرب تھے۔ اس کے باوجود وہ حضرت تھانوی کو محقق زماں سمجھتے تھے۔ اسلئے انہوں نے ایسے دقیق مسئلہ میں حضرت سے ہی تحقیق چاہی۔ اور حضرت تھانوی نے بھی ان کے اختلافات پر نظر رکھے بغیر جو صحیح سمجھا لکھ بھیجا جس کی کسی اور سے کم از کم توقع نہ ہوسکتی تھی۔ ورنہ مستفسر اپنے مخالف کی طرف رجوع نہ کرتا۔ اور ان کے رجوع کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت تھانوی اپنے ہر مخالف سے حسن ظن رکھنے کے عادی تھے۔ خواہ کوئی انہیں گالیاں ہی کیوں نہ دیتا ہو۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:-

"اللہ کا شکر ہے کہ میرے قلب میں کسی بزرگ کی طرف سے محض فرعی اختلاف کی بنا پر بدعقیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ ان میں بزرگی کے آثار غالب ہوں۔ اللہ اللہ کرنے والوں سے حسن ظن ہی رکھتا ہوں۔ گو وہ حضرات بعض غلط فہمیوں میں مبتلا ہوں لیکن یہ ضرور نہیں کہ ان کے افعال واقوال کو شریعت پر منطبق کیا جائے بلکہ مغلوب الحال بزرگوں کے اقوال وافعال کی یہ تاویل کرلیتا ہوں کہ بوجہ مغلوبیت معذور ہیں یا جو اجتہادی امور ہیں۔ ان میں اجتہادی اختلاف کی گنجائش سوءِ ظن سے مانع ہوجاتی ہے۔"

اس کی عملی مثال عادات کے باب میں مخالفین سے درگذر کے باب میں گذر چکی ہے۔

حسن طلب مدرسہ دیوبند کی طرف سے ایک تجارتی کمپنی قائم کی گئی تھی۔ جس کے ہر شخص پانچ سو کی مالیت کے حصے خرید سکتا تھا۔ حضرت تھانوی کے والد ماجد نے متمول ہونے کی

وجہ سے پانچ سو کے حصے اپنے نام سے۔ پانچ سو کے حصے حضرت کے نام سے اور پانچ سو کے حصے اپنے چھوٹے صاحبزادہ منشی اکبر علی صاحب کے نام سے خریدے۔ کچھ عرصہ بعد بمصلحت یہ رقم واپس لے لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت تھانوی دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے تھے آپ کو جب اس رقم کی واپسی کا علم ہوا تو آپ نے اپنے والد ماجد سے بذریعہ خط و کتابت دریافت فرمایا کہ:۔

"آیا یہ پانچ سو روپیہ جو میرے نام سے آپ نے جمع کئے تھے۔ اور اب واپس لے لئے ہیں۔ میری ملک ہیں یا آپ کی؟"

والد ماجد نے جواب بھیجا کہ:۔

"ابھی تک تو یہ رقم میری ہی ملک تھی۔ اور تمہارا نام محض مصلحتہً درج کرا دیا گیا تھا لیکن اب میں اس رقم کو دراصل تمہاری ہی ملک قرار دیتا ہوں"۔

اس پر اس متبع شریعت اور پابند دین طالب علم نے لکھا:۔

"جب یہ رقم میری ملک ہو چکی ہے۔ تو اس رقم کی زکوٰۃ بھی میرے ذمہ واجب ہے اور اب حج بھی میرے اوپر فرض ہو گیا ہے"۔

آپ کے والد ماجد نے خوش ہو کر زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے تو روپیہ بھیج دیا۔ اور حج کے متعلق لکھا کہ

"میں تمہاری چھوٹی بہن (والدہ صاحبہ حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی عثمانی) کے عقد سے فارغ ہو کر آئندہ سال حج کے لئے جاؤں گا۔ اس وقت تم بھی چلے چلنا"۔

لیکن باپ سے ڈرنے اور ان کا ادب کرنے والے اس "طالب علم" نے ایک فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کے خوف کو باپ کے ڈر اور ادب پر ترجیح دیتے ہوئے بڑے ناز سے لکھا کہ:۔

"آپ مجھے یہ لکھ کر دے دیجئے۔ کہ تم پار سال تک زندہ رہو گے"۔

اس پر انہوں نے لکھا کہ:۔

"میں یہ کیسے لکھ سکتا ہوں"۔

بس اب میدان صاف تھا۔ فوراً لکھا کہ:۔

"حج تو میرے ذمہ فرض ہو چکا ہے۔ اور زندگی کا کچھ اعتبار نہیں اور تاخیر بلا عذر شرعی جائز نہیں۔ اسلئے مجھے تو اسی سال حج کرنا ضروری ہے"۔

اس پر آپ کے والد ماجد کو جھکنا پڑا۔ اور بعجلت تمام شوال میں ہی اپنی صاحبزادی کا عقد کر دیا۔ اور

اپنے فرزانہ کو لے کر حج پر تشریف لے گئے۔

حسنِ مساوات

ہمارے محترم و کرم فرما حضرت طارق صاحب کے والد ماجد کی بھی حضرت تھانوی سے مکاتبت تھی۔ عمومی نہیں بلکہ خصوصی۔ اس ناتہ پر ہمارے صاحب نیاز بھی دیوبند سے گاہے گاہے پدری تعلق کی وجہ سے تھانہ بھون پہنچ جاتے تھے۔ اور اس خصوصی تعلق کی وجہ سے حضرت تھانوی انہیں بڑی شفقت سے اپنے قریب بٹھاتے۔ حالانکہ آپ کا قرب حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے کسی مقبول بندے کا کسی کو شرف قرب بخشنا عنداللہ اس کے مقرب ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔

حضرت طارق نے اپنا یہ چشم دید واقعہ بیان فرمایا کہ ایک روز کہیں سے حضرت کے پاس ہدیۃً ایک خوبصورت سا کپڑا آیا۔ جسے حضرت نے بہت پسند فرمایا اور نوکر سے کہا کہ اس جیسا اتنا ہی کپڑا بازار سے اور خرید لائے۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود اس جیسا کپڑا اور نہ مل سکا۔ اور نوکر واپس آگیا۔ حضرت تھانوی نے وہی کپڑا ملازم سے لے کر اسے دو برابر حصوں میں چیر دیا۔ اور فرمایا ہر ایک ڈیوڑھی پر ایک ایک ٹکڑا دیدو۔

اس وقت ایک صاحب سے نہ رہا گیا۔ اور حضرت سے عرض کیا کہ یہ تو اب کسی کام کا نہ رہا اگر فقط مساوات کا ہی خیال تھا۔ تو دوسرے گھر اس کپڑے کی قیمت بھیج دی جاتی۔ حضرت نے فرمایا۔
"آپ کا خیال صحیح نہیں۔ اس طرح مساوات قائم نہ رہتی۔ کیونکہ مساوات ہر نوع میں لازم ہے تاکہ کسی کے دل میں عدم مساوات کا خفیف سا شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔"

حسنِ معاشرت

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں:-
"حضرت کی مالی و معاشی حالت اگرچہ زیادہ اچھی نہ تھی۔ تو بری بھی نہیں کہی جا سکتی تھی۔ بہتوں سے بہتر تھی۔ متوسط درجہ کے شرفاء کا جو طرز معاشرت ہے۔ خصوصاً قصبات میں اور شیخ زادوں کے ہاں۔ حضرت اسی معیار پر فراغت آسائش سے گو یقیناً بغیر اس معیار کے اسراف و آرائش کے بسر فرماتے تھے۔ اولاد کوئی نہ تھی۔ لیکن محل دو تھے۔ جی ہاں! بزرگ ہو کر دو۔ دو محل!! معاندین۔ خوب خوش ہو ہو کر نوٹ کر لیں۔ طنز و تعریض کے لئے کتنا زبردست حربہ ہاتھ آگیا!!! دونوں کے لئے الگ مکان۔ ایک دوسرے سے فاصلہ پر۔ ملازم بھی دو تھے۔ دونوں ایک ایک ڈیوڑھی پر۔ دونوں کے ساتھ مولانا کا برتاؤ قابل دید تھا۔ بجائے خود ایک درس حیات، کام کو

جب فرماتے۔ تو خوب ٹھہر ٹھہر کر سمجھا کر۔ اکثر تکرار کے ساتھ کہ غلط فہمی کا احتمال نہ رہے ملازمین جب آتے تو حکم تھا کہ زبان سے السلام علیکم کہہ کر (ہاتھ سے سلام کرنے کے عجمی دستور کی گنجائش اس عربی سادگی ماحول میں کہاں تھی؟) قریب آکر بیٹھ جائیں۔ بات چیت بیٹھ کر کریں۔ بلا ضرورت کھڑے نہ رہیں۔ کام کی مشقت کبھی بہت زیادہ نہ ڈالتے۔ کام بگاڑنے تو حضرت غصہ بھی فرماتے اور غصہ کرنا ایسے مواقع پر تو امر طبعی ہے۔ لیکن اس میں بھی حدود کے اندر ہی رہتے۔ مسجد سے چھوٹے زنانہ کا فاصلہ۔ اچھا خاصہ ہے۔ لیکن شب میں بعد عشاء جب گھر تشریف لے جاتے تو لالٹین اپنے ہاتھ میں لئے رہتے۔ کسی ملازم کو اس کے لئے نہ بلاتے۔ کبھی کوئی بات ہنسی کی بھی اُن سے فرما دیتے۔ جس سے ان کا دل کھل جاتا۔ برتاؤ ہمیشہ خشک ہی نہ رکھتے۔ اُن کے کپڑوں۔ اُن کے بیوی بچوں سب کا لحاظ رکھتے بلکہ وہ جو ایک بہت قدیم ملازم میاں نیاز نامی۔ بڑے مخلص اور سادہ دل تھے۔ ان کا ذکر تو کبھی کبھی نیم مزاحی انداز میں وعظ میں بھی کر دیا کرتے اور "دہقان کی کلاہ افتخار" آفتاب تک پہنچا دیتے ؏

زقدر و شوکتِ سلطان نہ گشت چیزے کم کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید

بزرگوں کی زیارت کا اتفاق اس سے قبل بھی ہو چکا تھا۔ لکھنؤ میں مولانا عین القضاۃ صاحبِ علم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے تارک۔ زاہد۔ مرتاض بزرگ تھے صفی پور (ضلع اناؤ) کے شاہ عزیز اللہ بھی اپنے رنگ میں فرد۔ وقس علیٰ ھذا۔ لیکن یہاں کا مضمون ہی کچھ اور تھا ؏

"بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"

حسنِ جامعیت اسے حق تعالیٰ کا فضل خاص کہیے یا حسن انتظام کہ اس نے حضرت تھانوی کی انسانیت وجامعیت کی تصویر کھینچنے کے لئے اس نقاد کو مقرر فرمایا۔ جو بوجہ فلسفی ہونے کے بال کی کھال اتارنے۔ بوجہ غیر مربہ ہونے کے اشکال و اعتراض کرنے میں نہ رکنے کے عادی ہیں۔ اور جنہوں نے ابتدائی تربیت کسی دینی ماحول میں نہیں بلکہ کفر و الحاد کی وادی میں بھٹک کر حاصل کی تھی۔ یعنی مولانا دریابادی جو شان اشرف دیکھ کر بے ساختہ کہہ اُٹھے کہ:۔

"مولانا - عالم بے بدل اور درویش کامل تو خیر تھے ہی - لیکن سب سے پہلے انسان - تھے۔ اور جس نے اُن کے اس جوہر کو نہ پہچانا - اس نے ان کو ذرا بھی نہ پہچانا ...... بزرگوں کی حکایات کسی بزرگ سے پوچھئے - اور ولایت کی تحقیق کسی ولی اللہ ہی سے کیجئے - یہ عامی تو اپنے تجربہ اور مسلسل تجربہ سے بس اتنا جانتا ہے کہ اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان - بہترین دوست - بہترین میزبان - بہترین مخدوم - بہترین عزیز بہترین ہمسایہ - غرض انسانی کمالات و اوصاف کے لحاظ سے ..... ایک بہترین انسان ہوئے ہیں -

حضرت کی شان ہی سب سے الگ - سب سے نرالی - نہ فقر و فاقہ - نہ تجرد - نہ بیوی بچوں کا ترک - اور نہ شدید قسم کے مجاہدے اور نہ رسمی درویشی اور مشیخت کے کوئی سے بھی آداب و رسوم - بلکہ دیکھنے میں سارا سامان دنیاداری ہی کا موجود - اچھے خاصے پختہ اور بلند مکان - نوکر - چاکر - کھانے دو دو - تین تین قسم کے - لباس خاصہ اجلا نفیس - بڑی زبردست ڈاک کی آمد و رفت غرض بہ ظاہر ہر طرف دنیا ہی دنیا لیکن وہ دنیا ایسی کہ اس کے ہر جزو پر دین کی حکومت غالب - طبیعت و بشریت کی پوری پوری آزادیاں - لیکن وہی شریعت کی پابندی ہیں -

بزرگی کے دعوے نہیں - درویشی کی تعلیاں نہیں - مشیخت کی شیخیاں نہیں - جذب کی شوخیاں نہیں - بلکہ الٹا تقصیروں کا اعلان - لغزشوں کا اشتہار - ہائے ہائے کوئی اس عبدیت کی دلاویزی لا کہاں سے سکتا ہے -

لاکھوں لگاؤ - اک چرانا نگاہ کا

عبدیت کا مرتبہ اور افادیت کا جو درجہ ہے - کون سا حال اور کون سا مقام اسے پا سکا - رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا کی آہ و زاری نے ابوالبشر کے جو مرتبے بڑھائے کس بشر کی مجال ہے کہ انہیں پا سکے - بڑی سے بڑی ریاضتیں - بڑے سے بڑے مجاہدے بھی اس ایک شکستگی - اس ایک افتادگی - اس ایک بیچارگی کے مقابلہ پر لائے جا سکتے ہیں ؟ ؎

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

مولانا کی ذات خود دینی حیثیت سے عجیب ذات تھی۔ کوئی صرف فقیہ ہوتا ہے اور طریقت سے کورا۔ کوئی محض صوفی ہوتا ہے۔ اور کلام کے مباحث سے ناآشنا یہ حضرت ایک ہی وقت میں صوفی محقق بھی۔ اور متکلم بے بدل بھی۔ رومی عصر بھی اور رازی وقت بھی۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ تفسیر۔ حدیث و تصوف کے علاوہ کلام قدیم و جدید کے بھی خدا معلوم کتنے مسائل یہاں مجلسوں میں۔ واعظوں میں برابر بیان ہوتے رہتے اور ہم جیسے کتنے بے مایہ اور کم مایہ یہیں سے خوشہ چینی کر کر کے اپنی بات بناتے اپنی دکان چمکاتے"! (حکیم الامت)

عبدیت

حقیقتِ عبدیت

حق تعالیٰ نے کلام پاک میں انبیاء علیہم السلام کا مختلف خطابات سے ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو صادق الوعد۔ حضرت ادریس علیہ السلام کو صدیق۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نجی اللہ۔ مخلص اور کلیم اللہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ کا خطاب ملا۔ مگر جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عبد اللہ کا خطاب ہوا جو تمام خطابات میں سب سے اونچا خطاب ہے کیونکہ بارگاہِ الوہیت میں عبدیت سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں کہ جو رفعت عبدیت سے ملتی ہے وہ اور کسی مقام سے نہیں ملتی۔ اور جب انسان عبدیت کے آخری مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اپنے معبودِ حقیقی کے اتنے قریب ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے بعد زمانی و مکانی مانع نہیں رہتا اور عبد و معبود کے درمیان جس قدر حجاب ہائے ارض و سما حائل نظر آتے ہیں وہ سب اُٹھ جاتے ہیں۔ اور وہ اس مقامِ بلند و بالا پر پہنچ کر اس صانعِ حقیقی کے کارخانۂ قدرت کی ہر چیز کا بچشم خود مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ یہ مقام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

مقامِ عبدیت

سلوک کا اعلیٰ ترین مقام وہ مقامِ عبدیت ہے جس تک پہنچنے کے لئے طالبین و سالکین کو بسا اوقات قبض کے بحرِ ظلمات کی تیز و تند موجوں۔ غم و اندوہ کی دشوار گذار وادیوں۔ عظمت و جلال کے پرہیبت پہاڑوں اور خوف و خشیت کی گھنگھور گھٹاؤں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ جسے طے کرتے وقت بعض شدائد کی تاب نہ لا کر خود کشی کر بیٹھتے ہیں بعض

ہمت ہار کر یہ راستہ ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور بعض خوش نصیب بعون اللہ تعالےٰ تبض کے اس شدید و مدید دور سے نکل کر منزلِ مقصود پر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ان کو اپنا ہیچ از ہیچ اور لاشے محض ہونا روز روشن کی طرح مشاہد ہو جاتا ہے۔ یہ مقام صرف اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے۔ اس کا ادنیٰ درجہ وہ مقام عبدیت ہے جس میں احکام الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں۔ یعنی بقول علامہ اقبالؒ:

"کہ یہ نہ سمجھے کہ میں کسی حاکم یا آقا کے حکم و تسلط کے ماتحت فضائل اخلاق و عبادات پر کاربند اور رذائل و قبائح نفس سے مجتنب ہوں بلکہ یہ چیزیں اس کی اپنی تمنا بن کر اس کے عمیق روح سے اچھلیں۔ قرآن اس کے حق میں تلخ اور شافی دوا نہ رہے۔ بلکہ ایک لذیذ اور لذت کی بخش غذا بن جائے۔" (ملفوظاتِ اقبال صفحہ)

یہ مقام مومنین کو حاصل ہوتا ہے۔

احساسِ حقیقت اولیاء اللہ کو چونکہ خلق اللہ کی اصلاح و تربیت کا فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے اسلئے مسندِ ارشاد پر متمکن ہونے سے پہلے نظامِ تکوینی کے ماتحت انہیں خود بھی تربیتِ سلوک حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اس تربیت کی بدولت جب سالک پر اپنا لاشے محض ہونا مشاہد ہو جاتا ہے۔ تو بقول صاحب اشرف السوانح:۔

"اس مشاہدۂ عجز کی بدولت وہ بفضلہ تعالیٰ نزول کامل سے جو ترقیاتِ باطنیہ کی انتہائی منزل ہے۔ مشرف و ممتاز اور سربلند و سرفراز ہو جاتا ہے۔ نیز چونکہ تغیراتِ احوالِ قلب کا اس کو خوب اچھی طرح اور ذاتی طور پر تجربہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اسلئے عدمِ غلبۂ ہیبت کی حالت میں بھی وہ عظمت و جلال خداوندی اور شوکت و ہیبت قضا و قدر الٰہی سے ہمیشہ ترساں و لرزاں ہی رہتا ہے۔ اور اچھی سے اچھی باطنی حالت کو بھی اپنے اندر محسوس کرتے ہوئے اس کو کبھی عجب و ناز کا واہمہ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ بربنائے تجربہ سابقہ وہ اس حالت کو حادثاً محض موہبتِ خدا اور بقاءً ہر وقت زیرِ تصرف رب العلیٰ یقین کئے ہوئے ہوتا ہے۔ غرض استحضارِ عظمتِ حق اس کا حال دائمی اور تفویض کامل و فنا رتام اس کا شعار زندگی ہو جاتا ہے۔ یعنی عبدیتِ محضہ اس کی صفت لازمہ و بندگی و سرافگندگی اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔"

یہ اوصافِ جلیلہ حضرت تھانوی کی ذات والا صفات میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ جو روزانہ ورد یا

اشرفیہ میں زیر مشاہدہ آتے رہتے تھے۔ اور آپ کی تالیفات وارشادات میں بھی قدم قدم پر ان کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً

کسرِ نفسی | آپ بارہا قسم کھا کر فرمایا کرتے تھے کہ :۔
میں اپنے آپ کو کسی مسلمان سے حتیٰ کہ ان مسلمانوں سے بھی جن کو لوگ فساق و فجار سمجھتے ہیں فی الحال اور کفار سے بھی احتمالاً فی المآل افضل نہیں سمجھتا اور آخرت میں درجات حاصل ہونے کا کبھی مجھے وسوسہ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ درجات تو بڑے لوگوں کو حاصل ہوں گے۔ مجھے تو جنتیوں کی جوتیوں میں بھی جگہ مل جائے۔ تو اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہو۔ اس سے زیادہ کی ہوس ہی نہیں ہوتی۔ اور اتنی ہوس بھی بربنا استحقاق نہیں بلکہ اسلئے کہ دوزخ کے عذاب کا تحمل نہیں اور یہ جو میں بضرورت اصلاح زجر و توبیخ کیا کرتا ہوں۔ تو اس وقت یہ مثال پیش نظر رہتی ہے۔ جیسے کسی شہزادے نے جرم کیا ہو۔ اور بھنگی جلاد کو حکم شاہی ہوا ہو کہ اس شہزادے کو دُرے لگائے۔ تو کیا اس بھنگی جلاد کے دل میں درے مارتے وقت کہیں یہ بھی وسوسہ ہو سکتا ہے کہ میں اس شہزادے سے افضل ہوں۔ غرض کوئی مومن کیسا ہی بداعمال ہو۔ میں اس کو حقیر نہیں سمجھتا۔ بلکہ فوراً یہ مثال پیش نظر ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی حسین اپنے منہ پر کالک مل لے تو اس کو جاننے والا کالک کو بُرا سمجھے گا۔ اور اس حسین کو حسین ہی سمجھے گا۔ اور دل میں کہے گا کہ یہ جب کبھی بھی صابون سے منہ دھولے گا۔ پھر اس کا وہی چاند سا منہ نکل آئے گا۔ غرض مجھ کو صرف فعل سے نفرت ہوتی ہے۔ فاعل سے نفرت نہیں ہوتی۔"

آثارِ خجالت | صاحب "اشرف السوانح" کا بیان ہے کہ "ایک بار احقر نے حضرت والا کے ایک ذی فضل معتقد کا یہ قول نقل کیا کہ میں آخرت میں اپنا کوئی عمل ایسا پیش کر سکوں گا۔ جو خالص ہو۔ اس کو سن کر حضرت والا جو اس وقت کسی خط کا جواب لکھ رہے تھے لکھتے لکھتے بے اختیار رک گئے۔ اور چہرہ مبارک پر آثار سخت خجلت وندامت کے ظاہر ہونے لگے۔ غلبۂ عبدیت سے بیٹھے بیٹھے کسی قدر جھک بھی گئے۔ اور پھر تھوڑی دیر تک ایسی ہیئت سے ساکت بیٹھے رہنے کے بعد نہایت حسرت کے لہجہ میں فرمایا کہ :۔
جی ہاں! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے لائق کیا کوئی عمل پیش کیا جا سکتا ہے؟"

اور پھر لیلۃ التین والی حکایت بیان فرمائی۔

خوفِ مواخذہ ایک بار فرمایا کہ جب میں کسی کے ہدیہ کو رد کرتا ہوں۔ تو گو وجہ کے ساتھ ہو لیکن پھر بھی ڈرتا ہوں۔ کیونکہ عذر کر لینے سے کسی قدر شک کبر کا ہوتا ہے جس سے نہایت خوف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں۔ استغناء اور کبر میں فرق نہایت دشوار ہے دونوں بہت متشابہ ہیں کبھی اس میں دھوکہ ہو جاتا ہے کہ جس کو ہم استغنا سمجھ رہے ہیں۔ وہ دراصل کبر ہی ہوتا ہے۔ خدا ہی محفوظ رکھے۔ تو انسان محفوظ رہ سکتا ہے۔ ورنہ ہمارا ہر قول و فعل حال وقال سب ہی پر از خطر ہے۔ کوئی حالت خطرہ سے خالی نہیں مجھے تو اب وہ شعر اکثر یاد آیا کرتا ہے کہ جو کبھی بچپن میں پڑھا تھا ؎

من نگویم کہ طاعتم بپذیر — قلم عفو برگناہم کش

بلکہ برگناہم تو کیا۔ حق تعالیٰ خود ہماری طاعات کو معاف فرمادیں اور طاعات تو غیر کیا قابل معافی ہوتیں مطلب یہ ہے کہ ان میں جو کوتاہی رہے۔ وہ معاف فرمائے۔ کیونکہ جن کو ہم اپنی طاعات سمجھ رہے ہیں۔ وہ در حقیقت طاعات ہی کب ہیں؟ جس طرح کوئی سیلے ڈھنگے طور پر پنکھا جھل رہا ہو۔ یا کوئی خدمت کر رہا ہو۔ تو وہ اپنے جی میں بڑا خوش ہوتا ہے کہ میں خدمت کر رہا ہوں حالانکہ بعضوں کی خدمت سے سخت اذیت ہوتی ہے لیکن محض دل شکنی کی وجہ سے ان کو منع نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح ہماری طاعات میں کبھی کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ہم نے کچھ کفر اللہ اللہ کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ وہاں کچھ پوچھ تک نہیں ہوتی۔ ایسی طاعات پر میں کہتا ہوں کہ ہم لوگوں پر اگر مواخذہ نہ ہو۔ تو غنیمت ہے۔ (الحسن العزیز جلد ۱ طبع ۹۵)

عجز و نیاز ایک سلسلۂ کلام میں نہایت پُر اثر اور بہت ہی پستی اور شکستگی کے لہجہ میں فرمایا کہ "نہ علم کا اعتبار۔ نہ عمل کا اعتبار۔ نہ حال کا اعتبار۔ نہ مقام کا اعتبار۔ کسی شے کا اعتبار نہیں۔ یہاں تک کہ جو سب سے زیادہ ضروری چیز ہے یعنی ایمان۔ اس کے بقاء کا بھی کیا اعتبار۔ کیونکہ قضا و قدر سب جلد بند ہیں۔ کیا معلوم کس کے لئے کیا مقدر ہو چکا ہے۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جانتا ہے کہ یہ گناہ ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اس سے بچنا بھی اختیاری ہے۔ لیکن پھر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے اختیار سے اپنے آپ کو اس میں مبتلا کرتا ہے۔ آخر وہ کون ہے۔ جو اس کو کشاں کشاں لے جا رہا ہے۔ اور پھر دلائل سمعیہ و عقلیہ سے یہ بھی واجب ہے کہ جبر کا بھی عقیدہ نہ رکھو۔ اور واقع میں بھی جبر نہیں۔ بہت ہی نازک بات ہے اور بہت ہی

ڈرنے کا مقام ہے۔ اپنی کیسی ہی حالت اچھی ہو۔ ناز نہ کرے۔ اور دوسرے کی کیسی ہی بری حالت ہو۔ اس پر ہرگز طعن نہ کرے۔ کیا خبر! کہ اپنی حالت اس سے بھی بدتر ہو جائے۔ انسان کس چیز پر ناز کرے۔ جبکہ سارا علم و عمل حال و مقام سب خدا کے قبضہ میں ہے۔ ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لھا وما یمسک فلا مرسل لہ من بعدہٖ اللہ تعالیٰ جس رحمت کو کشادہ کرنا چاہیں۔ کوئی اس کو رد کرنے والا نہیں۔ اور جس رحمت کو رد کرنا چاہیں کوئی اس کا کشادہ کرنے والا نہیں۔ غرضیکہ کوئی چیز انسان کے مستقل اختیار میں نہیں"۔ اکثر گمراہ فرقوں کے عقائد واہیہ کے تذکروں میں بے اختیار ہاتھ جوڑ جوڑ کر اللہ تعالیٰ سے نہایت عجز و نیاز کے لہجہ میں عرض کرنے لگتے کہ اے اللہ اپنے قہر سے بچائیو! اور فرماتے کہ

جب اللہ تعالیٰ کا قہر ہوتا ہے۔ تو باطل چیزیں بھی حق نظر آنے لگتی ہیں اور اوہام باطلہ بھی حقائق کی صورت اختیار کر جاتے ہیں"۔

نفیِ کمال بارہا فرمایا کہ یہ جو اصلاح نفس کی سہل سہل اور نافع تدابیر اللہ تعالیٰ ذہن میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ سب طالبین کی برکت ہے۔ میرا کوئی کمال نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہے کہ میرے بندوں کی اصلاح ہو اور نفع پہنچے۔ لہٰذا ایک ناکارہ سے خدمت لے لیتے ہیں۔ اور جس کو اپنے علوم و معارف پر ناز ہو۔ طالبین سے الگ ہو کر تو ذرا دیکھے۔ واللہ جو بالکل ہی بیٹھ نہ جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اوروں ہی کے نفع کے لئے اس کو یہ علوم و معارف عطا فرماتے ہیں ع خاص کند بندہ مصلحت عام را۔ ماں یوں ناز نہ کرے کہ میں بچہ کو دودھ پلاتی ہوں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کو منظور ہے کہ بچہ کی پرورش ہو۔ اس لئے اس نے گوشت میں بھی دودھ پیدا کر دیا ہے۔ یہ جو دودھ چھاتیوں سے ابل رہا ہے۔ یہ بچہ کے جذب کی ہی برکت ہے۔ اگر ماں بچہ کو دودھ پلانا چھوڑ دے۔ تو پھر دودھ ہی خشک ہو جائے۔ اسی طرح اگر کنوئیں میں ڈول نہ ڈالا جائے اور پانی نہ نکالا جائے تو نیا پانی آنا بند ہو جائے۔ غرضیکہ اگر شیخ افادہ چھوڑ دے۔ تو تلقی بھی بند ہو جائے"۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ "میرے اندر علم ہے۔ نہ عمل ہے۔ نہ کوئی کمال ہے۔ لیکن الحمد للہ اپنے خلوص کا اعتقاد ہے۔ اللہ تعالیٰ بس اسی پر فضل فرما دے گا"۔

اس طرح جب ایک طالب علم حضرت کی تدبیر سے ایک نفسانی مرض سے شفایاب ہوا

تو اس نے عرض کیا کہ حضرت والا کی تعلیم میں تو کھلی ہوئی برکت ہے۔ فرمایا کہ میری تعلیم میں کیا رکھا ہے۔ حقیقت میں اللہ تعالے کی تائید ہے۔ وہی کارساز ہیں۔ میں کیا چیز ہوں چمار کو سڑک کوٹنا نہیں آتا۔ گر جب انجینئر اپنا ہاتھ اس کے دُرمٹ پر رکھ کر اس سے دُرمٹ چلواتا ہے۔ تو سڑک کٹ جاتی ہے۔ امراصلاح میں نہ میرے علم کو دخل ہے نہ عمل کو۔ خدا نے ایک کام میرے سپرد کیا ہے۔ وہ میری مدد کرتے ہیں۔ میرا کچھ بھی کمال نہیں۔"

حقیقتِ نفی آپ کی طرح حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ بھی بقسم فرمایا کرتے تھے کہ میرے اندر کوئی کمال نہیں اس پر ایک معتقد نے حضرت تھانوی کے سامنے اپنا اشکال پیش کیا کہ اگر یہ قسم سچی ہے۔ تو مولانا کے کمالات کی نفی ہوتی ہے۔ اور اگر سچی نہیں تو مولانا نے خلاف واقعہ قسم کیوں کھائی؟ ایسی حالت میں کیا عقیدہ رکھنا چاہیئے؟ آپ نے فرمایا کہ مولانا کو اپنی قسم میں بھی سچا سمجھا جائے اور ان کے کمالات کا بھی اعتقاد رکھا جائے۔ کیونکہ مولانا کمالاتِ متوقعہ کی نفی فرما رہے ہیں۔ اور ہم کمالاتِ واقعیہ کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اسلیئے کوئی تعارض موجود نہیں"۔

یہی کیفیت حضرت تھانوی کی نفیِ کمال کی ہے۔ جس کی مزید تائید اس اشکال کے جواب سے ہوتی ہے کہ جب حضرت خود کو واقعی بزرگ نہیں سمجھتے تو دوسروں کو معافحہ کی سہولت کیوں بہم پہنچاتے ہیں؟ اس کا جواب خود حضرت تھانوی کے الفاظ میں موجود ہے کہ:-

"میں معانحہ کو اپنے لیئے ایک بڑی سعادت سمجھتا ہوں کہ ایک ناکارہ شخص کے اتنے مسلمان محبت کرنے والے ہیں۔ اور اس نیت سے معافحہ کی اجازت دیتا ہوں کہ اتنے محبت کرنے والوں میں کوئی تو خدا کا مقبول و مرحوم بندہ ہوگا... جو مجھے تکلیف میں دیکھ کر حق تعالے سے میری سفارش کرے گا"۔

چونکہ حق تعالے کی تجلیات لا متناہی ہوتی ہیں۔ اسلیئے سالک عرفاں سلوک کے ہر بلند مقام پر پہنچنے کے بعد بھی خود کو ابتدائی منزل میں پاتا ہے۔ اور جب اس راہ کو لامتناہی دیکھتا ہے تو پھر تھک کر عبدیت کی طرف لوٹ آتا ہے اور

نظریہ فضل اپنے کمالاتِ ظاہری و باطنی کو نظر انداز کر کے فضلِ الٰہی پر نگاہ رکھتا ہے اسی لیئے حضرت تھانوی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ گو میں اعمال میں بہت کوتاہ ہوں۔

لیکن الحمد للہ اپنی اصلاح سے غافل نہیں ہمیشہ یہی ادھیڑبن لگی رہتی ہے کہ فلاں حالت کی یہ اصلاح کرنی چاہیئے۔ فلاں حالت میں یہ تغیر کرنا چاہیئے۔ غرض کسی حالت پر قناعت نہیں اور گو میں نجات کو اعمال پر منحصر نہیں سمجھتا۔ محض فضل پر سمجھتا ہوں۔ لیکن بندہ کے ذمہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ اس کے اوامر کو بجا لائے اور نواہی سے اجتناب کرے۔ اسلئے مجھ کو اپنے اعمال کی کوتاہی پر سخت ندامت ہے۔ اور ہمیشہ اپنی اصلاح کی فکر رہتی ہے"۔

عفو و دعا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالےٰ کو چونکہ میرا نیک نام کرنا منظور ہے اس لئے جو پہلے نیک ہیں۔ انہیں کو میرے پاس بھیج دیتے ہیں اور میں مفت میں نیک نام ہو جاتا ہوں ؎

نے دام خوش نہ دانہ خوش اما ز اتفاق ہر بار شاہباز در افتد بہ دام ما

مجھ میں تو سراسر عیوب ہی عیوب بھرے پڑے ہیں۔ میری اگر کوئی برائی کرتا ہے تو یقین جانئے مجھے کبھی بھی وسوسہ نہیں ہوتا کہ میں برائی کا مستحق نہیں بلکہ اگر کوئی تعریف کرتا ہے۔ تو واللہ تعجب ہوتا ہے کہ مجھ میں بھلا کونسی تعریف کے قابل بات ہے۔ جو اس کا یہ خیال ہے۔ اس کو دھوکا ہوا ہے۔ حق تعالےٰ نے ستاری کی ہے۔ کہ میرے عیوب کو پوشیدہ کر رکھا ہے اسلئے مجھ کو کسی کا برا کہنا مطلق ناگوار نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی میری ایک تعریف کرتا ہے تو اسی وقت دس عیب سامنے آجاتے ہیں۔ برا بھلا کہنے والے کو عدم واقفیت کی وجہ سے معذور سمجھتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ میری وجہ سے اپنی کسی مخلوق پر مواخذہ نہ کیجیو۔ جو کچھ کسی نے میرے ساتھ برائی کی ہو یا آئندہ کرے۔ وہ سب میں نے دل سے معاف کی اگر میری وجہ سے کسی کو عذاب ہوگا۔ تو اس سے مجھے کیا فائدہ؟

غرضیکہ حضرت تھانوی کے مقام عبدیت کی کیفیت بعینہ ایسی تھی جیسے "عارف کی جتنی بصیرت بڑھتی جاتی ہے۔ عظمت حق کا انکشاف روز افزوں ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور آداب عبودیت کے روز بروز نئے نئے دقائق پیش نظر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی عبادات و طاعات کو خواہ کتنی ہی کامل ہوں۔ حقوق عظمت حق کے لحاظ سے ہیچ در ہیچ سمجھتا ہے۔ اور اس کا ایسا سمجھنا حق بجانب ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا حق کسی طرح ادا ہو نہیں سکتا۔ اس لئے عارف کو اپنے کسی درجہ پر قناعت نہیں ہوتی۔ اور کسی درجہ کی بھی اصلاح

پر اطمینان نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے وہ قسمیں کھا کھا کر اپنے کمالات کی نفی کرتا رہتا ہے۔"

علم و ادب

تصنیف و تالیف کتابیں پڑھنا جس قدر آسان ہے کتابیں لکھنا اسی قدر مشکل۔ محنت کرنے والا ہی بیچارہ جانتا ہے کہ اس راہ میں اس کو کن کن مشکلات اور مشقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تصنیف و تالیف کے لئے علاوہ دیگر امور کے کسی نہ کسی حد تک جمعیتِ خاطر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر جو صبح شام اصلاحِ امت کے گوناگوں افکار و ہموم کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہوں۔ انہیں تصنیف و تالیف کے لئے فرصت و انشراح کی گھڑیاں میسر آنا اور سینکڑوں کی تعداد میں کتابیں لکھ ڈالنا کسی حالت میں بھی کرامت سے کم نہیں اور بدونِ امدادِ غیبی ایسا ہونا ناممکن ہے۔

حضرت تھانوی کے تصنیفی مشاغل و معمولات پر نظر دوڑانے سے دو باتیں بالکل واضح طور پر نظر آنے لگتی ہیں۔

۱۔ مخلصانہ جد و جہد

۲۔ غیبی دستگیری

مخلصانہ جد و جہد مخلصانہ جد و جہد کی کیفیت تو یہ تھی کہ:-

۱۔ جب آپ کوئی کام شروع کر بیٹھتے۔ تو جب تک اس سے بالکل فارغ نہ ہو جاتے۔ چین ہی نہ آتا۔ رات دن۔ وقت بے وقت اس کی تکمیل کی دھن میں لگے رہتے چنانچہ جب کلید مثنوی ختم ہونے کے قریب آئی۔ تو اس سے فراغت حاصل کرنے کا اس شدت سے تقاضا پیدا ہوا کہ آخر دن میں جو اسے لکھنے بیٹھے۔ تو دوسری صبح کر دی۔ اور رات بھر ایک منٹ نہ سوئے۔ حالانکہ رات بھر جاگنے کا پہلے کبھی اتفاق ہی نہ ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے بخار ہو گیا مگر اس بخار میں بھی اطمینان کی کیفیت تھی کہ کام سے تو فارغ ہو گیا ہوں۔"

۲۔ اتنا تعب برداشت کرنے کے علاوہ آپ کی عادت تھی کہ اکثر کاغذ پنسل اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جس وقت کوئی مضمون ذہن میں آتا اسے فوراً لکھ لیتے۔ بلکہ بسا اوقات رات کو بھی

کاغذ پنسل تکیہ کے نیچے رکھ لیتے تاکہ اگر رات کو بھی کوئی مضمون ذہن میں آجائے۔ تو روشنی کر کے اس کے متعلق یادداشت لکھ لی جائے۔ اسی طرح سفر و حضر میں کہیں کوئی بات قابل اصلاح دیکھتے تو اسے بھی نوٹ فرما لیا کرتے تاکہ مناسب موقع پر اس کے تدارک کی تجویز کر دی جائے۔ کیونکہ آپ کوئی کام دوسرے وقت پر ملتوی کرنے میں بہت بوجھ محسوس کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ

"جس وقت جو کام پیش آتا ہے میں اس کو فوراً کر ڈالتا ہوں۔ دوسرے وقت پر نہیں ٹالتا۔ گو اس میں اس وقت تو تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن بعد فراغ بس بالکل بے فکری ہو جاتی ہے۔ اور بڑی راحت ہوتی ہے۔ ورنہ ٹالنے سے اکثر کام نہیں ہونے اور اگر ہوتے بھی ہیں۔ تو جتنی دیر فکر دامنگیر رہتی ہے۔ اتنی دیر کلفت بھی رہتی ہے"۔

۳۔ علاوہ ازیں جب بھی تصنیف کا کام شروع فرماتے شرح صدر کے لئے دعا مانگتے اور اگر کسی وقت کسی وجہ سے کسی امر میں شرح صدر نہ ہوتا۔ تو صاف لکھ دیتے کہ اس سے بہتر بات اگر کہیں مل جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے۔ جیسا کہ تفسیر بیان القرآن لکھنے کے دوران میں سورۃ براۃ اور سورۃ حشر کے مقام پر ہوا اور آپ نے وہاں صاف لکھ دیا کہ اس سے بہتر تفسیر اگر کہیں مل جائے تو اس کو ترجیح دی جائے۔ جس کی مثال اہل علم میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔

۴۔ تصنیف کے دوران میں تحقیق کا اتنا اہتمام فرماتے کہ بہت ہی مختصر سی بات معلوم کرنے کے لئے بعض کتب دوسرے مقامات سے بڑے اہتمام اور خرچ سے منگواتے اور ان کی مدد سے ذرا سی عبارت لکھ کر فوراً واپس فرماتے۔ چنانچہ احیاء السنن کی تالیف میں آپ نے ہزاروں روپے لگا دیئے۔

۵۔ پھر ہر کتاب کو جامع و مانع اور سلیس و واضح بنانے میں بڑا تعب فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی مختصر عبارت بھی اظہار مدعا کے لئے بالکل کافی و وافی ہوتی۔ اور پھر اس میں یہ احتیاط بھی لازماً فرماتے کہ میری کسی تحریر سے کسی زمانہ میں کسی کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچنے پائے۔ جس کی بہترین مثال آپ کی کتاب "حیات المسلمین" ہے۔

غیبی دستگیری اس جدوجہد کے ساتھ ساتھ غیبی دستگیری کی یہ کیفیت تھی کہ:۔

۱۔ حق تعالٰی نے آپ کو شروع سے ہی تصنیف کا ملکہ عطا فرما رکھا تھا جس کی

وجہ سے آپ نے طالب علمی کے زمانہ میں ہی "مثنوی زیر و بم" لکھی۔

۲۔ دوسری صورت امداد غیبی کی یہ تھی کہ حضرت کو کسی مضمون کے سوچنے کی زیادہ ضرورت نہ پڑتی۔ مضامین خود بخود ذہن میں اترنے لگتے۔ اور آپ اکثر بڑے بڑے غامض مضامین کو بھی قلم برداشتہ ہی لکھتے چلے جاتے۔ گو اس میں بشرط ضرورت بعد میں اضافہ و ترمیم بھی فرماتے۔ ممکن ہے بعض کے نزدیک یہ نقص کی علامت ہو۔ مگر اس بارہ میں ایک ماہر کی رائے یہ ہے کہ:-

"یہ نقص نہیں بلکہ کمال ہے۔ کیونکہ یہ ذہن کی جولانی کی علامت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہن خوب چلتا ہے اور کسی مقام پر رکتا نہیں۔ بلکہ ترقی کرکے آگے کو بڑھتا رہتا ہے"

۳۔ تیسری غیبی امداد وقت کی برکت تھی۔ جس کا سبب انضباط اوقات تھا کہ جب تصنیف کا وقت آتا۔ طبیعت دوسرے مشاغل سے فرصت حاصل کرنے کے لئے بے قرار ہو جاتی خواہ اس وقت کوئی بزرگ یا استاد ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔ جس کی تفصیل "عادات" کے باب میں بضمن "عمل میں مداومت" گذر چکی ہے۔ اور آپ اس وقت خود کو فارغ کرکے تصنیف کے کام میں معروف ہونے پر مجبور ہو جاتے۔

۴۔ چوتھی غیبی امداد یہ تھی کہ موانعات پیش نہ آتے۔ چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ:-

"تفسیر بیان القرآن لکھنے کے زمانہ میں جو اڑھائی سال کے عرصہ میں مکمل ہوئی میرا کبھی کان بھی گرم نہیں ہوا۔ حالانکہ اس زمانہ میں یہاں طاعون کی بہت کثرت رہی"

۵۔ پانچویں غیبی امداد یہ تھی کہ ضرورت کا سامان بلا تعب خود بخود ہو جاتا تھا۔ مثلاً کسی حوالے کی ضرورت درپیش ہوتی۔ تو ذہن میں فی الفور اس کتاب اور اس کے صفحات کی تصویر کھنچ جاتی۔ اور اگر کوئی بات کتاب سے معلوم ہونے والی نہ ہوتی۔ تو جس سے معلوم کرنی ہوتی۔ قدرت اسے اس وقت آپ کے پاس بھیج دیتی۔ چنانچہ ایک بار مثنوی شریف کی شرح لکھتے وقت کبوتر بازوں کی کسی اصطلاح یا عام عادت کے معلوم کرنے کی ضرورت پڑی۔ تو حضرت کو تشویش ہوئی کہ اب کبوتر باز کہاں سے تلاش کیا جائے۔ بس اس تشویش کا پیدا ہونا تھا۔ کہ اس وقت ایک کبوتر باز آیا۔ اور اس نے ایک تعویذ کی درخواست کی۔ حضرت اسے جانتے تھے۔ اس لئے آپ نے اس سے وہ دریافت طلب امر پوچھ لیا۔ جس سے مثنوی شریف کا وہ مقام فوراً حل ہو گیا اور

اس واقعہ کا بھی اس مقام پر ذکر فرما دیا۔

شعر و شاعری | چونکہ آپ کے تصنیفی کام کا آغاز شعر و شاعری سے ہوا اس لئے اس کا ذکر پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو نظم کا ملکہ اور سلیقہ تو بفضل تعالیٰ خوب تھا۔ مگر آپ نے اسے دوسرے شعرا کی طرح مقصود زندگی نہ بنایا تھا۔ اس سلسلہ کی تفصیلات صرف اتنی ہیں کہ:۔

۱۔ طالب علمی کے زمانہ میں آپ نے نفس انسانی کی بصیرت افروز حکایت ایک بیوقوف عاشق اور چالاک معشوق کے قصہ کے طور پر "مثنوی زیر و بم" کے نام سے فارسی میں لکھی۔

۲۔ قیام مکہ کے دوران میں آپ نے حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے ایما پر حضرت ابن عطاء اسکندری کی کتاب تنویر کا اردو ترجمہ "اکسیر فی اثبات التقدیر" کے نام سے اس طرح کیا کہ نثر کا ترجمہ نثر میں اور عربی نظم کا ترجمہ اردو نظم میں۔

۳۔ بچوں کو تجوید کے عام مسائل ذہن نشین کرانے کے لئے تجوید القرآن کے نام سے ایک مختصر منظوم رسالہ تصنیف فرمایا۔

۴۔ آپ نے ایک شجرہ بھی نظم فرمایا۔

۵۔ مکہ معظمہ کے قیام کے دوران میں آپ نے غلبۂ توحید میں ایک نہایت ہی پرکیف غزل اردو میں لکھی۔ جو سرتاسر توحید وجودی کے مضامین کی حامل تھی۔ چونکہ حالتِ استغراق کی وجہ سے اس غزل کا عنوان خلاف ظاہر تھا۔ اس لئے آپ نے اس سے رجوع فرما لیا اور اسے شائع کرنے کی اجازت نہ دی۔ آپ کے شیخ حضرت حاجی صاحب کو یہ اتنی پسند آئی کہ بعض مشائخ جو انہیں ملنے آئے۔ تو حاجی صاحب نے فرمائش کر کے خاص طور پر وہ نظم ان کو حضرت کی زبانی سنائی اور فرمایا "یہ محقق قال نہیں۔ ان کا حال ہے"۔ اس غزل کے صرف مندرجہ ذیل دو شعر آپ نے صاحب اشرف السوانح کو نقل کرنے کی اجازت دی:۔

خودی جب تک رہی اس کو نہ پایا، جب اس کو ڈھونڈا پایا خود عدم تھے
حقیقت کیا تمہاری تھی میاں آہ یہ سب امداد کے لطف و کرم تھے

آہ آپ کا تخلص تھا اور امداد حضرت حاجی صاحب کا۔ جن کا نعتیہ کلام "گلزار معرفت" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ایک مرتبہ مولوی مسعود علی صاحب ندوی تھانہ بھون میں مقیم تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں اپنے حاضر ہونے کے اطلاع نامہ میں ریاض مرحوم کا یہ مصرعہ بھی لکھ دیا ع

زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

جو انہوں نے حضرت کو بھی سنایا۔ آپ نے سنتے ہی اسے فی البدیہ بدل کر فرمایا ؎

زندگی ہے تو سلیمان کا بھی پھیرا ہوگا

ایک مرتبہ حضرت نے سید صاحب موصوف کو ایک تسبیح عنایت فرمائی جس پر سید صاحب موصوف نے یہ شعر موزوں کیا ؎

خواجہ بخشید مرا سبحہ صد دانہ بلطف — دانہ انداخت ودر حلقہ مرا کرد اسیر

مقبل بلگرامی نے موقعہ پاکر یہ شعر حضرت کو بھی سنا دیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ کبھی مجھے بھی اس کا جواب لکھنا پڑے گا۔ چنانچہ جس وقت سید صاحب نے حضرت کی تحریک واشارہ کے بغیر اپنے ذاتی احساس سے مجبور ہو کر سیرۃ النبیؐ کے بعض مقامات سے رجوع واعتراف کا اعلان "معارف" میں شائع فرمایا تو اس کی اطلاع پا کر حضرت بڑے مسرور ہوئے۔ اور مثنوی کے وزن پر یہ دس شعر لکھ کر سید صاحب کو بھیج دیئے۔ جن کا عنوان تھا:-

اعتراف (یعنی اخبار اعلان) — از اعتراف (یعنی سید سلیمان)

لمثل ھذا فلیعمل العاملون — وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون

(اقتباس ترغیب ولپذیر۔ از مثنوی رومی بتصرف یسیر)

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل — واں نوندوی را منزہ از دغل

اے دلت معمور از اسرارِ حق — اے دلت محمود از آثارِ حق

اے دلت پرنور از انوارِ حق — اے دلت مسرور از اخبارِ حق

صد مبارک باد ایں اظہارِ حق — صد مبارک باد ایں اقرارِ حق

نیک باشد ایں طریق نفعِ خاص — کہ بہ اہلِ علم دارد اختصاص

سعی نفعِ عام اینجا واجب است — آنکہ نافع بہر ہر ہر طالب است

در کلامِ خود نظر خود کردنی — یا کہ نقادے بدست آوردنی

ہمچناں کردم بتالیفات خویش — صرف ہم کردم پئے او نقد بیش

گرچہ ناظم نیستم ابیات را — نثر کردم نیک ایں جذبات را

مقصدِ من خیر خواہی ہست وبس

بو کہ بارغبت فتد در گوش کس — (اشرف علی ۲۷ محرم ۱۳۶۱ھ)

یہ آپ کی آخری نظم تھی۔ مگر وفات سے چند روز قبل ایک آخری شعر ارشاد ہوا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ہندوستان کے مشہور شاعر جگر مراد آبادی نے اپنی ایک فارسی غزل جو انہیں بہت ہی پسند تھی۔ عقیدۃً حضرت کی خدمت میں لکھ بھیجی۔ جس کا ایک مصرعہ یہ تھا ؏

نہ بہ مطربے نہ بہ شاہدے۔ نہ بہ حاصلِ۔ عشق خوشم

آپ نے اس کے جواب میں لکھا کہ آپ کے تر اور رنگین جذبات نے میرے ایک خشک جذبہ کو حرکت دیکر مجھ سے بھی ایک شعر کہلوایا۔ جس کو اہلِ کمال کے سامنے پیش کرنا اسلئے مناسب نہیں کہ ایک صورت دعویٰ کی سی ہے۔ لیکن بہ امیدِ نفع پیش کرتا ہوں۔ گو وہ شعر رنگین نہیں مگر سنگین ضرور ہے ؎

نہ بہ نظم شاعر خوش غزل۔ نہ بہ نثر ناثر بے بدل
بہ غلامی ستہ عزّ و جل۔ و بعاشقی نبی خوشم (حیات اشرف ص۱۱۰)

اس امر کی تصدیق محترم آسی ضیائی کے مکتوب گرامی مورخہ ۲ مارچ ۱۹۵۵ء سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ لکھتے ہیں کہ:۔

"مولانا تھانوی کی شاعری کا مجھے علم ہے۔ ایک دفعہ جگر مراد آبادی نے انہیں اپنی فارسی غزل بعنوان "بہ لب تشنہ لبی خوشم" لکھ کر بھیجی تھی۔ مولانا نے اس پر ایک شعر بعنوان "بہ عشق نبی خوشم" کا اضافہ فرمایا۔ مدت ہوئی۔ دہلی میں جگر صاحب نے وہ اصل خط مجھے دکھایا تھا۔"

حضرت تھانویؒ اپنی ہر چھوٹی بڑی تصنیف یا وعظ یا تحریر کا نام بڑے اہتمام سے رکھتے تھے اور ان ناموں کی اپنے پاس یادداشت رکھتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً شائع فرماتے رہتے تھے۔ تاکہ ناموں کا تکرار نہ ہو۔ اور فہرست محفوظ رہنے کی صورت میں کوئی تصنیف غلط طور پر آپ کی طرف منسوب نہ کی جاسکے۔ مگر نام اکثر عربی ہوتے تھے۔ جنہیں اب عام فہم بنانے کی یہ بہتر صورت ہے کہ ان کا مترادف اردو نام جلی سرخی سے اور اصلی نام خفی سرخی سے سر ورق پر لکھ دیا جائے۔ جیسے ہم نے "نشر الطیب فی ذکر الحبیبؐ" کا نام "حبیبِ خدا" رکھا۔ اور حل الاشتباہات کا نام "اسلام اور عقلیات" تجویز ہوا۔

اردو نوازی حضرت تھانویؒ نے دین کی خدمت اور اصلاح کے اہم بالشان کام کے لئے زبان اردو کو ہی انتخاب کیا۔ وہی اردو

۱۔ جس نے شاہجہان کے زیر سایہ نشو ونما پائی۔
۲۔ جس میں سب سے پہلے "ایک مذہبی خیالات رکھنے والے شاہنشاہ عالمگیر نے شعر کہے
۳۔ جس میں سب سے پہلے مولانا شاہ عبدالقادر اور مولانا شاہ رفیع الدین نے کلام الٰہی کا ترجمہ کیا۔ اول الذکر کا ترجمہ کلام اللہ کے اردو لغات کے لئے ایک بڑی سند اور موخر الذکر کا ترجمہ تراکیب نحوی کے لئے ایک بہت عمدہ دستاویز ثابت ہوا۔
۴۔ جو آج روس۔ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے۔ اور
۵۔ انگریزی کے بعد عالمگیر حیثیت حاصل کر رہی ہے۔

چنانچہ حضرت تھانوی ایسے درویش کامل کی نظر انتخاب بھی اسی زبان پر پڑی۔ اور آپ نے اسی کو وعظ و تبلیغ اور تالیف و تصنیف کا ذریعہ بنایا۔ جہاں ارباب ندوہ تاریخ کو اردو کا جامہ پہنانے میں مصروف تھے۔ اور وقت کے ایک بہت بڑے تقاضا کو پورا کرنے میں کوشاں تھے۔ وہاں یہ گوشہ نشین سرمایہ دین کو اردو میں ذخیرہ کر لینے میں پیش پیش تھے اور یہ زبان اردو کی بہت بڑی خوش قسمتی تھی کہ اسے ...... ایسے یگانۂ روزگار مربی مل گئے تھے

ذخیرۂ اردو

یوں تو اردو میں اہل قلم کی بہت سی تصانیف و تالیفات موجود ہیں۔ مگر سب سے زیادہ اردو میں ذخیرہ کس کی کتابوں کا موجود ہے؟ اس سوال کا جواب مورخ اسلام سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

"علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں۔ جن کی تصانیف کے اوراق اگر ان کی زندگی کے ایام پر بانٹ دیے جائیں۔ تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے۔ امام جریری۔ حافظ خطیب بغدادی۔ امام رازی۔ حافظ ابن جوزی۔ حافظ سیوطی وغیرہ متعدد نام اس سلسلہ میں لئے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے نام بھی اس سلسلہ میں داخل ہیں۔ اس سلسلہ کا آخری نام مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔"

چنانچہ ۱۳۵۰ھ میں مولوی محمد عبدالحق صاحب فتحپوری نے بڑی تقطیع کے ۸۶ صفحات کی جو فہرست "تالیفات اشرفیہ" کے نام ...... سے شائع کی تھی۔ اس کی رو سے آپ کی چھوٹی بڑی سب تصانیف کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے۔ اور اگر اس فہرست میں ان کتابوں کو بھی شامل کر لیا

جائے۔ جن کے ذریعہ اہل علم نے کسی دینی غرض سے ترجمہ وتصرف فرمایا۔ یعنی تسہیل مضامین کی یا مختلف مقالات سے مضامین منتخب کر کے یکجا جمع کئے یا حضرت کے مضامین کا خلاصہ شائع کیا۔ تو یہ تعداد نو سو سے اوپر جا پہنچتی ہے۔

یہ ساری کتابیں ماسوائے "تجوید القرآن" "مثنوی زیر و بم" نثر میں ہیں۔ ان میں سے صرف تیرہ یا چودہ رسائل وکتب عربی زبان میں ہیں۔ تین فارسی زبان میں ہیں اور باقی سب اردو میں ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ صدی جو مطبوعات ومنشورات کے کمالات سے مملو ہے اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات واظہار میں ہو یا باطل کی نشر واشاعت میں۔ پریس اور مطبع ہی کی برکات ہیں۔ زبان وقلم اس صدی کے مبلغ ہیں۔ اور رسائل ومنشورات دعوی کے صحیفے ہیں"۔

اور اس صدی میں ہی زبان اردو کو عالمگیر حیثیت حاصل ہوئی۔ اردو انگریزی کی طرح بین الاقوامی زبان بننے لگی۔ اس لئے اس صدی کے مجدد نے بھی اپنے کمالات علمیہ کے لئے اسی زبان اردو کو انتخاب فرمایا۔ علوم قرآن۔ علوم حدیث۔ کلام۔ عقائد۔ فقہ۔ فتوی۔ سلوک تصوف اور مواعظ کثیرہ کا سب سے زیادہ ذخیرہ حضرت تھانوی نے ہی اردو زبان میں جمع کیا۔ یہاں تک کہ صنف نازک کے متعلق بھی سب سے پہلے آپ نے ہی اردو زبان میں اتنا دینی لٹریچر پھیلایا۔ اس سے پہلے ان کے لئے کوئی ایسی کتاب موجود نہ تھی۔ جو زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی رہنمائی کر سکتی۔ اور وہ گھر بیٹھے بلا استاد علوم دین سے بہرہ ور ہو سکتیں۔

ترجمہ قرآن اسلام میں علم کا اولین سفینہ وصحیفہ قرآن پاک ہے جس کے اردو میں اولین ترجمے حضرت شاہ عبد القادر اور حضرت شاہ رفیع الدینؒ نے شائع کئے تھے۔ مگر بعد ازاں زمانہ کے بدلتے ہوئے رجحانات اور اپنے جدید عقائد کے تحت سر سید احمد خاں نے بضمن تفسیر اردو میں ترجمہ کیا۔ اور جو تھا اردو ترجمہ شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد نے بھی ایسے ہی حالات میں کیا۔ ان ہر دو حضرات نے زبان پر تو زیادہ توجہ دی۔ مگر سلف کے طریق واسلوب کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ زمانہ کے تقاضوں اور اپنے اعتقادات کی بنیادوں پر قرآن کریم کے ترجمہ کرنے سے جماعت علماء میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ دہلی کے مشہور اخبار نویس

مرزا حیرت بھی ڈپٹی صاحب کا ترجمہ دیکھ کر حیرت میں آ گئے اور انہوں نے اس پر اعتراضات کرنے شروع کر دیئے اور جواب میں کسی عالم سے پانچواں اردو ترجمہ لکھوا کر اپنے نام سے شائع کر دیا حالانکہ وہ عربی سے بالکل نابلد تھے۔

ان حالات نے حضرت تھانویؒ کو اس میدان میں بھی عوام کی رہنمائی کے لئے مجبور کیا اور آپ نے ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمہ کی اصلاح کے لئے رسالہ "اصلاح ترجمہ دہلویہ" اور مرزا حیرت کے ترجمہ کی اصلاح کے لئے رسالہ "اصلاح ترجمہ حیرت" کے نام سے شائع کیا۔ آپ نے صرف اسی پر ہی اکتفا نہ کیا۔ بلکہ خود سارے قرآن مجید کا ترجمہ کر دیا جسے اردو میں بہترین ترجمہ کہنا چاہیئے اس کے متعلق مؤرخ اسلام سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:۔

"قرآن کریم کا سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی ہے۔ جس سے بڑے بڑے تراجم خالی ہیں۔ قرآن پاک کا سب سے صحیح ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی کا ہے۔ لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے۔ اسلئے عام اردو خواں کے فہم سے باہر ہے۔ مولانا تھانویؒ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یکجا ہیں۔ یعنی ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے۔ اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور محلوظ رکھی گئی ہے کہ اس زمانہ میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں ان کا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی ان ترجموں کے پڑھنے سے پیش نہ آئیں۔ اور پھر قرآن پاک کے لفظوں سے عدول بھی نہ ہونے پائے۔ اسی لئے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں۔ یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے"۔ (آثار جامعیت)

یہ صرف مسلمان اور قرآن کی ہی خدمت نہیں۔ بلکہ اردو زبان کی بھی خدمت ہے۔ جسے حضرت تھانوی کے طفیل ایسا صحیح۔ فصیح اور نادر سرمایہ دستیاب ہو گیا۔

تفسیر بیان القرآن ترجموں کی طرح حضرت کے بعض ہم عصر علماء نے اردو میں قرآن شریف پر بعض ایسے حواشی بھی لکھے۔ جن میں ربط آیات کے اظہار کے اہتمام کے ساتھ ساتھ آیات کو بتاویل واعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کر دیا۔ جس سے بعض مقامات پر ان کا قلم اعتدال کی حدود سے نکل گیا۔ اس سے حضرت تھانوی کو بہت صدمہ پہنچا۔ اور آپ نے ان تاویلات

بعدہ پر "التقصیر فی التفسیر" کے نام سے تنبیہات لکھیں اور اردو میں اپنی طرف سے ایک ایسی تفسیر بیان القرآن لکھی۔ جس سے صرف عوام ہی نہیں بلکہ علماء بھی مستفید ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں کیونکہ کسی عربی کتاب کو اردو میں بدلنے کا عام طور پر یہی مطلب سمجھا جاتا ہے کہ یہ اردو خواں طبقہ کی رعایت و سہولت کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں عربی جاننے والے علماء کو قطعاً لطف نہیں آتا۔ اور حضرت کی تفسیر کے متعلق بھی ایسا ہی خیال آپ کے معاصر علماء کو تھا۔ مگر تصنیف کے بو دمانن پر بارہ جب علوم قرآن کے ماہر حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جن کا تبحر علمی مسلّم و مشہور تھا) کی اس تفسیر اردو پر نظر پڑی۔ تو بس وجد میں آ گئے اور فرمایا:۔

"بیان القرآن کو دیکھ کر تو مجھے اردو کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ورنہ میں سمجھتا تھا کہ اردو کی کتابوں میں علوم عالیہ کہاں۔ نیز میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہو گی۔ مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت تھانوی نے اردو ادب میں ایسا بیش بہا اضافہ فرمایا کہ اس زبان سے التفات نہ کرنے والا طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہونے کے لئے مجبور ہو گیا۔ یہ تفسیر حضرت نے اڑھائی سال کے عرصہ میں مکمل فرمائی۔ جو بارہ جلدوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ مؤرخ اسلام سید سلیمان ندوی اس کی حسب ذیل خصوصیات تحریر فرماتے ہیں:۔

"سلیس و با محاورہ۔ حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ۔ بیچ "ف" کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر۔ تفسیری روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے۔ شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔ صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں۔ تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہل علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں۔ اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات وحقائق و معارف الگ لکھے گئے ہیں۔ ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر "روح المعانی" پر اعتبار فرمایا گیا ہے۔ یہ تفسیر اس لحاظ سے "حقیقتہً" مفید ہے کہ تیرھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے۔ اسلئے تمام قدما کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف و منتشر تحقیقات اس میں یکجا ملتی ہیں"۔ (بحوالہ صادر)

یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ بڑے بڑے ادیب اور اہل قلم سلیس عبارت لکھنے پر قطعاً قادر نہیں ہوتے۔ کیونکہ کچھ علم کا تفوق انہیں نیچے نہیں اترنے دیتا۔ اور کچھ علم کی وسعت انہیں عامیانہ زبان استعمال نہیں کرنے دیتی۔ علاوہ ازیں زبان کو سلیس و عام فہم بنانے کے لئے ذرا زیادہ غور و فکر اور تعب و مشقت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے وہ عادی نہیں ہوتے۔ مگر حضرت تھانوی مشکل تحریر کو آسان کرنے کے بادشاہ تھے۔ اسلئے آپ نے ترجمہ و تفسیر میں ایسا سادہ اور عام فہم انداز بیان اختیار فرمایا۔ تاکہ اس سے عوام فائدہ اٹھا سکیں۔ طبقہ علماء میں دینی علوم کو اردو ادب میں آسان اور سلیس زبان میں داخل کرنے کا شرف حضرت تھانوی کو ہی حاصل ہے

تجوید و قرأت

آپ نے صرف ترجمہ و تفسیر پر ہی اکتفا نہ فرمایا۔ بلکہ اردو ادب میں ایسی کتابوں کا بھی اضافہ فرمایا۔ جن میں

(۱) قرآن کریم کی تلاوت کرنے والوں کے لئے آداب و ہدایات درج تھیں۔ ملاحظہ ہو۔ آداب القرآن۔

(۲) قرآن کریم کو ترتیل و تجوید سے پڑھنے کے مسائل درج تھے۔ ملاحظہ ہو جمال القرآن

(۳) بچوں کے ذہن نشین کرانے کے لئے تجوید کے عام مسائل منظوم کئے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو۔ تجوید القرآن۔

(۴) اوقاف قرآنی کے بارہ میں قاریوں کے اختلافات کی توجیہ و تطبیق کی گئی تھی ملاحظہ ہو۔ رفع الخلاف فی حکم الاوقاف

(۵) قرأت سبع اور اس فن کی تفصیل بتائی گئی تھی۔ ملاحظہ ہو۔ تنشیط الطبع فی اجراء السبع

(۶) حفاظ قرآن کو قرآن سنانے میں جو متشابہات پیش آتے ہیں۔ ان سے بچنے کے گر بتائے گئے تھے۔ ملاحظہ ہو۔ متشابہات القرآن فی التراویح رمضان

تاکہ لوگوں میں خود قرآن فہمی کی استعداد پیدا ہو۔

حدیث و تصوف

اس زمانہ کے فتنوں میں ایک اضافہ تصوف کے غلط تصور نے بھی کیا ہے کہیں قولی و عملی بے قاعدگی کو تصوف سمجھا جاتا ہے۔ کہیں رسوم و بدعات کو تصوف تصور کیا جاتا ہے۔ کہیں کثرت اوراد و وظائف کو ہی تصوف قرار دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ

ا: بعضوں کے عقائد خراب ہو گئے ہیں۔

۲۔ بعض شرک میں مبتلا ہو گئے ہیں۔
۳۔ بعض اس سے اتنے متنفر ہو گئے ہیں کہ انہوں نے اسے خلاف شریعت قرار دے دیا ہے اور بزرگوں کی شان میں گستاخیاں کرنے لگے ہیں۔
۴۔ بعض نے طریقت کو شریعت سے الگ کر دیا ہے۔ کہ یہ اور چیز ہے اور وہ اور چیز
چونکہ ان باتوں کی بنیاد بالعموم ضعیف و موضوع احادیث پر رکھی گئی ہے۔ اسلئے ان سے ایک طرف تو منکرین حدیث کو اپنے فتنہ کو ہوا دینے میں مدد ملی ہے۔ اور دوسرے عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ فن سلوک اور اس کے مسائل احادیث نبوی سے ثابت نہیں۔
ان حالات و مفاسد سے متأثر ہو کر حضرت تھانوی نے اس کام کی طرف بھی پوری توجہ فرمائی اور اس سلسلہ میں آپ نے یہ گرانقدر کتابیں اردو میں لکھیں:۔
۱۔ **التکشف**۔ یہ کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں تصوف کی حقیقت کو کتاب و سنت سے ثابت کیا گیا ہے اور حقیقت طریقت۔ حقوق طریقت۔ تحقیق کرامت۔ تحقیق مسمریزم۔ تحقیق نزول متن وساوس۔ انوار و تجلیات۔ احکام روح۔ وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود۔ عینیت وغیریت۔ اخلاق۔ احوال۔ اشغال۔ تعلیمات۔ علامات۔ فضائل۔ عادات۔ رسوم۔ مسائل۔ اقوال۔ توجیہات۔ اصطلاحات وغیرہ کے متعلق ایسی روشنی ڈالی گئی ہے کہ تصوف لطیف و تصوف کثیف کی راہیں صاف صاف نظر آنے لگتی ہیں۔
۲۔ **التشرف**۔ یہ مذکورالصدر کتاب کا عربی حصہ ہے جو نافعیت کے خیال سے عربی میں لکھا گیا۔ جیسا کہ حضرت تھانوی کے اس ارشاد سے ظاہر ہے:۔
"اگرچہ افادۂ عام کا تقاضا تھا کہ یہ اردو میں ہوتا۔ مگر یہ عربی عبارت میں اسلئے رکھا گیا۔ کہ اس کے حصہ اول و دوم کی اکثر احادیث کی تخریج عراقی و مقاصد حسنہ سے نقل کی گئی ہے۔ اور "برکت کی خاطر ان کی عبارت کو نہیں بدلا گیا" اس کے بعد تقریر مسئلہ کے متعلق جو اپنی عبارت ہوتی تھی۔ اس کو بھی اس کے تابع رکھا گیا۔ اور حصہ سوم اسی کی موافقت میں شروع ہو گیا۔ اور افادہ عام کی مصلحت اردو ترجمہ سے پوری کر دی گئی۔ مگر حروف الف کے اختتام کے بعد۔ دفعتہ یہ بات خیال میں آئی۔ کہ وہ داعی تو رہا نہیں اور بلا ضرورت کام زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر اصل اردو میں لکھا جائے۔ تو بجائے کام زیادہ ہونے کے نفع زیادہ ہو۔ (ملاحظہ ہو تمہید التشرف حصہ چہارم)

اس سے ظاہر ہے کہ آپ کے پیش نظر ہمیشہ نفع رسانی رہی اور وہ بھی اردو کی زبانی رہی۔
غرضیکہ اس کتاب کو بھی اردو جامہ پہنا دیا گیا۔ اس میں احادیث کی تحقیق ہے۔ جو کتب تصوف میں
یا صوفیائے کرام کے کلام میں آئی ہیں۔ اور یہ دکھلایا گیا ہے کہ یہ حدیث کس درجہ کی ہے۔
اور جو روایات دراصل حدیث نہ تھیں۔ بلکہ غلطی سے عوام نے اس کو حدیث مشہور کر رکھا تھا۔
ان کی اصلیت ظاہر فرمانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ بزرگوں کا یہ قول فلاں دلیل
شرعی سے ثابت ہے۔ آپ کے مواعظ و ملفوظات میں بھی اس قسم کے ہزاروں مضمون ملتے ہیں

۳۔ اعلاء السنن۔ اس کی اس وقت تک بارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۹ جلدوں کی اشاعت
ہنوز باقی ہے۔ چونکہ غالی اہل حدیث حضرات حنفیہ کو یہ طعن دیتے ہیں کہ حنفی مسائل کی تائید میں
احادیث بہت کم ہیں۔ اور چونکہ کتب احادیث زیادہ تر محدثین اور حضرات شوافع کی لکھی ہوئی
ہیں۔ اسلئے ان میں حنفیہ کی مؤید حدیثیں یکجا نہیں ہیں۔ اس لئے اس میں مذہب حنفی کی مؤید
حدیثوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا۔ اور محدثین اور اہل فن کی تحقیقات اس
کے شروح و حواشی میں یکجا کئے گئے۔ اور افادۂ عام کے لئے اصل احادیث کا حاشیہ
پر اردو میں ترجمہ بھی کر دیا گیا۔

۴۔ قصد السبیل۔ اس میں فن سلوک کے وہ تمام حقائق و معارف جو سالہا سال میں معلوم
ہو سکے اور جن کے نہ جاننے سے سالکین و طالبین غلط راستوں پر پڑ کر منزل مقصود تک نہ پہنچ
سکتے تھے۔ اس طرح لکھ دئیے کہ کوزہ میں دریا بند کر دیا۔

۵۔ تربیت السالک۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کی بارہ سو بہتر صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس
میں سالکین کی مشکلاتِ راہ اور شاغلین و ذاکرین کے شبہات و خطراتِ راہ کے لئے ہدایات
درج ہیں۔ اس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:-
"علوم مکاشفہ و معاملہ کے متعلق کلیات و جزئیات اور احوال شخصی پر ایسی حاوی کتاب
کی نظیر تصوف کے سارے دفتر میں موجود نہیں۔" (آثار جامعیت)
اس سے استفادہ کو آسان کرنے کے لئے آپ نے اپنے خلیفہ مجاز حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری
سے اس کی تبویب کرائی تاکہ ہر ہر روحانی مرض کے متعدد معالجات یک جا مل سکیں۔

۶۔ بوادر النوادر۔ آپ کی آخری تصنیف ہے۔ جو بڑی تقطیع کے ایک ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی
ہے۔ یہ سفر آخرت سے چند روز پہلے شائع ہوئی۔ اس میں قرآن۔ حدیث۔ فقہ اور تصوف کے ادق

مسائل پر آپ کے تین سو ایسے عجیب و غریب۔ نادر اور تحقیقی مضامین درج ہیں۔ جو مختلف تصانیف میں منتشر تھے۔ مگر کسی مستقل تصنیف کا حصہ نہیں تھے۔ چونکہ وقتاً فوقتاً حوالہ کے لئے ان مضامین کی تلاش و تفحص میں کافی وقت ضائع ہوتا تھا۔ اور بے حد پریشان ہونا پڑتا تھا۔ اس لئے ان تمام نوادرِ علمیہ کو بوادر النوادر میں یکجا کر دیا گیا۔

اس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں بعض ایسے اہم ترین مسائل پر بھی تحقیقات موجود ہیں۔ جن پر حضرت سے قبل کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ ان کے علاوہ دورِ حاضرہ کے پیدا شدہ مسائل مثلاً ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا۔ روزہ کی حالت میں انجکشن لگوانا۔ نظم میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنا۔ منی آرڈر یا کرنسی نوٹ کے ذریعہ زکوٰۃ کا ادا کرنا۔ رویتِ ہلال کے متعلق تار کی خبر پر اعتبار کرنا۔ لاؤڈ سپیکر وغیرہ کا نماز میں استعمال کرنا۔ سرکاری فرائض کی ادائیگی کے لئے خفیہ پولیس والوں کا بہروپیہ بننا۔ حج کی فلم لینا۔ اور فلم دیکھنا۔ اخبار نویسی اور اخبار بینی وغیرہ ایسے امور پر تحقیقاتِ شرعیہ درج ہیں۔

۷۔ احکام القرآن۔ یہ حضرت کی وہ غیر مطبوعہ تصنیف ہے جو آپ نے اپنی ہدایات اور نگرانی میں آخری ایام زندگی میں لکھوانی شروع کی تھی۔ مگر افسوس کہ اس کام کی تکمیل حضرت کی حیات میں مقدر نہ تھی۔ آپ کی وفات کے بعد اس کتاب کی تکمیل کا کام مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی۔ مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی اور مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے سنبھال لیا۔ جو حضرت کے بنائے ہوئے خاکہ پر اس کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ مگر یہ کام ابھی تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔

اس کتاب کی وجہ تالیف یہ تھی کہ حضرت تھانوی کو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ مذہب حنفی کا موافق کتاب و سنت ہونا واضح کیا جائے اور اس بدنامی کا جواب دیا جائے۔ جو غیر مقلدین کی طرف سے شائع کی جاتی ہے کہ مذہب حنفی میں قیاس سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور حدیث کی مخالفت کی گئی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کو کتاب اعلاء السنن سے پورا کیا گیا اور اس کتاب میں ان فرعی احکام کو جمع کرنا مقصود تھا۔ جو حنفیہ نے قرآن سے اخذ کئے ہیں تاکہ دنیا پر واضح ہو جائے کہ مذہب حنفیہ میں قیاس سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ چونکہ دوسروں کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی۔ جہاں حنفیہ کی پہنچتی ہے۔ اس لئے وہ ان مسائل کو بھی جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں۔ قیاس سمجھتے ہیں۔ اس امر کی مزید وضاحت کے لئے آپ

ایسے مسائل اجماعی بھی ایک کتاب میں جمع کر دینا چاہتے تھے۔ جن پر تمام فقہار کا اتفاق ہے۔ مگر یہ کام صرف خیال کی حد تک رہا۔

۸۔ **ملفوظات**۔ حضرت تھانوی کے ملفوظات کا سلسلہ قریبًا ساٹھ مجلدات و رسائل میں مدون ہوا ہے۔ جو آپ کی نظر سے گذار کر چھاپا گیا ہے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:-

"ان ملفوظات میں بزرگوں کے قصے۔ سنجیدہ لطیفے۔ قرآن و حدیث کی تشریحات۔ مسائل فقہیہ کے بیانات۔ سلوک کے نکتے۔ اکابر کے حالات۔ طالبوں کی ہدایات و تنبیہات آداب و اخلاق کے نکات۔ اصلاحِ نفس و تزکیہ کے تجربات وغیرہ اس خوبی و دلچسپی سے درج ہیں کہ اہل شوق کے دل و دماغ دونوں اس آبِ زلال سے سیراب ہو جاتے ہیں"

(بحوالہ صدر)

غرضیکہ آپ نے علوم حدیث و تصوف پر اردو ادب میں ایسی نادر کتابوں کا اضافہ فرمایا ہے کہ سالکین و طالبین کے لئے عمل طریق کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں رہا۔ اسلئے یہ زبانِ اردو کے لئے قابل فخر سرمایہ سے کم نہیں۔

علوم فقہ حضرت تھانوی کو مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق کا خاص ذوق تھا جس کی وجہ سے آپ کے استاذ خاص مولانا محمد یعقوبؒ نے آپ سے طالب علمی کے زمانہ میں ہی افتاء کا کام لینا شروع کر دیا تھا۔ ویسے آپ نے اپنے طور پر باقاعدہ طور پر ۱۳۰۱ھ سے فتویٰ کا کام شروع فرمایا تھا۔ اور پورے ساٹھ سال یعنی ۱۳۶۲ھ تک فقہی خدمات انجام دیتے رہے۔ مگر آپ علوم فقہ میں مقلد جامد نہ تھے۔ بلکہ آپ نے اس سلسلہ میں نئی نئی راہیں نکالیں اور ایسی ایسی تحقیقات فرمائیں کہ اکابر علماء بھی داد دئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس ساٹھ برس کے عرصہ میں آپ نے ہزاروں مسائل کے جواب لکھے۔ ہزاروں فتوے دئے۔ سینکڑوں چھوٹے بڑے فقہی رسالے لکھے جو امداد الفتاویٰ کے نام سے متعدد ضخیم جلدوں میں موجود ہیں اور کم از کم ہندوستان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

چونکہ آپ کے زمانہ میں نئے نئے دینی اور دنیوی مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ جن کے متعلق سابقہ کتب فتاویٰ قریبًا خاموش تھیں۔ اسلئے آپ نے ان کے متعلق بھی نہایت بالغ نظری سے فتوے دئے۔ جو حوادث الفتاویٰ اور فتاویٰ اشرفیہ کے نام سے شائع ہوئے اور اس سلسلہ میں عورتوں کے لئے بہشتی زیور کی دس جلدیں اور مردوں کے لئے بہشتی گوہر کی ایک

جات بھی مرتب فرمائی۔ علاوہ ازیں پردہ۔ سود۔ رشوت۔ بنک۔ بیمہ۔ سینما۔ فلم۔ ریڈیو وغیرہ ایسے امور پر بھی متعدد فقہی تحقیقاتی رسالے تالیف فرمائے۔

اس سلسلہ کی بے نظیر کتاب ترجیح الراجح ہے۔ اس میں حضرت تھانوی نے اپنے ان مسائل کو جمع فرمایا۔ جن میں از خود یا کسی دوسرے کے توجہ دلانے سے کوئی تسامح نظر آیا۔ تو اس سے رجوع فرما کر مسئلہ کی مزید تحقیق فرما کر تصحیح کر دی۔ یہ سلسلہ آپ کی تواضع۔ انصاف پسندی اور شرافت نفس کا مظہر ہے۔ اس طرح آپ نے اس دور فتن میں اردو ادب میں ایک ایسی نظیر قائم فرمائی جس کی متاخرین میں بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ تابعین و تبع تابعین اور سلف صالحین میں یہ طریق رائج تھا۔

غرضیکہ اس باب میں بھی آپ نے اردو ادب میں قابل رشک اضافہ فرمایا۔ جس سے نہ صرف عوام بلکہ اہل علم بھی مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں۔

علم الکلام

علم کلام۔ عقائد اور توحید پر آپ نے متعدد کتابیں اردو میں لکھیں۔

۱۔ المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلامی احکام و مسائل کے مصالح و حکم درج ہیں۔

۲۔ الانتباهات المفیدہ عن الاشتباهات الجدیدہ میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ذہنی وساوس و خدشات کا تسلی بخش جواب لکھا۔ جواب "اسلام اور عقلیات" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

۳۔ اس سلسلہ کی مفید کتاب الرسالۃ الحمیدیہ مصنفہ شیخ حسین بن محمد جسر طرابلسی متوفی ۱۳۲۷ھ کا اردو ترجمہ مولانا محمد اسحاق صاحب سے کرا کر اسلام اور سائنس کے نام سے شائع کرایا۔

ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کئی رسائل وقتاً فوقتاً حسب ضرورت تحریر فرمائے۔ تاکہ عوام تہذیب جدیدہ کے فریب خوردگان کے فتنوں سے بچ سکیں۔ دراصل ایسے لوگوں کے پیدا کردہ اشکالات و وساوس کا اردو ادب میں توڑ حضرت کی ایسی کتابوں کے سوا اور کہیں تسلی بخش انداز میں موجود ہی نہیں نہ ہی کسی دوسرے طبقہ کی طرف سے اس طرف اتنی توجہ دی گئی ہے۔ جس کا یہ مستحق ہے۔ اگر اس سلسلہ میں ایک جماعت نے قدم بڑھایا بھی ہے تو وہ چند قدم ہی چل کر اغراض کی دلدل میں ایسی پھنسی ہے کہ اصل مقصد یعنی افادۂ خلق کو بھی بھول گئی ہے۔

اصلاحیات حضرت تھانوی کا مقصدِ حیات ہی چونکہ اصلاحِ امت تھا۔ اسلئے آپ نے ہر شعبہ حیات کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی۔ عوام کے لئے مواعظ کا سلسلہ شروع فرمایا جن میں سے اکثر ضبطِ تحریر میں لائے گئے۔ ان سے قبل صرف ابن بنا قہ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے چند مواعظ ملتے ہیں۔ مگر ان کے سوا پورے چودہ سو سال کے اندر جن بزرگوں نے وعظ فرمائے۔ ان کا کوئی مستند اور مفید ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ اور حضرت تھانوی کے چار سو مواعظ مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ جو احکام اسلامی۔ رد بدعات۔ نصائح پلپذیر اور مسلمانوں کے لئے مفید تدابیر و تجاویز پر مشتمل ہیں اور یہ سب کے سب بوقت وعظ لفظ بلفظ قلمبند ہوئے اور حضرت کی نظر سے گزار کر ہی شائع کیے گئے۔

اس سلسلہ کی اہم ترین کتاب حیات المسلمین بھی ہے۔ جس میں قرآن و حدیث کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے دینی و دنیوی ترقی و فلاح کا پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت حضرت کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ "اپنی ساری کتابوں سے اس کتاب کو ذریعہ نجات گمان کرتا ہوں"۔ اس کتاب کے مرتب کرنے میں حضرت نے جس قدر محنت فرمائی۔ ویسی کسی اور کتاب کے لئے نہ اٹھائی۔

اس کے علاوہ بھی آپ نے مسلمانوں کی اخلاقی۔ اجتماعی۔ معاشرتی زندگی کی اصلاح۔ ایسے اسلامی طریق اور شرعی نہج پر گزارنے کے لئے دیگر بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے۔ جن سے نہ صرف صراط مستقیم کی طرف راہنمائی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ انسان کو منزلِ ہدایت پہنچانے کی بھی ضامن ہیں۔ ایسی کتابوں میں اصلاحِ الرسوم۔ اصلاحِ امت۔ اصلاحِ انقلاب اصلاحِ خیال اور صفائی معاملات خاص طور پر مشہور ہیں۔

آپ کی نظرِ توجہ سے محراب و منبر بھی محروم نہیں رہے تھے اور آئمہ مساجد اور خطیبوں کے لئے آپ نے

۱۔ خطبات الاحکام کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی۔ جو پچاس خطبات پر مشتمل ہے جن میں اخلاق، عقائد اور ترغیب و ترہیب کے زیادہ مضامین ہیں اس سلسلہ کی دوسری کتاب

۲۔ الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ ہے۔ جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے منتخب فرما کر اردو میں منتقل کیا ہے۔ تاکہ جمعہ و عیدین کے موقعہ پر مسنون خطبات پڑھے جائیں۔ اور غیر مستند خطبات پڑھنے سے آئمہ مساجد

کو بچایا جائے۔

چونکہ یہ افراط و تفریط کا دور ہے۔ اسلئے ہر معاملہ میں اس کو دخل ہے جس کی وجہ سے بعض ایسے اوراد شائع و مروج ہو گئے ہیں۔ جو غیر شعوری طور پہ انسان کو شرک کی حدود میں داخل کر دیتے ہیں مسلمانوں کو اس گناہ سے بچانے کے لئے آپ نے مناجاتِ مقبول مرتب فرمائی جس میں قرآن وحدیث میں وارد دعائیں جمع کر دی گئیں ہیں۔ اور پورے ہفتہ پران کو پھیلا کر سات منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ تاکہ ہر شخص کو ہر روز پڑھنے میں آسانی رہے۔ اور دیگر مواقع کی دعائیں بھی ساتھ درج ہیں۔ عربی حصہ قربات عند اللہ وعند الرسول کے نام سے موسوم ہے۔ اور اردو حصہ جو نظم پر مشتمل ہے۔ مناجاتِ مقبول کے نام سے یہ کتاب صرف عوام میں ہی مقبول نہ ہوئی بلکہ دربار رسالت میں بھی اسے شرف قبولیت حاصل ہوا۔ اور حضور ؐ نے عزیز الرحمٰن صاحب زمیندار بنجولی ضلع میرٹھ کو عالم خواب میں فرمایا کہ "تم مناجات مقبول جو اشرف علی صاحب نے لکھی ہے۔ پڑھا کرو" بلکہ شریف احمد صاحب گنج پوری ضلع کرنال کو تو خواب میں آپ نے یہ فرمایا کہ:۔

"مولانا اشرف علی صاحب کی کتابوں پر عمل کرتے رہنا۔ اور دوسروں کے کہنے سے مت کرنا"

تفصیل کے لئے دیکھئے باب منامیات۔ اشرف السوانح جلد سوم

عوام کو جاہل پیروں اور دکاندار صوفیوں کے غیر شرعی تعویذ گنڈوں سے بچانے کے لئے اردو میں اعمالِ قرآنی و آثار تبیانی کے نام سے رسالے لکھے۔ جن میں قرآن مجید کی بعض آیات کے ایسے فوائد و خواص درج فرمائے۔ جو بزرگوں کے تجربہ میں آچکے ہیں۔

نوادر علمیہ غرضیکہ حضرت تھانوی نے اردو ادب میں کثیر تعداد میں سنجیدہ۔ پاکیزہ۔ دینی لٹریچر کا اضافہ کر کے امت مسلمہ کو گمراہی و بے راہ روی سے بچانے اور کتاب و سنت پر چلانے کا اتنا سامان کر دیا ہے۔ جو قیام قیامت تک کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ ایک مؤقر جریدہ لکھتا ہے کہ

"آپ نے چالیس پچاس کے قریب وہ مستند دینی کتب تصنیف فرمائی ہیں۔ جن کا جواب اس وقت اسلامی لٹریچر میں موجود نہیں۔ مولانا اس دنیا سے چلے گئے ہیں لیکن اپنے پیچھے مسلمان قوم کے لئے ایک زبردست علمی اور مذہبی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں۔ جو قیامت تک مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کرے گا۔"

ایک دوسرا جریدہ لکھتا ہے:۔

"مولانا نے متعدد کتابیں تو ایسی تصنیف کی ہیں۔ کہ جن کی نظیر سلف میں بھی نہیں

پائی جاتی "۔

کمال انتشار ایک اہل علم واہل فضل اور ماہر نفسیات و سیاسیات نے اپنے مشاہدہ کی بنار پر ایک مقالہ "الفیض الجاری" صاحب اشرف السوانح کی استدعا پر لکھا تھا جو اشرف السوانح حصہ سوم صفحہ ۳۲۸ پر درج ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

حضرت کی خدمت میں حاضری کے بعد جب سے حضرت کے علوم و معارف کا کچھ اندازہ ہوا۔ اب تو بلا مبالغہ یہ حال ہے "چشم بد بین کند بہ کس نگاہ ہے"۔ جتنا علم جتنا عمق اور جتنا ذوق واثر حضرت کی تحریروں میں ملتا ہے۔ کہیں نصیب نہیں حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کثیر تصانیف کے باوجود حضرت کا طرز تحریر اتنا قلیل الالفاظ، کثیر المعانی کیسے ہے۔ پھر اکثر دیکھئے گا کہ جس معنی و مفہوم کو جس لفظ و عبارت سے ادا فرمایا گیا ہے جو صحت و جامعیت اس میں ہے۔ وہ اس کی جگہ کسی دوسری تعبیر سے نہیں حاصل ہوتی۔ سچ پوچھئے تو انتشار کا کمال یہی ہے۔

باقی مضمون و معانی کے لحاظ سے تو معمولی خطوں سے لے کر ضخیم مجلدات تک میں شاید ہی کوئی لفظ حضرت کے قلم سے خالی تحسین کلام یا عبارت آرائی کے لئے نکلا ہو۔ ہر لفظ اور ہر فقرہ کسی نہ کسی معنوی افادہ کا حامل ہوتا ہے۔ طبیعت میں مضمون و معنی کی طلب ہو۔ تو پھر حضرت کی تحریر ایسی جاذب و دلچسپ معلوم ہونے لگتی ہے کہ کوئی حرف چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور آج کل کی کثیر اللفظ و قلیل المعنی انشار پردازی سے تو سخت وحشت و ملال ہونے لگتا ہے"۔

چونکہ صاحب اشرف السوانح نے کسی وجہ سے انکے نام کو پردہ اخفا میں رکھا ہے اسلئے ہم بھی اس پردے پردہ اٹھانا مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ اہل فہم حضرات انداز بیان سے سمجھ جائیں گے۔ کہ یہ کون صاحب ہیں۔

اعجاز بیان حضرت تھانوی جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے۔ تو پھر اس کا کوئی ضروری پہلو نظر انداز نہ ہونے دیتے۔ چنانچہ ایک جریدہ لکھتا ہے کہ حضرت کی:۔

" تصنیفات میں بلکہ ہر تحریر میں اہل نظر کو یہ معلوم ہوگا کہ مصنف کے سامنے سارے مسائل و مواد یکجا ہیں اور وہ سب کو اپنی اپنی جگہ احتیاط سے رکھتا جاتا ہے۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ مصنف جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے۔ اس کو اس میں ایسا غلو

ہو جاتا ہے کہ دوسرے گوشوں سے اس کو ذہول ہو جاتا ہے۔ حضرت کی تصانیف
کی خاص بات یہ ہے کہ قلم ہر ایک کی احتیاط اور رعایت کر کے اور غلو سے بچ کر
اس طرح نکلتا ہے کہ جاننے والوں پر حیرت چھا جاتی ہے۔"

علاوہ ازیں ایسے غیر دلآزارانہ مشفقانہ اور محبوبانہ انداز میں مکمل۔ مدلل اور مؤثر بحث فرماتے کہ کسی کے لئے گنجائش اعتراض و انکار باقی نہ رہتی۔ کیونکہ دل میں پیدا ہونے والے ہر اشکال کا جواب ساتھ ساتھ ملتا جاتا۔ جس کی وجہ سے مضامین خود بخود دل نشین ہوتے چلے جاتے۔ اور چھوٹے چھوٹے فقروں میں اس طرح حقائق و معارف کے دریا بند کر دیتے کہ بڑے بڑے اہل زبان اور اہل قلم دنگ رہ جاتے۔ جس کی کچھ مثالیں "حسن تحریر" میں گذر چکی ہیں۔ اور کچھ آئندہ "لطافت و ظرافت" کے باب میں آویں گی۔ چنانچہ البرہان دہلی اپنی اگست ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:۔

"مولانا کی تحریروں میں اسرار و نکات کے علاوہ ایسا عجیب و غریب منطقی اور عقلی استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا حریف بھی تصدیق و تائید سے کوئی مفر نہیں دیکھتا۔ جس بات کو بیان کرتے ہیں۔ نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ حضرت مرحوم کی تحریریں اور گفتگو میں غیر معمولی ذکاوت و فطانت کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ بات سے بات پیدا کرنا اور ہر معاملہ کی اصل حقیقت کو پہنچانا اُن کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔"

حق تصنیف حضرت تھانوی چونکہ تصنیف و تالیف کا کام اشاعت و خدمتِ دین کی خاطر خالصاً لوجہ اللہ کرتے تھے۔ اسلئے آپ اپنی کسی کتاب کا حق تصنیف نہیں لیتے تھے یہاں تک کہ مطبوعہ کتاب مانگنے کے بھی روادار نہ تھے۔ از خود کوئی بھیج دیتا۔ تو قبول فرما لیتے اسی لئے آپ نے اپنی کوئی کتاب نہ خود رجسٹری کرائی۔ نہ کسی دوسرے کو رجسٹری کرانے کی اجازت دی۔ بلکہ آپ نے اس سلسلہ میں باقاعدہ طور پر اعلان شائع فرمایا تھا کہ:۔

"چونکہ یہاں کی تصانیف پر کسی سے کچھ حق تصنیف وغیرہ نہیں لیا جاتا۔ اسلئے ان کی رجسٹری کرانے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔" (یکم جمادی الاولی ۱۳۳۲ھ)

مگر اس کے باوجود دہلی کے ایک مشہور ناشر نے تفسیر بیان القرآن اپنے مطبع کے نام رجسٹری کرالی۔ جسے بالآخر مقدمہ کے ذریعہ اس خود غرضانہ حرکت سے باز رکھا گیا۔

اشاعتِ علم و دین کی خاطر حقِ تصنیف ترک کرنے کے متعلق "البرہانؒ" دہلی اپنی مذکورۃ الصدر اشاعت میں لکھتا ہے کہ :-

"مولانا کی تصنیفات جو اب تک طبع ہو چکی ہیں۔ ان کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ سے کم نہیں ہے۔ مولانا کی سیر چشمی اور فیاضی۔ خلوص اور للّہیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوصف آپ نے کبھی کسی کتاب کا حقِ اشاعت و طبع اپنے لئے محفوظ نہیں رکھا۔ ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کرانے کا اذنِ عام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں مولانا کا صرف یہ ایک عمل ہی ایسا ہے۔ جو آج کل بڑے بڑے نامور علماء کے لئے سرمایۂ عبرت اور درسِ موعظت ہو سکتا ہے۔"

مقبولیتِ عامہ

یہی رسالہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ حضرت تھانوی کی:-

"تصانیف کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں۔ علماء فضلاء اربابِ شریعت اور اصحابِ طریقت۔ مرد اور عورتیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اردو خواں ہر ایک ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اور اپنے لئے اصلاحِ ظاہر و باطن کا سامان بنا سکتا ہے۔"

اسی لئے آپ کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں ہر زمانہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس معاملہ میں ہندو پاکستان میں یہ شرفِ اولیت صرف حضرت تھانوی کو ہی حاصل ہے۔ اور کسی مصنف کی اس قدر کتابیں آج تک شائع نہیں ہوئیں۔ اسی لئے ایک مؤقر جریدہ لکھتا ہے کہ:-

"مولانا کے ترجمۂ قرآن پاک اور کتب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کا ایک گھر بھی ایسا نہیں ہے۔ جس میں مولانا مرحوم کا مترجم قرآن مجید اور دینی کتب موجود نہ ہوں۔"

اردو کے محسنِ اعظم

ایسے حالات میں جبکہ حضرت تھانوی نے

۱۔ اردو لٹریچر میں بے نظیر۔ دلپذیر اور کثیر اسلامی لٹریچر کا اضافہ کیا ہو۔

۲۔ خلق اللہ کو اس سے کثیر دینی اور دنیوی فائدہ پہنچایا ہو۔

۳۔ لاکھوں روپے کا حقِ تصنیف چھوڑ کر اردو ادب کی نشر و اشاعت کرنے والوں کیلئے معقول روزگار مہیا کیا ہو۔

کوئی وجہ نہیں کہ اردو ادب کی تاریخ لکھنے والا حضرت تھانویؒ کو اردو کا محسن اعظم قرار دیتے ہوئے محسنانِ اردو ادب کی فہرست میں آپ کا نامِ نامی سر فہرست نہ رکھے۔

ظرافت و لطافت

حقیقتِ مزاح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مجلس نبوی کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان فرماتے تھے کہ جن باتوں پر لوگ ہنستے تھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ ہنسنے میں شریک ہو جاتے تھے۔ اور جن باتوں پر لوگ متعجب ہوتے تھے حضور بھی ان کے ساتھ اظہارِ تعجب فرماتے تھے۔ اور جب کوئی مزاح کا موقع پیدا ہو جاتا۔ تو بڑی بے تکلفی سے نہایت ہی لطیف و پاکیزہ مزاح بھی فرماتے تھے۔ جسے بعض ظاہربین حضرات شانِ نبوت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ ملکہ وکٹوریہ نے بھی حضرت تھانوی سے خواب میں یہی سوال کیا کہ:-

"مجھے اسلام حق مذہب معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ پیغمبر اسلام لوگوں سے مذاق کیوں کرتے تھے۔ نبوت تو بڑی چیز ہے۔ عام تہذیب میں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

حضرت تھانوی کا دماغ جس طرح عالمِ بیداری میں کام کرتا تھا۔ اسی طرح عالمِ خواب میں بھی مصروفِ کار رہتا تھا۔ آپ ماشاءاللہ حاضر جواب تو تھے ہی۔ فوراً ملکہ کو حالتِ خواب میں جواب دیا کہ:-

"اس سے لوگوں کو مانوس بنانا مقصود تھا۔ ورنہ حضور کے رعب سے لوگ کھل کر دل کی بات نہ کہہ سکتے۔"

اس جواب سے ملکہ مطمئن ہو گئی اور اس کا اشکال رفع ہو گیا۔

اسی طرح بعض کم فہم ظرافت کو شانِ درویشی یا علم و فضل کے منافی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ متین و لطیف ظرافت شگفتہ مزاجی کی دلیل ہوتی ہے۔

حقیقتِ بدخلقی حضرت تھانویؒ کو ان کے ناداں دوستوں اور غالی عقیدت مندوں نے تند مزاج اور خشک مشہور کر رکھا تھا۔ مگر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنے تعلقات کے دوران میں معاملہ الٹ پایا۔ اسلئے انہوں نے حضرت تھانوی کے حسنِ اخلاق اور آپ کی ذاتی عنایتوں اور شفقتوں سے متاثر ہو کر ایک دفعہ آپ کو لکھا کہ:-

"وہ کتنے ظالم اور بے درد لوگ ہیں۔ جو ایسے سرچشمۂ لینت کو خشک مزاج کہتے ہیں"

حضرت تھانوی نے اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ:-

"مجھ کو خشک مزاج کہنے والے ایسے ہی معذور ہیں۔ جیسے کوئی عرق تنباکو کو نسبتہً خشک کہے۔ اور اصل تو یہ ہے کہ جو شخص ان لوگوں کا تابع نہ ہو۔ وہ خشک و بد خلق ہے۔" (حکیم الامت ص۳۷)

ظرافتِ طبع حضرت تھانوی لطیفہ گوئی۔ بذلہ سنجی اور مزاج لطیف کے بادشاہ تھے۔ اور اپنے ملنے والوں سے اکثر باتیں شیخ خفت و ممتنت نہایت لطیف و پاکیزہ مزاح فرمایا کرتے تھے۔ جس سے چہروں پر بشاشت کھیلنے لگتی تھی۔ اور مرعوب طبائع زیادہ مانوس ہو جاتی تھیں۔ مندرجہ ذیل چند مثالوں سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:۔

۱۔ ایک مرتبہ منصبِ افتاء کی ذمہ داریوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ فرمانے لگے کہ مفتی ہونا کبھی قیمتی کا کام ہے۔ مفتی کا نہیں۔

۲۔ عرض کیا گیا کہ فلاں صاحب کو اپنے ابدال ہونے کا خیال ہو گیا ہے۔ فرمایا۔ ہاں! پہلے گوشت تھے۔ اب دال ہو گئے ہیں۔

۳۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب اپنے چند دوستوں کے ساتھ خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ انہیں آتا دیکھ کر فرمانے لگے۔ انجن تو چھوٹا سا ہے۔ مگر گاڑیاں بہت سی کھینچے لا رہا ہے۔

۴۔ شملہ کے سفر کے بعد وہاں کی غالب برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم تو سنا کرتے تھے کہ شملہ بمقدار علم ہوگا۔ لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شملہ بمقدار جہل ہے۔

۵۔ نئی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تہذیب نہیں۔ تعذیب ہے۔ اور آج کل کی ہمدردی انہیں ہمہ دردی ہے۔

۶۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے آپ کو طویل خط لکھنے کی معذرت چاہی۔ تو فرمایا کہیں طولِ زلفِ محبوب بھی کسی کو ناگوار گذرتا ہے۔

۷۔ ایک بار مولانا عبدالماجد صاحب نے آپ کو لکھا کہ انگریزی ترجمہ قرآن کا انشاءاللہ رمضان سے شروع کرونگا تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس خبر سے تو میری رمضان میں ہی عید ہو گئی۔

۸۔ ایک مرتبہ ایک صاحب سے تحریک خلافت پر گفتگو فرما رہے تھے تو آپ نے فرمایا کہ بلا امیرالمومنین کچھ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو امیرالمومنین بناتے ہیں۔ فرمایا جب تک امیرالمومنین میں قوتِ قہریہ نہ ہو۔ وہ امیرالمومنین ہی نہیں۔ میں ایسا امیرالمومنین نہیں بننا چاہتا کہ آج تو امیرالمومنین بنوں

اور کل کیا سیر اکا قرین ہو جاؤں۔

۹۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے اپنے ہم نام مولانا عبدالماجد بدایونی کی وفات پر حضرت کو دعا کے لئے لکھا۔ حالانکہ ان کا دل حضرت سے قطعاً صاف نہ تھا۔ حضرت نے جواباً تحریر فرمایا کہ میں نے دعا کر دی ہے۔ کہ:۔

"اے اللہ میں نے سب کچھ ان کو معاف کیا۔ آپ بھی معاف فرما دیں اور ان کو تو ایک خاص امتیاز حاصل تھا۔ کہ وہ بدایوں کے متوطن تھے۔ یہ ہمارے شیخ المشائخ حضرت سلطان جی کا وطن ہے۔ میں تو اخیر اہل بدایوں کے لئے یہ سمجھ کر ایسے امور کو ادا کرتا ہوں کہ بدا۔ یوں۔ یہی تھا"

اس پر مولانا عبدالماجد صاحب تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

مولانا (وہی خشک مزاجی کے لئے بدنام مولانا) رعایت لفظی کے استاد ماہر تھے بدایوں کی مناسبت سے پورا فقرہ بدا۔یوں۔ یہی تھا۔ کیا خوب کہا (حکیم الامت ص۲۲۰)

۱۰۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے آپ کو ایک خط میں لکھا کہ:۔

اب تو یہ تجربہ بار بار ہو چکا ہے کہ ادھر دعا کے لئے عریضہ روانہ ہوا۔ اُدھر قبولِ دعا کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور حضرت رومیؒ کے قول کی تصدیق ہو گئی ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں، می دہد یزداں مرادِ متقین

جس کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا کہ:۔

"جب تک میرے پاس خط نہ پہنچے۔ اس وقت تک تو چنیں خواہی کا مصداق آپ ہوں گے۔ الحمدللہ تواضع کے بعد ایک کمال کا تو اقرار کیا"

مولانا جس لطیف انداز سے مزاح فرماتے رہتے اس کی مثالیں تو اوپر بھی جا بجا گزر چکی ہیں۔ باقی یہ تو چنیں خواہی کے تحت میں لطیفہ تو بھولنے والی چیز نہیں (حکیم الامت ص۲۲)

۱۱۔ ماسٹر محمد شریف صاحب نے لکھا کہ حضرت اب کھانسی کا کیا حال ہے تو تحریر فرمایا کہ کھانسی کو جھانسی بھیج دیا ہے۔

۱۲۔ ماسٹر صاحب موصوف نے ایک اور خط میں گھر کے لئے تعویذ مانگا کہ اللہ تعالیٰ درد زہ سے محفوظ رکھے۔ تحریر فرمایا کہ جب درد ہی نہ ہوگا۔ تو بچہ کیسے پیدا ہوگا۔ کسی دائی مائی سے تو پوچھو۔

لطافت طبع | حضرت تھانوی کی زبان فیض ترجمان اور قلم حقیقت رقم سے اکثر ایسے چھوٹے چھوٹے

فقرے نکلا کرتے تھے۔ جن کے ذریعہ آپ کثافت کو لطافت میں بدل دیتے تھے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ظاہر ہے۔

۱۔ ایک طالب علم نے لکھا کہ میں نے اپنے قلب کو آپ کی تنبیہ کے بعد ایسا پایا۔ جیسے اس کے اندر گوہ ور گوہ ہو رہا ہو۔ آپ نے جواب بھیجا کہ:۔

"مبارک ہو۔ یہ گوہ خاکساری کی خاک سے مل کر کھاد کا کام دیگا۔ اور ایسی اجناس پیدا ہوں گی کہ روحانی غذا ہو جاویں گی"۔

۲۔ ایک طالب علم نے شکایت کی کہ میں تو بالکل کورا ہو گیا ہوں۔ فرمایا کورا ہونا برا نہیں کور ہونا برا ہے۔ بلا سے کورا ہو کور نہ ہو۔

۳۔ ایک طالب علم نے غلبۂ خشیت میں لکھا کہ مجھے سخت خطرہ درپیش ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ یہ خطرہ تو بحر معرفت کا قطرہ ہے۔ اللہ تعالےٰ اس کو بڑھا کر دریا کر دے۔

۴۔ اس سلسلہ میں ایک اور نے لکھا کہ سخت الجھن ہے۔ تحریر فرمایا کہ یہ الجھن تو مقدمہ ہے سلجھن کا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔

۵۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ اس طریق میں خود رائی نہ کرے۔ بلکہ خود کورائی کرے۔ یعنی اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھے۔ بس دھن اور دھیان میں رہے۔

۶۔ فرمایا آج کل لوگوں کی نظر مال پر تو ہے۔ مآل پر نہیں۔

۷۔ ایک طالب نے عبادت میں کسل اور سستی کا علاج پوچھا۔ تحریر فرمایا کہ سستی کا علاج چستی۔

۸۔ اسی طرح کسی نے درشتی کی شکایت کی۔ فرمایا درشتی ہی سے تو درستی ہوتی ہے۔

۹۔ ماسٹر محمد شریف صاحب نے ایک مرتبہ ایک امر کے متعلق لکھا کہ اس میں پریشانی مذموم تو نہیں۔ تو تحریر فرمایا کہ اس سے بعض اوقات پردے کی شان مل جاتی ہے۔

اختصار و جامعیت حضرت تھانوی کی زبان فیض ترجمان اور قلم ہدایت رقم سے ایسے چھوٹے چھوٹے فقرے بھی بکثرت نکلتے رہتے تھے۔ جو علم و معرفت کے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مصداق ہوتے تھے۔ جیسا کہ "حکیم الامت" کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے:۔

۱۔ ایک مرتبہ السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا (بمبئی) میں حضرت خالد بن ولید کے متعلق ایک نہایت ہی بیہودہ افسانہ شائع ہوا جس کا جواب دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رفیق مولانا شاہ معین الدین احمد

نے "معارف" میں شائع کیا۔ اسے پڑھ کر لکھا کہ:۔

"بہت کافی بلکہ شافی وافی اور شبہات کا کافی جواب لکھا ہے"۔

۲۔ مولانا دریابادی نے ایک مرتبہ زیادہ کھانا بھیج دیا۔ جو دونوں گھروں میں بھیجنے کے بعد بچ رہا۔ اس پر انہیں لکھا کہ:۔

"حقیقت تو اس کی تالّف تھی۔ مگر صورت اس کی تکلف کی ہو گئی"۔

۳۔ ایک دفعہ دو شادیوں پر جو گفتگو چلی۔ تو فرمایا کہ:۔

"دو بیویوں کا نباہنا سلطنت کے چلانے سے زیادہ مشکل ہے"۔

۴۔ مولانا موصوف نے لکھا کہ گو جتنی محنت کو دل چاہتا ہے ابھی اس کا نصف بھی کام نہیں کرتا۔ لکھا کہ:۔

"دل کے چاہنے پر عمل نہ کیا جائے۔ عقل کے فتویٰ پر عمل کیا جائے"۔

۵۔ مولانا موصوف کی درخواستِ دعا کے جواب میں لکھا:۔

"آپ کے لئے بھی خوب دعا کی۔ تحصیل کی بھی۔ تعدیل کی بھی۔ تکمیل کی بھی۔ تسہیل کی بھی۔ ومن اللہ التوفیق"۔

۶۔ مولانا نے لکھا کہ گیہوں کے ساتھ گھن کا پسنا تو سنتا تھا۔ یہ گھن کے ساتھ گیہوں پسا جا رہا ہے۔ جواب میں تحریر فرمایا۔

"تو ضرر کیا ہوا۔ اس کو تو اور قابل انتفاع بنا دیا۔ پسنے کے قبل تو وہ روٹی نہیں بن سکتا تھا۔ پسنے سے روٹی بن گیا"۔

۷۔ ایک سوال کے جواب میں لکھا:۔

"یہ ایک مجاہدہ ہے۔ اور مجاہدہ ایک معالجہ ہے۔ اور معالجہ کے لئے منقول یا ماثور ہونا ضروری نہیں۔ ہاں منہی عنہ نہ ہونا ضروری ہے"۔

۸۔ فرمایا کہ:۔

"تقویٰ تو ایک کمال ہے۔ اس کا دعویٰ خود ایک نقص ہے"۔

۹۔ ایک سوال کے جواب میں لکھا کہ:۔

"اگر حق تعالیٰ سے تعلق قوی کیا جائے۔ تو اس سے سب تعلقات ضعیف ہو جائینگے اور کلفت کا احتمال ہی نہ رہے گا"۔

۱۰۔ فرمایا
بعض بے تمیزی جب اس کا منشا صحیح ہو۔ تمیز سے محبوب ہوتی ہے۔"

۱۱۔ ایک مرتبہ ماسٹر محمد شریف صاحب نے لکھا کہ حضرت بیقراری سے بھی کسی طرح طبیعت کو قرار آسکتا ہے۔ تحریر فرمایا کہ
"میں معصیت کا علاج بتلاتا ہوں نہ کہ مصیبت کا۔"

خشونت

خاصۂ فطرت فطرتِ انسانی کا یہ خاصہ ہے کہ
(الف) جب انسان کی عقل و فہم کسی بات کی اصلیت و حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی۔ تو وہ اس کے متعلق ظن و تخمین سے کام لینا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب اس کا نفس تاویل کرنے پر تل جاتا ہے تو پھر کوئی قطعی دلیل اسے مطمئن نہیں کر سکتی۔
(ب) جب اس کے کسی محسن مخلص۔ مربی۔ دوست یا رشتہ دار سے کوئی ایسی بات صادر ہوتی ہے۔ جو اس کی خواہش و توقع کے خلاف ہوتی ہے۔ تو وہ اس بات کے اسباب و علل پر غور کئے بغیر اور اپنے تمام سابقہ اچھے تعلقات کو نظر انداز کرتے ہوئے فی الفور غیظ و غضب میں آجاتا ہے اور اسے جلی کٹی سنانے لگ جاتا ہے۔
(ج) بعض عقیدت مند اپنے مصلح یا مرشد کی ہر بات کو حرف آخر سمجھنے کے عادی ہوتے ہیں حالانکہ اس کا ہر فعل موقع و محل کے تابع ہوتا ہے۔ اور موقع و محل کے بدل جانے سے نوعیتِ اصلاح بھی بدل جاتی ہے۔ مگر وہ اس پر غور کئے بغیر لکیر کے فقیر ہی رہتے ہیں۔
حضرت تھانوی کو بدنام کرنے والے زیادہ تر انہی لمبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

رازِ شہرت حضرت تھانویؒ کی شہرت دیگر سے زیادہ شنید پر مبنی تھی۔ کیونکہ ملک کے گوشہ گوشہ سے روزانہ جو مختلف الخیال اور مختلف المزاج طالبین و سالکین حضرت کی خدمت میں آتے رہتے تھے۔ وہ جب اپنے اغراض و مقاصد میں کامیاب یا ناکام ہو کر واپس لوٹتے اور سامعین سے اپنا تاثر بیان کرتے۔ تو اس تاثر کی بنا پر مخالفین و موافقین اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی خواہش کے مطابق حضرتؒ کے متعلق اپنے نظریات کی نشر و اشاعت شروع کر دیتے۔

جس سے حضرت کی شہرت روز بروز دور دور تک پھیلتی گئی۔

حقیقتِ تاثر حضرت تھانوی کی خشونت و درشتی کی تمام داستانیں اور حکایتیں شخصی تنقید اور قیاسی دید پر مبنی ہیں۔ حضرت تھانوی جیسی جامع صفات و کمالات شخصیت کے متعلق سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر لینا۔ یا کسی مجلس، کسی ملاقات یا کسی خط کے جواب کی بنا پر کوئی فتویٰ صادر کر دینا صریحاً بے انصافی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ہاتھی کو ٹٹولنے والے چار اندھوں کے بیانات کی تھی۔ انھوں نے گو ہاتھی کے مختلف اعضاء کا جائزہ لینے کے بعد اپنی عقل و فہم کے مطابق صحیح صورتِ حال بیان کی تھی۔ مگر فی الحقیقت ان کا تاثر خلافِ حقیقت تھا۔ اس سلسلہ میں تاثر انہی لوگوں کا معتبر ہو سکتا ہے جنہیں کافی عرصہ حضرت کی صحبت میں رہنے اور آپ سے خط و کتابت کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔

دفترِ شکایات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اس امر کا عام چرچا تھا کہ آپ:۔

الف۔ "بڑے خشک مزاج اور تند خو تھے"۔

ب۔ "بڑے بدعقیدہ اور پکے وہابی تھے"۔

ج۔ "بڑے آدم بیزار اور تارک الدنیا تھے"۔

د۔ "سختی اور خشکی میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے"۔

اس میں گو آپ کے نافہم عقیدت مندوں کا بھی حصہ تھا۔ مگر زیادہ تر یہ پروپیگنڈہ آپ کے حاسد اور مخالف کر رہے تھے تاکہ کسی طرح لوگوں کو وہاں جانے سے روکا جائے۔

لیکن جونہی لوگوں پر اس کی حقیقت ..... واضح ہو جاتی۔ ان کے دل میں حضرت کی محبت و عقیدت اور عزت و عظمت پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی۔ اور مخالفوں کا پروپاگنڈا نہ صرف ناکام ہو جاتا بلکہ خود ان کی اپنی رسوائی کا باعث بنتا۔

صورتِ حال بات دراصل یہ ہے کہ

الف۔ حضرت تھانوی بڑے خوددار اور باغیرت واقع ہوئے تھے اور حتی الوسع معاملات کو وسعت دینے کے عادی نہ تھے۔ اسی لئے فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"میری عادت نہیں کہ خود کسی معاملہ میں دخل دوں۔ میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے۔ اسلئے خود کسی معاملہ میں دخل دینے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ میرا تو کام نہیں میں کیوں دخل دوں۔ کسی کو لاکھ دفعہ غرض پڑے۔ اپنی اصلاح کا طریقہ

دریافت کرے۔ ورنہ میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ اپنے آپ تو کسی کو اپنی اصلاح کا قصد نہ ہو اور میں اس کے پیچھے پڑتا پھروں۔ اگر کسی وقت شفقت کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو میں خود بھی نرمی سے کہہ دیتا ہوں۔" (المجح المبرور صہ ۱۶)

ب۔ حضرت تھانویؒ کو اپنے مصلح اور عالم ہونے کا دعویٰ بھی نہ تھا۔ ان کی تو تمام کائنات توفیق و انقام پر قائم تھی۔ آپ خود کو لاشئے محض سمجھتے تھے۔ اسی لئے جب پانی پت کے بعض لوگ اپنی کوتاہ اندیشی سے آپ سے ناراض ہو گئے تو کہنے لگے کہ بس آج سے ہم انہیں مولوی ہی نہ کہیں گے۔ اس امر کی اطلاع جب دربار اشرفیہ میں پہنچی۔ تو آپ نے فرمایا کہ:۔

"بھلا میں نے کب کہا ہے کہ مجھے مولوی کہو۔ میں تو بقسم کہتا ہوں کہ میں خود بھی اپنے علم کا قائل نہیں۔ یہاں تک کہ جب کوئی طالب علم آجاتا ہے۔ تو واللہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں میری قلعی نہ کھل جائے۔" (اشرف المعمولات صہ ۵۵)

ج۔ آپ کو دوسروں کی طرح مریدے بڑھانے کا بھی شوق نہیں تھا۔ چنانچہ جب پانی پت میں آپ کے متعلق یہ کہا گیا کہ ہم انہیں آج سے مولوی ہی نہ کہیں گے۔ تو اسی وقت پانی پت والوں سے ہی ایک نے جواب دیا کہ:۔

"وہ تو خود اس سے خوش ہوتے ہیں کہ کوئی ان کو مولوی نہ کہے۔ اور وہ تو ایسا شخص ہے کہ جب اس کو معلوم ہو جائے کہ ایک مرید کم ہو گیا ہے۔ تو خوش ہوتا ہے اور جب اسے معلوم ہو کہ دو کم ہو گئے ہیں۔ تو زیادہ خوش ہوتا ہے (ایجوالمصدر)

د۔ آپ کے پیش نظر کوئی ذاتی غرض یا منفعت بھی نہیں تھی کہ ہر قیمت پر دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے۔ اور کسی کو ناراض نہ ہونے دیتے۔ بلکہ آپ کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ دوسرے پر حق واضح ہو جائے۔ اسی لئے فرمایا کرتے تھے:۔

"میرا یہ کبھی قصد نہیں ہوتا کہ اپنے مقابل کو گفتگو میں مغلوب کر دوں۔ یا وہ میری موافقت کرے۔ بلکہ قصد یہ ہوتا ہے کہ خدا کرے یہ بھی سمجھیں اور میں بھی سمجھوں اور حق بات معلوم ہو جائے۔"

اور یہی حق کوشی انسان کو دوسروں کی نظروں میں بُرا بنا دیتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آکر حضرت تھانویؒ سے ایک تعویذ کی درخواست ایسے مبہم الفاظ میں کی کہ حضرت اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ آپ نے کئی مرتبہ اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے کہا۔ مگر اس نے ہر بار الجھا ہوا اور

نامکمل جواب دیا۔ جس کے سمجھنے میں آپ کو بڑا تعجب ہوا۔ یہ واقعہ بیان کر آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ:۔

"جو لوگ سال دو سال میں صرف ایک ہی دفعہ کسی کے پاس ہو آئیں۔ ان کے اخلاق کی درستی کیا ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل بزرگوں نے بھی ان امور میں لوگوں کو روک ٹوک کرنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ دوسروں کی اصلاح میں اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ بداخلاق بنانا ہی پڑتا ہے۔ بدون اس کے دوسروں کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اکثر حضرات کہتے ہیں کہ ہم کیوں بُرے بنیں" (مقالات حکمت ملفوظ ۱۷۷)

ان لوگوں نے جو مصلح کے طریق کے مطابق اپنی اصلاح کے متمنی نہ تھے۔ حضرت تھانوی کی مساعی کو خشونت۔ درشتی۔ مردم بیزاری۔ خشک مزاجی۔ تند خوئی وغیرہ سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔ حضرت تھانوی ان روایتوں۔ حکایتوں۔ افسانوں اور داستانوں کی حقیقت خود ہی بیان فرما گئے ہیں۔ جن کی وضاحت آپ کے مندرجہ ذیل ملفوظات سے ہوتی ہے۔

حقیقتِ شکایت ایک دفعہ فرمایا کہ ایک خط آیا ہے۔ اس صاحب نے پہلے تو گالیاں دے لیں۔ اب بہلا پھسلا کر فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میں انتقام نہیں لیتا۔ مگر رنج کی بات سے رنج تو ہوتا ہی ہے اور ہم لوگوں کی تو حقیقت ہی کیا ہے کہ رنج نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وحشیؓ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ یہ فرمایا کہ "ساری عمر صورت نہ دکھانا" مگر ہم کو کہا جاتا ہے کہ صاحب معاف کر دینا چاہیئے۔ ہم کوئی ان کے باوا کے غلام ہیں کہ گالیاں بھی کھائیں اور چاپلوسی بھی کریں۔ ہاں اس حالت میں بھی اس کی ضروریات کا انتظام کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص سے ناراضی ہو گئی۔ اور اس سے کہہ دیا کہ صورت مت دکھانا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں جگہ یا فلاں شخص سے اپنی اصلاح کرا لو۔" (الافاضات الیومیہ ص ۵/۲۰۶)

حقیقتِ ناراضی مزید المجید کے ملفوظ ۶۵ میں درج ہے کہ:۔

"حضرت کے ہاں ایک لیٹر بکس رکھا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ کہنا سننا ہوتا ہے۔ خط میں لکھ کر اس لیٹر بکس میں ڈال دیتے ہیں۔ حضرت والا سہولت سے جواب لکھ کر بذریعہ خادم ان کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ ایک شخص نے کچھ بے ہودہ اور بے جوڑ باتیں لکھ کر بکس میں ڈال دیں۔ حضرت نے دیکھ کر اس پرچہ پر لکھ دیا کہ ظہر کے بعد اس

پرچہ کو میرے ہاتھ میں دینا۔
بعد ظہر کے اس صاحب نے وہ پرچہ پیش کیا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ میں سلام سے محروم رہا مصافحہ سے محروم رہا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ آیا آپ نے سلام کیا تھا۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ یا آپ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا۔ میں نے دھکیل دیا؟ یا آپ نے شورش کیا یا میں نے آپ کو ممانعت کردی۔ اس پر وہ صاحب بیٹھے رہے دوبارہ استفسار پر بولے کہ جی مجھ سے خطا ہوگئی ہے۔ اس پر فرمایا کہ خطا ہوگئی۔ میں یہ نہیں پوچھتا۔ میری غرض تو یہ ہے کہ آپ کا اس لکھنے سے کیا مطلب تھا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میرا یہ مطلب تھا کہ اصلاح ہوجائے۔ تو فرمایا کہ آپ نے اس واسطے خطا کی تھی کہ میری اصلاح ہوجائے۔ یہ تو ایسی بات ہوئی کہ جیسے کوئی چوری کرے۔ اور حاکم کے دریافت کرنے پر یوں کہے کہ چوری اس واسطے کی تھی کہ میری اصلاح ہوجائے۔ یا کوئی اپنے کپڑے کو گندگی لگا لیوے اب اس سے کوئی کہے ایسا کیوں کر رکھا ہے۔ تو وہ اس کے جواب میں کہے۔ کہ جی کپڑا اجلا جائیگا۔ یعنی بغیر گندگی لگائے ہوئے کپڑا پاک نہیں ہوگا۔ اور حاضرین کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ اس پر لوگ مجھے سخت کہتے ہیں۔ اب تبلایئے کہ مجھ کمبخت کو تو اتنے کام ہیں کہ بعد نماز قرآن سنتا ہوں۔ خطوط کے جواب لکھتا ہوں بعض روز چالیس چالیس پچاس پچاس خطوط آجاتے ہیں۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ میرا بھی راحت و آرام کو جی چاہتا ہے۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ بدوں تخلیہ کے نہیں ہوسکتے۔ اس لئے تھوڑا بہت وقت ان کاموں کے لئے بھی چاہیئے۔ پھر میں تو اس پر بھی دو ڈھائی گھنٹے دے دیتا ہوں۔ ہاں مجھے تلوے سہلانے نہیں آتے۔"

(اشرف المعمولات صفحہ)

حقیقت بے مروتی ایک خط کے جواب کے سلسلہ میں فرمایا کہ منجملہ میری اور بے مروتیوں کے ایک بے مروتی یہ بھی ہے کہ میں جواب میں سائل کی خواہش کی رعایت نہیں کرتا۔ بلکہ حدود اور سائل کے مصالح کی رعایت کرتا ہوں"۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت عام پیروں کے ہاں تو یہ معاملات اور اصول نہیں ہیں۔ صرف آپ کے ہاں ہیں۔ اسلئے کہا جاتا ہے کہ آپ کے مزاج میں درشتی ہے۔ تبسم فرماتے ہو مزاحاً فرمایا کہ درشتی کے تین نقطے الگ کردیئے جائیں

تو حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ درشتی کے پردہ میں درستی ہوئی ہے۔ (الافاضات الیومیہ جلد ۲ ص۱۲)

حقیقتِ بدمزاجی

قنوج کے ایک صاحب حضرت کی خدمت میں تشریف لائے۔ اور ایک رسالہ پیش کیا کہ یہ حضرت کی نگاہ سے گذرا ہے یا نہیں؟ حضرت نے دریافت فرمایا کہ اس کے دکھانے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ اس پر وہ خاموش رہے۔ اس پر فرمایا کہ دیکھئے لوگوں کی یہ حالت ہے کہ خواہ مخواہ مجھے پریشان کرنے کے لئے تشریف لاتے ہیں جب دریافت کرتا ہوں کہ کیا مطلب ہے۔ تو بولتے نہیں۔ اب بتلائیے۔ میری کیا خطا ہے۔ اس پر لوگ مجھے بدمزاج کہتے ہیں۔ آپ انصاف کیجئے کہ میں بدمزاج ہوں یا یہ۔ میں نے یہی تو پوچھا تھا کہ آپ کا مطلب کیا ہے۔ تبلائیے اس میں گناہ کی کیا بات ہے۔ اس پر وہ صاحب اُٹھ کر چلے گئے تو فرمایا۔ کہ یہ مجھے سب میں بدنام تو کریں گے۔ مگر الحمدللہ ان کا علاج خوب ہو گیا ہے۔ اب ایسی حرکت کبھی نہ کریں گے۔ اور ساری عمر یہ بات یاد رہے گی۔" (ملفوظ نمبر ۸ مزید المجید)

حقیقتِ بدخلقی

ایک مرتبہ فرمایا کہ آجکل تو یہ دستور ہو گیا ہے کہ ایک کام مشورہ سے طے ہوتا ہے پھر اس کے خلاف بلا مشورہ اس میں تصرف کر لیا جاتا ہے اب ان سے پوچھیے کہ جو بات مشورہ سے طے ہوئی تھی۔ وہ مشورہ کے خلاف اکیلے کیوں کی۔ اگر خلاف ہی کرنا تھا۔ تو اس میں بھی مشورہ کر لیتے۔ یہی تو خرابی ہے۔ جس شخص کو کام دے دیتا ہوں وہ اپنے آپ کو مجتہد اور مستقل سمجھنے لگتا ہے۔ اسی واسطے میں کسی کے کام سپرد نہیں کرتا۔ مجھے ان باتوں سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اور پھر لوگ مجھے تو بد اخلاق کہتے ہیں۔ اور ان کو کچھ نہیں کہتے۔" (اشرف المعمولات ص۲۹)

حقیقتِ توحش

ایک دن لوگ حضرت کی مجلس میں دور دور بیٹھے ہوئے تھے۔ اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہو رہی تھی۔ اس پر فرمایا کہ سب قریب قریب ملکر بیٹھے افسوس کہ میں روز کہتا ہوں۔ مگر کوئی اس کا خیال نہیں کرتا۔ کیا یہ بھی میرے ہی ذمہ ضروری ہے کہ روز کہا کروں۔ اگر کوئی نیا آدمی دیکھے۔ تو یہی کہے گا کہ یہ شخص بھیڑیا معلوم ہوتا ہے جو لوگ اس سے اس قدر خائف ہیں کہ پاس آنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ نیز فرمایا کہ اس قدر تعظیم کرنا بدعت ہے (ایضاً ص۱۵۵)

حقیقتِ خفگی

فرمایا کہ ایک صاحب نے لکھا تھا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے؟ میں نے لکھا کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے؟ اس کا تو جواب نہ دیا

شکایت کا خط آگیا۔ کہ علماء کو اتنی خشکی نہ چاہیئے۔ جواب کے لئے ٹکٹ نہ تھا۔ اسلئے جواب نہ دیا گیا۔ اگر ٹکٹ ہوتا۔ تو یہ جواب دیتا کہ جہلاء کو بھی اتنی تری نہ چاہیئے کہ اس میں ڈوب ہی جائیں۔ پھر اتفاقاً ان سے رامپور میں ملاقات ہوگئی۔ وہ وہاں سب انسپکٹر پولیس تھے۔ کہنے لگے کہ آپ نے تو مجھ کو نہ پہچانا ہوگا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ کہا کہ میں فلاں شخص ہوں۔ جس نے یہ سوال کیا تھا۔ میں نے کہا کہ آہا آپ سے تو پرانی دوستی نکل آئی۔ کہنے لگے۔ کہ آپ نے ایسا خشک جواب کیوں دیا تھا۔ میں نے کہا کہ تم تھانیدار ہو۔ کیا مخصوصین اور عوام سب سے برتاؤ برابر ہے یا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ فرق ہے میں نے کہا یہی حق ہم کو ہے۔ آپ سے پہلے تعلق خاص نہ تھا۔ اسلئے ایسا کیا۔ اب تعلق ہو گیا ہے۔ ایسا نہ لکھوں گا۔ لیکن جب تعلق کا اثر مجھ پر ہے۔ اور میں ایسا جواب نہ دونگا ایسا ہی اثر آپ پر ہوگا۔ کہ آپ بھی ایسا سوال نہ کریں گے۔ میں نے سوچا کہ جب میں بندھ رہا ہوں ان کو کیوں نہ باندھوں تاکہ پھر ایسا بیہودہ سوال ہی نہ کیا کریں" (الافاضات الیومیہ ص ۱۸۹/ج ۱)

حقیقت درستی فرماتے تھے کہ "بعض لوگوں کو بد دلی سختی شفا نہیں ہوتی۔ یہ میرا بارہا کا مشاہدہ ہے۔ اب لوگ مجھے سخت کہتے ہیں۔ تبایئے۔ جب مجھے پورا یقین ہو جائے۔ کہ بدوں سختی کے فلاں شخص کا مرض نہیں جائیگا۔ تو میں سختی نہ کروں تو یہ خیانت ہے یا نہیں" چنانچہ ایک شخص حضرت والا کے پاس آیا۔ کہ حضرت میرا جی عیسائی ہونے کو چاہتا ہے۔ حضرت نے اسے ایک ایسی چپت رسید کی۔ کہ منہ پھر گیا اور ایک دوسری طرف بھی لگادی۔ اور فرمایا کہ "آپ کا خدا ہونے کو دل کیوں نہیں چاہتا کمبخت عیسائی ہو کر تو خود غلام رہے گا۔ خود عیسےٰ ہی کیوں نہیں بن جاتا۔ اور عیسےٰ ہونے پر بھی خدا کی غلامی کرنی پڑے گی۔ خدائی کا دعویٰ کیوں نہیں کرتا۔ اور پھر ایک لات رسید کی۔ کہ جا دور ہو۔ یہاں سے۔ وہ خانقاہ سے نکل کر بھاگنے لگا۔ تو ڈانٹ کر فرمایا کہ باہر کیوں جاتے ہو۔ مسجد کو کیوں نہیں جاتے۔ وہ شخص خوف زدہ ہو کر مسجد میں جا بیٹھا۔ تھوڑی سی دیر کے بعد خود آکر کہا کہ میرے کل شبہے جاتے رہے ہیں اور تسکین ہوگئی ہے (اشرف المعمولات ص ۱۹۱)

اسی لئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ :-

"میری بدخلقی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو لوگ مجھ سے تربیت کا تعلق رکھتے ہیں اگر کوئی اس تعلق کو نہ رکھے۔ تو میرے خلق کو دیکھے" (ایضاً ص ۵۲)

اعترافِ حقیقت دہلی کے گیسو دراز خواجہ حسن نظامیؒ جیسے مدعی علم و فہم بھی حضرت تھانویؒ کے مقالاتِ حکمت پر بعض اوقات نافہمی کی وجہ سے اعتراض کر بیٹھتے تھے۔ مگر ان کی یہ خوبی قابلِ داد ہے کہ جب کوئی بات ان کی سمجھ میں آجاتی تھی۔ تو وہ فوراً اسکی حقیقت کا اعتراف بھی کر لیتے تھے۔ چنانچہ وہ حضرت تھانویؒ کے متعلق اپنے بعض شبہات کے سلسلہ میں رسالہ "درویش" نمبر ا جلد ۶ میں لکھتے ہیں کہ:-

"جو اعتراضات میں نے (مولانا پر) کئے ہیں۔ اب میں ان سے معذرت کرتا ہوں میرا ایک اعتراض یہ تھا کہ "آپ نے قرآن مجید کے ترجمہ میں فحش تعویذ درج کئے ہیں"۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ چھاپہ خانہ والے نے درج کئے تھے۔ آپ کے نہیں تھے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ "بہشتی زیور میں فحش باتیں لکھی ہیں"۔ مگر منصفانہ غور کے بعد معلوم ہوا کہ فقہ ایک قانون ہے۔ اور قانون میں مخفی چیزوں کے احکام بیان کرنے ضروری ہوتے ہیں۔ ان پر فحش کی تعریف صادق نہیں آتی۔ مولانا اشرف علی صاحب نے جس قدر دین کی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ایسی نہیں ہیں کہ ان سے چشم پوشی کی جاوے۔ ہم سب کو ان کی خدمات کی قدر کرنی چاہیئے"۔

اہل علم کو پھر بھی کبھی نہ کبھی غور و خوض کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے اور سلیم الفطرت الطبائع حق بات کو تسلیم کرنے میں گریز نہیں کرتے۔ مگر سقیم الفطرت لوگ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی محض حسدِ فضیلت کی وجہ سے اس کی تفضیحت کرتے رہتے تھے۔ اور عوام کی حالت بالکل اسکی مصداق ہوتی ہے کہ ع چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔

سختی یا مضبوطی متذکرہ بالا تمام تصریحات کے باوجود اس سلسلہ میں حضرت کا یہ ارشاد قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے کہ:-

"اگر اصول تو نرم ہوں۔ لیکن ان کی پابندی سختی سے کرائی جائے۔ تو وہ سختی نہیں ہوتی بلکہ مضبوطی ہوتی ہے۔ جیسے ریشم کا رسہ نرم تو ایسا ہوتا ہے کہ چاہے اس میں گرہ لگا لو۔ لیکن ساتھ ہی مضبوط اتنا ہوتا ہے کہ اگر اس سے ہاتھی کو بھی باندھ دیا جائے تو وہ بھی اس کو نہیں توڑ سکتا۔ لہٰذا ریشم کو سخت نہ کہا جائے گا۔ بلکہ مضبوط کہا جائیگا البتہ لوہے کی زنجیر کو سخت کہا جائیگا۔ کیونکہ لوہا اپنی ذات میں سخت ہے۔ اگر اسکی

زنجیر کسی کے پاؤں میں ڈال دی جائے۔ تو وہ پاؤں کو زخمی کر دے۔ بخلاف ریشم کے رسہ کے۔ کہ پابند رکھنے کی صفت میں تو وہ لوہے کی زنجیر سے بھی بڑھ کر ہے لیکن اس سے پاؤں زخمی نہیں ہوتے۔ بلکہ بہت آرام میں رہتے ہیں اور اگر کوئی اپنے آپ کو بلا رد و کد اس کا پابند رکھے اور خواہ مخواہ اس کی پابندی سے اپنے آپ کو نکالنے کی فضول جد و جہد نہ کرے۔ تو کشا کشی کی دکھن تک بھی نہ ہو اسی طرح اگر کوئی میرے ہاں آکر اصول صحیحہ کا پابند رہے۔ تو اس کو کبھی کسی ناگواری کا موقع عمر بھر میری طرف سے پیش نہ آئے۔ لوگ خود اصول صحیحہ کو توڑ کر اور بے اصول باتیں کر کر کے مجھے بھی تکلیف دیتے ہیں۔ اور خود بھی مصیبت میں پڑتے ہیں۔ جس کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ نہ کہ میں یا میرے ہاں کے اصول!۔ مجھے تو اس بات پر رنج آتا ہے کہ میں تو ان کی اتنی رعایت کرتا ہوں کہ ان کی نظر بھی دقائق رعایت تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور میرے ساتھ وہ ایسی بے فکری کا معاملہ کرتے ہیں۔ وہ خود جو چپکے سے سوئی چبھو دیتے ہیں۔ اسے تو کوئی نہیں دیکھتا۔ اور اس تکلیف سے میں جو آہ کرتا ہوں اس کو سب سنتے ہیں۔ اس لئے ظالم تو مظلوم سمجھا جاتا ہے۔ اور مظلوم ظالم۔

غرضیکہ میں تو بدنام ہو جاتا ہوں۔ اور ستانے والے صاحب سرخرو بنے بیٹھے رہتے ہیں"۔

محبوبیّت

شانِ محبوبیت

محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ اس سے ہی خالق و مخلوق کے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ انسان جوں جوں طاعات میں ترقی کرتا ہے۔ اس کے درجات میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اور حق تعالیٰ اس کی طاعات سے خوش ہو کر اپنے بندوں کے دلوں میں اس کی محبت و عظمت پیدا کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے لوگوں کو خود بخود اس کی طرف کشش ہونے لگتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ بچپن میں دیوالی کی رات کو آپ اپنے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی کے ساتھ مل کر دیوالی کے چراغ بجھاتے چلے جاتے اور کوئی

اف تک نہ کرتیا۔ بلکہ سب مسکرا دیتے۔

طالب علمی کے زمانہ میں آپ شروع سے اخیر تک حلقۂ اساتذہ میں اتنے محبوب رہے کہ اکثر وہ خود چل کر آپ کو ملنے آتے تھے۔ اور سب سے زیادہ آپ پر عنایت و شفقت فرماتے تھے یہاں تک کہ عالمِ برزخ سے بھی توجہ فرماتے رہے۔

اہل اللہ کی نظر میں اتنے محبوب تھے کہ وہ آپ کے نادیدہ گرویدہ تھے بعض فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں اشرف سے اس وقت سے محبت ہے جبکہ اس کو خبر بھی نہ تھی۔ بعض عالمِ بالا سے آکر خواب میں تسلی دیتے تھے کہ ہم کو جو توجہ تمہارے ساتھ عالمِ حیات میں تھی۔ وہ اب بھی ہے مختلف المشرب بزرگ آپ کا اپنے اکابر جیسا احترام کرتے تھے۔ اور شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب نے تو آپ کو مکہ معظمہ سے بلوا بھیجا تھا۔

ان تمام واقعات کی تفصیل اوراق ماسبق میں گذر چکی ہے۔ ذیل میں آپ کے محبوبِ خلائق ہونے کے چند دیگر شواہد پیش کئے جاتے ہیں۔

سلامِ رسولِ اکرمؐ ایک رات کو مشرقی پاکستان کے دارالخلافہ ڈھاکہ کے ایک بزرگ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ

"اشرف علی کو میرا سلام پہنچانا"

وہ حضرت تھانوی کے شناسا نہ تھے۔ اس لئے عرض کی کہ حضورؐ میں تو ان سے ناواقف ہوں ارشاد ہوا "ظفر احمد کے ذریعہ" جو ان کے واقف تھے۔ یعنی حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہٗ جو حضرت کے حقیقی بھانجے ہیں اور اس وقت ڈھاکہ میں رہائش پذیر تھے۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی انہوں نے اس واقعہ کی مولانا ظفر احمد صاحب کو خبر کی۔ جو انہوں نے حضرت تھانویؒ تک پہنچائی جب حضرت تھانوی کو یہ مژدہ جانفزا پہنچا۔ تو آپ پر فرطِ ادب و مسرت سے ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی۔ اور زبان سے بے ساختہ نکلا

"وعلیک السلام یا نبی اللہ"

اور اس دن کے تمام معمولات موقوف کر کے سارا دن درود شریف پڑھنے میں مشغول رہے۔

فخرِ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا سیاسی مسلک حضرت تھانوی کے مسلک کے بالکل خلاف تھا۔ اور اتنا خلاف تھا کہ مولانا جسے جیسا سمجھتے تھے

حضرت تھانوی اسے موت سے تعبیر کرتے تھے۔ ـــ اور علمائے ہند کی اکثریت مولانا کے ساتھ تھی۔ مگر حضرت تھانوی سخت مخالفتوں اور شورشوں کے باوجود اپنے مسلک پر چٹان کی طرح جمے رہے۔ حضرت تھانوی کی اس جرأت و ہمت پر فخر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ:-

"ہمیں فخر اور خوشی ہے کہ ان تحریکاتِ حاضرہ سے جو بالکل کنارہ کش ہے وہ بھی ہمیں میں سے ہے"

کیونکہ حضرت تھانوی آپ کے شاگرد تھے۔

رشکِ عالم حضرت مولانا خلیل احمد رحمتہ اللہ علیہ اپنے وقت کے عالم با عمل اور درویش کامل تھے۔ گو حضرت سے علم و فضل سن و سال میں بڑے تھے۔ مگر آپ سے بعض اوقات ایسا برتاؤ کرتے تھے۔ جیسے چھوٹے بڑوں کے ساتھ تواضع سے پیش آتے ہیں۔ وہ آپ کو بدایا سے بھی مشرف فرماتے تھے اور بڑے شوق سے حضرت کا وعظ بھی سنتے تھے۔ اور بے اختیار ہو کر فرماتے تھے کہ:-

"اس کے بیان میں کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی"

تأثرِ نواب ایک مرتبہ نواب رامپور نے قادیانیوں سے مناظرہ کے لئے بہت سے علماء بلائے ہوئے تھے۔ ان سے روزانہ نواب صاحب ملاقات کرتے۔ حضرت تھانوی بھی دیگر علماء کے ساتھ چلے جاتے۔ مگر بہت فاصلے پر نظریں نیچی کر کے خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ جس سے نواب صاحب بہت متاثر ہوئے۔ جب نواب صاحب کے ایک مصاحب حضرت سے ملنے آئے۔ تو انہوں نے حضرت سے نواب صاحب کا قول نقل کرتے ہوئے کہا کہ:-

"نواب صاحب مجھ سے پوچھتے تھے کہ یہ کون صاحب تھے جو گردن جھکائے بیٹھے رہتے تھے۔ یہ کوئی صاحبِ اثر شخص معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی طرف قلب کو خواہ مخواہ کشش ہوتی تھی"

اعتقادِ استاد حکیم عبدالمجید خان دہلوی بہت بڑے مشہور حکیم اور مستغنی المزاج رئیس تھے۔ حضرت تھانوی نے ان سے صرف پندرہ دن طب پڑھی تھی۔ حکیم صاحب کے دل میں ان چند دنوں کی صحبت سے ایسی محبت پیدا ہوئی کہ جب حضرت تھانوی تھانہ بھون میں آکر مقیم ہوئے۔ تو حکیم صاحب نے تھانہ بھون آکر حضرت سے ملنے کا قصد فرمایا۔ اور دہلی میں کہنے

والے تھانہ بھون کے ایک صاحب سے پوچھا کہ تھانہ بھون حاضر ہونے کے کیا قواعد ہیں؟ انہوں نے کہا کہ وہ تو آپ کے شاگرد ہیں۔ آپ کے لئے قواعد کیا ہوں گے؟ حکیم صاحب نے فرمایا:-

"نہیں بھائی!! استادی شاگردی الگ چیز ہے۔ اور یہ راستہ الگ چیز ہے میں تو وہاں اُسی طرح جاؤں گا۔ جیسے معتقدین جاتے ہیں"

مگر قضا نے یہ ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔ جب حضرت تھانوی کو اس بات کا علم ہوا۔ تو آپ نے انتہائی افسوس کے ساتھ فرمایا:-

"اگر مجھ کو ان کا یہ خیال قبل از انتقال معلوم ہوتا۔ تو میں خود ہی پہنچ کر ان سے عرض کرتا کہ لیجئے حضرت! آپ کے لئے میرے پاس آنے کے بس یہ قواعد ہیں کہ میں خود حاضر ہو گیا ہوں"

اشتیاقِ افغان ایک مرتبہ حضرت تھانوی، دیوبند کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر وعظ فرما رہے تھے۔ اس وقت حضرت خواجہ عزیزالحسن مجذوبؒ صاحب "اشرف السوانح" کے پاس ہی ایک سرحدی پٹھان بیٹھا وعظ سن رہا تھا۔ اور بڑے مزے لے لے کر کہہ رہا تھا کہ:-

اَرے مولوی! خدا تجھے سلامت رکھے۔ ہم تو بس اتنی دور سے یہ تیری صورت ہی دیکھنے آتے ہیں"

اعترافِ غیر مسلم ایک سفر کے دوران میں چند ہندو بھی آپ کے ہم سفر تھے اور حضرت کی قیل و قال بڑے غور سے سنتے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہمراہی سے کہا کہ ان باتوں کی طرف دل کو کشش ہوتی ہے۔ دوسرے نے کہا کہ "یہ حق ہونے کی دلیل ہے۔ چونکہ یہ لوگ سچے ہوتے ہیں۔ اسلئے ان کی باتوں میں اثر ہوتا ہے"!

حسرتِ ہندی ایک اور موقعہ پر ایک معزز ہندو حضرت کے ڈبہ میں سفر کر رہا تھا۔ ڈبہ چھوٹا تھا۔ راستہ میں ایک فراخ ڈبہ کی اطلاع ملنے پر جب حضرت تھانوی اس ڈبہ سے تشریف لے جانے لگے۔ تو اس ہندو نے بصد حسرت کہا کہ:-

"اجی آپ ہی کی وجہ سے تو یہاں نور ہی نور تھا۔ آپ اپنے ساتھ نور کو بھی لے چلے"

محبوبیتِ عامہ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو طبعًا ہجومِ خلق سے وحشت ہوتی تھی۔ مزید

بڑا ہی وہ استقبالِ عامہ کو بھی تضیع اوقات پر محمول فرماکر اس کی اجازت نہ دیتے تھے۔ جیسے نواب ڈھاکہ کو عمال و احکام ریاست کے ساتھ استقبال کرنے سے روک دیا تھا۔ مگر پھر بھی لوگ آپ کی آمد کی خبر پاکر نواب صاحب کی تحریک کے بغیر خود بخود اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔ اسی طرح ہر جگہ حضرت کی آمد پر مشتاقانِ دید کے جم غفیر لگے رہتے۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی حضرت کی آمد لکھنؤ کے سلسلہ میں اپنے مشاہدہ کی بنا پر لکھتے ہیں:-

"حضرت کا آنا کسی لیڈر کا آنا نہ تھا۔ نہ پوسٹر چھپے۔ نہ اشتہارات تقسیم ہوئے۔ نہ ڈگی پٹی۔ نہ رضاکار دل نے نعرے لگائے۔ نہ مقامی اخبارات میں آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس کے باوجود خلقت کا ایک میلہ صبح اور سہ پہر دونوں وقت لگا رہتا تھا کوئی ملفوظات مبارک سے استفادہ کو آتا۔ کوئی مصافحہ اور دست بوسی پر ٹوٹ پڑتا۔ اور کسی کو محض شوقِ زیارت کھینچ لاتا۔ اولیاء اللہ میں جو ایک خاص قسم کی کشش محبوبیت و مرجعیت ہوتی ہے۔ اس کا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور بار بار دیکھا" (حکیم الامت ص۵۰)

مقبولیت

دستورِ دنیا بازارِ دنیا کے ہر دکاندار کی یہ طبعی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا خریدار دوسری دکان پر نہ جائے۔ بلکہ اس کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ دوسری دکانوں کے خریدار بھی وہاں سے ہٹ کر اس کی دکان پر آنے لگیں۔ اس غرض کے لئے بسا اوقات وہ غلط بیانی کرنے یا گاہک کو فریب دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

بازارِ معرفت میں اس کے بالکل برعکس رواج ہے۔ چونکہ ہر عارف کے پیشِ نظر ذاتی مفاد سے زیادہ مفادِ عامہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی نظر تحقیق میں جو بھی اس سے زیادہ ماہر کامل ہوتا ہے۔ وہ ترغیباً یا اعترافاً اس کے کمالات کا ذکر اپنے حلقۂ مریدین میں اکثر کرتا رہتا ہے اور اسے اس بات کا قطعاً اندیشہ نہیں ہوتا کہ میرا مرید کسی دوسرے بزرگ کی معرفت گاہ میں چلا جائے گا۔

وجہِ مقبولیت جس طرح حق تعالیٰ نے عوام و خواص کے دلوں میں حضرت تھانویؒ کی محبت و

کشش پیدا کر دی تھی۔ اسی طرح اسی کے فضل سے مقربانِ الٰہی پر حضرت تھانوی کے مجدد ہونے کی حقیقت بھی منکشف ہو چکی تھی۔ اس لئے حضرت تھانوی کے ہم عصر اولیاء، صلحا اور علماء و فضلاء اپنی اپنی مجلسوں میں بلا خوفِ لومتہ لائم حضرت تھانوی کی فضیلت بیان فرماتے رہتے تھے حالانکہ ان میں بعض ایسے بزرگ بھی تھے۔ جو بلحاظ سن و سال، علم و فضل اور زہد و تقویٰ حضرت تھانوی پر فضیلت رکھتے تھے۔ اور جن کا صاحبِ فضیلت ہونا خود حضرت تھانوی کو تسلیم تھا۔ ایسے بزرگوں کا اعترافِ فضیلت حضرت تھانوی کی مقبولیت کی بین دلیل ہے اگرچہ اوراقِ ماسبق میں ایسے کئی واقعات گزر چکے ہیں جن سے حضرت تھانوی کے مقبولِ عام ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ مگر ذیل میں آپ کی مقبولیتِ عامہ کی تائید میں چند مزید حقائق پیش کئے جاتے ہیں۔

اعترافِ حقانیت قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ سے ایک دفعہ کچھ لوگوں نے بعض اختلافیات کے متعلق حضرت تھانوی کی شکایت کرنا چاہی۔ تو مولانا نے انہیں یہ فرما کر روک دیا کہ:-

"میں ان کی کوئی شکایت نہیں سننا چاہتا۔ کیونکہ وہ جو کام کرتے ہیں نفسانیت سے نہیں کرتے۔"

اعترافِ فضیلت ایک مرتبہ حضرت تھانوی گنگوہ میں وعظ فرما رہے تھے۔ اس وقت جو کوئی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ وہ اس سے فرماتے کہ:-

"ایک عالمِ حقانی کا وعظ ہو رہا ہے۔ وہاں جاؤ۔ میرے پاس کیوں آ گئے ہو۔"

اعترافِ احتیاط ایک مرتبہ ایک تقریب کے موقعہ پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت تھانوی دونوں مدعو تھے۔ اس تقریب میں کوئی رسم بدعت تو نہ ہوتی تھی۔ البتہ صاحبِ تقریب نے عام برادری کو مدعو کر رکھا تھا۔ جسے حضرت تھانوی رسم تفاخر میں سے سمجھتے تھے۔ اسلئے آپ وہاں جا کر یہ حالت دیکھتے ہی واپس آ گئے۔ ایک صاحب نے اس کے متعلق حضرت شیخ الہند سے سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا:-

"واقعی بات یہ ہے کہ عوام کے مفاسد کی جس قدر انہیں اطلاع ہے۔ ہم کو اطلاع نہیں اسلئے انہوں نے احتیاط کی ہے۔"

اعترافِ تقویٰ اتفاق سے اسی تقریب میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری خلیفہ حضرت

مولانا گنگوہیؒ بھی موجود تھے۔ جب ان سے اس بارہ میں سوال کیا گیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ:۔

"ہم نے فتویٰ پر عمل کیا ہے۔ اور اس نے تقویٰ پر عمل کیا ہے"۔

اعترافِ اصول حضرت مولانا گنگوہیؒ کے خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائپوری رحمتہ اللہ علیہ اپنی بیماری کے زمانہ میں عیادت کرنے والوں کے وقت بے وقت ہجوم سے پریشان ہو کر فرماتے تھے کہ:۔

"مولانا تھانوی کے اصول بڑی راحت کے ہیں"۔

کیونکہ حضرت تھانوی کے ہاں ہر بات اور ہر کام ضابطہ سے ہوتا تھا۔ اور ہر کس و ناکس کو ان کے اصولوں کی پابندی کرنی پڑتی تھی جس سے سب کو آرام ملتا تھا۔

اعترافِ تہذیب حفیظ جونپوری اپنے وقت کے مشہور شعراء میں سے تھے اور بڑے آزاد طبع اور "تہذیب" لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے والے تھے۔ خوش بختی انہیں دربار اشرفیہ میں کھینچ لائی۔ یہاں پہنچنے کے بعد تہذیب اسلام کی حقیقت معلوم ہونے پر انہوں نے اپنے رسالہ "مآل" میں "تہذیب جدید" جسے تہذیب افرنگ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ کے متعلق لکھا کہ:۔

"جس تہذیب کو ہم نے مدت العمر امراء اور بڑے بڑے مہذبین کی صحبتوں میں رہ کر حاصل کیا تھا۔ تھانہ بھون آکر معلوم ہوا کہ وہ سراسر بدتمیزی تھی"۔

اعترافِ علم مولانا صادق الیقین رحمتہ اللہ علیہ حضرت گنگوہیؒ کے مرید اور حضرت تھانوی کے شاگرد ہونے کی وجہ سے اپنے والد سراج الیقین سے جو کرسی کے ایک خوش وقت سجادہ نشین تھے۔ بعض امور پر اس قدر اختلاف رکھتے تھے کہ تعلقات سخت کشیدہ ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ قطع تعلق ہو چکا تھا۔ حضرت تھانوی پر یہ امر ناگوار گذرا کہ میرے شاگرد کی اپنے والد سے منازعت ہو۔ اسلئے آپ نے ایسے مسائل اختلافیہ کے متعلق جنہوں نے باپ بیٹے کو ایک دوسرے سے جدا کر رکھا تھا۔ مولانا سراج الیقین کو نہایت لطیف پیرایہ اور نرم عنوان سے ایک خط[1] لکھا جس میں ان مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ اس خط کا پڑھنا تھا۔ کہ مخالف موافق ہو گیا۔ یعنی باپ نے بیٹے کے مسلک کی صحت کو تسلیم کر لیا۔ اختلافِ مشرب کے باوجود حضرت تھانوی کے ایک ہی خط سے اتنے اثر پذیر ہوئے کہ آپ سے ملاقات کرنے کے بعد قبر پر چادر چڑھانے کی بدعت ترک کر دی۔ صرف خود ہی یہ بدعت ترک نہ کی۔

[1] مکتوب محبوب القلوب

بلکہ اپنے ایک ہم مشرب اور معتقد فیہ عالم سے اس مسئلہ پر اختلاف کرتے ہوئے فرمایا:۔
"حضرت تھانوی موجود ہیں۔ ہندوستان میں جس عالم کا جی چاہے۔ ان سے گفتگو کر لے۔ میں ان کے برابر کسی کو عالم نہیں سمجھتا۔"

اعترافِ محبت

حضرت مولانا تاج محمود امروٹی سندھ کے مشہور مشائخ میں سے تھے سفر سندھ کے دوران میں حضرت تھانویؒ سے ان کا تعارف ہوا۔ پہلی ملاقات کے بعد حضرت تھانویؒ سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے دورہ میں شریک رہے اور اپنے مریدوں سے وصیتاً حضرت تھانوی کا ان الفاظ میں تعارف کرایا کہ:۔
"حضرت مولانا تھانویؒ چونکہ اہل حق سے ہیں۔ اسلئے ان کی محبت حق تعالے جل شانہ کی محبت ہے۔"
جس کی وجہ سے ان کے اکثر مرید حضرت تھانوی سے مستدعی دعا رہتے تھے۔

اعترافِ طریقت

پیر جھنڈا صاحب سندھ کے مشہور شیخ گذرے ہیں۔ ان کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ حضرت تھانویؒ کے دورہ سندھ میں ان کی حضرت سے واقفیت ہوئی۔ حضرت کی بہت تعظیم و تکریم فرمائی۔ خرقہ عطا فرمایا اور آپ کے طریق کا اعتراف کرتے ہوئے مریدوں سے کہا کہ:۔
"جس بات کے پوچھنے کی ضرورت ہو۔ یا تم لوگوں کے درمیان کسی امر میں اختلاف ہو تو مولانا (حضرت تھانویؒ) سے رجوع کرنا۔"

اعترافِ صداقت

کانپور میں یہ عام دستور تھا کہ لوگ مولود شریف کے درمیان میں قیام کرتے تھے۔ حضرت تھانویؒ کو نو وارد ہونے کی وجہ سے اس رسم کا بھی علم نہیں ہوا تھا کہ ایک روز آپ کو ایک جگہ مولود شریف میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ مگر اس دوران میں جب لوگوں نے قیام کیا تو آپ نے قیام نہ کیا اور نہایت بے فکری سے بیٹھے رہے۔ کیونکہ اپنے حضرات کا یہ معمول نہ تھا۔ حضرت کے ایک شاگرد نے آپ سے عربی میں کہا کہ اس وقت بیٹھا رہنا مناسب نہیں۔ آپ نے فوراً فرمایا کہ لا طاعۃ للمخلوق بمعصیۃ الخالق خدا کی نافرمانی سے مخلوق کی اتباع نہ کرنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس پر وہ شاگرد بھی بیٹھے رہے۔ لوگوں کو اس معاملہ میں اتنا غلو تھا کہ مجلس مولود میں اگر کوئی قیام نہ کرتا۔ تو اسے اسی وقت پیٹ دیتے۔ مگر حضرت تھانوی کی عظمت و محبت کی وجہ سے سب انہیں کنکھیوں سے دیکھتے رہے۔ کسی کو ہاتھ اٹھانا

تو ایک طرف رہا۔ زبان کھولنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

بانیٔ مدرسہ عبد الرحمٰن خاں کے صاحبزادے۔ اور دیگر معتقد حضرات بھی باوجودیکہ اسی عقیدہ کے قائل تھے۔ مگر کہنے لگے کہ اگر ہمیں خبر ہوتی کہ مولانا کھڑے نہیں ہوتے تو ہم بھی کھڑے نہ ہوتے۔

اعترافِ عظمت حضرت کے قیام کانپور کے ابتدائی زمانہ میں چند عورتیں نیاز دلانے کے لئے جامع مسجد میں جلیبیاں لائیں۔ طلبا وہیں رہتے تھے۔ انہوں نے بلا نیاز دیئے وہ کھالیں کیونکہ بقول حضرت تھانوی ان کو نیاز تھا۔ نیاز کیا دیتے۔ اس پر عورتیں بڑی بگڑیں اور اپنے مردوں کو بلا لائیں۔ جس پر بڑا ہنگامہ ہونے لگا۔ ایک طالب علم دوڑ کر حضرت کو بلا لایا۔ آپ نے آتے ہی ایک دو کو دھپڑ مارے۔ ایک دوسرے خفا ہوئے کہ بلا اذن کسی کی چیز کھا لینا کہاں جائز ہے؟ بوجہ عظمت و محبت حضرت کی خفگی ان لوگوں سے نہ دیکھی گئی۔ اور انہوں نے فوراً حضرت کی خفگی دور کرنے کے لئے طلبا کو بچانے کی خاطر ان کی حمایت شروع کر دی۔ مگر حضرت نے جلیبیاں کھانے والوں سے ایک ایک پیسہ وصول کر کے ان کو جلیبیوں کی قیمت ادا کر کے فرمایا کہ:-

"بھائی! یہاں وہابی رہتے ہیں۔ یہاں فاتحہ نیاز کے لئے چیزیں مت لایا کرو"۔

اس واضح ہدایت کے باوجود لوگ یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ حضرت یہ طلبا وہابی ہیں۔ آپ ہرگز وہابی نہیں۔

اعترافِ حکمت ضلع کانپور کے قصبہ گجنیر میں آریہ سماجیوں کی تحریکِ ارتداد کی خبر سن کر آپ چند ہمراہیوں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ سامان خورد و نوش۔ ڈیرہ خیمہ وغیرہ سب کچھ ہمراہ تھا۔ آریہ کی ریشہ دوانیوں سے وہاں مسلمانوں کے ہاتھ سے کھانا پینا پاپ سمجھتے تھے۔ اور اپنے اسلامی ناموں کو بھی ہندوانہ طریق پر بدل رکھا تھا۔ حضرت نے وہاں کے سرداروں کو بلایا جن کے نام سرکاری کاغذات میں نتھو خاں اور ادہار خاں تھے۔ مگر وہ نتھو سنگھ اور ادہار سنگھ کہلاتے تھے۔ حضرت نے شربت پیش کیا۔ تو انہوں نے عذر کر دیا کہ ہم مسلمان کے ہاتھ سے کچھ نہیں کھاتے۔ حضرت نے پوچھا کیا آپ ہندو ہیں؟ کہا نہیں۔ دریافت فرمایا مسلمان ہو کہ نہیں؟ کہا گیا آخر کون ہو؟ کہنے لگے کہ نو مسلم! اس کی تائید میں نتھو خاں نے تو یہ خیال ظاہر کیا کہ نیوگ کی خرابی کی وجہ سے آریہ مذہب کو ن شریف اختیار کر سکتا ہے۔ ادہار خاں نے کہا کہ ہم تو تعزیہ نکالتے ہیں ہم ہندو کیوں بننے لگے۔ حکیم الامت نے کفر کے حملہ کی شدت کے پیش

نظر اداہ ان کو تعزیہ نکالنے کی بدعت جاری رکھنے کی اجازت دیدی۔ ہمراہیوں کے اشکال پر فرمایا کہ "ان کے لئے بدعت وقایہ ہے کفر سے۔ اسلئے ان کو اس سے منع کرنا مصلحت نہیں"۔ اس کے بعد حضرت نے وعظ کا اعلان وہاں کے حالات کی مصلحت سے ان الفاظ میں کردیا کہ مسلمانوں کی کتھا ہوگی۔ کتھا سن کر لوگ جمع ہوئے۔ حضرت تھانوی اپنے ہمراہ پہلے سے ہی کچھ میلاد خواں لے گئے تھے۔ چنانچہ اس "کتھا" میں ان سے میلاد شریف پڑھوایا گیا۔ گو حضرت خود اس مجلس میں شریک نہ ہوئے بعد ازاں اس تبلیغی وفد کی اطلاع پاکر قصبہ بادہ پرگنہ۔ اکبر پور کے رؤسا بھی آگئے۔ حضرت نے مجمع عام میں بیان فرمائے۔ جو لوگوں نے صبر و تحمل سے سنے۔ کئی دن کی تبلیغ کے بعد جب انہوں نے پختہ وعدہ کرلیا کہ ہم مرتد نہ ہوں گے۔ تو حضرت نے واپسی کی تیاری فرمائی۔ جب آپ واپس آنے لگے۔ تو انہوں نے وفد سے یہ بھی کہہ دیا کہ "ہم تمہارے جیسے مسلمان بھی نہ ہوں گے۔ بلکہ ایسے ہی نومسلم رہیں گے"۔ غرضیکہ ایسے ناموافق ماحول اور نامساعد حالات میں ان لوگوں نے حضرت تھانوی کے بیان تو صبر و شکر سے سن لئے۔ مگر جب حضرت نے اپنے ہمراہی مولوی سعید احمد تھانوی مرحوم کو بعض دیہات میں اسی زمانہ میں تبلیغ کے لئے بھیجا۔ تو لوگوں نے اتنی بے اتفاقی کی کہ انہیں گرمی کے موسم میں دوپہر کو ستانے کی جگہ بھی نہ دی۔ لو کی شدت سے آپ کو بہت تکلیف میں دیکھ کر آخر ایک برہمن نے انہیں ٹھکانا دیا۔ مولوی صاحب کھانے کے لئے ستو ہمراہ لے گئے تھے۔ مگر کسی نے ستو گھولنے کے لئے برتن تک نہ دیا۔ اور انہوں نے تنگ آکر رومال میں پانی ڈال کر ستو کھنگو کر گذارہ کیا۔ اور بالآخر تنگ ہو کر واپس آگئے۔ مگر حضرت تھانوی کی حکمت عملی کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی اور وہ بطیب خاطر سب کچھ سنتے رہے۔

غرضیکہ حضرت تھانوی اپنی کسی نہ کسی خوبی اور کمال کی وجہ سے ہر طبقہ اور ہر حلقہ میں مقبول رہے۔

عزو شرف

لازمۂ بزرگی آج کل یہ ایک دستور سا ہوگیا ہے کہ جب تک کسی سے کشف و کرامات کا صدور نہ ہو۔ اسے بزرگ نہیں سمجھا جاتا۔ خواہ وہ کتنا تبع شریعت ہو۔ اور جسے امور شرعیہ کی پابندی کا قطعاً کوئی خیال یا اہتمام نہ ہو۔ اور اس سے خوارق کا صدور ہو۔ تو بس

لوگ اس کے گرد پروانوں کی طرح جمع رہتے ہیں۔ حالانکہ جن باتوں کو آج کل لازمۂ بزرگی سمجھا جاتا ہے فی الحقیقت وہ مانع بزرگی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خانقاہ اشرفیہ میں ایسی باتوں کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا جاتا تھا۔ اگر بعض واقعات کی بنا پر کوئی ایسا خیال بھی کرتا تھا۔ تو حضرت فوراً اس کی تردید فرما دیتے تھے۔ اور کسی کو ان باتوں کی طرف التفات نہیں کرنے دیتے تھے۔ حالانکہ دوسرے آستانوں میں ان ہی چیزوں کو اصل مقصود سمجھا جاتا تھا۔

حقیقتِ خوارق

حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں کہ:۔

"خرقِ عادت کئی قسم پر ہے۔ ایک قسم کشف ہے جس کی دو قسمیں ہیں۔ کشف کونی اور کشف الٰہی۔ کشف کونی یہ کہ بعد مکانی یا زمانی اس کے لئے حجاب نہ رہے کسی چیز کا حال معلوم ہو جائے۔ کشفِ الٰہی یہ کہ ذات و صفات یا سلوک کے متعلق علوم و اسرار و معارف اس کے قلب پر وارد ہوں۔ یا عالمِ مثال میں یہ چیزیں متمثل ہو کر مکشوف ہوں۔

دوسری قسم الہام ہے کہ مومن کے قلب پر اطمینان کے ساتھ کوئی علم القا ہو۔ یا کبھی ہاتفِ غیبی کی آواز سن لیتا ہو۔

تیسری قسم تصرف و تاثیر ہے۔ یہ بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ باطن مرید میں تاثیر کرنا جس سے اس کو حق تعالےٰ کی طرف کشش پیدا ہو۔ اور ہمت یا دعا سے دوسری اشیاء عالم میں تاثیر کرنا جس کی بے شمار حکایتیں اس باب میں اولیاء اللہ سے منقول ہیں۔

مگر خوارق کا ہونا ولایت کے لئے ضروری نہیں۔ صحابہ کرام اولیاء اللہ سے افضل تھے مگر بعض صحابہ سے عمر بھر میں ایک خرقِ عادت بھی واقع نہیں ہوا۔ فضیلت کا مدار قربِ الٰہی اور اخلاصِ عبادت پر ہے۔ خوارق پر نہیں۔ خوارق تو اکثر جوگیوں سے واقع ہوتے ہیں۔ جو ریاضت کا ثمرہ ہوتے ہیں۔" (تعلیم الدین صـ۹۵)

اسلئے غیر متبع شریعت اہل خوارق کی اہمیت عوام کی نظروں میں متبع شریعت حضرات سے زیادہ ہوتی ہے۔ خوارق کا صدور چونکہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اسلئے بمصداق کلُّ جدیدٍ لذیذٌ عوام کے لئے ان میں کشش زیادہ ہوتی ہے۔ اتباع شریعت چونکہ روزمرہ کا معمول ہو جاتا ہے اس لئے عوام کی نظروں میں وہ قابلِ التفات نہیں رہتا اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے:۔

"ایک گلاس میں پڑے ہوئے پانی نے اس تیل سے شکایت کی جو گلاس کے اندر اس پانی کے اوپر تیر رہا تھا۔ کہ یہ کیا بات ہے کہ میں نیچے رہتا ہوں۔ اور تو اوپر۔ حالانکہ میں پانی ہوں۔

اور پانی کی یہ صفت ہے کہ وہ صاف شفاف۔ خود طاہر مطہر۔ روشن۔ خوبصورت۔ خوب سیرت ہے غرض ساری صفتیں موجود ہیں۔ اور تو (یعنی تیل) خود بھی میلا ہے۔ جس پر گرے۔ اسے بھی میلا کر دے۔ کوئی چیز تجھ سے دھوئی نہیں جا سکتی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ تو نیچے ہوتا۔ اور میں اوپر مگر معاملہ برعکس ہے۔ تیل نے جواب دیا کہ ہاں یہ سب کچھ ہے۔ لیکن تم نے کوئی مجاہدہ نہیں کیا۔ ہمیشہ ناز و نعم ہی میں رہے۔ بچپن میں فرشتے تمہیں آسمان سے بڑے اکرام کے ساتھ اتار لائے۔ پھر جس نے دیکھا۔ عزت کے ساتھ برتنوں میں لیا۔ بڑی رغبت سے نوش کیا۔ تمہاری دھوپ سے حفاظت کی جاتی ہے۔ میل کچیل گرد و غبار سے بچایا جاتا ہے۔ گرا پڑے مطلب کو سہی۔ غرض ہمیشہ عزت ہی عزت اور ناز ہی ناز دیکھا۔ اور ہم نے جب سے ہماری ابتداء ہوئی ہے ہمیشہ مصیبتیں ہی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اول سرسوں یا تل کا تخم تھا۔ پہلی مصیبت یہ آئی کہ سینکڑوں من مٹی اوپر ڈال دی گئی۔ سینہ پر پتھر رکھا۔ پھر جگر شق ہوا۔ جو دوسری مصیبت تھی۔ تیسری مصیبت یہ پڑی کہ زمین کو توڑ کر باہر نکلے۔ چوتھی یہ کہ جب باہر نکلے تو آفتاب کی تمازت نے جگر بھون دیا۔ پانچویں مصیبت یہ جھیلنی پڑی کہ جب کچھ بڑے ہو گئے۔ تو درانتی سے کاٹے گئے۔ چھٹی مصیبت یہ کہ زیر و زبر کیا گیا۔ اور بیلوں کے کھروں میں روندا گیا۔ اس طرح ہماری ہستی عمر بھر مجاہدوں میں گذری۔ سو مجاہدہ کا ثمرہ یہ اونچا رہنا ہے۔ اور ناز و نعم کا ثمرہ یہ نیچا رہنا ہے (کمالات اشرفیہ ص ۲۵۳)

پانی کے مقابلہ میں تیل ان لوازمات زندگی سے نہیں۔ جن پر زیست کا دار و مدار ہو۔ مگر تیل کے مقابلہ میں پانی جیسی نعمت کی قطعاً قدر نہیں کی جاتی۔ یہی معاملہ تبع شریعت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور اس کے شریعت پر مستقیم رہنے کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔

تائید خرق عادت

حضرت تھانویؒ کے ایک معتقد نے علی گڑھ کی نمائش میں دکان لگائی ہوئی تھی۔ ایک روز عین فروخت کے وقت ان کے دل میں وحشت سی پیدا ہوئی۔ جس کے باعث انہوں نے نقصان کا خیال کئے بغیر اپنا سامان قبل از وقت صندوق میں بند کرنا شروع کر دیا۔ جونہی صندوق بھرے گئے۔ نمائش میں آگ لگ گئی۔ جس سے ان کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ اور گھبرانے لگے کہ اتنے وزنی صندوق کو اکیلے کس طرح اٹھائے جائیں۔ اس پریشانی کے عالم میں وہ دیکھتے ہیں کہ حضرت تھانوی بہ نفس نفیس تشریف لے آتے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ "جلدی کرو" چنانچہ ایک طرف سے وہ صاحب دکان اور دوسری طرف صاحب سیرت یعنی حضرت تھانوی نے ایک ایک صندوق پکڑ کر باہر نکالا اور جب سارا

سامان اُٹھ چکا۔ تو حضرت غائب ہو گئے۔ اس پر وہ سخت حیران ہوا۔ ادھر ادھر سب دیکھا مگر آپ کا کہیں پتہ نہ چلا۔ کیونکہ واقعہ عالمِ خواب کا تو تھا نہیں۔ عالمِ بیداری کا تھا۔ اور اس افراتفری میں سوائے حضرت کے اور کوئی دستگیری کو نہ بڑھا۔ جب اس واقعہ کی حضرت سے تحقیق کی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ اس وقت تو میں تھانہ بھون میں تھا۔ سامعین اس واقعہ کو خرقِ عادت پر محمول کرنے لگے تو آپ نے رفعِ اشتباہ کے لئے فرمایا کہ:۔

انکارِ خرقِ عادات

"مجھ کو اس واقعہ کی کچھ خبر نہیں۔ البتہ بعض اوقات حق تعالیٰ کسی کی دستگیری اور اعانت اس صورت میں فرماتے ہیں کہ کسی لطیفہ غیبیہ کو کسی مانوس شکل میں ظاہر فرما دیا۔ اور اس کے ذریعہ اس کا کام بنوا دیا۔ اور خود اس شکل والے کو کچھ خبر نہیں ہوتی"۔

چنانچہ اس نوع کے کئی واقعات ہوئے۔ اور آپ سب کو یہی جواب دیتے اور مزید فرماتے کہ الحمد للہ کہ میں اس مقامِ خرقِ عادت سے معرا ہوں۔

حقیقتِ کشف

حضرت تھانوی فرماتے کہ

"لوگ کشف کو بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ اس کو قرب میں کچھ بھی دخل نہیں۔ بعضوں کو کشف سے فطری مناسبت ہوتی ہے۔ بعضوں کو نہیں جیسے بعض کی نظر پیدائشی طور پر دوربین ہوتی ہے۔ بعض کی نزدیک بین۔ پھر مسجد کے سقاوہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ فرض کیجیے ایک شخص کی نظر تو صرف سقاوہ ہی تک پہنچتی ہے اور ایک کی باہر سڑک تک۔ تو کیا جس کی نظر سڑک تک پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ مقرب ہو گیا؟ یہ تو محض نظر کی ایک قسم ہے اس کو قرب سے کیا علاقہ۔ اس طرح طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ بعضوں کو کشف سے فطرۃً ہی مناسبت نہیں ہوتی۔ وہ لاکھ ریاضت و مجاہدہ کریں۔ انہیں عمر بھر بھی کشف نہیں ہوتا۔ بھلا کشف کو بزرگی سے کیا تعلق۔ اصل چیز تو عبدیت ہے۔ واللہ اگر کسی کو لاکھ کشف ہوں۔ اور وہ پھر اپنے وجدان کی طرف رجوع کرے۔ تو وہ محسوس کریگا کہ میرے قرب میں ذرہ برابر بھی ترقی نہیں ہوئی۔ برخلاف اس کے اگر دو چار مرتبہ بھی سبحان اللہ پڑھ کر اپنے وجدان کو دیکھے۔ تو اس کو صاف محسوس ہوگا کہ کچھ نہ کچھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب بڑھ گیا۔ اہلِ ذوق جب چاہیں اس کا تجربہ کرلیں"۔

اس سلسلہ میں آپ نے امیر عبدالرحمٰن خان مرحوم والیٔ کابل کا قول نقل فرمایا کہ جو بات کشف سے معلوم ہوتی ہے۔ وہی عقل سے بھی معلوم ہوسکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کشف کی مثال ٹیلیفون کی سی ہے۔ جس میں بعینہٖ الفاظ سنے جاتے ہیں۔ اور عقل کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ٹیلیگراف۔ جس میں قوتِ فکریہ اور استدلال سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ بعینہٖ الفاظ نہیں سنے جاتے۔ بلکہ کھٹکوں کے ذریعہ سے اشارات میں گفتگو ہوتی ہے۔

تائیدی واقعات اس امر کی بارہا تصدیق ہوئی کہ جو بات دل میں لے کر آئے۔ یا جو اشکال قلب میں پیدا ہوا۔ قبل اظہار ہی حضرت کی زبان فیض ترجمان سے اس کا جواب مل گیا۔ یا کسی باطنی پریشانی میں حاضر ہوئے۔ تو خطابِ خاص یا خطابِ عام میں کوئی ایسی بات فرمادی۔ جس سے تسلی ہوگئی۔ اور وہ پکار اُٹھتے ؎

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال — مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اور فوراً فیصلہ دیتے کہ آپ کو یہ بات کشف سے معلوم ہوگئی ہے۔ مگر حضرت فرماتے کہ

نفیِ کشف "اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کو تو علم ہے کہ فلاں شخص کی زبان سے اس کا جواب ہوجانے سے صاحبِ شبہ کو تسلی ہوجائے گی۔ اس لئے مجیب کے قلب میں اس جواب کا داعیہ القا فرمادیتے ہیں۔ اور وہ اس کی زبان سے ظاہر ہوجاتا ہے۔ سو یہ وہ کشف نہیں جس میں کلام ہو رہا ہے۔ وہ کشف تو اس وقت ہوتا۔ کہ جب مجیب کو بھی اطلاع ہوتی کہ اس سائل کے قلب میں فلاں شبہ ہے۔ سو اس کا مجھ کو علم نہیں ہوتا۔ اسلئے یہ کشف نہیں"۔

عوام تو ایک طرف رہے خواص کو بھی ایسا ہی گمان ہوتا تھا۔ خود مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے فلسفی بھی ایسا یقین کرنے لگے۔ جس پر حضرت نے انہیں لکھا کہ:-

"میں نے دو واسطہ کی سند سے سنا ہے کہ جناب کو مجھ پر صاحبِ کشف ہونے کا گمان ہے۔ سو اس کی نسبت عرض ہے کہ میں ایسا بے تکلف ہوں کہ اگر صحیح بات ہوتی ہے تو فوراً اس کا اقرار بلکہ دعویٰ کرنے میں بھی تکلف نہیں کرتا۔ اب بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ یہ امر بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں حلف کے لئے آمادہ ہوں۔ میرے پاس تو بڑا ذخیرہ اہلِ دل کی محبت کا ہے۔ اور دونو طرف سے"۔ (حکیم الامت صـ ۲۸)

حالانکہ جب مولانا عبدالماجد صاحب کی حضرت تھانوی سے پہلی ملاقات ہوئی تو انکا تاثر یہ تھا:۔

"گفتگو کا غالب حصہ قدرۃً دین و تصوف ہی سے متعلق تھا۔ بعض بزرگوں کے حالات حضرت اپنی زبان سے اس طرح ارشاد فرماتے کہ "درحدیثِ دیگراں" بعینہ ہم لوگوں کے خیالات وجذبات کی ترجمانی ہو رہی ہے۔ دل نے کہا کہ دیکھو روشن ضمیر ہیں، نہ سارے ہمارے مخفیات ان پر آئینہ ہوتے جارہے ہیں۔ صاحبِ کشف وکرامات ان سے بڑھ کر کون ہوگا۔"

بالآخر انہیں بھی تسلیم کرنا پڑا کہ:۔

"بعد کو۔ برسوں بعد کو اور وہ بھی اسی صحبت بابرکت کے فیض سے کھلا کہ مومن کی بصیرت و فراست کے سامنے یہ کشفِ تکوینی۔ یہ جوگیوں اور مسمریزم والوں کا کشف بھی بھلا کوئی کرامت ہے۔ اُس علوی کے سامنے۔ اس سفلی کی کیا حقیقت۔ اس حقیقت کے سامنے اس ملمع کی کیا ہستی۔ خیر اس وقت تو بڑا اگر اثر اس غیب دانی اور کشف صدر کا لے کر اُٹھا۔" (حکیم الامت صـ۲۳)

حقیقتِ کرامت

کرامت کے لغوی معنی ہیں عزت افزائی۔ اور کرامت کو کرامت اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ حق تعالٰے اپنے کسی مقبول بندہ کی عزت افزائی فرماتے ہیں۔ اور یہیں سے تواضع وتکبر کی سرحدیں پھوٹتی ہیں۔ چنانچہ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ:۔

"اگر کسی خارق کے بعد قلب میں زیادہ تعلق مع اللہ محسوس ہو۔ تب وہ کرامت ہے اور اگر اس میں زیادت محسوس نہ ہو۔ تو نا قابل اعتبار ہے اور کرامت واستدراج میں ایک ظاہر فرق یہ ہے کہ صاحبِ کرامت متصف بالایمان والعبادۃ وغیرہ ہوگا۔ اور صاحبِ استدراج افعال منکرہ میں مبتلا ہوگا (جیسے جوگی وغیرہ) اور دوسرا فرق اثر کے اعتبار سے ہوگا کہ صاحبِ کرامت پر انکسار کا غلبہ ہوگا اور صاحب استدراج پر ظہور خارق پر تکبر کا۔" (کرامات اشرفیہ صـ۲۹۹)

اسی لئے عارف باللہ حضرت عبدالعزیز دباغ قدس سرہٗ فرماتے ہیں:۔

"کشف کو لوگ پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں بڑی مضرت ہے۔ خود ولی کے لئے بھی اور اس کے لئے بھی جو ولی سے اس کا طالب ہو۔ ولی کے لئے تو یہ ضرور ہے

کہ اس میں مشاہدہ حق سے مشاہدۂ خلق کی طرف اترنا پڑتا ہے۔ اور یہ بالا مقام سے پستی کی طرف انحطاط ہے اور طالب کا ضرر یہ ہے کہ کشف و کرامات کا طالب وہی ہوتا ہے جس کی محبت حقیقی نہیں ہوتی"۔ (تبرنیہ ترجمہ ابریزہ ص ۲۸)

مگر بقول حضرت تھانوی:۔

آج کل لوگ اپنے شیخ کی ہر عجیب بات کو کرامت میں داخل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہر عجیب بات کرامت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کرامت وہ خارق عادت ہے کہ جس کے اندر یہ تاویل ہی نہ ہو سکے کہ اس واقعہ کا سبب اسباب طبیعہ میں سے کوئی سبب ہے۔ حتیٰ کہ اس میں خود اُن بزرگ کے تصرف کا بھی احتمال نہ ہو"۔

واقعاتِ کرامت

واقعات بتلاتے ہیں کہ ۱۔ آپ کی برادری کی ایک عورت پر جن کا اثر ہوا۔ اس نے آپ سے تعویذ کی درخواست کی۔ آپ نے بفراست یہ تو معلوم کر لیا کہ یہ جن کی شرارت ہے۔ گرچونکہ آپ عامل نہ تھے۔ اسلئے تعویذ دینے میں عذر فرمایا۔ جب اس کا اصرار بڑھا تو آپ نے بھی اپنے جد اعلیٰ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح جنہوں نے دریائے نیل کے نام خط لکھا تھا۔ اس جن کے نام ایک خط تحریر فرمایا کہ:۔

"اگر تم مسلمان ہو۔ تو میں تم کو قرآن و حدیث کی وہ عیدیں یاد دلاتا ہوں۔ جو کسی کو ستانے پر وارد ہوئی ہیں اور اگر تم کافر ہو۔ تو اول ہم صلح کی تحریک کرتے ہیں۔ اگر تم نہیں ہٹتے تو یاد رکھو کہ ہم میں بعض ایسے بھی ہیں۔ جو تمہارا پورا پورا استعمال کر سکتے ہیں"۔

جب یہ خط اس جن کو سنایا گیا۔ تو اس نے کہا کہ:۔

"یہ ایسے شخص کا خط نہیں کہ اس کا کہنا نہ مانا جائے۔ اچھا لو میں جاتا ہوں"۔

۲۔ ایک داروغہ صاحب کا ۹۔۱۰ برس کا لڑکا بڑی غبی تھا۔ وہ اسے حضرت کی خدمت میں لائے کہ اس کے ذہین ہونے کی کوئی تدبیر فرمائی جاوے۔ تو حضرت نے لفر کچا یا ازراہ اس کا سر پکڑ کر اپنے سر سے لگا لیا۔ اس کے بعد اُس کا ذہن بہت تیز ہو گیا۔ اور وہ خوب اچھی طرح پڑھنے لگا۔ اور جلد قرآن شریف ختم کر لیا۔

غرضیکہ ایسے سینکڑوں مصدقہ واقعات حضرت کے متعلق کتابوں میں موجود ہیں۔ جن سے کرامات کا یقین ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے واقعات کو پیش کرتے ہوئے بعض طالبین نے حضرت

سے عرض کی کہ یہ تو کرامات سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ:۔
"پھر تم میں بھی ایک ایسی چیز موجود ہے۔ جو کرامت سے بھی بڑھ کر ہے۔ یعنی ایمان تو اس کو اپنے فضائل میں کیوں شمار نہیں کرتے۔ ہاں انعاماتِ الٰہیہ میں شمار کرتے ہو۔ تو ان کو انعاماتِ الٰہیہ میں شمار کرنے کی میں بھی اجازت دیتا ہوں"۔

گو حضرت نے ایسے واقعات کو کرامت کی بجائے انعاماتِ الٰہیہ قرار دیا ہے۔ مگر انعامات بلا وجہ نہیں دیئے جاتے۔ کسی نہ کسی صفت یا خوبی کی بناء پر ہی عام طور پر ملا کرتے ہیں۔ اور یہ صفت یا خوبی حضرت کا انتہائی اتباعِ سنت تھا۔ جس کی برکت سے ان واقعات کا ظہور ہوتا تھا کیونکہ صوفیائے ربانی کا قول ہے کہ الاستقامۃ فوق الکرامات شریعت پر استقامت ساری کرامات سے افضل چیز ہے۔

انکارِ کرامات

اسی لئے حضرت تھانوی واضح طور پر فرمایا کرتے تھے کہ:۔
"اگر واقع میں میں صاحبِ کشف وکرامت ہوتا۔ تو میں خود اس کا اقرار کر لیتا۔ کہ یہ چیزیں کمالاتِ مقصودہ میں سے نہیں۔ نہ کوئی فضیلت کی چیز ہے۔ کرامت کا درجہ تو ذکر لسانی سے بھی متاخر ہے"۔

ایک دوسرے موقع پر صاف فرمایا کہ:۔
"مجھ کو اپنا ایک واقعہ بھی ایسا معلوم نہیں کہ جس کو کشف یا کرامت کہہ سکیں"۔

حقیقی کرامت

جیسا کہ کرامت کے لغوی معنوں سے ظاہر ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت سب سے بڑی کرامت تھی کہ حق تعالےٰ نے آپ کو خدمتِ خلق ودین کے لئے پیدا فرمایا۔ اور اسکے بعد بقول صاحبِ اشرف السوانح آپ کی سب سے نمایاں کرامات معنویہ خدمات دینیہ ہیں۔ جو کرامات حسیہ سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ اور کہیں زیادہ نافع ہیں۔ اور جن کا نافع ہونا دو طرح سے ہے۔ دوسروں کے لئے نافع ہونا یہ ہے کہ آپ سے مخلوق کثیر کو فائدہ پہنچتا رہا اور پہنچ رہا ہے .... اور انشاء اللہ پہنچتا رہے گا۔ حضرت کے اپنے لئے نافع ہونے کی صورت یہ ہے کہ یہ موجب اجر وقرب ہیں۔ بہ خلاف کرامات حسیہ کے کہ قرب کا ان پر ترتب نہیں۔

حقیقتِ فراست

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله۔ — مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

یہ عزت و شرف صرف اتباعِ کتاب و سنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس قدر اتباع میں ترقی ہوتی جائیگی اسی قدر یہ نورِ الٰہی بڑھتا جائے گا۔ اور پیروی نفس کی صورت میں کم ہونا شروع ہو جائیگا جیسا کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں ؎

فان العلم نور من الٰہ ونور اللہ لا یعطی لعاصی

کہ علم حق تعالےٰ کا ایک نور ہے اور حق تعالےٰ کا نور کسی گنہگار کو عطا نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہی نورِ ربانی بدرجۂ اتم انبیاء علیہم السلام کو عطا ہوا تھا۔ اور اسی سے حسب مراتب اولیاء کرام کو بھی حصہ ملتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کشف و کرامات کی کوئی حقیقت نہیں۔ حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

"فراست جس سے طالب کے امراض باطنی معلوم ہو جاتے ہیں۔ وہ کشف نہیں۔ کشف تو یہ ہے کہ جیسے راستہ میں کوئی شخص آ رہا ہے۔ اس کو یہیں بیٹھے دیکھ لیا پھر بعد میں وہ آ بھی گیا۔ بخلاف اس کے فراست دل کی گواہی دینے کو کہتے ہیں جسے الہام کہنا زیادہ مناسب ہے۔ فراست اور عقل باہم مشابہ ہیں۔ عقلاء کو بھی عقل کے ذریعہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ لیکن عقل و فراست میں یہ فرق ہے کہ عقل تو اسباب ظاہری سے استدلال کرتی ہے۔ اور فراست محض وجداناً محسوس کرتی ہے"۔

(کمالاتِ اشرفیہ ص ۲۱۹)

فقدانِ مجاہدہ داناؤں کا قول ہے کہ "عظمت ایک فیصدی ودیعت کی جاتی ہے اور ۹۹ فیصدی محنتِ شاقہ سے حاصل ہوتی ہے"۔

حضرت تھانوی اس ایک فی صدی والے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ آپ ریاضت و مجاہدہ کے قطعًا عادی نہ تھے۔ مشقت سے سخت گریز تھا۔ یہاں تک کہ آپ فرماتے تھے کہ:-

زیادہ غور و خوض کی مشقت بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ اسلئے ادق تحریروں سے مستفید ہونے سے محروم رہتا ہوں اور اپنے دل کو یوں سمجھا لیتا ہوں کہ ضروریات کا علم حاصل کرنے کے لئے اور سہل سہل کتابیں موجود ہیں۔ پھر کیوں مشقت اٹھائی جائے۔ میری عادت ہے کہ میں کسی مضمون کے سمجھنے میں زیادہ تعب نہیں اٹھاتا بس جو سرسری توجہ سے سمجھ میں آ گیا۔ آ گیا۔ ورنہ چھوڑ دیتا ہوں۔ کاوش نہیں کرتا بس

اس پر عمل ہے۔ اذا لم تستطع شیئاً فدعہ نیز دشوار طریق کو چھوڑ کر سہل طریق کو اختیار کرنے میں اس حدیث پر عمل ہے۔ ماخیر صلی اللہ علیہ وسلم فی امرین الا اختار ایسرھما۔

قلتِ مطالعہ آپ زیادہ مطالعہ کے بھی عادی نہ تھے۔ جیسے اہل علم کا دستور ہے۔ بلکہ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی:۔

حضرت کی نظر کتابوں پر زیادہ نہ رہتی تھی۔ علوم و معارف کے چشمے تو اندر ہی سے ابلتے رہتے تھے۔ "فی الحقیقت خود ہی ام الکتاب" تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف سب کا کتابی مطالعہ بس بقدر ضرورت و کفایت ہی رہتا تھا۔ اور آخر زمانہ میں تو اور بھی کم ہو گیا تھا۔ یا بالکل نہ تھا۔ کہ کتب بینی کی ہوس ہو۔ نئی نئی مطبوعات کی آمد برابر جاری رہے اور تاریخ، سیاحت، مناظرہ، محاضرہ کسی فن کی جو چھپی ہوئی کتاب بھی سامنے آ جائے پڑھ ضرور لی جائے۔ ضائع کرنے کو حضرت کے پاس اتنا وقت کہاں تھا۔ وہاں تو

صد کتاب و صد ورق در نار کن سینہ را از نور حق گلزار کن

کا گلزار ہر وقت کھلا رہتا تھا" (حکیم الامت ص ۲۹۹)

یہ رائے حضرت تھانوی کے حالات کا برسوں مشاہدہ کرلے والے اس فلسفی کی ہے۔ جو اب بھی بصد ناز لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت (تھانوی) سے اعتقاد کامل رکھنے کے باوجود میں مقلد جامد نہ تھا۔ فقہیات و کلامیات دونوں میں کبھی کبھی اپنی کم نظری سے اپنی ہی بات پر قائم رہتا تھا حضرت نے بھی اس ڈھٹائی کی خوب اجازت دے رکھی تھی۔" (حکیم الامت ص ۲۶۹)

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"ایک شبہ مجھ کو حضرت کی ذات پر بہ حیثیت شیخ کے پیدا ہو رہا تھا۔ اس کو بھی حضرت کی خدمت میں نقل کر دیا تھا۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں اس نامہ سیاہ کے علاوہ حضرت کے عام مریدین، معتقدین، مسترشدین سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ حضرات ایسی چیزیں زبان پر لانا ہی (دوسروں کی نیابت و ترجمانی میں بھی) سوء ادب میں داخل سمجھتے تھے۔ یہ عاجز ایک غیر معصوم بزرگ پر خود ایسے شبہات کے ایراد میں کوئی مضائقہ نہیں پاتا۔" (حکیم الامت ص ۲۵۳)

ملکۂ فراست عدم مجاہدہ و قلتِ مطالعہ کے باوجود امراضِ نفس کی تشخیص میں تو حق تعالےٰ نے حضرت کو وہ ملکۂ تامہ عطا فرمایا ہوا تھا۔ اور وہ فراستِ صحیحہ بخشی ہوئی تھی کہ فنِ تربیت میں یگانۂ روزگار تھے اور اسی لئے حکیم الامت کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے چنانچہ آپ نے خود فرمایا تھا کہ:-

"جب کوئی طالبِ اصلاح آتا ہے۔ تو بفضلہ تعالیٰ اس سے سابقہ پڑتے ہی اجمالی طور پر فوراً یہ ادراک ہوجاتا ہے کہ یہ فلاں مرض لے کر آیا ہے۔ اور اس کو فلاں تدبیر نافع ہوگی۔"

اور یہ اسی فراست کا نتیجہ تھا کہ آپ فرماتے تھے کہ

"مجھ سے کسی کا اپنے نفس کی چوریاں چھپانا بہت دشوار ہے۔"

چنانچہ یہ امر بارہا مشاہدہ اور تجربہ میں آچکا ہے۔ جس کی بیسیوں مثالیں اشرف السوانح میں موجود ہیں کہ حضرت تھانویؒ نے جس وقت کسی کے ساتھ جو معاملہ فرمایا۔ بعد میں وہ اکثر اس معاملہ کا اہل ثابت ہوا۔ گو دیکھنے والوں کو اس معاملہ کے وقت ایک گونہ استعجاب ہوتا تھا۔ کیونکہ ان کی نظر وہاں تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ جہاں حضرت کی نظر کی رسائی تھی۔ اسی لئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ

"میں چاہتا ہوں کہ میں جس کے ساتھ جیسا معاملہ کروں۔ میرے احباب اس میں مزاحمت نہ کریں۔ کیونکہ جب اللہ تعالےٰ کسی سے کوئی کام لیتے ہیں۔ تو اس کو اسکی سمجھ بھی عطا فرمادیتے ہیں۔ اس میں میرا کچھ کمال نہیں۔"

لمحۂ فکریہ تیل اور پانی کے مکالمہ میں آپ ابھی پڑھ چکے ہیں کہ مجاہدہ کا ثمرہ اونچا رہتا ہے اور ناز و نعم کا ثمرہ نیچا رہتا ہے۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ حق تعالےٰ کی نوازشاتِ خاص الخاص کے باوجود حضرت تھانویؒ نے اہلِ خوارق کی طرح اس پر فخر و تکبر کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ انتہائی تواضع و انکساری سے فرمایا ہے کہ "اس میں میرا کچھ کمال نہیں۔" اور یہیں سے انسانیت و عبدیت کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ جوں جوں نوازشیں اور عنایتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ وہ عجز و اعتراف سے گڑتا جاتا ہے۔ جیسا کہ باب "عبدیت" میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ دراصل نوازشاتِ الٰہی اور نوازشاتِ خاص کے حصول کے بعد خود کو عجز و اعتراف کے مقامِ فنا در فنا میں اتارنا ہی انسانیت کا سب سے بڑا مجاہدہ ہے۔ اسی لئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:-

"آدمی زاہد بن سکتا ہے۔ شیخ بن سکتا ہے۔ مگر انسان بننا مشکل ہے" (انفاسِ عیسیٰ ۲۸۹ الیومیہ)

کیونکہ جب تک عبدیت پیدا نہ ہو۔ انسانیت کی تکمیل نہیں ہوتی۔

مجدّدیت

ولایت حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں کہ:۔

"ولایت ایک مخفی امر ہے۔ اس کے معلوم ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور اگر معلوم کرنے سے یہ مقصود ہے کہ ہم اُن سے مستفید ہوں تو ان کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ وہ شریعت پر مستقیم ہوں۔ اور طالبانِ حق کی استعداد معلوم کر کے اس کے موافق انکی تربیت کریں جس کی تصدیق کا سب سے آسان طریق یہ ہے کہ جن کو شریعت پر مستقیم دیکھو۔ ان کی صحبت و تعلیم سے شرف حاصل کرو۔ جب اپنی حالت روز بروز متغیر پاؤ گے تو خود ہی معلوم ہو جائیگا۔ کہ یہ شخص صاحب تاثیر ہے۔" (تعلیم الدین ص۹۶)

اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص خود دین پر مستقیم ہوگا۔ اس کے دل میں لازمی طور پر دنیا اور دنیاداروں کی محبت کم اور دین اور دینداروں کی محبت زیادہ ہوگی۔ اس لئے طالبانِ دنیا کی بجائے اس کے ہاں طالبانِ دین کا ہی ہجوم ہوگا۔ یا اس کے ہاں وہی ٹھہر سکیں گے۔ جن کو اپنے دین کی دوستی مطلوب ہوگی۔

اولیاء اللہ میں سب سے بڑا درجہ قطب الارشاد کا ہے۔ جو لوگوں کو اپنی تعلیم و تربیت سے خدا اور رسولؐ کے راستہ پر گھیر کر لانے کے لئے ماموُر من اللہ ہوتا ہے۔ مگر قطب الارشاد کو قطب التکوین کی طرح اپنی قطبیت کا علم نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی قطب التکوین کی طرح قطب الارشاد متعدد ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک ہوتا ہے۔

تائیدی مشاہدہ جب ایک انگریزی خواں اور وہ بھی فلسفی اور ایک دوسرے شیخ کا مرید اور حضرت تھانوی سے اہم امور میں اختلاف بلکہ تکرار کرنے والا خانقاہ امدادیہ شریفہ میں پہنچتا ہے اور دیکھتا ہے کہ:۔

"جس کو دیکھئے ثقہ صورت۔ متشرع لباس۔ کوئی تلاوت کر رہا ہے۔ کوئی نماز پڑھ رہا ہے۔ کوئی ذکر میں مشغول ہے۔ کوئی مراقبہ میں محو ہے۔ کوئی درس دے رہا ہے کوئی تصنیف کر رہا ہے۔ کوئی مطالعہ کتب میں لگا ہوا ہے۔ بالخصوص پچھلی رات کو

تو عجیب سماں ہوتا ہے کہ دوران ذکر میں کوئی آہیں بھر رہا ہے۔ کسی پر گریہ طاری ہے کوئی بیتاب ہو کر تڑپ رہا ہے۔ کوئی غایت ذوق و شوق میں ہاتھ پاؤں پٹک رہا ہے۔ کوئی چیخ رہا ہے۔ کوئی کیف میں اشعار پڑھ رہا ہے۔ کوئی اور و کر دعائیں مانگ رہا ہے اور لطف یہ ہے کہ اندھیرے میں ایک کو دوسرے کی خبر نہیں کہ کس پر کون سی کیفیت طاری ہے۔ غرضیکہ ہر ذاکر دیار سے مطمئن ہو کر اور خوب جی کھول کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا ہے۔

تائیدِ مخالف اور جب وہ ایک غیر مقلد یعنی اہل حدیث کا یہ تاثر سنتا ہے کہ:۔
"یہاں تو بڑا لطف ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ چلتے پھرتے۔ سوتے جاگتے ہر وقت اور ہر حال میں ذکر اور تلاوت ہی کی آوازیں کانوں میں پڑتی رہتی ہیں۔ تو میں جہاں چاہتا ہوں۔ لیٹ جاتا ہوں۔ اور پڑا ہوا سنا کرتا ہوں۔ اور مزے لیا کرتا ہوں اسی کیف میں سو بھی جاتا ہوں۔ اور جب آنکھ کھلتی ہے۔ تو پھر وہی دلکش صدائیں کانوں میں پڑنے لگتی ہیں"۔

ذاتی تجربہ اور اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر صاحبِ خانقاہ یعنی حضرت تھانوی کو:۔
"ایک بہترین دوست۔ بہترین میزبان۔ بہترین مخدوم۔ بہترین عزیز۔ بہترین ہمسایہ۔ غرض انسانی کمالات و اوصاف کے لحاظ سے (اس دور کا) ایک بہترین انسان" پاتا ہے۔ تو وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ

قطبِ ارشاد "قطب ارشاد" کی اصطلاح تصوف کی کتابوں میں بارہا پڑھی تھی۔ علامتیں بھی پڑھ لی تھیں۔ دل نے کہا کہ اس دور کے "قطب ارشاد" تو یہی معلوم ہوتے ہیں اس کی تحقیق خود اُن ہی سے کیوں نہ کر لی جائے۔ استفسار ان الفاظ میں لکھا:۔
"میرا اپنا ظن اور قیاس اس وقت کے قطب ارشاد ہونے کے متعلق ان ہی بزرگ کی جانب ہے۔ جن کی خدمت میں یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ اگر یہ گمان غلط ہے۔ تو اس کی تردید فرما دی جائے۔ اور یہ بھی ارشاد فرما دیا جائے کہ کن علامات سے اسے شناخت کیا جا سکتا ہے؟
جواب سننے کے قابل ہے۔ احتیاط میں ڈوبا ہوا کہ:۔
قطب ارشاد کو بھی اپنے قطب ارشاد ہونے کا علم ضروری نہیں۔ اسلئے میں اس

سوال کا جازم جواب نہیں دے سکتا۔ علامات تو ہیں۔ مگر ان علامات کا تحقق خود ظنی ہے۔" (حکیم الامت صفحہ ۵۳-۵۴)

تائیدِ مزید اس دور میں چونکہ دین کے طالب بہت کم ہیں۔ اس لئے اہل اللہ کی طرف رجوع کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو دنیوی اغراض لے کر جاتے ہیں۔ مگر حضرت تھانوی نے اپنا طریقِ تعلیم و تربیت ہی ایسا رکھا تھا کہ وہاں سوائے طالب دین کے اور طالب دین بھی وہ جو طالب صادق ہو اور کوئی ٹھہر ہی نہ سکتا تھا۔ چنانچہ ایک بار آپ نے خود فرمایا کہ:-

"میرے یہاں کوئی ایسا ویسا تو ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ صرف طالبِ صادق ہی ٹھہر سکتا ہے۔ جیسے بلا تشبیہ مدینہ طیبہ کی صفت میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ کالکیر ینفی الخبث یعنی بھٹی کی مانند ہے جو میل کچیل کو دور کر دیتی ہے"

مجدد مجدد کا درجہ قطب الارشاد، قطب التکوین اور قطب الاقطاب سب سے اوپر ہوتا ہے اور وہ کتاب و سنت کی تعلیم کا مظہرِ اتم ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے کتاب و سنت کا عملی نمونہ بنا کر امتِ مسلمہ کی اصلاح کرنے اور اس کو خدا اور رسولؐ کے راستہ پر لانے کے لئے مبعوث کیا جاتا ہے۔ چونکہ نبوت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ اسلئے کارِ نبوت کو جاری رکھنے کے لئے اور اس نے راستہ سے مفاسد و بدعات کو ہٹانے کے لئے حق تعالے نے ہر صدی کے بعد مجدد دین بھیجنے کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اور اگر نبوت جاری رہتی۔ تو ممکن ہے انہیں یہ منصب جلیلہ بخشا جاتا۔ غرضیکہ مجدد کا درجہ بعد از نبوت ولایت میں سب سے آخری درجہ ہوتا ہے ...... نبی کو اپنا نبی ہونا یقینی اور قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے اور جس کے لئے اسے دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر ..... مجدد کو اپنا مجدد ہونا ظن و تخمین سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ اہلِ کشف کو البتہ اس کا علم ہو جاتا ہے۔

خبرِ مخبرِ صادق عن ابی هریرة ما اعلم عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ان الله یبعث فی امتی علی راس کل مائة من یجدد لها دینها (ابوداؤد کتاب الملاحم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بے شبہ اللہ تعالے میری امت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے کو پیدا کرے گا۔ جو اس کے لئے اس کے دین کو نیا کر دے گا۔

اسی حدیث کے متعلق حاکم نے مستدرک، کتاب الفتن میں اور بیہقی نے مدخل میں دوسری

روایتیں بھی کی ہیں۔

اشکال وجواب

مؤرخ اسلام سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:۔
"بعض محدثین نے گو اس حدیث کی سند میں کلام کیا ہے۔ خود اسی ابوداؤد کی روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک رفع میں راوی کو تردد ہے مگر ایسی بہت سی حدیثیں ہیں۔ جن کی سند میں کلام کیا گیا ہے۔ مگر واقعہ نے اُن کی صداقت کی توثیق کردی ہے۔ یہی حال اس حدیث کا بھی ہے اور تاریخِ اسلام اسکی صداقت کی شاہد ہے۔

اس موقع پر ایک شبہ کا رفع کرنا ضروری ہے عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ہر صدی کے سرے پر ایک ہی مجدد پیدا ہوتا ہے لیکن لفظ مَن جیسا کہ محققین نے اصولِ فقہ میں ثابت کیا ہے۔ کسی خاص کے لئے ہونا اس کا ضروری نہیں بلکہ عموم بھی اس سے سمجھا جاتا ہے یعنی اس سے ایک دو اور چند بھی سمجھے جاسکتے ہیں۔ جیسے من الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھم بمومنین کی آیت میں امنا اور ھم کی جمعیت سے ظاہر ہورہا ہے کہ مَن کے لئے ایک کا ہونا ضروری نہیں۔ اسلئے بالکل ممکن ہے کہ مختلف ملکوں میں یا مختلف اصلاحوں اور مختلف مفاسد کے مقابلہ میں تجدیدِ دین کے لحاظ سے ایک ہی وقت میں کئی مجدد ظہور کرسکتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ علماء نے بعض دفعہ ایک ہی وقت میں کئی بزرگوں کو مجدد مانا ہے۔

حدیث میں علی راس کل مائۃ آتا ہے۔ یعنی ہر صدی کے سر پر۔ سرا ابتدا اور انتہا دونوں پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض شارحین ابوداؤد نے لغت سے دونوں استعمال کو ثابت کیا ہے۔ اسلئے راس کل مائۃ کا صحیح ترجمہ صدی کے سرے پر کے بجائے تخصیص کے ساتھ ابتدا اور انتہا پر نہیں آنا چاہیئے۔

ایک اور بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ صدی کے سرے پر مجدد کی پیدائش ہونا ضروری نہیں بلکہ اس وقت اس کے تجدیدی مشن کا آغاز ہوتا ہے جس کو حدیث میں بعثت کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیدائش کے چالیس برس کے بعد مبعوث ہوئے۔

ایک اور نکتہ کو بھی کھول دینا ضروری ہے۔ حدیث کے لفظ یہ ہیں کہ مجدد دین کو نیا

کرے گا۔ یعنی رسوم و بدعات و فسادات کی گندگی کو دور کر کے اصل دین کو ظاہر کریگا اسلئے مجدد کی بڑی پہچان جس سے خواص اس کو پہچان اور عوام جان سکتے ہیں کہ اس کی تعلیم و تلقین اور جہاد و جہد اور دعوت و تبلیغ سے زمانہ کی ظلمتیں اور خیالات کی بدعتیں اور اعمال کے مفاسد دور ہو کر وہ اصل دین نمودار ہو جائے جس کی صحیح تصویر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے نگارخانہ کتاب و سنت میں محفوظ ہے۔

چونکہ اس حدیث کا سہارا لے کر بعض دفعہ مدعیان باطل نے نئے نئے دعوے کئے ہیں یہاں تک کہ نبوت کے حدود حرم تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اسلام میں نئے نئے فرقوں بلکہ امتوں کی بنیاد ڈالنی چاہی ہے۔ اسلئے یہ لغزش گاہ بھی ہے اور اس مقام پر قلم اور قدم کو بہت پھونک پھونک کر چلنا چاہیئے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ بتا دیا جائے کہ نبی کی ضرورت اصل احکام کے من جانب اللہ انسانوں تک پہنچانے کے لئے ہے۔ یعنی نبی اللہ تعالےٰ سے پاکر بندوں تک پہنچانے میں واسطہ ہے وہ عقل و قیاس اور علم و فہم سے نہیں کہتا۔ بلکہ جو کہتا ہے وحی سے لیتا ہے۔ اور خدا سے پا کر کہتا ہے۔ اس کی وحی و تعلیم ہر خطا سے پاک اور وہ ہر غلطی سے معصوم ہے۔ مگر مجدد کا یہ حال نہیں۔ بلکہ وہ کتاب و سنت اور وحی و رسالت کے احکام و پیغام کو سمجھ کر اور اپنی فراست ایمانی۔ صفائے ذہن و عقل مستقیم اور قیاس صحیح اور رائے صواب سے صحیح غلط میں تمیز کرتا ہے۔ دین کو غیر دین سے ارشادات الٰہی کو ایجادات انسانی سے سنت کو بدعت سے ممتاز کرتا ہے اور اپنی علمی عملی زندگی کی طہارت و نزاہت اور ثبات و استقامت اور نبی کی اتباع کمال اور اقتدا کے تام سے محبوبیت و مقبولیت کی شان پیدا کرتا ہے"۔

(مقدمہ جامع المجددین)

مندرجہ بالا طویل اقتباس میں مخالفین۔ معاندین اور متذبذین سب کے اشکالات کا نہ صرف جواب آگیا ہے۔ بلکہ مجدد کی شناخت کے آثار بھی بتلا دئیے گئے ہیں جن کے گذشتہ اوراق شاہد عدل ہیں۔ اور ان کا بغرض اثبات یہاں اعادہ کرنا محض تکرار و طوالت کا باعث ہوگا۔ البتہ ان کے علاوہ چند دیگر شواہد پیش کرنے سے جانہ ہوں گے۔

واقعاتی تائید | جب ہم حضرت تھانوی کی زندگی پر نظر دوڑاتے ہیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ حضرت

تھانوی تیرھویں صدی کے اختتام کے قریب یعنی ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اس صدی کے اختتام یعنی ۱۳۰۰ھ میں تحصیل علوم ظاہری سے فارغ ہوئے۔ عین چودھویں صدی کے آغاز یعنی ۱۳۰۱ھ میں آپ کانپور میں بیٹھ کر بذریعہ درس و تدریس۔ وعظ و تبلیغ اور تصنیف و تالیف فیض رسانی خلق میں مصروف ہوئے اور اسی سال فریضہ حج سے مشرف ہوئے اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ مہاجر مکی سے بیعت ہو کر فیض گوناگوں سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اور ۱۳۰۲ھ میں واپس آکر اسی افادہ خلق میں مشغول ہو گئے۔ بقول مورخ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ:۔

"اصلاح امت کی کوشش میں علمی و عملی زندگی کے ہر گوشہ پر ان کی نظر تھی۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک۔ عورتوں سے لے کر مردوں تک۔ جاہلوں سے لے کر عالموں تک فاسقوں سے لے کر صوفیوں۔ درویشوں اور زاہدوں تک۔ غریبوں سے لے کر امیروں استادوں اور مدرسوں تک۔ غرض ہر صنف، امت اور ہر جماعت کے کاموں تک ان کی نظر دوڑی۔ پیدائش۔ شادی بیاہ غمی اور دوسری تقریبوں اور اجتماعوں تک کے احوال پر ان کی نگاہ پڑی اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کا کھرا اور کھوٹا الگ کیا۔ اور رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو صراطِ مستقیم سے ہٹا دیا۔ تبلیغ۔ تعلیم سیاست۔ معاشرت۔ معاملات۔ اخلاق۔ عبادات اور عقائد میں دین خالص کی نظر میں جہاں کوتاہی نظر آئی۔ اس کی اصلاح کی۔ فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمان کی زندگی کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق بھی اپنے جاننے پورا سامان کر دیا۔"

(جامع المجددین ص ۲۷ کز)

تائید بزرگاں حضرت تھانوی کے مجدد ہونے کی تائید حسب ذیل واقعات سے بھی ہوتی ہے۔

۱۔ حضرت مولانا محمد روشن خاں مرادآبادی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ مجاز اور بڑے صاحب سوز و گداز بزرگ تھے۔ ان کے مرض وفات میں حضرت تھانوی مع خواجہ "عزیز الحسن صاحب اشرف السوانح" ان کے پاس بغرض عیادت تشریف لے گئے۔ انہوں نے حالات مرض بیان کرنے کے بعد حضرت تھانوی سے نہایت جوش کے ساتھ اور آبدیدہ ہو کر متغیر لہجہ میں فرمایا کہ:۔

"خیر یہ تو مرض کے حالات ہیں۔ اب آپ میرے لئے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرا خاتمہ ایمان پر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس صدی کا مجدد بنایا ہے اللہ تعالیٰ

آپ کے فیوض و برکات سے عالم کو منور کریے اور آپ کے ذریعہ رسوم و بدعات کا قلع قمع کرے۔"

حضرت تھانوی گردن جھکائے ہوئے اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ یہ سنتے رہے اور پھر ہاتھ اٹھاکر عفو و عافیت کی دعا مانگی۔

۲۔ ممدوح الذکر کے ایک ثقہ مرید نے "صاحب اشرف السوانح" سے ذکر کیا کہ:۔

"مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت تھانوی کے مجدد ہونے کا پورا وثوق تھا۔ یہاں تک کہ مجھ کو خاص طور پر مولانا تھانوی کی خدمت میں یہ ارشاد فرماکر بھیجا تھا کہ ان کے پاس ضرور حاضر ہو۔ وہ اس صدی کے مجدد ہیں"

۳۔ ایک اور موقع پر حضرت مولانا گنگوہی کے خادم خاص مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے بھی ایسا ہی صاحب اشرف السوانح سے فرمایا کہ:۔

"اب تک میرا گمان یہ تھا کہ اس صدی کے مجدد حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز تھے لیکن اب میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے مولانا کا فیض تو خاص تھا۔ اور زیادہ تر آپ سے علماء فیض یاب ہوئے لیکن میں اب دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کو اس وقت عام نفع مولانا تھانوی سے بہت پہنچ رہا ہے۔ اسلئے مجددیت کی شان ان میں زیادہ پائی جاتی ہے گو ممکن بلکہ مظنون ہے کہ حضرت تھانوی کا درجہ مجددیت سے بھی عالی ہو"

چونکہ آپ کے مجدد ہونے کا حال آپ کے اساتذہ کرام ہمعصر بزرگان دین اور اولیاء اللہ پر منکشف ہوچکا تھا اس لئے وہ سب آپ کا حد سے زیادہ ادب و احترام کرتے تھے جس کی تفصیل متعلقہ ابواب میں گذر چکی ہے۔

تائید منامیہ سنت اللہ یوں بھی جاری ہے کہ حق تعالےٰ اپنے بزرگان خاص کی اطلاع جو کسی خاص منصب کے لئے مبعوث ہوتے ہیں۔ اپنے نیک بندوں کو بھی مختلف طریق سے کردیتے ہیں کبھی کشف کے ذریعہ اور کبھی عالم رویا میں تاکہ طالبین ان سے استفادہ کرسکیں اور سچے خوابوں کی بشارت ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ ذیل میں دو بزرگوں کے خواب درج کئے جاتے ہیں جن سے آپ کے منجانب اللہ مقام ارشاد پر فائز ہونے اور اپنے وقت کے مجدد ہونے کی بشارت ملتی ہے:۔

۱۔ مشہور نعت گو شاعر محسن کاکوروی کے فرزند مولانا انوار الحسن کاکوروی اپنا ایک خواب یوں

بیان کرتے ہیں کہ:۔

"میں نے سفر حج میں بمقام مدینہ طیبہ حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کے متعلق ایک خواب دیکھا حالانکہ اس زمانہ میں مجھ کو حضرت مولانا سے کوئی عقیدت بھی نہ تھی۔ البتہ ایک بڑا عالم سمجھتا تھا۔ اور میرا خاندان بھی علمائے حق کا کچھ زیادہ معتقد نہ تھا۔ غرض حضرت مولانا کا مجھ کو مدینہ طیبہ میں کوئی بعید سے بعید خیال بھی نہ تھا۔ کہ ایک شب خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم ایک چارپائی پر بیمار پڑے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا تھانوی تیمارداری فرما رہے ہیں۔ اور ایک بزرگ دور بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے متعلق خواب ہی میں معلوم ہوا کہ یہ طبیب ہیں۔ آنکھ کھلنے پر فوراً میرے ذہن میں یہ تعبیر آئی کہ حضور تو کیا بیمار ہیں۔ حضور کی امت بیمار ہے اور حضرت مولانا اس کی تیمارداری یعنی اصلاح فرما رہے ہیں۔ لیکن وہ بزرگ طبیب جو دور بیٹھے نظر آئے تھے۔ وہ سمجھ میں نہ آئے کہ کون تھے۔ واپسی ہندوستان پر میں نے حضرت مولانا (تھانوی) کی خدمت میں یہ خواب لکھ کر بھیجا۔ اور جتنی تعبیر میری سمجھ میں آئی تھی۔ وہ بھی لکھ دی۔ اور یہ بھی لکھ دیا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ بزرگ طبیب کون تھے۔ جو دور بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا نے تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام مہدی علیہ السلام ہیں۔ اور وہ چونکہ ابھی زماناً بعید ہیں اس لئے خواب میں مکاناً بعید دکھائی دئیے۔"

اس خواب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تھانوی اور امام مہدی علیہ السلام کے درمیان اور کوئی مجدد پیدا نہ ہوگا۔

۲۔ قطب زماں۔ شیخ دوراں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری مدظلہ العالی رئیس الخلفاء دربار اشرفیہ مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور نے بھی اس سلسلہ میں ایک خواب دیکھا تھا۔ آپ نے لکھا کہ:۔

کچھ عرصہ ہوا یہ تقریباً ۱۳۵۰ھ کا ذکر ہے) خانقاہ شریف کی مسجد کے وسط میں بیت اللہ شریف اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پاک کو دیکھا کہ دونوں بالکل قریب قریب ہیں اور بیت اللہ شریف غالباً حضرت والا کی سہ دری کی طرف ہے۔ لیکن روضہ پاک بھی بیت اللہ شریف ہی کی شکل کا ہے۔ یعنی اس پر گنبد نہیں ہے۔ اور بیت اللہ شریف اور روضہ پاک دونوں پر اس قدر سبز اور خوبصورت غلاف ہیں کہ دنیا میں ان کی نظیر

نہ ہوگی۔ اور دونوں پر شعاعیں اور انوار معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت والا بیت اللہ شریف کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور اس قدر خوش ہیں کہ ایسا ہشاش بشاش میں نے حضرت والا کو کبھی نہیں دیکھا۔ نیز ایک کھجور کی ٹہنی بطور جھاڑو کے دست مبارک میں لئے ہوئے ہیں۔ جس کی ڈنڈی میں دستہ چھوڑ کر ادھر اُدھر شاخیں نکلی ہوئی ہیں اور یہ ارادہ فرمارہے ہیں کہ بیت اللہ شریف اور روضۂ پاک کے ارد گرد جو غبار ہے۔ اس کو دور فرمائیں۔"

جو آپ کے مصلح امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ اور مجدد سنت ہونے کی واضح اور بین دلیل ہے۔

احتمالِ اشرف

چونکہ حضرت تھانوی کا مجدد ہونا ظاہر و باہر تھا۔ اسلئے بعض متذبذبین اس بارہ میں خود حضرت تھانوی سے بھی سوال کرتے رہتے تھے۔ کہ "حضرت مجددِ وقت ہیں؟" ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ:۔

"احتمال تو مجھ کو بھی ہے۔ مگر اس سے زائد نہیں۔ جزم اوروں کو بھی نہیں کرنا چاہیئے ظن کے درجہ میں گنجائش ہے۔ باقی قطعی یقین تو کسی مجدد کا نہیں ہوا۔ جس پر جتنا اور جس درجہ کا فضل ہوجائے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔" (الافاضات الیومیہ)

ایک دوسرے مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں آپ نے اس سے بھی زیادہ واضح جواب دیا ہے کہ

"چونکہ نفی کی بھی کوئی دلیل نہیں۔ اسلئے اس کا احتمال مجھ کو بھی ہے۔ مگر اس سے زائد جزم نہ کرنا چاہیئے۔ محض ظن ہے اور یقینی تعین تو کسی مجدد کا نہیں" (کمالات اشرفیہ صفحہ ۳۸)

حقیقتِ احتمال

متذکرہ بالا ملفوظات میں حضرت نے جو ظن یا احتمال کا لفظ استعمال کیا ہے اسے اس کی نفی پر محمول نہ کیا جائے۔ کیونکہ ظن یا احتمال دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ جو شرعاً معتبر قرار نہیں دیا جاتا۔ اسے غیر ناشی عن الدلیل کہتے ہیں۔

دوسرا وہ جو شرعاً معتبر قرار دیا جاتا ہے۔ اسے ناشی عن الدلیل کہتے ہیں۔

چنانچہ صاحب "آثارِ رحمت" لکھتے ہیں کہ:۔

"وہ ظن جو ناشی عن الدلیل ہے وہ عند اللہ تعالیٰ وعند الشرع معتبر ہے۔ اور یہاں حضرت کے متذکرہ بالا ملفوظات میں ظن واحتمال سے وہی مراد ہے جو ناشی عن الدلیل

ہے۔ کیونکہ کسی مجدد کا مجدد ہونا نہ قطعیات پر موقوف ہے اور نہ اس کا منشا محض رائے اور تخمین ہے۔ بلکہ کسی مجدد کے مجدد ہونے کا مدار دلائل اور علامات پر ہے۔" (صـ۲۱)

اس کی تائید حضرت کے مندرجہ ذیل ملفوظ ۳۲۷ (مندرجہ ملفوظات حصہ ہفتم صـ۲۶۸ رسالہ المبلغ ۱۲/۱۲ بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ سے ہوتی ہے:۔

"ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا مجدد ہونا کسی دلیل قطعی سے معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا نہیں بلکہ دلائل ظنیہ سے۔ چنانچہ اب تک جتنے مجدد ہوئے ہیں۔ ان کے مجدد ہونے کا علم دلائل ظنیہ یعنی علامات و آثار سے حاصل ہوا ہے۔"

علاماتِ مجدد اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے آثار و علامات ہیں۔ جن کی موجودگی میں کسی کے مجدد ہونے کے متعلق فتویٰ دیا جا سکے۔ اس کا جواب بھی بحمد اللہ حضرت کے ہی ایک ملفوظ میں موجود ہے۔ جو خود خسرو دربار اشرفیہ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کا نقل کیا ہوا ہے کہ

"ایک بار احقر نے عرض کیا کہ کسی کا مجدد ہونا رائے سے معلوم ہو جاتا ہے؟ فرمایا کہ جی رائے سے کیا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی علامات ہیں۔

۱۔ مجدد شروع صدی میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ فیض اتم اس کا صدی کے شروع میں ظاہر ہو۔ گو وہ پہلی صدی میں پیدا ہوا ہو۔

۲۔ اس کے کلام میں اثر ہوتا ہے۔

۳۔ اس کو وہ بات سوجھتی ہے جو اس کے بڑے بڑوں کو نہیں سوجھتی۔

۴۔ وہ ہر جزو دین میں اصلاح کے لئے دخل دیتا ہے۔

۵۔ مجدد کی شان انبیاء کی سی ہوتی ہے اس سے جو بد اعتقاد ہوتا ہے۔ وہ برکات باطنی سے محروم رہتا ہے۔

پس مجدد کا منصب صرف اتنا ہے کہ لوگوں نے جو دین میں گڑبڑ اور کمی بیشی کی ہو۔ اس کو دور کر کے یہ دکھا دے کہ دین کی اصلی صورت یہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس سے خواہ مخواہ سب کی اصلاح ہی ہو جائے۔ (ملفوظات بمقالات حصہ سوم دعوات عبدیت)

اشکال و جواب یہاں پر پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ تمام آثار و علامات حضرت تھانوی میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ جس پر حضرت کی سوانح شاہد عدل ہے تو پھر حضرت تھانوی نے ظن اور احتمال کے الفاظ کیوں استعمال فرمائے۔ صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ

میں اس صدی کا مجدد ہوں؟ اس کا جواب صاحب "آثار رحمت" نے یہ دیا ہے کہ:-
"اگر کوئی یوں دعویٰ کرے کہ مجھ کو حضرت امام ابو حنیفہؒ کے جنتی ہونے میں کوئی شک نہیں اور حضرت غوث اعظمؒ کے ولی ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ تو اس پر کوئی نکیر نہیں۔ اس طرح اگر کوئی یوں دعویٰ کرے کہ مجھ کو حضرت محی السنت حکیم الامت کے مجدد ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ تو اس پر بھی شرعاً کسی کو حق نہ ہوگا کہ وہ نکیر کرسکے۔ کیونکہ ظن کی حیثیت سے تینوں مسائل ایک ہی صف میں نظر آرہے ہیں۔ اور راز ایسے الفاظ و عنوانات کا یہ ہے کہ عارفین جب مقام نزول میں ہوتے ہیں۔ جو حسب ارشاد محققین مقام عروج سے افضل ہے۔ تو بوجہ غلبہ عبدیت اور فنا ان کی زبان سے اپنی ذات کے متعلق ایسے ایسے الفاظ و تعبیرات نکلتے ہیں کہ جو سرتاسر عبدیت و فنا میں غرق ہوتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو جب تک ان کو ایسے الفاظ نکالنے کا امر نہیں ہوتا۔ تو ایسے الفاظ کا بھی ان کو اپنی زبان سے نکالنا ناگوار گذرتا ہے۔ ان کا تو یہ مذاق ہوتا ہے کہ ع

با وجودت زمن آواز نیاید کہ منم

بلکہ محبوب کے سامنے اپنے وجود کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ اور یوں کہتے ہیں کہ ؎

بگفتا مبر نام من پیش دوست — کہ حیف است نام من آنجا کہ اوست

بلکہ بعض اوقات اپنی تعریف تو درکنار اپنے محبوب حقیقی کی تعریف کو بھی خلاف ادب تصور کرکے خاموش ہوجاتے ہیں۔ کذا قال العارف الرومی ؎

خود ثنا گفتن زمن ترک ثنا ست — کایں دلیل ہستی و ہستی خطا ست

مادح خورشید مداح خود است — کہ دو چشمم روشن و نامردہ است

بس ان حضرات کے کلام کے اندر کمال کا دعویٰ ڈھونڈنا ایسا ہی ہے۔ جیسے کشتہ طلا کے اندر سونے کے ذرات کی تلاش۔" (ص۲۳)

اصولِ زندگی

ہیں مطابق فہمِ انسانی کے سب اسکے اصول
علم و حکمت کے قریب اور عقل و دانش کے قریں

(ظفر علی خاں)

خانقاہ امدادیہ

حقیقتِ خانقاہ

خانقاہ ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی تربیت گاہ کے بھی ہیں۔ جہاں کتاب وسنت کے مطابق تزکیۂ نفس وصحتِ اخلاق کی عملی تعلیم دی جاتی ہو۔ اس کی بہترین مثال اصحابِ صفہ کی تربیت گاہ تھی۔ جس میں خود سرکارِ دو عالم ان کی عملی تعلیم وتربیت فرماتے تھے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تعلیم وتربیت کی ندرت وجامعیت کے پیشِ نظر ہر دور میں اہل اللہ نے اپنے اپنے علاقہ میں ایسی تربیت گاہیں قائم کیں جن میں رشد وہدایت کے چشمے ابلتے تھے۔ گر رفتہ رفتہ عجمی تصوف ورہبانیت کا ان پر کچھ ایسا گہرا چھاپا کہ ان کی اصلیت وحقیقت ہمیشہ کے لئے مستور ہو کر رہ گئی۔ گر اس گہرے گہن میں چشمِ بینا اکثر وبیشتر حقیقی خانقاہوں کا فی الفور پتہ لگا لیتی۔ گر چشم ظاہر بین شاذ ہی وہاں تک پہنچ سکتی۔ اسلئے جب بھی یہ لفظ کہیں نظر آتا ہے۔ تو ذہن انسانی فی الفور غلط تصورات کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی عملی مثالیں اسی مادی دنیا میں بھی موجود ہیں۔ جہاں مختلف علوم وفنون کی علمی وعملی تعلیم وتربیت دی جاتی ہے۔

وجہ تسمیہ

تھانہ بھون کی دینی تربیت گاہ کی بنیاد شیخ طریقت حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی تھی۔ جو اپنے زمانہ کے اعظم مشائخ وعلماء میں سے تھے۔ ان کا شمار اس دور کے "اقطابِ ثلاثہ" میں ہوتا تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت حافظ محمد ضامنؒ ان کے پیر بھائی تھے۔ یہ تینوں حضرات اسی خانقاہ میں ذکر وفکر میں مشغول رہتے تھے جس کی وجہ یہ مشائخ میں "معرفت گاہ" کہلاتی تھی۔

مولانا شیخ محمد ۱۲۹۶ھ میں وفات پا گئے۔ حضرت حافظ محمد ضامنؒ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں ایک فرنگی کی گولی سے شہید ہوئے۔ اور اس انقلاب کے زمانہ میں حضرت حاجی صاحب مکہ معظمہ کو ہجرت فرما گئے۔ جس کی وجہ سے خانقاہ بے رونق ہو گئی۔

حضرت تھانویؒ نے اپنے شیخ کے ایماء پر ۱۳۱۵ھ میں آکر اسے پھر سے آباد کرنا شروع کیا حضرت حاجی صاحب چونکہ اسی خانقاہ کے حجرہ میں رہائش رکھتے تھے۔ جو اب تک موجود ہے اس لئے اس کے صحن مسجد اور خانقاہ کی عمارت میں بہت زیادہ اضافہ کر کے اس مجموعہ کا نام

حضرت حاجی صاحب کے ہی اسم مبارک پر "خانقاہ امدادیہ" رکھ دیا۔ جسے بعض ناواقف حضرت حاجی صاحب کا مزار تصور کرتے ہیں۔ اور بعض کم فہم "امداد باہمی" کا ادارہ سمجھتے ہیں۔

وسعتِ خانقاہ

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی جب پہلی مرتبہ ۳۰ جون ۱۹۲۸ء کو تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ تو انہوں نے اپنے جائزہ کی بنا پر اپنی کتاب "حکیم الامت" میں اس کی وسعت کی یہ کیفیت درج فرمائی:-

"خانقاہ کی عمارت قصبہ کے بالکل مغربی سرحد پر ہے۔ اس کے بعد اس لائین میں کوئی آبادی نہیں۔ کوئی دو فرلانگ پر ٹاؤن کا ریلوے سٹیشن ہے۔ قصبہ کی اکثر پرانی شاندار عمارتوں کی طرح سڑک بھی پرانی لکھوری اینٹ اور کھڑنجے کی ہے۔ جو عین خانقاہ کے دروازہ تک آتی ہے۔ پھاٹک کے اندر ایک وسیع صحن کنارے کنارے چاروں طرف پختہ برآمدہ یا ٹین کا سائبان۔ اس سلیقہ کے ساتھ کہ آدمی برسات میں ٹین کے نیچے نیچے پورا چکر لگا لے۔ نصف صحن کے قریب ایک پختہ حوض زیادہ حصہ پٹا ہوا۔ ایک لمبا حصہ کھلا ہوا۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی آپ کو دو طرف غسل خانے ملیں گے۔ چھوٹے لیکن ضرورت کے لئے کافی۔ جاڑوں میں پانی گرم کرنے کا انتظام موجود۔ اور سائبان کے نیچے بالکل متصل کنواں۔ پردہ کھٹکھٹا کر کے اندرونی دروازہ میں داخل ہوئے۔ جوتے اتارے کہ صحن مسجد شروع ہو گیا۔ جوتا رکھنے کے لئے ایک چبوتر کا بکس کھلا ہوا رکھا ہوا۔ اب آپ مشرق سے اپنے بائیں طرف یعنی شمال کی جانب مڑے۔ یہیں کنواں۔ اس کے آگے بیت الخلا جانے کا راستہ۔ اس کے بعد مہمان خانہ کا زینہ مہمانوں کے لئے کمرہ۔ کوٹھے پر۔ سادہ مگر ہوادار۔ گنجائش اتنی کہ چار مہمان ایک وقت میں آسانی سے ٹھہر سکیں۔ زینہ سے چند ہی قدم اور آگے چلے کہ رخ شمال میں چلتے چلتے اپنے داہنے ہاتھ کو یعنی مغرب کی جانب مڑنا پڑا۔ اور ایک لمبا برآمدہ ملا۔ اس برآمدہ میں دو سہ دریاں ہیں۔ پہلی سہ دری کے عقب میں کتب خانہ کا کمرہ۔ دوسری سہ دری خاص حضرت کی نشست گاہ۔ ایک حجرہ اس کے عقب میں۔ دوسرا حجرہ اس کے مغربی کونے پر۔ یہی حجرہ حضرت حاجی صاحب کا تھا۔ اور ایک کوٹھڑی اس کے جواب میں برآمدہ کے شرقی کونے پر

یہی حجرہ حضرت حاجی صاحب کا تھا۔ اور ایک کوٹھڑی اس کے جواب میں برآمدہ کے شرقی کونے پر۔ اب دوسری سہ دری سے نکل کر مسجد میں آگئے۔ مسجد کچھ ایسی بڑی نہیں لیکن بڑی پررونق اور پُر انوار۔ اور ساتھ ہی گنجائش اور آرام دہ۔ ختم مسجد کے بعد اسی مغربی لائن میں دالان۔ اور اس کے عقب میں طالبین و سالکین کے لئے حجرے۔ دالان میں ابتدائی تعلیم کے لئے لڑکوں کا مدرسہ قرآنی۔ خالمتہ پر زینہ اور کچھ اور حجرے۔ اوپر اور نیچے کے یہ سب حجرے طالبوں کے لئے ہیں۔ اب آپ پھر اپنی داہنی طرف یعنی شرق کی جانب مڑے۔ اور جنوبی برآمدہ میں آگئے اس کا نصف حصہ مدرسہ اور مہمانوں کے لئے ہے۔ اندرونی درجہ میں متعدد مہمانوں کی گنجائش۔ برآمدہ کے دوسرے حصہ میں مدرسہ کی اونچی جماعتیں یعنی ہدایہ خواں طلبہ کی درسگاہ۔ اس کے عقب میں رسالہ "النور" کا دفتر۔ حضرت کے بھتیجے اور خانقاہ کے مہتمم و نگراں مولانا شبیر علی صاحب کا کتب خانہ تجارتی۔ اس کے بعد آپ شمال کی جانب ایک بار پھر مڑے۔ اور شرق میں کنارہ پر چلتے چلتے چند قدم کے بعد دروازہ پر واپس پہنچ گئے۔ حجروں کی قطار ادھر بھی موجود۔ اور وضو کے لئے باقاعدہ نالیاں اس مستطیل کے شرقی ضلع میں شمال سے جنوب تک برابر بنی ہوئیں"۔

(حکیم الامت ص ۱۷-۱۸)

نظم و ضبط دنیا میں کوئی حکومت اور کوئی ادارہ نظم و ضبط کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اسی لئے قرآن پاک نے زندگی کے ہر دور اور شعبہ کے لئے حدود و قواعد کی پابندی لازمی قرار دی ہے۔ معلم الاخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مسلمانوں کی داخلی اور خارجی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی غرض سے بھیجا گیا۔ جیسا کہ ان کا اپنا ارشاد ہے کہ "میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں"۔ مگر عام طور پر نہ صرف عوام بلکہ خواص کا تصور یہی ہے کہ یہ اصول و قواعد۔ حدود و قیود اور نظم و ضبط صرف انگریزوں کے ہاں تھا۔ اسلام ان کا مانع نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کی زندگی کے کسی شعبہ میں کبھی باضابطگی نہیں پائی جاتی۔ جو کام بھی ہے بے ضابطہ اور بے طریقہ۔ اس طرف سب سے پہلے ہندوستان میں حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے توجہ فرمائی۔ اور انہوں نے مسلمانوں میں ضبط و نظم پیدا کرنے کے لئے اپنے ہاں ہر موقع و محل کے لئے اصول و قواعد تیار کئے۔ ان کی خود بھی اور دوسروں سے بھی پابندی کراتے تھے۔

کی وجہ سے نافہم لوگ آپ کو سخت گیر کہتے۔ حالانکہ اس دور میں سب سے پہلے امت مسلمہ کو جو سبق حضرت تھانویؒ نے دیا۔ اسی کو قائد اعظم نے بھی دہرایا۔ قوم کو مشورہ دیا کہ وہ اتحاد۔ تنظیم اور یقین سے کام لے۔ چونکہ حضرت تھانوی کی یہ اصول پسندی بعض طبائع پر گراں گزرتی تھی۔ اسلئے وہ آپ پر یوں زبانِ طعن دراز کرتے تھے:۔

"یہ اصول پسندی تو بالکل انگریزیت ہے کہ ملنے کے اوقات مقرر۔ گفتگو کے طور طریق متعین۔ یہ بھی کوئی درویشی ہے"۔

حالانکہ آرام و راحت کا بہت حد تک دارومدار ضبط و نظم پر ہے۔ لہذا حضرت تھانوی کے ہاں اس کا بہت اہتمام تھا۔ آپ نے نو واردین کی سہولت و راحت کے لئے ایک سوالنامہ چھپا رکھا تھا جس کی تمہید یہ تھی کہ:۔

"بعض حضرات احقر کے پاس خاص مقاصد کے لئے تشریف لاتے ہیں۔ جن کی بجا آوری ان کے مفصل حالات ضروریہ کے مطلع ہونے پر موقوف ہوتی ہے۔ مگر اکثر کا میرے سوال کرنے پر بھی جواب نہیں ملتا۔ یا بہت ہی ناتمام ملتا ہے یا کئی کئی بار کے پوچھنے پر ملتا ہے جس سے طبعاً اذیت ہوتی ہے۔ اور اذیت سے تنگی و کدورت جو ان کے مقاصد میں مخل ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی وجہ پوچھنے پر اکثر نے تصریحاً یہ وجہ بیان کی کہ زبانی سوال سے انتشار ہوجاتا ہے۔ اسلئے سہولت کے لئے نقشہ ذیل تجویز کرتا ہوں کہ یہ نقشہ پیش کردیا کریں۔ اور وہ اس کی خانہ پری خود یا کسی سے کرا کر مجھ کو عنایت فرما دیا کریں۔ کیونکہ جانبین کو اس میں راحت ہوگی۔ اشرف علی"

سوال نامہ

۱۔ نام

۲۔ اصلی وطن

۳۔ اس وقت کس مقام سے آنا ہوا۔ اور اس مقام میں کتنا قیام رہا ہے۔

۴۔ شغل و ذریعہ معاش

۵۔ مورد ثی زمین تو آپ کے پاس نہیں۔

۶۔ علمی استعداد اردو یا عربی یا انگریزی میں کس قدر ہے

۷۔ اصل مقصد آنے سے کیا ہے؟ محض ملاقات یا کچھ کہنا اور لکھ کر دینا یا زبانی اور مجمع میں یا تنہائی میں۔

۸۔ کسی سے بیعت ہیں یا نہیں ہیں تو کس سے۔
۹۔ اگر مجھ سے بیعت ہیں تو بیعت کو کتنا زمانہ ہوا اور تعلیم کس کے متعلق ہے۔
۱۰۔ میرے کون کون سے مواعظ و رسائل دیکھے ہیں۔
۱۱۔ اگر مجھ سے کچھ خط و کتابت ہوئی ہے۔ تو وہ پاس ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو دکھلائیے۔
۱۲۔ کتنا قیام ہوگا۔
۱۳۔ کہاں قیام ہوگا۔
۱۴۔ خانقاہ میں اول بار آنا ہوا ہے یا پہلے بھی آئے ہیں۔ اگر پہلے بھی آئے ہیں تو کتنا قیام ہوگا۔

۱۵۔ یہاں کے انتظام تعاد کی آپ کو خبر ہے یا نہیں۔
۱۶۔ باہر والا بڑا اعلان قلمی دیکھ لیا ہے یا نہیں۔ "اشرف علی"

اوقات نامہ سوال نمبر ۱۶ میں جس اعلان کی طرف اشارہ ہے وہ حسب ذیل تھا جو زائرین کی سہولت اور اپنے بھی حرج اوقات کے انسداد کیلئے آپ کی نشستگاہ کے باہر آویزاں رہتا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعلان انضباط اوقات احقر

تاکہ نہ اہل حاجت کا حرج یا تکلیف ہو۔ نہ احقر کا

۱۔ صبح سے بارہ بجے تک مجھ کو متفرق ایسے کام رہتے ہیں۔ جو تنہائی میں ہو سکتے ہیں۔ اس وقت کسی کے ملنے میں یا بات چیت کرنے میں تکلیف بھی ہے حرج بھی ہے۔

۲۔ البتہ اوپر کے نمبر سے تین شخص مستثنے ہیں۔ ایک وہ شخص جو تازہ آیا ہو۔ اور صرف ملاقات کا مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا وہ جو جا رہا ہو۔ اور صرف رخصت کا مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جس کو ایسی حاجت ہو کہ اس میں مہلت نہیں ہو سکتی۔ مثلاً درد زہ وغیرہ کا تعویذ لینا ہو یا فوری ضرورت کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو۔ جس میں تاخیر نہ ہو سکے۔ مگر ان تینوں شخصوں کو چاہئے کہ آتے ہی کہدیں کہ ہمارے اس وقت آنے کی یہ وجہ ہے۔ تاکہ معلوم نہ ہونے سے پریشانی نہ ہو۔

۳۔ پھر بارہ بجے سے نماز ظہر سے فارغ ہو کر اپنی مجلس میں اٹھنے تک میرے قیلولہ و نماز کا وقت ہے۔ اس میں ملاقات سے اور نیز سب خدمات سے معافی چاہتا ہوں۔

۴۔ پھر جب نمازِ ظہر پڑھ کر اپنی مجلس میں حاضر ہو جاؤں۔ اس وقت سے عصر کی اذان ہونے تک عام اجازت ہے۔ آنے کی بیٹھنے کی ہر قسم کی بات چیت کی۔ تعویذ وغیرہ مانگنے کی۔ البتہ جمعہ کا دن تعویذ سے مستثنیٰ ہے۔

۵۔ اذانِ عصر سے نماز سے فارغ ہونے تک کے لئے وہی قاعدہ ہے جو قیلولہ کے وقت کا ہے۔ اور نمبر ۳ میں مذکور ہے۔

۶۔ عصر سے فارغ ہونے کے بعد سے عشاء سے فارغ ہونے تک کیلئے وہ قاعدہ ہے جو صبح سے بارہ بجے تک کے وقت کا ہے۔ اور نمبر ۱ میں مذکور ہے۔ اور وہی لوگ یہاں بھی مستثنیٰ ہیں جو نمبر ۲ میں مذکور ہیں۔

۷۔ عشاء کے بعد تو علی الاطلاق معذوری ظاہر ہے۔ باستثناء اضطرار شدید۔

۸۔ یہ قواعد اُن صاحبوں کے لئے ہیں جو مجمع میں اپنا مقصود ظاہر فرما سکتے ہیں۔ اور جو کسی کو کچھ پوشیدہ کہنا ہے۔ اسکے لئے یہ قاعدہ ہے کہ اگر تحریر کو کافی سمجھیں۔ تو میری مجلس سے ملحق سہ دری کی دیوار میں ایک بکس لگا ہے۔ اس میں لکھ کر ڈال دیں۔ اور جس موقع پر جواب چاہتے ہوں۔ اس کا پورا پورا پتہ لکھ دیں۔ مثلاً فلاں نمبر کے حجرہ میں یا مسجد کے ممبر پر ہمیشہ بعد نماز فجر ایسے پرچے نکالے جاتے ہیں۔ اسی طریقے سے جواب تحریری مل جاوے گا۔ اور اگر وہ پوشیدہ بات زبانی ہی کہنا چاہیں۔ تو ایسے ہی پرچے کے ذریعے سے تنہائی کا وقت پوچھ لیں میں جو وقت بتلاؤں۔ اس وقت بات کرلیں۔ اور اکثر بعد مغرب کا وقت بتلایا کرتا ہوں۔

۹۔ بعض مہمانوں کو میں خاص اجازت دے کر تنہائی کے وقت میں بٹھلا لیتا ہوں۔ دوسرے حضرات اپنے کو ان پر قیاس نہ کریں۔ اور اسی طرح ایک کو کہ کوئی خدمت پنکھا وغیرہ کی کرتا ہو دیکھ کر دوسرے اس کی تقلید نہ کریں۔ جب تک خاص اجازت حاصل نہ کرلیں۔ اسی طرح دوسری خدمت بھی بلا صریح اجازت نہ کریں۔ جیسے جوتا اٹھانا یا لوٹا بھر کر رکھنا وغیرہ۔

۱۰۔ راستہ میں بھی کوئی صاحب میرے ساتھ نہ چلیں۔ نہ گھر جا کر پکاریں۔

نوٹ نمبر ۱۔ یہ سب قواعد ان صاحبوں کے لئے ہیں۔ جو محض عقیدت مندی کے تحت آتے ہیں اور جن کو کوئی دوسرا تعلق بھی ہو۔ ان کے لئے یہ ضابطہ نہیں۔ البتہ اگر کسی کو کسی خاص قاعدہ کا پابند کردوں تو اس کو اس کی پابندی لازم ہے۔

نوٹ نمبر ۲۔ کسی وقت ضرورت سے کچھ ترمیم کردوں۔ تو ترمیم ہی پر عمل ہوگا۔ اسی طرح ذاتی

ملازموں کے لئے دوسرے ضوابط ہیں جو ان کو زبانی بتا دیئے گئے ہیں۔
ماہ رمضان کے لئے ان قواعد کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔

۱۔ وقت تنگ اور مشاغل زیادہ ہونے کی وجہ سے رمضان گذرنے تک صبح کی مجلس موقوف کر دی گئی۔ ایک دو منٹ کے لئے ضروری بات کی زبانی اجازت ہے۔

۲۔ جن حضرات کو یہاں کے زمانہ قیام میں مکاتبت کی اجازت نہیں۔ وہ تو کسی قسم کا پرچہ نہ لکھیں اور جن کو اجازت ہے۔ وہ سہ دری والے لیٹر بکس میں نہ ڈالیں۔ بلکہ ڈاک کے ذریعہ سے بھیجیں اور جواب ملنے کا ذریعہ یہ ہوگا کہ عصر کے بعد حافظ اعجاز کے پاس جا بیٹھیں۔ ان کے پاس ایک بکس ہوگا۔ وہ اس کو کھول کر پرچہ والوں کے نام لے کر پکار پکار کر حوالہ کر دیں گے اور مناسب یہ ہے کہ ڈاک میں ڈالنے سے دوسرے روز جواب کا انتظار کریں اور شاذ و نادر بعض اوقات تیسرے روز ملنا بھی محتمل ہے۔ کتبہ اشرف علی عفی عنہ

اصول استثنا

حضرت تھانوی با ضابطہ ہونے میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ مگر ضابطہ کی پابندی بھی حد اعتدال کے اندر رکھتی اور افراط و تفریط سے قطعاً پاک تھی۔ حالانکہ عام طور پر پابند اصول انسان استثنا کے قائل نہیں ہوتے۔ جس طرح پابندی اصول فطرت سلیمہ کا مقتضا ہے۔ اسی طرح ضروری اور خصوصی مواقع پر استثنا سے کام لینا بھی فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانوی کا کوئی قاعدہ ایسا نہیں تھا۔ جس میں مستثنیات نہ ہوں۔ مگر آپ کا استثنا بھی قاعدہ کے مطابق تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا بکثرت استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ صرف خاص اہل تعلق۔ اہل قرابت۔ اہل فضیلت اور اہل حوائج شاذ و نادر ہی اس سے کبھی کبھی فائدہ اٹھاتے تھے۔

شرائط حاضری

اگر کوئی نو وارد طالب تحریری طور پر حاضری خدمت کی اجازت چاہتا۔ تو سب سے پہلے اس سے یہ سوال فرماتے کہ لکھا جائے آنے کی ایسی کون سی غرض و غایت ہے جس کے لئے حاضری اشد ضروری ہے۔ طالبین اپنے اپنے فہم کے مطابق اس سوال کے مختلف جواب عرض کرتے۔ لیکن جب تک وہ اس غایت کا انکشاف نہ کرتے۔ اس وقت تک آپ ان پر برابر جرح کرتے رہتے۔ اور آنے کی اجازت مرحمت نہ فرماتے اور اگر کوئی یہ لکھتا کہ حاضری صرف ملاقات کے لئے ہے اور زمانہ قیام میں مخاطبت و مکاتبت کی بجائے خاموشی کے ساتھ شریک مجلس رہوں گا۔ تو پھر آپ ایسے بخوشی اجازت دیتے تھے

اور فرمایا کرتے تھے کہ بس یہی ایک ایسا مقصود ہے جو بغیر حاضری حاصل نہیں ہو سکتا۔ ورنہ دیگر تمام مقاصد کے لئے یہاں آنے کی زحمت گوارا کرنا قطعاً ضروری نہیں۔

دستور العمل بعد میں جب حضرت نے محسوس کیا کہ حاضری خانقاہ کی شرائط کے متعلق طالبین بہت گڑبڑ کرتے ہیں۔ اور طے ہونے میں بڑا وقت صرف ہوتا ہے۔ تو آپ نے اپنے ذاتی خرچ سے حاضری کے متعلق مندرجہ ذیل دستور العمل چھپوا لیا۔ جب کوئی حاضری کی اجازت طلب کرتا تو اسے یہ مطبوعہ شرائط نامہ بھیج دیا جاتا:۔

دستور العمل طالبان تعلق مرکب از مراتب سبعہ

اولاً یہاں کی ابتدائی آمد میں ہر حال میں بدوں مخاطبت و مکاتبت کے سکوت محض کے ساتھ صرف مجالست و مصاحبت بغرض حصول بصیرت و مناسبت۔

ثانیاً۔ یہاں سے جا کر اگر تعلق رکھنا چاہیں۔ اپنے مستقر سے اپنی اصلاح کے متعلق زیادہ مناسبت کے لئے مراسلت و مکاتبت۔

ثالثاً۔ مکرر آمد میں اگر یہاں کے قیام میں صرف مکاتبت چاہیں تو قبل آمد بذریعہ خط مجھ سے تحقیق موافقت و ضروری مناسبت و اخذ اجازت مکاتبت

رابعاً۔ بعد حصول اجازت نامہ جس کو آنے کے وقت دکھانا ضروری ہوگا۔ یہاں کے قیام میں صرف مکاتبت یا مخاطبت۔

خامساً۔ بعد مناسبت تامہ جو مکاتبت طویلہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ میری اجازت کے بعد یہاں کے قیام میں مکاتبت و مخاطبت۔

اور یہ سب تفصیل بقاء تعلق کی صورت میں ہے۔

سادساً۔ اگر اختلاف مذاق کے سبب مناسبت سے مایوسی ہو جائے۔ تو پھر مصلحت کیلئے نہ کہ کدورت کے سبب تجویز مفارقت و مجانبت و مشورۂ رجوع بجانب محل مناسبت۔

سابعاً۔ لیکن اس حالت میں بھی اگر خواہش کریں تو طلب دعا۔ دریافت خیریت کے لئے خط بھیجنے کی اجازت علی المواظبت و بشرط عدم انقباض سکوت کے ساتھ اجازت مجالست و مصاحبت

خلاصہ

(۱) محض مجالست (۲) مستقر سے مراسلت (۳) بعد مناسبت ضروریہ و اخذ اجازت مجالست و مع مکاتبت یا مخاطبت (۴) بعد مراسلت طویلہ و مناسبت تامہ و اخذ اجازت مجالست مع مکاتبت و مخاطبت

بصورت عدم حصول مناسبت

(۵) مشورہ رجوع بجانب محل مناسبت (۶) صرف برائے طلب دعا و خیریت اجازت مراسلت (۷) بشرط عدم انقباض اجازت مجالست بلا مکاتبت و مخاطبت۔ فقط۔ کتبہ اشرف علی عفی عنہ"

اس مطبوعہ دستورالعمل کے علاوہ آپ کے اس خط سے مزید شرائط کا بھی پتہ چلتا ہے جو آپ نے ایک خاتون کو عریضہ اجازت کے جواب میں تحریر فرمائیں کہ اگر کبھی تمہارے شوہر اپنی خوشی سے ہمراہ لاویں۔ بشرطیکہ قرض نہ اٹھانا پڑے۔ کسی قسم کا کوئی حرج بھی واقع نہ ہو اور تم ان پر تقاضا کرکے تنگ بھی نہ کرو اور پردہ میں اور نماز میں بھی سفر میں خلل نہ پڑے۔ تو اجازت ہے"۔

(مکتوبات حسن العزیز جلد ۱)

منشاءِ مصلحت اس دستورالعمل سے خادمین کو بہت سہولت ہوئی ـــ جس کے متعلق خود حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"نئے آنے والوں کے لئے بزمانہ قیام عدم مخاطبت و عدم مکاتبت کی شرط اللہ تعالیٰ نے خوب میرے دل میں ڈال دی۔ ورنہ عدم مناسبت مزاج اور عدم واقفیت طریق کی وجہ سے لوگ بے اصولی باتیں اور بے تکے سوالات کرکر کے مجھے بڑی اذیتیں پہنچاتے اور نہ صرف اپنا بلکہ میرا بھی بڑا وقت ضائع کرتے۔ اب تو الحمد للہ کا شکر ہے کہ میں بھی اپنے کام میں اطمینان سے مشغول رہتا ہوں۔ اور ان لوگوں کو بھی نہایت یکسوئی اور سکون کے ساتھ میری باتیں سننے اور اطمینان سے ان پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ورنہ اگر قیل و قال کی اجازت ہوتی۔ تو مجلس کیا ہوتی۔ چوپال ہوتی بڑے پریشان ہوتے۔ اور بڑا پریشان کرتے۔ اور یہاں سے بالکل کورے جاتے اب تو بکثرت اس مضمون کے خطوط آتے رہتے ہیں کہ خموشی کے ساتھ بیٹھنے سے بہت نفع حاصل ہوا"۔

کیونکہ حاضر مجلس رہ کر انہیں حضرت کے طرزِ تربیت۔ اخلاق و عادات۔ ترغیب و ترہیب۔ زجر و توبیخ غرضیکہ ہر بات کا علم و مشاہدہ ہو جاتا تھا۔

آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہاں آنے والوں کے متعلق میرے جتنے معمولات ہیں۔ ان سب کا منشا تعلیم ادب ہے۔ یہ اصل ہے۔ اور سب فروع۔ جو کہ زمانہ اور مصالح اور ضرورتوں کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس اصل کی تصریح تا بعی حدیث کان علیہ الرضا الطبرے ہوتی ہے

اگر یہ تائید نہ بھی ہوتی تب بھی اس کے مستحسن اور قابل عمل ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا۔

زمانہ قیام میں عدم مخاطبت و مکاتبت کا یہ فائدہ ہے کہ نئے آنے والے پہلے خموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے میرا طرز تربیت۔ میری عادات۔ میری خصوصیات مزاج دیکھیں۔ اور میری باتیں سنیں ان پر اطمینان سے غور کریں۔ پھر یہاں سے جا کر آزادی کے ساتھ رائے قائم کریں۔ اگر میرا طریقہ اور مزاج پسند نہ آئے۔ اور مجھ سے مناسبت پیدا ہونے کی توقع نہ ہو۔ تو کسی دوسرے سے رجوع کریں۔ اگر میری باتیں سب پسند ہوں۔ تو پھر اصلاح کے متعلق مجھ سے خط و کتابت کریں شروع میں اصلاح خاص کی نیت سے یہاں نہ آئیں۔ بلکہ یہ دیکھنے اور سیکھنے کے لئے آئیں کہ آیا باہم مناسبت ہو گی یا نہ ہو گی۔ اور اگر ہو گی۔ تو اپنی اصلاح کے متعلق خط و کتابت کرنے اور اپنے امراض نفس کے پیش کرنے کا صحیح اور نافع طریق کیا ہے۔

مزید براں فائدہ یہ ہے کہ میرے متعلق عمر بھر میں جتنے کسی کو وسوسے آنے ہوں۔ اور اشکالات پیدا ہوتے ہوں۔ وہ ایک دم سے آجائیں اور ختم بھی ہو جائیں۔ اور پھر عمر بھر کے لئے یکسوئی ہو جائے۔ یا تو ہمیشہ کے لئے معتقد ہو کر یا ہمیشہ کے لئے غیر معتقد ہو کر۔ ورنہ اگر میں اپنے آپ کو بنائے ہوئے رکھتا۔ تو عمر بھر بھی یکسوئی نہ ہوتی۔ جب کوئی بات اپنے خیال کے خلاف دیکھتے۔ فوراً شبہ قائم کرتے۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا۔ اور عمر بھر اطمینان نہ ہوتا۔ اب تو بُرا بھلا جیسا بھی ہوں۔ سب کو سابقہ پڑتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ پھر چاہے کوئی رہے یا جائے۔ اور مجھے بھی یکسوئی ہو جاتی ہے۔ اور اس خیال کے لوگوں سے میرا شروع سے ہی پیچھا چھوٹ جاتا ہے۔ جو بزرگی اسی کو سمجھتے ہیں کہ بت کی طرح بالکل بے حس ہو جائے۔ اگر ان کے ساتھ تعظیم کا برتاؤ کیا جائے۔ تب انہیں کوئی حس نہیں دوسرے یہ کہ بزرگی کا دعویٰ ہی کس نے کیا ہے اور بنانے کا اعلان کس نے دیا ہے۔ میں تو ایک طالب علم ہوں۔ اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے دین کی جو باتیں سنی ہیں وہ سناتا رہتا ہوں اور ان کی صحبت کی برکت سے دین کی جو حقیقت سمجھ میں آئی ہے۔ اس کو ظاہر کرتا رہتا ہوں۔ اگر کسی کے جی کو لگے۔ قبول کرے۔ نہ لگے نہ قبول کرے۔ اختیار ہے۔ تو نہ تو مجھے بنا آتی۔ نہ میں اس کو مفید سمجھتا ہوں۔ گو بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ رفتہ رفتہ اپنے طریق پر لانا چاہیئے لیکن میں اس کے خلاف ہوں۔ کیونکہ میرا تجربہ ہے کہ جس نے اپنے ذہن میں جو معیار بزرگی کا صحیح یا غلط قائم کر رکھا ہے۔ وہ ابھی وقت تک اس کا معتقد ہے۔ جب تک وہ اس

معیار کے مطابق اس کو سمجھے ہوئے ہے اور جہاں ذرا اس معیار سے ہٹا ہوا پایا۔ بس سارا اعتقاد جاتا رہا۔ معتقد فیہ تو اس خیال میں رہتا ہے کہ یہ شخص ہمارا معتقد ہے۔ حالانکہ وہ درحقیقت اپنے ہی خیال کا معتقد ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی معتقد کا اعتقاد جاتا رہے۔ تو معتقد فیہ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اس کا معتقد تھا ہی نہیں۔ بلکہ ایک خیالی شخص کا معتقد تھا۔ تو ایسے خیالی معتقد کے کم ہو جانے کا افسوس ہی کیا۔ بلکہ خوش ہونا چاہیئے کہ اچھا ہوا قبل تعلق ہی پیچھا چھوٹ گیا۔ ورنہ تعلق قائم ہو جانے کے بعد اگر تعلق قطع ہوتا اور ضرور ہوتا۔ تو بہت ناگواری ہوتی۔ اور جب تک تعلق رہتا بہت ستاتا اس لیے میں شروع ہی سے ہر طالب کے ساتھ ایسا صاف معاملہ کرتا ہوں کہ اس کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ شروع ہی میں فیصلہ ہو جائے۔ ادھر یا ادھر۔ نہ وہ دھوکہ میں رہے نہ میں۔ میرا تو بس یہی مذاق ہے ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو … دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

غرضیکہ پاس رہنے سے اصلاح نہیں ہوتی۔ بلکہ مناسبت پیدا ہوتی ہے۔ اور اپنے امراض کو پیش کرنے کا اور میرے جوابات کو سمجھ کر ان پر عمل کرنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔"

مذکور الصدر دستور العمل کی اس وضاحت کے بعد اس کی تائید میں واقعات پیش کرنا لازمی طور پر طوالت کا باعث ہوگا۔ اسلیئے اس کی صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے جس سے اس کا عملی نقشہ بھی واضح ہو جائے گا۔ بلا مکاتبت و مخاطبت والے ایک طالب نے مجلس میں رہ کر جب خاموشی سے حضرت کی تمام حرکات و سکنات اور طریقِ اصلاح وغیرہ کا جائزہ لے لیا۔ تو اس نے واپس جا کر آپ کو خط لکھا کہ:۔

"دورانِ قیام میں جو سکون اور اطمینانِ قلب حضرت والا کی صحبت بابرکت سے حاصل ہوا ہے۔ وہ بیان سے باہر ہے۔ خاص کر اپنے نفس کے عیبوں پر بصیرت کے ساتھ اطلاع ہوئی۔ خاص کر بدگمانی کا مرض مجھ میں شدید ہے اس کا علاج تجویز فرمائیں۔"

جس سے ظاہر ہے کہ اس طالب نے حضرت کے طریق کار کو صحیح سمجھا۔ اور بربنائے مناسبت اصلاح حال کے لیئے رجوع کیا۔ اور حضرت نے بھی بوجہ مناسبت فی الفور باقاعدہ تعلیم اصلاح شروع فرمادی اور اسے لکھا کہ:۔

"وہ بدگمانی اختیار سے ہوتی ہے یا بلا اختیار اور صرف بدگمانی ہوتی ہے۔ یا اسکے موافق عمل بھی ہوتا ہے؟ اور کیا ہوتا ہے؟ مع ایک دو مثال کے لکھو۔"

بس اسی طریق سے آپ محققانہ انداز میں امراض نفس کی تحقیق فرماتے جاتے اور علاج تجویز فرماتے جاتے۔

دستور تدارک مذکورالصدر انتظامات کے علی الرغم بعض لوگ بلا اجازت بھی حاضر ہو جاتے مگر ان کو بھی انہی اصولوں پہ کاربند ہونا پڑتا۔ جیسا کہ آپ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ "اگر کوئی بلا اجازت طلب کئے آجائے۔ تو میرے ہاں کوئی پہرہ چوکی تو ہے نہیں جو چاہے چلا آئے اور جب چاہے چلا آئے۔ مگر یہاں آنے کے بعد بھی اس سے یہی سوال ہوگا۔ اور قیام کی بھی وہی شرائط ہوں گی" چنانچہ بلا اجازت آنے والوں سے جب مذکورہ بالا سوالات ہوتے اور وہ بے ڈھنگے اور بے تکے جوابات دیتے۔ تو ان سے حضرت کو اذیت ہوتی اور اتنی ناگواری بڑھتی کہ ان کو دوسری ہی گاڑی سے واپس کر دیتے یا وہ از خود واپس چلے جاتے کیونکہ معاملہ صاف ہوئے بغیر قیام کرنا جانبین کے لئے تکدر پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔

لیکن اکثر دیکھا گیا کہ ایسے نوواردین کی واپسی کی نوبت کم آتی۔ اور حضرت ان کے معافی طلب کرنے پر معاف فرما دیتے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ "جو اذیت مجھے پہنچی۔ وہ کس مد میں رہی کیا یہ خالی ہی گئی۔ جس غرض کے لئے یہاں آئے ہو۔ یعنی قیام۔ وہ تو جبھی پوری ہوگی جب اس اذیت کا کچھ تدارک کیا جائے گا" جب وہ تدارک پوچھتا۔ تو اکثر اس سے خود تدارک تجویز کراتے۔ تاکہ وہ خواہ مخواہ حضرت پر سختی کا الزام نہ رکھے۔ چنانچہ وہ اپنی فہم یا دوسروں کے مشورہ سے مناسب تدارک تجویز کرتا۔ اگر حضرت اسے کافی سمجھتے۔ تو اسے ہی اس کے لئے جائز سمجھتے یا اس میں مناسب ترمیم و تنسیخ فرماتے اگر وہ کافی و شافی نہ ہوتا۔ تو پھر اس پر اس انداز سے جرح فرماتے کہ اس کا تدارک خود بخود اس کے ذہن میں آجاتا۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی تدارک اس کے ذہن میں نہ آتا۔ تو پھر خود بخود تجویز فرما دیتے۔ جو اکثر یہی ہوتا کہ کسی قریب مقام پر جا کر وہاں سے پھر حاضری کی اجازت طلب کی جاتی۔ اور بعض کیلئے صرف اسی پر اکتفا فرماتے۔ کہ آپ یہ اعلان لکھ کر خانقاہ میں آویزاں کر دیں کہ مجھ سے فلاں اذیت دہ حرکت سرزد ہوئی ہے۔ اور بعض کے لئے یہ تجویز فرماتے کہ سب مقیمین خانقاہ سے فرداً فرداً اپنی غلطی کا اظہار کیا جائے۔ تاکہ نفس کو گرانی ہو۔ اور آئندہ کے لئے اس کو تنبیہ

ہو۔ چونکہ حضرت کو ان کی اصلاح مطلوب ہوتی۔ اس لئے ہر ایک کی طبیعت کا جائزہ لے کر ہی اس کے مناسب حال علاج تجویز فرماتے۔ چنانچہ ایک صاحب نے اپنے لئے یہ تدارک تجویز کیا کہ سہارنپور واپس جا کر پھر حاضری کی اجازت طلب کروں۔ آپ نے یہ تجویز منظور فرمالی لیکن اسی وقت پھر ان سے کوئی اذیت دہ حرکت سرزد ہوئی۔ جب وجہ دریافت کی گئی تو وہ غلط تاویل کرنے لگے۔ جس پر آپ نے ان کے مجوزہ تدارک میں شدت مرض کے پیش نظر یہ ترمیم فرمادی کہ وہ سہارنپور کی بجائے دہلی جا کر حاضری کی اجازت طلب کریں اور اس پر افسوس بھی فرمایا کہ "واللہ مجھ کو اس سے سخت قلق ہوا ہے۔ بلکہ خود ان سے بھی زیادہ قلق ہے لیکن کیا کروں۔ بدوں اس تدارک کے ان کی اصلاح ہی نہیں ہو سکتی تھی" چونکہ وہ طالب صادق تھے۔ اسلئے دہلی تک واپس چلے گئے۔ وہاں سے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اجازت حاضری طلب کی۔ جو حضرت نے بخوشی دے دی۔ لیکن واپسی پر مطابق دستور العمل اجازت حاضری کا خط پیش کرتے وقت ان سے پھر غلطی ہوئی کہ پہلے تو خط جیب سے نکالا جب حضرت اس کو لینے کے لئے آمادہ ہوئے۔ تو اسے فرش پر رکھ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس سے آپ کو سخت اذیت ہوئی۔ جس پر آپ نے فرمایا کہ اگر مصافحہ کرنا تھا تو پہلے مصافحہ کر لیتے۔ پھر جیب سے خط نکالتے۔ اگر خط نکال کر لینے پر آمادہ کیا تھا۔ تو خط ہی دیدیتے۔ اس وقت مصافحہ نہ کرتے بعد میں کر لیتے۔ اس پر حضرت نے اسے اپنے پاس سے کچھ وقت کے لئے اٹھا دیا۔ ایسے مواقع پر آپ حاضرین سے فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"اگر میں لوگوں کی ان حرکتوں پر صبر کروں۔ تو ان کی اصلاح بھی نہ ہو۔ اور میرے قلب کے اندر ان کی طرف سے تکدر بھی پیدا ہو جائے۔ اور اب تو چونکہ میں اپنی اذیت کا اظہار کر دیتا ہوں۔ اور بعض لوگ اذیت کا تدارک بھی کر دیتے ہیں اس لئے میری طبیعت صاف رہتی ہے۔"

دستور سلف ممکن ہے دور حاضر کی نازک طبائع اتنی وضاحت و صراحت کے باوجود بھی دستور خانقاہ پر حرف گیر ہوں۔ تو ان کی آگاہی کے لئے یہاں یہ ذکر کر دینا بے سود نہ ہوگا کہ حضرت نے اس زمانہ کی نازک مزاجی کے پیش نظر یہ بہت ہی سہل شرطیں رکھی ہوئی تھیں ورنہ اکابر سلف میں تو تعلیم اصلاح کے لئے اس سے کئی درجے سخت شرائط مقرر تھیں جیسا کہ صاحب "اشرف السوانح" کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ "بزرگان سلف نے تو اس سے بھی

سخت سخت سزائیں تجویز فرمائی ہیں۔

طبقات شعرانی میں ایک بزرگ کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کی خدمت میں ایک طالب آئے اور یہ کہا کہ بہت دور سے آیا ہوں۔ اس احسان جتلانے پر ان کے لئے یہ تجویز فرمائی گئی کہ تین برس تک یہاں آنے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح اس کتاب میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ کی خدمت میں ایک طالب علم مقیم تھے۔ وہ ایک لاکھ درہم تو اپنے پاس سے اور ایک لاکھ درہم لے کر خرچ کر چکے تھے لیکن ہنوز ان کو کلام کرنے کی بھی اجازت نہیں ملی تھی۔"

اس لئے حضرت تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے طالبین بھی کوئی طالبین ہیں کہ ذرا سی ستیا کا بھی تحمل نہیں۔ اور پھر حضرت مولانا رومیؒ کا یہ شعر پڑھ دیتے تھے کہ؎

تو بیک زخمے گریزانی ز عشق　　　تو بجز نامے چہ میدانی ز عشق

اجتماعی حاضری حضرت تھانوی کو طالبین کا اکٹھا ہو کر بغرض اصلاح آنا بالکل پسند نہ تھا۔ اور عدم اجتماع کی وجہ یہ بیان فرماتے تھے کہ ہر شخص کا تنہا آنا ہی اس کے لئے مفید ہے۔ کیونکہ ہر شخص کے ساتھ اس کے مناسب حال برتاؤ کرنا ہوتا ہے۔ اگر سب ایک ساتھ آئے۔ تو سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنا پڑے گا۔ اور اگر کسی کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنا مناسب ہوا۔ تو اس کو اپنے ساتھیوں سے شرمندگی ہوگی۔ بس ہر شخص کا الگ الگ آنا ہی ٹھیک ہے۔ یہ تو سفر آخرت ہے۔ مردے قبر میں علیحدہ علیحدہ ہی جاتے ہیں۔" چنانچہ ایک صاحب نے عریضہ میں اپنے ہمراہ اپنے والد صاحب کو بھی لانے کا قصد ظاہر کیا۔ تو آپ نے ان کو لکھا کہ "وہ آپ کے ساتھ تشریف لائے۔ تو ان کو مخدوم بنا کر رکھنا پڑے گا۔ جس کے لئے میں بسر و چشم آمادہ ہوں۔ لیکن اُن کو نفع نہ ہوگا۔" اسی لئے حضرت کبھی کا کسی کے ساتھ بغرض اصلاح آنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ البتہ اگر کوئی محض ملاقات کے لئے کسی کو ساتھ لانا چاہے تو اسے اجازت تھی۔ جس طرح چاہے آئے۔

لنگر خانہ اتنی بڑی تربیت گاہ میں کوئی لنگر خانہ نہیں تھا۔ بلکہ آنے والوں اور مقیمین خانقاہ کے لئے ان کی درخواست پر بعض لوگ بطور خود قیمتاً کھانے کا انتظام کر دیتے تھے جس سے جانبین کو بہت آرام رہتا تھا۔ لنگر جاری نہ کرنے کی وجوہ حسب ذیل تھیں۔ جن کی خود حضرت تھانویؒ نے تصریح فرما دی تھی کہ:

۱۔ صادق و غیر صادق طالبین کا امتیاز مشکل ہو جاتا۔

۲۔ بہت سے محض روٹیوں کی خاطر پڑے رہتے۔
۳۔ لنگر خانہ کے اخراجات کے لئے ہر وقت آنے والوں کے ہاتھ پر نظر رہتی۔ کہ یہ کچھ دیں گے جو خلافِ استغنا تھا۔
۴۔ ہر وقت اس کی خود نگرانی کرنی پڑتی جس کے لئے وقت نہیں۔ اور دوسرے کسی پر ادنیٰ بار ڈالنا مناسب نہیں۔ اور نہ ہی انتظام دوسرے کے سپرد کر کے خود کو بری الذمہ سمجھا جا سکتا ہے۔ مزید براں
۵۔ محض دوسرے کے اعتماد پر کام چھوڑ دینے سے وہ کام مکمل نہیں ہوتا۔

مہمان داری حضرت تھانوی کے ہاں اکثر و بیشتر مہمانوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اس لئے خانقاہ میں ہر قسم کے مہمان خانے موجود تھے۔ البتہ مہمان داری کا کوئی معین ضابطہ نہ تھا۔ جس وقت جیسی ضرورت اور مصلحت دیکھتے۔ ویسے عمل فرماتے۔ مگر اپنا معتد بہ حرج اوقات نہ ہونے دیتے۔ ایک دفعہ بلا اطلاع اور بلا حصول اجازت کسی گاؤں سے چند مستورات بغرض بیعت آگئیں۔ گھر والے کھانے کے انتظام کے لئے متفکر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جنس دے دو۔ چولھا بتا دو اور کہہ دو کہ آپ ہی پکائیں اور آپ ہی کھائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

جن مہمانوں کی آمد کی اطلاع ہوتی۔ تو ان کی خاطر کوشش کر کے اپنے معمولات سے کچھ پہلے ہی فراغت حاصل کر لیتے۔ تاکہ ان کی طرف توجہ دی جا سکے۔ جنہوں نے اسی روز واپس ہونا ہوتا ان کے لئے تو قیلولہ کا بھی ناغہ فرما دیتے اور ڈاک کے کام میں بھی تاخیر کر دیتے۔ بعد میں زیادہ دیر تک بیٹھ کر ڈاک نکالتے۔

کم قیام کرنے والوں کو اپنے پاس بیٹھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع دیتے۔ اور کوشش فرماتے کہ اس تھوڑے وقت میں وہ زیادہ سے زیادہ دینی فائدہ حاصل کر سکیں۔ اور بعض اوقات اس حرص افادہ میں کھانے کے اوقات بھی مؤخر فرما دیتے۔ اور خاص حالات میں تو ظہر کی مجلس عام کے علاوہ صبح بھی ضروری کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ان کے لئے خاص مجلس منعقد فرماتے۔ جس کی ایسے حضرات کو بروقت اطلاع کرا دی جاتی۔

ہر مہمان کو اس کی حسب حیثیت گھر سے کھانا بھجواتے۔ جس کی کچھ تفصیل "باب معیشت" میں گزر چکی ہے۔ تعطیلات کے ایام میں دیوبند اور سہارنپور سے بڑی تعداد میں طلبا و اساتذہ اور

علمار کرام استفاضہ و استفادہ کے لئے تشریف لاتے تھے۔ اور کئی کئی دن مہمان رہتے تھے۔ طلبار کے علاوہ سب حضرت کے ہی مہمان ہوتے۔ مگر جن طلبا کے متعلق قرائن سے معلوم ہوتا کہ ان کے پاس کھانے کے لئے خرچ نہیں۔ تو ہر ایک سے جدا جدا بذریعہ ملازم دریافت فرما کر بقدر ضرورت ان کی مالی اعانت فرماتے۔

طریق استقبال خاص اہل تعلق کے لئے حضرت تھانوی اسٹیشن پر پہنچ کر استقبال کرنے یا واپس پہنچانے میں گریز نہ فرماتے۔ اور بعض اوقات انتہائی خواہش کے باوجود محض اس خیال سے اسٹیشن پر تشریف نہ لے جاتے کہ ان کو سخت شرمندگی ہوگی۔

بعض بہت ہی خاص اعزاز و امتیاز اور خصوصیت والے مہمانوں کی آمد کے وقت آپ اپنی جگہ سے اُٹھ کر استقبال فرماتے۔ اور معانقہ کرتے۔ لیکن اکثر ایسے موقعوں پر حاضرین مجلس کو کھڑے ہونے سے روک دیتے۔ کہ سب کی طرف سے میں ہی اُٹھتا ہوں۔ اور سب صاحب بیٹھے رہیں۔ دنیا دار آدمیوں کے استقبال کے وقت تو خصوصیت کے ساتھ اہل مجلس کو نہ اٹھنے دیتے۔

اسی طرح خواہ کتنا ہی عزیز مہمان ہو جب وہ روانہ ہونا چاہتا۔ تو اس کے ٹھہرانے کے لئے دل میں خواہش پیدا ہونے کے باوجود مزید قیام کے لئے قطعاً اصرار نہ فرماتے۔ بلکہ قصد روانگی سن کر یہی فرما دیتے کہ جس میں سہولت دیکھیں وہی کریں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اپنی دلی کیفیت محبت کا اظہار اس طرح مزاحاً فرماتے کہ یہ آنا کیا ہوا۔ یا کبھی نہ ہوا۔ مہمان کی راحت رسانی کی خاطر اس کی روانگی کے وقت کا خود خیال رکھتے۔ اور اگر روانگی کے وقت ان سے کچھ تغافل ہو جاتا۔ تو آپ خود خلاف دستور فرما دیتے کہ جانے کا وقت آگیا ہے۔ تاکہ ریل کے نکل جانے سے اُن کو ان کے عزم کے خلاف نہ رکنا پڑے۔ اور افسوس نہ ہو۔ غرضیکہ ہر وقت ان کی راحت کے خیال میں رہتے۔

اہتمام راحت حضرت تھانوی بتاکید فرمایا کرتے تھے کہ "خانقاہ میں آنے والوں کی، کسی بے عنوانی پر سوائے میرے حاضرین خانقاہ میں سے کوئی دوسرا روک ٹوک نہ کرے۔ نہ ان کو بلا پوچھے کوئی مشورہ دے۔ روک ٹوک کے لئے کیا میں اکیلا کچھ کم ہوں۔ میں ہی بہت کچھ روکتا ٹوکتا رہتا ہوں۔ اگر دوسرے بھی روکیں ٹوکیں تو بے چارہ آنے والا پریشان ہی ہو جائے۔ پھر ہر ایک کا روکنا ٹوکنا گوارا بھی تو نہیں ہوتا میرا روکنا ٹوکنا تو خیر اس لئے زیادہ ناگوار نہیں ہوتا۔ کہ میرے ہی قصد سے یہاں آتے ہیں۔ دوسروں کے

روکنے ٹوکنے سے دل شکنی ہوگی۔ جو مجھے ہرگز گوارا نہیں۔ پھر ہر شخص کو نصیحت کرنا آتا بھی نہیں نیز اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ آنے والے دوسرے روکنے ٹوکنے والوں کو مقرب اور دخیل سمجھ کر ان سے مرعوب و مغلوب ہوں گے۔ اور اپنی حاجات کا وسیلہ بنائیں گے۔ اور اس طمع میں ہدایا وغیرہ سے ان کی خدمت کریں گے۔ جس سے فریقین کے لئے سینکڑوں مفاسد کا باب مفتوح ہو جائے گا۔ اور اس میں خود میرے لئے بھی یہ خرابی ہے کہ اپنے بہت سے معین و معاون دیکھ کر میرا بھی دماغ خراب ہوگا۔

اب تو الحمد للہ میں کسی کو اپنا معاون و مددگار نہیں سمجھتا۔ اللہ کے سوا کسی پر میری نظر نہیں۔ کہنے کی تو بات نہیں۔ لیکن اس وقت ذکر آ ہی گیا۔ تو کہتا ہوں کہ دنیا میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا سمجھتا ہوں۔ سوائے اللہ تعالے کی ذات کے کسی کو اپنا نہیں سمجھتا۔ بس یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ اور ایک اکیلے شخص کے ساتھ ایک اکیلی ذات ہے اور کوئی نہیں۔

لوگوں کی تو اپنے خدام اور محبین پر نظر ہوتی ہے۔ میری کسی پر بھی نظر نہیں۔ میری خشکی کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ میں کسی کو اپنا محب اور معین و معاون نہیں بناتا یا رکھنا چاہتا۔ ہر شخص سے تو آزادی کے ساتھ جو برتاؤ مناسب سمجھتا ہوں کرتا ہوں۔ الحمد للہ کبھی وسوسہ ہی پیدا نہیں ہوا کہ ایسے برتاؤ سے فلاں شخص میرا ساتھ چھوڑ دے گا۔ اور یہ میں دعویٰ سے نہیں کہتا۔ بلکہ یہ کہتے ہوئے ڈر بھی لگتا ہے کہ خدا جانے اس میں کتنی واقعیت ہے اپنے نزدیک تو واقعیت کے خلاف نہیں کہہ رہا۔ اگر کمی بیشی ہو۔ تو اللہ تعالے معاف فرمائے۔

بنٰی اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالے نے میری اس وضع کو محض اپنے فضل و کرم سے نباہ رکھا ہے۔ کیونکہ وہ عین وقت پر میری غیب سے ہر حاجت پوری فرما دیتے ہیں۔ اور ایسے طریق سے میری راحت کا سامان مہیا فرما دیتے ہیں۔ جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا۔ اسی لئے میرا یہ طرز آزادی و استغناء کا نبھ رہا ہے۔ ورنہ اگر احتیاج ہوتی۔ تو سارا استغناء دھرا رہ جاتا۔ اور ساری آزادی رکھی رہ جاتی۔"

قواعدِ ملاقات نو وارد کو ابتدائی ملاقات کے لئے ان قواعد کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ آنے کے بعد فوراً مقیمین سے اوقات کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرے۔

۲۔ وہاں پہنچنے کے بعد جلد ہی ملاقات کر لے۔ کیونکہ نئے آنے والے کے لئے کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ تاکہ اسے انتظار نہ کرنا پڑے۔

۳۔ سلام و مصافحہ کے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ حضرت باتوں میں مشغول نہ ہوں۔ اور ہاتھ بھی مصافحہ کے لئے خالی ہوں۔ آرام نہ فرما رہے ہوں۔ اگر مشغول بیٹھا دیکھیں۔ تو بیٹھ جائے انتظار فراغت میں نہ کھڑا رہے کہ یہ تقاضے کی صورت ہوتی ہے جس سے قلب پر بار ہوتا ہے

۴۔ سلام و مصافحہ کے بعد فوراً اپنا پورا تعارف کرائے۔ بصورت خط و کتابت آخری خط پیش کرے۔ گفتگو بیٹھ کر اس طرح کرے کہ صاف سنائی دے۔ بات پوری کرے۔ ادھوری نہ کرے

۵۔ سوال کا جواب فوراً دے۔ انتظار میں نہ رکھے۔ اگر جواب ذہن میں نہ آئے۔ تو کہہ دے کہ پھر سوچ کر جواب دوں گا۔

۶۔ اگر کوئی غلطی ہو جائے۔ تو بلا تامل اور بلا تاویل اس کا اقرار کر لے۔ اور سبب دریافت کرنے پر اصل بات بتلا دے۔

۷۔ اگر کوئی خط یا پرچہ پیش کرنا ہو۔ تو سامنے رکھ دے اور کہہ بھی دے کہ یہ پرچہ ملاحظہ ہو اس کو ہاتھ میں نہ لئے رہے۔ کیونکہ یہ بھی صورت تقاضا کی ہے کہ دوسرے کام سے جلد ہاتھ فارغ کیا جائے۔

۸۔ اگر مصافحہ کی ضرورت سمجھے تو مصافحہ سے فارغ ہو کر پرچہ پیش کرے۔

۹۔ آنے کی غرض صاف صاف بتلا دے۔ تاکہ اس کے مطابق معاملہ ہو سکے۔

۱۰۔ اگر اسے کھانے کے لئے کہا گیا ہو تو کھانے کے وقت خانقاہ میں حاضر رہے تاکہ تلاش نہ کرنا پڑے۔

۱۱۔ مقیمین سے بکثرت میل ملاپ میں وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ ہر شخص اپنے اپنے کام میں لگا رہے۔ بلا ضرورت کوئی کسی سے بات نہ کرے۔

۱۲۔ بلا اجازت مقیمین و واردین ایک دوسرے کی دعوت نہ کریں۔

۱۳۔ اہل قصبہ سے کوئی تعلق پیدا نہ کرے۔

غرضیکہ حضرت ہر شے کو اپنی جگہ پر رکھنا اور دیکھنا چاہتے تھے جس سے قدم قدم پر سبق ملتا تھا۔

دستورِ خادمت حضرت تھانوی اس وقت تک کسی سے خدمت لینا پسند نہیں فرماتے تھے جب تک اس سے بالکل دل نہ کھل جائے۔ بلکہ جن سے دل کھل بھی جاتا۔ ان سے

بھی شاذ و نادر ہی اور کسی بہت ہی خفیف کام کی فرمائش فرماتے۔ البتہ اگر وہ خود سبقت کرتے تو منع نہ فرماتے۔ ان پر مسلط بھی نہ ہو جاتے۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا۔ کیونکہ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ بعض کام خود ہی کرنے سے اچھے ہوتے ہیں۔ اور بعضوں کی خدمت زحمت تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ ان کو خدمت کرنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ پھر ہر شخص کی طبیعت۔ مزاج۔ عادت مختلف ہوتی ہے واقف کار ہی سمجھ سکتا ہے کہ کس طریق سے خدمت کرنے میں راحت پہونچے گی۔ ہر شخص پر یہ اطمینان بھی نہیں کہ یہ خلوص سے ہی خدمت کرے گا۔ کیونکہ بعد میں اغراض نکل آتی ہیں۔ اور بعض سے خدمت لینا طبعًا گراں ہوتا ہے۔ مثلاً اہل علم سے۔ بیٹے سے اور بوڑھوں سے خدمت لیتے ہوئے گرانی ہوتی ہے۔"

خدمت کے زحمت ہونے کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ "بعضے استنجا کے لئے سخت گرم پانی دے دیتے ہیں جس کا استعمال کے وقت پتہ لگتا ہے اور اس وقت اسے معتدل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس طرح وضو کے لئے۔ سخت سرد یا سخت گرم پانی دے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے میں نے اب دو لوٹوں میں پانی منگانا شروع کیا ہے۔ نصف لوٹا سرد پانی کا اور دوسرا لوٹا گرم پانی کا۔ تاکہ حسب خواہش پانی ملا لیا جائے۔"

نیز فرمایا کہ "میں چاہتا ہوں کہ سب اپنے اپنے کام میں لگے رہیں۔ خواہ مخواہ میری خدمت کے لئے مجھ پر مسلط نہ ہوں۔ تاکہ وہ بھی آزاد رہیں اور میں بھی آزاد رہوں۔ کیونکہ آزادی بڑی لت ہے۔ خاصہ میرے مذاق کا حریت ہے۔ کہ چاہے اہانت ہو۔ چاہے تعظیم جس سے آزادی میں فرق آئے اپنی یا دوسروں کی۔ اس میں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اور ہر مسلمان کا یہی مذاق ہونا چاہیئے کہ غیر اللہ سے بالکل آزاد رہے۔ کیونکہ خدا کی عبدیت مخلوق کی عبدیت کے ساتھ کیسے جمع ہو سکتی۔ اسی لئے میں نے اپنی ضروریات اتنی مختصر کر رکھی ہیں۔ کہ ان کو خود ہی پورا کر لیتا ہوں۔ کسی دوسرے کی محتاجی بفضلہ تعالیٰ نہیں رہتی۔"

جو خدمت کرنا چاہتا۔ اجازت لئے بغیر نہ کر سکتا تھا۔ اور جسے روک دیتے تھے۔ اسے اصرار کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ یہ نہ صرف مضر بلکہ جانبین کے لئے باعث تکدر ہوتا تھا۔

نظم مجلس حضرت تھانوی جب مجلس یا مسجد میں آتے۔ تو لوگ تعظیمًا اٹھ کھڑے ہوتے یا مصلیٰ تک پہنچنے کے لئے ادھر ادھر بیٹھنے لگتے یا مڑ مڑ کر دیکھنے لگتے۔ یا مسجد کو آنے ہوئے

پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیتے۔ اس کی از حد ممانعت تھی۔ فرماتے تھے کہ "میرے آنے کی وجہ سے کوئی تغیر نہ ہونا چاہیئے۔ جو جس طرح بیٹھا ہے بیٹھا رہا کرے۔ یہ مجھے بہت گراں گزرتا ہے کہ میرے آنے کی وجہ سے ایک ہل چل سی پیدا ہو جائے۔ میرے لئے جگہ دینے کا کوئی اہتمام نہ کرے۔ میں خود جدھر سے چاہوں گا آزادی کے ساتھ مصلیٰ تک پہنچ جاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ نہ مجھ کو تکلیف ہو۔ نہ میری وجہ سے کسی دوسرے کو تکلیف ہو۔ اور نہ ہی میرے پیچھے پیچھے آنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس سے ایک شان اور نمود کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز اس سے وہ ناجائز فائدہ اٹھا کر میرے پیچھے ہی دوسروں کو ہٹا کر صف میں جگہ لے لیتے ہیں۔ جس کا ان کو کوئی حق نہیں ہوتا"۔

مسجد کو جاتے وقت کسی کو راستہ میں مصافحہ کی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ آپ عین وقت نماز کے قریب مسجد کو روانہ ہوتے اور راستہ میں مصافحہ وغیرہ سے قلت وقت کے باعث تاخیر اور تکلیف ہوتی۔ اور نہ ہی وظیفہ کے وقت مصافحہ کی اجازت تھی۔ کیونکہ اس طرح اس میں خلل پڑتا تھا۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کو بڑی غیرت آتی ہے کہ جو بندہ اس کے ذکر میں مشغول ہو۔ اسے دوسری طرف متوجہ کیا جائے۔

نشستگاہِ خاص آپ کی خصوصی نشستگاہ سہ دری تھی۔ جس کے درمیان میں شرقی غربی دیوار سے متصل ڈیسک کے سامنے ایک مسند نما فرش پر تشریف رکھتے تھے۔ اس کے پائین میں ایک گوشہ صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔ جن کو کوئی ضروری بات کہنی ہو یا صرف ملاقات کرنی ہو۔ مستقل طور پر کسی کو وہاں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ اسے ضروری بات کرنے کے بعد وہاں سے اٹھنا ہوتا۔ اور بیٹھنا چاہتا۔ تو وہاں سے اٹھ کر مجلس عام میں آ بیٹھتا۔ وہاں کسی کے آکر بیٹھنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ حضرت فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اور یہ جگہ مخصوص کرنے کا فائدہ یہ تھا کہ مجلس میں کسی قسم کی گڑبڑ نہ ہو۔ اور نہ لطف و کیف میں کوئی فرق پڑے۔

سہ دری کا مغربی حصہ اہل خصوصیت کے بیٹھنے کے لئے مخصوص تھا۔ وہاں صرف ایسے لوگ بیٹھتے۔ جن کو حضرت وہاں خود بیٹھنے کا ارشاد فرماتے یا جن کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ حضرت نے ان کو اس جگہ بیٹھنے کا اعزاز بخشا ہوا ہے۔ ایسے لوگوں کو تکلف کی اجازت نہ تھی۔ کہ وہ ہر دفعہ حضرت کے کہنے پر وہاں بیٹھیں۔ بلکہ انہیں خود بخود ہی وہاں بیٹھنا ہوتا۔

مولانا عبدالماجد لکھتے ہیں کہ:-

"بیٹھنے بٹھانے کے سب آداب اور قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے۔ ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ۔ ہر بات میں نظم و آہنگ۔ بعد ظہر مجلس عام میں یہ قاعدہ تھا کہ حضرت کے داہنے ہاتھ پر سہ دری میں جو وسیع جگہ پڑی ہوئی تھی۔ وہ عام طالبین اور واردین کے لئے تھی۔ ہر شخص جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے۔ کسی دوسرے کو نہ اٹھائے نہ کھسکائے بائیں جانب جگہ نسبتہً کم تنگ تھی۔ کوئی سات آٹھ شخصوں کے بیٹھنے بھر کی۔ ادھر مخصوصین بٹھلائے جاتے تھے۔ دو چار شخص سامنے بھی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک ایک در کی دیوار کی آڑ میں۔ بغیر دوسرے کے حق میں حجاب بنے"۔ (حکیم الامت ص[۲۳])

دیگر قواعد

طالبین اور نو واردین کو حضرت کو بالخصوص و دیگراں کو بالعموم تکنکی باندھ کر دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔

۲۔ طالبین کو دوسروں کی طرف سے سلام و پیام۔ خط و ہدیہ وغیرہ لانے کی بھی عام طور پر ممانعت تھی۔

۳۔ طالبین و نو واردین کو سفارشی خطوط لانے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ کیونکہ امر دین میں سفارش کوئی اثر نہیں رکھتی۔ جبکہ وہاں سارا اہتمام ہی دینی تعلیم و تربیت کا تھا۔ البتہ اس سے دوسرے کو اپنی مرضی کے موافق کام کرنے پر مجبور کرنا ہوتا ہے۔ جو حضرت کو پسند نہ تھا۔

۴۔ نو واردین کو ہدیہ پیش کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ تاوقتیکہ مناسبت تامہ پیدا نہ ہو جائے۔

۵۔ مسجد یا گھر کو آتے جاتے وقت راستہ میں مصافحہ یا بات چیت کرنا بھی ممنوع تھا کیونکہ آپ اکثر آمد و رفت کے دوران میں غور و فکر میں مشغول ہوتے تھے اور بسا اوقات بالعموم بعد از عصر قریب مغرب گھر واپس جاتے ہوئے راستہ میں کوئی مضمون پڑھتے ہوئے تشریف لے جاتے تھے اس طرح کسی کے مصافحہ کرنے یا مخل ہونے سے یکسوئی میں خلل پڑتا تھا۔

۶۔ راستہ چلتے وقت پشت کی جانب سے تخاطب تو داخل بدتہذیبی تھا۔ اور اسے بہت برا مناتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے حضرت امام ابو یوسفؒ کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر تم کو کوئی پشت کی طرف سے خطاب کرے تو اس کا جواب مت دو۔ اس نے تمہاری بڑی اہانت کی۔ اور اس نے تم کو گویا جانور سمجھا۔ کیونکہ جانوروں کو ہی پشت سے خطاب کیا جاتا ہے۔

۷۔ راستہ چلتے وقت کسی کا — خواہ مخواہ ساتھ ہو لینا بھی ممنوع تھا۔ کیونکہ چلنے میں آزادی نہیں رہتی۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ بھی راستہ میں اپنے ہمراہ کسی کو نہ چلنے دیتے تھے۔

۸۔ اسی طرح راستہ چلتے وقت پیچھے پیچھے چلنے کی بھی اجازت نہ تھی کہ یہ آپ کے اچانک رک جانے سے پیچھے آدمی کو ٹکر لگنے کا امکان تھا۔ اگر کوئی پیچھے چلنا ہی چاہتا۔ تو اتنے فاصلہ پر رہنے کی اجازت تھی کہ پاؤں کی آہٹ نہ آئے۔

۹۔ رخصت ہوتے وقت رخصتی ملاقات کے لئے کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ صرف اتنی پابندی تھی کہ آتے ہی کہہ دے کہ میں جا رہا ہوں۔ کیونکہ محض سلام و معانقہ سے پتہ نہیں چل سکتا کہ یہ آمد کا ہے یا رفت کا۔

۱۰۔ عین چلتے وقت تعویذ وغیرہ کی درخواست یا کوئی دیگر حاجت پیش کرنی بھی ممنوع تھی کیونکہ قلت وقت کے باعث جانبین کو تنگی ہوتی تھی۔

ان شرائط کی مفصل حکمتیں جاننے کے لئے اشرف السوانح حصہ دوم عنوان چہارم کا مطالعہ مفید رہے گا۔

ماجدی جائزہ مولانا عبد الماجد دریابادی اپنے مشاہدہ کی بناء پر کوائف خانقاہ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

معمول یہ تھا کہ طالبین و سالکین کا تانتا ہر زمانہ میں بندھا رہتا تھا۔ یہ لوگ آتے اور اپنے کھانے پینے کا انتظام خود کر کے خانقاہ میں ٹھہر جاتے۔ ان میں اچھے اچھے ذاکر و شاغل ہوتے۔ اور ان میں سے بعض تو اپنے زہد و ریاضت کی بناء پر خود قابل زیارت ہوتے۔ لیکن یہ لوگ ملنے ملانے کے ڈھب کے زیادہ نہ ہوتے۔ دن تو دن۔ رات کے بھی اگلے اور پچھلے حصوں میں اپنے کام میں لگے رہتے۔ اور کام سے مراد محض نوافل و اوراد ہی نہیں۔ ہاتھ پیر سے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں بھی ان حضرات کو تامل نہ ہوتا۔ سادگی۔ اخلاص۔ بے طمعی۔ بے نفسی کے بیسیوں سبق ان لوگوں کی زندگیوں کو دیکھ دیکھ کر سیکھے جا سکتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک تعداد حضرت کے مخصوص خلفاء کی بھی تھی۔ یہ عموماً اہل علم و اہل وجاہت ہوتے۔ کوئی نہ کوئی ان میں سے بھی تھانہ بھون حاضر ہی ہوتا رہتا۔ خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب (بی اے۔ ایل ایل بی) انسپکٹر آف سکولز۔ مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند، مولانا

مفتی محمد شفیع دیوبندی (مفتی اعظم پاکستان) طبیب حاذق مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری میرٹھی۔ اس وقت یہی نام خیال میں آرہے ہیں۔ اس قسم کے حضرات سے بھی تھانہ بھون کے طویل قیام کے دوران میں ضرور ملاقات ہو جاتی۔ ایک تیسرا طبقہ مولانا کے ذاتی مہمانوں کا ہوا کرتا۔ اور ان میں سے اکثر علم و دین کے مشاہیر ہی ہوتے۔ آج شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس کی دہلی سے آمد ہے۔ کل مدرسہ مظاہر العلوم کے مولانا عبد اللطیف صاحب اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپور سے آرہے ہیں اور پرسوں رائے پور کے مشہور بزرگ شیخ عبد القادر صاحب جنہیں پہنچانے کے لئے مولانا خود اسٹیشن تک گئے۔ اور ان کے پیچھے ان کا ذکر خیر بار بار کرتے رہے۔" (حکیم الامت صہ۱۳۹)

قواعد ضوابط کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مولانا قواعد و ضوابط کے محکوم نہ تھے۔ قاعدے اور ضابطے سب ضرورۃً اور سہولت کے لئے بنائے گئے تھے۔ یہ نہ تھا کہ اپنے اور دوسروں کے ہاتھ باندھ دینے کے لئے خواہ مخواہ کچھ ضابطے عاید کر لئے ہوں۔ یہ واقعہ خاص اسلئے درج کیا جاتا ہے کہ مولانا کو ایک گروہ ضابطہ پرستی میں بدنام کر چکا ہے۔ بانامی تمام تر ہیجا ایسے لوگوں نے قریب سے حضرت کو دیکھا ہی نہیں۔" (حکیم الامت صہ۸۹)

انوارِ الٰہی مولانا حافظ محمد عمر علی گڑھی رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے صاحب حال بزرگ تھے نے اپنے اس مشاہدہ کا مولوی حافظ جلیل احمد رئیس علی گڑھ سے جو حضرت کے خلیفہ مجاز تھے۔ ایک بار ذکر فرمایا کہ:۔

"ایک رات ریل کے ذریعہ تھانہ بھون حاضر ہوئے۔ تو جب ریل خانقاہ کے محاذ سے گذری تو میں نے عالم بیداری میں دیکھا کہ مسجد خانقاہ کے گنبد سے آسمان تک انوار کا ایک تار لگا ہوا ہے۔"

تصوف

شریعت و طریقت اسلام کی تمام تعلیمات کا سرچشمہ کتاب و سنت ہے۔ جس کی ابتدائی تعلیم مجلس نبوی میں دی جاتی تھی۔ وہ چونکہ ابتدائی دور تھا اور حلقہ گو شانِ اسلام اپنے

اصلی مرکز میں موجود تھے۔ جن کی تعداد بھی اس وقت اتنی زیادہ نہ تھی۔ جتنی بعد میں ہو گئی۔ اسلئے اس نبوی یونیورسٹی میں تمام علوم اسلام یعنی علم تفسیر علم حدیث ۔ علم فقہ اور علم تصوف کی تعلیم یک جا دی جاتی تھی۔ کوئی الگ الگ دفتر قائم نہ تھے۔ البتہ اسی نبوی یونیورسٹی میں ایک اقامتی شعبہ ایسا بھی موجود تھا۔ جس میں محبان خدا اور عاشقان رسول تزکیہ نفس و اصلاح باطن کی عملی تعلیم و تربیت کے لئے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اور اصحاب صفہ کہلاتے تھے۔

بعد ازاں جب اسلام عالمگیر حیثیت اختیار کر گیا۔ تو اس کی تعلیمات کو علماء دین نے الگ الگ دفاتر میں منضبط کر دیا۔ جنہوں نے علم حدیث کی خدمت کی۔ وہ محدث کہلائے جنہوں نے علم تفسیر کا کام سنبھالا۔ وہ مفسر بنے۔ جو فقہ کا کام کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وہ فقیہہ بن گئے۔ اور جنہوں نے صرف تزکیہ نفس و اصلاح باطن کا شعبہ سنبھالا وہ ـــــ صوفیاء مشہور ہوئے۔

اکابر سلف میں سے کسی نے شریعت کو طریقت سے الگ نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ طریقت کو شریعت کے تابع رکھا۔ یہاں تک کہ تصوف کو بطور فلسفہ پیش کرنے والے سب سے پہلے مصنف شیخ ابن عربی نے بھی (جن پر بعض ظاہر بین علماء نے کفر تک کا فتوی صادر کر دیا تھا) صاف طور پر لکھا ہے کہ:

اقسام مشائخ

"مشائخ صوفیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جو کتاب و سنت کے عارف ہیں۔ ظاہر میں کتاب و سنت کے موافق باتیں کرتے ہیں۔ اور باطن میں کتاب و سنت سے رنگے ہوتے ہیں۔ اللہ کے حدود کی نگہبانی کرتے ہیں۔ اس کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور احکام شرعی کی پابندی کرتے ہیں۔ امت پر شفقت کرتے ہیں۔ کسی گنہگار کو حقیر و ذلیل نہیں کرتے۔ اللہ کو جو محبوب ہے اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اللہ کو جو مبغوض ہے اس سے بغض رکھتے ہیں۔ اللہ کے راستے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اچھی باتوں کا امر کرتے ہیں۔ اور متفق علیہ منکر سے منع کرتے ہیں۔ یہ حضرات وہ ہیں۔ جن کا اقتدا کیا جاتا ہے۔ ان کا احترام واجب ہے۔ یہی ہیں۔ جن کی صورت دیکھنے سے خدا یاد آتا ہے۔

دوسری قسم کے وہ مشائخ ہیں۔ جو صاحب احوال ہیں۔ ان کی حالت بدلتی رہتی ہے ظاہر میں ان کے اندر (شریعت کا وہ) تحفظ نہیں (جو پہلی قسم کے مشائخ میں ہوتا ہے تو

وہ احتیاط ہے جو ان میں ہوتی ہے) ان کے احوال کو تسلیم کر لیا جائے۔ مگر ان کی صحبت اختیار نہ کی جائے۔ اگر ان سے کچھ کرامات بھی ظاہر ہوں تو ان پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے۔ جبکہ ان کے اندر شریعت کے ساتھ بے ادبی موجود ہے۔ کیونکہ ہمارے لئے اللہ تک پہنچنے کا راستہ اس راستہ کے سوا کوئی نہیں۔ جو اللہ تعالےٰ نے شریعت میں مقرر فرما دیا ہے۔ تو جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تک پہنچنے کا راستہ شریعت کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا قول غلط اور جھوٹ ہے۔ پس جس شخص میں (شریعت کا) ادب نہ ہو۔ اس کی اقتدا نہ کی جائے گی۔ اگرچہ وہ اپنے حال میں سچا ہو۔" (فتوحات باب ۱۸۱)

اقوالِ صوفیاء

اسی سلسلہ میں حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

"اگر تم کسی کو کرامات والا دیکھو۔ حتیٰ کہ ہوا میں اڑتا ہو۔ تو دھوکے میں نہ آجانا۔ جب تک یہ نہ دیکھو کہ امر و نہی۔ حفظ حدود اور پابندی شریعت میں کیسا ہے"

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ :۔

"مخلوق پر سب راہیں بند ہیں۔ سوا اس کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم چلے"

حضرت نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :۔

"جس کو دیکھو کہ اللہ کے ساتھ کسی ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے۔ جو اس کو حد شرعی سے باہر کر دیتا ہے۔ تو اس کے پاس بھی نہ پھٹکو"

ان حقائق و شواہد سے ظاہر ہے کہ طریقت شریعت سے الگ نہیں ہو سکتی۔ دونوں لازم ملزوم ہیں۔

تصوف اور قرآن

چنانچہ قرآن کریم میں بھی دونوں کے احکام پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اور دونوں کو اس طرح برابر کی حیثیت دی گئی ہے۔ کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنے سے اصل مقصود یعنی رضائے حق کا حاصل ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حضرت تھانوی "حقیقت تصوف" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :۔

"شریعت کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے۔ وہ دو قسم کے ہیں۔ بعض کا تعلق ظاہر بدن یا ظاہری چیزوں سے ہے۔ جیسے کلمہ پڑھنا۔ نماز، روزہ، حج۔ زکوٰۃ۔ ماں باپ کی خدمت۔ ان کو مامورات کہتے ہیں۔ اور کلمات کفر کہنا، شرک کے افعال کرنا۔ زنا۔ چوری۔ سود خواری۔ رشوت وغیرہ ان کو مناہی کہتے ہیں بعض اعمال

ایسے ہیں کہ جن کا تعلق باطن سے ہے۔ جیسے ایمان و تصدیق۔ عقائد حقہ۔ صبر و شکر توکل و رضا بقضا تفویض و اخلاص محبت خدا اور رسول وغیرہ۔ ان کو مامورات و فضائل کہتے ہیں۔ اور عقائد باطلہ۔ بے صبری و ناشکری۔ ریا و تکبر عجب وغیرہ۔ یہ مناہی و رذائل ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔

جس طرح قرآن شریف میں اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ موجود ہے۔ اسی طرح یا ایھا الذین آمنوا اصبروا (اے ایماندارو صبر کرو) اور واشکروا للّٰہ (اللہ کا شکر بجالاؤ) بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر کتب علیکم الصیام اور للّٰہ علی الناس حج البیت پاؤ گے۔ تو دوسرے مقام میں یحبھم و یحبونہ اور والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ بھی دیکھو گے۔ جہاں اذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ ہے اس کے ساتھ ہی یراؤن الناس بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام میں تارک نماز و تارک زکوٰۃ کی مذمت ہے۔ تو دوسرے مقام میں تکبر و عجب کی برائی موجود ہے۔

اسی طرح احادیث کو دیکھو۔ جس طرح ان میں ابواب نماز۔ روزہ۔ بیع و شرا نکاح و طلاق پاؤ گے۔ ابواب ریا و سمع و کبر وغیرہ بھی دیکھو گے۔

اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ حکم خداوندی ہیں اسی طرح اعمال باطنہ بھی حکم الٰہی ہیں۔ کیا اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ امر کا صیغہ ہے اور اصبروا و اشکروا امر کا صیغہ نہیں۔ کیا کتب علیکم الصیام سے روزہ کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہے اور والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ سے محبت کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال سب ہی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں۔ اور باطن کی صفائی مقصود و موجب نجات اور اس کی کدورت موجب ہلاکت ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا ۔ بیشک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا اور جس نے اس کو میلا کیا۔ ناکام رہا۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۔ جس دن مال و اولاد کام نہ آئیں گے۔ مگر جو شخص کہ اللہ کے پاس سلامت قلب لے کر آیا۔

دیکھو پہلی آیت میں تزکیہ باطن کو موجب فلاح اور دوسری میں سلامتی قلب کے بغیر مال واولاد سب کو غیر نافع بنا دیا گیا ہے۔

ایمان وعقائد جن پر سارے اعمال کی مقبولیت منحصر ہے۔ قلب ہی کا فعل ہے اور ظاہر ہے کہ جتنے اعمال ہیں۔ سب ایمان ہی کی تکمیل کے لئے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دل کی اصلاح ہے۔ جس سے انسان مقبول بارگاہ اور صاحب مدارج ومقام ہوتا ہے۔ اور اس کا نام اصلاح وعرف میں تصوف ہے۔"

حقیقت تصوف گویا کہ تصوف دین کی روح ومعنی یا کیف وکمال کا نام ہے۔ جس کا کام باطن کو رذائل یعنی اخلاق ذمیمہ شہوت۔ آفات لسانی۔ غضب۔ حقد۔ حسد حب دنیا۔ حب جاہ۔ بخل۔ حرص۔ ریا۔ عجب۔ غرور سے پاک کرنا اور فضائل یعنی اخلاق حمیدہ توبہ۔ صبر۔ شکر۔ خوف ورجا۔ زہد۔ توحید۔ توکل۔ محبت۔ شوق۔ اخلاص۔ صدق۔ مراقبہ۔ محاسبہ تفکر سے آراستہ کرنا ہے تاکہ توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے۔ جو مقصود حیات ہے۔

لہٰذا تصوف وطریقت دین وشریعت کے قطعاً منافی ومغائر ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لئے لازمی ہے کہ وہ صوفی بنے کہ اس کے بغیر فی الواقعہ مسلمان مسلمان کہلانے کا مستحق ہی نہیں رہتا۔

صورت حال مگر اب تصوف کی حقیقت پر بدعات ورسومات بلکہ خرافات نے اتنے پردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کی صورت ہی مسخ کر کے رکھ دی ہے اور بقول مورخ اسلام سید سلیمان ندوی ندوی:

"صوفیانہ خانوادوں کی جہالت اور موروثی گدی نشینی کی متواتر رسم نے اللہ تعالیٰ کی بخشش اجتہاد اور مقبولیت کو بھی ایک صنعت گری کا کارخانہ بنا رکھا تھا۔ خانقاہوں کا کام صرف اعراس وفاتحہ کا اہتمام اور سماع ورقص وقوالی کا انصرام رہ گیا تھا۔ مقررہ دنوں اور مہینوں میں کچھ لوگ جمع ہو کر فاتحہ خوانی کر لیں مٹھائی کھا لیں اور ایک جگہ جمع ہو کر کسی ساز ندہ کے ترانے پر ہو حق کر لیں۔ اور زیادہ بڑھیں تو وحدۃ الوجود کی آڑ پکڑ کر شوخی وبیباکی اور رندی کے اشعار ومضامین پڑھ لیں اور سر دھن لیں۔ چند سینہ بسینہ راز تھے۔ جن کو بے سمجھے بوجھے بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ تصحیح عقائد تحسین عبادت۔ اتباع سنت اصلاح اعمال اور ادائے حق عبادت جو اصل دین

اور صحیح سلوک تھا۔ وہ ہر جگہ سے مٹ چکا تھا۔ علماء ظاہر چونکہ باطن کے منکر تھے یا باطن سے ناآشنا تھے۔ اسلئے ان کے پندونصائح کی حیثیت صوفیوں میں تضییع اوقات کی سے زیادہ نہ تھی۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ چونکہ طریقت کے اصل راز سے واقف نہیں اسلئے ان کی بات سننے کے قابل نہ تھی۔ اور علماء ظاہر چونکہ باطن سے منکر یا ناآشنا تھے۔ وہ ان دکاندار صوفیوں کو دیکھ کر اصل فن سلوک کو ضلالت و گمراہی قرار دینے لگے تھے۔ اور اس کے اصول و مسائل کو خلاف شریعت و مخالف کتاب و سنت سمجھتے تھے۔ اس سلئے عمومی طور پر تدوین فن۔ ترتیب اصول۔ تحقیق مسائل۔ تالیف مسائل اصل سلوک کے مضامین کو کتاب و سنت کی اور اسلاف صالحین اور اولیائے کاملین کی تشریح و توضیح سے ملا کر دیکھنے کے کام کہیں نہیں ہو رہے تھے۔ نہ خطبات و مواعظ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام کے خیالات کی اصلاح کی کوشش کی جارہی تھی۔ نہ رد شبہات و دفع شکوک۔ دفع اوہام کے لئے کوئی سلسلہ تھا اور نہ سالکین کی ظاہری و باطنی تربیت کی کوئی ایسی درسگاہ تھی۔ جس میں راہ کی مشکلات کو علمی و فنی طریق سے بتایا اور سکھایا جاتا ہو اور نہ کہیں کوئی ایسی منبر بچھی تھی۔ جہاں شریعت و طریقت کے مسائل پہلو بہ پہلو بیان ہوتے ہوں۔ جہاں تفسیر و فقہ و حدیث کے ساتھ امراض قلب کے علاج کے نسخے بتائے جاتے ہوں۔ جو کتاب و سنت میں موجود ہیں۔ جہاں جس قلم سے احکام فقہی کے فتاوے نکل رہے ہوں۔ اسی قلم سے سلوک و طریق کے مسائل بھی شائع ہو رہے ہوں جس منبر سے نماز و روزہ اور حج و زکواۃ کے فقہی مسائل و اشگاف بیان کئے جا رہے ہوں۔ اس منبر سے اُن کی روحانی حقیقت اور اُن کی قلبی ادا کاری کے طریق بتاتے جا رہے ہوں۔" (تجدید تصوف و سلوک ص۱۳)

تجدید تصوف جاہلیت کے اس دور میں حق تعالیٰ نے پھر ایک ایسا حکیم الامت اور مجدد ملت بھیج دیا۔ جس نے متذکرہ بالا تمام خامیاں دور اور ضرورتیں پوری کر کے دربار نبوی کی یاد تازہ کر دی۔ انہوں نے نہایت کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ "لوگوں کو علم کی فکر تو ہے لیکن عمل کی نہیں۔ اس کا بڑا اہتمام ہوتا ہے کہ ساری کتابیں پوری کر لیں۔ ہدایہ بھی۔ قدوری بھی۔ شمس بازغہ بھی لیکن عمل کی ذرا بھی پرواہ نہیں

حالانکہ فقط کسی چیز کا جان لینا اتنا کمال نہیں۔ شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے۔ بڑے بڑوں کو بہکاتا ہے۔ تفسیر میں وہ ماہر، حدیث سے وہ واقف، فقہ میں وہ کامل اور اگر یہ سب علماء سے زیادہ نہ جانتا ہو۔ تو ان کو بہکا کیسے سکتا ہے۔ شیطان میں اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ وہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایسا علم جو عمل کے لئے نہ ہو جہنم کا ذریعہ ہے" (مواعظ اشرفیہ ص۸)

عمل کی ترغیب دینے کے بعد آپ نے تصوف کی اہمیت کا یوں احساس دلایا کہ :-

"تصوف کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ سب سے اول چیز تصوف میں تواضع ہی کی تعلیم ہے۔ جس کو اصطلاح میں فنا کہتے ہیں۔ عموماً تو تصوف میں یہ سب سے آخر مقام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت سب سے اول مقام بھی فنا ہی ہے اور سب سے آخر مقام بھی فنا ہی ہے۔ کیونکہ فنا کے درجات ہیں۔ باقی بدون فنا کے تو کوئی اس طریق میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ خواہ لاکھ ورد و ظیفے پڑھے یا لاکھ تسبیحیں پھیرے۔

لوگ کہتے ہیں کہ حجروں میں بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میدان میں آنا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ حجروں ہی میں بیٹھنے سے میدان کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ریڈیو حجرہ میں ہی رکھا جاتا ہے پھر اس سے تقریریں نشر ہو کر تمام عالم میں ہل چل پڑ جاتی ہے سعد بن وقاص ایک معرکہ میں امیر لشکر تھے۔ اور دنبل نکل آنے کی وجہ سے نقل وحرکت سے معذور تھے۔ پھر بھی اپنے خیمہ میں بیٹھے بیٹھے فوج کی کمان کر رہے تھے (بلکہ جب نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی بدر سے پہلے عریشہ بنا تھا۔ تو بدرگیاں چہ رسد)" (الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص۲۷۸)

سلاسل اربعہ آپ نے آج کل کے مدعیان تجدد کی طرح اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہیں بنائی۔ بلکہ اپنی تمام تعلیمات کی بنیاد کتاب وسنت اور اتباع سلف صالحین پر رکھی۔ اور عوام کو تربیت باطن کے چاروں سلسلوں یعنی چشتیہ۔ نقشبندیہ۔ قادریہ۔ سہروردیہ کے مشائخ عظام اور تربیت ظاہر کے چاروں سلسلوں شافعی۔ حنفی۔ مالکی۔ حنبلی کے آئمہ کرام کی تعظیم و تکریم کی تاکید کی اور لکھا کہ :-

"اللہ و رسول نے دین کی سب باتیں قرآن و حدیث میں بتلا دیں۔ اب

کوئی نئی بات نکالنا دین میں درست نہیں - ایسی نئی بات کو بدعت کہتے ہیں بدعت بہت بڑا گناہ ہے - البتہ بعض باریک باتیں دین کی جو ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتیں اگلے عالموں نے اپنے علم کے زور سے قرآن و حدیث سے سمجھ کر دوسروں کو بھی بتلا دیں - ایسے لوگ مجتہد کہلاتے ہیں - مجتہد بہت ہوئے ہیں - ان میں چار بہت مشہور ہیں - امام اعظم ابو حنیفہؒ - امام شافعیؒ - امام مالکؒ - امام احمدؒ - جس کو جس مجتہد سے زیادہ اعتقاد ہو - اس کی پیروی اختیار کرے -

اسی طرح نفس کے سنوارنے کے طریقے قرآن و حدیث کے موافق اولیاء اللہ نے اپنے دل کی روشنی سے سمجھ کر بتلائے - ایسے لوگ شیخ کہلاتے ہیں - شیخ بھی بہت ہوئے ہیں مگر ان میں چار زیادہ مشہور ہیں - خواجہ معین الدین چشتیؒ - حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ - شیخ شہاب الدین سہروردیؒ - خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ - جس مجتہد اور شیخ سے اعتقاد ہو اس کی پیروی کرکے دوسروں کو برا سمجھنا درست نہیں اور اگر ان سے کوئی غلطی ہوگئی ہو - تو اس میں پیروی نہیں - (تعلیم الدین باب العقائد)

اسی کتاب کے باب الوصایا میں آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول کو بھی نقل فرماکر اس پر عمل پیرا ہونے کی تاکید فرمائی کہ :-

"مذاہب میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے کہ حنفیوں کا مذہب سب سے اچھا ہے یا شافعیہ کا مذہب سب سے بڑھ کر ہے - اپنے مذہب پر عمل کرتا رہے نہ صوفیوں کے طریقوں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے - کہ چشتیہ کی نسبت بڑے زور کی ہے دوسرا کہے راہ نقشبندیوں میں اتباع سنت زیادہ ہے اور اس قسم کے خرافات سے بچتا رہے اور جو لوگ مغلوب الحال ہیں - یا کسی تاویل سے کوئی امر کرتے ہیں جو اس شخص کے نزدیک خلاف سنت ہے - ان کو برا بھلا نہ کہے - اور خود وہی کرے جو قواعد شرعیہ کے موافق ہو۔"

جامع اصول

اس سلسلہ میں آپ نے یہ جامع اصول تجویز فرمایا کہ :-

"جن حضرات میں قبول کے علامات ظاہر ہیں اور منجملہ ان علامات کے علمائے محققین کا حسن ظن بھی ہے - ان کے ساتھ حسن اعتقاد رکھے - اور ان کے کلام میں اگر کوئی امر ظاہراً خلاف سواد اعظم دیکھے - تو اپنا اعتقاد اس کے موافق نہ رکھے - نہ اس کو

کسی کے سامنے نقل کرے۔ نہ ایسی کتابوں کا خود مطالعہ کرے۔ جب تک کسی شیخ سے نہ پڑھ لے۔ کیونکہ ان حضرات کا مقصود عوام کے لئے تدوین نہیں بلکہ عوام سے اخفا فرماتے تھے۔ لہٰذا اعتقاد سواد اعظم کے موافق رکھے اور اس کلام میں اگر تاویل ممکن ہو تو تاویل کرے۔ ورنہ غلبۂ حال پر محمول کرے یا دشمنوں کے ملحق کر دینے کا احتمال کرے۔ یا مثل متشابہات کے اس کو مفوض بہ حق کرے۔ کیونکہ گو وہ معصوم نہ تھے۔ لیکن شریعت کے بے حد متبع تھے۔ چنانچہ غیر معذور سے اگر کوئی فعل خلاف شریعت ظاہر ہو۔ تو اس پر ان سے خود نکیر منقول ہے اور اسلئے احکام میں خود ان سے ایسا امر منقول نہیں۔ (جو شریعت کے خلاف ہو) صرف بعض "اسرار" منقول ہیں۔ جن کی بنا ذوق و کشف پر ہے۔ اور تعبیر خاص اصطلاح میں کی گئی ہے۔ اور ان دونوں چیزوں سے چونکہ عوام اور اہل ظاہر بے بہرہ ہیں۔ اسلئے ان کے کلام کے معارض شریعت ہونے کا یہ لوگ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ گو ظاہری (علم و فضل کے اعتبار سے) ان سے بڑھے ہوئے ہوں۔ اسلئے ان کو اجمالاً تسلیم کر لینا چاہیئے۔ ورنہ گستاخی سے سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے۔

البتہ جو شخص ایسا محقق ہو۔ اس کو حق ہے کہ ایسے کلام پر مفصلاً رد کرے۔ خواہ "خطائے اجتہادی" کے درجہ میں اور خواہ ابطال کی حد تک"۔

مجاہدات اربعہ ارباب تصوف تزکیہ نفس کے لئے سالکین سے بعض مجاہدات و ریاضیات بھی کراتے ہیں۔ جن میں قلت طعام۔ قلت منام۔ قلت کلام اور قلت اختلاط مع الانام خاص طور پر مشہور ہیں۔ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے اب تک ان پر مسلسل اور متواتر عمل کیا جا رہا تھا۔ اور کسی نے اس امر کی طرف توجہ نہ دی تھی کہ آیا یہ مجاہدات اس زمانہ کے طبائع و اذواق کے موافق بھی ہیں یا نہیں حضرت تھانوی نے ان مجاہدات کے لئے بھی زمانہ حال کے حالات کے مطابق ترامیم کیں اور ان کو اتنا آسان کر دیا کہ ہر شخص بآسانی ان پر عمل کر سکے۔ فرماتے ہیں :-

" زہد ترک لذات کا نام نہیں محض تقلیل لذات کافی ہے۔ یعنی لذات میں انہماک نہ ہو۔ کہ رات دن اسی فکر میں رہے۔ یہ چیز زہد کے منافی ہے۔ ورنہ اگر بلا تکلف اور بلا اہتمام خاص کے لذات میسر آئیں۔ تو یہ حق تعالے کی نعمت ہے شکر کرنا چاہیئے صحت کی بہت حفاظت کرے۔ دل و دماغ کی تفریح و تقویت ہمیشہ غذاً و دواً کرتا رہے

غذا میں نہ اتنی کمی کرے کہ ضعف یبوست ہو جائے۔ نہ اس قدر افراط کہ ہضم میں فتور ہو جائے۔

بہت کم کھانا بھی زیادہ نہیں۔ نہ یہ مقصود ہے۔ کیونکہ ہمارے کم کھانے سے نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے خزانہ میں کوئی توفیر تھوڑا ہی ہو جائے گی۔ ہاں اتنا بھی نہ کھائے کہ پیٹ میں درد ہو جائے۔ ہمارے حاجی (امداد اللہؒ) صاحب کا مذاق تو یہ تھا کہ نفس کو خوب آرام سے رکھے۔ لیکن اس سے کام بھی خوب لے۔ میرا تو خیال ہے کہ "مزدور خوش دل کند کار بیش"۔ حضرت حاجی صاحب نے ایک روز فرمایا کہ میاں اشرف علی! پانی ہمیشہ ٹھنڈا پیو کہ ہر بُن مُو سے الحمد للہ نکلے۔ ورنہ گرم پانی پی کر زبان تو الحمد للہ کہے گی۔ دل شریک نہ ہوگا۔

اسی طرح سونے میں اعتدال رکھے۔ نہ اتنا زیادہ سوئے کہ کسل ہو جائے نہ بہت کمی کرے۔ کہ یبوست (خشکی) ہو جائے"۔

البتہ کثرت کلام پر تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"زیادہ گوئی قابل ترک ہے۔ حضرت عارفین کا مشاہدہ ہے۔ کہ ضروری گفتگو دن بھر بھی ہوتی رہے۔ تو اس سے قلب پر ظلمت کا اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک کنجڑا دن بھر "لے لو امرود" پکارتا پھرے۔ تو ذرہ برابر قلب میں اس سے غفلت نہ آئے گی۔ کیونکہ یہ بضرورت ہے اور بے ضرورت ایک جملہ بھی زبان سے نکل جائے۔ تو دل سیاہ ہو جاتا ہے"۔

اسی طرح لوگوں سے تعلق بڑھانے کو سخت مضر بتایا کہ:۔

"اگر تم ارتباط بالاحباب کی وجہ سے معمولات کو ناغہ کرو گے۔ تو ایک دن بالکل کورے ہو جاؤ گے۔ من لا وردلہ لا واردلہ"

چنانچہ انہی اصول و قواعد کے تحت آپ سالکین کی تعلیم و تربیت فرماتے رہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے:۔

مجاہدۂ نفس

ضرورتِ نگرانی یوں تو انسان اپنی ہر چیز کی نگرانی اور حفاظت کرتا ہے۔ مگر جس چیز کی زیادہ نگرانی کی ضرورت ہے۔ اس سے بالعموم غفلت برتی جاتی ہے۔ یعنی انسان اپنے نفس کی اتنی نگرانی نہیں کرتا۔ جتنی مال کی کرتا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت مال کا ضیاع نفس کے معصیت میں مبتلا ہونے کے اعتبار سے کم تر ہے۔ کیونکہ دولتِ باطنی کے بقا کا تمام تر دارومدار نفس کی نگہداشت پر ہے۔ اور باطن کا اثر ظاہر پر ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت شیخ اکبر قدس سرہ العزیز اپنے رسالہ الامر المحکم المربوط فیما یلزم اصل طریق اللہ من الشروط میں لکھتے ہیں کہ

"پس جبکہ شیخ ہر روز اپنے حالات کی نگرانی اسی طریق سے نہ کرے۔ جس سے اس کو یہ تمکین (یعنی دوام اطاعت اور کثرت ذکر کی عادت) حاصل ہوئی ہو۔ تو عجب نہیں کہ وہ دھوکہ میں پڑ جائے۔ اور آہستہ آہستہ طبیعت اور عادت قدیمہ اس کو اپنی طرف کھینچ لے۔ اور پھر وہ خلوت میں بھی رہنا چاہے۔ تو انس حاصل نہ ہو۔ بلکہ خلوت سے وحشت ہونے لگے۔ اور یہی حال ہے ان تمام حالات وکیفیات کا۔ جو نفس کی طبیعت وجبلت کے موافق نہیں۔ کہ ان حالات کے حصول پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ بہت سریع الزوال ہوتے ہیں اور ہم نے بہت سے مشائخ کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے درجہ سے گر گئے۔ اللہ تعالے ہمیں اور ان کو عافیت عطا فرمائے (آمین) حق تعالے نے فرمایا ہے۔ ان الانسان خلق ھلوعا اذا مسه الشر جزوعا واذا مسه الخیر منوعا۔ اس آیت میں اللہ تعالے نے نفس کے تمام رذائل کو جمع فرما دیا اور بیان فرما دیا ہے کہ جتنے فضائل نفس کو حاصل ہیں وہ اس کے جبلی اور طبعی نہیں۔ اسلئے ان کا تحفظ واجب ہے۔"

اسی طرح شیخ ابومدین مغربی جو حضرت شیخ اکبرؒ کے مشائخ میں سے ہیں۔ طبقات کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جو درویش اپنی (باطنی) زیادتی اور کمی کو ہر دم محسوس نہ کرتا ہے۔ وہ درویش نہیں۔"

شاہانِ طریق کی اس تحقیق کے آئینہ میں جب ہم حضرت تھانوی کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو

آپ کو ہر وقت نگرانیٔ نفس میں مشغول پاتے ہیں۔ جو شخص خود اپنے نفس کی نگرانی و نگہداشت نہ کر سکے وہ دوسروں کی نفسانی امراض کا کماحقہٗ علاج کیسے کر سکتا ہے؟ اسی لئے حضرت تھانوی کے ہاں ظاہری ریاضات و مجاہدات کی طرف تو بالکل اعتنا نہیں برتا جاتا تھا۔ مگر باطنی مجاہدات کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ جس کی بنا پر آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"میرے طریق میں تو عمر بھر لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ گویا جنم کا روگ لگ جاتا ہے۔ میرے یہاں تو وہ آوے جس کو رات دن اپنے نفس پر آرے چلاتے ہوں"۔

شاہی سلوک مگر یہ آرے بھی سراسر قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق ہی چلانے پڑتے تھے دوسرے مشائخ کی طرح یہاں یہ دستور نہ تھا کہ اپنے مریدین سے گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے ذکر و شغل کرا لینا اور پھر انہیں خلاف شرع وضع قطع وغیرہ امور میں بالکل آزاد چھوڑ دینا حضرت تھانوی کا تو یہ اصول تھا کہ نہ ریاضیات کراتے تھے۔ نہ مجاہدات۔ نہ ترک تعلقات کراتے تھے۔ نہ ترک لذات و مباحات۔ بلکہ یہ تاکید فرماتے تھے کہ:۔

خوب راحت و آرام سے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا ہو۔ اور طبیعت میں نشاط رہے۔ جو معین عبادات ہو۔ البتہ معصیت کے پاس سے نہ پھٹکو اور نفس کی ہر وقت نگرانی رکھو۔ اور ہمت سے کام لو۔ اور بقدر تحمل و فرصت کچھ ذکر و شغل بھی کرتے رہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ مقصود کا حصول یقینی ہے۔ نہ کم کھانے کی ضرورت ہے۔ نہ کم سونے کی یہ دونوں مجاہدے آج کل متروک ہیں۔ کیونکہ طبائع میں پہلے ہی سے ضعف غالب ہے۔ البتہ کم بولنا اور کم ملنا جلنا ضروری ہے، لیکن نہ اتنا کہ قلب میں انقباض پیدا ہو جائے"۔

اور اسی پر آپ کا عمل تھا جس پر ایک حقیقت شناس نے کہا کہ:۔

"حضرت تھانوی کا سلوک تو شاہی سلوک ہے"۔

فریبِ نفس ایک دفعہ ایک صاحب نے کسی کے ترکہ سے پانچ سو روپیہ بذریعہ بیمہ مصارف خیر کے لئے حضرت تھانوی کی خدمت میں بھیجے۔ مگر اس کے بھیجنے کے متعلق پہلے اجازت نہ لی۔ اسلئے حضرت نے حسب معمول وہ بیمہ واپس کر دیا۔ اس پر انہوں نے ایک معذرت نامہ بھیجا اور روپیہ بھیجنے کی اجازت چاہی۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ اس پانچسو روپیہ میں زیادہ حصہ ان ورثا کا ہے جو اسے مصارف خیر میں صرف کرنے کی اجازت دے چکے ہیں

اور قابل حصہ ایسے ورثا کا ہے۔ جن سے اس امر کی اجازت حاصل نہیں کی گئی۔ اس لئے حضرت تھانوی نے کلی طور پر ممانعت لکھ بھیجی کہ چونکہ بعض ورثا کی اجازت حاصل نہیں کی گئی۔ اسلئے وہ رقم نہ بھیجی جائے۔

مجلس عام میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت نے اس فضیلت کا انکشاف فرمایا کہ:۔

"ممانعت کلی لکھتے وقت میرے نفس نے کہا کہ رقم کے اس حصہ کی تو بھیجنے کی اجازت لکھ دی جائے جس کے متعلق ورثار کی اجازت لی جا چکی ہے۔ اچھا ہے مساکین کا بھلا ہو جائے گا۔ لیکن میں نے اپنے نفس سے کہا کہ اچھا آپ اپنے استاد کو بھی پٹی پڑھانا چاہتے ہیں"۔

اور اس طرح آپ فریب نفس سے بچ گئے۔ جو صرف نگرانِ نفس کی برکت تھی۔ کیونکہ

نگرانی نفس

حضرت تھانوی جہاں طالبین کے نفوس کی ہر وقت دیکھ بھال کرتے رہتے تھے۔ وہاں اپنے نفس کی بھی نگرانی رکھتے تھے۔ اور اسے ابھرنے کا ذرہ موقع نہ دیتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"اگر گھر سے کہیں گئی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور کوئی غیر محرم عزیزیا مہمان یا کام کاج کرنے والی عورت یا لڑکی گھر میں ہوتی ہے۔ تو میں اس زمانہ میں گھر جانا ہی چھوڑ دیتا ہوں اور اگر کوئی ضروری بات کہنی یا سننی ہوتی ہے۔ تو دہلیز ہی میں کھڑے کھڑے کہہ سن لیتا ہوں۔ اندر نہیں جاتا۔ یہ میں اسلئے اوروں کو سنا رہا ہوں کہ سب کو اس معاملہ میں غایت درجہ احتیاط رکھنی چاہیئے۔ کیونکہ اول تو نفس کا کچھ اعتبار نہیں پھر خیالات کا بھی تو پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ بلکہ نابالغ نامحرم لڑکیوں سے بھی احتیاط ہی چاہیئے۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی نابالغ لڑکی کے سر پہ ہاتھ پھیرنے کا سبب تو شفقت ہی ہوتا ہے۔ لیکن سر پہ ہاتھ رکھنے کے تھوڑی دیر بعد نفس کی آمیزش ہونے لگتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو عموماً ایسے دقائق نفسی کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا۔ اور وہ برابر شفقت ہی کے گمان میں رہتے ہیں۔ اسکی احتیاط واجب ہے"

ایک اور موقعہ پہ فرمایا کہ:۔

"میں کسی امرد کو بھی اپنے پاس تنہائی میں نہیں آنے دیتا۔ گو یہ بات اپنی ذات میں تو معمولی ہے۔ لیکن جو شخص مجھ سے اعتقاد رکھتا ہو۔ اس کے لئے یہ بہت بڑی بات

ہے۔ کہ جب یہ پیر ہو کر بھی اپنے نفس کی اتنی حفاظت کرتے ہیں۔ تو ہمیں تو بہت ہی زیادہ حفاظت کرنی چاہیئے"۔

ایک مرتبہ آپ مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی کے ہمراہ سفر فرما رہے تھے۔ آپ نے نارنول سے الور۔ الور سے دہلی اور دہلی سے پانی پت جانا تھا۔ نارنول میں جمعہ پڑا۔ تو آپ نے شب جمعہ کو تہجد کے وقت کپڑے بدلنے کے لئے مولوی صاحب موصوف سے کپڑے مانگے جن کی تحویل میں آپ کا بیگ تھا۔ انہوں نے چکن کا کرتہ پیش کیا فرمایا یہ نہیں۔ ململ کا کرتہ لائیے۔ جب وہ ململ کا کرتہ لائے۔ تو پھر فرمایا کہ اچھا وہ چکن کا ہی لے آیئے۔ اس کو رکھ دیجئے جب وہ چکن کا کرتہ لائے تو فرمایا کہ کچھ خبر بھی ہے۔ یہ میں نے کیوں کیا۔ بات یہ ہے کہ جب آپ چکن کا کرتہ لائے۔ تو مجھے خیال ہوا کہ یہ تو قصبہ ہے۔ یہاں ململ کا کرتہ پہن لینا کافی ہے۔ اس کے بعد دہلی جانا ہے۔ وہاں چکن کا کرتہ پہننا مناسب ہوگا۔ اس مصلحت سے کہ امرا کی نظر میں ذلت نہ ہو۔ میں نے اس خیال کی مخالفت کی"۔

آپ نے صرف اسی پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ نفس کو اس سرتابی کی سزا دینے کے لئے الور سے دہلی روانہ ہوتے وقت کپڑے نہ بدلے۔ یہاں تک کہ دہلی میں بھی نہ بدلے۔ حالانکہ کپڑے میلے ہو چکے تھے۔ اور بوجہ نفاست مزاج میلے کپڑوں سے بہت اذیت ہو رہی تھی۔ مگر جب دہلی سے پانی پت پہنچے۔ تو فوراً غسل فرما کر کپڑے بدل لئے۔ اور اس طرح آپ نے نفس کی خواہش عزت پوری نہ ہونے دی۔

سامانِ راحت نفس کی اس طرح نگرانی کرنے سے گو شروع میں تھوڑی سی کلفت ہوتی ہے۔ مگر اس کے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس سے دائمی راحت کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ کالپی کے سفر کے دوران میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب کے ایک ہم سبق انگریزی خواں پولیس آفیسر بھی ہم سفر تھے۔ خواجہ صاحب بھی حضرت کے ساتھ تھے انہوں نے خواجہ صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت سے عرض کیا کہ ان کی حالت دیکھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہمت نہیں پڑتی۔ حضرت نے فوراً فرمایا کہ "اس کو نہ دیکھیے بلکہ یہ دیکھیے کہ گھڑی کو چابی دینے والا تو ایک مرتبہ ہی چابی دیتا ہے۔ پھر جو کچھ اس میں تغیرات ہوتے ہیں۔ وہ تو خود بخود اور بے تکلف ہی ہوتے رہتے ہیں کہ پہلے ایک بجا۔ پھر دو۔ پھر تین وقس علیٰ ہٰذا یعنی بظاہر ضرور دشواری نظر آتی ہے۔ مگر اس دشواری کو ایک مرتبہ برداشت کر لینے سے

جو تعلق مع اللہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی لذت کے مقابلہ میں اس دشواری کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ قلب خود بخود اپنی اصلاح کی طرف راغب رہتا ہے اور جو بھی کوئی ایسا ناگوار واقعہ پیش آتا ہے۔ تو وہ فوراً اس کی کوئی نہ کوئی تاویل کرکے مطمئن ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ ہر وقت باطنی ترقی کرتا رہتا ہے اور اس شخص سے بڑھ جاتا ہے۔ جسے عبادات نافلہ کا تو اہتمام بہت ہوتا ہے لیکن قلب کی نگہداشت کا اہتمام نہیں ہوتا۔"

راحت رسانی

حقیقتِ راحت قرآن کریم اور احادیث نبوی میں اسی دنیا کے اندر لطفِ جنت اٹھانے کے لئے جس قدر اصول و آداب موجود ہیں۔ ان تمام کی اساس و بنیاد اس پر ہے کہ مسلمان کو مسلمان کی زبان اور ہاتھ سے آزار نہ پہنچے۔ جسے ایک شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ع

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

دین کے پانچ اجزاء میں سے عقائد و عبادات کا تعلق براہ راست حق تعالےٰ سے ہے صحتِ اخلاق و معاملات کا تعلق زیادہ تر انسان کی اپنی ذاتِ خاص سے ہے۔ اور آدابِ معاشرت کا تعلق تمام تر عوام الناس کے ساتھ ہے جنہیں حق تعالےٰ نے اپنی عیال ظاہر کرکے اپنا محبوب جتایا ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی امر ہے کہ جو کسی کے محبوب سے محبت کرتا ہے۔ وہ بھی محبوب سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے حق تعالےٰ کی رضا حاصل کرنے کا سہل طریق یہ ہے کہ اس کی مخلوق کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دی جاوے۔ جس کی طرف الا ماشاء اللہ کسی کی بھی توجہ نہیں بلکہ اس وقت حالت یہ ہے کہ ع

انسان کو انسان ہی جینے نہیں دیتا

مشاہیر صوفیاء و مشائخ میں اس بات کا شرفِ اولیت حضرت تھانویؒ کو ہی حاصل ہے کہ آپ نے ذکر و شغل اور مجاہدات و ریاضات کی بجائے اپنی تمام تر توجہ اصلاحِ معاشرت پر لگائی۔ جو تکدر و انقباض کی دافع اور مسرت و انبساط کی جامع ہے۔

اصولِ راحت ذیل میں حضرت تھانوی کے چند اصولِ راحت پیش کئے جاتے ہیں تاکہ

آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس معاملہ میں حضرت کی نظر کتنی دور رس تھی۔

اپنے لئے متکلم کو ہدایت تھی کہ:۔

۱۔ بات ہمیشہ صاف اور بے تکلف کہہ دے۔ تکلف کی تمہید وغیرہ نہ کرے۔
۲۔ کسی کے توسط سے بلا ضرورت پیغام نہ پہنچائے۔ جو کچھ کہنا ہو۔ خود بے تکلف کہہ دے
۳۔ جب بات کرنی ہو۔ تو سامنے بیٹھ کر بات کرے۔ پشت پر سے کرنے میں الجھن ہوتی ہے
۴۔ اگر گفتگو میں کسی کی بے تمیزی پر زیادہ تغیر مزاج میں ہونے لگے تو بہتر ہے کہ بلا واسطہ اس سے گفتگو نہ کرے۔ کسی مزاج شناس سلیقہ شعار کو بلا کر اس کے واسطے سے گفتگو کرے تاکہ تمہارا تغیر دوسرے پر اور اس کی بے تمیزی تم پر اثر انداز نہ ہو۔
۵۔ دوسروں کی بات اچھی طرح توجہ سے سنے۔ اور اگر کچھ شبہ رہے۔ تو متکلم سے فوراً دوبارہ تحقیق کرلے۔ بے سمجھے محض اجتہاد سے کام نہ لے۔ بعض اوقات غلط فہمی کے ساتھ عمل کرنے سے متکلم کو اذیت ہوتی ہے۔

دوسروں کیلئے دوسروں کو تاکید تھی کہ:۔

۱۔ جس سے بے تکلفی نہ ہو۔ اس سے ملاقات کے وقت اس کے گھر کا حال نہ پوچھو
۲۔ لڑکوں کے سامنے کوئی بے شرمی کی بات نہ کہو۔
۳۔ جو آدمی تیزی کے ساتھ جا رہا ہو۔ راستہ میں اسے مصافحہ کرنے کے لئے مت روکو شاید اس کا کوئی حرج ہو۔ اسی طرح ایسے وقت میں اس کو کھڑا کر کے بات مت کرو۔
۴۔ جو شخص کھانے کے لئے جا رہا ہو۔ یا بلایا گیا ہو۔ اس کے ساتھ اس مقام تک مت جاؤ کیونکہ صاحب خانہ شرما کر کھانے کی تواضع کرتا ہے۔ اور دل اندر سے نہیں چاہتا۔ اور بعضے جلدی قبول کر لیتے ہیں۔ تو صاحب خانہ کی بلا رضا کھانا کھایا اور اگر قبول نہ کیا۔ تو صاحب خانہ کی سبکی ہے۔ پھر خود صاحب خانہ کا اول صورت میں تردد بھی مستقل ایذا ہے۔
۵۔ کوئی چیز جو کئی شخصوں کے استعمال میں آتی ہو۔ اس سے کام لینے کے بعد اسے وہیں رکھ دو۔ اور اس کا بہت ہی اہتمام کرے تاکہ دوسروں کو پریشانی نہ ہو۔
۶۔ جہاں جس کا جوتا رکھا ہو۔ اس کو ہٹا کر اپنا جوتا رکھ کر مسجد وغیرہ میں نہ جانا چاہیئے جہاں جس کا جوتا رکھا ہو۔ وہ اسی کا حق ہے۔ وہیں آکر دیکھے گا۔ نہ ملے گا تو پریشان ہوگا۔

۶۔ جہاں اور آدمی بیٹھے ہوں وہاں بیٹھ کر مت تھوکو۔ نہ ناک صاف کرو۔ اگر ضرورت ہو تو ایک کنارے جا کر فراغت حاصل کرو۔

۷۔ بیمار کے سامنے یا اس کے گھر والوں کے سامنے ایسی باتیں مت کرو۔ جس سے زندگی کی ناامیدی پائی جائے۔ ناحق دل ٹوٹے گا۔ بلکہ تسلی کی باتیں کرو۔ کہ انشاءاللہ تعالیٰ سب ٹھیک جاتا رہے گا۔

۸۔ اگر کسی سے پوشیدہ بات کرنی ہو۔ اور وہ بھی اس جگہ موجود ہو۔ تو آنکھ سے یا ہاتھ سے ادھر اشارہ مت کرو۔ ناحق اس کو شبہ ہوگا۔ اور یہ جب ہے کہ اس بات کا کرنا شرعًا درست بھی ہو۔ اور اگر درست نہ ہو۔ تو ایسی بات کرنا ہی گناہ ہے۔

۹۔ کسی کو کوئی چیز ہاتھ میں دینا ہو۔ تو دور سے مت پھینکو۔ کہ وہ ہاتھ میں لے لے گا۔

۱۰۔ اگر کسی شخص پر قصدًا ناخوش ہونا پڑے یا اتفاق سے ایسا ہو جائے تو دوسرے وقت اس کا دل خوش کردو۔ اور اگر تم سے واقعی زیادتی ہو گئی ہے۔ تو بے تکلف اس سے معذرت کر کے اپنی زیادتی کی معافی مانگ لو۔ عار مت کرو۔ قیامت میں وہ اور تم برابر ہو گے۔

ملاقاتیوں کیلیے

ملاقاتیوں کے لئے ان اصولوں کی پابندی لازمی تھی کہ:۔

۱۔ اگر کسی سے ملنے جاؤ۔ تو وہاں اتنا مت بیٹھو یا اس سے اتنی دیر باتیں مت کرو کہ وہ تنگ آجاوے یا اس کے کام میں حرج ہونے لگے۔

۲۔ اگر مجلس میں کوئی خاص گفتگو ہو رہی ہے۔ تو نئے آنے والے کو خواہ مخواہ سلام کر کے اپنی طرف متوجہ کر کے سلسلۂ گفتگو میں مزاحم نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ چپکے سے نظر بچا کر بیٹھ جاوے۔ پھر موقعہ پا کر سلام وغیرہ کرے۔

۳۔ مشغول آدمی کے پاس بیٹھ کر اس کو تکتا نہ رہے کہ اس سے دل بٹتا ہے۔ اور دل پر بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ بلکہ خود اس کی طرف متوجہ ہو کر نہ بیٹھے۔

۴۔ کوئی حاجت لے کر جاوے۔ تو موقع پا کر فورًا اپنی بات کہہ دے۔ انتظار نہ کرا دے۔

۵۔ بعض آدمی مجلس میں پہنچ کر سب سے الگ الگ مصافحہ کرتے ہیں۔ اگرچہ سب سے تعارف نہ ہو جس میں بہت وقت صرف ہوتا ہے اور فراغ تک تمام مجلس مشغول اور پریشان رہتی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ جس کے پاس قصد کر کے آئے ہو۔ اس کے مصافحہ پر کفایت کرو۔ البتہ اگر دوسرے سے بھی تعارف ہو۔ تو مضائقہ نہیں۔

مہمانوں کیلئے مہمانوں کے لئے یہ اصول وضع فرمائے کہ:-

۱- کسی کے گھر میں مہمان بنو تو اس سے کسی چیز کی فرمائش نہ کرو۔ بعض دفعہ چیز تو بے حقیقت سی ہوتی ہے۔ مگر اس وقت گھر والا اس کو پوری نہیں کر سکتا۔ ناحق اس کو شرمندگی ہوگی

۲- اگر کسی کے ہاں مہمان بنو اور تم کو کھانا کھانا منظور نہ ہو۔ خواہ کھا چکنے کی وجہ سے یا روزہ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے کھانے کا ارادہ نہ ہو۔ تو فوراً جاتے ہی اس کی اطلاع کر دو کہ میں اس وقت کا کھانا نہ کھاؤں گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ انتظام کرے۔ اور انتظام میں اسے تعب بھی ہو۔ اور تمہارے کھانا نہ کھانے کی وجہ سے اس کا نقصان بھی ہو۔

۳- اسی طرح مہمان کو چاہیئے کہ کسی کی دعوت میزبان کی اجازت کے بغیر قبول نہ کرے۔

۴- اگر مہمان کہیں جانا چاہے۔ تو میزبان کو اطلاع کر کے جاوے تاکہ بعد میں اس کی تلاش نہ کرنی پڑے۔

۵- جہاں مہمان بنے۔ وہاں کے انتظامات میں مہمان ہونے کی وجہ سے ہرگز دخل نہ دے۔ البتہ اگر میزبان کوئی خاص انتظام اس کے سپرد کرے۔ تو اس کے اہتمام کا مضائقہ نہیں

۶- مہمان کو چاہیئے کہ اگر پیٹ بھر جاوے۔ تو تھوڑا سالن روٹی دسترخوان میں ضرور چھوڑ دے تاکہ گھر والوں کو یہ شبہ نہ ہو کہ مہمان کو کھانا کم ہو گیا۔ اور وہ دل میں شرمندہ ہو۔

فرمائشیوں کیلئے فرمائش کرنے والوں کو ہدایت کی کہ:-

۱- جس شخص کی نسبت تم کو قرائن سے تیقن یا مظنون ہو کہ تمہارے کہنے کو ہرگز نہ ٹالے گا۔ تو اس سے کسی ایسی چیز کی فرمائش نہ کرو۔ جو شرعاً واجب نہیں۔

۲- اگر بلا فرمائش کوئی تمہاری مالی یا بدنی خدمت کرے۔ تب بھی اس کا لحاظ رکھو کہ اس کی راحت یا مصلحت میں خلل نہ پڑے۔ یعنی اس کو زیادہ نہ جاگنے دو۔ اس کی گنجائش سے زیادہ اس کا ہدیہ مت لو۔ اگر وہ تمہاری دعوت کرے۔ تو بہت سے کھانے مت پکانے دو۔ ہمراہی میں بہت سے آدمیوں کی دعوت مت کرنے دو۔

۳- کسی ایسے شخص سے کوئی چیز مت مانگو کہ تم کو قرائن سے یقین ہو کہ وہ باوجود گرانی کے بھی انکار نہ کر سکے گا۔ اگرچہ یہ مانگنا بطور عاریت یا قرض کے ہی کیوں نہ ہو۔ اگر یہ یقین ہو کہ اس کو گرانی ہی نہ ہوگی۔ یا اگر گرانی ہوئی۔ تو یہ آزادی سے عذر کر دیگا۔ تو مضائقہ نہیں اور

۴- یہی تفصیل ہے کسی کام بتلانے میں۔ کوئی فرمائش کرنے میں کسی سے کسی کی سفارش۔

کرنے میں۔

۵۔ اسی طرح کسی کی وجاہت سے کام نکالنا۔ مثلاً کسی بڑے آدمی سے اپنی قرابت ہے۔ اور اس کے کسی معتقد یا اثر ماننے والے کے پاس اپنی کوئی حاجت ملے جاوے اور قرائن سے معلوم ہو کہ وہ بطیب خاطر اس حاجت میں سعی نہ کرے گا۔ بلکہ محض اس بڑے آدمی کے تعلق اور اثر سے کریگا کہ بے توجہی سے وہ ناراض نہ ہو جائے تو اس طرح سے کام نکالنا۔ یا کام کی فرمائش کرنا حرام ہے۔

تعلیم و تربیت

محورِ زندگی حضرت تھانوی کی زندگی کا ایک سرسری جائزہ لینے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے اپنی زندگی امتِ مسلمہ کی اصلاح و تربیت کے لئے ہی وقف کر رکھی تھی۔ آپ کو ہر وقت طالبین و سالکین کی اصلاح و نفع کا خیال رہتا تھا۔ اس باب میں آپ کو اتنا اہتمام تھا کہ خود طالبین و سالکین بھی اپنے لئے اتنی فکر نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے جن جن گوشوں تک آپ کی نظر پہنچتی تھی۔ وہاں کسی دوسرے کی نظر پہنچنی محال تھی۔

تشخیص و معالجہ ایک صاحب قلم فلسفی لکھتے ہیں کہ:۔

اکثر اطباء علاج میں صرف مرض کا خیال کرتے ہیں۔ مریض کا نہیں۔ شخصی حالات یا زمان و مکان کے اختلافات پر بہت کم نظر جاتی ہے۔ حضرت کے ہاں روحانی معالجہ میں دونوں باتوں کا پورا لحاظ رہتا ہے۔ مثلاً کم خوری۔ کم خوابی یا دیگر ریاضیات شاقہ وغیرہ کو غالباً اس زمانہ کے لوگوں کے لئے بالعموم ترک ہی فرما دیا ہے۔ اذکار و اشغال وغیرہ تمام چیزوں میں طبیعت کی مناسبت اور برداشت کا خیال فرماتے ہیں۔ زیادہ زور احکام پر ہے۔ تشخیص مرض اور نفس شناسی میں حضرت کی حذاقت حیرت انگیز ہے۔ کسی ماہر نفسیات کی نگاہ وہاں کیا پہنچے گی۔ جہاں حضرت کی پہنچتی ہے۔ ایک شخص اپنی جس صفت کو تواضع سمجھ رہا ہے۔ اور دوسرے بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ حضرت کی حذاقت اسے کبر کا مرض تشخیص فرماتی ہے۔ اور پھر مریض کو خود نظر آ جاتا ہے کہ ہاں یہ تواضع نہیں کبر تھا۔ بعض مرتبہ آدمی اپنا کوئی ایسا حال بیان کرتا ہے کہ دوسرا مرشد تو شاید اس کی ولایت کی تصدیق کر دے۔ مگر حضرت سیر رست دماغ کا علاج کرانے کی ہدایت

فرماتے ہیں۔ اسی طرح دوسری طرف بعض حالات وخیالات پر انسان کو اپنے کفر ونفاق تک کا گمان ہونے لگتا ہے۔ لیکن حضرت کی تشخیص میں وہ ایمان واخلاص کے منافی نہیں ہوتے کم ہمت سے کم ہمت کو بھی حضرت ہمت شکستہ نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ جہاں تک بھی اسکی ہمت یاری کرے۔ دین کا یسر یہ ہے کہ خدا سے لپٹائے رکھتے ہیں۔ ایسے ہی تجربات بتاتے ہیں کہ مرشد کی کیا ضرورت ہے اور اس کو کیسا ہونا چاہیئے۔

تعلیم وتربیت کے باب میں بعض کلیات تو حضرت کے ایسے ہیں مثلاً مطلوب وغیر مطلوب اختیاری وغیر اختیاری کی تفریق وتقلیل کہ جن سے سلوک کی سینکڑوں گرہیں کھل جاتی ہیں۔ بہت سی باتوں کو سالک اہم ومقدم قرار دے لیتا ہے۔ جو دراصل غیر اہم یا سرے سے غیر ضروری ہوتی ہیں۔ جیسے احوال واذواق۔ کشف وکرامات۔ ان کے عدم حصول سے نہ صرف دل ٹوٹ جاتا ہے۔ بلکہ جو امور حقیقتاً اہم واقدم ہیں۔ ان کا دل میں اہتمام ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک بڑی سہولت تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں حضرت نے یہ فرمادی ہے کہ جس کے بعد محرومی کا کوئی عذر نہیں رہ جاتا۔ کہ دور دراز مقام پر رہ کر بھی آدمی مکاتبت کے ذریعہ کافی استفادہ کر سکتا ہے۔ اس معاملہ میں حضرت کی بصیرت سراپا کرامت ہے۔ طویل سے طویل اور پراگندہ سے پراگندہ خطوں میں دکھتی ہی رگ پر انگلی پڑتی ہے۔ اور دو چار فقروں میں شافی وکافی جواب تحریر فرما دیتے ہیں۔" (الفیض الجاری)

اہمیتِ اصلاح حضرت تھانوی کی ابتدائی اور اہم ترین کوشش یہ ہوتی تھی۔ کہ اصلاح اعمال کی اہمیت طالب کے ذہن نشین ہو جائے اور جب تک یہ مقصود حاصل نہ ہو جاتا۔ نہ آپ خود چین لیتے اور نہ اسے چین لینے دیتے۔ مگر یہ منزل آپ صرف استفسارات میں ہی طے کرا دیتے تھے۔ اور اس کا حق تعالے نے آپ کو ایسا ملکہ وسلیقہ بخشا تھا جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ آپ طالب سے محققانہ سوالات کر کر کے اسے اس طرح لاجواب کر دیتے کہ اس کا جہل اس کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا تھا۔ اور وہ اپنے لئے گریز پائی کے تمام راستے مسدود پا کر شاہراہ طریقت پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتا تھا جس کی مثالوں سے اشرف السوانح حصہ دوم بھری پڑی ہے۔

طریق اصلاح حضرت تھانوی کے ہاں امراض باطنی کے معالجہ کا دستور یہ تھا کہ طالب آپ کو محض اپنے حالات باطنیہ کی اطلاع دے۔ اور درخواست اصلاح کرے

لیکن تشخیص و تجویز کے سلسلہ میں اپنی طرف سے کوئی رائے یا تدبیر پیش نہ کرے۔ اور یہ تمام معاملہ آپ کی رائے پر چھوڑ دے۔ جب آپ تمام حالات کا جائزہ لے کر یا حسب ضرورت ضروری استفسارات فرما کر مرض و علاج تشخیص و تجویز کریں۔ تو طالب بلا چون و چرا اور بکمال اعتماد آپ کی تجاویز پر عمل کرنا شروع کر دے۔ اور اس میں قطعاً اپنی رائے کو دخیل نہ ہونے دے عمل کرنے کے بعد یا عمل کرنے کے دوران میں جو جو حالات اور تغیرات پیدا ہوتے جائیں ان سے آپ کو مطلع کرتا رہے۔ اور ان کے پیش نظر حضرت اپنی تجویزات میں جو مناسب حال تغیر و تبدیل یا کمی بیشی یا ترمیم و تنسیخ فرمائیں۔ ان پر کاربند رہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رکھے اس طریق کو ذہن نشین کرنے کے لیے حضرت نے فرمایا کہ بس ان چار ہم قافیہ الفاظ کو یاد رکھے۔ اطلاع و اتباع۔ اعتقاد و انقیاد تعلیم و تربیت کا یہ دستور آپ کے اس اصول پر مبنی تھا کہ:۔

"انسان صرف اختیاری امور کا مکلف ہے۔ غیر اختیاری امور کا مکلف ہی نہیں لہٰذا اختیاری امور میں تو بہ تکلف ہمت اور استعمال اختیار سے کام لے اور غیر اختیاری امور کے نہ تو درپے ہو اور نہ ان کی فکر میں پڑے۔"

چنانچہ جب کوئی طالب اپنے کسی عیب کی اصلاح چاہتا۔ تو آپ سب سے پہلے اس پر یہ سوال کرتے کہ یہ اختیاری ہے یا غیر اختیاری؟ اگر وہ کہتا کہ اختیاری ہے۔ تو فرماتے جس چیز کا فعل اختیاری ہے۔ اس کا ترک بھی اختیاری ہے ہمت کر کے اختیار کو استعمال میں لاؤ۔ . . . . . . اگر وہ کہتا کہ غیر اختیاری ہے۔ تو اگر وہ در اصل غیر اختیاری ہوتا۔ تو فرماتے کہ غیر اختیاری کا انسان مکلف ہی نہیں۔ پھر اس میں دینی ضرر ہی کیا ہوا۔ جو اس کا علاج پوچھا جاتا ہے یہی سوال ان عنوانات سے بھی فرماتے کہ یہ بات عقلی و طبعی ہے یا مقصود و غیر مقصود ہے یا مطلوب و غیر مطلوب ہے۔ جس سے حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی۔ مثلاً

۱۔ عقلی و طبعی امور کے متعلق فرماتے کہ انسان عقلی امور کا مکلف ہے۔ کیونکہ وہ اختیاری ہیں۔ طبعی امور کا مکلف نہیں۔ کیونکہ وہ غیر اختیاری ہیں۔

۲۔ اعمال و احوال کے متعلق فرماتے۔ اعمال مقصود ہیں۔ احوال (کشف و کرامات وغیرہ) مقصود نہیں۔ کیونکہ اعمال اختیاری ہیں۔ احوال اختیاری نہیں۔

۳۔ افعال و انفعالات کے ضمن میں فرماتے کہ اس طریق میں افعال کا اعتبار ہے انفعالات کا اعتبار نہیں۔ لہٰذا افعال کا اہتمام چاہیے۔ جو اختیاری ہیں۔ انفعالات کے درپے نہ ہونا چاہیے

جو غیر اختیاری ہیں۔

۴۔ مقصود و غیر مقصود کے سلسلہ میں فرماتے کہ گو احوال محمود و محمود ہیں لیکن مقصود نہیں کیونکہ وہ اختیاری نہیں۔ نہ ان کا حصول لازم نہ ان کا بقا دائم۔ اگر حاصل ہوں شکر کرے۔ لیکن کمال نہ سمجھے اگر حاصل نہ ہوں یا حاصل ہو کر زائل ہو جائیں۔ تو غم نہ کرے۔

غرضیکہ آپ صرف اس ایک تنقیح پر مختلف صورتوں سے ہزاروں اشکالات فوراً اس طرح حل فرما دیتے تھے کہ اہل علم کے سامنے بھی ان کا حل تشکل ہو کر آجاتا تھا۔

اذکار و اشغال

جب ایک طالب اصلاح اعمال کی اہمیت کو ذہن نشین کر کے اصلاح اعمال میں خاص اہتمام کے ساتھ مشغول ہو جاتا۔ تو پھر آپ اصلاح اعمال کی تکمیل کا انتظار کئے بغیر بلا تامل اذکار و اشتغال بھی اسی وقت شروع کرا دیتے تھے حالانکہ سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ سلف کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب تک طالب اصلاح اعمال ظاہرہ و باطنہ کی تکمیل نہ کر لیتا۔ اسے اذکار و اشغال شروع نہ کرائے جاتے۔ لیکن اکابر متاخرین نے یہ دیکھ کر کہ اس زمانہ میں عمریں اور ہمتیں دونوں اس ترتیب کو علیٰ حالہ قائم رکھنے میں قاصر ہیں انہوں نے یہ ترتیب بدل دی۔ اور اصلاح اعمال کے ساتھ اذکار و اشتغال کی تعلیم بھی دینی شروع کر دی۔ مگر حکیم الامت نے اپنے زمانہ کے طالبین کے مصالح کے پیش نظر اکابر سلف اور اکابر متاخرین کے طریق کے بین بین طریق اختیار کیا۔ فرماتے ہیں کہ:-

"کچھ دن تک تو میں محض اصلاح اعمال ہی میں مشغول رکھتا ہوں۔ اور جب یہ دیکھ لیتا ہوں کہ اصلاح اعمال کی اہمیت اچھی طرح اس کے ذہن نشین ہو گئی ہے اور اس کے اندر اس کا خاص اہتمام پیدا ہو گیا ہے۔ اس وقت اذکار و اشتغال بھی بتلا دیتا ہوں اور پھر دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلاتا ہوں۔ غرضیکہ میں نے اکابر متاخرین کے طریق میں اپنے زمانہ کے طالبین کی طبائع کا رنگ دیکھ کر بضرورت صرف اتنی ترمیم کر لی ہے کہ وہ حضرات تو دونوں چیزوں کو شروع ہی سے ساتھ ساتھ چلاتے تھے۔ اور میں کچھ دن بعد ساتھ ساتھ چلاتا ہوں۔"

دستور العمل

اذکار و اشغال کے سلسلہ میں حضرت کا دستور العمل بھی بڑا حکیمانہ تھا جس کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ:-

"دستور العمل غایت نافع ہونے کے اعتبار سے میرے نزدیک عطر تصوف کہنے کے

قابل ہے۔ جو بہت ہی خاک بیزی کے بعد ہاتھ آیا ہے۔ جسے عام طالبین کے لئے عموماً اپنے شیخ کی خدمت میں پہنچنے تک کے واسطے اور اپنے دوستوں کیلئے خصوصاً ہمیشہ کے لئے عمل کرنے کے واسطے ضبط کئے دیتا ہوں۔ پھر اگر کسی کا شیخ اس کو منظور و جائز رکھے تب تو قصہ سہل ہوا۔ اور اگر اوراد و اذکار و اشغال کے متعلق کچھ اور تجویز کرے تو اس کے موافق کرنا چاہیے۔ البتہ اس میں جتنے امور شرعاً ضروری ہیں۔ ان میں تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں۔۔ وہ بحالہ رہیں گے۔"

(قصد السبیل ص۸)

اس توسع و احتیاط کی مثال اس زمانہ میں ملنی ناممکن نہیں۔ تو مشکل ضرور ہے۔ آپ کے الفاظ میں اس دستور العمل کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"طالب یا عامی ہے یا عالم۔ اور ہر ایک ان میں سے یا فکرِ معاش و حقوق عباد سے فارغ ہے۔ یا مشغول۔ تو طالب کی یہ کل چار قسمیں ہوئیں (۱) عامی فارغ (۲) عامی مشغول (۳) عالم فارغ (۴) عالم مشغول۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک ایک دستور العمل خاص ہے۔" (بحوالہ صدر)

برائے عامی مشغول

۱۔ عامی مشغول کا خاص دستور العمل یہ قرار دیا کہ۔۔۔۔۔۔ اول عقائد و مسائل ضروریہ سیکھے۔ اور بہت اہتمام سے اس کا پابند رہے۔ جو نئی بات اس کو پیش آوے۔ علماء سے پوچھے۔ اور اگر اس کا پیر عالم ہے۔ تو وہ سب سے بہتر ہے۔ اگر ممکن ہو۔ تو تہجد اخیر شب میں پڑھے ورنہ عشا کے بعد ہی وتر سے پہلے کچھ نفلیں بجائے تہجد کے پڑھ لے۔ اور پانچوں نمازوں کے بعد یا جن نمازوں کے بعد فرصت ہو۔ سبحان اللہ سو بار لا الہ الا اللہ سو بار اور اللہ اکبر سو بار اور سوتے وقت استغفار سو بار پڑھا کرے۔ اور ہر وقت اٹھتے بیٹھتے درود شریف زبان سے جاری رکھے۔ اس میں وضو اور کسی عدد کی قید نہیں لیکن ہر وقت تسبیح ہاتھ میں نہ لئے پھرے۔ اور اگر قرآن پڑھا ہوا ہو۔ تو روزانہ کسی قدر قرآن کی تلاوت بھی کر دیا کرے۔ اور رسالہ قصد السبیل کے اخیر میں جو مردوں اور عورتوں کے لئے نصیحتیں لکھی ہیں۔ ان کو کبھی کبھی دیکھ لیا کرے اور ان پر عمل کرے۔ اور کبھی کبھی اپنے پیر کے پاس یا اور کوئی خوش عقیدہ متقی بزرگ موجود ہو اس کے پاس جا بیٹھا کرے لیکن پیر کے پاس جاتے میں اس کی پابندی نہ کرے کہ کچھ نہ کچھ

لے کر ہی جانا چاہیئے۔ کیونکہ یہ تکلف اخلاص کے خلاف ہے اور باقی اوقات میں بال بچوں کے لئے کسب حلال میں مشغول رہنا بھی عبادت ہے۔ اور اگر یہ عامی عورت ہے تو ان باقی اوقات میں گھر کا کاروبار خصوصاً شوہر کی خدمت اس کے لئے عبادت ہے۔ مگر یہ بلا اذن شوہر کے پیر کے ہاں نہ جائے۔ اور ایام حیض میں بھی وظیفوں کے وقت میں وضو کر کے وظیفے پڑھ لیا کرے۔ بجز قرآن مجید۔ کے کہ اس کا پڑھنا اس حالت میں درست نہیں۔

برائے عامی فارغ

۲۔ عامی فارغ کا خاص دستورالعمل وہی قرار دیا جو عامی مشغول کیلئے بیان کیا گیا۔ مگر اتنے امور اور زائد ہیں کہ اگر ممکن ہو۔ تو پیر کی خدمت میں جا پڑے۔ لیکن اپنے کھانے پینے کا انتظام ایسے طور پر کرے۔ کہ کسی دوسرے پر اس کا بار نہ پڑے۔ اور اگر کوئی انتظام و سامان ظاہری نہ ہو۔ تو اتنا ضرور ہے کہ دوسرے کے بھروسہ پر نہ رہے۔ یا تو کچھ محنت مزدوری کر لے اور اگر ہمت ہو۔ تو اللہ پر توکل کرے مل جائے تو کھالے۔ نہ ملے صبر کرے۔ اگر پیر کے پاس نہ رہ سکے تو اپنے وطن میں ہی رہے خواہ گھر میں یا کسی مسجد میں۔ مگر جہاں تک ہو سکے۔ خلق سے علیحدہ رہے۔ کسی کے پاس زیادہ آمد و رفت نہ رکھے۔ جب تک کوئی دنیا یا دین کی ضرورت نہ ہو۔ مخالطت نہ کرے۔ اور کسی ضرورت سے ملنا ہو۔ تو زبان کا بہت زیادہ خیال رکھے۔ کوئی کلمہ خلاف شرع مثل غیبت وغیرہ منہ سے نہ نکالے۔ لیکن نماز جماعت کے ساتھ پڑھے۔ اور تنہائی میں جو اوقات اپنی ضروری حاجت و آرام سے بچیں۔ اس میں خواہ قرآن کی تلاوت مع مناجات مقبول خواہ نوافل خواہ درود شریف۔ خواہ استغفار میں مشغول رہے۔ اور اگر کچھ خواندہ ہو۔ تو تھوڑے وقت دین کی کتابیں بھی جو اردو۔ فارسی میں ہیں۔ کسی معتبر عالم کو دکھا کر مطالعہ کرے لیکن جہاں شبہ رہے۔ اپنی رائے سے مطلب نہ نکالے۔ کسی محقق عالم سے پوچھ لے۔ اگر اس بستی میں کہیں طالب علم یا اللہ اللہ کرنے والے موجود ہوں۔ تو ان کی خدمت گذاری میں اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ خرچ کرے۔ اس سے قلب میں برکت بھی پیدا ہوتی ہے اور خود دین سے بھی حفاظت رہتی ہے اور کبھی کبھی نفل روزہ بھی رکھ لیا کرے۔ باقی دونو قسم کے عامی کو اشغال کی تعلیم نہ کرنا چاہیئے کہ اس میں طرح طرح کے خطرات ہیں۔ جن کا تحمل عامی سے نہیں ہوتا۔ البتہ اگر اس میں شوق و استعداد دیکھے تو اسم ذات تین ہزار سے چھ ہزار تک تنہائی میں بیٹھ کر پڑھنے کو بتا دے۔ مگر بدون ضرب و بلا جہر کے۔ اس سے زیادہ مناسب نہیں باقی

دوسرے اوراد و نوافل جس قدر جی چاہے پڑھے۔ البتہ اگر کوئی عامی صحبت علماء سے مثل علماء کے خوش فہم ہو گیا ہو۔ وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

برائے عالم مشغول

۳۔ عالم مشغول کا خاص دستورالعمل یہ قرار دیا کہ فارغ اوقات میں کوئی ایسا وقت جس میں قلب، افکار و تشویشات سے کسی قدر خالی ہو۔ اور معدہ پُر نہ ہو۔ نہ بھوک کا تقاضا ہو معین کر کے اس میں بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک جس قدر ممکن ہو۔ خلوت میں بیٹھ کر اسم ذات یعنی اللہ اللہ۔ باو جہر خفیف جہر و ضرب کے ساتھ قلب کو متوجہ کر کے پڑھا کریں۔ تہجد کی پابندی کریں۔ اور کسی وقت قرآن شریف کی تلاوت اور مناجات مقبول کی اصل عربی کی ایک منزل کا التزام رکھیں۔ اگر مدرس ہیں۔ فبہا۔ ورنہ ایک معتدبہ وقت تدریس طلبہ علم دین میں ضرور صرف کیا کریں۔ اور گاہ گاہ جب ضرورت دیکھی جاوے۔ یا سامعین رغبت کریں۔ ضروری احکام کا وعظ کہہ دیا کریں۔ مگر وعظ میں غیر ضروری مضامین بیان نہ کریں اور جو ضروری مضمون ہو۔ مگر عوام کی طبیعت کے خلاف ہو۔ اس کو نہ مبہم طور سے کہیں۔ اور نہ خشونت و درشتی سے کہیں۔ بلکہ صاف لیکن نرم کہیں اور وعظ پر اجرت نہ لیں۔ نہ عوام کے زیادہ در پے ہوں۔ نہ ان کو سخت کہیں کہ اس سے خواہ مخواہ عداوت پیدا ہوتی ہے۔ اور احیاء العلوم وغیرہ مطالعہ میں رکھیں لیکن شیخ سے دور رہ کر شغل نہ کریں۔ البتہ جب سے شیخ کے حضور میں اگر یہ کام کیا ہو۔ اور وہ اب بھی تجویز کرے تو مضائقہ نہیں۔

برائے عالم فارغ

۴۔ عالم فارغ کے لئے یہ دستورالعمل ہے کہ وہ اگر برائے چندے ہی فارغ ہو۔ جس کی مدت اقل چھ ماہ ہیں۔ خاص دستورالعمل یہ ہے کہ چند روز جس قدر موقع میسر آئے۔ شیخ کی خدمت میں رہ کر مشغول ذکر رہے۔ اور اس کے لئے اذکار میں سے اس قدر کافی ہے کہ بعد تہجد کے بارہ تسبیح پڑھے۔ یعنی لا الٰہ الا اللہ ۲۰۰ بار الا اللہ ۴۰۰ بار اور اَللّٰہُ اَللّٰہُ بضم ہائے اول و سکون ہائے ثانی ۶۰۰ بار اور صرف اللہ ۱۰۰ بار۔ یہ تیرہ تسبیح ہیں۔ مگر اصطلاح میں بارہ کہلاتی ہیں۔ ان میں خفیف سا جہر اور معتدل ضرب قلب پر کرے۔ مگر جہر مقصود بالذات اور قربت فی نفسہا نہیں۔ ایسا اعتقاد کرنا بدعت ہے (جس کی ترکیب تفصیل نیچے دیکھ لی جائے) اس کے بعد اگر نیند کا تقاضا ہو۔ ذرا سو جائے۔ ورنہ خواہ ان اذکار میں نفی کسی خاص ذکر کو اور زیادہ کر لے۔ یا یونہی فارغ رہے۔ پھر بعد نماز صبح تلاوت قرآن اور ایک منزل مناجات مقبول پڑھنے کے بعد بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک جس قدر سہل ہو۔

اسم ذات خفیف جہر اور معتدل ضرب سے خلوت میں بیٹھ کر کرے اور دوپہر کو قیلولہ کرے پھر بعد ظہر اسی طرح بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک سہولت کے ساتھ عصر کے قبل اسم ذات کا ورد کرے۔ اور عصر کے بعد اگر شیخ فارغ ہو۔ تو مغرب تک شیخ کی خدمت میں حاضر رہے۔ اور فارغ نہ ہو۔ یا وہاں موجود ہی نہ ہو۔ یا اس کے قلب میں زیادہ اشتیاق نہ ہو۔ تو جنگل۔ باغ۔ نہر۔ ندی وغیرہ کی سیر کو چلا جائے۔ اگر شیخ موجود ہو۔ تو اس کی اجازت لے کر جائے۔ اور اسی وقت میں کبھی کبھی مقابر عامہ مسلمین و مزارات اولیاء کرام پر ہو آیا کرے پھر بعد مغرب گھنٹہ آدھ گھنٹہ جب تک دلچسپی ہو۔ خلوت میں بیٹھ کر مراقبہ موت و مابعد الموت الی الحساب کا کرے کہ یہ واقعات اس طرح سے ہوں گے۔ اور بقیہ اوقات میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے درود شریف پڑھتا رہے یا اور جس ذکر سے دلچسپی ہو۔" (قصد السبیل)۔

عامی و عالم۔ فارغ و مشغول کے اذکار و اشغال کا طویل اقتباس محض اسلئے پیش کیا گیا ہے تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ یہ طریق سلوک شریعت مطہرہ کے کتنے مطابق ہے۔ اور دین و دنیا کے امتزاج کے باوجود کتنی سہولت و رعایت کا حامل ہے۔ اگر انسان ایک دفعہ اس پر عامل ہو جائے۔ تو بظاہر اگر کوئی مشکل صورت نظر بھی آتی ہو۔ تو وہ بھی سہل و آسان معلوم ہونے لگتی ہے۔

کیفیات و تنبیہات یہ بات ظاہر ہے کہ جس دستور العمل پر بھی انسان عمل کرے۔ اس کا کوئی نہ کوئی خاص نتیجہ طالب کی طلب۔ اخلاص۔ ذوق و شوق کے مطابق برآمد ہونا لازمی ہے۔ جسے سلوک کی اصطلاح میں کیفیت کہتے ہیں۔ مگر ان کیفیات کے معاملہ میں حضرت کی تنبیہات کا معاملہ ایسا ہے جیسے کہ

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای ۔ باز مے گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

کیونکہ حضرت کے ہاں اس بات کا بڑا اہتمام رہتا تھا کہ طالبین کیفیات کو ان کے درجہ سے آگے نہ بڑھائیں۔ اسی لئے آپ نے طالبین کو کیفیات کی طرف التفات کرنے سے تاکید منع فرماتے رہتے تھے۔ اگر کوئی طالب اپنی کیفیات کی اطلاع دیتا تو اکثر یہی فرماتے تھے کہ:۔

۱۔ ان کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ اپنے کام میں لگا جائے۔ اور کام ہی کی طرف ہمہ تن متوجہ رہا جائے۔ ورنہ غیر مقاصد میں مشغول ہو کر طالب اپنے اصل کام سے بھی رہ جاتا ہے اور پھر کیفیات بھی منقطع ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان کا ورود بھی تو کام ہی کی برکت سے ہوتا ہے

جیسے چراغ میں روشنی اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کہ بتی میں تیل پہنچتا رہے۔ اور اگر تیل ہی ڈالنا چھوڑ دیا جائے۔ تو رفتہ رفتہ روشنی کم ہو کر چراغ گل ہو جائے گا۔

۲۔ کشف و کرامات و مواجید وغیرہ راہ سلوک میں کوئی چیز نہیں بلکہ یہ چیزیں اکثر مانع طریق ہو جاتی ہیں۔ ان کا نہ ہونا زیادہ اچھا اور بے خطر ہے۔ لوگ خواہ مخواہ اس کی ہوس کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا درجہ تو بس اتنا ہے۔ جیسے شروع میں بچہ کو پڑھنے کا شوق دلانے کے لئے مٹھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت جنیدؒ کے قول تلک خیالات تربی بہا اطفال الطریقۃ سے ظاہر ہے تو بعض مبتدیوں کو جو اطفال طریق ہوتے ہیں راہ پر لگانے کیلئے کیفیات عطا فرمادی جاتی ہیں۔ اور

۳۔ کسی طالب کی حوصلہ افزائی کے لئے کیفیاتِ محمودہ پر اسے مبارک باد دیتے تو ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرما دیتے کہ کیفیات محمودہ کو محمودہ سمجھ کر شکر تو کرے۔ لیکن مقصود اور کمال اور لازم طریق یا لازم بزرگی نہ سمجھے۔

۴۔ ذکر و طاعت میں بہ تکلف مشغول رہے۔ سہولت یا دلچسپی کا منتظر نہ ہو، اور یہ نہ دیکھے کہ مجھے کچھ نفع ہو رہا ہے یا نہیں ذکر و طاعت میں مشغول رہنا ہی اصل مقصود اور اصل نفع ہے اور جب بہ تکلف مشغول ہو جائیگا۔ تو پھر رفتہ رفتہ سہولت بھی ہونے لگے گی اور دلچسپی بھی پیدا ہو جائیگی۔

توسط و اعتدال

غرضیکہ حضرت تھانوی کے ہاں افراط و تفریط نہ تھی۔ ہر معاملہ میں توسط و اعتدال برتا جاتا تھا کہ وجد و حال۔ ذوق و شوق جوش و خروش اور گریہ وزاری سب کچھ ہو لیکن سب اندر ہی اندر ہو۔ باہر کچھ نہ ہو۔ ہمت و تحمل اور یقین و اعتماد کے ساتھ کام تو کرے مگر اظہار سے باز رہے۔ اس لئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"تقویٰ و دینداری کا اہتمام تو بہت رکھے۔ لیکن اپنی طرف سے حتی الامکان کوئی ایسی امتیازی صورت پیدا نہ ہونے دے۔ جس سے شہرت ہو جائے جب لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہو تو کبھی کبھی کسی قدر ہنس بول بھی لے۔ تاکہ لوگوں کو خواہ مخواہ بزرگی کا گمان نہ ہو۔ لیکن ہنسنے بولنے کی کثرت ہرگز نہ کرے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو زیادہ ہنسنے سے بچاؤ۔ ہنسنے کی کثرت قلب کو مردہ کر دیتی ہے۔"

یہ رعائتیں اور احتیاطیں صرف دربار اشرفیہ میں ہی برتی جاتی ہیں۔ دوسری خانقاہوں میں آپ کو ان کی مثالیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں گی۔

بیعت

حقیقتِ بیعت حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ "بیعت کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت۔ اس کی صورت مطلوب نہیں حقیقت مطلوب ہے صورت بیعت ایسی ہے۔ جیسے پھولوں کی کیاری میں گھاس کہ اس سے ایک خوشنمائی ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور پھولوں کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ لیکن پھولوں کے نشوونما میں گھاس کا کچھ بھی دخل نہیں۔ اگر کیاری میں گھاس نہ بھی لگائی جائے۔ محض پھولوں کے پودے ہی لگا دیئے جائیں تب بھی پھول اپنی ساری صفات اور اپنی اصلی آب وتاب ہی کے ساتھ پیدا ہوں گے کیاری میں گھاس نہ ہونے کی وجہ سے ان کی ذات میں کسی قسم کا نقص واقع نہ ہوگا۔

بیعت کی حقیقت یہ ہے کہ اس کو اپنے شیخ پر پورا اعتقاد واعتماد ہو جائے کہ یہ میرا خیرخواہ ہے۔ جو مشورہ دیگا۔ وہ میرے لئے نہایت نافع ہوگا۔ غرض اس پر پورا اطمینان ہو اس کی تجویز وتشخیص میں مطلق دخل نہ دے۔ جیسا کہ طبیب حاذق ومشفق کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے۔ بس ویسا ہی اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔

بیعت کی صورت شروع شروع میں خواص کے لئے نافع نہیں ہوتی۔ عوام کے لئے البتہ نافع ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کے قلب پر ایک عظمت اور شان اس شخص کی طاری ہو جاتی ہے۔ جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اس کے قول کو باوقعت سمجھ کر اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ خواص کے لئے کچھ مدت کے بعد بیعت نافع ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا فائدہ ہے کہ جانبین میں ایک تعلق خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ پیر سمجھنے لگتا ہے کہ یہ ہمارا ہے اور مرید سمجھتا ہے کہ یہ ہمارے ہیں۔ ڈانواڈول حالت نہیں رہتی۔ جب تک جانبین میں پوری مناسبت اور اطمینان نہ ہو جائے بیعت کرنا کرانا بالکل عبث ہے۔" (حسن العزیز جلد ا ملفوظ نمبر ۵۹)

ضرورتِ ضابطہ حضرت تھانوی کے ہاں چونکہ ہر بات اصول اور ضابطہ کی ہوتی تھی۔ اس لئے لوگوں پر اس کی پابندی ذرا گراں گذرتی تھی۔ حالانکہ وہ قواعد اپنی ذات میں بالکل سہل ہوتے تھے اور ان کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ نہ کوئی آپ کو اذیت دے۔ اور نہ کسی کا کوئی کام رکا رہے۔ اور بزرگوں کے ہاں چونکہ یہ قاعدے اور ضابطے نظر

نہیں آتے تھے۔ اسلئے لوگ حضرت پر زبان طعن دراز کرنے سے باز نہ رہتے تھے۔ جس کے جواب میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ "بعض لوگوں نے مجھ سے کہا کہ اپنے اور حضرات کا تو یہ طرز نہ تھا میں نے کہا کہ یہ بات تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے کہ حد خمر نہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی۔ نہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تھی صرف تعزیر تھی۔ حضرت عمرؓ نے بجائے تعزیر کے یہ حد کیوں مقرر کردی۔ پس جو وہاں جواب ہے وہی یہاں بھی ہے یعنی پہلے طبائع میں سلامتی تھی۔ اسلئے واقعات میں قلت تھی۔ لہذا صرف تعزیر کافی تھی۔ حد مقرر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بعد کو طبائع کا رنگ بدل گیا۔ اور واقعات زیادہ ہونے لگے۔ اسلئے حد مقرر کرنے کی ضرورت واقع ہوئی۔ تو جو فاروق نے کیا۔ وہی ایک فاروقی بھی کر رہا ہے:۔

میں نے یہ قواعد سوچ سوچ کر بلا ضرورت پہلے سے تجویز نہیں کئے بلکہ جیسے جیسے معاملات لوگ میرے ساتھ کرتے گئے۔ ان کی بنا پر جیسی جیسی ضرورت پیش آتی گئی۔ قواعد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ باقی خدا نہ کرے۔ مجھ کو خواہ مخواہ قواعد بنانے کا کوئی شوق تھوڑا ہی ہے کہ لوگوں کو تنگی میں ڈالوں۔ مجھے تو ضرورتوں نے مجبور کر رکھا ہے"۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے۔ جیسے لوگوں کے اعمال میں روز بروز نئی نئی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں اور حکومت ان کے انسداد کے لئے قانون پر قانون بنائے چلی جا رہی ہے۔ اسمبلی کا کوئی اجلاس بھی ایسا نہیں گزرتا جس میں نئے نئے قانون اور ضابطے وضع نہ کئے جاتے ہوں۔

شرائط بیعت اسی لئے حضرت کے ہاں بیعت کے لئے بھی قواعد مقرر تھے۔ جب کوئی طالب آپ سے بیعت کی درخواست کرتا۔ تو آپ ایک پرچہ شرائط بیعت اسکے حوالے کرتے۔ اور پرچہ دیتے وقت اس کو تاکید فرماتے کہ "اس کے متعلق یہاں تحریری یا تقریری گفتگو کرنے کی اجازت نہیں۔ گھر پہنچ کر اس کا جواب سوچ کر لکھنا۔ تاکہ آپ کو اس مسئلہ پر پورا غور کرنے کا موقع مل جائے۔ اس قسم کے بعد جو مناسب ہوگا۔ جواب دیا جائیگا"۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ زبانی گفتگو میں وہ ضرور کوئی بے ڈھنگی بات کہہ دیگا جس سے طبیعت میں فہمائش کا تقاضا ہوگا۔ اور اس سے بے لطفی ہوگی۔ جو طالب کے لئے مضر ہے۔

شرائط بیعت دو قسم کی تھیں (۱) بیعت بلا تعلیم (۲) تعلیم بلا بیعت۔ پہلی قسم کے لئے یہ شرائط تھیں:۔

۱- قرآن مجید جتنا پڑھا ہے یا جتنا یاد ہے کسی صحیح پڑھنے والے سے صحیح کرنا ہوگا۔
۲- بہشتی زیور کے سب حصے یا سات حصے بہشتی گوہر۔ اصلاح الرسوم اور قصد السبیل کی
تعدیل (جن میں کرنے اور چھوڑنے کے کاموں کی فہرست درج ہے) پڑھ کر یا سن کر اس کی
پابندی کرنا ہوگی۔
۳- میرے چھپے ہوئے وعظ ہمیشہ پڑھنا یا سننا پڑیں گے۔
۴- ابتدائی تعلیم میرے کسی اجازت یافتہ سے (جس کو میں تجویز کردوں یا طالب کی تجویز
پر اجازت دے دوں) حاصل کرنی ہوگی۔ اور جب تک پچیس بار ان سے خط وکتابت نہ ہو
چکے۔ مجھ سے براہ راست تعلیم کی استدعا نہ کی جائے۔

دوسری قسم کے لئے یہ شرط تھی:۔
اگر فی الحال بیعت پر اصرار نہ ہو۔ صرف تعلیم حاصل کرنا ہو۔ تو صرف اول تین شرطوں کی پابندی
لازم ہوگی۔ چوتھی شرط نہ ہوگی۔ پھر جب باہم خوب مناسبت ہو جائے گی۔ اس وقت درخواست
بیعت کا بھی مضائقہ نہیں۔
تنبیہ۔ ابتدا میں بیعت وتعلیم دونوں یکجا جمع نہیں ہوسکتیں۔ اشرف علی

دیگر شرائط خط وکتابت کے بعد جن کی درخواست بیعت یا تعلیم منظور فرمانا چاہتے ان کو لکھ دیتے
کہ میرا یہ خط میرے فلاں تجویز کردہ اجازت یافتہ کے پاس بھیج کر ان سے تعلیم
حاصل کرنا شروع کردیں۔ جب ان کے تعلیمی خط مع میرے اس خط کے میرے پاس بھیج کر مجھ
سے درخواست بیعت کی جائے گی۔ میں بیعت کرلوں گا۔ چنانچہ جب وہ ایسا کرتے۔ تو آپ انہیں
بلاتامل بیعت فرمالیتے لیکن خط کے ذریعہ بیعت فرماتے۔ محض بیعت کے لئے سفر کرنے کی اجازت
نہ دیتے۔ کیونکہ یہ مقصود خط کے ذریعہ بھی حاصل ہوسکتا ہے۔
جن کو بیعت بلا تعلیم سے مشرف فرمایا جاتا۔ ان کو کسی قسم کی تعلیمی خط وکتابت کی اجازت
نہ دی جاتی۔ البتہ محض طلب دعا اور دریافت خیریت کے لئے خط لکھنے کی اجازت عطا کی جاتی
اور جو اس سے تجاوز کرتا۔ اس کو خود خط کا مسودہ لکھ بھیجتے کہ آئندہ اس طرح خط لکھا جائے
اور میرا مسودہ ہمراہ بھیجا جاوے۔ تاکہ موازنہ ہوسکے کہ اس میں کمی بیشی تو نہیں کی گئی۔
جو حضرات تعلیم بلا بیعت کے خواستگار ہوتے۔ تو حضرت انہیں خوش فہم تصور کرتے۔ کہ
انہوں نے محض بیعت پر محض تعلیم کو ترجیح دی۔ جو اصل مقصود ہے۔ چنانچہ ان کو تعلیمی خط وکتابت

کی اجازت دے دی جاتی۔ لیکن اگر وہ خط وکتابت کے دوران میں فہم وفکر سے کام نہ لیتے۔ اور بے اصول باتیں لکھ کر باعث اذیت ہوتے۔ تو ان کو اپنے کسی خلیفہ مجاز سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت فرماتے۔ اور اس کی اکثر یہ ترتیب ہوتی۔ کہ اول سخت سخت تنبیہات کی جاتیں اگر ان کا اثر نہ ہوتا۔ تو خط لکھنے کی ممانعت کر دی جاتی۔ جب وہ بلاواسطہ یا بواسطہ معافی چاہتا تو اکثر بواسطہ ہی معافی کے بارہ میں تحریر یا تقریر کی اجازت ملتی۔ کیونکہ اس طرح مزید بدعنوانی کا امکان نہ رہتا۔ اور واسطہ کو صرف سفیر بننے کی اجازت ہوتی۔ وکیل بننے کی نہ ہوتی۔ اور ایسے ذی واسطہ کو کوئی مشورہ دینے یا سفارش کرنے کی سخت ممانعت ہوتی۔ ورنہ وہ خود زیر عتاب آجاتا۔ اسلئے کبھی کسی کو ایسی جرأت نہ ہوتی۔ اور جب اس امر کی تسلی ہوجاتی کہ یہ آئندہ اذیت نہ پہنچائیں گے۔ تو انہیں معافی دے دی جاتی۔ اور جن سے یہ توقع نہ ہوتی کہ وہ خط وکتابت میں آئندہ اذیت نہ پہنچائیں گے۔ تو ان کو اس شرط پر معافی دے دیتے کہ آئندہ کے لئے مجھ سے تعلیم حاصل کرنے کا تعلق نہ رکھا جائے۔ مگر اس حالت میں بھی ازراہ خیرخواہی تحریر فرما دیتے کہ اصلاح کرانا بہرحال ضروری ہے۔ اور اس کے لئے کسی دوسرے مصلح کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور اگر کوئی اس کا پتہ پوچھتا۔ تو آپ وہ بھی بتلا دیتے۔

چونکہ یہاں نام کی بیعت نہ ہوتی تھی بلکہ کام کی بیعت ہوتی تھی۔ اس لئے اس میں عجلت گوارا نہ کرتے تھے اور تاخیر اسلئے فرماتے تھے کہ امید بیعت میں طالب اپنی اصلاح اور مناسبت پیدا کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے ورنہ اگر درخواست پر بیعت فوراً کر دیا جائے۔ تو پھر وہ بے فکر ہوجاتا ہے۔ بلکہ اس کے دل میں اس کی وقعت پیدا نہیں ہوتی۔

صاف معاملگی حضرت تھانوی ایسے لوگوں کو ہرگز بیعت نہ فرماتے۔ جن سے قلب میں کسی قسم کا حجاب ہوتا خواہ اختلاف طبائع کی وجہ سے۔ خواہ اختلاف مسلک کے سبب سے یا کسی خاص نوعیت کی وجاہت کے سبب سے۔

بعض اوقات تعلیم وتربیت کے لئے اہل بدعت۔ اہل حدیث۔ اہل قرآن بلکہ قادیانی اور ہندو بھی آپ کے پاس پہنچتے رہے۔ اور بعض خط وکتابت کرتے رہے۔ لیکن حضرت تھانویؒ سب سے اول ہی موقع پر اپنا مسلک اور دستور صاف صاف بیان فرما دیتے اور اظہار حق میں ذرا تامل نہ فرماتے۔ اور غیر مسلم کو نہایت مہذب عنوان سے بلا ادنیٰ دل آزاری فرما دیتے کہ اسکے لئے اسلام شرط اولین ہے۔ تاکہ بعد میں کسی قسم کی خلش فریقین کے دل میں نہ رہے۔

نوابوں کو اور والیان ریاست کو ان کی پیہم درخواستوں کے باوجود بیعت نہ فرماتے اور نہایت لطافت و متانت اور تہذیب و شائستگی کے ساتھ عذر فرما دیتے۔ کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ:۔

"کسی کی تربیت اس وقت تک اپنے ذمہ نہ لینا چاہئے۔ جب تک اپنے دل کو اس سے اتنا کھلا ہوا نہ پائے کہ اگر خود اس کی ذات کو نالائق نہ کہہ سکے۔ تو کم از کم اتنا تو کہہ سکے کہ آپ کی یہ حرکت بڑی نالائق ہے۔ ورنہ پھر اس کی اصلاح کیا ہو سکتی ہے اور پھر اس کو اس سے فائدہ ہی کیا پہنچ سکتا ہے۔"

اس پر ایک اہل خصوصیت و صاحب اجازت نے عرض کیا کہ حضرت پھر ایسے لوگ فیض کس طرح حاصل کریں۔ فرمایا "یہ تو انہیں کے اختیار کی بات ہے۔ وہ برتاؤ ہی ایسا کریں کہ دل کھل جائے۔ کہ جو چاہیں کہہ سکیں۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ برتاؤ سے دل کھل جاتا ہے۔"

گر با ایں ہمہ آپ بعض درویشوں کی طرح امراء و اہل وجاہت کے ساتھ خشونت کا برتاؤ نہ کرتے تھے۔ بلکہ فرماتے تھے کہ اس معاملہ میں میرا معمول یہ ہے کہ میں ان کے ساتھ نہ تو تملق کا برتاؤ کرتا ہوں۔ نہ اہانت کا۔ بلکہ متوسط درجہ کا برتاؤ کرتا ہوں۔ جس میں ان کی امتیازی شان اور حفظ مراتب کی بھی رعایت ہوتی ہے۔ کیونکہ جس برتاؤ کے وہ عادی ہوتے ہیں اور عام طور سے متوقع رہتے ہیں۔ اس کا بھی بقدر ضرورت لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ دل شکنی نہ ہو لیکن اگر ان کی طرف سے کوئی برتاؤ نازیبا ہوتا ہے۔ بالخصوص ایسا برتاؤ جس سے اہل دین کا استخفاف مترشح ہو۔ تو پھر میں ان کی بالکل رعایت نہیں کرتا۔

جو لوگ پہلے کسی صحیح سلسلہ بیعت سے وابستہ ہوتے اور اپنے شیخ کی وفات کے بعد حضرت سے مکرر بیعت ہونا چاہتے۔ تو حضرت انہیں عموماً از سر نو بیعت نہ فرماتے بلکہ فرماتے کہ پچھلی بیعت مع اپنی تمام برکات کے بدستور قائم ہے۔ تجدید بیعت کی حاجت نہیں البتہ تعلیم طریق کے لئے حاضر ہوں۔" اس کے باوجود اگر کوئی اپنی تسلی اور اطمینان کے لئے بیعت پر اصرار کرتا۔ تو آپ پھر انکار بھی نہ فرماتے۔ کیونکہ تجدید بیعت خلاف طریق نہیں۔

انتہائے ادب

اگر کسی ناقص العقیدہ پیر کا مرید پچھلی بیعت کو فسخ کر کے حضرت سے بیعت ہوتا۔ اس کو بھی سخت تاکید فرماتے کہ اپنے پچھلے پیر کی نسبت عمر بھر کوئی گستاخی کا کلمہ زبان پر نہ لانا۔ اگرچہ میں بھی برا کہوں۔ مگر تم مت کہنا۔ کیونکہ اول اول اس نے اس طریق کی طرف متوجہ کیا۔ اور راہ پر ڈالا۔ اسلئے وہ محسن ہے۔ گو راستہ غلط بتایا۔ لیکن مقصود

کا شوق تو اسی نے دلایا۔ اس راہ میں ناشکری بہت ہی مضر ہے۔ یہ طریق بس بالکل ادب
ہی ادب ہے۔ بے ادبی سے بڑھ کر اس طریق میں کوئی چیز مضر نہیں۔ یہاں تک کہ بعض
حیثیتوں سے معصیت بھی اتنی مضر نہیں کیونکہ معصیت کا تعلق ایسی ذات سے ہے۔ جو
انفعال سے پاک ہے اور بے ادبی کا تعلق شیخ سے ہے۔ جو بشر ہے اور جس کو بے
ادبی سے تکدر ہوتا ہے۔ جو مرید کے حق میں سم قاتل ہے۔

حضرت کے ہاں فاسد العقیدہ پیروں کے احتراز کا اتنا اہتمام تھا۔ مگر اُن کے ہاں
حضرت اور ان کے سلسلہ کے اکابر کو بے ہودہ اور فحش گالیاں دینے کا رواج عام تھا اور ہے

حضرت تھانوی حضرت حاجی صاحب کے طریق کے مطابق بیعت کرتے وقت طالبین
کو چاروں سلسلوں میں داخل فرماتے تھے۔ تاکہ سب اکابر طریق سے انتساب ہو جائے اور
سب کی برکات نصیب ہوں۔ چاروں سلسلوں کے بزرگوں سے یکساں اعتقاد رہے اور ایک
سلسلہ کے بزرگوں کو دوسرے سلسلہ کے بزرگوں پر فضیلت نہ دیں۔ کیونکہ آخر اس تفضیل سے
دوسرے بزرگوں کی تنقیص لازم آتی ہے۔ جو ناجائز بھی ہے اور خطرناک بھی۔ کیونکہ بزرگوں کے
ساتھ سوء ظن بسا اوقات سوء خاتمہ کا سبب ہو جاتا ہے۔ ورنہ برکات سے محرومی تو ضرور ہوتی ہے۔

رعایتِ خاص

حضرت تھانوی عورتوں کو یوں تو مسنون طریقہ سے پردہ کی آڑ سے بذریعہ
کسی رومال یا کپڑے کے بیعت فرماتے تھے۔ اور بیعت کرنے کے وقت
اُن کے کسی محرم یا اپنی اہلیہ محترمہ یا اپنی کسی محرم مستورہ کو اپنے پاس بٹھا لیتے تھے۔ اور اس
بات کی بھی تاکید فرما دیتے تھے کہ میں جو کچھ کہتا جاؤں۔ تم بھی وہ چپکے چپکے کہتی جاؤ۔ پکار کر نہ
کہو۔ اور ایسی بڑھیاں جو حضرت سے پردہ نہ کرتی تھیں۔ ان کو بھی بیعت کے وقت پردہ میں
بٹھلا دیا جاتا تھا۔ جس سے اس طریق کے ادب کا تحفظ مقصود تھا۔ مگر ان کے لئے مردوں کی
طرح تنگی نہ فرماتے تھے۔ بلکہ انہیں ذی رائے نہ سمجھ کر فوراً بیعت فرما لیتے تھے۔ اس طرح
مریض کو بھی ازراہ ترحم جلد بیعت کر لیتے تھے۔

تاکیدِ خاص

حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ میں بیعت کے وقت اس سے بھی منع کر دیتا ہوں
کہ کسی سے لڑنا جھگڑنا نہیں۔ کیونکہ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ کم عقل لوگ
لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور اپنے بزرگوں کو گالیاں دلاتے ہیں۔ کیونکہ دو ہی حالتیں ہیں
یا تو وہ اپنے بزرگوں کی تعریف کرے گا۔ تو یہ بھی مجھے پسند نہیں یہ استخواں فروشی ہے۔ کہ

خواہ مخواہ اپنے بزرگوں کی تعریف کراتے پھریں۔ جسے غرض ہوگی۔ وہ خود آکر دیکھ لے گا تمہیں ترغیب دینے کی کیا ضرورت ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ وہ گالیاں دے گا۔ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ ایک مسئلہ کسی کے سامنے بیان کر دیا کہ اس نے ابھی تک تو انہیں کو برا بھلا کہا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے یہ کہہ دیا کہ فلاں بزرگ فرماتے تھے۔ بس اب ان بزرگ پر گالیاں پڑنا شروع ہو گئیں۔ بھلا اس کی کیا ضرورت ہے کہ ایک مخالف کے سامنے اپنے شیخ کا ذکر کیا جائے اور اسے گالیاں دلوائی جائیں۔ اول تو آپ کو جوش ہی کیوں آیا اگر آیا تھا۔ تو اپنی ہی طرف منسوب کئے دیا جاتا۔ یہ بالکل نادانی ہے کہ جوش آپ کو ہو۔ اور نام شیخ کا لیں۔ تاکہ تبرا جو کچھ ہو۔ انہیں پر ہو۔"

ہدیہ

اتباعِ سنت حضرت تھانوی کے ہاں کوئی بات بھی خلاف کتاب و سنت نہ ہوتی تھی بلکہ آپ طبعاً کوئی خلاف شرع بات برداشت کر ہی نہ سکتے تھے کانپور سے واپسی کے بعد آپ نے گو اپنے شیخ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے فرمان کے مطابق توکلاً علی اللہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی۔ مگر یہ توکل بھی اس زمانہ کے مقتضیات کے عین مطابق تھا۔ یعنی آپ سال بھر کا خرچ ہمیشہ اپنے پاس جمع رکھتے تھے۔ کیونکہ آپ کے ارشاد کے مطابق :-

"اس سے اطمینان رہتا ہے۔ حدیث شریف میں بھی ہے کہ حضورؐ ازواج مطہرات کو سال بھر کا خرچ دے دیا کرتے تھے۔ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ سال بھر کا خرچ ذخیرہ کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔"

قلیل ہدایا کی قبولیت اور کثیر ہدایا کا استرداد بھی عین سنت کے مطابق تھا۔ ایک روز مجلس عام میں اس کی علت و حکمت کے متعلق خواجہ عزیز الحسن کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ :-

"ہدیہ قبول کرنے کا طریقہ میں نے ایجاد نہیں کیا۔ یہ بھی دین کا طریقہ ہے۔ الحمد للہ مجھے اس کا بہت خیال رہتا ہے کہ کوئی دستور العمل سنت اور شریعت کے خلاف نہ ہو۔ جو خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے۔ ایک بات میں میرا خیال تھا کہ شاید سنت کے خلاف

ہو۔ وہ یہ کہ اگر کوئی بڑی رقم کا ہدیہ دیتا ہے۔ تو گو دینے والے کی حیثیت سے زیادہ نہ ہو اور خلوص میں بھی کمی نہ ہو۔ لیکن مجھے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اور طبیعت پر بوجھ ایسا ہوتا ہے جس کی وجہ سے واپسی کو جی چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ یہاں کیا عذر شرعی ہے۔ لیکن باوجود عذر سمجھ میں نہ آنے کے چونکہ طبعی بات کی مخالفت مشکل ہوتی ہے۔ اسلئے میں انکار کر دیتا تھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ یہ محض طبعی معذوری ہے۔ سنت میں اس کی اصل نہیں ہے۔ بہت دنوں مجھے یہ شبہ رہا۔ میں اپنے کو اس واپسی میں قاصر سمجھتا تھا۔ مگر واپس کر دیتا تھا۔ لیکن الحمدللہ میرا وہ شبہ جاتا رہا۔ جب سے کہ میں نے ایک حدیث دیکھی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ کوئی خوشبو پیش کرے۔ تو واپس مت کرو۔ کیونکہ اس کا بار کچھ زیادہ نہیں ہوتا اور فرحت کی چیز ہے۔ پس عدم رد کی علت خفیف المحل ہونے کو بتایا الحمدللہ کہ اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ طبیعت پر بوجھ پڑنا بھی ہدیہ کو رد کرنے کا ایک معقول و مشروع عذر ہے۔ میں نے احتیاطاً اوروں سے بھی پوچھا کہ اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ مجھے خیال ہوا کہ کہیں نفس نے ہی یہ مطلب نہ تراشا ہو۔ مگر وہ کہنے لگے کہ اچھی دلالت صاف ہے۔"

مقدارِ ہدیہ آپ فرماتے تھے کہ اہلِ علم کو اموال کے باب میں بہت احتیاط چاہیئے لینے میں بھی اور دینے میں بھی۔ میرے یہاں لینے کے بھی شرائط ہیں کہ ایک دفعہ ایک دن کی آمدنی سے زیادہ ہدیہ نہ دیا جائے۔ مثلاً اگر پندرہ روپیہ ماہوار کا ملازم ہے۔ تو ایک بار میں آٹھ آنہ یومیہ سے زیادہ نہ دے۔ اور دو ہدیوں کے درمیان کم از کم ایک ماہ کا فصل ہو اور پابندی کے ساتھ نہ دے۔"

شرائطِ ہدیہ حضرت تھانوی کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب تک ہدیہ دینے والے کے متعلق آپ کو پورا اطمینان اور شرح صدر نہ ہو جاتا تھا کہ یہ بالکل صدق و اخلاص سے ہدیہ دینے رہا ہے۔ اور یہ میرے متعلق کسی قسم کے دھوکہ میں نہیں ہے اور اس ہدیہ کے قبول کرنے میں کسی دینی یا دنیوی مصلحت میں خلل نہیں پڑتا۔ نہ اس کی۔ نہ میری۔ خواہ وہ گرانی ہی کے درجہ میں ہو۔ اس وقت تک ہدیہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ اور جن پر ان امور کے متعلق پورا پورا اطمینان ہو چکا تھا کہ وہ جو کچھ دیں گے۔ ان سب امور کی رعایت کر کے دیں گے۔ تو ان

کے لئے کوئی قواعد و ضوابط نہیں تھے۔ بلکہ مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ ایسے لوگ تو اگر مجھے اپنا سارا گھر بھی بخش دیں۔ تب بھی انکار نہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ فلاں مقام سے جو بھی آتا ہے۔ کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتا ہے۔ اول تو مجھے اجنبی شخص سے جس سے کہ پوری پوری بے تکلفی نہ ہو۔ ہدیہ لیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے اعتقاد میں مجھے کیا سمجھ رہا ہو۔ اور میں بعد ملاقات کچھ اور ثابت ہوں۔ پھر اس کو اس ہدیہ کا افسوس ہو۔ جیسے ایک شخص نے ایک مسئلہ پوچھا۔ اس کا جواب اس کے مذاق یا خواہش کے خلاف اسے ملا۔ تو کہنے لگا کہ ہم نے اتنے دنوں خدمت کی۔ پھر بھی موقع پر ہماری مدد نہ کی۔

دوسرے جس شخص کو مجھ سے دین کا فائدہ نہ پہنچا ہو۔ اس سے کچھ لینا سخت ذلت کی بات ہے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ گویا میں نے اسے بیعت ہی اس لئے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان لوگوں کے ہدیہ واپس کر دیتا ہوں۔ جو مجھ سے دین کی باتیں نہیں پوچھتے۔ یا اپنی اصلاح نہیں چاہتے کیونکہ سب خرابیوں کی بنا دین سے ناواقفیت اور فکر اصلاح نہ کرنے میں ہے جو دین کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کی دنیا کی سمجھ بھی خراب ہو جاتی ہے۔ اور جو شخص دیندار ہوتا ہے۔ گو اسے دنیا کا تجربہ نہ ہو۔ لیکن دنیاوی امور میں بھی اس کی سمجھ سلیم ہوتی ہے۔ حلال روزی میں بھی یہی اثر ہے۔ برخلاف اس کے حرام روزی سے فہم مسخ ہو جاتا ہے۔ ہاں جو مجھ سے دینی نفع حاصل کرتا رہے۔ وہ اگر کبھی کچھ محبت سے دے۔ تو کس کو انکار ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دینے میں بجز محبت کے اور کوئی نیت نہ ہو۔ یہاں تک کہ ثواب کی بھی نیت نہیں ہونی چاہیئے۔ گو حق تعالیٰ کے تعلق کی وجہ سے ثواب ویسے بھی مل جاتا ہے۔ جیسے اگر کوئی اپنے باپ یا اپنے لڑکے کو کچھ دے۔ تو نیت ثواب کی نہیں ہوتی۔ لیکن ثواب ملتا ہے"

اقسام ہدیہ اسی سلسلہ میں ایک بار فرمایا کہ آج کل جو چیز لوگوں کو بصورت ہدایا دیا جاتا ہے اکثر اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو بغرض دنیا یعنی رشوت۔ دوسرے بغرض ثواب اخروی یعنی صدقہ و خیرات۔ تیسرے کسی امر دینی کی غرض سے مثلاً استفادہ کے سلسلہ میں اس کی اجرت۔ اور میں ان تین قسموں میں سے ایک قسم کا بھی ہدیہ نہیں لیتا۔ البتہ جو محبت سے دیا جاوے۔ وہ لے لیتا ہوں۔ کیونکہ صدقہ لینا تو مجھے بوجہ غنی ہونے کے جائز نہیں اور اجرت امور دینیہ پر لینا بھی جائز نہیں سمجھتا۔ اور رشوت تو سب ہی کے نزدیک حرام ہے۔ جو شخص محبت کی وجہ

سے ہو۔ وہ ہدیہ ہے اور اسی کا قبول کرنا سنت ہے۔ اور دین کی حفاظت بلا اتباع سنت نہیں ہو سکتی۔ ہماری طرف جو لوگوں کی توجہ ہے۔ وہ سب دین کی بدولت ہے۔ اس لئے ہمیں اس دین کی عزت قائم رکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ اگر اس کی عزت نہ رہے۔ تو پھر ہم کو کون پوچھتا ہے۔"

ہدیۂ طلبا اس سلسلہ میں ایک اور مولوی منفعت علی صاحب بی اے۔ ایل ایل بی وکیل سہارنپور نے صاحب اشرف السوانح سے فرمایا کہ میں نے حضرت تھانوی کی خدمت میں بزمانہ طالب علمی جب کبھی ہدیہ پیش کیا۔ تو آپ نے یہ فرما کر واپس کر دیا کہ "ابھی تو تم طالب علمی ہی کر رہے ہو۔ اسلئے سر دست تمہارا مجھ پر حق ہے۔ اگر میں اس طرح ہدایا لینے لگوں۔ تو سونے کی دیواریں کھڑی کر لوں۔" واقعی حق تعالے نے آپ کو جس قسم کی محبوبیت و جاذبیت بخشی تھی۔ جس کی وجہ سے بکثرت ہدایا آتے تھے۔ اگر حضرت ان کو قبول کرنے میں بھی ویسی ہی وسعت دکھلاتے۔ تو بلاخوف تردید کروڑپتی بن جاتے۔

تعلق باللہ مگر وہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ اور تو اور۔ خود اپنے برادر عزیز منشی اکبر علی صاحب کا ہدیہ بھی آپ نے قبول کرنے میں عذر فرما دیا۔ آپ جب کانپور سے تھانہ بھون آکر مقیم ہوئے۔ تو آپ کے برادر موصوف ان دنوں بریلی میونسپلٹی میں بطور سکریٹری ملازم تھے اور قریباً پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ انہوں نے یہ چاہا کہ پچاس روپیہ ماہوار حضرت کو بھیج دیا کریں۔ جو آپ کانپور میں بحیثیت مدرس لیتے تھے۔ اور حضرت کو اپنے اس ارادے سے مطلع کیا۔ تو آپ نے انہیں لکھا کہ :-

> اس کی قبولیت میں ایک خرابی ہے۔ اب تو میری نظر کسی خاص شخص پر نہیں۔ صرف اللہ پر ہے۔ اگر تم نے ماہوار مقرر کر دیا۔ تو پھر دل بریلی ہی میں پڑا رہے گا۔ اور ہر ماہ کے اختتام پر یہ خیال کرنا پڑے گا کہ آج تنخواہ وصول ہوئی ہوگی۔ آج روپیہ روانہ کیا ہوگا۔ آج آرہا ہوگا۔ بروقت نہ آیا۔ تو اور پریشانی بڑھے گی۔ کہ نہ معلوم کیا وجہ ہوئی۔ پھر مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ کی شان تو نہ رہے گی۔ کہ جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہاں سے حق تعالے دیتے ہیں۔ دوسرے یہ برا ماننے کی بات نہیں گو تمہاری تنخواہ ساڑھے چار سو روپیہ رہ جائے گی۔ لیکن ضرورتیں مختلف ہوا کرتی ہیں۔ بعض دفعہ پانچ سو کا خرچ بڑھ جائے گا۔ اس وقت تم گرانی محسوس کروگے۔

کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہر وقت جوشش محبت نہیں رہتا"۔
غرضیکہ حضرت تھانوی کے وسعت کے ساتھ ہدایا قبول کرنے اور ان کے محدود تعدادین قبول کرنے کے لئے اصول وضع کرنے میں اسی تعلق باللہ کو دخل تھا۔ جس کے بعد دنیا کی کسی چیز کی محبت ووقعت دل میں باقی نہیں رہ جاتی۔

تبرکات

امتیازی وصف صاحب اشرف السوانح لکھتے ہیں کہ:-
"چونکہ حضرت والا پر بفضلہ تعالیٰ توحید اور تنزیہ باری تعالیٰ کا بہت غلبہ ہے اور ہر شے کو اسکے درجہ پر رکھنا۔ اور مقصود وغیر مقصود میں فرق کرنا حضرت کا امتیازی وصف ہے جو ایک مجدد اور مصلح اور حکیم الامت میں ہونا لازمی ہے۔ اسلئے تبرکات کے باب میں بھی حضرت کا مذاق نہایت معتدل ہے۔ یعنی ان کی برکت کا انکار نہیں۔ بلکہ بزرگوں کے تبرکات کی برکتوں کے واقعات اپنے بھی اور دوسروں کے بھی مشاہدہ کئے ہوئے اکثر نہایت معتقدانہ طور پر بیان فرماتے رہتے ہیں۔ لیکن جو اصل دولت بزرگوں کے پاس ہے جس نے ان حضرات کو اس قابل بنا دیا کہ اس کی وجہ سے ان کی چیزوں میں بھی برکت پیدا ہو گئی۔ اس دولت کی تحصیل کی جانب خود بھی ہمیشہ نظر رہتی ہے اور دوسروں کو بھی اسی کی تحصیل کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ اور فرماتے رہتے ہیں کہ بزرگوں کے اصل تبرکات تو ان حضرات کے اقوال و اعمال و احوال ہیں۔ ان سے برکت حاصل کرنی چاہیئے"۔

عطیۂ شیخ چنانچہ جب حضرت کے پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے بنہایت شفقت وعنایت اپنا کتب خانہ حضرت تھانوی کو عطا کرنا چاہا۔ تو اس وقت حضرت تھانوی نے نہایت ادب و احترام سے عرض کیا کہ:-
"حضرت کتابوں میں کیا رکھا ہے۔ مجھے تو کچھ اپنے سینہ مبارک سے عطا فرمایئے"
اس پر حضرت حاجی صاحب بہت مسرور ہوئے اور جوش میں آکر فرمایا کہ
"جی ہاں۔ سچ تو یہی ہے کہ کتابوں میں کیا رکھا ہے"۔
حالانکہ کتابوں کا عطیہ دوسرے تبرکات کے مقابلہ میں ہزار درجہ بہتر و نافع تھا۔ مگر حضرت تھانوی

کی نظر کتاب علم پر نہ تھی۔ بلکہ انوارِ علم پر تھی۔ جس کا مصحف پر نہ کتاب پر ہوتا ہے۔

ادب تبرکات جس طرح بزرگوں کی شان میں ادنیٰ بے ادبی بھی موجب محرومی برکات باطنی ہوتی ہے۔ اس طرح ان کے تبرکات کی بے ادبی بھی باطنی محرومی کا باعث ہوتی ہے۔ مگر ان کے ادب میں حاود سے تجاوز کر کے غلو کرنا تو معصیت کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ اسلئے حضرت تھانوی کو اس معاملہ میں اعتقاداً یا عملاً زیادہ شغف نہ تھا۔ یہاں تک کہ ان کا ادب اور ادب میں اعتدال و احتیاط کی نگہداشت ہی بلاخاطر ہوتی تھی۔ اسلئے آپ کے پاس حضرت حاجی صاحب کے جس قدر تبرکات موجود تھے وہ آپ نے ایسوں میں تقسیم کر دئے تھے۔ جن کے متعلق آپ کو یقین تھا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ ان کا ادب کریں گے۔ اور ان تبرکات میں سے صرف حضرت حاجی صاحب کی تعلیمات پر اکتفا کیا اور فرمایا کہ:۔

"اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں پر عمل کی توفیق بخشی۔ تو ظاہری تبرکات کے مقابلہ میں یہ ہزار درجہ بہتر ہیں"

ایک صاحب نے آپ سے سوال کیا کہ شیخ کے تبرک کو پہن کر پاخانہ جانا جائز ہے یا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ:۔

"جائز تو ہے۔ مگر کچھ واجب بھی تو نہیں۔ اور ہر جائز کام کا کرنا ضروری ہی کیا ہے۔ خود میری یہ حالت ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامزد جبہ جلال آباد سے تھانہ بھون آتا ہے۔ تو اگرچہ اس مکان کی طرف جہاں وہ رکھا جاتا ہے۔ پاؤں کرنا جائز ہے۔ مگر غلبۂ ادب کی وجہ سے غالب احوال میں اس طرف پاؤں نہیں کرسکتا"

برکت تبرکات حضرت تھانوی تبرکات کی برکت کے نہ صرف قائل تھے۔ بلکہ اکثر اسے محسوس بھی کرتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"میں برکت کا تو معتقد ہوں۔ لیکن جو آج کل لوگوں نے ان کے متعلق اعتقاد اور عمل میں غلو کر رکھا ہے۔ اس کو ناجائز سمجھتا ہوں"

ایک بہت ہی صالح امی بزرگ حاجی عبداللہ نے جو اول حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت تھے۔ اور پھر خود حضرت سے بیعت ہو گئے۔ حضرت کو ایک بالکل معمولی کپڑے کا روئی دار

عبا بد تیّہ دیا تھا۔ جو حضرت نے خود استعمال کیا۔ اور اس کے متعلق فرمایا کہ :-

"اس کی خود میں نے برکت محسوس کی اور حسّیّاً یا اور بالتجربہ کیا کہ جب تک میں اس کو پہنے رہا معصیت کے وساوس بھی بالکل نہ آتے تھے"

زیارتِ تبرکات

تبرکات کی زیارت کا جس طرح آج کل دستور ہے۔ اس سے حضرت کو سخت نفرت تھی۔ ایک دفعہ میرٹھ میں ایک صاحب سلسلہ شیخ نے حضرت کی موجودگی میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے ایک خرقہ کو مجلس میں ایک ایک کے سامنے پیش کیا۔ تاکہ اس کو چوما جائے۔ اور آنکھوں سے لگایا جائے۔ حالانکہ یہ مروجہ تعظیم و تکریم حضرت کے اپنے ہی پیر و مرشد کے خرقہ کی کی جا رہی تھی۔ مگر پھر بھی حضرت نے فرمایا کہ :-

"مجھ کو ان کا یہ فعل اچھا معلوم نہیں ہوا۔ بلکہ ایک ڈھونگ سا معلوم ہوا ہے"۔

جلال آباد میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامزد جبّہ شریف رکھا ہوا ہے۔ جس کی آپ نے اپنے اکابر سے اس کی تصدیق وجدانی سنی ہوئی تھی۔ اسے لئے حق زیارت تھانہ بھون بھی لایا جاتا تھا۔ اور خدام جبّہ ایک لمحہ کے لئے بھی جبّہ شریف کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ کرتے تھے۔ حضرت نے بھی اس کی زیارت کا شوق ظاہر کیا۔ مگر یہ شرط لگا دی کہ مجھے بالکل تنہائی میں زیارت کا موقع دیا جائے۔ چونکہ ان لوگوں کو حضرت کی خاص طور سے خاطر عزیز تھی۔ اسلئے انھوں نے آپ کو تنہائی میں زیارت کرنے کی اجازت دیدی۔ اور خود وہاں سے ہٹ گئے۔ چنانچہ آپ نے بالکل تنہائی میں نہایت ذوق و شوق سے محظی بالطبع ہو کر خوب اطمینان کے ساتھ زیارت کر کے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس وقت حضرت پر جو کیفیات طاری ہوئی ہوں گی۔ ان کی حضرت کے سوا کسی کو خبر نہ ہو سکی۔

احتیاط و ممانعت

حضرت تھانویؒ نے لوگوں کو اس معاملہ میں غلو اور خلافِ شرع رسوم سے بچانے کے لئے یہ تدبیر کی کہ جب آپ نے اپنے پٹے دار بال کٹوائے تو ان کو حجام کے پاس نہ رہنے دیا۔ تاکہ وہ کہیں ان کو بیچنا نہ شروع کر دے۔ کیونکہ آپ بچشم خود مشاہدہ فرما چکے تھے۔ کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے تبرکات بعض لوگ معتقدین کے ہاتھ بڑی بڑی قیمتوں پر بیچنے پر آمادہ تھے۔ اور پھر ان بالوں کو خاص اہتمام کے ساتھ دفن کرا دیا۔ تاکہ معتقدین کے ہاتھ نہ پڑنے پائیں اور وہ ان کا کوئی ڈھونگ نہ بنا سکیں۔

علاوہ ازیں آپ نے اپنے وصیت نامہ "الاستقصاء للاحتقار" میں یہ وصیت بھی فرمادی کہ میری مستعمل چیزوں کے ساتھ متعارف طریق سے تبرکات کا سا معاملہ نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی محبت سے بطریق شرعی مالک بن کر مخفی طور پر اپنے پاس رکھے۔ تو مضائقہ نہیں۔ مگر اعلان اور دوسروں کو دکھلانے کا اہتمام نہ کیا جائے۔

حصولِ تبرکات حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "بزرگوں کے تبرکات حاصل کرنے کا سہل طریق جس میں ان کو کچھ تردد نہیں کرنا پڑتا۔ یہ ہے کہ اپنی کوئی چیز ان کو عاریتہً دیکر یہ عرض کیا جائے کہ کچھ دیر اس کو استعمال فرما کر واپس فرمادیں۔ میں نے ایک رومی شیخ کو حضرت حاجی صاحبؒ سے اس طرح تبرک حاصل کرتے دیکھا تھا۔ جو مجھ کو بہت پسند آیا تھا۔"

مزید فرمایا کہ "تبرکات بزرگوں کے ہوتے ہیں۔ میں گنہگار اس قابل کہاں کہ مجھ سے تبرکات حاصل کئے جائیں۔ لیکن بعض اپنے حسن ظن اور محبت سے مانگتے ہیں۔ تو اگر اس وقت کوئی چیز نہ ہوئی۔ تو میں ان کو بھی یہی ترکیب بتادیتا ہوں اور یہ صورت مجھے بھی بہت راحت کی کہ اس میں مجھ کو کوئی تردد نہیں کرنا پڑتا۔"

چنانچہ اکثر فہیم خدام ایسا ہی کرتے تھے اور بعض کی درخواست پر حضرت اپنی خاص مستعمل اشیاء بھی مرحمت فرمادیتے تھے۔ نیز چونکہ نوزائیدہ بچوں کے کرتوں کے لئے اکثر حضرت سے کپڑا بطور تبرک مانگا جاتا تھا۔ اسلئے آپ اپنے کہنہ مستعمل کرتوں میں سے ایسے بچوں کے ناپ کے چند چھوٹے چھوٹے کرتے قطع کرا کر ایسے موقعوں کے لئے رکھ لیتے تھے۔ تاکہ وقت پر تردد نہ کرنا پڑے۔ اور درخواست پر فوراً نکال کر دیا جاسکے۔

عملیات

خواصِ قرآنی قرآن پاک میں اس کی مختلف صفات بیان فرمائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک صفت "شفاء" بھی ہے۔ سورۂ یونس کے چھٹے رکوع میں شفاء کے ساتھ لما فی الصدور کا بھی اضافہ فرمایا گیا ہے کہ یہ دلوں کی بیماری کے لئے شفاء ہے مگر آگے سورۂ بنی اسرائیل اور سورہ حم سجدہ میں لفظ مطلق شفا کا آیا ہے کہ

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ ۔ ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں

(بنی اسرائیل ۹/۱۵) جن سے روگ دفع ہوں۔
عام مفسرین نے شفار کی یہ تفسیر کی ہے کہ اس سے روحانی بیماریاں دور ہوتی ہیں دل سے عقائد باطلہ اخلاق ذمیمہ اور شکوک و شبہات کے روگ مٹ کر صحتِ باطنی حاصل ہوتی ہے۔ مگر صاحب "روح المعانی" اور "زاد المعاد" نے اس کا فلسفہ اور تجربہ بیان کر کے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ بسا اوقات اس کی مبارک تاثیر سے بدنی صحت بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ قیصر روم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دردِ سر کی شکایت لکھ بھیجی۔ تو آپؓ نے ایک ٹوپی سلوا کر بھیج دی کہ یہ پہنی جائے۔ جب تک وہ ٹوپی سر پر رہتی درد کو سکون رہتا۔ اور جب اس کو اتار دیتا۔ پھر درد ہونے لگتا۔ اسے تعجب ہوا۔ اور کھول کر اس ٹوپی کو دیکھا۔ تو اس میں صرف بسم اللہ لکھی تھی۔
گو مادہ پرست اوران کا حلقہ اثر قرآن کے الفاظ کی تاثیر کا قائل نہیں مگر مادہ پرستوں کا مورث اعلیٰ ابوجہل اس کا قائل تھا۔ چنانچہ اس نے جب دیکھا کہ محض قرآن کی آیات سننے سے بڑے بڑے ذی مرتبت کفار حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں۔ تو اس نے منادی کرا دی کہ جہاں قرآن پڑھا جا رہا ہو۔ وہاں شور وغل مچاؤ۔ تاکہ اس کی آواز لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ اور انہیں اس سے متاثر ہونے کا کوئی موقعہ نہ ملے۔

مفید خدمت قرآن کے خواص پر بڑے بڑے آئمہ نے اپنے تجربہ کی بنار پر مفید رسائل لکھے ہیں۔ جن میں سے حضرت تھانوی نے

۱۔ امام یافعی شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الدر النظیم جس میں انہوں نے کتاب البرق اللامع تالیف قاضی ابی بکر غسانی اور کتاب خواص آیات و فواتح تالیف امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو یکجا جمع کیا ہے۔ اور
۲۔ شیخ شہاب الدین شرجی یمنی کی کتاب الفوائد فی الصلاۃ العوائد جس کے حاشیہ پر امام محمد شیرازی الشافعی الشرقاوی کا رسالہ بر فوائد الغرالاسنے فی شرح اسماء حسنیٰ درج تھا کو.... عوام کے لئے مفید پا کر ان کا ترجمہ کر کے "اعمالِ قرآنی" کے نام سے اردو میں منتقل کیا جن کا مقصد صرف عامۃ المسلمین کو خواص قرآنی کے متعلق اکابر سلف کے تجربات سے مطلع کرنا اور پیشہ ور پیروں کے ہتھکنڈوں خلافِ شرع اور غیر معتبر باتوں سے بچانا تھا اور بس۔

ارشادِ مرشد حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ العزیز نے آپ کو تاکید فرمائی تھی کہ اگر لوگ

تعویذ مانگنے آئیں۔ تو جو کچھ اس وقت سمجھ میں آیا کرے۔ لکھ کر دیدیا کریں۔ اسلئے حضرت تھانوی اپنے شیخ کے ارشاد کی تعمیل میں معمولی شکایات۔ درد سر۔ بخار۔ نظر وغیرہ کے تعویذ اسی طرح لکھ کر دے دیتے تھے۔ عاملوں کی قیود کا لحاظ نہ کرتے تھے۔ اور نہ ہی خاص عملیات کی پابندی کرتے تھے۔ بلکہ اکثر اوقات تو کوئی مناسب حال آیت یا حدیث یا دعا لکھ دیتے تھے۔ جو عین وقت پر خیال میں آجاتی تھی اور بفضلہ تعالیٰ بالعموم مقصد برادی ہو جاتی تھی۔

گرانی طبع مگر ذاتی طور پر حضرت تھانوی تعویذ گنڈوں کے شغل کو بہت ہی ناپسند فرماتے تھے کیونکہ

۱۔ ان کے طالب زیادہ تر دنیادار ہوتے ہیں۔ جو دنیوی اغراض کے لئے حاصل کرتے ہیں۔ جس سے صرف وقت ہی ضائع نہیں ہوتا۔ دینی ضرر بھی ہوتا ہے۔

۲۔ لوگ ان کو تدابیر سے زیادہ نافع اور دعا سے زیادہ مؤثر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا سمجھنا خلاف سنت ہے۔

۳۔ جن کے تعویذ گنڈے مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ لوگ انہیں صاحب کرامات بزرگ سمجھنے لگتے ہیں۔

۔ اس گرانی طبع کی وجہ سے حضرت عام طور پر تعویذ نہیں دیا کرتے تھے۔ جبکہ تو بالکل نہ دیتے تھے تاکہ ضرورت مندوں کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی طلب نہ کرنے لگیں۔ ویسے بھی تحریری یا زبانی درخواست پر ایک سے زائد تعویذ نہ دیتے تھے۔ اگر آپ سے کوئی آسیب یا سحر وغیرہ کے لئے تعویذ مانگتا۔ تو آپ عام طور پر یہ کہہ کر انکار فرما دیتے تھے کہ میں عامل نہیں مگر از راہ شفقت یہ بھی فرما دیتے تھے کہ اگر کسی عامل کا مجھ سے پتہ پوچھا جائے تو وہ بتا دونگا چنانچہ جو پتہ پوچھتا۔ اسے بتا دیتے۔ جو عامل ہونے کے انکار کے باوجود تعویذ مانگنے پر اصرار کرتا۔ تو اسے اس شرط پر تعویذ عطا فرماتے کہ "اگر اثر نہ ہو۔ تو پھر مجھ سے درخواست نہ کی جائے۔ کیونکہ میں عامل نہیں ہوں کہ اگر ایک تعویذ سے نفع نہ ہوا۔ تو دوسرا لکھ دوں"۔ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت نے جب بھی کچھ لکھ کر دیا۔ اس کا فوری اثر ہوا۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے فلسفی نے بھی اپنی کتاب "حکیم الامت" میں اس کا بڑی حیرت کے ساتھ اعتراف کیا ہے باایں ہمہ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دو صفحہ کا مضمون لکھنا اتنا گراں نہیں گذرتا۔ جتنا دو سطروں کا تعویذ لکھنا۔

مواقعِ انکار غیر مباح کاموں کے لئے آپ قطعاً تعویذ نہیں دیتے تھے۔ بلکہ جہاں کسی مفسدہ کا احتمال بھی ہوتا۔ وہاں آپ انکار فرما دیتے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک صاحب نے اپنی درخواست تعویذ میں لکھا کہ ایک نوجوان نادروقی النسل اپنے تمام رشتہ داروں کی مرضی اور دستورِ خاندان کے خلاف تیموری نسل کی ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جس کے تمام رشتہ دار بجز اس کی والدہ کے اس پیوند سے ناراض ہیں۔ اس کا حضرت نے یہ جواب لکھا کہ:۔

"اتنا قائل ہے کہ تفریق وہاں جائز ہے۔ جہاں اتفاق حرام ہو۔ کیا کسی عورت سے نکاح کرنا حرام ہے۔ جو تنافر کی تدبیر کی جائے۔ اگر اس جزو میں مجھ کو مطمئن کردیا جائے۔ تو تعویذ لکھ دونگا"

اسی طرح ایک صاحب نے اپنی تشویشات بیان کر کے کچھ پڑھنے کو پوچھا۔ تو فرمایا کہ تشویشات کا علاج پڑھنا نہیں بلکہ تدابیر اختیار کرنا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کوئی تدبیر ہی بتا دیجئے۔ تو فرمایا کہ ہر تشویش کی تدبیر جدا ہے۔ جب کوئی خاص تشویش پیش آئے تو اس کے متعلق دریافت کیا جائے۔

اگر کوئی طالب حزب البحر یا دلائل الخیرات یا اس قسم کے بزرگوں کے دوسرے اوراد و احزاب پڑھنے کی اجازت طلب کرتا تو آپ اس سے پہلے اس کی غرض دریافت فرماتے اگر وہ لکھتا کہ اسے دنیوی حاجات کے لئے بطور عمل کے معمول بنانا ہے تو صاف لکھ دیتے کہ میں عامل نہیں ہوں۔ اگر کوئی زیادہ ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے یہ لکھتا کہ مقصود قرب و رضائے حق ہے۔ تو تحریر فرماتے کہ اُن دعاؤں سے پہلے قربِ حق کا کوئی طریقہ نہ تھا؟ اگر نہیں تھا۔ تو جن بزرگوں سے یہ دعائیں منقول ہیں۔ ان کو قربِ حق کس طرح حاصل ہوا؟ جو وہ اس قابل ہو گئے کہ ان پر یہ دعائیں الہام کی گئیں؟ لہذا تم بھی انہی کا طریقہ کیوں نہیں اختیار کرتے کہ ویسے ہو جاؤ"

غرضیکہ آپ حتی الوسع اس باب میں بھی اعتقادی غلو کی اصلاح فرمانے کی کوشش میں رہتے تاکہ آئندہ کے لئے اچھی طرح مستاصل ہو جائے۔ اور لوگ عملیات و تعویذات کے پیچھے نہ پڑے رہیں۔

قوتِ متخیلہ آپ عملیات کے اثر کو زیادہ تر قوتِ متخیلہ کا اثر قرار دیتے تھے۔ جن دنوں آپ کانپور میں پڑھاتے تھے۔ انہی دنوں وہاں طلسمی انگوٹھی اور روحوں کو بلانے کا بڑا چرچا تھا۔ جب آپ نے یہ واقعات سنے تو آپ کو بہت حیرت ہوئی۔ اور خود یہ واقعہ دیکھنا چاہا چنانچہ

اس واقعہ کے راوی کو کہا گیا کہ ان لوگوں کو یہاں بلا لاوے تاکہ ہم بھی مشاہدہ کر سکیں چنانچہ جب
یہ عمل کرنے والے آ گئے۔ تو آپ نے مدرسہ میں ان کے عمل کرانے کو خلاف مصلحت سمجھا۔ اور
ایک علیحدہ مکان میں اس عمل کو دیکھنا تجویز ہوا۔ اس وقت تین عامل۔ مدرسہ کے مہتمم حضرت
تھانوی اور ایک مدرس جو ایسی باتوں کے قطعاً قائل ہی نہ تھے۔ موجود تھے۔ میز پر ان عاملوں
نے عمل کیا۔ دونوں ہاتھوں کو رگڑ کر انہوں نے میز پر رکھا اور ذرا ادھر توجہ کی تو تھوڑی دیر
بعد میز کا ایک پایہ خود بخود اٹھا۔ انہوں نے کہا کہ لیجئے جناب روح آ گئی ہے انہوں نے پوچھا
کہ تمہارا کیا نام ہے معلوم ہوا کہ تجمل حسین ہے۔ کوئی آواز تو نہ تھی۔ البتہ کچھ اصطلاحیں مقرر تھیں
ان سے سوالات کے جوابات معلوم ہو جاتے تھے۔ اب ان لوگوں نے مشہور اہل ہوئی کے
لڑکے کی روح کو بلانا چاہا۔ اور اس تجمل حسین سے کہا کہ اس کی روح کو بلا لاؤ۔ اور جب جانے
لگو۔ تو فلاں پایہ کو اٹھاتے جانا۔ اور جب واپس آنا۔ تو واپسی کی اطلاع فلاں پایہ کو اٹھا
کر دینا۔ چنانچہ فوراً پہلے وہ پایا اٹھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ روح کو بلانے چلا گیا ہے تھوڑی
دیر کے بعد دوسرا پایا اٹھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس شخص کی روح آ گئی ہے۔ اب ایسی
ہی اصطلاحوں میں اس اہل ہوئی کے لڑکے سے سوالات کرنے شروع کئے۔ پوچھا کہ تم
نے جمہور کے مذہب کو حق پایا یا اپنے مذہب کو؟ جواب ملا کہ جمہور کے مذہب کو۔ پوچھا کہ
تم اتباع ہوی کی وجہ سے سزا بھگت رہے ہو یا سزا نہیں دی گئی۔ جواب ملا کہ سزا دی جا
رہی ہے۔ میں عذاب میں مبتلا ہوں۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ بڑی حیرت میں تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ان لوگوں نے
مجھ سے فرمائش کی کہ اب آپ جس شخص کی روح کو بلانا چاہیں۔ بلوا لیں۔ ملاں کی دوڑ مسجد
تک میں نے حضرت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی روح کو بلایا۔ وہی تجمل حسین سب روحوں
کو بلا یا کر لاتا تھا۔ چنانچہ جب حضرت حافظ صاحب تشریف لائے تو میں نے السلام علیکم کیا
اصطلاح میں جواب ملا کہ وعلیکم السلام۔ جب حضرت مجلس میں یہ واقعہ بیان فرما رہے تھے۔ تو
اس وقت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب نے حضرت سے سوال کیا کہ کیا حضور کو یقین ہو
گیا تھا کہ یہ حضرت حافظ صاحب کی روح ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ جی ہیں بالکل خالی الذہن
تھا۔ نہ اعتقاد تھا اور نہ اس مشاہدہ کی تکذیب کی کوئی دلیل ذہن میں آتی تھی۔ حیرت میں تھا
کہ یا اللہ کیا معاملہ ہے۔ سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں نے مجھ

سے کہا کہ آپ حضرت حافظ کا کلام پڑھئے۔ ان کی روح خوش ہوگی۔ چنانچہ میں نے شروع کی غزل الایا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا پڑھی۔ میز کا پایا بار بار اور جلدی جلدی اُٹھنے لگا گویا حضرت حافظ صاحب کی روح وجد کر رہی ہے۔ ہم لوگ بڑے متعجب تھے اور کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اتنے میں نماز مغرب کا وقت ہوگیا۔ ہم نماز پڑھنے کے لئے اُٹھے اور آپس میں گفتگو کی کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ اخیر میں یہ رائے قرار پائی کہ یہ سب کرشمے قوت خیالیہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ اب یہ کرنا چاہیئے کہ جب وہ عمل کرنے لگیں۔ تو ہم تینوں یہ خیال کر کے بیٹھ جائیں کہ پایہ نہ اُٹھے۔ مہتمم صاحب بولے کہ وہ لوگ مشاق ہیں۔ ہم لوگوں کا خیال ان کے مقابلہ میں کیا کام کرسکتا ہے۔ میں نے کہا کہ تم ابھی سے ضعیف نہ ہو۔ نہیں تو کچھ بھی نہ ہوسکے گا۔ یہی سمجھنا چاہیئے کہ ان کے خیال کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ ہمارا خیال ضرور غالب آئے گا۔ امتحان تو کرنا چاہیئے۔

چنانچہ ہم لوگ یہ مشورہ کر کے بعد نماز مغرب پھر پہنچے۔ اور ان سے کہا کہ اب کی مرتبہ پھر وہ عمل دکھلاؤ۔ انہوں نے پھر عمل کرنا شروع کیا۔ ادھر ہم تینوں یہ خیال جما کر بیٹھ گئے کہ پایہ نہ اُٹھے۔ انہوں نے بہتیرا زور لگایا۔ مگر پایہ نہ اُٹھا جس سے وہ بڑے شرمندہ ہوئے اب تو ہماری بڑی ہمت بندھی۔ اور مجھ کو یقین ہوگیا کہ یہ سب قوت خیالیہ کے ہی کرشمے ہیں اس پر میں اُٹھ کر چلا آیا۔"

دوسرے روز حضرت نے اُن ہمراہیوں کی مدد سے خود اس کا تجربہ کیا اور کامیاب رہے اور اس طرح اس عمل کی ساری حقیقت کھل گئی۔ (حضرت کے اس تجربہ اور دوسرے تجربات کا مفصل حال "حسن العزیز" جلد اول کے ملفوظ نمبر ۱۳۵ میں مفصل درج ہے۔ جسے شوق ہو وہاں سے دیکھ لے) حضرت نے فرمایا کہ قوتِ متخیلہ ایسی چیز ہے کہ اگر اس سے کام لیا جائے۔ تو بہت سے واقعات صحیح نکل آتے ہیں۔ جس کی تائید میں حضرت نے بعض واقعات بھی بیان فرمائے۔ جو اسی ملفوظ کے اندر موجود ہیں۔

تصرفات اسی سلسلہ میں آپ نے ایک استفسار پر فرمایا کہ سالکین کو جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں بھی بعض امور قوتِ خیالیہ کے تصرف سے ہوتے ہیں مثلاً سلب مرض یا کشف قبور وغیرہ یا بعضے انوار و اصوات وغیرہ گو کتاب ضیاء القلوب میں بحیثیت فن بعض تصرفات کی ترکیبیں بھی لکھی ہیں لیکن انہیں بہت ناپسند فرماتے تھے۔ کیونکہ ان میں ایک صورت

دعویٰ کی سی ہوتی ہے ۔ نیز عوام کو ان کے باکمال ہونے کا ایہام ہوتا ہے ۔ پھر اہل باطل کے لوگ معتقد ہونے لگتے ہیں ۔ کیونکہ ان کے لئے بزرگی کی ضرورت نہیں ۔ بلکہ فاسق فاجر یہاں تک کہ کفار جوگی بھی مشق سے یہ قوت حاصل کر سکتے ہیں ۔ اسلئے ان میں بڑا نقصہ ہے ۔ پھر تصرفات شانِ عبدیت کے بھی خلاف ہیں ۔ ان تصرفات کے وقت حق تعالیٰ کی طرف اتنی توجہ نہیں رہتی ۔ جس قدر غیر حق کی طرف ہوتی ہے اور وہ بھی قصداً ۔ مجھ کو تو اس سے بڑی غیرت آتی ہے ۔ اس لئے توجہ متعارف یا تصور شیخ سے مجھ کو بہت ہی انقباض ہے یہ وجدان کی بات ہے ۔ گو میں اس کو جائز سمجھتا ہوں ۔ لیکن ذوقاً نفرت ہے ۔ جیسے اوجھڑی کھانا گو جائز ہے ۔ لیکن بعض طبیعتیں اس کو قبول نہیں کرتیں (ملفوظ نمبر ۱۲۸ حسن العزیز جلد دل)

توجہ متعارف فرمایا کہ توجہ متعارف اور تصور شیخ میں بھی ایک غیرت پیدا ہوتی ہے کہ جو توجہ تام کہ حق تعالیٰ کا حق ہے ۔ دوسری طرف اس کو متصرف کرنا نہایت ناگوار معلوم ہوتا ہے گو ہر وقت توجہ الی الحق کی بھی توفیق نہیں ہوتی ۔ لیکن قصداً تو دوسری طرف ایسی توجہ اچھی نہیں لگتی ۔ جو خاص حق تعالیٰ کا حق ہے ۔

ایک اور موقعہ پر یوں فرمایا کہ توجہ کے دو درجے ہیں ایک درجہ تو غیر اختیاری ہے وہ یہ کہ دل چاہتا ہے کہ فلاں شخص میں ذوق و شوق ۔ محبت حق ۔ خوف خدا وغیرہ پیدا ہو جائے اس کے واسطے دعا کر دے ۔ تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں ۔ دوسرا درجہ توجہ کا متعارف مصطلح ہے وہ یہ کہ شیخ اپنے قلب کو سب خطرات سے خالی کر کے خاص توجہ کرتا ہے ۔ اس میں تصور بقصد تصرف ہوتا ہے ۔ یہ گو جائز ہے مگر ذوقاً پسند نہیں ۔ اس میں فاعل قوت برقیہ ہوتی ہے جو انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے ۔ جیسا کہ زمین میں بھی یہ قوت بہت ہے سنا ہے بے تار برقی کے جو خبر پہنچتی ہے وہ بھی اس کے ذریعہ سے پہنچائی جاتی ہے ۔ نظر لگنے میں بھی اسی کا اثر ہوتا ہے مسمریزم ، توجہ متعارف کا نشا روا خذ ایک ہے ایک بری جگہ صرف ہوتا ہے اور ایک اچھی جگہ صرف کی جاتی ہے ۔ صرف اتنا فرق ہے اور یہ مشق پر موقوف ہے اسلئے مشق کی جاتی ہے کہ دوسروں پر نسبت کا القاء کریں گے ۔ بعض مشائخ کے ہاں اس سے بہت کام لیا جاتا ہے ۔ مگر اس کا نفع باقی نہیں رہتا ۔ طالب کیفیت کو نفع سمجھ کر اس کو کافی جانتا ہے ۔ اسلئے کام چھوڑ دیتا ہے اس میں چند مفاسد ہیں اول تو سنت میں منقول نہیں ۔ دوسرے اس سے اکثر کو کام میں سستی ہونے لگتی ہے بس مسنون طریقہ اصلاح کا وعظ ، نصیحت ۔ دعا ہے اور توجہ تام حق تعالیٰ کا حق ہے ۔
(کمالات اشرفیہ صفحہ ۱۶۶)

مکاتبت

خدمتِ خلق خدمتِ خلق بڑی چیز ہے۔ بلکہ ایک بہت بڑی عبادت ہے۔ دوسروں کی راحت کے لیے خود تکلیفیں برداشت کرنا آسان نہیں۔ ہر دور میں ملک کے اندر بڑے بڑے عظیم الشان ادارے سرگرمِ عمل رہے ہیں۔ مگر خدمتِ خلق کا شعبہ صحیح معنوں میں کہیں بھی دکھلائی نہیں دیتا۔ حضرت تھانوی نے اپنی تمام زندگی خدمتِ خلق کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ مگر اس معاملہ میں اتنی احتیاط اور اتنا خیال ضرور رکھتے تھے کہ دوسروں کی خدمت کرتے کرتے کہیں اپنے حقوق جان کا نقصان یا حق تلفی نہ ہو۔ اس کے ساتھ اس بات کا بھی اہتمام رکھتے تھے کہ تمام تر توجہ ایک ہی طرف نہ لگی رہے۔ بلکہ سب کاموں کے لیے تھوڑا تھوڑا وقت نکالتے تھے تاکہ کوئی کام ادھورا نہ رہ جائے۔ اس لیے آپ فرمایا کرتے تھے کہ:-

"اگر کوئی عمر بھر بھی مجھ سے خدمت لیتا رہے۔ تو میں نہایت خوشی کے ساتھ حاضر ہوں۔ کیونکہ میرا تو کام ہی یہی ہے کہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت کروں۔ جتنی بھی ہو سکے اور جیسی بھی ہو سکے۔ بشرطیکہ طریقہ سے خدمت لی جائے۔ اور صرف وہی کام مجھ سے لیا جائے۔ جو میرے کرنے کا ہو۔ اور جو خود کر سکیں اس کو خود کیا جائے۔ سارا بوجھ مجھ پر نہ ڈالا جائے۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے سب کے کام ہو جائیں کیونکہ سبھی کا حق ہے۔ اگر میں ایک ہی کام کر لے بیٹھوں۔ تو دوسروں کے کام یوں ہی پڑے رہیں گے۔"

شرائطِ مکاتبت اس لیے آپ نے خط و کتابت کرنے والوں کے لیے اپنے تجربہ کی بنا پر چند اصول مقرر کر رکھے تھے۔ تاکہ سب کا کام حصہ رسدی ہوتا چلا جائے اور اگر آپ کے ہاں یہ اصول و قاعدے مقرر نہ ہوتے تو آپ کبھی بھی روزانہ اوسطاً چالیس پچاس خطوط کے جواب نہ دے سکتے۔ اور نہ ہی دوسرے ضروری امور کی طرف توجہ فرما سکتے۔ آپ نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ:-

۱۔ ایک خط میں مختلف النوع مضامین نہ لکھے جائیں۔ یعنی مسائل فقہیہ اور احوال و مسائل سلوک کا ایک ہی خط میں جمع کرنا آپ کو گوارا نہ تھا۔ ایک تو مختلف مضامین کے جواب دینے میں

خلجان ہوتا تھا۔ دوسرے یہ اندازہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اصل مقصود کس مضمون کا جواب حاصل کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے اس سلسلہ میں بوجہ ناداری استثنے کی درخواست کی کہ بار بار خط بھیجنے کے لئے ہمارے پاس پیسے نہیں تو حضرت نے انہیں لکھا کہ:۔

"اول تو مواقع استثنار کو میں یاد کیسے رکھ سکتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ جب مستثنیٰ کرنا شروع کر دیا۔ تو وہ قاعدہ قاعدہ ہی کیا رہے گا۔ اور جس ضرورت و مصلحت سے وہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے۔ وہ کب پوری ہو گی۔ اسلئے یہ تو گوارا نہیں۔ لیکن اگر ناداری ہے۔ تو اس غرض خاص کے لئے چندہ جمع کیا جائے اور اسمیں میں بھی خوشی کے ساتھ شریک ہوں گا"

چنانچہ حضرت تھانوی نے اس بارہ میں اصول تو نہ توڑا۔ مگر ایسے لوگوں کی اس سلسلہ میں برابر مالی اعانت فرماتے رہے تاکہ بوجہ ناداری وہ محروم نہ رہیں۔

۲۔ خط عبارت کے تصنع و تکلف سے پاک ہو۔ کیونکہ اس طرح تلبیس کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے۔ اور کاتب کے مافی الضمیر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مزید براں ایسے خطوط سے زیادہ تر مقصود محض اظہار لیاقت ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض حضرات بلا ضرورت آپ کو عربی میں خط لکھ دیتے تھے۔ تو آپ جواب عربی میں لکھنے کی بجائے اردو میں ہی یہ تحریر فرما دیتے کہ:۔

"میں تو بے تکلف عربی عبارت لکھنے پر قادر نہیں۔ اور آپ ماشاءاللہ قادر ہیں اسلئے آپ مجھ سے اکمل ہوئے۔ لہذا اکمل کو ناقص سے رجوع نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ کسی کامل سے رجوع کیجئے"

اس طرح ایک دوسرے عربی خط کے جواب میں لکھا کہ:۔

"افادہ کی شرط مفید کا مستفید سے اکمل ہونا ہے۔ آپ عربی لکھتے ہیں گو غلط لکھتے ہیں میں غلط بھی نہیں لکھتا۔ پس آپ اکمل ٹھہرے۔ اور شرط مفقود ہوئی۔ اس لئے مشروط بھی مفقود ہوا"

البتہ عرب ممالک سے جو خطوط عربی میں آتے تھے۔ ان کا جواب آپ عربی میں ہی دیتے تھے کیونکہ وہ ان کی مادری زبان تھی۔ وہاں تصنع و تکلف کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

۳۔ طالبین خطوط میں اشعار نہ لکھیں۔ کیونکہ آپ اپنے بڑے کے سامنے اشعار پڑھنا یا اسکو اشعار لکھنا...... خلاف تہذیب و ادب سمجھتے تھے لیکن مغلوب الحال یا ہم عصر و ہم مکتب و ہم مشرب

حضرات کے لئے یہ پابندی نہ تھی۔

۴۔ زیادہ تعظیمی الفاظ بھی نہ لکھے جائیں۔ کہ یہ بھی تکلف میں داخل ہے۔ ایک مرتبہ ایک ذی وجاہت وکیل نے لکھا کہ میں تو حضرت والا کے دربار کا ادنیٰ غلام ہوں۔ آپ نے انہیں اس لطیف و جامع جواب میں آئندہ کے لئے ایسا نہ لکھنے کی تنبیہ فرمائی کہ:۔

"ایسے الفاظ سے اگر مجھ میں کبر ہوا۔ تو میرا مرض بڑھتا ہے۔ اور اگر تواضع ہوئی۔ تو تنگی ہوتی ہے۔ بہرحال اس میں ضرر ہی ہے۔ بدنی یا نفسانی"

انہی وکیل صاحب کے خط میں دوسرا فقرہ یہ تھا کہ افسوس میرا پہلا خط جو میں نے بڑے شوق سے لکھا تھا گم ہو گیا اور آپ کو نہیں ملا۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔ اس پر یہ تنبیہ تحریر فرمائی کہ

"مجھ کو مسلمان کے منہ سے بدقسمتی کا اقرار اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مسلمان تو بدقسمت ہوتا ہی نہیں۔ مثلاً اس واقعہ میں آپ کا خط گم ہوا۔ آپ کو قلق ہوا اور اس پر آپ کو اجر ملا۔ تو یہ خوش قسمتی ہوئی یا بدقسمتی۔ البتہ جو معاصی اختیار یہ ہیں۔ ان کو خسارہ سے تعبیر کر سکتے ہیں"

انہی وکیل صاحب نے یہ بھی لکھا کہ حضوری میں جناب عالی سے مرعوب ہوں اور غائبی میں کتابت سے قلم ترساں۔ اس پر آپ نے لکھا کہ:۔

"ان خیالات کو دل میں نہ آنے دیجئے۔ بلا رعایت کسی خاص قاعدہ و ضابطہ کے بے تکلف جو دل میں آئے لکھئے۔ بس اتنا خیال رہے کہ ایک تو واقعہ صاف لکھا جائے۔ تکلف یا عبارت آرائی نہ ہو۔ دوسرے بلا ضرورت طول نہ ہو۔ تیسرے ایک خط میں متعدد مضامین نہ ہوں۔ لیکن اگر ان میں ارتباط ہو۔ تو وہ ایک ہی مضمون شمار ہو گا"

انگریزی روشنائی والے خطوط بھی آپ پسند نہ فرماتے تھے۔ کیونکہ ان میں سپرٹ کی آمیزش ہوتی ہے۔ اسلئے اگر کوئی ایسا خط نماز کے وقت جیب میں ہوتا۔ تو آپ اسے نکال کر الگ رکھ لیتے تھے۔ مزید براں گیلے ہاتھ ہونے کی وجہ سے ہاتھ پر اس کا رنگ چڑھ جاتا ہے اور پسینہ کی صورت میں جیب میں ایسے خط ہونے سے کپڑے داغدار ہو جاتے ہیں۔

حصول جواب جواب خط کے لئے لازمی تھا کہ جوابی خط بھیجا جائے۔ خود حضرت تھانوی اگر اپنے کسی جان نثار کو بھی خط لکھتے تو جواب طلب امور کے لئے جوابی خط ہی لکھتے۔ اور فرماتے جب میری ہی غرض ہے۔ تو ان پر خواہ مخواہ کیوں محصول ڈاک کا بار

ڈالا جائے۔ اسی طرح جو طالب اپنے سوال کے ساتھ جواب کے لئے لفافہ ہمراہ نہ بھیجتا۔ اسے جواب نہ دیتے۔

یہ بھی لازمی تھا کہ جوابی لفافہ پر اپنا نام و پورا پتہ صاف لکھا ہوا ہو۔ بغیر پتہ لکھے جواب کے لئے لفافہ ڈالتے ہیں یہ قباحت ہوتی کہ بسا اوقات جواب دینے والے کا پتہ معلوم ہوتا یا اس وقت بھولا ہوا ہوتا۔ یا جو پتہ یاد ہوتا۔ وہ بدل چکا ہوتا ہے۔ یا نقل کرتے وقت غلطی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے جواب دیر سے پہنچتا ہے یا بالکل ہی نہیں پہنچتا۔

اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ جواب کے لئے ٹکٹ نہ بھیجے جائیں۔ کیونکہ وہ بھی موجب اذیت ہوتے تھے۔ بسا اوقات لفافہ کھولتے وقت گر جاتے تھے۔ بسا اوقات کثرتِ مشاغل اور ہجوم خطوط کی وجہ سے یاد نہیں رہتا تھا کہ اس خط کے جواب کے ٹکٹ کہاں رکھے تھے۔ اور اگر کوئی ٹکٹ گر پڑتا اور بعد میں مل جاتا۔ تو سب خطوط کی پڑتال کرنی پڑتی کہ یہ کس لفافہ کا ٹکٹ ہوگا۔ اگر پھر بھی پتہ نہ چلتا۔ تو کچھ عرصہ امانت رکھ کر پھر مصارف خیر میں صرف کر دیا جاتا اس طرح نہ صرف وقت ضائع ہوتا بلکہ پریشانی بھی اٹھانی پڑتی۔

رسید طلبی اگر کوئی خط بذریعہ "رجسٹری بہ واپسی رسید" بھیجتا۔ اور قرائن سے معلوم ہو جاتا کہ یہ کسی جھگڑے کا معاملہ ہے۔ جس کی وجہ سے بھیجنے والا رسید طلب کرتا ہے تاکہ مرسل الیہ خط پانے سے انکار نہ کر سکے۔ تو واپس کر دیتے اور فرماتے کہ رسید تو وہاں طلب کی جاتی ہے۔ جہاں یہ احتمال ہو کہ مرسل الیہ خط پانے سے انکار کر دے گا جس کا حاصل یہ ہوا کہ مرسل کو مرسل الیہ کے کاذب ہونے کا احتمال ہے، جو بلا دلیل شرعی معصیت ہے نیز اس سے مرسل کا مقصود بھی حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مقصود تو یہ ہے کہ مرسل الیہ اس کے خاص مضمون پہنچنے کا انکار نہ کر سکے۔ لیکن رسید صرف اس بات کو ظاہر کرے گی کہ کوئی خط پہنچا مگر اس کو ظاہر نہیں کر سکتی کہ کس مضمون کا خط پہنچا۔ لہٰذا ہر حال میں رسید طلب کرنا ایک فضول حرکت ہے۔ رہی حفاظت۔ وہ غیر جوابی رجسٹری سے بھی ہو سکتی ہے۔"

ویسے جہاں مذکورالصدر شبہ نہ ہوتا وہاں جوابی رجسٹری کبھی وصول کر لیتے۔ مگر جوابی رجسٹری بھیجنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔

منی آرڈر منی آرڈر کے کوپن پہ اگر کوئی مضمون تحریر نہ ہوتا۔ یا مبہم مضمون ہوتا۔ جس سے بھیجی ہوئی رقم کا مصرف یا کوئی اور ضروری جزو صاف طور پر واضح نہ ہوتا۔ تو اس پر بیب

لکھ کر واپس فرما دیتے۔ اگر کوپن پر صرف اتنا لکھا ہوتا کہ اس رقم کے متعلق الگ خط لکھا گیا ہے تب بھی اسے وصول نہ فرماتے۔ کیونکہ اگر خط کے انتظار میں رقم وصول کر لیتے اور پھر خط کے مضمون سے وہ رقم قابل واپسی سمجھتے۔ تو اسے امانت رکھتے اور پھر واپسی بھیجنے میں بڑی دقت ہوتی۔

بیمہ یا رجسٹری اس طرح اگر کوئی رقم بذریعہ بیمہ یا رجسٹری بھیجتا اور اس کی تفصیل سے پہلے آگاہ نہ کرتا۔ تو بجز اطمینان کے مواقع کے اس کو بھی واپس فرما دیتے۔ کیونکہ یہ امر ظاہر یا واضح نہ ہوتا۔ کہ وہ رقم قابل وصولی بھی ہے یا نہ۔

چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ منی آرڈر یا بیمہ کے ذریعہ آئی ہوئی رقم جو واپس جاتی اور پھر اس کے مرسل کی طرف سے وضاحتی خط آتا۔ تو اس کا کوئی نہ کوئی جزو ضرور ایسا نکلتا۔ جو نا قابل قبول ہوتا۔ جس کی مثال باب اخلاق میں بضمن استغنا گذر چکی ہے جو بڑے بڑے بیمے یا منی آرڈر خلاف اصول ہونے کی وجہ سے واپس بھیج دیئے جاتے۔ اور وہی رقوم اصول کے مطابق ہو کر موصول ہوتیں۔ تو اس وقت حضرت فرمایا کرتے کہ دیکھئے جو آنے والی چیز ہوتی ہے وہ آ کر ہی رہتی ہے چاہے اس کو لاکھ واپس کیا جائے۔ پھر کیوں نیت خراب کی جائے اور خلاف اصول کا ارتکاب کیا جائے۔

جواب رسائل آپ فرماتے تھے کہ لوگ بڑے بڑے رسالے بھیج دیتے ہیں کہ ان کا جواب لکھو۔ میں یہ لکھ دیتا ہوں کہ میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ سب کا یکجائی جواب لکھوں وہاں آپ یہ کریں کہ پہلے ایسے مقامات منتخب کر لیں جو آپ کے نزدیک محتاج جواب ہوں پھر اُن مقامات میں سے ایک خط میں صرف ایک مقام میرے پاس بھیجا کریں۔ جب اس کا جواب پہنچ جائے اور وہ طے ہو جائے۔ خواہ ایک ہی خط میں یا متعدد خطوط میں۔ تو پھر اسی طرح دوسرا مقام بھیج کر اس کا جواب حاصل کر لیں۔ اسی طرح برابر مجھ سے خدمت لیتے جائیں۔ اور جب سب مقامات کا جواب ہو جائے۔ تو اس کو جمع کر کے شائع کر دیں۔"

اس سلسلہ میں آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ لوگوں کو دوسرے پر بوجھ ڈال دینا تو آسان ہے۔ لیکن جب خود ان کو کچھ کام کرنے کو کہا جاتا ہے۔ تو پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں کو مذکورہ بالا طریقہ بتلایا۔ لیکن چونکہ اس میں خود بھی ان کو کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ اسلئے بیٹھ رہے۔ البتہ ایک صاحب نے اس اطلاع کے بعد ایک رسالہ کا صرف ایک مقام حل کرایا۔ پھر وہ بھی بیٹھ رہے۔ انہوں نے

فرقہ بہائیہ کے شبہات کے جوابات چاہیے تھے۔ ان لوگوں نے یہی لکھ دیا۔ کہ ایک ایک شبہ پیش کیا۔ اور اس کو اپنی طرف منسوب کیا جاوے۔ نہ کہ کسی دوسرے کی طرف سے۔ کیونکہ میں غائب سے کیسے خطاب کر سکتا ہوں۔

چنانچہ انہوں نے ایک بار شبہ لکھ کر بھیجا۔ میں نے اس کا جواب لکھ دیا۔ اور میں اپنی طرف سے اس سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ اور اس کے جوابات کو جداگانہ نقل بھی کرا لیا (کیونکہ جو جواب یا مضمون باہر جاتا تھا۔ اس کی نقل رکھ لی جاتی تھی) تاکہ آئندہ کے لئے جوابات کو مسلسل نقل کراتا رہوں۔ لیکن ان کا بھی بس ایک ہی خط آ کر رہ گیا۔ اور اتنا التزام بھی ان سے نہ نبھ سکا۔"

تحفظِ حقوق

حقوق العباد حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حق العبد میں محض بندہ ہی کا حق ہوتا ہے۔ حق تعالے کا حق نہیں ہوتا۔ یہ غلط ہے۔ کیونکہ بندہ کا وہ حق اللہ تعالیٰ ہی نے تو مقرر فرمایا ہے۔ مثلاً حکم دیا ہے کہ مظلوم کی امداد کرو۔ کسی مسلمان کی غیبت نہ کرو۔ کسی کو ایذا نہ دو۔ تو جب ان احکام کے خلاف کسی کو ایذا دی جاوے گی۔ تو جیسے بندہ کا حق فوت کیا۔ ویسے ہی حق تعالے کا بھی حق فوت کیا کہ ان کے حکم کی مخالفت کی۔ اس لئے حقوق العباد تلف کرنے میں محض بندوں کی معافی کافی نہیں۔ بلکہ حق تعالے سے بھی توبہ و استغفار لازمی ہے گو عام حقوق العباد میں بندہ کی معافی کے بعد حق تعالے اکثر اپنا حق بھی معاف کر دیتے ہیں۔ مگر بعض اوقات محبوبانِ خاص کی حق تلفی میں ان کی معافی کے بعد بھی حق تعالے اپنا حق معاف نہیں فرماتے۔ بلکہ مواخذہ ضرور ہوتا ہے۔" (کمالات اشرفیہ صـ۱۶)

یہ اسی تحقیقِ لطیف کا نتیجہ تھا کہ حضرت تھانوی کو تحفظ حقوق کا غایت درجہ اہتمام تھا اور معاملات میں ہمیشہ احکام شرعیہ اور جزئیات فقہیہ تا مقدور دقیقہ کو ہر وقت پیش نظر رکھتے تھے اور مالی معاملات میں احتیاط انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ جو سب کے نزدیک واجب العمل ہونے کے باوجود قابل اعتنا نہیں۔

پابندیٔ شریعت ایک مرتبہ ایک صاحب نے ایک معتد بہ رقم مصارف خیر کے سلسلہ میں حضرت

تھانوی کی خدمت میں روانہ کی اور لکھا کہ میں بہت بیمار ہوں یہاں تک کہ صحت سے مایوسی ہے مگر اس میں وصیت کا کہیں ذکر نہ تھا۔ اسلئے حضرت تھانوی نے مصارف خیر کے لئے بھی رقم کی وصولی کو حد شرعی کے اندر لانے کے لئے ان کو شرعی وصیت کا ایک مضمون لکھ کر روانہ کیا۔ کہ وہ اس پر اپنے دستخط کر کے واپس بھیج دیں۔ تاکہ وصیت شرعاً بھی ہو جائے۔ چونکہ انہوں نے وہ رقم بہ نیت وصیت ہی بھیجی تھی۔ اس لئے انہوں نے بلا تامل اس مضمون پر دستخط کر کے حضرت کی خدمت میں بھیج دیا۔ ورنہ حضرت اس بات کا تہیہ کر چکے تھے۔ کہ اگر اس پر دستخط نہ ہوئے تو یہ رقم واپس کر دی جائے گی۔

حجتِ شرعی

اسی طرح جب حضرت کے ایک نہایت ہی مخلص اور متمول خادم مجاز حاجی محمد یوسف رنگونی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا۔ تو ان کے ورثاء نے ایک کثیر رقم حضرت کی خدمت میں اس وصیت کی بنا پر روانہ کی۔ جو مرحوم نے حضرت کے نام تحریر فرما دی تھی۔ لیکن حضرت نے تحریر فرمایا کہ چونکہ مرحوم کے بعض ورثاء نابالغ ہیں۔ اسلئے اگر یہ وصیت کسی شرعی حجت سے ثابت ہو۔ تب تو وہ نابالغ ورثاء کے مقابلہ میں شرعاً نافذ ہو سکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔ لہذا وہاں کے علماء کے سامنے شرعی حجت پیش کر کے اور ان پر یہ بھی ظاہر کر کے کہ وہ وصیت نامہ کس کس کے سامنے لکھا گیا یا حاجی صاحب نے کس کس کے سامنے تحریر کرنے کا اقرار کیا۔ اور کس کس کے پاس رہا اور کہاں کہاں رہا ان سے باقاعدہ فتویٰ حاصل کیا جائے اور پھر وہ فتویٰ میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر میرے نزدیک بھی وہ حجت شرعاً کافی ہوگی۔ تو وصیت کردہ رقم بخوشی قبول کر لوں گا۔ ورنہ عذر کر دوں گا۔ چنانچہ وہاں سے باقاعدہ فتویٰ مکمل حجت شرعی کے ساتھ جب آیا۔ اور حضرت کو بھی اس پر پورا اطمینان ہو گیا۔ تب وہ رقم قبول فرمائی۔

کمالِ احتیاط

وصیت کردہ رقم کے علاوہ حاجی صاحب مرحوم نے ایک کثیر رقم ایک خاص مصرف خیر کے لئے حضرت کے پاس امانت رکھی ہوئی تھی۔ جو حضرت نے ان کی ہدایات کے مطابق صرف فرمائی تھی۔ چونکہ اس کے مصرف میں لانے سے قبل ہی صاحب خیرات انتقال فرما چکے تھے۔ اسلئے اب ان کا اس رقم پر کوئی حق شرعی باقی نہ رہا تھا۔ بلکہ یہ رقم اب ورثاء کا ترکہ ہو چکی تھی۔ اس لئے حضرت نے وہ رقم ان کے ورثاء کو واپس بھیج دی اور اس رقم کی واپسی کی نسبت پہلے دریافت کرنا اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ مبادا وہ از راہ

مروت واپس کرنے کی ممانعت کردی۔ برخلاف اس کے اب ان کو آزادی تھی۔ کہ اب جو چاہیں اس کے متعلق رائے قائم کریں۔ چونکہ ان کے ورثار بھی باشاء اللہ دیندار تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی یہ کہا کہ اس رقم کو بالغ ورثار نے اپنے حصہ میں لگا کر اور نابالغوں کے حصہ کا عوض ان کو اپنے پاس سے دے کر واپس بھیج دیا کہ اسی مصرف خیر میں بدستور صرف کی جاوے۔ چونکہ اب کوئی عذر شرعی باقی نہ رہا تھا۔ اسلئے حضرت نے وہ رقم بخوشی قبول کرکے اس مصرف خیر میں صرف فرما دی۔

بے نظیر مثال حضرت کے خلیفہ حکیم نور احمد صاحب کانپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مرض الموت میں اپنے تین مکان بذریعہ تحریری وصیت حضرت کے نام تملیک کرکے اس کی باضابطہ رجسٹری کرادی۔ حضرت تھانوی چونکہ ان ایام میں تھانہ بھون رہتے تھے۔ اس لئے ان کو اس واقعہ کا کوئی علم نہ تھا۔ اور نہ وہ بوجہ بُعدِ مسافت اور تنگی وقت حضرت کو اس امر سے آگاہ کرسکے۔ جب حضرت کو کانپور جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں پہنچ کر یہ واقعہ بھی معلوم ہوا۔ چونکہ حقوق العباد کا معاملہ تھا۔ اسلئے حضرت نے بڑے اہتمام سے مرحوم کے ورثار کی بابت تحقیق کی۔ تو معلوم ہوا کہ انہوں نے کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ البتہ یہ سنا کہ ان کے کوئی عزیز تھے۔ جو مفقود الخبر ہیں۔

علتِ تملیک پر جب حضرت نے غور فرمایا تو وہ ذوقاً اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر مرحوم کو گنجائش ملتی تو وہ کسی وارث کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ رقم مصارفِ خیر میں ہی وقف کرتے۔ لیکن چونکہ ان کو کوئی قابلِ اعتماد آدمی نہ ملا۔ اس لئے ان کو خیال ہوا کہ میرے نام وصیت لکھ دیں۔ کہ وہ ان مکانات کی آمدنی مصارفِ خیر میں صرف کریں گے۔ حالانکہ اس امر کی تائید میں وصیت نامہ میں ایک حرف بھی موجود نہ تھا بلکہ انہوں نے وہ مکان مطلق تملیک کئے تھے جنہیں اپنے مصرف میں لے لینے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ مگر حضرت کے تقویٰ و استغنار سے یہ برداشت نہ ہوسکا۔ اور آپ نے غایت احتیاط کی بنا پر وہ تینوں مکان اپنی ملک میں رکھنے کی بجائے اس شرط کے ساتھ یتیم خانہ کانپور کے نام وقف کرکے رجسٹری کرادیئے کہ

"مرحوم کے کسی شرعی وارث کی مجھ کو تحقیق نہیں ہوئی۔ سو اگر واقع میں ایسا ہی ہے تب تو یہ مکانات کل وقف ہیں اور اگر کوئی شرعی وارث حجتِ شرعیہ کے موافق ثابت ہو جائے۔ تو اگر وہ اس وقف کو جائز رکھے اور شرعاً جائز رکھنے کی شرائط

کا پایا جانا ضروری ہے، تب بھی کل وقف ہے۔ اور اگر وہ جائز نہ رکھے یا اس کا جائز رکھنا کسی عارض کے سبب جائز نہ ہو۔ تو مجموعہ مکانات کا ایک ثلث وقف ہے۔ اور دو ثلث اس وارث کا حق ہے اور اب سے لے کر اس کی میراث شرعی ملنے تک حساب سے جو کچھ اس وقف کی آمدنی ہو۔ اس کا دو ثلث بھی اس وارث کو واپس کیا جائے۔ اور اگر وقف مذکور کی آمدنی میں اس وقت اس قدر رقم موجود نہ ہو۔ تو اس دو ثلث کی آمدنی کو بقیہ ایک ثلث کی آمدنی سے اول پورا کیا جاوے۔ اس کے بعد مصارف تعمیم خانہ میں صرف کیا جاوے۔"

جب یہ وقف نامہ بغرض رجسٹری پیش ہوا تو اس کو دیکھ کر سب رجسٹرار بڑا ہی متاثر ہوا۔ اور بے حد تحسین کی کہ اس سے قبل اس قسم کا وقف اور ایسا وقف نامہ جو مختصراً مگر واضح اور ہر پہلو سے مکمل ہو۔ میں نے نہیں دیکھا۔ حالانکہ حضرت قانون دان نہ تھے۔

اعلانِ عام آپ نے صرف یہ وقف نامہ رجسٹری کرا دینے اور وارث کے حقوق کا تحفظ کا بندوبست کر دینے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اس امر کے متعلق مفصل اعلان رسالہ "تنبیہات وصیت" کے ضمیمہ خامسہ تتمہ سابعہ کے مضمون رابع میں بھی شائع فرمایا تا کہ:۔

الف۔ کسی طرح مرحوم کے مفقود الخبر عزیز کو اس بات کا علم ہو جائے۔ یا

ب۔ ممکن ہے ان کا کوئی اور شرعی وارث موجود ہو۔ تو وہ باخبر ہو جائے۔ نیز کہ

ج۔ میرا کوئی وارث رائج الوقت انگریزی قانون کی بنا پر اس کا دعویٰ نہ کر بیٹھے۔

اس سلسلہ میں مزید احتیاط و اہتمام یہ کیا کہ:۔

"اس وقف نامہ کی رجسٹری عدالت کا پنیدرکا پورا پتہ لکھے دیتا ہوں تا کہ حقدار کو حاجت کے وقت اس کی نقل لینا سہل ہو جائے۔ جو یہ ہے:۔

۲۱ مارچ ۱۹۲۳ء۔ بہی نمبر ا جلد ۱۰۵ صفحات ۲۹۷ - ۲۹۸ - دستاویز نمبر ۱۳۹۔ فقط"

استحقاقِ شرعی اگر کسی رقم کے متعلق حضرت کو یہ علم ہو جاتا کہ اس کے وصول کرنے سے قبل بھیجنے والے کا انتقال ہو چکا ہے۔ تو اس کو بھی واپس فرما دیتے تھے۔ کیونکہ موہوب کی ملک ہونے کے لئے محض روانگی رقم کافی نہیں۔ بلکہ قبضہ شرط ہے۔ اور یہاں چونکہ وہ رقم بھیجنے والے کے انتقال کے بعد وصول ہوئی۔ اور قبل انتقال یعنی اس وقت جبکہ وہ رقم معطی کی ملک تھی۔ حضرت کا قبضہ اس پر نہیں ہوا تھا۔ اسلئے شرعاً وہ رقم وصول ہو جانے کے باوجود

حضرت کی ملکیت نہ ہوتی تھی۔ بلکہ وارثوں کی ہی ملک رہتی تھی۔ اسلیئے ایسے واپس فرمادیتے تھے اور اگر بیمہ یا منی آرڈر پہنچنے کے قبل بھیجنے والے کے انتقال کی خبر مل جاتی تو اس کو وصول نہ فرماتے۔ اسی طرح اگر کسی رقم کے دوران صرف میں اس کے بھیجنے والے کے انتقال کا علم ہوتا تو فوراً اس کا خرچ کرنا روک دیتے۔ اور بقیہ رقم کے متعلق خصوصیت کے محل پر تو اطلاع کرکے استفسار فرمالیتے۔ اگر جواب ہر پہلو سے اطمینان بخش ہوتا۔ تو اس پر عمل فرماتے۔ ورنہ بقیہ رقم واپس کردیتے۔ اور بلا خصوصیت کے مواقع پر تو استفسار کئے بغیر ہی واپس کردیتے۔

غرضیکہ جتنی احتیاط حضرت ایسے معاملہ میں فرماتے تھے اس کی مثال اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔

حق مساکین حضرت کے ایما پر خانقاہ تھانہ بھون میں روزانہ بعد عصر ختم خواجگان پڑھا جاتا تھا۔ جس میں خانقاہ میں رہنے والے مساکین بھی بعض شرائط مناسبہ پر شریک ہوتے تھے اور اس میں دعا مانگی جاتی تھی۔ جو صاحب اپنی دنیوی مباح حاجات کے لیئے مدعی دعا ہوتے تو اعانت مساکین کے لیئے انہیں ایک آنہ یومیہ اس غرض کے لیئے جمع کرانا پڑتا تھا کیونکہ عملیات اور رقی پر اجرت لینا شرعاً جائز ہے۔ اور مساکین وظیفہ ختم ہونے کے بعد روزانہ ان کی مطلوبہ حاجت کے لیئے ان کا نام لے لے کر دعا کرتے تھے۔ اس طرح جو رقم وصول ہوتی۔ وہ سب شرکاء وظیفہ کو حصہ رسدی تقسیم کردی جاتی تھی۔

اگر کوئی بلا اجرت دعا کرانا چاہتا۔ تو سات دن تک اس کے لیئے مفت دعا کی جاتی تھی۔ اور دینی امور کے لیئے دعا کرانے والوں سے کوئی رقم قبول نہ کی جاتی تھی۔ کیونکہ ایسی دعا دین ہے اور باستثناء "مواقع مذکورہ کتب فقہ" دین پر اجرت لینا جائز نہیں۔

اس طرح اگر کوئی مریض صحت کی دعا کے لیئے کوئی رقم بھیجتا اور اس رقم کے ختم ہونے سے قبل اس کا انتقال ہوجاتا۔ تو فوراً اس کی بقایا رقم کی تقسیم بند کرادیتے تھے۔ اور بقیہ رقم اسکے ورثاء کو واپس بھیج دی جاتی تھی۔ اگر ورثاء یہ چاہتے کہ بقیہ رقم میں مرحوم کے لیئے دعائے مغفرت کی جائے تو انکار فرمادیا جاتا کیونکہ دعا مغفرت پر اجرت لینا جائز نہیں۔

اگر کوئی متمول شخص ایک آنہ یومیہ سے زائد بھیجنا چاہتا۔ تو زائد رقم قبول نہ کی جاتی تھی چنانچہ ایک دفعہ ایک والی ملک نے اور ایک ولیعہد نے اس غرض کے لیئے زائد رقم بھیجنی چاہی۔ مگر حضرت نے انکار فرمادیا۔ اور ایک آنہ یومیہ کے حساب سے ہی رقم وصول کی اور سبب

اول الذکر کو کامیابی نصیب ہوئی۔ تو انہوں نے مساکین کی دعوت و پارچات کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ روانہ کئے۔ جو حضرت نے قبول کر کے مستحقین میں تقسیم کر دئیے۔
غرضیکہ ایسی احتیاط، صفائی معاملات اور حفظِ حقوق کا اہتمام آپ کو کہیں بھی نظر نہ آئیگا جس کا اعتراف خود حضرت کے مخالفین کو بھی تھا۔

دیانت و شرافت

نظامِ قدرت نظامِ قدرت تکوینیاً اس بات کا متقاضی تھے کہ جب تک یہ نظامِ عالم قائم رہے۔ خیر و شر کی قوتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں۔ تاکہ اس معرکۂ حق و باطل میں لوگوں کی فہم و فراست اور علم و عمل کا امتحان ہوتا رہے۔ کہ وہ اہلِ حق کے ساتھ صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں یا اہلِ باطل کی معیت میں راہِ ضلالت اختیار کرتے ہیں۔

اس ابتلاء و امتحان کے لئے نظامِ تکوینی کے تحت ہر زمانہ میں بالفاظِ قرآن "شیاطین والانس کی جماعت بھی جاتی رہی۔ جس کا کام انبیاء علیہم السلام پر اعتراضات کرنا اور لوگوں کو ان کی پیروی سے روکنے کے لئے دھوکا اور فریب دینا بنایا گیا ہے :-

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (انعام ۱۱۲)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان یعنی شریر آدمیوں اور جنوں کو پیدا کیا۔ جن میں سے بعض دوسروں کو ملمع کی ہوئی باتیں فریب دینے کیلئے سکھاتے ہیں

لازمی بات ہے کہ جب کوئی کسی پر ناحق تہمت لگاتا ہے یا جھوٹ بولتا ہے تو اسے رنج ہوتا ہے اور اس رنج کی بناء پر غصہ آتا ہے جس سے بسا اوقات بڑی بڑی خرابیاں۔ فتنے اور فساد رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے حق تعالےٰ نے متذکرہ بالا خبر کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ہدایت و تلقین فرمائی کہ شیاطین الجن والانس کی جماعت دانستہ پیدا کی گئی ہے اس کی باتوں کی طرف ہرگز التفات نہ کیا جائے۔ نہ اس سے مناظرہ و مباحثہ کیا جائے بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اپنے فریضہ کی طرف توجہ دی جائے۔ کیونکہ ہدایت دینا میرا

کام ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں ہے کہ
وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ۔
اور اگر اللہ چاہتا۔ تو ایسا نہ کرسکتے۔ سو ان لوگوں کو اور جو کچھ یہ افترا پردازی کر رہے ہیں ان کے حال پر رہنے دیجئے۔
(الانعام ۱۴۲/۸)۔

باب نبوۃ بند ہونے کے بعد یہ جماعت ورثۃ الانبیاء یعنی اولیاء و علماء کے درپے آزار ہوگئی اور تا قیام قیامت اس طرح مصروفِ عمل رہے گی۔

وہابی ایٹم

زمانہ ماسبق میں اس جماعت کے پاس علماء راسخین اور اتقیاء صالحین کے خلاف استعمال کرنے کے لئے صرف ایک ہی ہتھیار "تیرِ تکفیر" تھا جس کی مدد سے یہ اہل اللہ کی محبوبیت و مقبولیت گھٹانے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر یہ اہلِ حق کے لئے اس کی حسب خواہش ایٹم بم کی طرح تباہ کن ثابت نہ ہوا تھا۔ فرقہ وہابیہ کے معرضِ وجود میں آنے سے اس جماعت کی بہت سی مشکلات آسان ہوگئیں۔ اور اس نے اہلِ حق کو مٹانے اور ان کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لئے وہابیت کا ایٹم بم چلانا شروع کر دیا۔ جس کی "ہلاکت آفرینی" کا حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اپنے "نقش حیات" میں یوں اعتراف کرتے ہیں :۔

"عوام میں اس قدر نفرت نام وہابی سے پھیلائی گئی۔ کہ شرک و کفر۔ عیسائیت و یہودیت ہندویت و بت پرستی سے مسلم عوام کو اتنی نفرت نہیں ہوتی۔ جتنی کہ وہابیت سے ہوئی۔ مجھ کو بخوبی یاد ہے کہ غالباً ۱۹۲۵ء یا اسی کے قریب زمانہ میں پنجاب کے اخباروں میں ایک واقعہ چھپا تھا۔ کہ کسی گاؤں کا امام وہاں کے ایک ہندو بنئے کا مقروض تھا۔ قرضہ بڑھ گیا تھا۔ بنئے نے تقاضا کیا۔ اور آئندہ قرض دینا بند کر دیا۔ امام صاحب نے اس کو سمجھایا۔ مگر وہ بنیا نہ مانا۔ اور کہا کہ جب تک پہلا قرضہ ادا نہ کر دو۔ میں تم کو کچھ قرض نہ دوں گا۔ امام صاحب دھمکی دے کر چلے گئے۔ اور مسجد میں بعد نماز جمعہ اعلان کر دیا کہ فلاں بنیا وہابی ہو گیا ہے۔ اس سے کسی قسم کا معاملہ خرید و فروخت آمد و رفت کا جائز نہیں ہے۔ تمام باشندگان دیہہ نے بنیا کا بائیکاٹ کر دیا۔ بنیا بیچارہ دن بھر دکان پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تھا۔ اور کوئی آدمی اس کی دکان پر نہ آتا تھا۔ اس نے بعض لوگوں سے پوچھا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ امام صاحب

فرماتے ہیں۔ کہ تو وہابی ہوگیا ہے۔ اس لئے ہم تم سے لین دین نہیں کرسکتے بالآخر اس بنیئے نے جا کر امام صاحب سے صلح کرلی۔ تو امام صاحب نے لگے ہاتھ اعلان کردیا کہ بنیئے نے وہابیت سے توبہ کرلی ہے۔ اب لین دین جاری کردو۔ چنانچہ بازار کھل گیا۔ خیال کیجئے۔ کہ بنیئے کا ہندو اور بت پرست مشرک ہونا تو لین دین میں خارج نہ تھا۔ مگر وہابی ہونا خارج ہوگیا۔ (صفحہ ۱۲۴-۱۲۵)

بریلوی حملہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اصلاحی جہاد سے چونکہ ارباب بدعت کے ایوان اقتدار میں ایک زلزلہ سا آگیا تھا۔ اور ان کے حلقوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی اسلئے بریلویوں کے اعلیٰ حضرت مولوی احمد رضا خانصاحب نے حضرت تھانویؒ کی روز افزوں محبوبیت و مقبولیت اور آپ کے تجدیدی کارناموں کی اہمیت و افادیت کو مٹانے کے لئے یہ چال چلی کہ حضرت تھانویؒ کے رسالہ "حفظ الایمان" کے دو فقروں اور آپ کے اکابر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہم اللہ تعالیٰ کی بعض تحریروں کو سیاق و سباق سے الگ کرکے اور ان کا حلیہ بگاڑ کر ایک رسالہ "حسام الحرمین علی منحر اہل الکفر والمین" کے نام سے ان حضرات کے خلاف مرتب کیا۔ اور لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے اور ان حضرات کے خلاف نفرت پھیلانے کی غرض سے اولاً حضرات کو اس رسالہ میں وہابی ظاہر کیا۔ اور بعدہٗ ان کی مسخ کردہ تحریروں کو پیش کرکے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ اور بڑے دجل و فریب سے اس پر علمائے عرب کے دستخط بھی حاصل کر لئے۔ علماء حرم چونکہ پہلے سے ہی وہابیوں کے زخم خوردہ تھے۔ اور ان حضرات کی اصل کتابوں سے جو اردو میں تھیں اور جن کے حوالہ جات اس رسالہ میں درج تھے۔ واقف نہ تھے۔ اسلئے وہ وہابیت کے فریب میں جلد آگئے اور رسالہ حسام الحرمین پر اصل کتب دیکھے بغیر محض مولوی احمد رضا خانصاحب کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے فتویٰ کفر کی تصدیق کرکے اس پر دستخط ثبت کردئے۔ علماء حرم کو مولوی احمد رضا خانصاحب نے کس طرح فریب دیا۔ اس کی تفصیل حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے "نقش حیات" اور ان کے رسالہ "الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب" یا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنی کے رسالہ "المہند علی المفند" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس فتویٰ کفر کے اجراء سے ملک کے سنجیدہ طبقہ کو بہت ہی صدمہ پہنچا۔ بعض مقامات پر فتنہ و فساد بھی ہوا۔ بعض حضرات پر امید لگائے بیٹھے تھے کہ اس کی تردید میں دربار اشرفیہ سے

کوئی ملا اعلان شائع ہوگا۔ مگر حضرت تھانوی نے مذکورالصدر احکام قرآنی کے تحت اس جماعت
کی افترا پردازیوں کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہ دی۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ لوگ اس شرانگیزی
کے لئے فطرتاً مجبور اور روز ازل سے مامور ہیں۔

میدان سے فرار ایسے سنگین فتویٰ کے اجرا پر حضرت تھانوی کی خاموشی نے ایک
طرف تو آپ کے مخالفین و معاندین کو زیادہ شرانگیزی کا موقع
دیا۔ دوسری طرف نافہم لوگ یہ سمجھنے لگے کہ شاید یہ حضرات ان اعتراضات کا جواب
دینے سے عاجز ہیں۔ اس پر حضرت مولانا مرتضٰے حسن صاحب چاندپوری نے مولوی
احمد رضا خاں کے اتہامات کا معقول جواب شائع کیا۔ جس کی تردید کی اس ساری
جماعت کو آج تک ہمت نہ ہوئی۔ مگر اس نے اپنی خفت مٹانے کیلئے یہ عذر کیا کہ

"مولوی اشرف علی تھانوی جن کی ہار جیت علمائے دیوبند و دہلی کی ہار جیت ہوگی
ہم سے مناظرہ کریں یا ہماری تحریروں کا جواب دیں۔ مولوی مرتضٰے حسن ہمارے
مخاطب نہیں۔"

گو اب حضرت تھانوی ایسے مناظروں کو پسند نہ کرتے تھے مگر اتمام حجت کے لئے آپ
تحریری و تقریری کے لئے تیار ہو گئے۔ بلند شہر میں مناظرہ ٹھہرا۔ آپ نے مولوی احمد رضا خاں صاحب
کو اپنے دستخطی لکھ بھیجا کہ میں آپ سے مناظرہ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر آپ کو منظور ہو تو مطلع
فرمایئے۔ مگر مولوی احمد رضا خاں صاحب تو صاف چھوڑ بیٹھے۔ اور حضرت تھانوی کو خط کا جواب دینے
کی بجائے منتظمین مناظرہ کو ایک بے سروپا خط لکھ مارا۔ اور مناظرہ سے پہلوتہی کی مگر
متلاشیانِ حق نے مولوی احمد رضا خاں کو پیچھا چھڑانے کی اجازت نہ دی۔ اور بالآخر
مرادآباد میں حضرت تھانوی اور مولوی احمد رضا خاں کا مناظرہ قرار پایا۔ چونکہ حکومت انگریزی
وقتاً فوقتاً سیاسی اغراض اور انتشار پیدا کرنے کے لئے اس جماعت کا تعاون حاصل
کرتی رہتی تھی۔ اس لئے اسے اس کی از حد خاطر مطلوب تھی۔ اور آڑے وقتوں میں وہی
ان لوگوں کو اپنے "سایہ عاطفت" میں پناہ دیتی تھی۔ جب مولوی احمد رضا خاں صاحب اور ان کی
جماعت نے دیکھا کہ دیوبندی کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تو انہوں نے چالاکی سے پولیس
میں اطلاع کر دی کہ اہل دیوبند فساد کرانے آئے ہیں۔ جس پر حکومت نے مناظرہ کی ممانعت
کر کے مولوی احمد رضا خاں کو مناظرہ کی مصیبت سے بچا لیا۔ اور اس طرح انہوں نے خیالات

کے سامنے آنے کی بجائے راہِ فرار اختیار کی۔ اس سلسلہ میں جو خط وکتابت اور اشتہار واعلان شائع ہوئے۔ ان کی تفصیل رسالہ "قاھمۃ الظہر فی بلدہ شہر" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے

انکشافِ حقیقت جماعتِ بریلویہ کے اعلیٰ حضرت کی اس گریز پائی نے اگرچہ ان کے دجل وفریب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا تھا۔ اور ان کے کذب وافترا کی قلعی کھل گئی تھی۔ مگر متنبہین کی ابھی تک تسلی نہ ہوئی تھی۔ اس لئے مولانا سید مرتضےٰ حسن صاحب چاندپوری نے بڑی دانائی سے کام لیتے ہوئے انکشافِ حقیقت کے لئے حضرت تھانوی کی خدمت میں مندرجہ ذیل استفسار نامہ بھیجا:۔

"بخدمت اقدس حضرت مولانا المولوی الحافظ الحاج الشاہ اشرف علی صاحب فیوضکم العالیہ

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی یہ بیان کرتے ہیں اور حسام الحرمین میں آپ کی نسبت لکھتے ہیں کہ آپ نے "حفظ الایمان" میں اس کی تصریح کی کہ غیب کی باتوں کا علم جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ ایسا ہر بچے اور پاگل بلکہ ہر جانور اور چارپائے کو حاصل ہے اسلئے امور ذیل دریافت طلب ہیں:۔

۱۔ آیا آپ نے "حفظ الایمان" میں یا کسی کتاب میں ایسی تصریح کی ہے؟

۲۔ اگر تصریح نہیں۔ تو بطریق لزوم بھی یہ مضمون آپ کی کسی عبارت سے نکل سکتا ہے؟

۳۔ آیا ایسا مضمون آپ کی مراد ہے؟

۴۔ اگر آپ نے نہ ایسے مضمون کی تصریح فرمائی نہ اشارۃً مفادِ عبارت ہے نہ آپ کا مراد ہے۔ تو ایسے شخص کو جو یہ اعتقاد رکھے یا صراحۃً یا اشارۃً کہے۔ اُسے آپ مسلمان سمجھتے ہیں یا کافر؟

بندہ محمد مرتضےٰ حسن عفا عنہ (لبسط البنان ص۳)

حضرت تھانویؒ نے اس کا یہ جواب لکھا:۔

"مشفق کرم سلمہم اللہ تعالےٰ

السلام علیکم آپ کے خط کے جواب میں عرض کرتا ہوں کہ میں نے

۱۔ یہ خبیث مضمون کسی کتاب میں نہیں لکھا۔ اور لکھنا تو درکنار میرے قلب میں بھی اس مضمون کا کبھی خطرہ نہیں گذرا۔

۲۔ میری کسی عبارت سے یہ مضمون لازم بھی نہیں آتا۔ چنانچہ اخیر میں عرض کرونگا۔

۳۔ جب میں اس مضمون کو خبیث سمجھتا ہوں اور میرے دل میں بھی اس کا خطرہ نہیں

گزرا۔ جیسا کہ اوپر معروض ہوا۔ تو میری مراد کیسے ہو سکتا ہے۔

۴۔ جو شخص ایسا اعتقاد رکھے۔ یا بلا اعتقاد صراحۃً یا اشارۃً یہ بات کہے۔ میں اس شخص کو خارج از اسلام سمجھتا ہوں کہ وہ تکذیب کرتا ہے۔ نصوص قطعیہ کی اور تنقیص کرتا ہے۔ حضور سرور عالم فخر بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

یہ تو جواب ہے آپ کے سوالات کا۔ اب آخر میں اس جواب کی تتمیم کیلئے مناسب سمجھتا ہوں کہ رسالہ "حفظ الایمان" کی اس عبارت کی مزید توضیح کردوں۔ جس کی بنا پر مجھ پر یہ تہمت لگائی گئی ہے۔ حالانکہ وہ خود واضح ہے۔ اول میں نے دعویٰ کیا ہے کہ علم غیب جو بلاواسطہ ہو۔ وہ مخاص ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ۔ اور جو بواسطہ ہو۔ وہ مخلوق کے لئے ہو سکتا ہے۔ اس سے مخلوق کو عالم الغیب کہنا جائز نہیں۔ اور اس دعویٰ پر دو دلیلیں قائم کی ہیں۔ وہ عبارت دوسری دلیل کی ہے۔ جو اس لفظ سے شروع ہوتی ہے:۔

"پھر یہ کہ آپ کی ذات مقدسہ پر" مطلب یہ ہے کہ آپ کی ذات مقدسہ پر علم غیب کا حکم کیا جانا۔ یعنی محض اسی بنا پر کہ علوم غیبیہ بواسطہ حاصل ہیں۔ آپ کو عالم الغیب کہنا۔ اگر صحیح ہو۔ تو اس سے اگر کل غیر متناہیہ مراد ہوں۔ تو وہ نقلاً وعقلاً محال ہے اور اگر بعض علوم مراد ہوں۔ گو وہ ایک ہی چیز کا علم ہو۔ اور گو وہ چیز ادنیٰ ہی درجہ کی ہو۔ تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا تخصیص ہے۔ ایسا علم غیب تو زید۔ عمر وغیرہ کو بھی حاصل ہے۔ تو لفظ ایسا کا یہ مطلب نہیں کہ جیسا علم واقع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے... الخ" (بسط البنان ص ۱۲)

اگر ایسا کی جگہ لفظ اتنا ہوتا۔ تو پھر بات قابل گرفت ہو سکتی تھی۔ مگر آپ نے لفظ اتنا نہیں فرمایا۔ جس کا فرق ظاہر و باہر ہے۔ کیونکہ برابری مقدار میں اتنا میں ہو سکتی تھی۔ لفظ ایسا میں نہیں۔ بہرحال اس سے اتنا تو عیاں ہے کہ اس جماعت کو حضرت تھانوی کی سینکڑوں تصنیفات اور ہزاروں ملفوظات میں اور تو کوئی ایسی تحریر نہ مل سکی۔ جس سے تلبیس و تکفیر کا کام لیا جا سکتا۔ لے دے کے اس کے ہاتھ میں صرف یہی ایک..... ایسی سطر آ سکی۔ جس کو [illegible] سیاق سباق سے الگ کرکے لوگوں کو دھوکا دیا گیا۔ اور کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ اور اسے وہابیت کے چوکھٹے میں مزین کرکے کم علم لوگوں کو فریب دیا گیا۔

وجہ تاخیر | مذکورہ بالا جواب کے اخیر میں یہ لکھتے ہیں کہ:۔

"میں نے اب تک ایسی لغویات کے جواب دینے کی طرف التفات نہیں کیا تھا۔ کیونکہ تجربہ ہے اس پر کوئی معتدبہ نفع مرتب نہ ہونے کی وجہ سے اس کو اضاعتِ وقت سمجھتا ہوں۔ اب جو آپ نے طریقہ سے پوچھا۔ تو میں نے اپنے معلومات ظاہر کر دیئے۔ اس سے یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ اب تک کیوں نہیں لکھا۔ شاید اب رجوع کر لیا ہو۔ سو وجہ نہ لکھنے کی یہی تھی کہ کسی نے بھلے مانسوں کی طرح پوچھا ہی نہ تھا۔ باقی رجوع تو وہ ہے کہ جو پہلے اور قول اور عقیدہ ہو۔ اور اب اس کو ترک کر کے دوسرا عقیدہ اور قول اختیار کیا ہو۔ بفضلہ تعالےٰ میرا اور میرے سب بزرگوں کا ہمیشہ سے آپ کے افضل المخلوقات فی جمیع الکمالات العلمیہ والعملیہ ہونے کے باب میں یہ ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" (بسط البنان ص۹)

وہابیت کی تہمت

مولوی احمد رضا خاں صاحب ماشاء اللہ عالم تھے۔ گو ان کا شمار ایسے علماء کے زمرہ میں کیا جاتا ہے۔ جن کا اپنے علم پر عمل نہیں تھا کیونکہ مولوی احمد رضا خاں "لعنۃ اللہ علی الکاذبین" کی حقیقت سے لاعلم نہ تھے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خدا کی بھیجی ہوئی لعنت کا اثر نسلاً بعد نسلٍ تک رہتا ہے مگر اس علم کے باوجود انہوں نے بہت بڑے تاریخی جھوٹ سے کام لیتے ہوئے حضرت تھانوی پر وہابیت کی تہمت لگائی۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ:-

۱۔ حضرت تھانوی کو محمد بن عبدالوہاب بانی فرقہ وہابیہ سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

۲۔ وہابی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کی زیارت کے لئے سفر ممنوع قرار دیتے ہیں۔ اور حضرت تھانوی اسے ضروری قرار دیتے تھے۔ بلکہ اس شرف سے خود بھی مشرف ہو چکے تھے۔

۳۔ وہابی توسل بالانبیاء والاولیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بعد الوفات حرام قرار دیتے ہیں مگر حضرت تھانوی اسے نہ صرف جائز اور مفید سمجھتے تھے بلکہ اقرب الاجابت قرار دیتے تھے۔

۴۔ وہابی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور حضرت تھانوی حضور نبی اکرمؐ سے اس قدر ادب و عقیدت کا اظہار فرماتے تھے کہ ظاہر بینوں کو غلو و مبالغہ کا احتمال ہوتا تھا۔ ویسے بھی حضرت تھانوی کی تصنیف لطیف "نشر الطیب" اور زاد السعید اس پر شاہد عدل ہے۔

۵- وہابی تصوف و طریقت ذکر و شغل وغیرہ کے منکر ہیں۔ اور حضرت تھانوی ان امور کے جامع اور مجدد تھے۔

۶- وہابی تقلید شخصی کے بالکل قائل نہیں مگر حضرت تھانوی سلف صالحین کی اتباع اور مجتہدین کی تقلید شخصی کے قائل و عامل تھے۔

کفر کا فتویٰ مزید براں مولوی احمد رضا خاں صاحب نے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ غیر مستحق کی تکفیر کرنا اپنے کفر کا اثبات کرنا ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ اگر تکفیر و لعن کسی غیر مستحق کی طرف عائد کی جائے گی تو وہ اسی پر لوٹ آئے گی۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے دیدہ دانستہ ایک بے بنیاد احتمال پر ناحق حضرت تھانوی اور ان کے اکابر پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ جن کا اس بارہ میں اپنا مسلک یہ تھا کہ

"اگر کسی کے کلام میں ہزار احتمال ہوں۔ جن میں سے نو سو ننانوے احتمالات کفریہ ہوں اور صرف ایک احتمال ایمان کا ہو۔ تو اس کی تکفیر جائز نہیں" (مکتوب الزار القلوب)

تنگ ظرفی اور وسعت خیالی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے لیکن جب حضرت تھانوی نے:-

۱- اس عبارت کی خود وضاحت کر دی۔ جس کی بنا پر کفر کا فتویٰ عائد کیا گیا تھا۔ کہ اس کا وہ مطلب ہرگز نہیں جو مولوی احمد رضا خاں صاحب سمجھے ہیں۔

۲- اور اس مفہوم کو جو مولوی احمد رضا خاں نے بیان کیا اور اس عقیدہ کا صریحاً انکار و ابطال کیا۔ بلکہ

۳- ایسے عقیدہ رکھنے والے کو خارج از اسلام کہا۔

شرافت کا تقاضا تو شرافت کا تقاضا یہ تھا کہ مولوی احمد رضا خاں اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیتے اور آئندہ کے لئے اس کی نشر و اشاعت ممنوع قرار دیتے اور اپنی جماعت سے سختی کے ساتھ اس کی پابندی کراتے۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ حضرت تھانوی کے متذکرہ صدر اعلان کے بعد خود مولوی احمد رضا خاں کی موجودگی میں ان کی زیر نگرانی رسالہ حسام الحرمین کی نشر و اشاعت ہوتی رہی اور ان کی جماعت آج تک اپنے "اعلیٰ حضرت" کی سنت ادا کرتے ہوئے بدستور حضرت تھانوی اور آپ کے اکابر کو کافر اور وہابی کہے جا رہی ہے اور یہی فتویٰ ہر سال از سر نو شائع کر کے اپنے جلسوں میں تقسیم کرتی رہتی ہے

چنانچہ امسال (۱۹۳۸ء) جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی تھیں۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں ایک پمفلٹ بعنوان "دیوبندی مولویوں کے عقیدوں کی کہانی۔ دیوبندی مولویوں کے پیشواؤں کی زبانی" بانٹا جا رہا تھا۔ جس میں انہی باتوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔ جو فتویٰ کفر کی بنیاد بنائی گئی تھیں اور جن کی خود ان بزرگوں نے توضیح یا تردید عرصہ سے کر دی ہوئی ہے جن سے یہ منسوب ہیں۔ آخر یہ خیانت و شقاوت نہیں تو اور کیا ہے کہ اپنا دین و ایمان ضائع کر کے اور اپنی عاقبت خراب کر کے ایک بے گناہ اور بے قصور انسان کو متہم کیا جائے

ع بریں عقل و دانش بباید گریست

مسلکِ اشرف قرآن کریم نے اس جماعت کے متعلق جن الفاظ میں خبر دی تھی مندرجہ بالا واقعات نے اس کی حرف بحرف تصدیق کر دی اور اس کے مقابلہ میں جو طریق کار اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس پر حضرت تھانوی نے پورا پورا بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ عمل فرمایا۔ چنانچہ آپ رسالہ "حکایات الشکایات مع روایات الحکایات" کے دیباچہ میں اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ایک مدت سے مجھ پر عنایت فرماؤں کی طرف سے بیجا اعتراضوں کی بوچھاڑ ہے جس میں اکثر کا سبب تعصب و تحزب ہے اس کے جواب کی طرف احقر نے اس لئے کبھی التفات نہیں کیا کہ میں ان اعتراضوں کو قابل التفات نہیں سمجھتا۔ نیز یہ بھی خیال ہوا کہ آج کل جواب دینا قاطع اعتراضات نہیں ہوتا۔ بلکہ کلام اور زیادہ مطول ہو جاتا ہے۔ جس سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور غایت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ مر تیسرے مجھ کو اس سے زیادہ اہم کام اس کثرت سے رہا کئے کہ اس کام کے لئے مجھ کو وقت بھی نہ مل سکتا تھا۔ جو کچھ میں نے جہاں تک دل کو ٹٹولا ایسے اعتراضات کا جواب دینے میں نیت اچھی نہیں پائی۔ میں اہل خلوص کو تو کہتا نہیں۔ مجھ جیسے مغلوب النفس کی نیت تو زیادہ یہی ہوتی ہے کہ جواب نہ دینے میں معتقد کم ہو جائیں گے۔ شان میں فرق آ جائیگا۔ جس کا حاصل ارضاء عوام ہے۔ سو مجھ کو طبعاً اس مقصود یعنی ارضاء عوام سے غیرت آتی ہے۔ باقی بعض محبین کی یہ توجیہ کہ اعتراض سے عام مسلمانوں کو بدگمانی کا گناہ ہوتا ہے تو جواب سے اُن کا اس گناہ سے بچانا ہے۔ تامل کے بعد یہ توجیہ برائے گفتن ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ

مسلمان دوسرے ہزاروں گناہوں میں مبتلا ہیں۔ ان سے بچانے کا اس قدر اہتمام کیوں نہیں کیا جاتا۔ نیز دوسرے علماء حقانی سے اگر ایسی ہی بدگمانی ہو جائے اس کے رفع کرنے کا وہ اہتمام نہیں ہوتا۔ جو اپنے نفس یا اپنے کسی معتقد فیہ کیلئے ہوتا ہے۔ بلکہ اس قدر تو کیا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات تو اگر ان بزرگوں سے کچھ چشمک ہوتی ہے تو نفس میں ایک گونہ سرور پایا جاتا ہے۔ کہ اچھا ہوا ان کی ذرا رسوائی تو ہوئی۔ تدین کا مقتضا تو یہ تھا کہ اگر اپنے یا اپنے اکابر کے کسی مخالف سے بھی کسی کو بے جا بدگمانی ہو۔ تو اس کے رفع کے لئے ویسا ہی اہتمام ہو۔ جیسا اپنے یا اپنے اکابر کے لئے ہوا ہے۔ پھر اس توجیہ کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ اور خیر اگر اپنے کسی بزرگ کے لئے ایسا اہتمام کرے۔ تو اس کو نصرتِ مظلوم میں بھی داخل کر سکتے ہیں۔ جو کہ طاعت ہے۔ مگر اپنے نفس کے لئے ایسا کرنا تو کوئی طاعت بھی نہیں۔ گو جائز ہو۔ مگر ممکن ہے کہ کسی کو بعض جائز سے بھی طبعاً انقباض ہوتا ہو۔ چونکہ احقر کو اس سے انقباض ہوتا ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے عوام کی خوشامد کی جا رہی ہو۔ کہ ہم سے ناراض نہ ہونا۔ ہم کو برا مت سمجھنا۔ ہماری برائی تم سے غلطی سے ہو گئی ہے۔ سو جہاں کوئی دنیوی ضرورت ہو۔ وہاں تو ایسا کرنا مضائقہ نہیں۔ اور جہاں یہ بھی نہ ہو۔ تو انسان کیوں تعب میں پڑے۔ اور تقلیل منافع مالیہ یا قوتِ جاہ یہ کوئی معتد بہ ضرر نہیں۔ جس کے لئے اتنا اہتمام کیا جائے۔ یہ ہے میرا مذاق ان مسالک میں۔ پس ان وجوہ سے میں نے اس کا کبھی قصد نہیں کیا۔ اور نہ اپنے مخصوصین کو اس کی اجازت دی۔ ہاں اگر کسی محض بے تعلق شخص نے بدوں مجھ سے مشورہ لئے ہوئے کبھی جواب دیا۔ تو نفس کو سرور ضرور ہوا۔ مگر پوچھنے پر مشورہ کبھی نہیں دیا"

مخالفین کی رعایت یہاں پر بجا طور پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مسلک پر قائم رہتے ہوئے رسالہ "حکایات الشکایات" لکھنے کی کیوں ضرورت پیدا ہوئی؟ اس کا جواب ہونے پر سہاگہ کا مصداق ہے۔ اس کا جواب خود اسی رسالہ میں موجود ہے۔ لکھتے ہیں کہ:-

"آج کل بعض جو اعتراضات مجھ پر کئے جا رہے ہیں ممکن ہے بعض معتقدین و موافقین

کہ اب تک ان اعتراضوں کا علم نہ ہوا اور وہ اس لاعلمی کی وجہ سے ہمارے معتقد ہوں
اور اگر علم ہو جاتا تو معتقد نہ رہتے۔ تو گویا زمانہ بقاء عقیدت تک وہ دھوکا میں
رہے اور دھوکا سے مسلمانوں کو بچانا ضروری ہے جیسا کسی تاجر کے سودے میں
کوئی کھوٹ ہو۔ تو ظاہر کر دینا شرعاً ضروری ہے۔ لیکن اگر تاجر کے علم میں وہ کھوٹ
نہ ہو۔ لیکن بعض مشترین کے زعم میں ہو۔ تب بھی گو شرعاً اس کا اظہار واجب نہیں
لیکن خوش معاملگی اور صفائی کا کمال پھر اسی کو مقتضی ہے کہ ایسے امر کو
بھی مع اپنی تحقیق کے دوسرے مشتری کے سامنے ظاہر کر دے تاکہ وہ دونوں قولوں
کو سن کر آزادی سے رائے قائم کر کے خریدنے نہ خریدنے میں مختار رہے لہذا
مناسب ہوا کہ جو ایسے اعتراضات نقل کر کے اپنے نزدیک جو ان کی حقیقت
ہے۔ اس کو بھی لکھ دیا جائے۔ تاکہ دیکھنے والے دونوں کو دیکھ لیں۔ پھر جس
کا جی چاہے۔ احقر سے تعلق پیدا کرے یا رکھے اور جس کا جی چاہے تعلق نہ کرے
یا نہ رکھے۔ ضمناً یہ بھی مصلحت ذہن میں آئی کہ بعض لوگ واقعی حق کے طالب ہوتے
ہیں۔ اور اصل واقعہ معلوم نہ ہونے یا اس کی حقیقت نہ سمجھنے سے تردد میں پڑ
جاتے ہیں اور وہ خلوص کے ساتھ تردد کو رفع کرنا چاہتے ہیں۔ ایسوں کا تردد
رفع کرنا ہدایت کا ایک شعبہ ہے۔ جو کہ طاعت ہے۔ تو ساتھ ساتھ یہ طاعت
بھی ادا ہو جائے گی۔ پس اس عجالہ مختصرہ میں ان مضامین کو اس ترتیب سے
لکھا جاویگا کہ اول ایک وہ مضمون جو مبنیٰ ہے اعتراض کا بعنوان حکایت لکھونگا
پھر معترض کے اعتراض کو بعنوان شکایت نقل کروں گا۔ پھر اپنے نزدیک جو
اس کی حقیقت واقعیہ ہے۔ بعنوان درایت لکھ کر ختم کر دوں گا۔ وقس علیٰ ہذا
اس طرز سے اظہار واقع سنت حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہے کما قال
اللہ تعالیٰ فی قصۃ یوسف علیہ السلام فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ
إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ إلی قولہ وَمَا
أُبَرِّئُ نَفْسِي۔ الآیۃ یعنی مقصود بالذات اس اظہار سے اپنا تبریہ یا تزکیہ نہیں
گو برات مطابق واقع کے بھی ہے۔ بلکہ دوسرے مصالح دینیہ سے اس کا اظہار
کیا جاتا ہے۔

پھر اپنے سے تہمت دفع کرنا سنت بھی تو ہے۔ پس اس وقت اپنی تین حالتیں پیش نظر ہیں ایک محبین کی ملامت اور مخالفین کا اعتراض۔ دوسرے ان سب اعتراضوں کو جن کو وہ میرا عیب جو مدتوں میں چھانٹتا۔ از خود ایک جگہ جمع کر دینا تاکہ اسے میرے عیب تلاش کرنے میں تکلیف نہ ہو۔ تیسرے اس جمع کرنے میں یہ نیت کہ جس کا جی چاہے تعلق رکھے جس کا جی چاہے نہ رکھے ان تینوں حالتوں پر تین شعر بے ساختہ ذہن میں آتے ہیں۔ اول کے متعلق مومن خاں کا شعر ؎

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ — کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

ثانی کے متعلق اسی غزل کا دوسرا شعر ؎

میں گلہ کرتا ہوں اپنا۔ تو نہ سن غیروں کی بات — ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

ثالث کے متعلق غالب کا شعر بتصرف یسیر ؎

ہاں وہ نہیں وفا پرست۔ جاؤ۔ وہ بے وفا سہی — جس کو ہو جان و دل عزیز۔ اسکی گلی میں جائیں کیوں"

ایک عجیب اہتمام | حضرت تھانوی بقول مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی:۔

"محض نور کے بنے ہوئے اور تقدس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے کروبیوں میں نہیں۔ آب و گل سے ترکیب پائے۔ انسانی دل اور بشری جذبات رکھنے والے انسان تھے"۔ (حکیم الامت ص ۲۲)

اس لئے آپ نے اپنی تحریروں میں سہو و خطا کی جانچ پڑتال کرانے کے لئے اہل علم و دیانت ناقدین کی ایک کافی جماعت اس غرض کے لئے معین کر دی تھی۔

"میری تمام تحریرات کو نظر تنقید سے دیکھ لیا کرے۔ جو ان کی رائے میں قابل اشاعت نہ ہوں۔ ان کو یا حذف کر دیں۔ یا ان پر نشان لگا دیں تاکہ ان کو کوئی شائع نہ کرے باقی اگر کوئی خاص مکتوب الیہ کسی خاص مضمون کا جواب بطور خود بدوں یہاں کے علم کے شائع کر دے۔ تو وہ اختیار سے خارج ہے۔ اب اگر کوئی مضمون جو ناظرین کے نزدیک موہم ہو۔ یہاں سے شائع ہو۔ تو اس کے متعلق خط و کتابت بجائے میرے بنام "جماعت انتخاب التالیف تھانہ بھون" فرمانا مناسب ہے"۔

(اشرف علی تھانوی عفی عنہ آخر جمادی الاولی)

عفوِ عام | حضرت تھانوی کے مخالفین و معاندین کی طرف سے چونکہ ان بے بنیاد اتہامات و اعترافات

کی نشر و اشاعت اسلئے کی گئی تھی کہ لوگ آپ سے مستفید و مستفیض ہونے کی بجائے آپ کو سب و شتم کریں اور حضرت تھانوی کو نہ مخلوق کی خوشنودی مطلوب تھی۔ اور نہ آپ کسی کو تکلیف میں مبتلا ہوتا دیکھ سکتے تھے بلکہ آپ کا مقصود زندگی ہی راحت رسانی خلق تھا۔ اسلئے آپ نے رسالہ حکایات الشکایات کے اخیر میں اعلان کر دیا کہ :۔

"ان مضامین (اعتراضات) سے جو کچھ تشویش عوام میں ہوئی۔ اس کا حاصل مجھ کو سب و شتم کرنا تھا۔ بحمد اللہ کسی مقصود دینی میں کوئی اختلال واقع نہیں ہوا۔ سو اپنے سب و شتم کو بامید عفو حق سب کو معاف کرتا ہوں"

اور ایک دوسرے اعلان کے ذریعہ جس کا ذکر سیرت کے حصہ دوم باب العادات میں گذر چکا ہے۔ آپ نے ان لوگوں کو بھی معاف کر دیا تھا۔ جو آئندہ ایسی افترا پردازیوں اور کذب بیانیوں کے مرتکب ہوتے رہیں گے۔ تاکہ

"قیامت کے روز ان سے محض میری وجہ سے مواخذہ نہ ہو۔ کیونکہ کسی کو عذاب ہونے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا"

گویا اپنے مخالفین و معاندین کے معاملہ میں آپ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک پر عمل پیرا تھے کہ "خطا کا جواب عطا سے دیا جائے"۔

سیاسی بہتان مذکورالصدر تہمتوں کے علاوہ آپ پر سیاسی مخالفین کی طرف سے یہ بہتان لگائے گئے :۔

۱۔ آپ خلافت کے مخالف تھے۔
۲۔ سلطنت اسلامیہ کے مٹنے سے خوش تھے۔
۳۔ مولانا محمود الحسن قدس سرہ کے مخالف تھے۔
۴۔ آپ کے بعض خدام ان کو برا کہتے تھے اور آپ انہیں نہ روکتے تھے۔
۵۔ آپ حکومت انگریزی سے تنخواہ پاتے تھے۔

غرضیکہ جتنے منہ۔ اتنی باتیں۔ جو جس کے جی میں آتا۔ کہتا رہتا۔ اور عوام میں آپ کے خلاف بدگمانیاں پھیلاتا رہتا۔ اس پر بعض حضرات نے آپ سے ان امور کی تردید کے متعلق بھی کوئی تحریر شائع کرنے کی درخواست کی۔ اور اس کی مصلحت یہ پیش کی کہ ایسی افترا پردازیوں سے آپ کی ذات کو تو نقصان نہ پہنچے گا۔ لیکن بدگمانیاں پھیلانے والوں کا دین و ایمان خراب

ہوگا۔ اس پر آپ نے فرمایا:۔

جواب باصواب

"یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ تو میں نعوذ باللہ خلافت کا مخالف ہوں۔ کیونکہ مسئلہ خلافت ایک اجماعی مسئلہ ہے۔ نہ میں سلطنت اسلام کے ضعف و زوال سے نعوذ باللہ خوش ہوں بلکہ اللہ کو خبر ہے۔ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ اور میری یہ حالت ہے کہ جب مجھے مسلمانوں کی دینی و دنیوی تباہی کا خیال آجاتا ہے۔ جس میں زیادہ حصہ خود مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی کا ہے۔ تو رگ رگ میں غم عظیم پھیل جاتا ہے۔ اور اگر کھانا کھانے میں خیال آجاتا ہے۔ تو کھانا تلخ ہو جاتا ہے اور نہ میں حضرت مولانا (محمود الحسنؒ) کا نعوذ باللہ مخالف ہوں۔ بلکہ جس قدر محبت و عظمت حضرت قدس سرہٗ کی میرے دل میں ہے۔ اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ رہا کسی مسئلہ میں رائے کا اختلاف! سو ایسا اختلاف مجھ کو حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ بلکہ اپنے مرشد حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بھی رہا ہے۔ اور اس اختلاف کی ان حضرات کو اطلاع بھی تھی۔ مگر کبھی ان کو تکدر نہیں ہوا۔ اس کو مخالفت کہنا غلو فی الدین ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ نے باوجود شاگرد ہونے کے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ نعوذ باللہ صاحبین امام صاحب کے مخالف و معاند تھے۔ استغفر اللہ۔ تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ محض بعض امور میں اختلاف رائے کی بناء پر جس کا وجہ میرے اعلان ملقب بہ عنوان "احقر اشرف علی کے مسلک کی شرح" میں بتلا دیا گیا ہے مجھے حضرت مولانا کا مخالف کیوں سمجھا جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ میرا یہ اختلاف حضرت مولانا کے ساتھ آج سے نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ بہت زمانہ پیشتر کا ہے۔ پس اگر یہ اختلاف دینی حیثیت سے مضر تھا۔ تو خود حضرت مولانا نے مجھے اپنی اتباع پر کیوں نہ مجبور کیا۔ یا اس اختلاف کو مذموم کیوں نہیں فرمایا۔ اور اگر یہ اختلاف مخالفت تھا۔ تو حضرت قدس سرہٗ نے اخیر تک مجھ سے وہی بسابقہ بزرگانہ شفقت کا برتاؤ کیوں رکھا۔ یہ واقعات خود بتلاتے ہیں کہ یہ اختلاف نہ دینی حیثیت سے مضر تھا۔ اور نہ اس کو مخالفت کہا جا سکتا ہے۔

رہا یہ الزام کہ میرے بعض متعلقین حضرت قدس سرہٗ کے مخالف ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے کسی متعلق نے حضرت کی شان میں نہ تقریراً کوئی گستاخی کی اور نہ تحریراً اور اگر کوئی ایسا کرتا۔ تو میں عمر بھر کے لئے اس سے قطع تعلق کر لیتا۔ بعض لوگوں نے یہ تہمت بیچارے

(مولانا) مولوی ظفر احمد (مولانا) مولوی جلیب احمد کی تحریرات پر رکھی ہے۔ مگر ان کی عبارتیں حضرت اقدس کے ساتھ شدت عقیدت و غایت احترام کو ظاہر کر رہی ہیں۔ مثلاً آخری پیام میں وہ دونوں لکھتے ہیں کہ "ہم نے اپنی متعدد تحریروں میں اس امر کو صاف کر دیا ہے کہ نہ ہم کو حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ سے کبھی مخالفت ہوئی اور نہ اب ہے بلکہ ہم ان کے ساتھ حسن عقیدت کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھتے ہیں"۔ نیز یہ بھی غلط ہے کہ میں گورنمنٹ سے تنخواہ پاتا ہوں اگر کسی کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہو تو میں عام طور پر ہر شخص کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ پیش کرے۔ اور اگر وہ پیش نہ کر سکے اور یقیناً نہیں کر سکتا تو اس کو چاہیئے کہ توبہ کرے۔ اگر کوئی مجھ سے ان امور میں مباہلہ کرنا چاہے۔ تو میں مباہلہ کر سکتا ہوں۔ مگر میں اپنی طرف سے کسی ایسے اعلان کی ضرورت اسلئے نہیں سمجھتا کہ لوگوں کا میرا معتقد ہونا یا معتقد رہنا دین میں ضروری نہیں۔ اہل حق میں سے جس کے بھی متبع ہو جاویں۔ ان کے لئے کافی ہے (النور ماہ جمادی الاخری ۱۳۴۳ھ)

دراصل آپ کو گورنمنٹ برطانیہ کا ایجنٹ مشہور کرنے کی وجہ یہ تھی کہ

الف۔ حضرت تھانوی ہی پاکستان بننے کے سب سے زیادہ اور اولیں خواہاں تھے

ب۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے واجب الاحترام لیڈروں کی موافقت کے باوجود آپ مسلمانوں کے کانگریس میں شامل ہونے کے سخت مخالف تھے۔

ج۔ آپ قائداعظم کی دینی تربیت فرما رہے تھے اور مسلم لیگ کی حمایت کر کے قائداعظم کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ جس کا قائداعظم نے بعض موقعوں پر فخریہ اظہار فرمایا تھا۔ بلکہ وائسرائے تک سے بھی ذکر کیا تھا۔

تاکہ قائداعظم کے نیک مقاصد کو نقصان پہنچایا جائے جس کی تفصیل اگلے ابواب میں آرہی ہے۔

دینی ضیاع حضرت تھانوی کے متذکرہ بالا جواب باصواب پر جس کی نظیر مشاہیر کی تاریخ کردار میں ملنی مشکل ہے۔ مخاطبین نے عرض کیا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ صحیح ہے لیکن لوگوں کا دین بدگمانیوں۔ افترا پردازیوں۔ سب وشتم۔ سے برباد ہو رہا ہے۔ جواب شائع ہونے سے اس کا تدارک ہو جائے گا"۔ تو آپ نے فرمایا:۔

ازالہ ضیاع "جب لوگ خود ہی اپنا دین برباد کریں۔ تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی بے گناہ پر تہمت لگانا گناہ ہے، ضرور جانتے ہیں۔ پھر کیا وہ یہ نہیں

جانتے کہ یہ تمام باتیں جو میری طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ ایسی ہیں۔ جن کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں۔ ضرور جانتے ہیں۔ تو پھر جب باوجود ان باتوں کے جاننے کے وہ ایسی باتیں میری طرف منسوب کرتے ہیں تو گویا وہ قصداً گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں تو ایسی حالت میں میں کیا کرسکتا ہوں اگر میں ایسا کردوں بھی۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ ایسا اچھا ہوں۔ تم مجھے بُرا نہ کہو۔ سو مجھ کو اس سے غیرت آتی ہے۔ اور اگر بادل ناخواستہ میں گوارا بھی کرلوں۔ تو اس پر شبہ ہو سکتا ہے کہ اپنی غرض سے ایسا کرتا ہے۔ اس شبہ کو کیونکر رفع کیا جائے۔ دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ دنیا میں سب ہی ناداں نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سمجھدار حضرات بھی ہیں۔ جو میری حالت سے بخوبی واقف ہیں اور یقیناً جانتے ہیں کہ یہ تمام باتیں جو میری طرف عوام منسوب کرتے ہیں۔ غلط ہیں۔ اور لوگ ناحق بدگمانیاں کرکے معاصی میں مبتلا ہورہے ہیں۔ پس اگر عوام کے دین کی حفاظت کی ضرورت تھی۔ تو اس کی تدبیر یہ تھی کہ واقف حضرات خود ان بدگمانیوں کو رفع کرتے اور لوگوں کو نفع پہنچاتے۔ اور ان کا ایسا کرنا مفید بھی ہوتا۔ کیونکہ وہ بے لوث تھے اور مجھ پر غرض کا شبہ بھی ہوسکتا ہے جس کو میں دفع نہیں کرسکتا۔ میرا مقصود یہ نہیں کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔ میں نے معاملہ خدا کے سپرد کر رکھا ہے۔ مقصود صرف اس سوال کے جواب میں اس طریق سے اطلاع دینا ہے۔ ان وجوہ سے جو تدارک میرے اختیار میں تھا۔ وہ صرف یہ تھا کہ میں ان تمام لوگوں کو جو ناحق بدگمانی افترا۔ سب وشتم کرکے گناہ میں مبتلا ہوئے ہیں معاف کردوں۔ سو میں نے دل سے ان کو معاف کردیا ہے۔ اس سے آگے میرے قبضہ سے باہر ہے۔"

(الجوالصادر)

شرافت نفس

انہی بہتان طرازیوں کے سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے بھی مورخہ ۱۰ رجون ۱۹۳۲ء کو حضرت تھانوی کو حسب ذیل اطلاع بھیجی کہ:-

"پچھلے دنوں جناب والا سے متعلق عجب عجب اتہامات سننے میں آئے۔ ایک صاحب نے ایک مشہور مولوی صاحب کے حوالہ سے بیان کیا کہ جناب نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ جب تک جسم پر ولایتی کپڑے کا کوئی جزو نہ ہوگا۔ نماز درست نہ ہوگی نعوذ باللہ۔ ایک دوسرے صاحب نے بیان کیا کہ آپ نے "بیان القرآن" سورۃ المائدہ کی آیت وَلَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً کے تحت میں گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ موالات ومودت فرض قرار دی ہے۔ پہلے افترا کی تو زبانی تردید کرکے خاموش رہا۔

اس دوسرے افتراء کی تردید یا اصل تفسیر سے اقتباس نئے کتاب کی صفحہ کے پرچہ "سچ" میں کر رہا ہوں۔" (حکیم الامت ص۲۲۲)

آپ نے انہیں لکھا کہ :-

"یہ آپ کی محبت ہے۔ مگر مجھ کو تو طبعًا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ اس اہتمام میں نہ انکا ضرر نہ میرا۔ بلکہ جواب دینے میں ان کا یہ ضرر ہے کہ اب تو وہ اہتمام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر مطلع ہو کر قبول نہ کریں گے تو عاصی ہوں گے۔ تو ایک مسلمان کو عاصی بنانا کیا فائدہ۔"

ایسے حالات میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ؎

ہیں مطابق فہم انسانی کے سب اس کے اصول علم و حکمت کے ترتیب اور عقل و دانش کے قریب

اور خسرو دلہ یا دِ اشرفیہ یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ؎

کہیں نہ دیکھا کہیں نہ پایا جمال ایسا کمال ایسا
دکھائے کوئی اگر مدعی جمال ایسا کمال ایسا۔

اختلاف و التفات

بہترین لوگ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں۔ جن کی صورت دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہو۔ جن کی بات سے علم میں ترقی ہوتی ہو اور جن کے عمل کو دیکھ کر آخرت کی رغبت پیدا ہوتی ہو؟ (جامع الصغیر)

یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے کہ اگر تعصب کی عینک اتار کر خالی الذہن ہو کر۔ بغض اور غصہ کے جذبات سے علیحدہ ہو کر دیکھا جائے۔ تو یہ تینوں خصوصیات مندرجہ ذیل بزرگوں میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جن کا نہ صرف مشاہدہ بلکہ اعتراف خلق کثیر کو ہے۔

۱۔ حضرت شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

۲۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

۳۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی

اعلان جنگ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں

کہ جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے، میری طرف سے اس کو اعلان جنگ ہے (مشکوٰۃ و بخاری) ایک اور حدیث میں ہے کہ جو میرے کسی ولی کی اہانت کرتا ہے۔ وہ میرے ساتھ مقابلہ کے لئے سامنے آتا ہے (فتح الباری) صاحب مظاہر الحق نے لکھا ہے کہ اللہ سے بندہ کی لڑائی دلالت کرتی ہے۔ اس کے خاتمہ بد ہونے پر۔

حق تعالے نے سود کھانے والوں اور اپنے بہترین لوگوں یعنی اولیاء اللہ کو ستانے والوں کے سوا اور کسی کے خلاف اعلان جنگ نہیں فرمایا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو ستانا یا ان کو برا بھلا کہنا کتنا گناہِ عظیم ہے۔

نتیجہ جنگ اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذکورالصدر حضرات کے خلاف زبان لعن و طعن دراز کرنے والے اکثر اہل علم ہیں جو بوجہ بغض و حسد ان کے اجتہادی اختلافات کو دانستہ اہمیت دے کر لوگوں کو ان بزرگوں سے بدگمان کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں آگاہ فرمایا:۔

"ایک روز حضورؐ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم لوگ مفلس کس کو کہتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا جس کے پاس مال نہ ہو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ وہ مفلس نہیں ہے بلکہ حقیقتاً مفلس وہ شخص ہے کہ جو قیامت کے دن بہت سی نیکیاں لے کر حاضر دربار ہوگا۔ مگر اس نے دنیا میں کسی پر ظلم کیا تھا۔ کسی کو گالیاں دی تھیں۔ کسی کا مال چھینا تھا۔ قیامت میں روپیہ پیسہ تو ہے ہی نہیں۔ وہاں تو سارے حساب نیکیوں اور گناہوں سے پورے کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ان مظالم کے بدلے میں اس شخص کی نیکیاں ان لوگوں کو دلائی جائیں گی۔ جن پر ظلم کیا تھا اور ان کو برا بھلا کہا تھا۔ اور جب اس شخص کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی۔ تو بہرحال ان کے تو حقوق کو پورا کرنا ہی ہے۔ اس لئے بقدر ان حقوق کے جس قدر گناہ ان لوگوں کے وزن میں آئیں گے۔ وہ اس پر ڈال دئے جائیں گے تو اصل مفلس یہ ہے۔ جو بہت کچھ کمائی (نماز۔ روزہ اور دینی کاموں کی) لے کر گیا تھا۔ اور ملا یہ کہ دوسروں کے گناہ بھی سر پڑ گئے"

گویا سوء خاتمہ کے امکان کے ساتھ حبطِ اعمال کی سزا کا بھی امکان ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی صاحبِ ایمان نہ اللہ تعالے سے جنگ مول لے سکتا ہے اور نہ عاقبت کا یہ

خسارہ برداشت کر سکتا ہے۔ اسلئے لازمی طور پر یہ لوگ وہی ہو سکتے ہیں جن کو شیاطین الجن والانسان کہا گیا ہے اور حضرت تھانویؒ کا ایسے لوگوں کو بامید عفو حق معاف کر دینا انہیں یوم حساب کے عذاب سے بچانے کی سعیِ بلیغ کرنا ہے۔ جو آپ کے "بہترین لوگوں" کے زمرہ سے ہونے کی بے نظیر مثال ہے۔

پروپاگنڈا کا نتیجہ مذکورہ بالا ہر سہ گروں کے خلاف اشرار کی پھیلائی ہوئی افتراپردازیوں کذب بیانیوں اور بدگمانیوں سے جن کی تفصیل پچھلے باب میں گزر چکی ہے۔ جہاں عوام دھوکا کھا بیٹھے تھے۔ وہاں اہل علم بھی پریشان ہو کر اپنے اکابر سے ان کی وضاحت چاہنے لگے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں

(۱) حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان نے حضرت تھانویؒ سے ان سوالات کا جواب چاہا:۔

الف۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب و مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب (مدظلہم) کو حضرت والا کیا سمجھتے ہیں۔ اور کیا اپنے مخصوص و معلوم سیاسی معتقدات کے باوجود یہ حضرات لائق احترام ہیں۔

ب۔ جو افراد یا اخبارات ان حضرات کی شان میں بے باکانہ کلمات استعمال کرتے ہیں مثلاً فسیخ الاصنام۔ شیخ الہنود۔ ابوجہل یا شقی اور دلالہ اور جہالتہ وغیرہ ان کو حضرت کیسا سمجھتے ہیں اور وہ شرعی مجرم ہیں یا نہیں۔

ج۔ حضرت والا ان حضرات کو سیاسیات میں اختلاف رائے کے باوجود نیک نیت اور دیانتدار سمجھتے ہیں یا بددیانت اور خائن۔ اور ان حضرات کی سیاسی جدوجہد کیا حضرت کے نزدیک اخلاص اور ملت کی خیر طلبی پر مبنی ہے یا کسی خودغرضی اور خود مطلبی پر (بوادر النوادر ۹۶۲)

(۲) حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مدظلہ العالی شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور سے ان کے ایک مرید نے بھی استفسار کیا کہ:۔

الف۔ حضرت تھانوی اور حضرت مدنی میں باوجود دونوں کے مخلص اور اہل اللہ ہونے کے اتنا شدید اختلاف کیوں ہے۔ کیا مخلصوں اور دنیاداروں میں بھی ایسا اختلاف ہو سکتا ہے

ب۔ آپ کے نزدیک کون حق پر ہے۔ اور ان مسائل میں آپ کی کیا رائے ہے۔

ج۔ علماء کا وقار عمداً گرایا جا رہا ہے۔ بے تکلف سب و شتم کیا جاتا ہے۔

د۔ علماء کے اختلاف سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے مسلمان تباہ ہو رہے ہیں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ وغیرہ (الاعتدال فی مراتب الرجال)

یہ سوالات چونکہ اہل علم حضرات کی طرف سے تھے۔ اسلئے دونوں حضرات نے انکے جواب بھی علمی دیئے۔ جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ حضرت تھانوی کے جوابات رسالہ "شق الغین عن حق علی و حسین" (جو بوادر النوادر ص ۹۶۳ پر موجود ہے) اور مولانا محمد زکریا صاحب کے جوابات رسالہ "الاعتدال فی مراتب الرجال" میں ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں۔

اشرار کی طرف سے چونکہ ان بزرگوں کے خلاف اب تک پروپاگنڈا جاری ہے۔ اور ان کو ایک دوسرے کا مخالف ظاہر کر کے عوام میں تفریق کا بیج بویا جا رہا ہے۔ اسلئے ان حضرات کے باہمی تعلقات اور اختلافات پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ تاکہ ایک بہت بڑے تاریخی فریب کا پردہ چاک کیا جائے۔

نوعیتِ مسائل جن مسائل کو وجہ اختلاف بنا کر اکابر کے خلاف شدومد سے پروپاگنڈا کیا جاتا رہا اور کیا جا رہا ہے۔ ان کی نوعیت حضرت تھانوی کے الفاظ میں اس سے زیادہ نہیں کہ:-

"بعض مسائل قطعی ہوتے ہیں۔ ان میں اختلاف کی کچھ گنجائش نہیں ہوتی۔ بعضے اجتہادی و ظنی ہوتے ہیں ان میں سلف سے خلف تک شاگردوں نے استاد کے ساتھ۔ مریدوں نے پیر کے ساتھ۔ قلیل جماعت نے کثیر جماعت کے ساتھ۔ واحد نے متعدد کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں کی۔ اور نہ ایک دوسرے کو ضال اور عاصی کہا ہے نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا۔ نہ اختلاف کے ہوتے ہوئے باہم بغض و عداوت ہوا نہ مناظرہ پر اصرار کیا گیا۔ چنانچہ مشاجرات میں صحابہ کا اختلاف اور علیحدہ رہنے والوں کی علیحدگی کو سب کا جائز رکھنا معلوم ہے۔

ایسے مسائل اجتہادیہ ظنیہ میں اختلاف دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک دلائل کے اختلاف سے جیسے حنفی شافعی میں قرآت خلف امام کے مسئلہ میں۔ دوسرے واقعات یا عوارض کے اختلاف سے جیسے امام صاحب اور صاحبین میں نکاح صابیات کے مسئلہ میں کہ جن کو تحقیق ہوا۔ کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں۔ انہوں نے اس نکاح کو جائز رکھا۔ اور جن کو تحقیق ہوا کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں۔ انہوں نے اس نکاح کو ناجائز رکھا۔ مگر اس واقعہ کی تحقیق میں

اختلاف ہوگیا کہ آیا وہ کتابی ہیں یا غیر کتابی۔ اسلئے فتوی میں اختلاف ہوا۔ یا حنفی و شافعی میں تعیین سورت فی الصلوٰۃ کے مسئلہ میں کہ شافعی نے نفس عمل کو منقول عن الشارع دیکھ کر اس کو جائز کیا۔ اور امام صاحب نے عارض اعتقاد یا ایہام اعتقاد وجوب حالاً یا مآلاً پر نظر رکھ کر اس کو مکروہ فرمایا۔"

شیخ الہند سے اختلاف

بعینہٖ یہی حالت متذکرہ صدر ہر سہ بزرگان دین کے اختلافات کی تھی۔ جس کی وضاحت خود حضرت تھانوی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے "ذکرِ محمود" میں یوں فرمائی:۔

"حضرت مولانا رحمتہ اللہ علیہ جب مالٹا سے تشریف لائے۔ تو بعض خاص اسباب سے بعض خاص معاملات میں بعض خاص خیالات ظاہر فرمائے۔ اور اعلاناً و عملاً ان میں حصہ لیا۔ جس کا مبنیٰ محض خلوص کے ساتھ اسلام اور اہل اسلام کی خدمت تھی۔ چونکہ وہ مسائل اجتہادی تھے۔ جن میں شرعاً گنجائش اختلاف کی ہوتی ہے۔ اور ان میں بعض پہلو دنیوی و دینی خطرات بھی رکھتے تھے۔ جو شرعاً واجب التحرز تھے۔ بعض اہل علم نے ان خطرات و مضرات پر نظر کر کے ان تحریکات میں رایاً و عملاً شرکت نہیں کی۔ اور احقر کا خیال بھی ان ہی علیحدگی رکھنے والوں کے موافق تھا اور اس علیحدگی کو اکثر اہل محبت مفرط نعوذ باللہ حضرت کی مخالفت سمجھتے تھے۔"

حضرت تھانوی نے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے حضرت شیخ الہندؒ کی یوں وکالت فرمائی کہ:۔

"حامیان کانگرس میں سے بعض حضرات کانگرس کے اشتراک کو استاذی مولانا دیوبندی کا اتباع سمجھتے ہیں۔ اور بعض اصحاب اس اختلاف کو مثل اختلاف حنفی و شافعی کے خیال کرتے ہیں۔ سو میرے نزدیک یہ دونو خیال محض غلط ہیں۔ حضرت مولانا کا اشتراک مشابحت تھا۔ نہ کہ متابعت۔ یعنی اس وقت تحریک خلافت نہایت قوت پر تھی۔ جس سے حضرت مولانا کو قوی امید تھی کہ حکم اسلام کا غالب ہوگا۔ اور ہم لوگوں کا خیال قرائن اور وجدان سے اس کا عکس تھا۔ سو یہ اختلاف محض رائے کا اختلاف تھا۔ اور مثل اختلاف حنفی و شافعی کے۔

اجتہادی تھا۔ اس اشتراک میں متابعت کے شائبہ کا وہم بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی شعار اسلامی کے ضعف یا کسی شعار کفر کی قوت کا ذرا شبہ بھی ہوتا تھا۔ فوراً اس پر نکیر شدید فرماتے چنانچہ مشاہدہ متواترہ اس کا شاہد ہے۔ بخلاف اس وقت کی حالت کے کہ اب کانگریس کی قوت سے کفر و شرک کا حکم غالب ہے۔ اس کی ہر تجویز سے موافقت و مداہنت کی جاتی ہے۔ اس وقت کا اشتراک بصورت ادغام بالکل متابعت ہے۔ جو کہ ناجائز ہے۔ اسلئے مسلمانوں کو اپنی تقویت اور تنظیم مستقل لازم ہے تاکہ اس کے بعد جو اشتراک ہو۔ وہ مصالحت ہو۔ متابعت نہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ اشتراک ایک لفظ مشترک ہے۔ مگر اس کے دو فردوں کا یعنی مصالحت و متابعت کا حکم جدا جدا ہے پس حقیقی امتیاز کے بعد محض لفظی اشتراک سے اشتباہ نہ ہو جائیے"

(بوادر النوادر ص ۹۶۹)

شیخ الہند کی عنایات

انہی اختلافات کے زمانہ میں شیخ الاسلام حضرت مولا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی سے استفسار فرمایا کہ ان مسائل میں جب اختلاف ہے تو مجھ کو کیا کرنا چاہیئے۔ آپ نے جواب دیا کہ "حضرت (شیخ الہند) ہم سب کے بڑے ہیں۔ مجھ پر ان کو ترجیح دینا چاہیئے۔ باقی میرا معاملہ جدا ہے"۔

اور جب حضرت شیخ الہند کی توجہ حضرت تھانوی کے اختلاف کی طرف دلائی گئی تو انہوں نے آپ کی نکیر نہیں فرمائی بلکہ فرمایا کہ:۔

(الف) "میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ کیا مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ میری ایک رائے ہے سو اس کی (یعنی) حضرت تھانوی کی بھی ایک رائے ہے۔ اس میں اعتراض و شکایت کی کیا بات ہے"

(ب) اختلاف تو ٹھیک نہیں۔ میرے جی میں یہ آتا ہے کہ میں ہی اپنی رائے سے کچھ ہٹ جاؤں"

(ج) یہاں تک کہ ان سے حضرت کی مخالفت سنی بھی نہ جاتی تھی۔ چنانچہ ایک اور موقع پر ایک صاحب نے بیرونی پروپاگنڈا سے متاثر ہو کر حضرت تھانوی کو حضرت شیخ الہند کا مخالف سمجھتے ہوئے ان سے گفتگو کے دوران میں آپ کی شان کے خلاف کوئی کلمہ کہہ دیا۔ اس پر انہوں نے اسے تنبیہ فرمائی کہ:۔

"تمہیں یہ کس طرح معلوم ہوا کہ جو میرا خیال ہے۔ وہی صحیح ہے۔ اور حق ہے ....."

..... اور مولانا تھانوی کا جو خیال ہے۔ وہ سراسر غلط ہے۔ تم نے جس جس جگہ مولانا تھانوی کی نسبت کچھ کہا ہے۔ وہاں مولانا تھانوی کی مدح و تعریف کرو۔ تاکہ اس کا تدارک ہو جائے۔"

(د) ایک اور موقعہ پر بعض ناداں دوستوں نے حضرت شیخ الہند کو تحریکات کی تقویت کے لئے تھانہ بھون لانا چاہا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ:-

"وہاں مولوی اشرف علی موجود ہے۔ میرے جانے سے اس کو تنگی ہو گی کیونکہ موافقت تو اس کی رائے کے خلاف ہو گی۔ اور عدم موافقت سے شرمائے گا اس لئے وہاں نہیں جاتا۔"

(س) اسی طرح ایک اور موقع پر فرمایا:-

"تم کیوں بار بار اُس پر اعتراض کرتے ہو۔ وہ بھی دین کا ایک کام کر رہا ہے۔"

شیخ الاسلام کا رجوع

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حضرت تھانوی کے خلیفہ خاص تھے۔ مگر تحریک خلافت وغیرہ کے دوران میں ان ہر دو بزرگوں کے درمیان بھی شدید اختلاف ہو گیا۔ حضرت تھانوی کی تحریک خلافت سے علیحدگی کے سلسلہ میں لوگوں نے جوش میں آکر آپ کو مطعون کرنا شروع کیا۔ تو اس وقت کے مسائل حاضرہ پر علماء دیوبند نے ایک فتویٰ دیا۔ جس میں تحریر تھا کہ:-

"مسائل حاضرہ میں ہمارا مسلک تو بالکل وہی مسلک ہے۔ جو حضرت استاذ مولانا مولوی محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقرر فرما گئے ہیں۔ لیکن بہ نسبت مولانا اشرف علی صاحب کے بسبب حسن ظن کے ہمیشہ تاویل کی ہے۔ کبھی تفسیق نہیں کی اور نہ کسی کو اجازت دی۔"

اس فتوے پر دیوبند کے دیگر بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بھی دستخط تھی۔ جس پر انہوں نے اپنی طرف سے یہ الفاظ بھی بڑھا دیئے تھے کہ اما انا فمولانا التھانوی یسئل عنی ولا اسال عنہ کہ میرا یہ رتبہ نہیں کہ مجھ سے مولانا تھانوی کے متعلق پوچھا جائے۔ بلکہ اگر ان سے میری نسبت پوچھا جائے تو زیبا ہے اور جو کسی کی سمجھ میں کچھ اور آوے۔ تو خود صاحب عبارت سے پوچھ لیا جاوے۔

جب یہ جوش کا زمانہ گذر گیا۔ اور آہستہ آہستہ سب کو ہوش آنے لگا تو حضرت

شیخ الاسلام نے بھی فوراً اپنے شیخ کی طرف رجوع کر لیا جس کی اطلاع حضرت تھانویؒ نے ان الفاظ میں مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کے استفسار پر دی کہ :۔

"مولوی شبیر احمد صاحب نے ہمت کی کہ اعلان تجویز شدہ کو خود لطیف بنا کر مجھ سے موافقت حاصل کر کے شائع کرا دیا۔ خود بھی آ گئے تھے۔ مگر اعلان کے قبل بھی ملنے آئے تھے۔ میں اکرام و احترام سے ملا۔ باتیں بھی کیں"۔ (حکیم الامت ص۴۲۵)

مولانا عثمانیؒ کے رجوع سے حضرت کو اتنی مسرت ہوئی کہ ان کی مریدانہ حیثیت کو مساوی بنا دیا۔ اور اس کے متعلق آپ نے مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کو لکھا کہ :۔

"جب اعلان آیا۔ وہ موجود نہ تھے۔ ورنہ بلا کر خود منا۔ اب آئیں گے تو لسا نشت بھی ہو گی۔ البتہ یہ کہہ دوں گا کہ اب منا پہلی حیثیت سے نہیں اسلئے اب میرے ساتھ تعظیم یا استفادہ کا برتاؤ نہ کیا جاوے۔ مساویانہ یا برادرانہ برتاؤ رکھا جائے۔ اور ان کو بھی چاہیئے کہ اس کو قبول کر لیں"۔ (بحوالہ صادر)

اکابر دیوبند کا اختلاف

سیرت کے حصہ دوم میں اس بات کا ذکر آ چکا ہے کہ حضرت تھانوی نے مدرسہ دیوبند کے اہتمام سے بعض مذکرہ الصدر نوعیت کے اختلافات کی بنا پر خود کو بذریعہ اعلان اخبار معزول کر لیا تھا۔ مگر لوگوں نے اسے بھی خوب پھیلایا۔ جس سے متاثر ہو کر مولانا عبدالماجد نے حضرت تھانوی کو لکھا۔

"دیوبند کے حالات سے اللہ جانتا ہے کہ بڑا ہی دل دکھتا ہے۔ خصوصاً اپنے دونوں بزرگوں کے اختلاف دیکھ کر۔ صحابہ کرام کے اختلافات تسکین و تشفی کے لئے سامنے نہ ہوتے۔ تو دل بالکل ہی مایوس ہو کر رہ جاتا"۔ (حکیم الامت ص۲۶)

اس کے جواب میں حضرت تھانوی نے لکھا :۔

"واقعی سچی محبت اور خیر خواہی یہی ہے جزاکم اللہ تعالیٰ۔ اب میں بھی صدق و خلوص سے حقیقت عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ حقیقت اس تحقیق کی میری بھی سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ بالکل مبہم ہے۔ میرے ذہن کو مبہم سمجھنے کی عادت نہیں۔ ضرورت ہے کہ حسب ذیل نقشہ پر کر کے مجھ کو عطا فرمایا جاوے۔ تاکہ مجھ کو موقع ملے نظر کرنے کا اور نظر کرانے کا :۔

اختلاف کا واقعہ جو اشرف علی کے متعلق معلوم ہوا	معلوم ہونے کا ذریعہ	مشورہ جس پر اشرف علی کو کاربند ہونا مناسب ہے

مگر مولانا عبدالماجد صاحب کی طرف سے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں بھی حضرت تھانوی کو ناحق منسوب و مطعون کیا جا رہا تھا۔ فی الاصل بات اتنی نہ تھی۔ جتنی بڑھائی گئی تھی۔ جس کی تائید حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے حسب ذیل گرامی ناموں سے ہوتی ہے:۔

(۱) مولانا نے ایک معترض کو اس کے خط کے جواب میں لکھا:۔

"سلام مسنون۔ لفافہ آپ کا پہنچا۔ حالات معلوم ہوئے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب سے حالات حاضرہ میں ہم کو اختلاف ضرور ہے لیکن یہ اختلاف ایسا نہیں ہے کہ جس سے ہم مولانا کی توہین اور گستاخی کو گوارا کریں۔ مولوی . . . . صاحب نے جو کچھ کیا یا کہا اپنی طرف سے کیا۔ ہم اس کو پسند کبھی نہیں کرتے۔ اور نہ اس کی اجازت دے سکتے ہیں۔

۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۹ھ"

(۲) مولانا موصوف نے ۱۶ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ کو حضرت تھانوی کو اختلافات کے باوجود دیوبند آنے کی دعوت دی اور دعوت نامہ میں لکھا کہ:۔

"یہاں بحمداللہ کسی کو انقباض و تکدر...نہیں۔ اگر فی الواقع ایسا ہو بھی۔ تب بھی مجھے جناب سے یہی توقع رکھنی چاہیئے کہ اس عقدہ کو حل فرما کر جماعت کو انتشار و تشتت سے بچالیں مجھے خود بھی جناب سے بعض رایوں میں اختلاف تھا۔ لیکن الحمدللہ تنقیص و توہین کو سننا بھی گوارا نہیں کیا۔ اختلاف آرا مسائل کی صورت میں اعتراض کرنا شرعاً مذموم نہیں سمجھا گیا۔ سب سے اول مشاجرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھا جائے کہ جلیل القدر صحابہ یہاں تک کہ عشرہ مبشرہ بلکہ خلفائے راشدین میں بوجہ اختلاف اعتراض کئے گئے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ قتال کی نوبت پہنچ گئی۔ لیکن یہ اسی حد تک تھا۔ جہاں تک اختلاف رائے کا تعلق تھا۔ اور جب نفس ذات پر نظر جاتی تھی۔ تو وہی اصل ارتباط معلوم ہوتا تھا۔

اس کے بعد مجتہدین اور ان کے اتباع کے اختلافات موجود ہیں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ حضرت امام اعظمؒ پر اور ان کے متبعین پر سخت الفاظ میں اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن جب نفس ذات امام اعظمؒ اور ان کے فضل و کمال پر نظر جاتی ہے۔ تو نہایت درجہ کا ادب کرتے ہیں یہاں تک کہ نماز صبح میں قنوت بھی ترک کر دیتے ہیں۔ اس طرح امام شافعیؒ اپنے استاد امام مالکؒ

پر سختی سے اعتراض کرنے میں ۔ یہ بھی بطور قاعدہ کلیہ کے ہے کہ اختلاف اگرچہ اصولی نہ ہوں۔ فرعی ہوں حقیقی نہ ہوں لفظی ہوں۔ مگر ابتداءً بوجہ جوش و ہیجان ایک دوسرے کے خلاف جو ایسے الفاظ استعمال کر لیتے ہیں اور بسا اوقات یہ جزوی اختلاف فساد کی طرف منجر ہو جاتے ہیں مگر انجام کار سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ اشاعرہ و ماتریدیہ اصولاً متفق ہیں۔ صرف چند مسائل میں اختلاف کی وجہ سے کیسے کیسے خلاف ہوئے۔ طعن و تشنیع کے دروازے کھلے۔ نوبت بمخاصمت و تذلیل پہنچی۔ مگر انجام جب صلح ہوئی۔ تو معلوم ہوا کہ اکثر اختلافات صرف لفظی تھے اور جو بعض حقیقی تھے۔ تو ان سے تضلیل و تفسیق ہوئی بجنسہ یہی حالت ہم لوگوں کی جناب کے ساتھ تھی۔ اختلاف ضرور تھا۔ اعتراض بھی کرتے تھے۔ لیکن جناب کی ذات سے دینی تعلق تھا کسی حالت ناراضی میں کوئی لفظ بھی کہا تو وہ اس حالت کا اقتضا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں اور ہم میں سے اکثروں نے بالکل احتیاط کا طریقہ رکھا۔ اور اکثروں کا طریقہ یہ رہا کہ نفس مسئلہ میں اختلاف کے ساتھ جناب کی طرف سے مدافعت بھی کرتے رہے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔ اس سے میری غرض یہ ہے کہ ایسے شدید ہیجان جوش اور اختلاف رائے کے وقت اگر کسی سے کوئی امر خلاف شان سرزد ہوا۔ تو ایسی حالت میں کہ اصولاً سب متفق ہیں اختلاف ہے۔ تو صرف مصالح دینی کی بنا پر۔ جس کے نزدیک جو جانب راجح معلوم ہوئی۔ اس پر عمل کیا۔ تو میرے نزدیک اس میں زیادہ کنج کاوی نہ کی جائے۔ بلکہ اصول کو پیش نظر رکھ کر عارضی اختلافات کو رفع کر دیا جائے۔ خلاصہ عرض یہ ہے کہ بہت سی روایات اور واقعات اصلی حالت میں نہیں پہنچے اور اس میں شک نہیں کہ اختلاف پیدا ہوا۔ اور اس کی وجہ سے شکوہ شکایت اور اعتراضات کی نوبت پہنچی۔ لیکن بایں ہمہ یہ اعتراضات مخالفانہ یا معاندانہ نہ تھے۔ بلکہ جیسا کہ اہل حق کی دو جماعتوں میں اکثر ہوا ہے۔ تھے۔ اکثر اختلافات کا مبنیٰ عزیمت و رخصت پر تھا۔ ایسی حالت میں باوجود اختلاف کے دینی تعلقات برابر قائم رہے۔ اور ہیں۔ جن اکابر یا بالخصوص اصاغر کی طرف جناب کو خیال ہے۔ ان کی طرف بہت سی باتیں غلط طور پر منسوب ہوئیں۔ صورت حال ایسی تھی کہ جو کچھ روایت ہوا۔ چھاپ ہو گیا اور اس میں کسی ایک جانب کی خصوصیت نہیں رہے۔ یہ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ تعلقات کبھی بھی منقطع نہیں ہوئے۔ ۔ ۔ فریقین نے اختلاف رائے کی وجہ سے اعتراض تو کئے ہیں۔ توہین و تنقیص نہیں کی اور نہ ان کا مقصود یہ تھا۔ مجھے امید ہے کہ جناب ان روایات پر توجہ نہ فرما دیں گے۔

اور میری نیازمندانہ عرض قبول فرما کر یہاں (دیوبند) تشریف لانے کا قصد فرماویں گے"۔

صلح کی مسرت یہ دعوت نامہ اس بات کا مظہر ہے کہ مخالفین و معاندین نے کس طرح رائی کو پہاڑ بنا کر حضرات دیوبند اور حضرت تھانوی کے اجتہادی اختلافات کو ہوا دی۔ حضرت تھانوی کے دل میں تو کسی کے خلاف کدورت تھی ہی نہیں۔ آپ تو سب مخالفین و معاندین کو پیشگی معاف کر چکے تھے۔ بس اس دعوت نامہ کو پڑھتے ہی آپ دیوبند چلنے کو تیار ہو گئے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ:-

"اس کے بعد میں نے عذر کی کوئی گنجائش نہیں دیکھی اور چہارشنبہ ہی کے روز دیوبند حاضر ہو گیا۔ اور پنجشنبہ کو تمام دن لقاءِ احباب سے جانبین میں عید کا لطف حاصل رہا اور اس لطف کی تکمیل شب جمعہ کے ایک وعظ پر ختم ہوئی۔ جس کی احقر کو فرمائش کی گئی اس وعظ کا نام "آداب التبلیغ" ہے۔ جو چھپ چکا ہے۔ اس صلح کی مسرت کے ساتھ ایک دوسری صلح کی مسرت فوراً ملی نور ہو گئی۔ یعنی زمان مکاتبت میں ایک عزیز کے خط میں یہ خبر نظر سے گذری کہ آج ترکوں کا معاہدہ اپنے مخالفین سے مکمل ہو چکا ہے اور دستخط ہو گئے ہیں"۔
(یوم الجمعہ ۱۳۴۱ھ)

مولانا مدنی کا معاملہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور حضرت تھانوی کے درمیان بھی ویسے ہی اختلافات تھے۔ جیسے حضرت شیخ الہندؒ کے درمیان مگر مخالفین نے کاندھلہ میں غالباً ۱۳۳۹ھ میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے حضرت تھانوی کے متعلق سوال کیا۔ تو مولانا بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ "یہ کیا واہیات سوال ہے۔ ہم تو ان کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ اپنے دوسرے بڑوں کو"۔ بعد ازاں معاندین نے ان اختلافات کو اتنی اہمیت دی کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسی شخصیت بھی اس پروپگنڈا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں کہ:-

۱۔ "کانوں نے بیشک یہی سنا تھا۔ کہ اُن کے اور اِن کے درمیان بے لطفی ہے نا چاقی ہے"۔ (حکیم الامت صـ۱۶)

۲۔ "دیوبند کے حالات سے اللہ جانتا ہے کہ بڑا ہی دل دکھتا ہے خصوصاً اپنے دونوں بزرگوں کے اختلاف دیکھ کر"۔ (حکیم الامت صـ۴۶)

لیکن جب مولانا عبدالماجد صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی معیت میں

پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے اور یہ دونوں بزرگ صبح کی نماز حضرت تھانوی کے پیچھے پڑھ کر فارغ ہوئے ۔ تو مولانا عبدالماجد صاحب کیا دیکھتے ہیں؟ اس کی تفصیل خود ان کی زبانی یہ ہے کہ:-

"نماز ختم ہوئی ۔ سلام پھیرا ۔ دعا مانگ کر جونہی حضرت (تھانوی) اُٹھے ۔ نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی ۔ ان کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے اور بڑے التفات سے ملے ۔ لوگ تو کہتے تھے کہ بڑے خشک مزاج ہیں ۔ خشک مزاج ایسے ہی ہوتے ہیں؟ یہ نرم بشاش چہرہ ۔ یہ ہنستا مسکراتا ہوا بشرہ کسی خشک مزاج کا ہو سکتا ہے؟ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے اور ان کے درمیان بے تعلقی ہے ناچاقی ہے ۔ کانوں نے بیشک یہی سنا تھا لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں ۔ کہ دو دشمن نہیں ۔ دو دوست گلے مل رہے ہیں ۔ تعظیم و تکریم مولانا حسین احمد صاحب کی طرف سے تو خیر ہوتی بھی ۔ عادت طبعی ہونے کی بنا پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بنا پر بھی ۔ لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا تھا کہ اُدھر سے بھی آداب و مراسم تکریم میں کوئی کمی نہ تھی"۔
(حکیم الامت ص ۱۶-۱۷)

حضرت تھانوی کے آداب و احترام کے بعد حضرت مدنی کا اخلاص و اکرام بھی قابل قدر ہے ۔ جب مولانا مدنی صاحب کے مرید باصفا مولانا عبدالماجد صاحب حضرت تھانوی کے ہاں چند دنوں کے لئے تھانہ بھون جا کر قیام فرماتے ہیں ۔ تو انہیں تھانہ بھون میں حضرت مولانا مدنی کا یہ خط موصول ہوا ۔

"محترم المقام زید مجدکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
والا نامہ محررہ ۱۶ر اکتوبر (۱۹۲۹ء) باعث سرفرازی ہوا تھا ۔ اب تو جناب خانقاہ میں پہنچ گئے ہوں گے ۔ خداوند کریم وہاں کی حاضری باعث برکات لاانتہا ء کرے ۔ آمین

چوں با حبیب نشینی و بادہ پیمائی ۔ بیاد آر محبان بادہ پیما را

مجھ کو قوی امید ہے کہ آنجناب وہاں پر اپنے اوقات کو مشاغل حقیقیہ میں صرف فرماوینگے جن کے متعلق ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں ۔
البتہ ایک ضروری عرضی محض اخلاص کی بنا پر کرتا ہوں ۔ اور امیدوار ہوں کہ کسی غیر

محمل پر محمل نہ فرمائیں گے۔ میں نے حسب الارشاد حضرت مولانا (تھانوی) دامت برکاتہم اور آپ حضرات کے اصرار پر اُس وقت آپ کو بیعت کر دیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بدحالی۔ رو سیاہی۔ ناکامی پر نہایت درجہ گریہ کناں ہوں۔ اور سخت شرمندہ۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا دامت برکاتہم کے دربار میں پہنچا دیا ہے۔ اور مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے اُنس اور تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ وللہ الحمد اللہم زد فزد۔ اب مناسب اور ضروری ہے کہ آپ مولانا سے بھی بیعت کر لیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ مولانا دامت برکاتہم آپ کو نہ ٹالیں گے۔ میں نے خود ان دنوں جب حاضر ہوا تھا۔ عرض کیا تھا کہ آپ جب تشریف لائیں۔ اور وہ درخواست کریں۔ تو جناب ان کو ضرور بیعت کر لیں قواعد طریقت کے اصول پر بیعت کر لینا ہی زیادہ تر مفید اور کارآمد ہے۔ اسی کی بنا پر فیض کی زیادہ تر امید ہے۔

مجھ رو سیاہ کو بھی کبھی کبھی دعوات صالحہ سے یاد فرما لیا کریں۔ نیز مولانا دامت برکاتہم سے بھی دعا کی التجا کر دیا کریں۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ دیوبند۔ ۲۰ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ

(حکیم الامت صفحہ ۹)

اس گرامی نامہ کا جواب مولانا عبدالماجد صاحب کی بجائے حضرت تھانوی نے یہ دیا:۔

"مخدومی و مکرمی مولانا حسین احمد صاحب دامت فیضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولوی عبدالماجد صاحب کے نام جو گرامی نامہ آیا۔ اس میں مشورہ تحویل بیعت کا پڑھا گو اس وجہ سے کہ میں اس کا مخاطب نہیں۔ مجھ کو جواب عرض کرنے کا استحقاق نہیں لیکن چونکہ اخیر تعلق مجھ سے ہی ہے۔ نیز اس میں مجھ کو مخاطب بنانے کی یاد دہانی بھی ہے اسلئے عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

مجملاً تو وہی عذر ہے۔ جو زبانی عرض کیا تھا۔ اور قدرے مفصلاً یہ عرض ہے کہ اس میں مولوی صاحب کا ضرر ہے اسلئے امید ہے۔ کہ اس مشورہ سے رجوع فرمائیں گے۔ وہ ضرر یہ ہے کہ میری خشونت و سوءِ خلق تو مشتہر ہے ہی۔ مگر مولوی صاحب کی یہ رعایت و دلجوئی جو محض قلب سے ہے۔ وہ آپ ہی کے انتساب سے مسبب ہے۔ کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ وہ اس

رعایت سے محروم کر دئے جائیں۔ دوسرے گو ان کو مجھ سے مولانست کافی ہے۔ لیکن نفع کا مدار اعظم مناسبت ہے۔ اس کو میں پہلی ملاقات میں طے کر چکا تھا۔ اور اسی بنا پر آپ نے میری سفارش کو قبول فرمایا۔ جس کا میں شکر گذار ہوں۔ اور اگر ان بناؤں کو آپ ضعیف خیال فرمائیں۔ تو میں بھی ان کی تقویت پر زور نہیں دیتا۔ لیکن جب اول بار میں بقول خود۔ میری خاطر منظور تھی۔ سو اب بھی میری خاطر منظور فرمائی جائے۔ اور جس طرح کام چل رہا ہے چلنے دیا جائے۔ کہ آپ اُن کے مخدوم رہیئے اور مجھ کو خادم رہنے دیجئے۔ اس جدید تبدل میں میری اور ان کی دونوں کی پریشانی مضمر ہے۔ جس کا گوارا کرنا اخلاق سامی سے بعید اور بہت بعید ہے۔ اور جب اس کا مجھ پر مدار ہے۔ اور میری طرف سے محض انکار ہے۔ تو مولوی صاحب کو ایسی بات کا حکم فرمانا۔ جو اُن کی قدرت سے خارج ہے تکلیف مالا یطاق ہے۔ جو ہر پہلو سے منفی ہے۔ والسلام

ناکارہ ننگ انام۔ اشرف برائے نام از تھانہ بھون جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۸ھ

(حکیم الامت صـ ۹۲-۹۱)

یہ خط وکتابت عین اختلافات کے زمانہ یعنی ۱۹۲۹ء کی ہے۔ اس لئے مولانا عبد الماجد صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"سیاسی اختلافات مولانا حسین احمد صاحب سے اس وقت بھی تھے۔ اس پر بھی اس وقت تک اُن کا پورا لحاظ و احترام قائم تھا۔" (حکیم الامت صـ ۱۱۳)

زمانہ گزرتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اختلافات کی خلیج بھی وسیع ہوتی گئی۔ پورے آٹھ سال بعد بھی ان ہر دو حضرات کے درمیان عزت و عظمت کے وہی قابل رشک نظارے دیکھے گئے۔ خود مولانا حسین احمد صاحب کے مرید باتمیز مولانا عبد الماجد صاحب اس بات کی شہادت ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

"تھانہ بھون اور دیوبند کے سیاسی مسلک میں اختلاف کچھ آج سے نہیں۔ مدت دراز سے بالکل واضح و غیر مخفی تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں بزرگوں کے ذاتی تعلقات بڑے خوشگوار اور شگفتہ تھے۔ نہ شفقت میں کوئی کمی حضرت تھانوی کی جانب سے تھی اور نہ احترام وغیرہ گذاشت میں کوئی فرق مولانا حسین احمد کی طرف سے"

(حکیم الامت صـ ۵۱۰)

یہ حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ جن اکابر کو دانستہ یا نادانستہ ایک دوسرے کا سخت ترین مخالف ظاہر کیا جاتا تھا۔ ان میں کس درجہ التفات وارتباط تھا۔ اور ان کے اختلافات بھی کیسے اصول صحیحہ کے موافق اور حدود شرعیہ کے اندر تھے۔ جس کی کسی دوسرے مکتبہ فکر میں مثال ملنی مشکل ہے۔ بلکہ بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی :۔

افراط وتفریط

"قوم عجیب افراط وتفریط کے مرض میں اندھا دھند مبتلا ہے کسی سے خوشں ہوئے تو اسے پوجنے لگے۔ خفا ہوئے تو گالیاں دینے لعنت برسانے لگے۔ گویا اُن کا لیڈر یا امیر فرشتہ ہو۔ اگر فرشتہ نہیں ہے۔ تو پھر شیطان کے اُوپر کوئی درجہ نہیں۔ توازن واعتدال کا گویا قحط پڑ گیا ہے اور اشخاص و رجال کو۔ ان کے صحیح مقام پر رکھنا ہم لوگ بھول ہی گئے ہیں۔ شیعیت اور خارجیت دونوں بے اعتدالی کی پیداوار ہیں۔ اور اہل سنت کا مذہب جو ان بین اور سارے پہلوؤں کے درمیان ایک حکیمانہ توازن کے ساتھ قائم ہوا تھا۔ افسوس کہ وہ خود اب اسی بدبختی کا شکار ہوا جا رہا ہے۔" (حکیم الامت ص۹۱)

ذکر و فکر

میانہ روی

اسلام کی تمام تعلیمات اعتدال پر مبنی ہیں۔ وہ سکھلاتا ہے کہ:۔

الف۔ اگر کسی کا کوئی ایسا فعل دیکھو۔ جو بظاہر محل نظر ہو۔ تو اس کے متعلق فی الفور بلا تحقیق فتویٰ صادر نہ کرو۔ اگر کسی شرعی دلیل سے اس کے جواز کا پہلو نکلتا ہو۔ تو پھر تاویل سے کام لو۔ اسے ذلیل نہ کرو۔

ب۔ اگر آپ حسن ظن سے کام نہیں لے سکتے اور اس کی برائیاں نمایاں کرنے پر مجبور ہیں تو حق پسندی وحق شناسی سے کام لیتے ہوئے۔ اس کی خوبیاں بھی بیان کر دو۔

ج۔ اگر اس کی خوبیاں بیان نہیں کرنا چاہتے۔ تو نرمی اور مروت سے کام لیتے ہوئے اس کا ذکر اسی انداز سے کرو کہ اسے یا اس کے ہم خیال لوگوں کو ناگوار نہ گزرے۔

د۔ اگر اس کی بھی ہمت نہیں۔ تو احترام انسانیت کے تحت اس کی برائیوں کو بھی برا سمجھو اس کی ذات کو سب وشتم کا نشانہ نہ بناؤ۔

گر ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں بڑے بڑوں کے پائے استقلال میں لغزش آگئی۔ اور وہ کم فہمی یا بغض وحسد کی وجہ سے اعتدال کا دامن چھوڑ بیٹھے اور تشتت وتفریق کی خلیج وسیع سے وسیع ترکرتے چلے گئے۔

اس دور افراط وتفریط میں اگر کوئی جادۂ اعتدال سے سر مو نہیں بھٹک سکا۔ تو وہ صرف تھانہ بھون کا یہ مرد حق تھا۔ جس نے بقول سے:-

"اپنے اور پرایوں کو قرآن وحدیث کی میزان پر تولا۔ اور جو جتنا اترا۔ اس کا حق ادا کیا۔ ان کی طبعی جبلی مجبوریوں۔ ذہنی وفکری خطاؤں۔ حالی ومقالی لغزشوں کی حدود شرع کے اندر تاویلات کیں۔ اور حسن ظن کی تلقین فرمائی۔ جو باتیں دائرۂ شریعت کے اندر نہ آسکیں۔ ان پر سکوت فرمایا۔ جو چیزیں حرم شریعت سے ٹکرائیں ان کا صاف صاف رد کیا۔ مگر صاحب قول پر لعن طعن اور سب وشتم سے پھر بھی گریز کیا۔"

(حیات اشرف صہ ۲۲۱)

جس کی تائید آپ کی مندرجہ ذیل آراء وافکار سے ہوتی ہے۔ جو آپ نے وقتاً فوقتاً ایسی جماعتوں اور شخصیتوں کے متعلق ظاہر فرمائیں۔ جن کے متعلق رائے قائم کرنے میں بڑے بڑے علماء وفضلا نے غلو ومبالغہ یا تنگ نظری وتنگ ظرفی کا مظاہرہ کیا۔

شیخ ابن عربی حضرت شیخ محی الدین ابن عربی المعروف بہ شیخ اکبر کو صوفیا کی ایک جماعت تو امام مانتی ہے۔ ادھر علماء کی دوسری جماعت ان پر کفر کا فتویٰ صادر کرتی ہے۔ مگر حضرت تھانوی کی میانہ روی ملاحظہ ہو۔ آپ لکھتے ہیں کہ:-

"میرا مسلک حضرت شیخ قدس سرہ کے باب میں یہ ہے کہ بنا بر شہادت جم غفیر اکابر امت جس کی حجیت انتم شہداء فی الارض سے ثابت ہے۔ شیخ کی مقبولیت وولایت کا عقیدہ کامل رکھتا ہوں۔ اور شیخ کے اکثر علوم جو از قبیل اسرار ہیں اور میرے فہم سے خارج ہیں۔ عقلاً نہ ان کے اثبات کا حکم رکھتا ہوں بامتثال لاتقف ما لیس لك به علم اور نہ ان کی نفی کا بایماء آیت بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ اور بلا ضرورت شرعیہ ان کی اشاعت اشتغال کو مضر سمجھتا ہوں بحکم آیت واما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ اور طبعاً ان کے قول کی طرف توجہ کرنے سے قلب میں اطمینان

نہیں پاتا ہوں۔ اسلئے مطابق حدیث دع ما یریبک الی ما لا یریبک ان کا استغفار نہیں کرتا۔ اور جن علماء نے حفاظت شریعت کے لئے حدود شرعیہ کے اندر رہ کر اقوال شیخ بلکہ شیخ پر نکیر کیا ہے ان کو حسب آیت لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا اور حدیث انما الاعمال بالنیات۔ اور اس مجموعی مسلک میں اپنے کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ متوافق دیکھتا ہوں۔ جیسا کہ ان کے بعض مکتوبات سے ظاہر ہے۔ البتہ مجدد صاحب میں یہ امر مزید ہے کہ وہ ان کے اقوال پر کلام بھی کرتے ہیں۔ جو بوجہ ان کے محقق و صاحب کشف ہونے کے ان کا حق ہے۔ اور ہم یہ منصب نہیں رکھتے۔ بقول عارف رومیؒ سے

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ　　برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

حسین ابن منصور

زمرۂ عشاق میں سب سے زیادہ بدنام شخصیت حسین ابن منصور حلاج کی ہے۔ جو خود اپنے شیخ کے قول کے مطابق مردود ہے۔ ان کے متعلق حضرت تھانویؒ نے ایک تحقیقی رسالہ "القول المنصور فی ابن منصور" کے نام سے لکھوایا ہے جس کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ:۔

"کسی غیر مقبول کے ساتھ حسن ظن رکھنا مضر نہیں۔ اور مقبول سے بلا وجہ بدگمانی کرنا مضر ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی رذیل کے ساتھ شریفوں جیسا معاملہ کرنا برا نہیں۔ لیکن کسی شریف کے ساتھ رذیلوں جیسا برتاؤ بہت برا ہے۔"

اس کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ایسی سخت سزا اور سنگین مصیبت کو اس درجہ صبر و استقلال کے ساتھ اور خندہ پیشانی سے تحمل کرنا نہ کسی زاہد خشک سے ممکن ہے نہ کسی ساحر زندیق سے اور عین اس حالت میں نشہ توحید سے سرشار ہو کر محبت و عشق الٰہی کا ایسا درد انگیز اظہار کرنا کہ مشائخ وقت بھی نعرہ حسب الواحد افراد الواحد لہ سن کر رقت پذیر ہو گئے۔ اور درد انگیز حالت میں شبلیؒ جیسے امام طریقت کے سوالات کا جواب دینا ابن منصور کی جس شان یکتائی کو ظاہر کرتا ہے زمانہ کی نگاہوں نے اس کا نظارہ بہت کم کیا ہوگا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ ابن منصور کا واقعہ قتل اور سانحہ ہوش ربا ہی ان کے سچے صوفی۔ عاشق فانی۔ محبوب

سبحانی اور صاحب استقلال لاثانی ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ رہا یہ امر کہ اس مجمع میں کسی نے بھی ان کی اس حالت استقامت اور مستی محبت درجۂ کمال سے ان کی ولایت ومعرفت پر کیوں نہ استدلال کیا، تو اہل بصیرت نے ضرور کیا ہوگا۔"

حضرت تھانویؒ کو چونکہ ہر وقت اپنے مسیح ہونے کا استحضار رہتا تھا۔ اور آپ عبدیت میں فنا رہتے تھے۔ اسلئے آپ اپنے شدید ترین مخالفین کو بھی برا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ انکی زیادتیوں کے مقابلہ میں آپ ہمیشہ حسن ظن اور تاویل سے کام لیتے تھے۔ اور آپ کی نظر عیوب پر نہیں بلکہ صفات پر رہتی تھی۔ جس کا اندازہ ذیل کے تاثرات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلویوں کے سب سے بڑے امام گزرے ہیں۔ جو اہل حق سے بے حد دشمنی رکھتے تھے۔ اور حضرت تھانوی کے سخت ترین مخالف تھے۔ یہاں تک کہ حدود تہذیب سے بھی تجاوز کر جاتے تھے۔ مگر حضرت تھانوی کی ان کی ذات اور ان کی جماعت کے متعلق یہ رائے تھی:۔

"ممکن ہے ان کی مخالفت کا سبب واقعی حبِ رسول ہی ہو۔ اور وہ غلط فہمی سے ہم لوگوں کو نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخ سمجھتے ہوں۔"

یہ فرما کر آپ اپنے مخلصین کو اپنے مخالفین کی مخالفت سے باز رکھتے تھے۔ مگر ان کی طرف سے بھول کر بھی ایسی رواداری اور وسیع النظری کا کبھی مظاہرہ نہیں ہوا۔

سرسید احمد خاں مسلمانوں کے مخلص خادموں میں سے گذرے ہیں جن کے خلاف عرب وعجم کے علمائے کرام نے کفر کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ مگر حضرت تھانوی کی نظروں میں وہ کچھ اور ہی تھے۔ اس لئے حضرت تھانوی ان کے ذکر آجانے پر تو اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"عیب مے جملہ بگفتی۔ ہنرش نیز بگو۔ سرسید کو مسلمانوں کے دنیوی فلاح کی بہت ہی دھن تھی۔ اور اس معاملہ میں بڑی دلسوزی تھی۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اسی صفت پر فضل فرما دیں۔"

آپ اکثر سرسید کی اس صفت کے متعلق نیز بعض اکابر کے ساتھ ان کے حسن عقیدت کے واقعات نقل کر کے فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"سرسید کا عقیدہ توحید ورسالت کے متعلق جس درجہ کا بھی تھا۔ وہ نہایت پختہ

اور بلا وسوسہ تھا۔ جیسا کہ ان کی تصانیف سے مجھ کو اندازہ ہوا ہے۔ اور قرآن و حدیث میں انہوں نے جو جو تاویلات و توجیہات کی ہیں ان کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مخالفین کا اسلام پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو سکے۔ گو یہ طرز جو انہوں نے اختیار کیا تھا۔ وہ غلط تھا۔ اسلئے میں انہیں ناداں دوست کہا کرتا ہوں۔"

ان کو فاسق فاجر کہنے والوں کو آپ یہ جواب دیا کرتے تھے کہ

بعضے فاسقوں میں کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔ جو بڑے بڑے مشائخ میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا کسی کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے۔"

اور اپنے اس نظریہ کی تائید میں آپ انہیں بڑے بڑے فاسقوں اور فاجروں کے ایسے ایسے واقعات سنایا کرتے تھے۔ جن سے ان کا عاشق دین ہونا ثابت ہوتا تھا۔ چونکہ سرسید کے خلاف فتویٰ دینے والوں نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا۔ اسلئے انہوں نے ٹھوکر کھائی اور اس محقق تھانوی کو ان کی رائے سے اختلاف کرنا پڑا۔

مولانا محمد علی جوہرؒ مشاہیر ہند میں سے مسلمانوں کے محبوب اور مخلص رہنما تھے۔ گو حضرت تھانوی سے سخت سیاسی اختلافات رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت کی آمادگی کے باوجود یہ مسائل اختلافیہ پر حضرت سے گفتگو کرنے کے لئے بھی بخوشی آمادہ نہ ہوئے۔ گو حضرت تھانوی کے دل پر اس کا ذرہ بھر ملال نہ آیا۔ بلکہ وہ بدستور حضرت کی نظر میں محبوب ہی رہے۔ جس کا اظہار حضرت نے ان کی وفات کے بعد ان الفاظ میں فرمایا:۔

"محمد علی کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر مجھے محبت ہے۔ وہ صرف ایک صفت مسلمانوں کی سچی۔ بے غرض محبت ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں۔ میں نے کبھی دیکھا نہیں۔ اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح صفات سمجھتا ہوں۔" (حکیم الامت ص۱۷۶)

ارباب بدعت جو ارباب بدعت حضرت تھانوی کے رد بدعات کو برداشت نہ کر کے آپ پر کفر کے فتوے لگانے میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کے متعلق آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"علماء کے وجود کو میں دین کے بقا کے لئے اس درجہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر سارے علماء بھی ایسے ہی مسلک کے ہو جائیں۔ جو مجھ کو کافر کہتے ہیں۔ تب بھی میں ان کی بقاء

کی دعائیں مانگتا رہوں۔ کیونکہ گو وہ مسائل میں غلو کریں اور مجھ کو بُرا کہیں لیکن وہ تعلیم تو قرآن و حدیث ہی کی دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے دین تو قائم ہے۔ میں ان کو دہریے مدعیان اسلام کے مقابلہ میں ہزار درجہ غنیمت سمجھتا ہوں۔ جو سرے سے دین کو اڑانا چاہتے ہیں۔ اور خدا جانتا ہے کہ اس وسعت رائے میں میری کوئی ذاتی مصلحت نہیں۔ بلکہ اس کا منشا محض حفظ حدود ہے۔"

پیران زر دنیائے تصوف میں ایسے "پیران پارسا" کی بھی کمی نہیں جنہوں نے تصوف کی "دکانیں" کھول رکھی ہیں۔ اور جن کا مقصودِ حیات صرف لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کرنا ہے۔ ان کے متعلق حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ:۔

"ان کھاؤ کماؤ پیروں پر بھی مجھے رحم ہی آیا کرتا ہے کہ بچارے اور تو کسی کام کے نہیں۔ آخر کیا کریں۔ پیٹ تو پالنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں کھانے پینے کو دے رکھا ہے۔ ورنہ اگر کھانے پینے کو نہ ملتا۔ تو خدا جانے ہم بھی کس حال میں ہوتے۔ اور ہماری نیت بھی کیسی ہو جاتی۔ یہ استغنا بھی پیٹ بھرے کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ابتلا و امتحان سے محفوظ رکھے۔ گو عقلاً و اعتقاداً میں ان کے طریقہ کو بُرا سمجھتا ہوں۔ لیکن طبعاً ان پر رحم بھی آتا ہے۔ جس کا یہ اثر ہے کہ بجائے صرف غصہ آنے کے بنا بر ترحم ان کی اصلاح و ہدایت کے لئے دعا بھی دل سے نکلتی ہے۔

اسی طرح باوجود بھک منگوں کے پیشہ سے نفرت ہونے کے ان کی یہ صفت پسند ہے کہ بیچارے سب کے لئے ہر حال میں دعا گو ہیں۔ اور سوائے مانگنے کے اور کسی فتنہ انگیزی، شور و شر یا فرقہ بندی میں شامل نہیں۔ بس اپنے بھیک مانگنے سے کام ہے۔

اسی طرح گو کفار پر اعتقاداً اور ایک کافی حد تک طبعاً بھی غصہ ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ تکوینی حیثیت سے اس میں بھی حکمتیں ہیں۔ غیظ طبعی میں اعتدال رہتا ہے۔"

تحقیق و اعتدال کا یہ درجہ بھلا کسے نصیب!

ارباب علم و فکر بصیرت محض مطالعہ سے پیدا نہیں ہوا کرتی۔ اس کے لئے اہل اللہ کی صحبت بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس وقت جو نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے ہیں وہ سب

اسی بصیرت کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ اوران کے بانی تمام نرے ہی مفکرین ہیں۔ جنہوں نے کسی صاحب علم ونظر کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کئے۔ بلکہ صرف کتابی مطالعہ ہی انکے علم وفکر کا منبع وماخذ ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی نظر میں وسعت تو پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر عمق پیدا نہیں ہوتا اسلئے حضرت فرماتے تھے کہ:۔

"آج کل رسالوں کے باعث لوگوں میں کتب بینی کا مذاق بہت پھیل گیا ہے۔ اور معمولی طالب علم بھی خوب خوب کتابیں پڑھنے لگے ہیں۔ لیکن نظر کی اس وسعت نے نظر کے عمق کو غارت کردیا ہے۔ لوگوں کی نظریں پھیلی ہوئی تو بہت ملتی ہیں لیکن گہری نہیں ہوتیں۔ صرف سطح پر رہتی ہیں۔ اپنے مضامین اور مقالات میں حوالے تو خوب دیتے ہیں کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یوں لکھا ہے۔ لیکن فہم مسائل کی استعداد نہیں بڑھتی۔ سمندر سے موتی وہی نکال کر لاسکتے ہیں۔ جو گہری غواصی کرسکتے ہوں۔ محض سطح سمندر پر دور تک پیرتے ہوئے چلے جانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اگلے علماء مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ کے پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت ہی کم تھا۔ لیکن نکتے کیسے کیسے ان حضرات نے پیدا کئے۔"

(حکیم الامت ص۳)

"یہ مفکرین" فقہاء وصوفیا کے خلاف محاذ قائم کئے ہوئے ہیں۔ وہ سب ظاہر بین ہیں ان کی نظر میں گو وسعت ہے مگر عمق نہیں۔ بصیرت کے فقدان کے ساتھ ان کی آنکھوں پر خود بینی کی عینک بھی چڑھی ہوئی ہے۔ اوران کے دلوں میں خود غرضی اور ہوس اقتدار کارفرما ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ان حضرات کے مقامات کو نہیں پہچان سکتے۔ جن کے متعلق حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ:۔

فقہاء وصوفیا

"میرے دل میں حضرات صوفیہ کا تو ادب بڑے بھائی کا سا ہے اور حضرات فقہا کا ادب باپ کا سا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کا معاملہ بھی حضرات صوفیا کے ساتھ چھوٹے بچے کا سا معلوم ہوتا ہے۔ اور حضرات فقہا کے ساتھ بڑے لڑکے کا سا۔ کہ حرکتیں تو بچے کی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ اور اس کو بہت سی باتوں میں غیر مکلف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن کام بڑے لڑکے سے ہی لیا جاتا ہے۔

یہ فقہاء درحقیقت امت کے عقلاء اور ملت کے حکماء ہوتے ہیں۔ نظم ملت الٰہی کے دم سے وابستہ ہے۔ انہوں نے اگر کتاب و سنت کی روشنی میں عقلی۔ منطقی قاعدوں کے ماتحت اور فطرت بشری کے روزانہ تجربوں کی مدد سے لاتعداد جزئیات ہر شعبۂ زندگی کے متعلق نہ مرتب کر دیتے ہوتے۔ تو آج ہم لوگ خدا معلوم کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے ہوتے۔ اور امت منتشر ہو کر کیسی کیسی گمراہیوں میں بٹ چکی ہوتی۔ فقہاء صوفیہ دونوں درحقیقت اسلام کی فوج کے اہم بازو ہیں رہے ان کے "بدنام کنندہ نکونامے چند"۔ تو ظاہر ہے کہ کس گروہ میں ایسے لوگ نہیں ہوتے یا نہیں ہو سکتے۔ رائے ہر گروہ کے بہترین ہی نمائندوں سے قائم کرنی چاہیئے۔ نہ کہ ان کے بدترین نمائندوں کو دیکھ کر" (حکیم الامت ص۵۵)

علماء کرام

بعض تعلیم یافتہ فتنہ پرداز علماء کرام کی عزت و عظمت پر ہاتھ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اور اس طرح وہ اسلام کی بیخ کنی کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ بقول حضرت تھانوی:-

"صوفیاء سے زیادہ علماء کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انہی کی بدولت انتظام دین قائم ہے۔ ورنہ کسی کو احکام دین اور ان کے حدود کا ہی پتہ نہ چلے۔ درویشی تو اس کے بعد کی چیز ہے۔ میرے قلب میں محبت تو درویشوں کی زیادہ ہے۔ مگر عظمت علماء کی ہے۔"

اہلحدیث

بعض ارباب غرض ذاتی یا سیاسی ضرورتوں کے ماتحت اکثر مقلد و غیر مقلد کے مباحثے و مناظرے کرا کر فضا کو خراب کرتے رہتے ہیں۔ اور بعض تنگ نظر حضرات اہلحدیث کو اچھی نظر سے نہ دیکھنے کے عادی ہیں۔ مگر حضرت تھانوی اہلحدیث حضرات کو برا نہ کہتے تھے بلکہ بعض شرائط کے ماتحت انہیں بیعت بھی کر لیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ:-

"اگر یہ بدگمانی اور بدزبانی نہ کریں۔ تو چونکہ یہ بھی سلف کا ایک طریق ہے گو خلف کا قیاس سلف پر اس باب میں مع الفارق ہے۔ مجھ سے متعدد غیر مقلد بیعت بھی ہیں۔ میں اس میں سخت نہیں ہوں۔ انہیں بھی بیعت کر لیتا ہوں۔ بشرطیکہ تقلید کو جائز سمجھتے ہوں۔ گو واجب نہ سمجھتے ہوں۔ مگر معصیت بھی نہ سمجھتے ہوں۔ لیکن

جس کو دل تنا کہتے ہیں۔ وہ باوجود قلب کو متوجہ کرنے کے بھی نہیں ہوتا۔ ان کی نیکی میں شک نہیں۔ لیکن نیکی بدرجہ محبوبیت نہیں۔ کیونکہ ان حضرات میں عموماً ادب کی کمی ہوتی ہے۔ بیباک ہوتے ہیں۔ اور تقویٰ کا اہتمام بھی بہت کم کرتے ہیں۔ جس سے ایک گونہ انقباض ہوتا ہے۔"

جماعت اسلامی

سیاسی اغراض کے لئے اسلام اور قرآن کے نام پر نشو و نما پانے والے فتنوں کی داغ بیل حضرت تھانویؒ کے زمانہ میں ہی پڑ چکی تھی۔ اگرچہ حق تعالیٰ نے آپ کو ان کے مہلک اثرات دیکھنے سے قبل اٹھا لیا تھا۔ مگر آپ کی نظرِ فراست سے ان کی فتنہ سامانیاں اوجھل نہ تھیں۔

مودودیت کا صالح فتنہ آپ کے زمانہ میں ہی پردہ سے نکال چکا تھا۔ حامیان دین متین اور شیدایانِ اسلام کے لئے یہ بڑی کشش کا باعث بن رہا تھا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی "دینی خدمات" کو بہت سراہا جا رہا تھا۔ اور ظاہر بین اور خوش فہم لوگوں نے ان سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔

لکھنو کے مشہور ماہنامہ "الفرقان" کے ایڈیٹر اور جماعت اسلامی کے سابق رکن مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے مودودی صاحب کی تحریک اسلامی میں شرکت اور اس کے موافق شریعت ہونے کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے حضرت کی خدمت میں بریلی سے آنا چاہا۔ اور اجازت چاہی۔ تو حضرت نے صاف لکھ دیا کہ:۔

"اگرچہ کوئی اعتراض شرعی لحاظ سے بظاہر نہ وارد کیا جا سکے۔ لیکن میرا دل اس تحریک کو قبول نہیں کرتا۔ یہی زبانی بھی عرض کروں گا۔ لہٰذا اس ضرورت کے لئے زحمتِ سفر نہ فرمائی جاوے۔" (خاتمۃ السوانح ص ۲۲)

اس صاحب قال کو کیا علم تھا کہ "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید"۔ چنانچہ تھوڑے سے ہی عرصہ بعد مولانا موصوف اس تحریک میں شریک رہ کر اور اس میں قابل اعتراض امور کا خود مشاہدہ کر کے ذاتی تجربہ کے بعد اس سے الگ ہو گئے اور بزبانِ حال اعتراف کر لیا کہ:۔

اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ۔

ان کی علیحدگی کی خبر سن کر خود ہم نے بھی انہیں اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے خط لکھا کہ کیا آپ اس جماعت کے امیر میں روحانیت کی بجائے انانیت دیکھ کر تو متنفر نہیں ہوئے

تو مولانا موصوف نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۷ شوال المکرم ۱۳۶۲ھ میں لکھا کہ:-

محترمی سلام مسنون

"جماعت اسلامی کے نظام سے میری علیحدگی کے بارہ میں آپ کا فکر ایک حد تک صحیح ہے۔"

محمد منظور نعمانی

اس واقعہ کے دس بارہ سال بعد ہونے والے واقعات نے بھی حضرت کے ارشاد کی حرف بحرف تائید کردی۔ جس سے اخبار بین طبقہ . . . بخوبی واقف ہے۔ غرضیکہ ذکر و فکر میں بھی حضرت تھانوی کے ہاتھ سے اعتدال کا دامن نہیں چھوٹتا تھا۔

تخیّلِ پاکستان

داستانِ پاکستان

پاکستان کے لفظ سے دنیا پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۳۰ء میں چودھری رحمت علی بیرسٹر (مرحوم) کی زبانی آشنا ہوئی۔ جبکہ چند نوجوانوں کو لندن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصہ کو ہندوستان سے الگ کیا جائے۔

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال علامہ اقبالؒ نے مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران میں ظاہر کیا۔ جس کا ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں ملی نصب العین کے طور پر ایک قرارداد کے ذریعہ باقاعدہ مطالبہ کیا گیا۔ مگر علامہ اقبالؒ کے خطبہ اور لاہور قرارداد میں لفظ پاکستان کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اسے ہندو اور برطانوی پریس نے تمسخر و استہزا کے طور پر اچھالا۔ جو قائداعظم کی کوششوں سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو حقیقت بن کر منصۂ شہود پر آگیا۔

تاریخی مغالطہ

اسلامی سلطنت کے قیام کا جو خیال علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے متذکرہ بالا اجلاس میں پیش کیا تھا۔ بالکل وہی خیال ان سے بہت پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی مجلس عام میں کئی بار ظاہر فرما چکے تھے۔ بلکہ اس کا مکمل خاکہ اور حصول کا پروگرام بھی بنا چکے تھے۔ جون ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم (جو ابتداً کانگریس کے بہت بڑے حامی تھے) کے معتمد خاص بلکہ درست راست حضرت مولانا حسین احمد مدنی مدظلہ کے مربیہ باتمیز مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے۔ اور اپنی اس اولین ملاقات کا حال اپنی کتاب "نقوش و تاثرات" میں ان الفاظ میں درج کیا:۔

"سنہ ۱۹۲۸ء تھا۔ اور مخاطب روزنامہ "ہمدرد" کا ڈائریکٹر تھا۔ صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آ جانا ناگزیر سا تھا۔ گفتگو آئی۔ حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت گورنمنٹی آدمی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ جس نے بھی ایسا کہا جان کر یا بے جانے۔ بہرحال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوش دینی اور غیرت ملی میں کسی "خلافتی" سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تخیل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑی بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔ نفس مقصد یعنی حکومت کا فرانہ سے گلو خلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے۔ عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھا۔ حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی۔ وہ اس کے "کافرانہ" ہونے کی بنا پر تھی۔ نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر۔" (نقوش و تاثرات ص ۲۳)

یہ اعتراف و انکشاف ہندوستان کے اس مرد مجاہد کا ہے۔ جو شروع شروع میں سیاسی لحاظ سے حضرت تھانویؒ کے ہم خیال نہ تھے۔ بلکہ کانگریس کی حامی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اور آج ارباب کانگریس کو بالخصوص اور عام دنیا کو بالعموم "سچی باتیں" سنانے میں ہندو پاکستان کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ممکن ہے آپ کے لئے ان کا یہ انکشاف موجب حیرت ہو۔ کیونکہ یہ بات علامہ اقبالؒ کے اظہار کے پورے پچیس سال بعد منظر عام پر لائی جا رہی ہے مگر کسی بات کا علم میں نہ آنا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ اور نہ واقعات انسان کی طرح جھوٹ بول سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو عقیدت کے پردہ میں زیادہ دیر تک چھپایا جا سکتا ہے حضرت تھانویؒ ان "رہنماؤں" میں سے نہ تھے۔ جو اپنی "ملکی و ملی خدمات" اور اپنے "حقیقت افروز بیانات" اخبارات میں شائع کرانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ بلکہ وہ تو ایک ایسے رہنما اور مصلح تھے۔ جو انبیائی طریق پر نہایت خاموشی کے ساتھ اصلاح امت اور خدمت خلق میں

مصروف تھے۔ جو ایسی خدمات کا اظہار نمود و نمائش اور ریا میں داخل سمجھتے تھے۔ اور اسی لئے وہ اپنی سوانح حیات کا لکھا جانا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ جس کی تفصیل "سیرت" کی صورت میں آ چکی ہے۔ مؤرخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں:۔

"یہ مرد درویش ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا۔ مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل، نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مصروف تھا اس نے پوری زندگی اس امر میں صرف کر دی کہ مسلم کی تصویر حیات کو اس شبیہ کے مطابق بنا دے۔ جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے" (جامع المجددین ص ۲۸)

بنائے پاکستان

مفکر اسلام علامہ اقبال کی لوگوں کے دلوں میں عظمت ان کی اسلام آموز شاعری کی وجہ سے ہے کہ ہمارے دل میں ان کی عزت اس نور معرفت کی وجہ سے ہے جو ان کی شاعری کی روح ہے اور جسے وہ اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اور اسی پر انہوں نے اپنے نظریہ پاکستان کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ اپنے مذکورۃ الصدر تاریخی خطبہ صدارت میں لگی لپٹی رکھے بغیر اس بات کا صاف طور پر اعتراف کرتے ہیں کہ:۔

"اسلام پر ابتلا و آزمائش کا کبھی ایسا وقت نہیں آیا۔ جیسا کہ آج درپیش ہے"

اسی ابتلاء کے وہ دو سبب بتاتے ہیں:۔

الف۔ "ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ پہلا عارضہ یہ ہے کہ اہم شخصیتوں کا وجود نہیں۔ سر مالکم ہیلی اور لارڈ ارون کی تشخیص بالکل صحیح تھی۔ جب انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ملت اسلامیہ نے کوئی رہنما پیدا نہیں کیا" رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں۔ جن کو اعانت ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور تقدیر کیا ہے۔ دوسری طرف ان میں یہ قوت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں۔ یہی لوگ ہیں۔ جن پر کسی قوم کی قوت عمل کا انحصار ہوتا ہے۔

ب۔ دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے۔ یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں اور اس سے قوم کے عام افکار اور اس کی عام سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

اس انتشار سے نکلنے کی وہ یہ صورت بتلاتے ہیں:۔

"مسلمانانِ ہند اس وقت اپنی زندگی کے نازک دور میں سے گذر رہے ہیں۔ اس کے لئے کامل تنظیم اور اتحادِ عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے (کیونکہ) ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے۔ یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جمادیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔"

اسی لئے وہ اکابرِ قوم کو دعوت دیتے ہیں کہ:۔

"تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا خواہ ان کے خیالات کچھ بھی ہوں۔ فرض ہوگا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور صرف قراردادیں منظور نہ کریں۔ بلکہ اپنے مقاصد میں کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانوں کے لئے کوئی راہِ عمل پیش کریں۔"

تاکہ قوم کو اس دورِ ابتلاء و آزمائش سے نکالا جائے۔

راہِ عمل دیکھنا یہ ہے کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء سے قبل کسی دوسرے رہنما کو بھی ایسی حالات کا احساس ہوا اور اس نے قوم کے سامنے کوئی ایسی راہِ عمل پیش کی جس کے لئے علامہ اقبالؒ نے اکابرِ قوم کو دعوت دی تھی۔ اس سوال کا جواب ہمیں حضرت تھانویؒ کے ایک ملفوظ اور ایک مکتوب سے ملتا ہے۔

عین اس زمانہ میں جبکہ جنگِ پاکستان شباب پر تھی اور اطراف و اکنافِ ہند سے روزانہ دربارِ اشرفیہ میں لیگی اور غیر لیگی حضرات کی طرف سے رہنمائی کی درخواستیں پہنچ رہی تھیں حضرت تھانویؒ سے سوال کیا گیا۔ وہ کونسے اسباب ہیں کہ جن کو اختیار کرنے سے مسلمان موجودہ پستی اور تنزل سے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"بفضلہٖ تعالیٰ ایسی تدابیر موجود ہیں اور ان کو ضبط کر کے رفاہِ عامہ کے لئے شائع بھی کر دیا گیا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے مسلمانوں کی موجودہ تباہی اور بربادی سے بے

ہیں جو کہ دو کتابیں تصنیف کی تھیں۔ جن میں سے ایک کا نام صیانۃ المسلمین ہے اور دوسری کا نام حیات المسلمین۔ ان دو کتابوں کے اندر میں نے ان مصائب کا جو اس وقت مسلمانوں پر آرہے ہیں۔ پورا پورا علاج کر دیا ہے۔ مسلمان پہلے ان ہی دو کتابوں پر پورا پورا عمل کر کے دیکھیں کہ ان کو کتنا نفع ہوتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ عمل تو کرتے نہیں۔ بس شکایت کرتے ہیں کہ علماء ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ہماری رہبری نہیں کرتے۔"

(ملفوظ نمبر ۳ از ملفوظات حصہ ششم)

مسلم لیگ کا دعوت نامہ

۲۳ تا ۲۶ اپریل ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا دہلی میں اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اس تاریخی اجلاس میں شرکت کے لئے اراکان مسلم لیگ نے حضرت تھانوی کی خدمت میں ایک خصوصی دعوت نامہ بھیجا تاکہ آپ آکر ہمیں ہدایات دیں۔ جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"آپ اس موقع پر خود دہلی تشریف لاکر اپنے ارشادات سے مجلس کو ہدایت دیں تو بہتر ہو۔ لیکن اگر حضور تشریف نہ لاسکیں۔ تو اپنے نمائندہ کو بھیج کر مشکور فرما دیں اور دعا فرما دیں کہ اللہ پاک اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلموں کے دلوں کو مسحور کر دے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوا دے۔ تاکہ سلطنت اسلامی قائم ہو سکے" الخ (خاتمۃ السوانح ص۵۸)

یہ حضرت تھانویؒ کی وفات سے تین ماہ قبل کا واقعہ ہے۔ جبکہ آپ ضعف اور مرض کی شدت میں مبتلا تھے۔ اس لئے بامر مجبوری آپ نے شرکت اجلاس سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے ان کو یہ تاریخی خط لکھا:۔

حضرت تھانویؒ کا جواب

از ناکارہ۔ آوارہ۔ ننگ انام۔ اشرف برائے نام

بخدمت اراکان مسلم لیگ نصرہم اللہ و نفرہم اللہ

السلام علیکم۔ لیگ کے عزائم معلوم کر کے اس آیت پر عمل کی توفیق ہوئی قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا لیکن اس کے ساتھ ہی عاذر نہ ہوتا۔ تو اس آیۃ پر بھی عمل ہوتا۔ انفروا خفافاً وثقالاً[1] لیکن عذر کے سبب اس رخصت پر عمل کی اجازت مل گئی۔ لیس علی الضعفاء ولا علی المرضی[2]

---

[1] جہاد کے لئے، نکل پڑو تھوڑے سامان سے (خواہ) زیادہ سامان سے

[2] کمزوروں اور بیماروں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ ان لوگوں پر جن کو خرچ کرنے کو میسر نہیں۔ جبکہ یہ لوگ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ خلوص رکھیں۔

ولا علی الذین لایجدون ما ینفقون حرج اذا نصحوا للہ ورسولہ - لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہو گیا کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں - جو انشاء اللہ تعالی قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے پیام عمل ہے - ایک حیات المسلمین شخصی اصلاح کیلئے - دوسری صیانتہ المسلمین جمہوری نظام کے لئے - ان کے مضامین اپنے موضوع میں گو رنگین نہیں مگر سنگین ہیں - جن میں وہی فرق ہے جو ذوق و غالب کے اشعار میں اور حکیم محمود خاں حکیم محمد صادق خاں کے نسخوں میں - اور لطا ئف وہ کام نہیں کر سکتا - جو یہ کتابیں کر سکتی ہیں گو عمل شرط ہے - جیسے اعلیٰ درجہ کا مال الحم بوتلوں میں بھرا ہوا قیمتی ہے - گو نتیجہ خیز نہیں - اس کا نفع اس وقت ظاہر ہو گا - جب حلق سے اتریگا - ورنہ بدون عمل یہ سب کوششیں اس کا مصداق ہوں گی نشستند و گفتند و برخاستند - باقی دعا ہر حال میں بخصوص ان تاریخوں میں زیادہ اہتمام سے جاری رکھوں گا - بقول کسی شاعر کے ؎

لا خیل عندک تہدیہا ولا مال　　فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

نوٹ :- یہ دونوں کتابیں اگر یہاں مل گئیں - تو ۲۲ راپریل کو ڈاک سے ہدیۃً روانہ کر دوں گا ورنہ دہلی کے کسی کتب خانہ تجارتی سے تلاش کی جائیں - والسلام

بعد تحقیق معلوم ہوا کہ حیوۃ المسلمین بلا قیمت جا سکتی ہے - سو اس کا نسخہ روانہ کر رہا ہوں نیز یہ معلوم ہوا کہ صیانتہ المسلمین یہاں نہیں ہے لہذا وہاں تلاش کرائی جائے ۔"

احقر اشرف علی تھانہ بھون (۲۷ ربیع الاول)

یہ دونوں کتابیں اسی دعوت کی داعی ہیں جو حضرت تھانویؒ نے مسلم لیگ کو ۱۹۳۶ء میں اپنے پیغام میں دی تھی کہ :-

"جنگ آئینی ہو یا غیر آئینی مسلمانوں کو بجز خدا کے کسی کی امداد کی ضرورت نہیں - اور امداد الہی کی شرط احکام الہی کی پابندی ہے جس کا سینکڑوں برس تک تجربہ کیا جا چکا ہے - جب تک مسلمان سچے مذہبی دیوانے بنے رہے - دنیا ان کی جوتیوں سے لگی رہی اور جوں جوں اس میں کمی آتی گئی مسلمان ترقی سے محروم ہوتے گئے" (آثار رحمت صفحہ ۱۰۹)

وحدت خیال

ارباب مسلم لیگ نے اسلامی سلطنت قائم کرنے کے سلسلہ میں حضرت تھانویؒ سے جو ہدایات طلب کیں - ان کے جواب میں حضرت تھانوی اپنی دو مذکورہ الصدر

لہ یعنی تیرے پاس امداد کرنے کیلئے نہ گھوڑے ہیں نہ مال ہے ایسی حالت میں تیری زبان (نطق) تو کام دیتی ہے

کتابیں پیش کرتے ہیں۔ جو

الف- قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے پیام عمل ہیں۔ اور

ب- جن میں وہ راہ عمل مذکور ہے۔ جس کے متعین کرنے کے لئے علامہ اقبالؒ نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اکابر قوم کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔ اور جو

ج- انہی حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں۔ جن کا علامہ اقبالؒ نے مذکورہ بالا تاریخ اپنے کے تاریخی اجلاس میں اظہار کیا تھا۔ جیسا کہ ان کتابوں کے دیباچوں کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے۔

حیوٰۃ المسلمین کے دیباچہ میں آپ لکھتے ہیں:۔

"اس وقت مسلمانوں پر عالم میں عموماً اور کشور ہند میں خصوصاً مصیبتوں پر مصیبتیں اور بلاؤں پر بلائیں نازل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ مگر نہ ان کی طرف ان کے ذہن کو مطلق التفات ہوتا ہے نہ ان کی زبان پر اس کا نام آتا ہے۔ نہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلتا ہے۔ اگر کسی کو علاج و تدابیر کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ تو وہ نسخے استعمال کئے جاتے ہیں جن کے متعلق بے تکلف یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ مرض کے خلاف ہوتے ہیں۔ جو مزاج میں بجائے درستی کے اور سستی پیدا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان مصائب کی تشخیص میں ان کو نصوص الہیہ و نبویہ (قرآن و حدیث) کی پوری تصدیق نہیں ہوتی۔"

صیانۃ المسلمین کے شروع میں درج ہے کہ

"ہمارے بھائیوں میں اجتماع۔ اتفاق۔ تنظیم قریب قریب مفقود ہے۔ اسلئے ہر مسلمان بجائے خود اپنے کو تنہا دیکھ کر اپنے ضعف سے پریشان ہے۔ ورنہ اہل باطل کے مقابلہ میں اہل حق کی پریشانی کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا اور اگر کہیں برائے نام تنظیم ہے تو اس سے محض اغراض دنیویہ مقصود ہیں۔ بلکہ اکثر تو دین کو ان اغراض میں مخل سمجھ کر اس سے اعراض کرتے ہیں۔ مسلمانان ہند جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ ان میں دو طریق مشروع ہیں۔ ایک ضعفاء کے لئے کہ سکوت محض سے کام لیں۔ نہ حفاظت کا کوئی سامان کریں۔ نہ مدافعت کا اہتمام کریں۔ دوسرا اقویاء کے لئے کہ حفاظت و مدافعت کی تدبیر کریں اپنے لئے بھی اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے بھی۔"

اسی زمانہ اشاعت صیانۃ المسلمین میں آپ نے فرمایا:۔

"کانگریس ایک منظم جماعت ہے اور اہل حق کی کوئی منظم جماعت نہیں۔ ہر شخص تنہا ہے۔

اسلئے ہر شخص خوفزدہ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اہل حق کے اندر ایک جماعت ایسی منظم ہو
جو ان ظالموں (ہندوؤں) کو دفع کر سکے (کیونکہ) ان لوگوں کی اتنی جرأت بڑھ گئی ہے کہ بعض
مقامات پر مسلمانوں پر یہ لوگ چڑھ آتے ہیں۔ اور حملہ کر دیا۔ حالانکہ مسلمان کا کوئی قصور نہ تھا
بیچارے مسلمان حیران و پریشان تھے اور کچھ نہ کر سکے۔ اسلئے مسلمانوں کو ضرور اپنی حفاظت کا
سامان کرنا چاہیئے۔ ورنہ اگر ان لوگوں کی جرأت بڑھ گئی۔ تو پھر مسلمانوں کا جان و مال سب خطرہ
میں ہے مگر اب مشکل یہ ہے کہ ایسی منظم جماعت آئے کہاں سے" (جمہوری نظام صفحہ ۲۵-۲۶)

حیاۃ المسلمین اور صیانۃ المسلمین کی ان وجوہ تصنیف کو اگر علامہ اقبال کے ان ارشادات
کے آئینہ میں دیکھا جائے۔ جو شروع میں نقل کئے گئے ہیں۔ تو یہ دونوں حکمائے اُمت
تشخیص مرض اور تجویز علاج میں متفق اللسان نظر آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت
تھانویؒ جن خطوط پر مسلمانوں کی بہبودی اور مستقبل کے متعلق راہ عمل تجویز کر چکے تھے۔
اس کی طرف علامہ اقبالؒ کا ذہن بعد میں کارفرما ہوا۔

اس مرحلہ پر یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ حضرت تھانوی جن خطرات کو جولائی ۱۹۳۰ء میں دیکھ
رہے تھے۔ قوم نے ان کا خونیں نظارہ پورے سترہ سال بعد اگست ۱۹۴۷ء میں اپنی آنکھوں
سے دیکھ لیا ع قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

شرف اولیت

اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حضرت تھانوی نے اپنی جن دو
کتابوں کو حصول پاکستان اور بقائے پاکستان کے لئے بطور راہ عمل پیش
کیا ہے۔ وہ کب منظر عام پر آئیں۔

ملکی اور ملی حالات کے برسوں مشاہدہ اور جائزہ کے بعد حضرت تھانویؒ نے مسلمانوں
کی شخصی اصلاح کے لئے وسط ۱۹۲۵ء سے حیاۃ المسلمین لکھنی شروع کی جو اڑھائی سال
میں لکھی گئی۔ اور مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۲۷ء کو جیسا کہ اسکے دیباچہ کی تاریخ سے ظاہر ہے، مکمل
ہو کر ۱۹۲۸ء کے آغاز میں شائع ہوئی۔ صیانۃ المسلمین جو جمہوری نظام کے متعلق تھی۔ جولائی
۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ جیسا کہ اس کے اختتامی نوٹ کی تاریخ سے ظاہر ہے۔

یہ تاریخیں صاف بتلا رہی ہیں کہ جن مصائب کا علاج حضرت تھانوی ۱۹۲۷ء یا جولائی ۱۹۳۰ء
میں تجویز فرما چکے تھے انہی مصائب کا علاج پیش کرنے کیلئے علامہ اقبالؒ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اکابر قوم کو دعوت
دے رہے تھے۔

نظامِ پاکستان کا خاکہ اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت تھانویؒ بھی ویسا ہی نظامِ پاکستان چاہتے تھے جس کا نقشہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے اپنے خطبات و اعلانات میں پیش کیا تھا اور جس کا قوم آج تک مطالبہ کر رہی ہے۔

اس سوال کا جواب حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی اس اولین ملاقات کی تفصیل سے ملتا ہے جو انہوں نے جون ۱۹۲۸ء میں حضرت تھانویؒ سے کی اور جس کے ضمن میں انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

"پاکستان کا تخیل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔"
(نقوش و تاثرات صـ۲۳ـ)

ہماری درخواست پر اس "بالکل صاف جزو" کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا دریابادی اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۵۵ء میں لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرتؒ کو بعض معاصر علماء کی طرح "جنگ آزادی"۔ "جنگِ حقیقی" "آزادی وطن" وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں۔ تمامتر دینی تھا۔ وہ صرف اسلام کی حاکمیت چاہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی۔ تو اس ملاقات میں حضرت۔ نے دارالاسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی۔ کہ جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء۔ احکام شریعت کے مطابق ہو۔ بیت المال ہو۔ نظامِ زکوٰۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ وقس علیٰ ہذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیئے۔ اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہیئے۔"

گویا دربار اشرفیہ میں حصول و بقاء پاکستان کا لائحہ عمل اور نظامِ پاکستان کا پورا نقشہ اس وقت پیش ہوا۔ جبکہ پاکستان چاہنے والوں کو بھی اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت تھانوی نے اپنے دارالاسلام کا جو نقشہ پیش کیا تھا۔ قائداعظم بھی اسی کے مطابق نظامِ پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۱ء میں قائداعظمؒ جب حیدرآباد تشریف لے گئے۔ تو ان سے "اسلامی حکومت" کی وضاحت چاہی گئی۔ انہوں نے اس سوال کے جواب میں نوجوان طلباء کو بتلایا کہ:۔

"اسلامی حکومت کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی و پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔" (حیات قائد اعظم ص۲۴۵)

غرضیکہ

۱۔ انہی اصولوں پر قائد اعظم نے پاکستان کی جنگ لڑی۔

۲۔ انہی اصولوں کی حکومت کے لئے قوم نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ جو جنگ پاکستان کے ہر مرحلہ پر پوچھتی تھی کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے، تو اسے جواب دیا جاتا تھا۔ لا الہ الا اللہ۔

۳۔ انہی اصولوں کے مطابق دربار اشرفیہ کے فیض یافتہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی کوششوں سے قرار داد مقاصد پاس ہوئی۔

۴۔ انہی اصولوں پر ..... مجلس دستور ساز نے نظام مملکت کی بنیاد رکھی کہ آئندہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائیگا۔ جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ اور

۵۔ انہی اصولوں کی تعلیم مجلس دستور ساز نے مملکت کے مسلمانوں کے لئے لازمی قرار دی تھی اور

۶۔ انہی اصولوں پر چلنے میں پاکستان کے بقا کا راز مضمر ہے۔

عملی جد و جہد حضرت تھانویؒ نے حصول پاکستان کے لئے راہ عمل یا نظام پاکستان کا خاکہ پیش کرنے پر ہی اکتفا نہ فرمایا تھا۔ بلکہ اس کے لئے عملی جد و جہد بھی اسی زمانہ سے شروع کر دی تھی۔

۱۔ سب سے پہلے آپ نے ہی ہندوستان میں اسلامی قوانین رائج کرنے کی مہم شروع کی تھی جس کی تفصیل آپ کو ——— "آئینی سرگرمیوں" کے باب میں ملے گی۔

۲۔ سب سے پہلے کانگریس کے خلاف اور مسلم لیگ کی حمایت میں جماعت علماء میں سے اور اشرفیہ ہی سے اعلان جاری ہوا جس کی تفصیل آپ کو ——— "سیاسی کشمکش" کے باب میں ملیگی۔

۳۔ سب سے پہلے حضرت تھانویؒ نے مسلم لیگ کی تطہیر اور قائد اعظمؒ میں تدین پیدا کرنے کی کوشش کی جس کی تفصیل ــــــــ اگلے باب میں ملے گی۔ اور

۴۔ سب سے پہلے حصولِ پاکستان کے لئے جہاد کی تیاری بھی حضرت تھانویؒ نے فرمائی جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جہاد کی تیاری حضرت مولانا جلیل احمد صاحب علی گڈھی لکھتے ہیں کہ:۔

"احقر بعونہ تعالیٰ تقریباً تیرہ چودہ سال مستقل طور پر محی السنت حکیم الامت مجدد الملت مرشدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ کے دربار گہربار میں رہا اس عرصہ میں احقر نے وقتاً فوقتاً خود اس کا مشاہدہ کیا کہ جب مسلمانوں پر کفار کے ظلم و ستم کا بیان ہوتا۔ تو حضرت حکیم الامتؒ پر ایک خاص کیفیت کا ورود و مشاہدہ کیا جاتا آنکھیں سرخ نظر آنے لگتیں۔ اور حاضرباش کو بداہتاً محسوس ہوتا تھا کہ حضرت بے چینی کے ساتھ کسی چیز کے متمنی اور کسی وقت کے منتظر ہیں۔ ایک بار ترب و جوار کے ایک مسلمان نے اپنی کسی مستعدی کا اظہار کیا۔ مسکرا کر فرمایا کہ اچھا اگر ضرورت ہوئی۔ تو تم سے جہاد کا کام لیں گے۔ اسی طرح ایک بار صوبہ سرحد کے ایک والیٔ ریاست نے دوستانہ تعلقات کو وسیع کرنا چاہا۔ تو حضرت نے اس سے عذر فرمایا۔ مگر یہ بھی فرمایا کہ ہاں وقت آئیگا۔ تو آپ سے جہاد کا کام لیا جائیگا"

(آثار رحمت ص ۱۰۷)

مرکز اور امام کی ضرورت جہاد خواہ کسی نوع کا ہو۔ اس کے لئے مرکز اور امیر کا ہونا بڑا ضروری ہے۔ جس کے لئے حضرت تھانویؒ بڑے متفکر تھے۔

۔ چنانچہ ۱۹۳۸؁ء میں جب مسلم لیگ کے نام آپ کے تاریخی پیغام کا مسودہ تیار کیا گیا۔ تو مسودہ تیار کرنے والے مولوی صاحب نے اس میں ایک یہ فقرہ بھی لکھ دیا تھا کہ لوگوں کو جب نماز روزہ کی ترغیب دی جاتی ہے۔ تو یورپ زدہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کیا ہوتا ہے تو اس فقرہ کی تصحیح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخل ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روزہ کامیابی کے لئے کافی ہے۔ بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی

ضرورت ہے اور وہ چیز قتال جہاد ہے۔ کیا مکہ میں نماز روزہ نہ تھا۔ تھا صحابہ رضہ سے بڑھ کر نماز روزہ کس کا ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ مکہ کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے لیکن غلبہ نہ ہوا جب ہجرت ہوئی۔ قتال ہوا اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلامی اُٹھا کر دیکھ لو کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی کہ خالی نماز روزہ نے مسلمانوں کو غلبہ ہوا ہو۔ البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے۔ غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز روزہ تو شرط ہے غلبہ کی۔ اگر نماز روزہ اور اطاعت ہو گی۔ تو غلبہ ہو گا۔ اور جہاد علت ہے غلبہ کی۔ گو نماز روزہ فرض عین ہے۔ اور جہاد فرض کفایہ ہے۔ مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے کہ جب تک طاعت کے ساتھ قتال نہ ہو گا۔ اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میسر نہیں ہو سکتی۔ اور جہاد کے لئے مرکز ضروری ہے۔ لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیر المؤمنین ہو اور جس کو امیر المؤمنین بنایا جائے۔ اس کے اندر تین صفات ہوں۔ ایک تدین یعنی وہ دیندار ہو۔ دوسرے وہ سیاست سے واقف ہو اور تیسرے اس کے اندر ہمت ہو۔ اب مشکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدین ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں۔"

(آثار رحمت ص۱۰۱)

چونکہ قائد اعظم کے اندر سیاست بھی تھی اور ہمت بھی۔ اس لئے آپ نے ان میں تدین پیدا کرنے کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائی تاکہ وہ ان تمام ضروری صفات سے متصف ہو جائیں جو ایک امیر المؤمنین کے لئے ضروری ہیں۔

حضرت تھانوی ؒ کی یہ تمام جد و جہد ۱۹۴۰ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس کے اندر قرارداد پاکستان پاس کرنے سے پہلے کی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت تھانوی ؒ نے نہ صرف سب سے پہلے پاکستان کا تخیل پیش کیا۔ بلکہ اس کے حصول کے لئے عملی جد و جہد کرنے والوں میں بھی آپ کا درجہ السابقون الاولون کا ہے۔

اصلاحِ معمارِ پاکستان

احساسِ تبلیغ حضرت تھانویؒ کو جنہوں نے سب سے پہلے نظریۂ پاکستان پیش کیا تھا۔ فراست معلوم ہو گیا تھا کہ پاکستان ایک نہ ایک دن معرضِ وجود میں آکر رہے گا۔ جس کے حصول کا سہرا قائدِ اعظم کے سر ہوگا۔ مگر قائدِ اعظم انگریزی ماحول میں تعلیم و تربیت پانے کی وجہ سے دین کی تعلیم سے کما حقہٗ واقف نہ تھے۔ اور نہ ہی ان کے رفقاء کار دینی اعتبار کے لوگ تھے۔ اسلئے حضرت تھانوی نے محسوس کیا کہ جنگِ پاکستان لڑنے والوں کو دین کی تبلیغ کی جائے اور انہیں کتاب و سنت کی پیروی کی تلقین کی جائے۔

اس غرض کے لئے آپ نے مئی ۱۹۳۸ء میں مولانا شبیر علی صاحب مہتمم خانقاہ امدادیہ کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ:۔

"میاں شبیر علی ہوا کا رخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جاویں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی۔ وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی۔ جن کو آج سب فاسق و فاجر کہتے ہیں مولویوں کو تو ملنے سے رہی۔ لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ یہی لوگ دیندار بن جاویں۔ اور بھائی آجکل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جائے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات ساری دنیا سے جوڑ توڑ ہمارے بس کا کام نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیا داروں ہی کا کام ہے۔ مولویوں کو یہ کرسیاں اور تخت زیب بھی نہیں دیتا اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانتدار بن گئے اور پھر سلطنت ان ہی کے ہاتھ میں رہی۔ تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ کہ ہم خود سلطنت کے طالب ہی نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو۔ وہ دیندار اور دیانت دار لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ اور بس تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔"

(تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی صفحہ ۶۹)

مولانا شبیر علی صاحب نے یہ سن کر عرض کیا کہ پھر تبلیغ نیچے کے طبقہ یعنی عوام سے شروع ہو یا اوپر کے طبقہ یعنی خواص سے؟ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

اُوپر کے طبقہ سے ، کیونکہ وقت کم ہے ۔ خواص کی تعداد کم ہے اور الناس علیٰ دین ملوکھم اگر خواص دیندار اور دیانتدار بن گئے ۔ تو انشاءاللہ عوام کی بھی اصلاح ہو جائے گی ۔ (ایضاً ص ۷)

تبلیغی ہدایات

۱۴ دسمبر ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہونے والا تھا جس میں اکابر لیگ نے جمع ہونا تھا ۔ اسلئے حضرت تھانوی نے وہاں ایک تبلیغی وفد بھیجنے کا فیصلہ فرمایا اور علامہ شبیر احمد عثمانی کو اس کا امیر الوفد مقرر کر کے مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اور مولانا عبدالکریم گمتھلوی ارکان وفد کو مولانا عثمانی کے نام ایک خط دے کر ان کے پاس دیوبند روانہ کیا ۔ تاکہ وہاں سے وہ انہیں ہمراہ لے کر آگے روانہ ہو جائیں ۔ آپ نے مولانا شبیر علی صاحب کو قائداعظم سے گفتگو کرنے کیلئے حسب ذیل ہدایات دیں ۔

" جناح صاحب سے جو باتیں کرنی ہیں ۔ وہ میں نے مولانا شبیر احمد کو خط میں لکھ دی ہیں ۔ وہ امیرالوفد بھی ہیں ۔ اور گفتگو کا سلیقہ بھی ان کو بہت بہتر آتا ہے لیکن اگر کسی سے گفتگو کا تم کو اتفاق ہو جائے ۔ تو گفتگو میں اس کا لحاظ رکھنا کہ گفتگو نرم لہجہ میں ہو ۔ اختلافی مسائل درمیان میں بالکل نہ آویں ۔ اگر مخاطب اختلافی مسائل درمیان میں لانا چاہے تو بہ لطائف الحیل اس سے گریز کرنا ۔ اور دوسری گفتگو شروع کر دینا اگر مخاطب کے کسی عمل کے متعلق کچھ تنقید کرنا ہو ۔ تو لہجہ تنقید ہی نہ ہو بلکہ ہمدردانہ اور تبلیغی ہو ۔ الفاظ بھی نرم ہوں اور کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب ایسا دینا جس کو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے جس کی میں ایک مثال دیتا ہوں ۔ کہ میں فتح پور ہسوہ سے الٰہ آباد جا رہا تھا ۔ ریل میں کچھ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوان ہمسفر ہو گئے ۔ مجھے وہ پہچانتے نہ تھے ۔ گو صورت سے مولوی سمجھ کر پوچھنے لگے کہ مولانا شریعت نے کتا پالنا کیوں منع کیا ہے ۔ حالانکہ اس میں تو بہت سی صفات اچھی ہیں ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قومی ہمدردی کا علی گڑھ میں بہت زور تھا ۔ میں اگر ان کے سامنے شرعی مسائل بیان کرتا اور اللہ و رسول کے احکام بیان کرتا ۔ تو بحث کا دروازہ کھل جاتا ۔ اور وہ مقصد کہ ان کے دل میں کتے کے پالنے کی برائی بیٹھ جائے ۔ وہ حاصل نہ ہوتا ۔ اسلئے میں نے کہا کہ کتے میں ساری صفات مسلّم

گر ایک عیب ایسا ہے کہ سب صفات پر پانی پھیر دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا وہ عیب کیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں۔ اپنی قوم کے کسی فرد کو دیکھتا ہے۔ تو فوراً لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس پر وہ سب نوجوان بہت خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ واقعی یہ عیب پاس رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ ورنہ ہم میں بھی یہ اثر آ دیگا۔ تو یہاں اس کا لحاظ ہے کہ مقصد ہاتھ سے نہ جائے لیکن مخاطب کے فہم کا ضرور لحاظ ہے۔" (بحوالہ صدر صفحہ ۲-۲)

تبلیغی وفود جب یہ حضرات مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی خدمت میں پہنچے۔ تو ان کی والدہ صاحبہ سخت بیمار تھیں اسلئے انہوں نے روانگی سے عذر کر دیا۔ اور چونکہ کوئی دوسرا امیر الوفد نہ مل سکا۔ جو قائداعظم سے گفتگو کر سکتا۔ اسلئے یہ وفد روانہ نہ ہو سکا

دسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمقام پٹنہ ہونا قرار پایا۔ اس اجتماع سے فائدہ اٹھانے کے لئے حضرت تھانویؒ نے دوسرا تبلیغی وفد تیار کیا۔ جو مولانا شبیر علی صاحب تھانوی مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی۔ مولانا عبدالجبار صاحب ابوہری مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری اور مولانا معظم حسین صاحب امروہوی پر مشتمل تھا جس کے رئیس الوفد مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوریؒ تھے۔ حضرت نے وفد کو لیے دو رسائل دیئے کہ وہ ممبران لیگ میں تقسیم کئے جاویں اور جو بچ رہیں۔ وہ عوام کو تقسیم کر دیئے جائیں۔ ان میں سے ایک رسالہ میں حضرت تھانوی کا مسلم لیگ کے نام وہ تاریخی پیام تھا۔ جس میں ارباب لیگ کو دینی شعائر اور وضع اسلامی کی پابندی کی تلقین کی گئی تھی۔ جس کی روشنی میں انہوں نے قائداعظم سے گفتگو کرنی تھی۔

وفد نے پٹنہ پہنچنے کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خاں کی معرفت قائداعظم سے گفتگو کا وقت لیا۔ جو پانچ بجے شام کا مقرر ہوا۔ وقت مقررہ پر ارکان وفد قائداعظم کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ قائداعظم نے کھڑے ہو کر ارکان وفد سے معانقہ کیا اور عبدالعزیز صاحب بیرسٹر پٹنہ نے جن کے قائداعظم مہمان تھے۔ ارکان وفد کا تعارف کرایا۔ اور ایک گھنٹہ تک گفتگو جاری رہی جس میں قائداعظم کو نماز پڑھنے کی تبلیغ کی گئی۔ اور قائداعظم نے فرمایا:۔
"میں گنہگار ہوں۔ خطاوار ہوں۔ آپ کا حق ہے کہ مجھے کہیں۔ میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا۔ (بحوالہ صدر)

جس کی تفصیل "مشاہدات ووارداتؔ" اور "تعمیر پاکستان اور علماء ربانی" میں دیکھی جا سکتی ہے
مولانا شبیر علی تھانوی اپنی اس پہلی ملاقات کا تاثر یوں بیان کرتے ہیں کہ:-

"میں نے حضرت کی ہدایات کے مطابق ان سے گفتگو کی۔ جناح صاحب نے مزید
کہ جوابات تسلی بخش عنایت فرمائے۔ بلکہ ان کے جوابات ایسے تھے کہ ہم سب
اور خصوصیت سے میں تو بہت متاثر ہوا۔ کیونکہ اگر دوران گفتگو میں ان کے کسی
دینی عمل کی کوتاہی کے متعلق عرض کیا گیا۔ تو بغیر کسی تاویل یا حجت کے انہوں
نے اپنی کوتاہی کو تسلیم کیا۔ اور آئندہ اس عمل کی اصلاح کا وعدہ کیا اور ہم
سے کہا کہ آپ بھی دعا کریں کہ میں اپنی اصلاح کر سکوں (تعمیر پاکستان اور علماء ربانی ۴۶)

حضرت تھانوی جب بھی قائد اعظم میں کوئی خلافِ شریعت بات دیکھتے فوراً ان کے پاس
وفد بھیج کر ان کی اصلاح کی کوشش کرتے۔ اس طرح مختلف اوقات پر مختلف وفود ان کے
پاس بھیجے۔ دو تین مرتبہ تو مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی بھی مولانا
شبیر علی صاحب کے ہمراہ بھیجے گئے۔ مگر بعد میں مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اکیلے ہی
بطور سفیر دربار اشرفیہ قائد اعظم کے پاس حضرت تھانوی کے پیغامات لے جاتے رہے
اور اصلاح طلب امور کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ قائد اعظم سفیر دربار اشرفیہ
سے بڑی عزت واحترام کے ساتھ پیش آتے۔ ان کی باتوں کو بغور سنتے اور ایسی ملاقا
کے لئے یوں اشتیاق ظاہر کرتے کہ:-

"آپ تو کبھی تشریف لاتے ہیں حضرت تھانوی کی باتیں مجھے سمجھاتے ہیں اور علماء
بھی میرے پاس آتے ہیں۔ مگر سب مجھ سے موجودہ سیاست میں بات کرتے ہیں
جس سے وہ حضرات ناواقف ہیں اور میں مذاہب سے ناواقف ہوں۔ حضرت تھانوی
نے آپ کو ایک مرتبہ بھی کسی سیاسی امر میں گفتگو کے لئے نہیں بھیجا۔ مجھے آپ کے
ذریعہ خاص مذہبی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جو اور جگہ نصیب نہیں ہوتیں۔ اگر
آپ کو کچھ اور کہنا ہو۔ تو بیٹھ جائیے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں بڑے
شوق سے سنوں گا" (ایضاً ص۸۵)

تبلیغی خطوط

قائد اعظم کے پاس تبلیغی وفود بھیجنے کے علاوہ حضرت تھانوی وقتاً فوقتاً
انہیں اور دیگر ارباب لیگ کو تبلیغی خطوط بھی لکھتے رہتے تھے جیسا کہ "اعلام

نافع میں درج ہے کہ:۔
"میں خود اس (مسلم لیگ) کی اصلاح کا برابر سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔ چنانچہ عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا ایک مختصر وفد اسی کام کے لئے بھیجا۔ پھر ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو چند عزیزوں کو اس کام کے لئے دہلی روانہ کیا۔ غرضیکہ جتنا مجھ سے ہو سکتا ہے لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر دین کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوصاً علماء بھی مل کر ان پر زور دیتے۔ اور دین کو نماز روزہ وضع اسلامی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہو جاتی۔"
اسی طرح "افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ" میں درج ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا:۔
"جس زمانہ میں کانگرس مسلم لیگ سے مفاہمت کی گفتگو کر رہی تھی۔ میں نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر۔ مسٹر محمد علی جناح کو اس مضمون کا لکھا تھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امور دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور بہت ضروری ہے اسلئے شرعیات میں آپ اپنی رائے کا بالکل دخل نہ دیں۔ بلکہ علماء محققین سے پوچھ کر عمل فرمادیں۔ تو انہوں نے نہایت شرافت و تہذیب سے جواب لکھا اور اطمینان دلایا کہ اس ہدایت کے مطابق عمل کیا جائیگا۔" (ص ۹۶)
حضرت تھانوی کے خطوط اردو میں ہوتے تھے۔ مگر خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب ان کا انگریزی ترجمہ کر کے اصل خط کے ساتھ منسلک کر دیتے تھے۔ تاکہ انہیں سمجھنے میں آسانی ہو۔ اور اس تمام خط و کتابت کا ریکارڈ مولانا شبیر علی تھانوی مہتمم خانقاہ امدادیہ محفوظ رکھتے تھے جو انقلاب ۱۹۴۷ء میں ضائع ہو گئی۔ مگر قائد اعظم نے اس کا جو فائل مجلس دعوۃ الحق لیگ کے ممبران کو حضرت تھانوی کی وفات کے بعد دکھلایا تھا۔ وہ یقیناً مس فاطمہ جناح کے پاس ہوگا جس کے متعلق انہوں نے متعدد درخواستوں کے باوجود کوئی جواب نہ دیا۔

نتائج تبلیغ حضرت تھانوی کی تبلیغی مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ قائد اعظم نے شیعہ طریق پر نہیں بلکہ مسنون طریق پر پابندی کے ساتھ پانچ وقت نماز پڑھنی شروع کر دی۔ باتباع سنت میں خود کو شیعہ کہلانا پسند نہ کیا۔ بلکہ جب انہیں ایک شیعہ وفد نے کوئٹہ میں احساس دلایا

کہ آپ ہمارے فرقہ سے ہیں۔ تو انہوں نے بڑی جرأت سے فرمایا No, I am muslim
چنانچہ بعد وفات ان کی تجہیز و تکفین بھی اسی طریق پہ ہوئی اور نماز جنازہ بھی مسنون طریقہ پہ
علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھائی۔ ان پہ اکثر خوف خدا طاری رہتا۔ وہ پہلے سیاست و مذہب
کو الگ الگ سمجھتے تھے۔ مگر بعد میں مذہب کو سیاست پر ترجیح دینی شروع کردی۔ ہر وقت
انگریزی لباس میں ملبوس رہنے کی عادت ترک کر کے اکثر و بیشتر اسلامی لباس میں منظر عام
پر آنے لگے۔ قرآن اور اسلامی لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا۔ توکل و تضرع و انکسار و عاجزی
اور دنیا سے نفرت کا جذبہ ان میں پیدا ہو گیا۔ جس کی وجہ ان کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ جس
کی تفصیل "تعمیر پاکستان اور علماء ربانی" کے باب تاریخ قائد اعظم میں دیکھی جاسکتی ہے

تصدیق صدیق اسی لئے حضرت تھانویؒ کے مرید خاص اور قائد اعظم کے یار غار
نواب جمشید علی خان صاحب جن کے پاس اکثر قائد اعظم اپنی ہمشیرہ
مس فاطمہ جناح کے ہمراہ موسم گرما میں باغپت جایا کرتے تھے۔ اور جو انہیں حضرت
تھانوی کے مواعظ و ملفوظات سنایا کرتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ بالکل حقیقت ہے کہ قائد اعظم کی تمام تر دینی تربیت حضرت تھانوی کا فیضان
تھا۔ اور ان کا اسلامی شعور حضرت والا کی بدولت تھا۔ مولوی شبیر علی صاحب
تھانوی نے قائد اعظم کو حضرت والا کے قریب لانے میں بڑا کام کیا۔
قائد اعظم باغپت کے دوران قیام میں حضرت والا کا بہت خلوص اور ادب سے
تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قائد اعظم کو تھانہ بھون حاضر ہونے کا
انتہائی شوق تھا۔ لیکن افسوس کہ چند در چند وجوہات کی بنا پر ان کی یہ تمنا پوری
نہ ہو سکی۔
قائد اعظم پر آخر زمانہ میں جو مذہبی رنگ غالب ہوا۔ اور جس کو ہم سب نے دیکھا
وہ حضرت رحمۃ اللہ کی ہی توجہات کا صدقہ تھا۔" (تعمیر پاکستان اور علماء ربانی صفحہ ۹۲)

تائید اشرف حق تعالیٰ نے (جو اپنے نیک بندوں کی مساعی خیر کی بنا پر ان کی ہر وقت
تسلی کے سامان کرتے رہتے ہیں) نے حضرت تھانویؒ کو بھی ان کی تبلیغی جدوجہد
کے نتائج کا مشاہدہ ان کی زندگی میں کرادیا تھا۔ حضرت تھانوی کے خواہر زادہ مولانا ظفر احمد
عثمانی کا ارشاد ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ:۔

"میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں۔ مگر آج میں نے عجیب خواب دیکھا ہے میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مجمع ہے گویا کہ میدانِ حشر سا معلوم ہوتا ہے۔ اس مجمع میں اولیا علماء و صلحا کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح مجمع کے ساتھ عربی لباس پہنے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے دل میں خیال گذرا کہ یہ اس مجمع میں کیسے شامل ہو گئے؟ تو مجھ سے کہا گیا کہ محمد علی آج کل اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اسی واسطے ان کو یہ درجہ دیا گیا ہے۔" (ایضاً صفحہ ۱۱۱)

گویا جس طرح پاکستان کا تخیل پیش کرنے کا شرف حضرت تھانوی کو حاصل ہے اسی طرح معمارِ پاکستان کی اصلاح و دینی تربیت کا شرف بھی انہیں ہی حاصل رہا۔

آئینی سرگرمیاں

شرعی قوانین جہاں تک امن و امان اور عدل و انصاف کا تعلق ہے۔ نتائج کے اعتبار سے کسی مملکت کا قانون شرعی قانون پر فضیلت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس وقت دنیا کے ...... کسی خطہ میں ماسوائے سعودی عرب کے اس کا نفاذ نہیں مگر وہاں کے امن و امان اور عدل و انصاف پر دنیا کی مہذب قومیں حیران و ششدر ہیں جو اسلامی قوانین کو غیر مہذب بتاتی ہیں۔ وہ دنیا کا اسلامی ملک ہے۔ جہاں کے دکاندار کھلی ہوئی دکانیں اکیلی یا کسی پہرہ بٹھائے چھوڑ کر آذان سنتے ہی مسجدوں میں چلے جاتے ہیں۔ اور جب واپس آتے ہیں۔ تو ہر چیز جوں کی توں پڑی ملتی ہے۔ کیا مجال کہ کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھے اور شرعی قوانین کے نفاذ کی برکت سے وہاں جیل خانوں کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں ایک ایک مقدمہ کی سماعت میں کئی کئی برس لگ جاتے ہیں۔ اور وہاں چوبیس گھنٹے کے اندر مقدمہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہاں فریادیوں کو عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ وہاں وقوعہ کی اطلاع پاتے ہی عدالت خود بخود موقع پر پہنچ کر معاملہ فیصلہ کر دیتی ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہاں عدالتیں گو ہر چھوٹے چھوٹے علاقہ میں یعنی محلوں میں موجود ہیں۔ مگر مقدمات اتنے کم ہوتے ہیں کہ قاضی اکثر بیکار بیٹھے رہتے ہیں۔ اور وکلا کا تو وہاں وجود ہی نہیں۔

حضرت تھانوی کے پیش نظر بھی یہی چیز تھی کہ یہاں ایک دار الاسلام قائم ہو جائے تاکہ ہم

شرعی عدالتیں قائم کر سکیں۔ اور معاشرہ کو جن روز افزوں جرائم نے تباہ کر رکھا ہے۔ اس کی اصلاح کی جا سکے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے حضرت نے ہی سب سے پہلے کوشش شروع کی۔ مسلمانوں کے سرزمین ہند پر قدم رکھنے کے فوراً بعد ہندوستان کے ساحلی علاقہ کے ہندو راجاؤں کے عہد حکومت میں مسلمانوں کے مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے الگ مسلمان افسر مقرر ہوتا تھا۔ جو اسلامی قانون کی رو سے ان پر حکم لگاتا تھا۔ جیسا کہ چوتھی صدی ہجری کا نوجوان سیاح ابن حوقل ہندوستان کے ساحلی علاقہ کے دورہ کے حالات میں لکھتا ہے کہ:۔

"ان تمام علاقوں میں مسلمان کسی حکم اور فیصلہ کو اس وقت تک تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ جب تک ان پر خود مسلمان ہی حاکم نہ ہو ان پر حدود اور سزاؤں کے نفاذ کا یا ان پر شہادت اور گواہی دلانے کا حق مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ خواہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔"

(داستان عمل ص ۱۵۲ ابن حوقل ص ۲۲۸)

حضرت تھانوی بھی اسی طرح یہاں مسلمانوں کے معاملات ان کی شریعت کے مطابق فیصلہ کرانا چاہتے تھے۔

تحریک تقرر قضاۃ

ہندوستان میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک سب سے پہلے حضرت تھانوی نے شروع کی۔ آپ نے حضرت حافظ محمد احمد صاحب مرحوم مہتمم دارالعلوم دیوبند کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ انہوں نے حضرت کی تحریک پر مسٹر مانٹیگو سابق وزیر ہند سے اس کی ضرورت کو ظاہر فرمایا۔ بعض ممبران اسمبلی اور کونسل میں یہ معاملہ پیش کرنے کی ترغیب دی۔ بعض ذرائع سے سائمن کمیشن کے سامنے بھی اس کی ضرورت کو ظاہر کیا گیا میرٹھ میں حضرت کے ایماء پر انجمن نصب القضاۃ قائم ہوئی۔ اسنے رسالہ "القول الماضی" وغیرہ شائع کر کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں بمقام دہلی اس سلسلہ میں ایک خاص جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں تمام ممبران اسمبلی اور عمائد شہر دہلی کے علاوہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری اور مولانا محمد علی صاحب جوہر اور دیگر علماء دیوبند و سہارنپور تشریف لائے۔ دربار اشرفیہ کی طرف سے مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی نے نمائندگی کے فرائض انجام دئے اور ممبران اسمبلی پر پوری طرح اس مسئلہ کی اہمیت واضح کر دی گئی۔ انہوں نے بھی اس کی اہمیت و افادیت کا احساس کرتے ہوئے اس سلسلہ میں کوشش کرنے کا یقین دلایا لیکن یہ سعی کارگر ثابت نہ ہوئی۔

قانونِ وراثت ایک مرتبہ حضرت کی مجلس میں ذکر آیا کہ پنجاب میں وراثت کا قانون شریعت مقدسہ کے خلاف ہے۔ بہن بیٹی وغیرہ کو میراث سے حصہ نہیں ملتا وہاں کے لوگ رواج کے پابند ہیں۔ شرعی قانونِ وراثت کی بجائے قانونِ رواج عام رائج ہے اور کسی کو اس کا احساس نہیں نہ اس طرف توجہ ہے۔ تو حضرت نے بڑے اہتمام سے فرمایا کہ وہاں کے مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلانا نہایت ہی ضروری ہے۔ مولوی عبدالکریم گمتھلوی نے عرض کیا کہ حضرت علمائے کرام اگر خاص سعی فرما دیں تو ممکن ہے کچھ لوگ سمجھ جائیں۔ ورنہ ایسے معاملہ میں معمولی سعی سے تو نفع کی امید نہیں۔ فرمایا جس قدر کوشش ہو سکے۔ اس میں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ نفع کی فکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے چنانچہ مولوی صاحب موصوف نے اپنے وطن جا کر اپنے نواح ہی اس مسئلہ کی طرف لوگوں کو توجہ دلانی شروع کی۔ امرتسر اور لاہور میں بھی اس غرض کے لئے جلسے کئے۔ مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

حضرت تھانوی جب مولوی صاحب کے سسرال موضع اڑدن میں تشریف لے گئے اور راجپورہ میں قیام فرمایا تو وہاں پھر یہ مسئلہ وراثت پیش ہوا۔ تو حضرت نے اس کے لئے مولوی صاحب کو پنجاب کے سفر کی پھر ترغیب دی۔ انہوں نے مصارف کا عذر کیا تو آپ نے واپس جاتے ہی ابتدائی مصارف کے لئے اپنی طرف سے تیس روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دئے مولوی صاحب نے اس سلسلہ میں ایک سوال نامہ مرتب کر کے علماء کرام کی تائید حاصل کرنے کے لئے چالیس پچاس جگہ مشاہیر علماء کو روانہ کیا اور خود توکلاً علی اللہ پنجاب روانہ ہو گئے۔ سرہند وغیرہ اترتے ہوئے لاہور پہنچے۔ وہاں زیادہ تر وقت اہل علم اور اسلامی انجمنوں کو اس جانب توجہ دلانے میں صرف کیا۔ اتفاق سے انہیں یہاں ایک ایسی جماعت بھی مل گئی۔ جس کے بعض ارکان کو کسی قدر اس مسئلہ کا خیال تھا۔ اور تھوڑی بہت جزوی کوشش کا بھی ارادہ تھا۔ مگر لوگوں کی مخالفت کے سبب کامیابی کی کوئی سبیل نظر نہ آنے پر انہوں نے حضرت کو اطلاع دی۔ تو آپ نے لکھا کہ "جب تک ناامیدی نہ ہو ایک دفعہ جان توڑ کوشش کر لینی چاہیئے"۔ اس پر مولوی عبدالکریم صاحب آگے بڑھے۔ آپ ابھی وزیر آباد تک ہی پہنچے تھے کہ علماء حضرات کی طرف سے ان کے استفتار کا جواب موصول ہو گیا۔ جسے چھپوانے کی غرض سے تھانہ بھون واپس آ گئے۔ اور ان کو "ظلم پنجاب کے متعلق خدائی وصیت" کے عنوان سے چھپوا کر پنجاب روانہ ہی ہونے والے تھے

کہ ہندوؤں نے اطراف آگرہ میں شدھی کی تحریک شروع کر دی۔ جب اس کی خبر تھانہ بھون پہنچی۔ تو حضرت تھانوی نے مولوی صاحب موصوف سے دریافت کیا کہ اگر تم وہاں چلے جاؤ تو قانون وراثت کی سعی میں تو کچھ حرج واقع نہ ہوگا۔ انہوں نے عرض کیا کہ صرف تاخیر ہو جائیگی اور تو کچھ حرج نہیں۔ فرمایا "بس تو پھر الاہم فالاہم پر عمل کرنا چاہیئے۔ بسم اللہ کر کے آگرہ اور اس کے نواح میں جا کر اپنے مسلمانوں کو ہندو ہونے سے بچاؤ"۔ چنانچہ مولوی صاحب آگرہ کی طرف روانہ ہو گئے اور فتویٰ بذریعہ ڈاک پنجاب کے شہروں میں بغرض تقسیم بھیج دیا۔ تاکہ وہاں بھی کام جاری رہے اور ایک دوسرا رسالہ "غصب المیراث" کے نام سے بھی شائع کر کے تقسیم کیا گیا۔ جب یہ ختم ہو گئے۔ تو دوبارہ چھپوائے گئے۔ اور ان کے اخراجات کا حضرت تھانوی نے انتظام فرمایا۔

حضرت تھانوی جمعیۃ العلماء کو اس طرف توجہ دلانے کے لئے برابر تین جلسوں میں .... مولوی عبدالکریم صاحب کو بھیجتے رہے دو دفعہ تو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ تیسری مرتبہ اتنی کامیابی ہوئی کہ ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۴/۱۹۲۵ء) میں بمقام مراد آباد ایک پر زور قرارداد اس سلسلہ میں منظور ہوئی جب فتنہ ارتداد کی آندھی کچھ تھمی تو پھر مولوی صاحب کو حکم ہوا کہ "میرا خیال ہے کہ ان سب قصوں کو چھوڑ کر پنجاب کا سفر تحریک عدل فی المیراث کیا جاوے"۔ اور اس مرتبہ ان کے ہمراہ مولانا عبدالمجید صاحب بچھرایونی کو بھی بھیجا گیا۔ اس دورہ سے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ بہت سے لوگوں نے قانون رواج عام بدلوانے کی سعی شروع کر دی۔ اور بالآخر پاکستان بننے کے بعد ۱۹[illegible]ء میں اس قسم کا قانون معرض وجود میں آگیا۔

جبری تعلیم

۱۹۲۸ء میں ریاست الور میں دینی تعلیم حکماً بند کر دی گئی اور تمام چھوٹے بڑے دینی مدارس و مکاتب یک قلم توڑ دیئے گئے۔ اس کی اطلاع مولوی عبدالکریم صاحب نے جو ان دنوں مدرسہ معین الاسلام قصبہ نوح ضلع گوڑگانواں سے متعلق تھے۔ حضرت تھانوی کو بھیجی۔ اور دعا کے لئے لکھا کہ کسی طرح یہ قانون منسوخ ہو جائے۔ حضرت نے دعا کے ساتھ لکھا کہ اس سلسلہ میں قانونی چارہ جوئی کی جائے۔ اور اخراجات کے لئے ان کے تخمینہ کے مطابق مبلغ یک صد روپیہ پیش کرنے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ مولوی صاحب اس مسل کے ضروری کاغذات کی نقل حاصل کر کے جن کی رو سے تعلیم دین بند کرنے کا حکم دیا گیا تھا وکلاء وغیرہ سے مشورہ لینے کے لئے دہلی پہنچے۔ کاغذات کے ملاحظہ سے یہ راز کھلا کہ جس طرح فلسطین

کے مسلمانوں نے طمع نفسانی میں وہاں کی زمینیں خود یہودیوں کے پاس بیچ دیں تھیں اور اسلامی دنیا فلسطین میں یہود کے غلبہ کے خلاف ڈھول پیٹتی رہی تھی۔ اس طرح یہاں بھی ہندوؤں نے چالاکی کرکے دینی مکاتب کے بند کرنے کی درخواستیں خود مسلمانوں سے دلوا رکھی تھیں۔ اور ان کی بنا پر حکام ریاست نے تعلیم دین بند کردی تھی۔ گو دکلاء نے کہا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا مگر حضرت کی تاکید کے پیش نظر مولوی صاحب نے ہمت نہ ہاری اور حکام متعلقہ کو اس سازش کے خلاف درخواستیں وغیرہ دینی شروع کردیں۔

یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ دہلی سے خبر آئی کہ وہاں بھی جبری تعلیم کے قانون کے تحت تمام دینی مدارس توڑے جا رہے ہیں۔ مولوی عبدالکریم صاحب تمام حالات معلوم کرکے فوراً تھانہ بھون پہنچے اور اطلاع دی کہ اس وقت تک گیارہ مکاتب ٹوٹ چکے ہیں جن میں تقریباً اڑھائی سو طلبار قرآنی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور یہی وبا ملحقہ اضلاع میں بھی پھیل رہی ہے۔ اس پر حضرت تھانوی بہت پریشان ہوئے اور آپ کو سخت صدمہ پہنچا۔ آپ کے حکم سے مولوی صاحب نے اس بارہ میں ایک استفتار مرتب کیا۔ حضرت نے اس کا جواب تحریر فرما کر دیگر علمار کرام کے دستخط حاصل کرنے کا امر فرمایا۔ چنانچہ مولوی عبدالکریم صاحب نے اس پر علمار دیوبند۔ سہارنپور۔ دہلی اور میرٹھ کے دستخط حاصل کرکے اسے شائع کردیا۔ اور اس تحریک کو چلانے کے لئے انجمن خدام القرآن قائم کی۔ حضرت کی دعا اور مالی امداد سے اس تحریک کو بڑے زور سے چلایا گیا۔ اور تھوڑی مدت بعد بفضلہ تعالےٰ تمام دینی مدارس کھل گئے یہاں تک کہ مرادآباد۔ سہارنپور وغیرہ مقامات پر بھی روک تھام ہوگئی۔ پھر جہاں جہاں سے خبر آتی کہ وہاں دینی مدارس بند کئے جا رہے ہیں۔ وہاں فی الفور مناسب کارروائی کرکے ان کو اس ارادہ سے باز رکھا جاتا۔ اگر اس وقت فی الفور حضرت اس توجہ نہ فرماتے تو نتائج یقیناً درج فرسا ہوتے۔

قانونِ اوقاف

۱۹۳۰ء میں نواب جمشید علی خاں صاحب کی ہمراہی میں چند اعلیٰ طبقہ کے وکلار اور رؤسار کے ایک باضابطہ نیم سرکاری وفد نے جس کے صدر حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر کانپور تھے۔ تھانہ بھون حاضری کی اطلاع دی۔ حضرت نے قصبہ کے رئیس اعظم اور اپنے بھتیجہ حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کو ان کے استقبال کے لئے تاریخ مقررہ پر اسٹیشن پر بھیجا۔ اور ان کے قیام کا انتظام بھی مولانا کے دولت خانہ پر کیا۔

....

....

....

....

یہ وفد اس امر کی تحقیق کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا کہ آیا مسلمانوں کے اوقاف کے انتظامی معاملات میں غیر مسلم حکومت کو دخیل بنانا جائز ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں ان حضرات نے ایک سوالنامہ جو قریبًا سو سوالات پر مشتمل تھا۔ شرعی تحقیق کے لئے حضرت کی خدمت میں اپنی آمد سے قبل ہی بھیج دیا تھا تاکہ حضرت سوچ بچار کر لکھیں۔ مگر حضرت کو کثرتِ مشاغل کی وجہ سے انہیں ابھی دیکھنے کا اتفاق ہی نہ ہوا تھا کہ وفد پہنچ گیا۔ چونکہ وفد کے ارکان اعلیٰ طبقہ کے افراد پر مشتمل تھے۔ اسلئے حضرت ان کو خانقاہ میں آنے کی تکلیف دینے کی بجائے خود ان کی قیامگاہ پر گفتگو کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔

اصولِ بحث

حضرت نے ارکان وفد سے گفتگو کرنے کے لئے مندرجہ ذیل امور بطور اصول موضوعہ پیش کئے:۔

۱۔ مسائل کا جواب عرض کرنے کے لئے میں حاضر ہوں۔ مگر مشورہ و مصلحت کے متعلق کچھ عرض کرنے سے میں اسلئے معذور ہوں کہ مجھ کو اس سے مناسبت نہیں۔

۲۔ بعض مسائل عین وقت پر مستحضر نہیں ہوتے۔ ان کے جوابات سے معذور ہونگا البتہ اگر ان کی یادداشت لکھ کر مجھ کو دے دی جائے۔ تو کتابیں دیکھ کر اطمینان سے جواب دے سکتا ہوں۔

۳۔ مسائل پر اگر کچھ شبہات ہوں۔ تو ان کا جواب دینا ہم لوگوں کے ذمہ نہیں کیونکہ ہم لوگ مسائل کے ناقل ہیں۔ بانی نہیں۔ جیسے قوانین کے متعلق اگر کوئی شبہ یا خدشہ ہو اس کا جواب مجلس قانون ساز کے ذمہ ہے۔ جج یا وکیل کے ذمہ نہیں۔

حاضر جوابی

متذکرہ بالا اصولوں پر جب گفتگو شروع ہوئی۔ تو حضرت نے ان حضرات کو صاف کہہ دیا کہ چونکہ یہ مذہبی فعل ہے۔ اسلئے اس کے اندر غیر مسلم کا دخل دینا مذہبی دست اندازی ہے اور مذہبی دست اندازی کرنا یا اور کسی طرح سے اس میں مداخلت کی کوشش کرنا صاف جرم ہوگا۔ جیسے کہ نماز جو ایک خالص مذہبی فعل ہے۔ اس کے اندر

کسی طرح جائز نہیں کہ غیر مسلم کو دخیل بنایا جائے۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہوگا کہ کسی غیر مسلم سے دست اندازی کی درخواست کی جائے یا کوئی ایسی کوشش کی جاوے کہ وہ غیر مسلم وقف کے انتظامی معاملات میں دخیل ہو۔

وفد کی طرف سے گفتگو ہندوستان کے ایک مشہور بیرسٹر کر رہے تھے۔ جو فن جرح میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور لوگ انہیں جرح کا بادشاہ کہتے تھے۔

حضرت تھانوی کی مذکورہ بالا تصریح سن کر بیرسٹر صاحب موصوف نے کہا کہ معاف فرمایئے نماز میں اور وقف میں فرق ہے۔ اس لئے کہ نماز کا تعلق مال سے نہیں ہے اور وقف کا تعلق مال سے ہے۔ اس وقت چونکہ متولیوں کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ اسلئے اوقاف کے اندر وہ بڑی گڑبڑ کرتے ہیں۔ اس کی آمدنی مصارف خیر میں صرف نہیں کرتے خود کھا جاتے ہیں۔

حکیم الامت نے فرمایا اچھا اگر آپ کے نزدیک نماز کی نظیر ٹھیک نہیں ہے۔ تو زکوٰۃ کو ہی لے لیجئے۔ کہ یہ ایک خالص مذہبی فعل بھی ہے اور اس کا تعلق مال سے بھی ہے۔ اور بہت سے مسلمان ایسے ہیں۔ جو اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں نکالتے۔ مگر چونکہ مذہبی فعل بھی ہے اس لئے اس میں غیر مسلم کی مداخلت جس قسم کی بھی ہو۔ ناجائز سمجھتے ہیں۔

بیرسٹر صاحب نے کہا اچھا صاحب نکاح اور طلاق بھی آپ کے نزدیک خالص مذہبی فعل ہے یا نہیں؟

حضرت نے جواب دیا۔ جی ہاں۔

اس پر انہوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ اگر ایک عورت کو شوہر نے طلاق دی۔ مگر اب وہ عورت اس مرد سے جدا ہونا چاہتی ہے اور مرد اس کو نہیں جانے دیتا بلکہ روکتا ہے۔ اور طلاق سے انکار کرتا ہے۔ تو ایسی صورت میں کیا اس عورت کو جائز نہیں کہ عدالت میں اسکے

لہ ہم نے چاہا کہ یہ واقعہ ان کے نام سے لکھا جائے۔ اسلئے مولانا شبیر علی صاحب مہتمم خانقاہ سے ان کا نام دریافت کیا گیا تو انہوں نے لکھا کہ:۔

"حضرت کے اندر اخفا اور عیب پوشی کا بہت اہتمام تھا۔ وہ اگر ضرورت ہوتی تو اپنی ہار مان لیتے تھے اور اگر کہیں بر ضرورت دوسرے کی ہار کا اظہار بہ ضرورت دینی کرنا ہوتا تھا۔ تو پھر اس کا نام ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ لہٰذا میں بھی اتباعاً ان کا نام ظاہر کرنے سے معذور ہوں۔ حالانکہ مجھے ان کا نام و پتہ معلوم اور یاد ہے۔" (مکتوب گرامی مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۵۵ء)

متعلق استغاثہ دائر کرے۔ اور شہادت سے طلاق کو ثابت کر کے حکومت سے اپنی آزادی میں مدد حاصل کرے۔ تو دیکھئے نکاح و طلاق مذہبی فعل ہیں۔ مگر اس میں غیر مسلم کا دخل جائز ہوا

حضرت نے جواب دیا۔ آپ نے غور نہیں کیا۔ یہاں دو چیزیں جدا جدا ہیں۔ ایک تو وقوع طلاق اور ایک اثر طلاق یعنی وہ حق جو اس عورت کو مرد کے طلاق دے دینے سے حاصل ہو گیا ہے اور مرد اس حق کو چھیننا چاہتا ہے۔ جس میں عورت کا ضرر ہے۔ تو یہاں وہ عورت غیر مسلم حکومت کا دخل قصداً خود طلاق میں نہیں چاہتی۔ بلکہ طلاق سے اس کو جو حق آزادی حاصل ہوا ہے۔ جس کے استعمال نہ کر سکنے سے اس کو ضرر پہنچا ہے۔ اس ضرر کو دفع کرنے کے لئے وہ عورت عدالت سے مدد چاہتی ہے۔

بیرسٹر صاحب نے کہا کہ معاف فرمایئے اسی طرح ہم یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جیسے یہاں عورت کا ضرر ہے۔ اسی طرح اوقاف کے اندر گڑبڑ ہونے میں مساکین کا ضرر ہے۔ تو جیسے وہاں اس ضرر سے بچنے کی خاطر غیر مسلم کے دخل کو جائز رکھا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں اوقاف میں ضرر سے بچنے کے لئے غیر مسلم کا دخل جائز ہونا چاہیے۔

حضرت نے جواب دیا کہ آپ نے غور نہیں کیا۔ وہاں تو شوہر کے حبس سے اس عورت کا ضرر ہے۔ اور یہاں اوقاف میں متولی کی خیانت سے مساکین کا ضرر نہیں بلکہ صرف عدم النفع ہے۔ ضرر اور چیز ہے۔ عدم النفع اور چیز ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً آپ کی جیب میں ایک سو روپے کا نوٹ تھا۔ ایک شخص نے آپ سے وہ چھین لیا۔ تو یہ ضرر ہوا۔ اور اگر میں آپ کو ایک نوٹ دینا چاہتا ہوں۔ مگر پھر کوئی اس نوٹ کے دینے سے منع کر دے تو اس میں آپ کا ضرر کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ صرف عدم النفع ہوا۔

اعتراف وفد اس پر سب لوگوں نے بیساختہ سبحان اللہ اور صل علیٰ کہنا شروع کر دیا۔ اور بیرسٹر صاحب خاموش ہو گئے۔ اور پھر کوئی شبہ پیش نہیں کیا۔ مگر حضرت کی حاضر جوابی سے بشاش ہو گئے۔ اور یہاں سے بہت ہی خوش خوش رخصت ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ:-

بعض لوگوں نے ہم کو بہت ہی خشک جواب دئے۔ جس سے ہماری بہت دل شکنی ہوئی۔ مگر یہاں حاضر ہو کر جو ہم کو نفع ہوا۔ اور جو علوم ہم کو اس مجلس میں حاصل ہوئے وہ کہیں حاصل نہیں ہوئے۔ ہم نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ استفادہ کی غرض سے گاہ گاہ

یہاں حاضر ہوا کریں گے"۔

جب ارکانِ وفد واپس اسٹیشن کو روانہ ہوئے۔ تو حضرت بھی انہیں رخصت کرنے کی غرض سے اسٹیشن پر تشریف لے گئے۔ اور فرمایا کہ جب آپ یہاں اسٹیشن پر آ کر اترے تھے۔ اس وقت اس لئے نہیں آیا کہ اس وقت میرا آنا آپ کی جاہ کی وجہ سے ہوتا۔ اور اب جو میں آیا ہوں۔ اب تو یہ آنا آپ کی چاہ یعنی محبت کی وجہ سے ہوا ہے۔

نقل یادداشت حضرت تھانوی نے ارکان وفد کی رہنمائی کے لئے اس وقت مندرجہ ذیل ایک مختصر سی یادداشت لکھ دی تاکہ اس کی روشنی میں اگر یہ کوئی تجویز اصلاح اوقاف کے سلسلہ میں کرسکیں تو کریں۔

۱۔ وقف کرنا ایک مالی عبادت ہے اور خالص عبادت ہے۔ جیسے زکوٰۃ دینا عبادت ہے اور خالص عبادت ہے۔

۲۔ گو وقف کا نفع بسا اوقات عباد کو بھی پہنچتا ہے۔ جبکہ ان عباد کے لئے کوئی استحقاق مقرر کردے مگر پھر بھی وقف خالص عبادت رہے گا۔ معاملہ نہ ہوگا۔ جیسے زکوٰۃ خالص نفع عباد کے لئے ہی موضوع ہے۔ دوسرے مصارف مساجد وغیرہ میں صرف نہیں ہوسکتی۔ بخلاف وقف کے کہ وہ ان مصارف میں بھی شرط وقف کے موافق صرف ہوسکتا ہے جس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ کا تعلق عباد کے ساتھ بہ نسبت وقف کے زیادہ ہے۔ مگر باوجود اس کے زکوٰۃ خالص عبادت ہے معاملہ نہیں۔ پس وقف خالص عبادت ہونے میں زکوٰۃ سے بھی زیادہ ہے۔

۳۔ جب وقف مثل زکوٰۃ کے بلکہ زکوٰۃ سے بھی زیادہ خالص عبادت ہے۔ اس میں کسی خرابی کا ہونا ایسا ہوگا۔ جیسے زکوٰۃ میں کسی خرابی کا ہونا۔ اور اس خرابی کی اصلاح کے لئے گورنمنٹ کا دخل دینا ایسا ہوگا۔ جیسا زکوٰۃ کی خرابی کی اصلاح کے لئے گورنمنٹ کا دخل دینا۔

۴۔ زکوٰۃ میں ایسا دخل دینا یقیناً دخل فی المذہب ہے۔ اس طرح وقف میں دخل دینا دخل فی المذہب ہوگا۔ خواہ خود دخل دیا جائے۔ خواہ کسی کی درخواست پر دخل دیا جائے۔ باقی سوال یہ ہے کہ پھر وقف کی خرابیوں کا کیا انسداد ہو یہ ایسا ہے۔ جیسا یہ سوال کیا جائے کہ اگر کوئی نماز روزہ حج یا زکوٰۃ میں کوتاہی کرے۔ اس کا کیا انسداد ہے۔ کیا اس کا کوئی شخص یہ جواب تجویز کرسکتا ہے کہ گورنمنٹ کو ان کوتاہیوں پر جرمانہ وغیرہ مقرر کرنے کا حق ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس کا انتظام خود مسلمان کرسکتے ہیں۔ خواہ اس کو افہام تفہیم کریں۔ خواہ اس کو تولیت سے معزول

کریں۔ جبکہ واقف نے ان کو اس قسم کے اختیارات دئیے ہوں۔ خواہ اس نے قطع تعلق کریں۔ اگر ایسا نہ کریں۔ تو ان کی کوتاہی ہی ہوگی۔ گورنمنٹ کو پھر بھی دخل دینے کا حق نہیں۔"

مسودہ پر غور و خوض

اگرچہ حضرت تھانوی کی رائے یہی تھی کہ ایسا قانون بنانے کا حکومت کو قواعد شرعیہ کی رو سے اختیار نہیں۔ اور دیوبند اور سہارنپور کے علمار کرام بھی حضرت تھانوی کی تائید میں تھے۔ مگر بعض حلقوں سے وفد کو حسب خواہش جواب مل گیا۔ اور اہل وفد نے ایک مسودہ قانون مرتب کر کے کونسل میں پیش کر دیا۔ جو رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے مشتہر کیا گیا۔ اس کی مشتہری پر مولانا حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مظاہر العلوم سہارنپور نے حضرت تھانوی کی اس طرف توجہ مبذول کرائی۔ انکی تحریک اور حضرت کی تائید سے علمار دیوبند و سہارنپور ۲ ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ کو تھانہ بھون جمع ہوئے اور بعد غور و خوض سب کی یہی رائے ہوئی کہ حضرت تھانوی کی زیر نگرانی اس پر تفصیلی نظر کر کے اس کے نقائص واضح کئے جا دیں اور اس میں ایسی ترامیم کر دی جائیں کہ یہ مسودہ شریعت کے موافق ہو جائے۔ اس غرض کے لئے حضرت نے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (مفتی اعظم پاکستان)، مولوی جمیل احمد صاحب تھانوی مدرس مظاہر العلوم سہارنپور اور مولوی عبدالکریم صاحب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی۔ اور انہوں نے ہر ہر جزو میں حضرت سے استصواب کر کے غور و خوض کے بعد ترمیمی مسودہ مرتب کیا۔ حضرت نے اس کو تحقیقی نظر سے دیکھنے کے بعد دستخط فرمائے۔ اور اس کو ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۴ء کو دیوبند میں آخری بار غور و خوض کے لئے روانہ کیا گیا۔ جہاں صبح سے عشار تک اس پر بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ اور بالآخر یہ بالاتفاق منظور ہوا جس پر ۲ علمار کرام کے دستخط ثبت ہوئے اور یہ ترمیمی مسودہ کونسل کو بھیج دیا گیا۔ اس مسودہ پر مکالمہ کی غرض سے ۲۲ اپریل ۱۹۳۴ء کو اس مسودہ کے مجوّز حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر و ممبر کونسل آف اسٹیٹ نواب جمشید علی خاں صاحب ممبر لیجسلیٹو اسمبلی — حاجی وجیہہ الدین صاحب ممبر اسمبلی حاجی رشید احمد خاں صاحب سوداگر اسلحہ دہلی تھانہ بھون پہنچے۔ اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مہتمم صاحب دیوبند۔ مفتی صاحب دیوبند۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور سہارنپور سے ناظم صاحب مظاہر العلوم۔ مولانا محمد زکریا صاحب و دیگر علمار کرام تشریف لائے حضرت تھانوی کی موجودگی میں پانچ گھنٹے تک اس مسودہ پر مفصل گفتگو ہوئی۔ بالآخر حافظ

ہدایت حسین صاحب مجوز مسودہ نے بعض اصلاحات کو تسلیم کر لیا۔ بعض میں کچھ عذر کیا اور بعض پر غور کا وعدہ کیا۔

اس سلسلہ میں جس قدر اخراجات ہوئے۔ ان کا ایک تہائی حصہ حضرت تھانویؒ نے از گرہ خود ادا کیا۔

قانون تنسیخ نکاح ایک عرصہ سے تقرر قضاۃ کا سلسلہ موقوف ہونے کی وجہ سے مسلمان عورتیں سخت مصائب و مشکلات میں گرفتار تھیں اور ستم رسیدہ مستورات کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ تبدیلی مذہب کی آڑ میں ظالم خاوندوں سے نجات حاصل کریں۔

ان کے حالِ زار پر بھی حضرت تھانویؒ کو ہی سب سے پہلے توجہ فرمانے کا شرف حاصل ہوا آپ نے ان کے مسائل پر علماء مدینہ منورہ۔ دیوبند۔ سہارنپور سے بار بار فتاوی حاصل کرکے اور کامل تحقیق فرما کر پانچ سال کی محنت شاقہ کے بعد ایک رسالہ حیلۃ الناجزہ تصنیف فرمایا اور ایک ہزار روپیہ کی لاگت سے اسے چھپوا کر اور اس پر دوسرے علماء کرام کی تصدیق لاکر ممبران اسمبلی میں تقسیم کیا کہ اس کے مطابق ایک مسودہ قانون تنسیخ نکاح مرتب کرکے بغرض منظوری اسمبلی میں پیش کیا جائے۔

تقریباً تمام علماء ہند نے اس رسالہ کی تائید و تصدیق فرمائی اور ممبران اسمبلی نے بہت جلد قانون بنوانے کی سعی شروع کر دی۔ اور ایک مسودہ مسلم قانون فسخ نکاح کے نام سے کاظمی صاحب نے اسمبلی میں پیش کر دیا۔ مگر اس مسودہ میں وہ قیود و شرائط نظر انداز کر دیں۔ جو حضرت نے فقہ کی ورق گردانی اور علمائے محققین سے مراجعت کے بعد تحریر فرمائی تھیں بہرحال ۱۹۳۹ء میں ایکٹ نمبر ۸ انفساخ نکاح منظور ہو گیا۔ جس کے ذریعہ عورتوں کے لئے ظلم و تشدد سے نجات پانے کی سبیل نکل آئی۔ اور تب سے اس قانون پر عمل درآمد ہوتا چلا آرہا ہے۔

آرمی بل دوسری جنگ عظیم شروع ہونے پر گورنمنٹ نے اسمبلی میں ہندوستان کی طرف سے فوجی امداد دینے کا ایک بل پیش کیا۔ جس کی کانگرس نے بڑی مخالفت کی۔ مگر قائداعظم نے اس کی حمایت کی۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کے خلاف کانگرسیوں نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ اور بلطائف الحیل قائداعظم کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ اس واویلا کا اثر خانقاہ

تھانہ بھون تک بھی جا پہنچا۔ اور کانگریس زدہ لوگوں نے آرمی بل کی آڑ میں حضرت تھانوی کو قائداعظم سے برگشتہ کرنے کے لئے طرح طرح کی چالیں چلنی شروع کردیں مسلسل پروپاگنڈا سے حضرت کو بھی کچھ تشویش سی ہوئی۔ مگر حقیقتِ حال سے آگاہ ہوئے بغیر آپ نے کوئی اعلان شائع کرنے سے انکار کردیا۔ اور ایک وفد جو مولانا شبیر علی صاحب تھانوی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (مفتی اعظم پاکستان)، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی پر مشتمل تھا۔ قائداعظم کی خدمت میں دہلی بھیجا کہ ان سے معلوم کریں کہ انہوں نے آرمی بل کی حمایت کن وجوہات کی بنا پر کی ہے۔ وقت مقررہ کے مطابق وفد دہلی پہنچ گیا۔

قائداعظم کی وضاحت

وفد نے قائداعظم سے آرمی بل کی حمایت کے وجوہ دریافت کئے۔ قائداعظم نے کہا کہ:-

"کانگریس نے حقیقتِ حال پر پردہ ڈال کر میرے خلاف پروپاگنڈا کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ کانگریس خود آرمی بل کی حمایت کرنے کو تیار تھی۔ مگر اس کی شرط یہ تھی کہ فوجی بھرتی تناسب آبادی کے لحاظ سے ہو۔ یعنی اس وقت فوج میں ستر فی صدی مسلمان تھے۔ کانگریس کا مطالبہ تھا کہ ۲۵ فیصدی مسلمان لئے جائیں تب وہ آرمی بل کی حمایت کرے گی۔ اس پر ہوم ممبر نے کہا کہ خطرہ ہمارے سر پر ہے اور ہم فوج کو توڑ کر نئی فوج نہیں بنا سکتے۔ اس پر ڈاکٹر مونجے نے کہا۔ کہ ایک سال میں ہم آپ کو ایک لاکھ فوجی تربیت یافتہ نوجوان دے سکتے ہیں۔ ہوم ممبر نے کہا کہ آپ ایک سال کہتے ہیں۔ ہم کو ایک مہینہ کی بھی مہلت نہیں ہے خطرہ سر پر ہے۔

اس کے بعد اجلاس لنچ کے لئے ملتوی ہو گیا۔ اور صدر اسمبلی نے مجھ سے گفتگو کی کہ آپ آرمی بل کی حمایت کرسکتے ہیں کہ نہیں؟ میں نے کہا کہ دو شرطوں پر کرسکتا ہوں۔ ایک یہ کہ فوجی تناسب جو اس وقت ہے۔ وہ ہمیشہ قائم رہے دوسرے یہ کہ مسلمان فوج مسلمانوں کے مقابلہ میں کبھی نہ بھیجی جائے۔ چنانچہ یہ شرطیں منظور کرلی گئیں اور میں نے آرمی بل کی حمایت شروع کردی۔"

وفد نے کہا کہ انگریزی فوج میں مسلمانوں کا بھرتی ہونا مسلمانوں کے لئے کیسے مفید ہوسکتا ہے؟ اسکا فائدہ سراسر انگریزوں کو ہوگا۔ قائداعظم نے کہا کہ:-

"اس میں ذرا غور کیجئے۔ آپ کو جان لینا چاہیئے کہ انقلاب ناگزیر ہے۔ ہندوستان آزاد ہو کر رہے گا۔ اگر آزادی ہند کے وقت مسلمان فوج میں نہ ہوئے۔ تو جس کی فوج ہو گی۔ طاقت اسی کے ہاتھ میں رہے گی۔ اسلئے میں چاہتا ہوں کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی ہوں۔ تاکہ انقلاب کے وقت طاقت مسلمان کے ہاتھ میں رہے۔"

قائداعظم یہ کہہ کر رکے اور پھر فوراً سلسلہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:۔

"آپ کو حالات کا کچھ علم نہیں۔ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک وقت ایسا آرہا ہے کہ اگر ان کے ہاتھ میں ہتھیار نہ ہوا۔ تو ان کی جان مال اور عزت محفوظ نہ رہے گی۔"

وفد کو اگرچہ ملاقات کے لئے آدھ گھنٹہ وقت دیا گیا تھا۔ مگر ڈیڑھ گھنٹہ تک گفتگو ہوتی رہی درمیان میں وفد نے کہا کہ اگر آپ کا کچھ ہرج ہوتا ہو۔ تو ہم گفتگو ختم کر دیں۔ قائداعظم نے کہا کہ:۔

"نہیں۔ دوسرے لوگ جو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے کیا کہیں گے۔ لیکن آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ میں نہیں جانتا۔ اس لئے آپ جس قدر گفتگو کرنا چاہیں۔ شوق سے کریں۔ میں برابر سنوں گا۔"

جب اس وفد نے واپس جا کر حضرت کو تمام حالات سنائے۔ تو آپ کو نہ صرف تسلی بلکہ مسرت بھی ہوئی۔ کہ قوم کے اس مخلص رہنما کی نظر صرف آج کے حالات پر ہی نہیں بلکہ آج سے نو دس سال بعد ہونے والے واقعات کو بھی وہ اپنی چشم فراست سے برابر دیکھ رہے ہیں۔ جب مجلس عام میں اس وفد کی ملاقات کا ذکر آیا۔ اور مخالفین لیگ نے حضرت کو قائد اعظم کی تائید میں پایا۔ تو ان کے ۶۰ الم مشتہمہ پر اوس پڑ گئی۔

لمحہ فکریہ اندازہ لگایئے اور انصاف کیجئے کہ ایک دور افتادہ غیر معروف قصبہ میں بیٹھا ہوا یہ دوربین مرد درویش کس طرح ہندوستان میں پاکستان کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف تھا۔ تن تنہا ہے۔ کوئی جماعت نہیں۔ چندہ نہیں۔ جلسہ نہیں۔ جلوس نہیں۔ پریس نہیں۔ اخبار نہیں۔ ماحول سارے کا سارا مخالف ہے۔ حصول پاکستان کی باقاعدہ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی۔ مگر حضرت تھانوی دامے۔ درمے۔ قدمے سخنے اسی مقصد کے لئے مصروف جدوجہد ہیں۔ جس کا اظہار علامہ اقبال نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء

کو ان الفاظ میں کیا تھا کہ :-

"میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں (کیونکہ) مسلمانان ہندوستان کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے۔"

سیاسی کشمکش

سیاسی طوفان پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان میں ایک بے پناہ سیاسی طوفان آیا۔ جس کا آغاز تحریک خلافت سے ہوا۔

تحریکِ خلافت اس تحریک کے زمانہ کا نقشہ خود اس تحریک کے مجاہد مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے یوں کھینچا ہے :-

"تحریک خلافت کا زمانہ بھی ہندی اسلام کی تاریخ میں ایک یادرہ جانے والا دور گذرا ہے اور جس نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ اس کے سامنے اس دور کا نقشہ کھینچنا بھی دشوار ہے۔ ایک بے پناہ ہیجان تھا۔ طوفان تھا۔ جوش میں آکر بھائی بھائی سے جدا ہو رہے تھے۔ باپ بیٹوں سے بیٹے باپ سے"۔ اللہ اکبر کے نعرے اور "محمد علی شوکت علی کی جے" کی صدائیں گھر گھر سے بلند ہو رہی تھیں۔ علماء حق کی اکثریت کا فتویٰ حکومت سے ترک موالات اور تحریک خلافت کی تائید میں تھا۔ حضرت (تھانوی) کا مسلک اس سے مختلف تھا۔ مسلک اجتہاد میں اختلاف تو اسلام کی تاریخ میں شروع ہی سے داخل رہا ہے اور عامہ صحابہ کیا معنی خلفائے راشدین تک کا دور اس سے مستثنیٰ نہ رہا۔ اور اگر اختلاف کی بنیاد محض حق و اخلاص ہے۔ تو یہ ذرہ بھر بھی عیب نہیں۔ بلکہ عین رحمت ہے۔ لیکن محققین کے اتباع و پیرو خود سب کب محقق ہو سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ محق ہوتے ہیں۔ اور محقق اور محق کے حدود میں ہمیشہ وہی فرق ہوتا ہے جو دانا اور نادان میں ہوا کرتا ہے۔ محق اہل حق میں سے کسی ایک سردار یا شیخ کی پیروی اندھا دھند کرنے لگتا ہے۔ اور اس ایک رہ کے ما سوا سب کچھ باطل سمجھتا ہے اور محقق اہل حق کے اختلاف باہمی کے سبب

دنشا پر نظر رکھتا ہے"۔ (حکیم الامت ص۲۷۹)

شورش اور فتنہ

اُس وقت نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے ذمہ دار لیڈر جن میں عالم بھی شامل تھے یہ کہتے پھرتے تھے کہ:۔

۱۔ زبانی جے پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر تم ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے۔ بھائیو! خدا کی رسی مضبوط پکڑو گے۔ اگر ہم اس رسی کو مضبوط پکڑ لیں گے تو چاہے دین ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے۔ مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی۔ (مدینہ بجنور ۲۱ فروری ۱۹۲۰ء)

۲۔ اے اللہ ہم سے ایک نیک کام ہو گیا ہے۔ کہ ہم اور مہاتما گاندھی یقینی بھائی ہو گئے ہیں۔ (فتح دہلی ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء)

۳۔ خدا نے ان (گاندھی) کو ہمارے واسطے مذکر بنا کر بھیجا ہے۔ قدرت نے ان کو سبق پڑھانے والا مدبر بنا کر بھیجا ہے۔ (بحوالہ صد)

علاوہ ازیں مشرکین کو مساجد میں لے جا کر واعظ مساجد بنانا۔ ان کے قدم کو شہر کی خاک پاک کرنے والا کہنا۔ ان کے جائے قدوم کو قصبہ جنتی پر طعنہ زن کہنا۔ ان کو مسیحا کہنا۔ ان کو رحمت وادور کہنا۔ ان کی ثنا میں یہ کہنا کہ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔ گائے کی قربانی کا بند کرنے کا اہتمام کرنا۔ قشقہ لگوانا۔ مشرک کی ارتھی اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کی جے بولتے ہوئے مرگھٹ لے جانا۔ ڈولہ سجا کر قرآن مجید کو رامائن کے ساتھ رکھنا۔ یہ کہنا کہ ہم ایسا مذہب بنانا چاہتے ہیں۔ جو ہندو مسلمان کا امتیاز اٹھا دے گا۔ اگر کوئی ان نتائج کے سبب یا شرعی مانع کے سبب شرکت نہ کرے۔ اس کو کافر یا فاسق کہنا۔ اس سے عداوت رکھنا۔ اسے ایذا پہنچانے کی فکر کرنا معمولات سے ہو گیا تھا۔ اسلئے حضرت تھانوی نے آغاز ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ میں ایک اعلان بعنوان "مسائل حاضرہ کے متعلق احقر اشرف علی کا مسلک" شائع کیا۔ اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا۔ کہ "میں ان شورشوں کو ایک فتنہ سمجھتا ہوں"۔ جس سے خلافت کے پرستاروں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اور انہوں نے ان خرابیوں کو دور کرنے کی بجائے ان خرابیوں کی نشاندہی کرنے والے کو ہی ختم کر دینا مناسب سمجھا۔

قاتلانہ حملہ

صاحب حیات اشرف لکھتے ہیں کہ:۔

عین اس طوفانی دور میں آپ نے اپنی جان و عزت کی فکر کئے بغیر جو کچھ حق سمجھتے تھے۔ اس کو برملا پیش کیا۔ اس کے صلہ میں الزامات ملے۔ کسی نے انگریز

کا پٹھو کہا۔ کسی نے کہا کہ یہ تو مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب اس کے باوجود اپنے مسلک میں حضرت کو مستحکم پایا۔ تو آزادی کا نعرہ بلند کرنے والوں نے اشرار کی جماعت تھانہ بھون میں بھیجی۔ تاکہ اس زبان ہی کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے۔ جس سے یہ خلاف مرضی باتیں نکل رہی تھیں۔

یہ ٹکڑی آئی۔ اور لاٹھیوں سے مسلح راستہ کے کنارے چھپ گئی۔ تاکہ صبح جب حکیم الامت مسجد جا رہے ہوں تو ان کا کام تمام کر دیا جائے۔ مولانا تھانوی کو اس کی اطلاع ملی۔ آپ مراقب ہوئے۔ میلان قلبی یہی رہا کہ مسجد جایا جائے حسب معمول ایک ہاتھ میں قندیل اور ایک ہاتھ میں عصا لئے ہوئے صبح صادق سے پہلے ہی گھر سے چل پڑے۔ جب اس مقام پر پہنچے جہاں غنڈے چھپ رہے تھے۔ تو ان پر اس درجہ ہیبت طاری ہوئی کہ سب کے سب بے تحاشہ وہاں سے بھاگ پڑے۔ اور پہلی ٹرین کے ذریعہ تھانہ بھون سے چلے گئے۔ اور پھر کبھی ایسی جرأت نہ کی ؎

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست　　ہیبتِ ایں مرد صاحب دلق نیست

ندامت و خجالت

یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن جو اعتدال اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گو آپ بہ حیثیت مجتہد اپنی رائے میں بہت مستحکم تھے مگر چونکہ یہ مسئلہ بالکل اجتہادی تھا۔ اسلئے خود اپنے حلقۂ ارادت کے علماء کو بھی اختلاف رائے کی پوری پوری آزادی دے رکھی تھی۔ البتہ جب بعض علماء نے حدود سے تجاوز کیا۔ اور خود آپ کو اپنی قائم کردہ رائے کے سامنے غلط ٹھہرانے کی سعی کی۔ اور جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے۔ تو حکیم الامت نے ان کو اپنے زمرہ سے نکال دیا۔ بعد کو جب خلافت کی تحریک کی آندھی ختم ہوئی اور حکیم الامت کے محسوس کردہ خدشات حقائق بن کر سامنے آئے تو پھر ان حضرات کی ندامت و خجالت بیان سے باہر رہی لیکن اس نقصان کی تلافی نہ ہو سکی۔"

(حیات اشرف صفحہ ۲۲۵ تا ۲۲۷)

دوسرا دور

۱۹۲۰ء نے بساطِ سیاست کے مہرے بدل دیے۔ مولانا محمد علی جوہر نے بعض تلخ تجربات کی بنا پر کانگرس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کی پر دلکے

بغیر ٹیکس سازی کے ذریعہ سول نافرمانی کی مہم شروع کر دی۔ اس انتشار سے جمیعتہ العلماء بھی نہ بچ سکی۔ اس کا ایک بڑا حصہ تو کانگریس کے ساتھ رہا۔ مگر قلیل حصہ اس سے کٹ کر ہمیشہ کیلئے الگ ہو گیا۔ اور اس نے اپنی الگ جمیعتہ بنا لی۔

مسلمانوں نے بھی غیرت کا ثبوت دیا۔ انہوں نے جب اوائل ۱۹۳۰ء میں دیکھا کہ گاندھی جی کو ہماری ضرورت نہیں۔ تو انہوں نے بھی اواخر ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے پاکستان کا مہرہ آگے کر دیا۔ کہ اگر تمہیں ہماری ضرورت نہیں۔ تو ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر رہنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ اپنے گھر میں خوش رہیں اور ہمیں ہمارا حصہ تقسیم کر کے دے دیں۔ تاکہ دونو علیحدہ علیحدہ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔

سیاسی مسلک

سیاسی حالات نے ملک کو تین پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ۔ انگریز برسراقتدار تھا۔ کانگریس کی پشت پر ساری ہندو قوم اور اکثر مسلم سیاسی جماعتیں تھیں۔ مسلم لیگ کے ساتھ سوائے عافیت پسندوں کے اور کوئی نہ تھا۔ مسلمانوں کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ انگریز اور ہندو دونوں ان کی کمزوری کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اسلئے حضرت تھانوی:-

"انگریزی حکومت اور کانگریس کے درمیان رسہ کشی میں مسلمانوں کو بالکل غیر جانبدار اور یکسو دیکھنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان خود اپنے اندر پوری قوت نہیں پیدا کر لیتے۔ ان کا کسی فریق کے ساتھ شامل ہو کر عملی حصہ لینا خودکشی کے مرادف ہوگا۔ اور سارا زور اس پر دیتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنے میں قوت و تنظیم پیدا کریں۔" (حکیم الامت صـ ۲۷۶)

طلبا اور سیاست

اس زمانہ میں حضرت تھانوی دارالعلوم دیوبند کے سرپرست تھے جس کے اکابر جمیعتہ العلماء ہند کے ممبر ہونے کی وجہ سے کانگریس کے ساتھ تھے ان کی دیکھا دیکھی دارالعلوم کے طلباء نے بھی سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ جو حضرت تھانوی کو سخت ناگوار گزرا۔ حضرت تھانوی کی رائے تھی کہ:-

"موجودہ سیاسیات کا اشتغال خواہ فی نفسہ حق ہو یا باطل۔ مگر دارالعلوم کے طلباء و علماء کو اس میں شرکت بہرحال مدرسہ کے مقاصد اصلیہ کو متزلزل کر دینے والی ہے جس کا مشاہدہ و تجربہ بھی عرصہ سے اکثر حضرات کو ہو چکا ہے" (خاتمۃ السوانح صـ ۲۱)

لہٰذا آپ نے مہتمم مدرسہ کی تائید سے ایک اعلان شائع کردیا کہ آئندہ کیلئے سیاسی سرگرمیوں میں قطعاً حصہ نہ لیں اس سے باب نزاع کھل گیا۔

سرپرستی سے استعفیٰ حضرتؒ کی یہ عادت تھی کہ اختلاف کے مواقع پر جو بات بھی حق سمجھتے تھے۔ اس کا صاف صاف اظہار اور اعلان فرمادیتے تھے اگر اسے قبول کرلیا جاتا تو بہتر۔ ورنہ خود کو اس سے علیحدہ کرلیتے تھے۔ اور مناظرہ و مناقشہ میں ہرگز نہ فرماتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند چونکہ حضرت کا علمی گہوارہ تھا۔ اور بزرگوں کا مرکز تھا۔ اسلئے حضرت کو اس سے بہت محبت تھی۔ جس کا کوئی دوسرا اندازہ بھی نہیں کرسکتا ارباب مدرسہ نے اس معاملہ میں آپ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اسلئے آپ نے مدرسہ کے مفاد کی خاطر مدرسہ کی سرپرستی سے استعفےٰ دے دیا۔ لیکن مدرسہ کی ہمدردی اور بہی خواہی کا تعلق برابر قائم رکھا۔

جھانسی الیکشن کانگریس اور مسلم لیگ کی میدانی جنگ کا آغاز جھانسی کے ایک ضمنی الیکشن سے ہوا۔ جو مسلم لیگ کو ۱۹۳۵ء میں لڑنا پڑا۔ کانگریس مسلم لیگ کے مقابلہ میں بڑے بڑے علماء لے آئی۔ اور لیگ کے کیمپ میں صرف مولانا شوکت علی مدیر "خلافت" اور مولانا مظہر الدین مدیر "الامان" نظر آتے تھے جنہیں صرف "اخباری مولوی" سمجھ کر دیوبندی علماء کے مقابلہ میں لوگوں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ اور وہ مولانا شوکت علی سے کہنے لگے کہ کانگریس کی حمایت میں تو بڑے بڑے عالم آئے ہوئے ہیں۔ مگر مسلم لیگ کی حمایت میں کوئی بڑا عالم نظر نہیں آتا۔ جب ہر طرف سے یہی سوال ہونے لگا۔ تو مولانا شوکت علی بہت پریشان ہوئے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ آخر ان کی نظر تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ پر جاکر رکی۔ انہوں نے خیال کیا کہ جھانسی کی پہلی سیاسی جنگ میں حضرت تھانوی کا ایک پیغام ہی نقشہ جنگ بدل سکتا ہے۔ اس تصور سے مولانا سنبھلے اور مستفسرین سے فرمایا کہ آپ کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی پر اعتماد ہے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو فرمایا بس ابھی سے تار دے کر پوچھ لو۔ کہ ووٹ کس کو دیا جائے۔ چنانچہ اسی وقت حضرت تھانوی کو تار دیا گیا کہ ووٹ مسلم لیگ کے امیدوار کو دیا جائے یا کانگریس کے امیدوار کو۔

تائید اشرف حضرت تھانویؒ کانگریسیوں کے عزائم سے بخوبی آگاہ تھے۔ مگر مسلم لیگ والوں سے بھی کچھ مطمئن نہ تھے۔ اسلئے آپ نے ابھی تک شرح صدر کے

ساتھ مسلم لیگ کی حمایت کا کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ مگر کانگرس کے ضرور مخالف تھے۔ اس لئے تار ملنے پر آپ نے کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے بغرض مشورہ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی اور مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کو بلایا۔ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے لئے مولانا ظفر احمد صاحب نے یہ مشورہ دیا کہ آپ صرف یہ تار دے دیں کہ کانگرس کو ووٹ نہ دیا جائے حضرتؒ کو یہ رائے بہت پسند آئی اور اسی وقت اس مضمون کا جھانسی تار دے دیا گیا۔ تار کا پہنچنا تھا کہ مولانا شوکت علی کی جان میں جان آئی۔ انہوں نے اپنے استصواب اور حضرت کے جواب کے بڑے بڑے پوسٹر چھپوا کر شہر کے در و دیوار پر چسپاں کرا دئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیکھتے دیکھتے میدانِ الیکشن کا نقشہ بدل گیا۔ کانگرسی علماء وہ اثر پیدا نہ کر سکے۔ جو حضرت کے ایک تار سے پیدا ہوا۔ کانگرس کو شکست فاش ہوئی۔ اور میدان مسلم لیگ کے ہاتھ میں رہا۔

کامیابی کا شکریہ چونکہ حضرت تھانوی کے تار نے مسلم لیگ کی بگڑی بنا دی تھی اس لئے مولانا شوکت علی اور مولانا مظہر الدین دونوں اپنے اس محسن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے جنہوں نے آڑے وقت میں ان کی امداد کی تھی۔ تھانہ بھون پہنچے۔ دربار اشرفیہ میں باریابی کے بعد مولانا شوکت علی صاحب نے حضرت کے تار کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ

"جھانسی کے میدان میں ہمارے پاس کانگرس کے برابر نہ لاریاں تھیں۔ نہ روپیہ پیسہ تھا۔ آپ کے تار نے کچھ ایسا اثر کیا کہ کایا پلٹ دی۔ مسلمانوں میں یکایک مسلم لیگ کی حمایت کا جوش پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے ہم کامیاب ہوئے"

تھانہ بھون میں جلسہ اسی رات ان ہر دو حضرات کی درخواست پر تھانہ بھون میں مسلم لیگ کی طرف سے ایک جلسہ عام ہوا۔ جس میں انہوں نے جھانسی کے الیکشن کے حالات لوگوں کو سنائے کہ کس طرح بے سروسامانی کے عالم میں انہیں فتح نصیب ہوئی۔ اس جلسہ میں حضرت تھانوی کی اجازت سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے لیگ کے حق میں پہلی تقریر فرمائی۔

نیا مد و جزر اس کے کچھ عرصہ بعد کانگرس برسراقتدار آ گئی۔ جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ وہاں انہوں نے اپنی حکومت بنائی۔ اور حکومت کے نشہ میں سرشار ہو کر انہوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے کی مہم بڑی تیزی سے شروع کر دی۔ پنڈت نہرو نے

بھی اس نشہ سے سرشار ہو کر مسلمانوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ ملک میں صرف دو پارٹیاں ہیں انگریز اور کانگریس۔ بایں ہمہ ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتیں کانگریس کے ساتھ رہیں۔ جوں جوں ہندؤں کا تشدد بڑھتا گیا۔ مسلم لیگ قوت پکڑتی گئی۔ حالات روز بروز بدلتے بلکہ بگڑتے گئے اور نئے نئے سوالات پیدا ہوتے گئے۔ اب لوگ بڑی کشمکش میں مبتلا تھے کہ کس کا ساتھ دیں۔ جس کی وجہ سے روزانہ حالاتِ حاضرہ کے متعلق تھانہ بھون میں بیسیوں استفسار آرہے تھے۔

مصالحت کی کوشش اگرچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا:-

"طبعی رنگ درویشانہ یکسوئی کا تھا۔ اس کا مقتضایہ تھا کہ ان سیاسی تحریکات میں آپ کوئی دخل نہ دیتے۔ لیکن اس طبعی رنگ کے ساتھ حق تعالیٰ نے آپ کو ایک مجددانہ اصلاح وتربیت اور ہمدردی خلق کا بھی وہ جذبہ عطا فرمایا تھا۔ جو آپ کو اکثر بے چین کئے رکھتا تھا۔ اور اسی وجہ سے جب ملک میں کوئی ہنگامی تحریک شروع ہوتی۔ اس پر شرعی حیثیت سے اور تجربہ کارانہ بصیرت کے ساتھ نظر ڈال کر اپنے نزدیک اس کے حسن وقبح اور پھر صحیح راہ عمل واضح کرنے کا معمول رہا" (افادات اشرفیہ صـ۲)

ایک طرف تو کانگریس میں مسلمانوں کے بلا شرط داخلہ کے خطرناک عواقب تقریباً سامنے آگئے تھے۔ اور اب اس بات کی ضرورت پیدا ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کو قوت کے ساتھ کانگریس میں شمولیت سے روکا جائے اور دوسری طرف رہنمائی کے لئے خطوط پر خطوط آرہے تھے اسلئے آپ نے ملک کی دو مسلمان سیاسی جماعتوں یعنی مسلم لیگ اور جمعیتہ العلماء ہند کے درمیان مصالحت کرانے کی غرض سے متعدد بار اکابر جمعیتہ العلماء سے گفتگو فرمائی۔ پھر یہ اہتمام کیا گیا کہ ایک تاریخ کو ارکان جمعیتہ العلماء اور ارکان مسلم لیگ کو جمع کر کے بالمشافہ دونوں سے بات چیت کی جائے۔ مگر بعض عوارض کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ تو اس کا بدل یہ کافی سمجھا گیا کہ ان دونوں جماعتوں سے ضروری سوالات کے ذریعہ تحقیق حال کی جائے۔ اور ان کے جوابات کی روشنی میں مصالحت کا کوئی ایسا فارمولا تلاش کیا جائے۔ جس سے مسلمان دینی اور سیاسی مضرت سے بچ سکیں۔ چنانچہ کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے حضرت تھانوی کی طرف سے دو سوالنامے مرتب کئے گئے۔ ان میں سے ایک جمعیتہ العلماء ہند کے نام بھیجا گیا۔ اور دوسرا مسلم لیگ کے نام۔

وہ سوالنامے یہ تھے:-

سوالنامہ بنام جمیعتہ العلماء

حالاً و معاملاً و مسلماً۔ ان سوالات میں ابتدائی چند سوالات تو وہ ہیں۔ جو ہماری طرف سے ہیں۔ جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ حالات حاضرہ کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے پوری طرح حالات و واقعات کا علم ہو جائے اور بقیہ کے چند سوالات وہ ہیں جو دوسرے لوگ جمیعتہ علماء ہند کے متعلق کیا کرتے ہیں۔ جن کا واقعی جواب جمیعت علماء ہی دے سکتی ہے کہ اس کو ان واقعات و حالات کی زیادہ خبر ہے۔

ابتدائی سوالات

الف۔ جمیعتہ علماء کے نزدیک مذہبی حیثیت سے کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کیوں ضروری ہے۔ اور کانگرس سے علیحدگی میں کیا ضرر ہے؟

ب۔ کانگرس میں مسلمانوں کا داخلہ جس صورت سے انفرادی غیر منظم اور غیر مشروط طریقہ پر اس وقت ہو رہا ہے اور مسلم نشستوں کے لئے کانگرس خود براہ راست امیدوار تجویز کرتی ہے۔ کیا اس سے اسلام اور مسلمانانِ ہند کو خطرہ نہیں؟ اگر ہے۔ تو اس خطرہ سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

ج۔ مسلم لیگ سے جمیعتہ العلماء کو کیوں اختلاف ہے جبکہ وہ مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے اور اس کا مقصد بھی آزادیٔ کامل کا تخیل ہے۔ جیسا کہ اس سال لکھنؤ کے اجلاس میں اس نے اعلان کر دیا ہے۔

د۔ اگر مسلم لیگ میں کچھ مفاسد اور منکرات شرعیہ موجود ہیں۔ تو کیا یہ صورت ممکن نہیں کہ جمیعت علماء مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کو مخلص اور فعال لوگوں سے بھر دے اور مسلمانوں کی تنظیم کو مکمل اور مفاسد و منکرات سے پاک کر دے۔

ہ۔ کیا مسلم لیگ اور جمیعتہ علماء کے تصادم سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا نہیں ہوتا اور کیا یہ تشتت مضر نہیں ہے۔ اگر ہے تو جمیعتہ علماء نے اس ضرر کے انسداد کے لئے کوئی صورت اختیار کی ہے یا نہیں۔

نوٹ:- یہ سوال مسلم لیگ والوں سے بھی کیا گیا ہے۔

دوسروں کے شبہات و اعتراضات

۱۔ کانگرس کے ساتھ مل کر جو آزادی ہندوستان کو حاصل ہو گی اس کا انجام ایک حکومت مشترکہ کا قیام ہے۔ جس میں عنصر کفر غالب اور عنصر اسلام مغلوب ہو گا۔ ایسی حکومت اسلامی حکومت یقیناً

نہ ہوگی۔ تو اس کے لئے جدوجہد کرنا مسلمانوں کے ذمہ کس دلیل سے واجب ہے نیز اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے بالکل بے دخل کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ میں مسلمانوں پر حکومت کرنا نہیں چاہتے۔ کانگریس کے اقتدار سے اس وقت ہندوؤں کے حوصلے جس قدر بڑھنے لگے اور مسلمانوں پر یا ذاد دل۔ دیہاتوں بلاز متوں سرکاری محکموں میں جو مظالم وہ برپا کرنے لگے ہیں۔ جمیعتہ العلماء نے ان کے انسداد کی کیا تدبیر سوچی ہے اور اس کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھایا ہے۔ یا نہیں؟

۲۔ کانگریس وزارتوں نے زمینداروں کی اراضی کا شتکاروں کی مملوک بنا دینے کی جو تجویز سوچی ہے۔ یقیناً صریح ظلم ہے اور جو لوگ کانگریس میں شریک ہیں وہ سب کے سب اس ظلم میں شریک ہیں۔ پھر اس سے بچنے کی جمیعت علماء نے کیا تدبیر کی اور کون سا عملی قدم اُٹھایا ہے۔

۳۔ کانگریس میں بندے ماترم کا گیت گایا جاتا ہے۔ جو مضامین شرکیہ پر مشتمل ہے۔ اور قومی جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے۔ جو قریب بہ شرک ہے۔ کانگریسی مسلمان بھی بندے ماترم کے گیت کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں۔ کیا ان افعال میں شرکت کرنا گناہ نہیں؟ اگر ہے۔ تو جمیعتہ علماء نے مسلمانوں کو اس کے متعلق کیا ہدایت کی۔ اور اس پر اور اسی قسم کے دوسرے منکرات پر صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں۔

۴۔ صدر کانگریس اور اس کی ہم خیال جماعت جو اشتراکیت کی حامی اور مذہب اور خدا کی دشمن ہے۔ ان کی تقریریں خدا اور مذہب کے خلاف شائع ہوتی رہتی ہے جمیعت علماء نے ان کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کی یا نہیں۔ اور مسلمانوں کو ایسے کافروں کی تعظیم و تکریم سے روکا ہے یا نہیں۔

۵۔ کانگریس کے ساتھ جو آزادی حاصل ہوگی۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ اُس میں مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی حقوق کی پوری طرح حفاظت ہوگی۔ جبکہ کانگریس اور اس کے ذمہ داروں کے مذہب اور حقوق کا نام لینا بھی جرم سمجھتے ہیں۔ اور اس کو فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں۔ نیز جمیعتہ العلماء نے کانگریس کے ساتھ تعاون کر کے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی حقوق کے تحفظ میں اس وقت تک کیا کام کیا ہے۔

۶۔ جمیعت علماء نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کے لئے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں

جس کی مذہبًا و سیاستہً سخت ضرورت ہے اور ان کے اسلام میں داخل ہو جانے کی بھی توی امید ہے

سوالات از مسلم لیگ

۱۔ آپ کے نزدیک کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت سیاسی حیثیت سے کیوں مضر ہے اور اس سے علیحدگی کیوں ضروری ہے اکثر لوگ پوچھتے ہیں۔ تو ہم ناواقفیت کے سبب جواب نہیں دے سکتے۔

۲۔ کیا بدوں کانگریس کے تعاون کے ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے اگر مل سکتی ہے۔ تو اس کی جو صورت آپ کے ذہن میں ہو۔ اس کو واضح فرمایا جاوے۔

۳۔ کیا کانگریس سے مسلمانوں کی علیحدگی آزادی ہندوستان کے مسئلہ میں باعث تعویق و تاخیر ہوگی۔

۴۔ کیا مسلم لیگ تمام مسلمانوں کو یا ان کی زیادہ تعداد کو کانگریس سے روک سکتی ہے بظاہر یہ امر مستبعد ہے۔ کانگریس میں پہلے ہی سے مسلمان بہت ہیں اور جب سے وزارت قبول کر کے وہ برسر اقتدار ہوئی ہے۔ زیادہ تعداد اس میں شریک ہو رہی ہے۔ پس اگر مسلم لیگ نے تھوڑے سے مسلمانوں کو کانگریس سے روک لیا۔ تو کیا نفع کی امید ہے۔ جبکہ زیادہ تعداد اس میں شریک ہوگا۔

۵۔ کیا مسلم لیگ کے زیادہ تر ارکان انگریزوں کے حامی اور اندرونی طور پران کے بہی خواہ ہیں۔ اور کیا بقول سر اکبر حیدری مسلم لیگ ایک برطانوی زہر ہے (مدینہ اخبار ۱۳ر دسمبر ۳۸ء) اگر نہیں تو اس اعتراض کا اطمینان بخش جواب کیا دیا جاوے۔

۶۔ مخالفین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ ایک بے عمل جماعت ہے۔ کانگریس کی طرح اس نے کوئی عملی قدم اب تک نہیں اٹھایا۔ نہ مسلمانوں کے فائدہ کے لئے کوئی کام کیا اور اس وقت کانگریس کے مقابلہ پر جدوجہد الیکشن لڑانے میں صرف کر رہی ہے مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ انگریزوں کا نفع ہے کہ کانگریس کی قوت کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کا مسئلہ تعویق میں پڑ جائے۔ اس اعتراض کا کیا حل ہے۔

۷۔ مسلم لیگ نے اب تک مسلمانوں کی تنظیم اور ان کی مذہبی و تمدنی و اقتصادی ترقی کیلئے کیا طریق عمل اختیار کیا۔ اور اس کے لئے کونسا عملی قدم اٹھایا۔ یا آئندہ کیا ارادہ اور ذہن میں اس کی کیا صورت ہے۔

۸۔ اگر کسی وقت ہر طرح سے اطمینان حاصل کر کے مسلم لیگ کو کانگریس میں شامل ہونے کی

ضرورت ہوئی۔ تو کیا مسلم لیگ کو توڑ کر اس میں شامل ہونے کی رائے ہے یا مسلم لیگ کو قائم رکھ کر مسلمانوں کے اقتدار کو برقرار رکھتے ہوئے شرکت کی رائے ہے۔

۹۔ اگر علمار مسلم لیگ کا ممبر بننا چاہیں۔ تو کیا ان کو بھی الیکشن ہی کے ذریعہ مسلم لیگ کا کوئی عہدہ حاصل ہوگا۔ جس سے ان کو مسلم لیگ کے اجلاس اور مجلس عاملہ وغیرہ میں اپنی رائے پیش کرنے کا حق ہو۔ یا اگر وہ اس ذریعہ کو پسند نہ کریں۔ تو ان کو بدون اس ذریعہ کے بھی ایسا درجہ مل سکے گا۔

۱۰۔ مسلم لیگ میں علمار کی وقعت کس درجہ کی ہو گی۔ اور بصورت اختلاف علمار کسی مسئلہ مختلف فیہا کو کس طرح طے کیا جائے گا۔ کیا اس کے لئے کوئی قاعدہ ذہن میں ہے۔

۱۱۔ جمعیت علمار ہند دہلی اور مسلم لیگ کے تصادم سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا ہو رہا ہے لیگ نے اس کے ضرر کو محسوس کیا ہے۔ یا نہیں۔ اگر کیا ہے تو اس ضرر کے انسداد کی کوئی صورت باہمی اتفاق کی سوچی ہے۔ یا سوچنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔

(نوٹ) یہ سوال جمعیت علمار دہلی سے بھی کیا گیا ہے۔

۱۲۔ مسلم لیگ نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کی ضرورت کو محسوس کیا ہے یا نہیں (جو نہ صرف مذہبا بلکہ سیاستہ بھی نہایت اہم ہے) اگر کیا ہے تو اس کے لئے عملی قدم اٹھایا گیا ہے یا نہیں اور اس کا نتیجہ کیا ظاہر ہوا۔ اگر اب تک نہیں۔ تو آئندہ کیا رائے ہے۔

جمعیۃ علمار کا سکوت

یہ سوالات صرف حضرت کی سیاستدانی کے ہی نہیں بلکہ معاملہ کی اہمیت و افادیت کے بھی شاہد ہیں کہ حضرت نے کس طرح مسلمانوں کے انتشار کو دور کرنے اور ان کے مذہبی اور سیاسی حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے ان اہم سوالات کے ذریعہ حالات کی پوری پوری تحقیق کرنے اور مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ایسی سعی بلیغ کی کہ ان کا انفرادی وجود بھی قائم رہے اور قوم کا اجتماعی مفاد بھی محفوظ رہے۔ مگر ارباب جمعیۃ العلما کی طرف سے اس سوالنامہ کا بار بار کی یاد دہانی کے باوجود کوئی جواب نہ ملا۔

زعمار مسلم لیگ کا جواب

مسلم لیگ والوں نے حضرت کی مخلصانہ مساعی کے عملی اعتراف کے طور پر نہایت مفصل اور جامع و مانع جواب دیا۔ جس سے اس جدوجہد آزادی کا تمام پس منظر سامنے آجاتا ہے۔ اور اس لئے یہ طویل جواب یہاں نقل

کیا جاتا ہے۔ ورنہ طوالت کا خوف اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ زعمائے لیگ کا یہ جواب نواب
محمد اسماعیل خاں صاحب ایم ایل اے۔ بیرسٹر۔ صدر مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ و سید حسن ریاض
صاحب و دیگر اراکین کے مشورہ سے تحریر ہوا۔ اور سید ذاکر علی جائنٹ سکریٹری مسلم لیگ پارلیمنٹری
بورڈ صوبہ متحدہ نے دسمبر ۱۹۳۷ء کو حضرت کی خدمت میں روانہ کیا۔ جو درج ذیل ہے۔

۱۔ بحث یہ ہے کہ مسلمان اجتماعی حیثیت سے کانگریس کے ساتھ تعاون کریں یا انفرادی حیثیت
سے کانگریس میں داخل ہو جائیں۔ ہمارے خیال میں سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی انفرادی شرکت
اس لئے مضر ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کانگریس میں ہمیشہ اس قدر کم تعداد میں رہیں
گے کہ کانگریس کے مسلک اور عمل پر ان کی رائے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ نیز مسلمان ارکان کی
تعداد کم ہونے کی وجہ سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں کانگریس کے با اختیار
ادارے میں شاذ و نادر ہی منتخب ہو سکیں گے۔ کانگریس کی ان دونوں با اختیار کمیٹیوں میں اس
وقت تک مسلمانوں کا جو تناسب رہا ہے۔ اس سے یہ اچھی طرح ثابت ہو رہا ہے کہ یہ اندیشہ
بالکل صحیح ہے۔ غالباً آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اکیس ارکان میں سے صرف دو مسلمان
مسلمان ہیں۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تقریباً تین سو ارکان میں سے سات یا آٹھ مسلمان ہیں
انتخاب مخلوط نشستوں کا یقین نہیں۔ کانگریس میں ہندو ووٹروں کی تعداد زیادہ ہے اس صورت
میں کبھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ مسلمان با اختیار کمیٹیوں میں اتنے ہو سکیں گے کہ وہ کانگریس کے
فیصلوں اور طرز عمل پر کوئی اثر ڈال سکیں۔ اس سلسلہ میں کانگریسی مسلمان کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو
چاہیئے کہ کثیر تعداد میں کانگریس کے ممبر بنیں۔ اور اس طرح کانگریس پر قبضہ کر لیں۔ یہ خیال غلط ہے
ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں باعتبار تعداد زیادہ آگئے ہیں۔ اور ہندو عورتیں بھی کانگریس کی ممبر
بنتی ہیں۔ اور اس میں شریک ہوتی ہیں۔ مسلمان عورتیں اگر ممبر بھی بن جائیں۔ تو پردے کی وجہ سے
شریک نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنی ساری آبادی کو کانگریس کا ممبر بنوا دیں
ہندو بھی یہی کریں گے۔ اس صورت میں ہندو مرد اور عورتیں مل کر مسلمان مرد ممبروں سے تقریباً پانچ
گنے ہو جائیں گے۔ اور کانگریس کی ہر کمیٹی کا فیصلہ انہیں کی رائے پر منحصر ہوگا۔ مسلمان کبھی یہ توقع
نہیں کر سکتے کہ ان کی کوئی تجویز کانگریس میں منظور ہو سکے گی۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ان چار
صوبوں کی کانگریس میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یعنی صوبہ سرحد۔ پنجاب۔ سندھ اور بنگال کی
ہر کمیٹی میں مسلمانوں کی اکثریت رہے گی۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ کانگریس کے نظام

ہیں دونوں کو موجودہ انگریزی نظام حکومت کی طرح صوبجاتی خود اختیاری حاصل نہیں ہے کانگرس اس وجہ سے کہ چار صوبوں میں مسلمانوں کو با اختیار اکثریت نہ ہو۔ صوبجاتی خود اختیاری کے خلاف ہے۔ اور مرکزی وحدانی طرز انتظام پر مصر ہے۔ کامل آزادی کے مسائل میں متفق نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں اور کانگرس کے درمیان یہ مسلسل اختلاف رہا ہے۔ مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں جو بات طے کریں گے۔ وہ مرکزی وحدانی طرز حکومت ہونے کی صورت میں کانگرس یعنی آل انڈیا کانگرس کے اجلاس۔ کانگرس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں نامنظور ہو جائیگی جہاں مسلمان ارکان کا تناسب چوتھائی سے زیادہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر مسلمان اس طرح کانگرس میں شریک ہو گئے۔ تو ان کی یہ حیثیت ہو گی۔ کہ ان کی موجودگی میں ان کے مفاد کے خلاف فیصلے ہوں گے۔ اور آئینی اصول کے مطابق ان کو اکثریت کے فیصلوں کو ماننا پڑیگا۔ اور اس کے باوجود کہ وہ شکایت کریں یا اختلاف کریں۔ وہ ان مخالف فیصلوں کے ذمہ دار تصور کئے جائیں گے۔ اور کانگرس کے باہر بھی ان کو اختلاف کا کوئی حق نہ رہے گا۔ لیکن اگر مسلم لیگ کے ماتحت اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم کریں۔ تو وہ ہندوستان میں ایک دوسری طاقت ہوں گے۔ جو تعداد کے اعتبار سے کم ہو۔ مگر دوسری حیثیت سے اکثریت کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور ہو سکتی ہے یقیناً ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک اور اتحاد کے بغیر ہندوستان کا بظاہر آزاد ہونا ممکن نہیں لیکن یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا مشترکہ مفاد اور مقصد ہے۔ لہذا مسلمانوں کو ہندوؤں سے ملنے کی جتنی طلب ہے۔ اتنی ہی ہندوؤں کو بھی ہونی چاہیئے۔ لہذا کانگرس اگر اخلاص کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی طالب ہو۔ تو اس کو مسلم لیگ کے جائز مطالبات طے کرنے پڑیں گے۔ اور ہر اہم معاملہ میں مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو گی۔ انفرادی حیثیت سے کانگرس میں شرکت سے مسلم اقلیت ہندو اکثریت میں گم ہو جاتی ہے۔ اور جداگانہ تنظیم کی صورت میں مسلمانوں کی اجتماعی قومی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ کانگرس میں شریک ہو کر مسلمان جو بات کہیں گے۔ وہ اکثریت کی فی الفور آواز سے دب جائے گی۔ اور جو بات مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کہیں گے۔ وہ جداگانہ ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں سنی جائے گی۔ کانگرس میں شریک ہو کر مسلمان اپنے خاص مفاد کے لئے کوئی جداگانہ عمل نہ کر سکیں گے۔ اور جداگانہ اسلامی تنظیم کے ماتحت ہر عمل ان کے اختیار میں ہوگا۔

جواب سوال نمبر ۲۔ کانگرس کے تعاون بغیر یا دوسرے الفاظ میں ہندوؤں کے تعاون

کے بغیر مسلمان یقیناً ہندوستان کو آزاد نہیں کرا سکتے لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ کانگریس کا تعاون انہیں شرائط پر حاصل کیا جائے جو کانگریس پیش کرے یعنی ہر مسلمان چار آنہ کا ابتدائی ممبر بنے۔ اور انفرادی حیثیت سے بلا مسلم مفاد کے تحفظ کی شرائط منوا سکتے ہوئے کانگریس میں داخل ہو کر اپنی اسلامی حیثیت کو گم کر دے۔ اور محض ہندوستانی رہ جائے۔ اسی طرح کیوں نہ ہو کہ مسلمان مسلم لیگ کے ماتحت اپنی تنظیم کریں۔ اور مسلمانوں کی انجمن مسلم لیگ اور ہندوؤں کی انجمن کانگریس کے درمیان تمام مشترکہ مفاد کے حصول کے لئے اور نیز آزادی حاصل کرنے کے لئے بشرائط اس قسم کا معاہدہ اتحاد ہو۔ جیسا دو حلیف قوموں کے درمیان ہوتا ہے۔ اہم معاملات کے تصفیہ کے لئے کانگریس کی مجلس عاملہ اور مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس ہوں۔ اور ان اجلاسوں میں جو فیصلے ہوں۔ ان پر دونوں انجمنیں اور دونوں قومیں کاربند ہوں کیا انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنی اپنی قومی انفرادیت کو مٹائے بغیر جرمنی کے خلاف جنگ نہیں کی۔ کانگریس کا تعاون حاصل کرنے کی دوسری اور مسلمانوں کے حق میں بہتر صورت یہ ہے۔ کہ اگر مسلمان مسلم لیگ کو مستحکم اور مضبوط کرلیں اور کانگریس میں شریک نہ ہوں تو یقیناً کانگریس اس طریقہ پر مسلمانوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہوگی۔

جواب سوال نمبر ۳۔ کانگریس میں مدغم ہونے کے بعد جب مسلمان یہ دیکھیں گے کہ ان کی رائے اور آواز بے اثر ہے اور وہ اپنے قومی مفاد کے خلاف ہندوؤں کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہیں۔ تو آزادی حاصل کرنے کا جذبہ ان کے دلوں میں سرد ہو جائے گا۔ اور آزادی کی تحریک بعد جنگ مسلمانوں کی ہمت اور عمل سے اس طرح محروم ہو جائے گی۔ جس طرح کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے تحفظ کے لئے جنگوں میں ہندوستانیوں کے طبعی جوش مدافعت وطن اور جوش ملک گیری سے محروم ہے اور صرف روپیہ دے کر ان کو لڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لہٰذا اس طرح حصول آزادی میں تعویق اور تاخیر زیادہ ہوگی۔ لیکن اگر مسلم لیگ میں مسلمان رہے اور کانگریس میں ہندو رہے۔ اور دونوں کے درمیان اس طرح اتحاد قائم ہوا جیسا کہ دو کے درمیان ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کو اس کا اطمینان ہو گیا کہ ان کی اسلامیت اور قومی انفرادیت محفوظ ہے اور آزاد ہندوستان میں وہ بھی آزاد قوم کی حیثیت سے رہیں گے تو مسلمان اپنے مفاد کے لئے اور ہندو اپنے مفاد کے لئے حلیفوں کی حیثیت سے خالص وطنی آزادی کے جذبہ سے جنگ کریں گے۔ یہ جنگ جس قسم کی بھی زیادہ طاقتور ہوگی اس سے آزادی جلد حاصل ہو سکے گی۔

جواب سوال نمبر ۴ - یقیناً مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روک سکتی ہے اور اس کے باوجود کہ کانگریس برسر اقتدار اور اس کی وزارت قائم ہے۔ تجربہ سے ظاہر ہوگیا ہے کہ کانگریس کی حکومت قائم تھی۔ مسلم لیگ نے کانگریس کے مقابلہ میں پانچ الکشن لڑے۔ ان میں سے چار میں مسلم لیگ کامیاب ہوئی۔ اور صرف ایک بجنور میں ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کی وجہ بھی حافظ ابراہیم صاحب کا ذاتی اثر اور مسلم لیگ کو کام کرنے کی مہلت کم تھی۔ نیز یہ کہ ابھی تک مسلم لیگ کی تنظیم مکمل اور طاقتور بھی نہیں ہے پھر تاریخی تجربہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ اقوام کی اکثریت اپنے مفاد اور وجود کے تحفظ کے حق میں رہتی ہے۔ حکومت کے مؤید صرف وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جن کے مفاد براہ راست حکومت سے وابستہ ہوں۔ مثال کے طور پر کانگریس کی سابقہ تحریکات کو لے لیجئے۔ انگریزوں کی حکومت قائم تھی۔ ہزاروں ہندو ملازم سرکار تھے۔ زمیندار، خطاب یافتہ اور ٹھیکیدار اور اجارہ دار وغیرہ تھے۔ مگر قوم کی آواز وہی سمجھی گئی۔ جو کانگریس کے پلیٹ فارم سے بلند ہوئی۔ حکومت کے مؤید ہندوؤں یا ہندوستانیوں کی تائید ہندوستانیوں یا ہندو قوم کی تائید نہیں سمجھی گئی۔ لہٰذا جو لوگ ذاتی اغراض کے لئے یا کانگریس کے اقتدار سے مرعوب ہوکر مسلم مفاد کے خلاف کانگریس میں شریک ہوں گے وہ بھی انگریزی حکومت کے پرستار ہندوؤں کی طرح بے اثر ہوکر رہ جائیں گے۔ نیز یہ کہ جب مسلم لیگ کا نظام مضبوط ہو جائیگا۔ اور یہ ناممکن ہو جائیگا کہ کوئی مسلمان انفرادی حیثیت سے یا کانگریس کی طرف سے کھڑا ہوکر مجالس واضعان قانون کا ممبر منتخب ہو سکے۔ اور مسلم رائے عامہ کانگریس کا ممبر ہونا عیب اور مسلم لیگ کا ممبر ہونا اچھا سمجھنے لگے گی۔ تو کوئی مسلمان کانگریس کا ممبر بننا پسند نہ کرے گا۔ اور اس طرح مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگریس میں جانے سے روک دے گی۔ اور بالفرض اگر کوئی چھوٹی سی بے اثر جماعت کانگریس میں رہی بھی۔ تو کانگریس کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ چنانچہ ۲۹ء سے ۳۳ء تک یہی ہوا کہ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق کانگریسی مسلمانوں سے کوئی گفتگو نہیں کرتی تھی۔ بلکہ ہر معاملہ میں ان کو نظر انداز کر کے کانگریس کو مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہرگز شریک نہیں۔ اس قسم کے تمام اعلانات جھوٹے اور بے بنیاد ہیں۔ بعض چند افراد ہیں۔ جو کانگریس میں شریک ہیں۔

جواب سوال نمبر ۵۔ اکتوبر ۳۷ء سے مسلم لیگ میں مکمل انقلاب ہوا کامل ذمہ دارانہ حکومت کی بجائے پورا استقلال یا پوری خود مختاری مطمح نظر قرار پایا ہے۔ محدود رکنیت کی جگہ ۲ جنس کی شرط پر رکنیت عام کی گئی ہے۔ گویا اب مسلم لیگ سب سے زیادہ جمہوری انجمن ہے ابتدا سے انتہا تک جتنی کمیٹیاں بنیں گی اور جتنے عہدے دیئے جائیں گے۔ وہ انتخاب کے ذریعہ ہوں گے۔ اس صورت میں انگریزوں کے خوشامدیوں کے دخل کا مسلم لیگ میں کوئی امکان نہیں لیکن بالفرض عام مسلمان انگریزوں کے حامی واقع ہوئے ہیں اور وہ ایسے ہی لوگوں کو منتخب کرنا چاہتے ہیں۔ جو انگریزوں کے حامی ہیں۔ تو ان کو کون روک سکتا ہے۔ مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ مسلم لیگ کے تمام موجودہ ارکان کی میعاد رکنیت فروری میں ختم ہو جائیگی۔ نئے انتخابات میں امیر اور غریب کو عام ممبر بننے کے وقت اس عہدنامہ پر دستخط کرنے پڑیں گے۔ کہ وہ کامل آزادی کا طالب ہے۔ اس کے بعد وہ انتخابات میں آئے گا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ منافقت کرے۔ اور دل میں انگریزوں کا حامی رہے۔ تو اس پر کسی کو قابو نہیں جیسے کوئی شخص توحید و رسالت وغیرہ کا اقرار کرے۔ ہم اس کو مسلمان ماننے پر مجبور ہیں اس کے دل میں کیا ہے۔ اس پر سوال کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اس طرح کے منافق لوگ خود کانگریس میں بھی موجود ہیں۔ اور کانگریس ان کو اندر آنے سے نہیں روک سکتی۔ سر اکبر حیدری مسلم لیگ کو جو برطانوی زہر کہتے ہیں اس کے معنی بالکل اور ہیں۔ کیا سر اکبر حیدری نے حیدرآباد میں کانگریس قائم کرنے کی اجازت دے دی ہے اور کیا وہ کانگریس کو تریاق سمجھتے ہیں ہر ہندوستانی ریاست سیاسی تحریکات کو اپنے حدود کے اندر داخل ہونے سے روکتی ہے خواہ وہ قومی ہو یا فرقہ دارانہ۔ صاف بات ہے حیدرآباد میں مسلمانوں کو سیاسی استیلا حاصل ہے۔ وہاں مسلمانوں کے حقوق مفاد اور آزادی خطرہ میں نہیں۔ حکومت انجمن سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ حیدرآباد میں مسلم حکومت موجود ہے۔ اس صورت میں یقیناً وہاں مسلم لیگ کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر حیدرآباد میں مسلم لیگ قائم کی جائے گی۔ تو وہ بجائے سیاسی انجمن کے خالص فرقہ دارانہ انجمن بن کر رہ جائے گی۔ جو حکومت اور ہندوؤں کے درمیان تصادم کا باعث ہوگی۔

جواب سوال نمبر ۱۔ غلط ہے کہ مسلم لیگ بے عمل جماعت ہے مسلم لیگ ابتداً یعنی ۱۹۰۶ء میں اس غرض سے قائم ہوئی تھی۔ کہ برطانیہ سے ہندوستان کو جو مراعات ملیں۔ ان میں سے مسلمانوں

کو پورا حصہ دلائے اور مزید مراعات حاصل کرنے میں اکثریت کے ساتھ تعاون کرے۔ چنانچہ اس نے یہ کیا کہ کانگریس نے ہندوستان کے لئے سیاسی اختیارات حاصل کرنے کی جب کوئی تحریک شروع کی۔ مسلم لیگ نے اس کی تائید کی۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے متحدہ مطالبہ پر مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات ہندوستان کو دی گئیں اور مسلم لیگ کے ذریعہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو محسوس کر کے کانگریس ۱۹۱۶ء میں فرقہ وارانہ معاملات میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوئی۔ جو ۱۹۳۵ء تک بلا تغیر جاری رہا۔ چونکہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد ابتداءً محض ہندوستان کی اندرونی سیاسی امور تک محدود تھے۔ اسلئے جب جنگ عظیم ہوئی۔ اور خلافت اور اماکن مقدسہ کا مسئلہ سامنے آیا۔ تو انہیں مسلمانوں نے جو مسلم لیگ کے بانی اور رکن تھے۔ خلافت کمیٹی قائم کی۔ خلافت کمیٹی نے جو کچھ کیا۔ اس سے دنیا واقف ہے۔ عملاً اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو خلافت کمیٹی حقیقت میں مسلم لیگ کا شعبۂ امور خارجہ تھا۔ ۱۹۲۹ء سے جب نہرو رپورٹ کا فتنہ اٹھا نئے دستور موسومہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے بننے تک مسلم لیگ نے ہندوستان کے سیاسی اختیار کی ترقی اور اس میں مسلمانوں کے حق کے تعین میں جو کچھ کیا۔ اس قانون کے اندر موجود ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ مل کر سول نافرمانی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے معاملہ میں کانگریس نے مسلم لیگ کو اطمینان نہیں دلایا تھا بلکہ مسلمانوں کے علی الرغم سول نافرمانی شروع کر دی۔ کانگریس کی یہ سول نافرمانی کس مقصد کیلئے تھی۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ یہ کامل آزادی حاصل کرنے کے لئے کی گئی مگر یہ غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب وائسرائے نے نہرو رپورٹ منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ جو مسلمانوں کے مفاد کے لئے سخت مضر تھی۔ تو کانگریس نے اس ضد میں سول نافرمانی شروع کر دی۔ مسلمان اس سول نافرمانی کو اپنے خلاف ہندوؤں کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں اصل طاقت ہندوؤں کی ہے۔ اور مسلمان قابل اعتبار بھی نہیں ہوتا۔ اور مسلمانوں کا یہ خیال صحیح تھا۔ چنانچہ ثبوت میں پنڈت جواہر لعل نہرو کا یہ متکبرانہ قول پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگریس دوسری برطانوی حکومت۔ یہ کہ مسلم لیگ جو کانگریس سے الیکشن لڑ رہی ہے۔ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مخالفین کی طرف سے مسلم لیگ پر ایک بے مغز اعتراض ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ مجلس واضعان قانون کا ممبر منتخب کرنا مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا تحفظ کریگا۔ جن کے وہ آئین مروجہ کی رو سے مستحق

ہیں۔ تو تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ مسلمانوں کو مجالس واضعان قوانین میں بھیجنا ہی مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں مسلم لیگ صرف اس غرض کے لئے الیکشن میں جد وجہد کر رہی ہے کہ صرف ان لوگوں کو بھیجے جو ہندوستان کے سیاسی اختیار کی ترقی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی تمدنی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے خلاف کانگریس کی اطاعت کریں۔ اگر یہ بات کہ مسلمان کسی عہد کے ساتھ مجالس واضعان قوانین میں جائیں۔ اس قدر غیر اہم ہے کہ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ تو کانگریس اپنے قدیم دستور کے خلاف اس مرتبہ الیکشن لڑانے پر اس قدر کیوں مصر ہے کہ اس کو کمزور ہونا منظور اور کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کی تحریک کو تعویق میں ڈالنا منظور مگر مسلم لیگ کے مقابلہ میں الیکشن لڑانا ضرور۔ واضح ہے کہ اس معاملہ میں کانگریس کا عمل جارحانہ ہے کہ مسلم لیگ کا؟ اس اعتراض کا صرف یہ حل ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کا مطمح نظر کامل آزادی ہے۔ مفاد عامہ کے کاموں میں مسلم لیگ کی پارٹی کانگریس کی کوئی مخالفت نہیں کرتی۔ البتہ مسلم اقلیت کے حقوق و مفاد کا تحفظ اس کا دفاعی عمل ہے۔ لہذا کانگریس کو مسلم لیگ کے مقابلہ میں کوئی الیکشن نہ لڑانا چاہیئے۔ پھر نہ وہ کمزور ہوگی۔ اور نہ آزادی کی تحریک اگر اس کا کہیں وجود ہے تعویق میں پڑے گی۔

جواب سوال نمبر ۷ مسلم لیگ نے اکتوبر ۱۹۳۷ء سے قبل ہندو اکثریت کے جارحانہ اقدامات کے مقابلہ میں اپنی مدافعت کر کے مسلمانوں کی دینی مذہبی اجتماعی سیاسی اور اقتصادی تنظیم کی حفاظت کی ہے۔ اکتوبر ۳۷ء سے اس کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ اب وہ عام مسلمانوں کو مسلم لیگ کی تنظیم میں داخل کر کے مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی خلفشار کو ختم کرنا چاہتی ہے رائے عامہ کی تربیت کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادی کامل اور آزاد ہندوستان میں مسلم اور دوسری اقلیتوں کے لئے جمہوری تحفظ یعنی اکثریت کے فرقہ وارانہ جبر و استبداد کے امکان کے انسداد کے مقصد پر ہم خیال کرنا چاہتی ہے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جس طاقت کی ضرورت ہے۔ وہ تنظیم کے ذریعہ پیدا کر رہی ہے۔ اس غرض کے لئے ہر ہر شہر قصبہ اور موضع میں مسلم لیگ قائم کی جا رہی ہے۔ ہر عام مسلمان اس کا رکن بنایا جا رہا ہے۔ نوجوانوں کی ایک بڑی جمعیت بھرتی کی جا رہی ہے۔ اقتصادی خوش حالی کے لئے مسلمان دستکاروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کے رواج کی کوشش ہے۔ سود منسوخ کرانا مد نظر ہے۔ اور مسلم لیگ کا جو ارادہ ہے۔ وہ اس کے سالانہ اجلاس کی قراردادوں سے مفصل معلوم ہوگا۔

جوابِ سوال نمبر ۸۔ اگر کانگریس سے سمجھوتہ ہوگیا اور اکثریت کے جبر و استبداد کا کوئی خطرہ نہ رہا مسلم لیگ اس وقت تک قائم رہے گی۔ اور اشتراکِ عمل مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہوگا۔ مسلمان منتشر ہو کر کانگریس میں کبھی شریک نہ ہوں گے۔ مسلم لیگ کی یہ قطعی رائے ہے۔

جوابِ سوال نمبر ۹۔ اگر علماء مسلم لیگ کے ممبر بننا چاہیں تو ان کا الیکشن کے ذریعہ مسلم لیگ کی با اختیار کمیٹیوں میں آنے سے گریز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تو بہترین صورت ہے لیکن خاص حالات میں بہت ہی مقتدر علماء کے لئے جو الیکشن کے ذریعہ نہ آسکیں ایک صورت اور بھی ہے جس کو انگریزی میں کو آپریشن کہتے ہیں۔ یعنی وہ بطریق اضافہ آسکتے ہیں۔

جوابِ سوال نمبر ۱۰۔ مسلم لیگ میں دینی امور کے متعلق علماء کی رائے کو وہی وقعت حاصل ہوگی۔ جو اب تک مسلمانوں میں ان کی رائے کو حاصل رہی ہے۔ ان معاملات میں اگر علماء کے درمیان کوئی اختلاف ہو۔ تو اس کے لئے وہی طریق اختیار کیا جائیگا۔ جو حدیث و قرآن کی رو سے صحیح ہو۔

جوابِ سوال نمبر ۱۱۔ یقیناً مسلم لیگ نے جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے تصادم کو ضرور محسوس کیا ہے اور اس کے انسداد کی اس کے ذہن میں یہ صورت ہے کہ جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے درمیان تقسیمِ عمل ہو جائے یعنی خالص دینی امور کا انصرام جمعیۃ العلماء اپنے ذمہ لے لے۔ اور مذہبی تمدنی سیاسی اور دوسرے شعبہ ہائے حیات کے انصرام میں شرکت کے لئے علماء حضرات مسلم لیگ میں بحیثیت مسلمان شریک رہیں۔

جوابِ سوال نمبر ۱۲۔ بیشک راجپوتوں اور غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام مسلم لیگ کے نزدیک ایک اہم فریضہ ہے اور سیاسی حیثیت سے بھی یہ ضروری ہے۔ مگر اس اہم اسلامی خدمت کے اہل صرف حضرات علماء ہیں۔ بدقسمتی سے مسلم لیگ کو ان کا پورا تعاون حاصل نہیں رہا ہے۔ اس لئے وہ اس خدمت سے قاصر رہی ہے۔ اگر علماء اس کام کو شروع کریں تو مسلم لیگ ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے گی۔

اعلانِ مسلک

حضرتؒ مسلم لیگ کے جواب کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا ابھی جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مولوی منفعت علی صاحب وکیل و ممبر مسلم لیگ سہارنپور کی طرف سے حضرت کو ایک خط موصول ہوا۔ جس میں تمام حالات پر

روشنی ڈالنے کے بعد درخواست کی گئی کہ :-

"حضرت اقدس کے نزدیک دونوں جماعتوں یعنی لیگ اور کانگریس میں سے مسلمانوں کو کس جماعت میں شرکت کرنی چاہیئے" (مسائل سیاسیہ ص۔)

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے بیان کے مطابق اس خط کے موصول ہونے کے بعد مارفروری ۱۹۳۸ء کو حضرت تھانوی ایک مضمون لکھ کر خانقاہ میں تشریف لائے۔ صبح کی مجلس میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مولانا شبیر علی صاحب تھانوی و دیگر علماء خانقاہ کو بلا کر فرمایا کہ:

"رات میں نے سونا چاہا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ بار بار قلب یہ تقاضا کرتا تھا کہ جواب لکھو۔ جب شدید تقاضا ہوا تو میں لکھنے بیٹھ گیا۔ اور یہ مضمون قلمبند ہوا۔ جسے "تنظیم المسلمین" کا نام دیا گیا ہے"

اس کا خلاصہ حضرت تھانوی کے الفاظ میں یہ تھا کہ :-

"از خود نہ کسی سے آویزش کی ضرورت ہے نہ آمیزش کی ضرورت۔ رضائے حق کو مطمح نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں۔ اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پائے۔ یہی عبدیت کی روح اور حیات مسلم کی اصل الاصول ہے" (افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص۔)

وضاحت مسلک اپنے مذکورالصدر اعلان کی وضاحت میں آپ نے آگاہی عوام کے لئے "تنظیم المسلمین" کا ضمیمہ بعنوان "عرض ضروری باطلاع معذوری" حسب ذیل تحریر فرمایا :-

"بعد الحمد والصلوٰۃ حضرات ناظرین السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ سیاسیات حاضرہ کے متعلق ایک فتویٰ مسمیٰ بہ "تنظیم المسلمین" زمانہ قریب میں میری جانب سے شائع ہو چکا ہے۔ اور اس سے میرا مسلک واضح ہو گیا ہے۔ مگر پھر بھی روزانہ ڈاک میں اس کے متعلق برابر خطوط آتے رہتے ہیں۔ جن میں مختلف عنوانات سے سوالات ہوتے ہیں۔ چونکہ میں بوجہ ضعف ہر جزئی کا مفصل جواب دینے سے قاصر ہوں۔ اور بغیر تفصیل کے غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے نیز اس فتویٰ میں نہایت احتیاط کے ساتھ اس قدر قیود و حدود کی رعایت کی گئی ہے کہ ان میں غور کرنے سے یا کسی عالم کے مطالعہ میں شریک کرنے سے تقریباً تمام ضروری سوالات کا جواب اس سے حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ ہر تنظیم کا حسب قدرت شرع کے موافق ہونا ضروری ہے۔
۲۔ جس جماعت میں داخل ہوں۔ اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس میں منکر پر نکیر کرنا بھی آگیا
۳۔ جو شخص اسلام کو حق جانتا ہو۔ اس کی اصلاح بہ نسبت غیر مسلم کے سہل ہے۔
۴۔ اصلاح اس تفصیل سے کی جاوے کہ اہل قوت اپنی قوت سے اور غیر اہل قوت اُن اہل قوت کو آمادہ کرنے سے اور علماء سے علمی و عملی امداد حاصل کرنے سے کام لیں۔
۵۔ تمام علماء احکام کی تبلیغ میں مشغول رہیں کہ تقسیم خدمات کے قاعدہ سے یہ ان کا اصلی فرض ہے۔ اہل سیاست سے اس کی توقع فضول ہے۔ جیسا اس کا عکس۔ البتہ اہل سیاست تدابیر سیاست کے جواز و عدم جواز کے حکم میں علماء کے محتاج ہیں۔
۶۔ غیر اسلامی جماعت کے ساتھ اصول شرعیہ کے موافق صلح کا مضائقہ نہیں۔ لیکن ان میں مدغم نہ ہوں۔
۷۔ اگر کوئی دوسری اسلامی جماعت پیدا ہو جائے۔ اس کے ساتھ اتحاد رکھیں۔
۸۔ اگر ایسی سیاسی جماعت متقی نہ ہو مگر اسلام کی حفاظت اور مخالفین اسلام کی مدافعت اس کا مقصود مشترک ہو۔ جیسا کہ اس وقت زیادہ غرض تنظیم سے یہی ہے کہ جو متعصبین آزادی ہند کے بعد ہندوستان سے اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اس کی حمایت کریں تاکہ اسلام اپنے اصول و شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے۔ گو اس جماعت کے افراد میں اختلاف مذاہب بھی ہو۔ اور اس وقت کی فضاء پر نظر کر کے بظاہر اسباب اس کی ضرورت ہے کہ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لئے باہمی اختلاف کو بجائے خود رکھ کر سب کلمہ گو جمع ہو جاویں۔ تو متقی نہ ہونا ایسی حالت میں اختلاف میں مانع تعاون نہیں۔ البتہ اس میں شرط ضروری ہے کہ اس تعاون میں جو اختلاط ہو۔ وہ مضر دین نہ ہو۔ اور اس کی اسلم صورت یہ ہے کہ عوام الناس ایسے لوگوں سے مذہبی گفتگو نہ کریں۔ نہ سنیں۔ یہ کام علماء پر چھوڑ دیں۔ البتہ اپنے عقیدہ کی علمی و عملی اصلاح خاص ملاقاتوں میں لطف و اخلاق سے کرتے رہنا بالخصوص مناسب بلکہ واجب ہے۔ تاکہ وہ بھی تقویٰ کے ساتھ موصوف ہو جاویں۔ حاصل اس تقسیم خدمات کا یہ ہے کہ زعماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث القوم مٹنے نہ دیں اور علماء کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو من حیث المذہب بگڑنے نہ دیں۔ تو ایک جماعت میں جن خاص اوصاف کی کمی اس کے فرض میں مخل ہے۔ اس کمی کو دوسری جماعت میں دیکھ کر خود اس جماعت کو بیکار سمجھنا محض ناحقیقت شناسی اور ناتجربہ کاری

ہے ع ہر کسے بہر کارے ساختند۔

۹- ہر حال اور ہر عمل میں اصل مطمح نظر رضائے حق کو رکھیں کہ حقیقی کامیابی اسی پر موقوف ہے

۱۰- فتویٰ ۱۳۵۶ھ کے ختم اور ۱۹۳۸ء کے آغاز کا لکھا ہوا ہے اور اس وقت کی حالت کی بنا پر ہے۔ اگر حالات بدل گئے تو حکم بھی بدل جائیگا۔"

یہ وہ اعلان تھا۔ جس کے ذریعہ آپ نے مسلمانوں کو چند شرائط کے ساتھ مسلم لیگ میں شامل ہونے کا فتویٰ دیا۔

مجلس دعوۃ الحق

حضرت تھانوی کی اصل سیاست یہ تھی کہ جس طرح بھی بن سکے۔ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنادیا جائے۔ اسلئے آپ کی حمایتِ لیگ سیاسی اغراض کے لئے نہ تھی۔ بلکہ اس غرض کے لئے تھی۔ کہ مسلمان لیگ کے اندر داخل ہوکر اپنی تنظیم اور لیگ کی اصلاح کی فکر کریں تاکہ یہ کانگرس کا مقابلہ کرسکے۔ اور متعصبین اسلام کو ہندوستان سے نہ مٹا سکیں۔ اور اسلام اپنے اصول وشعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے مسلم لیگ چونکہ نہ علماء کی جماعت تھی اور نہ بالکل دینداروں کی۔ اسلئے حضرت تھانوی کو اس کی قیادت سے کچھ دینی مضرتوں کا احتمال تھا۔ جس کی وجہ سے آپ نے ایک ایسی تبلیغی جماعت بنانے کی ضرورت محسوس فرمائی۔ جو تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کی بھی نگرانی کرتی رہے۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے حقوق کا گورنمنٹ سے مطالبہ کرتے وقت شریعت کے خلاف عمل نہ کر بیٹھے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے حضرت کے ایماء پر "مجلس دعوۃ الحق" قائم ہوئی۔ جس کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

الف۔ حضرت تھانوی کے رسائل "تنظیم المسلمین و تعلیم المسلمین" میں جو عوام و خواص کو تنظیم و تبلیغ کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کے لئے ایک مرکز قائم کرنا۔ اور تنظیم و تبلیغ کو وسیع پیمانہ پر ہندوستان میں پھیلانا۔

ب۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کو دینداری کی طرف متوجہ کرنا۔ کیونکہ مسلم لیگ کو اس وقت مسلمانوں میں بڑی حد تک مرکزی شان حاصل ہے۔ اس کے لیڈروں کی اصلاح سے بہت کچھ عوام کی اصلاح متوقع ہے۔

ج۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ارکان کے پاس ان کے جلسوں میں یا خاص اوقات میں چند مخلصین کا وفد بھیجتے رہنا۔ جو یہ بات ان کے ذہن نشین کرائے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اتباع

احکام الہیہ سے ہی کامیابی اور ترقی ہوئی ہے۔ محض اسباب ظاہرہ یا دیگر اقوام جیسا مظاہرہ مسلمانوں کے لئے ہرگز کافی نہیں۔

د۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو شعائر اسلامیہ کی پابندی کی تبلیغ کرنا اور ان سے درخواست کرنا کہ مسلم لیگ کے ہر ممبر پر قانونی طور سے شعائر اسلامیہ کی پابندی کو لازم کیا جائے کہ اس پر کامیابی موقوف ہے۔ اور قلوب اہل اسلام کا انجذاب بھی اسی سے ہوگا۔ جو تنظیم کی بنیاد ہے۔

چنانچہ اس تبلیغی پروگرام پر نومبر ۱۹۳۸ء سے عملدرآمد شروع ہوگیا۔ اور اسکی ابتدا قائد اعظم کو تبلیغ سے ہوئی۔

تطہیر و تکفیر کی مساعی

ایک طرف تو حضرت تھانویؒ اور ان کے مخلصین کی جماعت اللہ کے دین کا بول بالا کرنے اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کی غرض سے مسلم لیگ والوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے میں مصروف تھی۔ اور دوسری طرف خود حضرت تھانوی کو کافر قرار دینے والا بریلویوں کا فتویٰ لوگوں میں تقسیم کیا جارہا تھا۔ اور مسلم لیگ والوں کو بے دین ثابت کیا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ قائد اعظم تک کو کافر کہا جارہا تھا۔ تاکہ کسی طرح لوگ مسلم لیگ میں شامل نہ ہوں۔ اس پر حضرت نے ایک دوسرا اعلان بعنوان "الطریق الاحم فی شرائط اتحاد الامم" جاری کیا۔ اور اس میں لکھا کہ:-

"بعض حضرات کانگریس کے مفاسد کے جواب میں اکثر اہل مسلم لیگ کے بعض اعمال دینیہ کی کوتاہیاں پیش کر کے بطور الزام ان کوتاہیوں کو اس کے ساتھ اتحاد کرنے کے جواز سے مانع قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ کہاں اصل ایمان کا فقدان کہاں فروع اعمال کا نقصان۔ تو ایک کا قیاس دوسرے پر محض فاسد اور قیاس مع الفارق ہے۔ خصوص جبکہ اس دوسرے نقصان کی اصلاح کی توقع بھی قریب ہو۔ جس کی کوشش شروع بھی ہوگئی ہے۔

ظاہر ہے کہ اہل مسلم لیگ کی کوتاہیاں خوارج کی بددینی کے درجہ تک تو نہیں پھر جب کفار کے مقابلہ کے لئے خوارج کے ساتھ اشتراک عمل جائز ہے۔ تو مسلم لیگ کے ساتھ بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ پس اس تحریر سے کانگریس اور مسلم لیگ کی حقیقت اور حکم میں صاف فرق ظاہر ہوگیا۔ اس پر بھی اگر کوئی شخص اپنے قیاس فاسد پر

اصرار کرے۔ تو کیا علاج"

جمعیتہ العلماء ہند کی دعوت

جب کانگریس نے دیکھا کہ حضرت تھانوی مسلم لیگ کی پشت پناہی سے باز نہیں آرہے ہیں۔ تو اس کی حلیف جماعت جمعیتہ العلماء ہند کے ناظم مولانا احمد سعید صاحب کی طرف سے مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۳۹ء کو حضرت تھانوی کی خدمت میں اس مضمون کا ایک دعوت نامہ پہنچا۔ کہ "جمعیتہ العلماء ہند کا جو اجلاس دہلی میں ہو رہا ہے اس میں شرکت کے لیے بہ نفس نفیس تشریف لاویں۔ اگر سفر کا تحمل نہ ہو۔ تو کسی کو بطور نمائندہ روانہ فرما دیں۔ معاملات کی اہمیت حضور کے پیش نظر ہے"۔

حضرت تھانوی کا جواب

جمعیتہ العلماء ہند کے دعوت نامہ کا حضرت تھانوی کی طرف سے مندرجہ ذیل جواب لکھا گیا:۔

"السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ آپ کا دعوت نامہ آیا۔ میرا عذر سفر تو آپ کو معلوم ہی ہے اسلئے خود تو حاضری سے قاصر ہوں۔ اگر دعوت نامہ کچھ پہلے آتا۔ تو ممکن تھا۔ کہ اس کے متعلق کچھ غور کر کے کسی کو بھیجنے کا انتظام کرتا۔ اب عین وقت پر اس کا انتظام بھی مشکل ہے۔ اسلئے شرعی حیثیت سے صرف اپنی ایک رائے کا اظہار کرتا ہوں۔ جس کے متعلق مولانا محمد کفایت اللہ صاحب سے زبانی گفتگو بھی ہو چکی ہے۔ اور اب تو واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت ہی پختہ کر دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا خصوصاً حضرات علماء کا کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کر دینا نہایت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنا چاہیے تاکہ ان کی تنظیم خالص دینی اصول پر ہو۔ اور مسلمانوں کو کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔ والسلام اشرف علی" (افادات اشرفیہ ص ـــ)

مگر عین وقت پر اس کی روانگی روک لی گئی۔ اور یہ جواب نہ بھیجا گیا۔ اس جواب کے نہ بھیجنے کی مصلحت اس وقت معلوم ہوئی جب جمعیتہ العلماء ہند کے مذکورہ بالا اجلاس میں ہونے والی تقریر کے ردعمل کے طور پر اجلاس کے اختتام کے قریب ہی مولوی مظہر الدین مالک اخبار الامان دہلی کو قتل کر دیا گیا اگر یہ جواب چلا جاتا۔ تو یہی خیال کیا جاتا کہ حضرت کے جواب سے برافروختہ ہو کر جلسہ والوں نے ایسی تقاریر کیں جو مسلم لیگ کے ترجمان کے قتل پر منتج ہوئیں۔ چونکہ حضرت پر اس واقعہ کا ہونا منکشف ہو چکا تھا۔ اسلئے آپ نے جواب نہ بھیجنے دیا۔

قتل کی دھمکی

حضرت کے خط نے کانگریسیوں کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کانگریسی حکومتوں

کی مسلم کش پالیسی اور ہندوؤں کے جبر و استبداد نے پاکستان کے لئے راہ صاف کرنی شروع کر دی جمیعتہ العلمار۔ احرار۔ سرخپوش نیشنلسٹ اور مومن کانفرنس والے سب مل کر بھی تھانہ بھون کے مرد درویش کی آواز پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ اور مسلمان حضرت تھانوی کے اعلانات پر جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہو کر جنگ پاکستان لڑنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ غرضیکہ کانگرسیوں کے تمام ناجائز حربوں کے باوجود حضرت تھانوی مسلم لیگ کی حمایت سے باز نہ آئے ع

خلقے بہ یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

سیاسی معاملات میں حضرت تھانوی کے اس استقلال و استقامت کو دیکھ کر محقق اسلام مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھا کہ:-

"اللہ تعالیٰ ان (حضرت تھانوی) کے سایہ کو ملت اسلامیہ کے سر پر دیر تک صحت وسلامتی کے ساتھ قائم رکھے۔ اور اس وقت کے طوفان کے اکیلے ملاح کو اتنا تو دفقہ دے کہ کم از کم یہ طوفان سر سے ٹل جائے۔ علمار میں افسوس ہے کہ سب اُدھر ہی چلے گئے۔ جدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں۔ ایک حضرت ہی ہیں۔ جن سے اس جماعت کی آبرو باقی ہے۔" (حکیم الامت ص۵۳۶)

اہل نظر حضرت کی درازئ عمر کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ اور اہل غرض انہیں اپنے راستہ سے ہمیشہ کے لئے ہٹانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جمیعتہ العلمار ہند کو ٹکا سا جواب ملنے کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد حضرت تھانوی کو ۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء کی ڈاک میں ایک خط موصول ہوا جس کے لفافہ پر مٹونا تھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ کے ڈاک خانہ کی ۱۲ اپریل ۱۹۳۹ء کی مہر تھی خط میں کاتب کا نام اور پتہ درج نہ تھا۔ یہ لکھا تھا کہ:-

"یہ بات بہت تشویش اور ہمارے لئے شرم کی ہے کہ کانگرس جمیعتہ العلمار۔ احرار اور مومن کانفرنس کی تمام کوششوں کے باوجود مسلم لیگ کا فتنہ ملک میں پھیلتا جاتا ہے اور آپ نے علماؤں کے خلاف مسلم لیگ کے موافق فتویٰ دیا ہے۔ جس سے بہت اثر ہے۔ لیکن اب ہماری پارٹی مسلم لیگ کے مولویوں اور بددین لیڈروں کو مزا چکھانے کے لئے تیار ہو کر میدان میں آگئی ہے۔ اسلئے آپ کو بھی تاکیدی نوٹس دی جاتی ہے کہ ایک مہینہ کے اندر اندر مسلم لیگ سے اپنا فتویٰ واپس لے لو۔ اور حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا مسلک قبول کر لو۔ اور کانگرس کی حمایت

کر دو۔ ورنہ یقین اور پورا یقین رکھو کہ مظہر الدین "الامان" والا کی طرح تم کو بھی تمہاری خانقاہ میں چھرے سے ذبح کر دیا جائے گا۔ یہ تیسرا و آخری اطلاع بھیجی جاتی ہے۔ ایک مہینہ کی مدت غنیمت جاننا۔ ایک مہینہ تمہارے بیان کی انتظار کر کے ہمارا آدمی روانہ ہو جائے گا۔ جو پستول یا چھرے سے تم کو ختم کر دے گا پھر مردود جینا کی باری ہوگی۔ اور مدعی مولوی حامد بدایونی کی۔ یہ اعتقی کوئی دھمکی نہیں ہے۔ فقط کانگریس زندہ باد اور جمعیتہ العلماء زندہ باد۔ (اعلام نافع ص ۲)

دھمکی کا جواب

حضرت تھانوی نے قتل کی اس دھمکی کے جواب میں حسب ذیل اعلان "النور" ماہ صفر ۱۳۵۷ھ میں شائع فرمایا:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ کاتب خط نے میرے اس فتویٰ میں جو مسلم لیگ کے متعلق ہے اور جس کا لقب تنظیم المسلمین ہے۔ غور نہیں کیا جس کی وجہ سے بلا دلیل اس کو مسلم لیگ کی حمایت مطلقہ سمجھ لیا۔ حالانکہ اس میں ذیل کی قیود کی تصریح کی ہے۔

۱۔ اس کو اس جماعت پر ترجیح دی ہے جس میں غالب عنصر غیر مسلمین کا ہے۔

۲۔ اسلامی منظم و صاحب قوت و صاحب اثر جماعتوں پر اگر موجود ہوں۔ ترجیح نہیں دی بلکہ یہ لکھ دیا ہے کہ اگر مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد اور کوئی جماعت مسلمہ منظمہ۔ صاحب قوت و صاحب اثر تیار ہو جائے تو اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد و اشتراک کے ساتھ کام کریں۔ تاکہ مسلمانوں میں افتراق و تشتت نہ ہو۔

۳۔ اس میں مسلم لیگ کے نقائص کو تسلیم کر کے اس کی اصلاح کا سب کو خصوص علماء کو مشورہ دیا ہے۔

۴۔ پھر اس میں جو اہل قوت و اہل اثر ہیں۔ ان کو اپنی قوت و اثر سے اس کی اصلاح کی تاکید کی گئی ہے۔

۵۔ خود بھی اس کی اصلاح کا برابر سلسلہ رکھتا ہوں۔ چنانچہ عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی جاتے رہتے ہیں۔

۶۔ ابھی لیگ کے اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا ایک مختصر وفد اس کام کے لئے بھیجا۔ پھر ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو چند عزیزوں کو اس کام کے سلئے دہلی روانہ کیا۔

ف یعنی قائد اعظم

غرض جتنا مجھ سے ہو سکتا ہے۔ لیگ کے ذمہ دار حضرات کو برابر دین کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوصاً علماء بھی مل کر ان حضرات پر زور دیتے۔ اور ان کو نماز روزہ اور وضع اسلامی کی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے۔ تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہو جاتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے ان خطرات سے آویزش کرنا سبب نہیں سمجھا۔ کہ جلسے کرتا اور ان کے مقابلہ میں ان کوتاہیوں کو برملا بیان کرواتا۔ کہ اس کو میں مضر سمجھتا ہوں۔ اس طریقہ سے دوسرے کو ضد ہو جاتی ہے۔ جو طریقہ میں نے اختیار کیا ہے۔ وہ دیر طلب ضرور ہے۔ مگر اس کا اثر انشاءاللہ دیرپا ہوگا۔ پھر ان احتیاطوں کے ساتھ میں نے وہ فتویٰ قبل اشاعت اپنی دیوبندی جماعت کے علماء کو بھی دکھلا لیا تھا۔ جس کی پسندیدگی پر سب نے اتفاق کیا تھا۔ گو میں نے اسی وقت ان حضرات کے نام ظاہر نہیں کئے کہ شاید وہ اپنی مصلحت کے خلاف سمجھیں صرف فیما بینی وبین اللہ ان سے اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ جیسا کہ ان کی تصدیقات سے ظاہر ہے۔

میں اب بھی اس پر آمادہ ہوں کہ اگر علماء سے اس کارروائی کے خلاف شرع ہونے کا فتویٰ حاصل کر کے مجھ کو اطلاع کر دی جائے۔ میں اس میں انصاف اور تدین سے غور کر کے تشرح صدر کے بعد اپنے فتویٰ سے رجوع کر لوں گا۔ جیسا کہ میرا ہمیشہ سے معمول رہا ہے رسالہ ترجیح الراجح کا سلسلہ اسی کی دلیل ہے اور یہی کلام ہے کانگرس کی حمایت میں جس کو اب تک میں بحالت موجودہ اسلام اور اہل اسلام کے لئے سخت مضر سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر دلیل شرعی سے اس کے خلاف واضح ہو جائے۔ تو میں اپنی رائے بدلنے کو تیار ہوں۔ اور کسی کی غلطی پر مطلع کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

باقی اگر تخویف سے کسی نے اپنی ضمیر کے خلاف کوئی رائے بھی ظاہر کر دی تو یہ عقلاً مفید نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ یہ رائے دل سے نہیں دی۔ تو اس سے مقصود حاصل نہ ہوگا۔ اسلئے یہ طریقہ محض عبث اور عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے۔ یہ سب تنقیح اس وقت ہے جب حقیقت کو سمجھنا اور حق کا اتباع کرنا مقصود ہو۔ اور اگر یہ نہیں تو پھر بجز قیامت کے دن کے اس کے فیصلہ کی کوئی صورت نہیں۔ باقی میں اس پر تیار نہیں کہ محض مخلوق کے راضی کرنے کیلئے حق تعالے کو ناراض کر دوں۔ اور دنیا کی متاع قلیل کے لئے آخرت کے نفع و ضرر کو نظر انداز کر دوں۔ میرا ہی کیا ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ مقدرات بدلا نہیں کرتے۔ لہذا جو ہونے والا ہے ہو کر

رہے گا۔ اور نہ ہونے والا ہوگا۔ لہٰذا اس خط کا بحمد اللہ مجھ پر کوئی معتد بہ اثر نہیں ہوا۔ اور نہ اس سے بچنے کے لئے مجھے کسی رسالہ کے شائع کرنے کی ضرورت تھی۔ مگر اس سے مجھے یہ شبہ ہوگیا کہ بعض لوگوں کو مسلم لیگ کے متعلق میرے مسلک کی نسبت کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ اگر اس خط میں کاتب کا نام و نشان ہوتا۔ تو خصوصیت کے ساتھ تفہیم ممکن تھی۔ اب عام عنوان سے جواب دے دیا ہے۔ والسلام۔ واللہ الھادی الیٰ سواء السبیل"

یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ محبت و عقیدت اور جوش و جنون انسان کی نظر حقیقت تک نہیں پہنچنے دیتا۔ حضرت تھانوی کے جواب سے ارباب ہوش کی تو تسلی ہوگئی۔ مگر ارباب جوش نے اسے اپنے لئے آخری تازیانہ سمجھا۔

لیگ خاکسار اتحاد

عین اس زمانہ میں جبکہ حضرت تھانوی کو لیگ کی حمایت کی پاداش میں قتل کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں مسلم لیگ جماعت خاکساران سے محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ جس کے ذریعہ اس کے امیر علامہ مشرقی مسلمانوں میں اپنے عقائد کفریہ پھیلا رہے تھے جس کی خبریں تھانہ بھون میں مخلصین اور معترضین کے خطوط کے ذریعہ برابر پہنچ رہی تھیں۔ اور حضرت کو مطعون کیا جا رہا تھا۔ کہ آپ ایک ایسی جماعت کی تائید و حمایت کر رہے ہیں جس کا تعلق علامہ مشرقی کی جماعت سے ہے۔ جو عقائد کفریہ رکھتے ہیں۔ اس سے حضرت تھانوی کو سخت رنج پہنچا۔

صدر یو۔پی مسلم لیگ کی طلبی

اس سے کچھ عرصہ قبل قائد اعظم کے ایما پر نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب بیرسٹر ایم۔ایل۔اے صدر پارلیمنٹری بورڈ و یو۔پی مسلم لیگ نواب جمشید علی خاں صاحب کے ہمراہ لیگ کے خلاف حضرت تھانوی کے شکوک رفع کرنے کی غرض سے تھانہ بھون حاضری دے چکے تھے۔ اور انہی کی یقین دہانی پر حضرت لیگ کی حمایت فرما رہے تھے۔ اسلئے لیگ خاکسار اتحاد کے سلسلہ میں حضرت نے ان سے ہی شکوہ کرنا مناسب سمجھا اور انہیں تھانہ بھون میں طلب فرمایا۔

افہام و تفہیم اور اس کا نتیجہ

چنانچہ نواب صاحب فوراً تھانہ بھون پہنچے۔ وہاں افہام و تفہیم کی جو گفتگو ہوئی۔ اس کی تفصیل نواب صاحب یوں لکھتے ہیں کہ:۔

"دوسری مرتبہ مولانا نے خود مجھے تھانہ بھون میں طلب کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ علامہ مشرقی نے کوئی قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی۔ یا لکھنا شروع کی تھی۔ اس پر مولانا مرحوم کو سخت غصہ

تھا۔ ان کو کسی نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ لیگ اور خاکساروں میں گہرا تعلق ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے۔ تو وہ لیگ سے بھی بیزاری کا اعلان کر دیں گے۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ ایسا کرتے۔ انہوں نے مجھ سے تصدیق کرنی مناسب سمجھی۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ خاکساروں کا لیگ تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اکثر ہمارے جلسوں میں بغیر بلائے بحیثیت والنٹیروں کے آجاتے ہیں۔ میں ایک بیان شائع کر دوں گا جس میں پبلک کو ظاہر کر دوں گا کہ لیگ کا خاکساروں کے ساتھ کوئی تعلق یا سمجھوتہ نہیں ہے۔ مولانا مطمئن ہو گئے۔ میں نے یہ بھی رائے پیش کی کہ اس سے قبل کہ مولانا کوئی بیان اخبارات کو دیں۔ یہ بہتر ہو گا کہ علامہ مشرقی کو بتائیں کہ ان سے کیا کیا غلطیاں اس تفسیر میں ہوئی ہیں۔ اور اگر وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کریں۔ تو ضرور ان کے خلاف بیان شائع کریں۔ اس کو انہوں نے خندہ پیشانی سے منظور فرمایا۔“ (مکتوب گرامی مورخہ ۱۰ جون ۱۹۵۵ء)

حضرت تھانویؒ نے نواب صاحب کو بتلایا کہ وہ علامہ مشرقی کو اس سلسلہ میں لکھ چکے ہیں اور نواب صاحب نے واپس آکر بحیثیت صدر یو۔ پی مسلم لیگ یہ بیان اخبارات میں شائع کرا دیا کہ لیگ کا خاکساران سے کوئی تعلق یا واسطہ یا سمجھوتہ نہیں ہے۔ جس سے حضرت کو تسلی ہو گئی۔

سیاست کے کرشمے

اسلام نے تو سیاست کی بنیاد امانت و دیانت پر رکھی تھی۔ مگر دانایانِ فرنگ نے اسے خود غرضی و مطلب پرستی کا ذریعہ بنا دیا۔ اور جائز و ناجائز۔ حلال و حرام اور دوست و دشمن کی تمیز اڑا دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ذاتی مفاد کی خاطر قومی مفاد قربان کیا جانے لگا۔ اور ذاتی اغراض کے لئے دوستوں کو بھی دشمن سمجھا جانے لگا۔

اس زمانہ میں پنجاب کی ”اتحادی حکومت“ تھی۔ جس کی عنان وزارت سر سکندر حیات خاں مرحوم کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی پالیسی اگرچہ مسلم لیگی تھی۔ مگر اپنی وزارت کے استحکام کے لئے کانگریسیوں سے بھی انہوں نے دوستانہ گانٹھ رکھا تھا۔ حسن اتفاق سے مسلم لیگ کو ۱۹۳۹ء میں امرتسر کا ضمنی الکشن لڑنا پڑا۔ مسلم لیگ نے امرتسر کے مشہور قومی کارکن شیخ صادق حسن صاحب کو نمائندہ منتخب کیا۔ کانگرس ان کے مقابلہ میں امرتسر کے مشہور کانگرسی رہنما ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو کو میدان میں لے آئی۔ گو دونوں کا امرتسر اپنا گھر تھا۔ جوڑ بھی برابر کے تھے۔ مگر کانگرسیوں کو کچھ لیگیوں کا پلہ بھاری معلوم ہوا۔ اسلئے شیخ صادق حسن صاحب کو پچھاڑنے کے لئے کانگرس

کی حلیف جماعت احرار نے بھی الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنا مشہور اور مخلص رہنما چودھری افضل حق مرحوم مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ ان کا اگرچہ امرتسر گھر نہیں تھا۔ مگر ان کی جماعت احرار کا گڑھ ضرور تھا۔ اب ذرا لیگ والوں کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اگرچہ خاکساروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ جن کا وہ عہدِ شباب تھا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ علمارِ حق کی امداد کے بغیر وہ کانگریس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس وقت سر سکندر حیات خاں کی بالکل وہی حالت تھی جس حالت سے چار سال قبل مولانا شوکت علی مرحوم کو جھانسی کے میدان میں دوچار ہونا پڑا۔ اس کامیاب سیاست دان نے دیکھا کہ اگر حضرت تھانوی شیخ صادق حسن صاحب کے حق میں چند سطریں لکھ دیں۔ تو وہ ان کی روحانی قوت سے احرار اور کانگریس کو شکست فاش دے سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت تھانوی کی خدمت میں آنریری سیکرٹری پنجاب پراونشل مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کی معرفت درخواست امداد بھیجی۔

سر سکندر حیات خاں کو ٹکا سا جواب

جس وقت سر سکندر حیات خاں کا ذاتی پیغام امداد تھانہ بھون پہنچا۔ اس وقت حضرت کے کانوں تک یہ خبریں بھی پہنچ چکی تھیں کہ :-

۱۔ شیخ صادق حسن صاحب خاکساروں کی امداد سے الیکشن لڑ رہے ہیں۔

۲۔ بعض لیگی حضرات کانگریسی علمار کو سامنے رکھ کر بلا استثنیٰ علمار کرام کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

۳۔ اور کہ وہ شعائرِ اسلام کی پابندی بھی نہیں کر رہے جس کی حضرت انہیں تبلیغ کرتے اور کراتے رہتے تھے۔ اسلئے حضرت کو ارباب لیگ سے سخت شکوہ تھا۔ سر سکندر حیات خاں کے خط آنے کے بعد اب آپ کو انہیں کھری کھری سنانے کا موقع ہاتھ آیا۔ اور آپ نے سر سکندر حیات خاں کو ایسا ٹکا سا جواب دیا۔ جو انہیں کبھی کسی اور نے نہ دیا تھا۔

داستانِ شکوۂ لیگ

یہ تاریخی اور بصیرت افروز مکتوب سر سکندر حیات خاں کے خط کا صرف جواب ہی نہ تھا۔ بلکہ ارباب مسلم لیگ کے شکوہ کی مکمل داستان بھی تھی۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا :-

از اشرف علی عفی عنہ۔ یکم رجب۔ جمعہ ۱۳۵۸ھ

مکرمی زاد لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الطاف نامہ صادر ہوا۔ احقر تو مسلم لیگ کا ہمیشہ حامی ہے۔ اور وہ حمایت الحمد للہ کہ کسی غرض کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی دنیوی اصلاح میں اس وقت مسلم لیگ ہی میں شامل ہونے میں سمجھ رہا ہوں۔ اور کانگریس میں داخل ہونے میں دینی و دنیوی دونوں کا نقصان خیال کرتا ہوں۔ لیکن ہر مسلمان جانتا ہے کہ دنیا سے دین مقدم ہے۔ اور تاریخی واقعات وشواہد سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک مسلمان دین اور مذہب پر قائم رہے اور اس قدر پختگی سے قائم رہے۔ کہ لوگ ان کو مجنوں سمجھتے تھے۔ ان کو دین کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل کی دھن تھی۔ اس وقت تک دنیوی اعتبار سے بھی مسلمان ہر طرح کامیاب رہے اور تمام دنیا میں ان سے آنکھ ملانے والا کوئی نہ تھا۔ اور جب سے اس میں کمی آئی۔ اسی وقت سے ذلیل ہوتے ہوتے اب ان کی ذلت کی انتہا ہو گئی ہے۔ اور تمام مجھدار حضرات اپنی تقریروں اور تحریروں میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی ماضی کی طرف لوٹنا چاہیئے۔ مگر نہ معلوم اس کا مفہوم کیا سمجھ لیا ہے۔ کہ اس کو فرماتے سب ہیں۔ جانتے سب ہیں۔ مگر دین کی باتوں سے گریز ہے۔ کہتے ہیں۔ مگر عمل نہیں کرتے۔ سو اگر حضرات لیگ دینداری کی طرف توجہ فرماتے۔ تو آج لیگ کی ترقی سے تمام اقوام خائف ہوتیں۔ مگر نہ معلوم کون سی چیز مانع ہے۔ کہ اس طرف نہیں آتے۔ میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسہ پٹنہ میں ایک پیام بھیجا تھا۔ جو وہاں پڑھا بھی گیا تھا۔ اور سب حضرات کو تقسیم بھی کیا گیا تھا۔ اس میں صرف دو چیزوں کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی۔ اول نماز کی پابندی کو لیگ کے مقاصد میں شامل کیا جاوے۔ دوسرے وضع اسلامی کو لیگ کے ہر ممبر پر لازمی قرار دیا جاوے نماز کا ارکان اسلام میں اہم ترین رکن ہونا ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ اور وضع خاص رکھنا ایسی چیز ہے کہ دنیا کے تمام سیاست دان اس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ جرمنی کا لباس الگ ہے۔ جاپان کا الگ ہے۔ فرانسیسی کا الگ دکھلایا۔ اور فوجی وردی تو لازمی طور پر الگ ہوتی ہے۔ اگر جرمنی سپاہی مثلاً انگریزی وردی پہن کر جرمنی فوج میں شامل ہو۔ اور ویسے ہر طرح وفادار اور مستعد ہو۔ لیکن صرف وردی کی تبدیلی کی وجہ سے وہ مستوجب سزا کا ہوگا۔ دکھلایا۔ تو کیا مسلمانوں کے لئے جو حق تعالےٰ کی فوج ہے۔ کوئی خاص وضع اور امتیاز ضروری نہیں ہے؟ ہے اور ضروری ہے!

لیکن افسوس کہ حضرات لیگ نے ان دو باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ اگر ان باتوں کی

طرف توجہ فرماتے۔ تو دین کی اور باتیں بھی جو ترقی دنیا میں بھی مؤثر ہیں۔ میں اور بتاتا۔ گر مجھے واقعی حضرات لیگ سے یہ شکایت ہے کہ مولویوں کو صرف الیکشن کے وقت پوچھا جاتا ہے اور ان کے فتووں پر عمل کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اور پھر ان کی بات کی طرف کوئی کان نہیں دھرتا۔ ہم اگر ذاتی منافع کے لئے کچھ بھی کہیں۔ تو بیشک نہ سنئے۔ نہ مانئے۔ لیکن اگر ان حضرات کو ہم پر اعتماد ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم فتویٰ صحیح دیتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ الیکشن ہی کے لئے صحیح ہوتا ہے۔ دوسرے وقت وہ قابل عمل نہیں ہوتا۔ میری غرض لیگ کی حمایت سے یہی تھی کہ اس میں بحمد اللہ سمجھدار۔ عالی دماغ مسلمان ہیں۔ تو ان حضرات سے جب دین کے لئے کہا جاویگا۔ تو بہت جلد مان لیا جاوے گا۔ تو گویا لیگ کی حمایت دین کی حمایت تھی اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اصل چیز یعنی دین ہی سے بے تعلقی اور بے توجہی ہے۔ تو بجز خاموشی کے اور کیا کروں۔ آپ ہی انصاف فرماویں کہ اب میرا کیا جی چاہے! یہاں تک تو وہ امور عرض کئے تھے۔ جن کی طرف حضرات لیگ کو متوجہ کر چکا ہوں اور پھر بھی انھوں نے عمل نہیں کیا۔

اب دو نئی چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ جن سے میں بہت پریشان ہو رہا ہوں ایک تو لیگ کا علامہ مشرقی سے تعاون اور دوسرا ذمہ داران لیگ کا علماء کے وقار اور ملا ازم کے برباد کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ مشرقی کی کتابیں میں نے بھی دیکھی ہیں۔ اور جہاں تک ہو سکا میں نے اس کے اقوال کی تاویل بھی کی۔ گر وہ انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اور اس کے عقائد جن کی رفتہ رفتہ وہ خاموشی سے تبلیغ کر رہا ہے صریح کفر ہیں۔ اور چونکہ مسلم لیگ اس وقت تک مسلمانوں میں مقبول جماعت ہے۔ گر خاکساروں کی حمایت کی وجہ سے لوگ لیگ سے بھی بدظن ہو رہے ہیں۔ جس کا مجھے اس طرح علم ہے کہ اکناف ہند سے ان لوگوں کے سوالات میرے پاس آ رہے ہیں۔ جو اب تک مسلم لیگ کے سرگرم اور حامی ممبر تھے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ لیگ جب خاکساروں سے تعاون کرتی ہے۔ تو اب مسلم لیگ میں داخل رہنا جائز ہے یا نہیں؟ غرض ان خاکساروں سے ملنے کی وجہ سے بھی لیگ بدنام ہو رہی ہے۔ اور جو شخص اب لیگ کی جدید حمایت کرے گا۔ وہ بھی بدنام ہوگا۔ دوسری چیز لیگ والوں کا بلا کسی استثناء کے علماء کے وقار کو تباہ کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ اگر کانگریسی علماء سے بچایا جاتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اختلاف مسلک کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ مگر بلا کسی استثناء کے علماء کے اثر کو مٹانے کی سعی کے معنے تو مذہب کو مٹانے کی سعی کرنا ہے۔ اور جو جماعت دین کو مٹانے

کی فکر میں ہو۔ آپ ہی انصاف فرمادیں کہ اس سے میں کہاں تک تعاون کر سکتا ہوں۔
مجھے بھی افسوس ہے کہ مجھے جناب سے نیاز حاصل نہیں ہے اور سر سکندر حیات خاں صاحب کے ارشاد کے بعد مجھے ایک ایسی تحریر لکھنا پڑی جو بظاہر خلاف تہذیب ہے۔ مگر مسلمانوں کی اصل تہذیب چونکہ دین ہے۔ اور دین کی خیر خواہی مجھے مجبور کرتی ہے۔ کہ ان حالات میں میں اس ارشاد کی تعمیل سے عذر کردوں۔ اسلئے مجھے امید ہے۔ وہ معاف فرمادیں گے۔ اور اگر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمادیں گے۔ تو شاید وقت آجاسکے۔ اور لیگ خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام پر عمل کرنا شروع کردے۔ تو میں لیگ کا ہر وقت خادم ہوں اخیر میں ایک درجہ تنزل کر کے عرض کرتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اور وزیر صاحب کی خدمت میں بھی جن سے مجھ کو ان کے غائبانہ اوصاف خصوص اسلامی حمیت من کر مدت سے خاص محبت ہے وہ عرض یہ ہے اگر پابندی شرعی وضع کو مقاصد لیگ کا جزو بنانا کسی دنیاوی مصلحت کے خلاف کہا جاوے۔ یا ہمت سے بالاتر خیال کیا جاوے۔ تو کم از کم ان چیزوں کو تو ممنوع قرار دیا جاوے جن سے لیگ کی دنیوی قوت کو یا بلفظ دیگر اسلامی مفاد کو صدمہ یا ضعف پہنچتا ہو۔ جن کی طرف میں نے اس خط میں اشارہ کیا ہے۔ اور اگر خدا نہ کرے یہ بھی نہ ہو سکے۔ تو پھر میں کسی کی آزادی میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ درخواست ضرور کردوں گا کہ پھر میری آزادی میں بھی خلل نہ ڈالا جائے۔ اور مجھ کو اجازت دی جائے کہ اپنے لئے جو طریق عمل مناسب سمجھا جاوے تجویز کرلوں۔
میں جانتا ہوں کہ اس خط میں بہت سے ایسے امور عرض کئے گئے۔ جو اصل سوال سے زائد ہیں۔ مگر اس کا باعث صرف یہ ہوا کہ آپ کے خط سے اسلامی ہمدردی کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ پھر جناب وزیر صاحب کی توجہ تھی۔ اسلئے توقع ہوئی کہ شاید یہ توجہ کچھ ترقی کر کے اصلاح میں مؤثر ہوجائے۔ لیکن اگر یہ سب لے محل سمجھا جاوے۔ تو آپ سے اور جناب وزیر صاحب سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اگر توجہ صرف نہ کی جاوے تو جواب کی تکلیف نہ فرمائی جاوے
باقی دعا ہر حال میں اپنا وظیفہ ہے ۔
حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس ۔۔۔ دربند آں مباش کہ نشنید یا شنید

(مشاہدات واردات صفحہ ۲۰۵ تا ۲۰۷)

نواب محمد اسمٰعیل خاں کی درخواستِ امداد

سر سکندر حیات خاں تو حضرت کا جواب پڑھ کر جہاں تھے۔ وہیں رہ گئے۔ اب

ہائی کمان نے نواب محمد اسماعیل خاں صاحب صدر یو۔پی مسلم لیگ کو لکھا کہ وہ حضرت تھانوی سے شیخ محمد صادق حسن صاحب کے لئے بیان حاصل کریں۔ کیونکہ حضرت تھانوی کا بہت احترام کرتے تھے۔ اور ان سے ذاتی طور پر بھی متعارف تھے۔ اسلئے نواب صاحب نے حضرت کی خدمت میں خط لکھا اور تمام واقعات تحریر کر کے ایک بیان جاری کرنے کی استدعا کی۔

شرائطِ امداد

اس درخواست کے جواب میں حضرتؒ کے ارشاد پر دربار اشرفیہ کی طرف سے مندرجہ ذیل خط نواب صاحب کو لکھا گیا۔

"مخدوم و محترم جناب نواب صاحب زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

الطاف نامہ حضرت والا دام ظلہم کی خدمت میں آیا۔ اخبارات میں بیان دینے سے اطمینان ہوا۔ جزاکم اللہ تعالےٰ خیرالجزا۔ شیخ صادق حسن صاحب کے لئے جو پیغام جناب نے طلب فرمایا ہے۔ بیان تو کیا ایک فتویٰ کی شکل میں تحریر حضرت والا کی طرف سے ارسال کی جاسکتی تھی مگر امرتسر کے بعض متدین و ثقہ حضرات سے جو آجکل خانقاہ میں آئے ہوئے ہیں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب موصوف خاکساروں کے بہت زیادہ حامی ہیں۔ اور ان کے موجودہ الیکشن میں بھی خاکساروں سے ہی امداد لی جارہی ہے۔ ان حضرات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تعاون کی وجہ سے مسلمان شیخ صاحب سے بہت بددل ہو رہے ہیں۔ حضرت والا شیخ صاحب سے اور ان کے حالات سے واقف نہیں۔ اگر امرتسر کے ان حضرات کی اطلاع صحیح ہے۔ تو آپ غور فرمایئے کہ ایک طرف تو مشرقی کے وہ حالات حضرت والا کے سامنے ہیں۔ جن پر کفر و ارتداد کے فتاویٰ ہیں۔ اور دوسری طرف شیخ صاحب کا ان سے تعاون ہو۔ تو ان کی حمایت میں فتویٰ دینے کے کیا معنی ہوں گے؟ اور اگر یہ اطلاع کہ شیخ صاحب خاکساروں کے حامی ہیں۔ غلط ہے تو اس کی سہل تجویز یہ ہے کہ حضرت والا کی خدمت میں شیخ صاحب کی طرف سے ایک سوال روانہ کیا جائے۔ کہ پنجاب کی اسمبلی کی مسلم سیٹ کے لئے الیکشن ہو رہا ہے جس میں مسلم لیگ کانگرس اور احرار تینوں نے امیدوار کھڑے کئے ہیں اور مسلم لیگ کے امیدوار کو خاکساروں سے کوئی ہمدردی اور تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ مشہور کیا جارہا ہے۔ ان حالات میں کس جماعت کے امیدوار کو ووٹ دیا جاسکے۔ اس سوال کا جواب حضرت والا تحریر فرما دینگے

پھر اس سوال اور جواب کو پورا شائع کر دیا جائے۔ اگر ممکن ہو۔ تو یہ سوال شیخ صاحب کی طرف سے براہ راست حضرت کی خدمت میں جلد آجانا چاہیئے۔ تاکہ جواب جلد پہنچ جاوے۔

علامہ مشرقی کا رویہ

اس کے بعد گذارش یہ ہے کہ جناب کی تشریف آوری کے وقت بتلایا گیا تھا کہ مشرقی سے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ اور اخیر خط میں مشرقی کے پاس بارہ سوال بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ ان سوالات کا جواب منیجر الاصلاح کی طرف سے یہ آیا ہے کہ اعتراضات کے خطوط مشرقی کے سامنے پیش کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ اور عام طور پر دفتر بھی ایسے خطوط کا جواب نہیں دیتا۔ اور آئندہ آپ کو بھی جواب نہ دیا جائیگا۔ مشرقی کے جو موجودہ عقاید ہیں۔ ان پر بجز ارتداد کے اور کوئی حکم نہیں لگتا۔ گو حضرت والا نے احتیاط کی وجہ سے اور تبلیغ حق کے لئے چاہا تھا کہ ان سے زبانی گفتگو ہو جاوے شاید وہ عقاید کی اصلاح کر لیں۔ اس پر وہ آمادہ نہ ہوئے۔ تو سوالات کے ذریعہ ان کو تنبیہ کیا گیا۔ اس کا انہوں نے مذکورہ بالا جواب دیا۔ گویا آئندہ کی امید کو بھی قطع کر دیا۔

اصلاح کی آخری سعی

اب چونکہ جناب نے فرمایا تھا۔ کہ مشرقی میرٹھ آنے والے ہیں۔ اس وقت ہم لوگوں کو بھی بلایا جاویگا۔ سو اگر اس کی امید جلد ہو تو اس کا انتظار کیا جاوے۔ جلد سے مراد ہفتہ عشرہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو۔ تو جناب کوئی ایسی تدبیر فرماویں کہ وہ ہم لوگوں کو گفتگو کے لئے جلد سے جلد کافی وقت دے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر عوام کی اصلاح کے لئے فتویٰ شائع کر دیا جائے۔ اس میں جو صورت جناب کے نزدیک مناسب ہو۔ اس سے مطلع فرمایا جاوے۔ بطور مشورہ یہ سب صورتیں پیش کر رہا ہوں۔ والسلام

احقر ..... از تھانہ بھون"

بیان اور فتویٰ کا فرق

حضرت تھانوی کے ایما پر جب مندرجہ صدر جواب لکھا جا چکا تو اس پر حضرت نے اپنی طرف سے مندرجہ ذیل عبارت ازدیاد فرمائی:۔

"از اشرف علی۔ السلام علیکم!

کرمت نامہ کے جواب میں خلاف معمول تارسے تاخیر اسلئے ہوئی کہ واقعات و مصالح و نتائج کے تعارض سے دماغ پریشان ہوگیا۔ اور مناسب طریق سوچنے میں بہت وقت صرف ہوا۔ آخر فیصلہ ذہن میں یہ آیا کہ بیان متعارف کو مسلمان ایک رائے کے درجہ سے زیادہ اہمیت

لہ یہ خاکساروں کا جماعتی آرگن تھا۔

نہیں دیتے۔ نہ اس کا کچھ اثر ہوتا ہے۔ البتہ فتویٰ کو نظرِ عظمت سے دیکھتے ہیں۔ اسلئے یہ صورت مناسب ہے اور اس کا مؤثر ہونا موقوف ہے۔ بدگمانی نہ ہونے پر۔ اسلئے خاکساروں سے بے تعلقی کے سوال پر تصریح ضروری ہے۔ والسلام"

چنانچہ اس خط کے پہنچنے کے بعد لیگ والوں نے صراحتہً خاکساروں سے بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔ جس پر حضرت نے فتویٰ کی صورت میں شیخ صادق حسن کی امداد کرنے کا اعلان فرمایا۔ اور بفضلہٖ تعالےٰ حضرت کی دعا اور فتویٰ مقبول ہوا۔ اور شیخ صاحب کانگریس اور احرار دونو کو شکست دے کر پنجاب اسمبلی میں جا پہنچے۔

علامہ مشرقی جن سے حضرت ملنا چاہتے تھے۔ لکھنؤ میں ہی گرفتار کر لئے گئے۔ جس کی وجہ سے وہ میرٹھ نہ پہنچ سکے اور اس طرح ان سے ملاقات کی صورت نہ نکل سکی۔ اور ان کی اصلاح کی کوشش ناکام رہی۔

کانگریس کی مخالفت کی وجہ

اگرچہ ہندوستان کے بڑے بڑے علماء کانگریس کے ساتھ تھے مگر ان کی نظر وقتی اور ذاتی مصالح پر تھی۔ اس کے نتائج پر نہ تھی۔ بخلاف ان کے حضرتؒ کی نظر حق تعالےٰ کے اس فیصلہ پر تھی کہ:۔

وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا — کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ اگر قابو پاویں۔ تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں۔

جس کی روشنی میں آپ پر کانگریس کے عزائم واضح ہو چکے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے آپ سے سوال کیا کہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی جو ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی کیوں ناکام رہی۔ جبکہ اس کی کمان حضرت سید اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلویؒ ایسے نفوس قدسیہ کے ہاتھ میں تھی۔ تو آپ نے فرمایا کہ:۔

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اسلئے ناکامی ہوئی کہ اس تحریک میں ہندو شامل تھے دونو شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ مگر ہندوؤں نے وقت پر دغا دی۔ اب بھی ان سے وفا کی امید نہیں ہے۔ یہ وقت پر دھوکا دیں گے۔ مسلمان اپنے ہی پاؤں پہ کھڑا ہو کر کامیاب ہو سکتا ہے۔ دوسروں کے سہارے کبھی نہیں۔"

اس لئے آپ وفاق ہند کے مخالف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلم لیگ شرعی حدود کے اندر

وہ اُن کیلئے جنگ پاکستان لڑے۔ تاکہ کامیابی یقینی ہو۔ چنانچہ جب تک مسلم لیگ کانگریس کی ہمنوا رہی۔ آپ اس سے بالکل الگ رہے۔ اور جب اس نے دوسروں کا سہارا چھوڑ کر اپنا پلیٹ فارم الگ بنایا۔ تب آپ نے اس کی حمایت شروع کردی۔

آپ کانگریس کے مخالف اسلئے نہ تھے کہ اس سے آپ کو کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ بلکہ آپ اس کی مخالفت کے لئے اسلئے مجبور تھے کہ وہ آزادئ ہند کے بعد ہندوستان سے اسلام کو مٹانا چاہتی تھی۔ چنانچہ جونہی زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں آئی مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھانے شروع ہوگئے۔ ملازمتوں کے دروازے بند کردیئے گئے۔ مسجدوں کو مندروں میں بدلا جانے لگا۔ اور ہر اس روایت کو حرف غلط کی طرح مٹانے کے درپے ہوگئی۔ جس کی صرف نسبت مسلمانوں سے تھی۔ یعنی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جو باتیں ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۸ء میں ان کے عزائم کے متعلق بھری مجلس میں فرمائی تھیں۔ ۱۹۴۸ء کے بعد کے حالات نے ان کی حرف بحرف تصدیق کردی۔ اور کانگریس کی اس مسلم کش پالیسی کے خلاف بالآخر انہی حضرات کو ہندوستان کی پارلیمان میں احتجاج کرنا پڑا۔ جو تحریک آزادی کے زمانہ میں حضرتؒ کے مسلک کی مخالفت کرنے والوں کی صف اول میں نظر آتے تھے۔ مگر کسی نے اس وقت اس پر غور نہ کیا کہ ع تانہ زہر چہ گوید دیدہ گوید۔ جس کی وجہ سے انہیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا۔

مخالفت میں احتیاط اس سیاسی کشمکش کے دوران میں آپ نے ہمیشہ انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ مثلاً

۱۔ جن معاملات میں علماء کا اختلاف ہوتا۔ ان میں بدون کسی مکمل تحقیق و تفتیش کے کوئی فتویٰ یا اعلان شائع نہ فرماتے۔

۲۔ مقدور بھر تحقیق کے بعد اگر اعلان کی ضرورت بھی ثابت ہوتی۔ تو اس وقت بھی دوسری جانب کی پوری رعایت رکھ کر اعلان فرماتے۔ جس سے اختلاف کی خلیج وسیع ہونے اور عوام کو علماء کے خلاف برسرپیکار ہونے کا موقع نہ ملتا۔

۳۔ اعلان کے بعد تحقیق حال اور مفاہمت باہمی کا سلسلہ برابر جاری رکھتے۔ اور قابل قبول چیزوں کے قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے۔

مسلک کی ندرت سیاسی کشمکش کے دوران میں علمائے امت اور لیڈران قوم ہر مسئلہ پر مختلف الرائے رہے۔ ہر جماعت نے اپنے علم یا تحقیق یا غرض کے ماتحت واقعات کو قوم

کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ واقعات بھی بسرعت تمام بدلتے رہے۔ جس کی وجہ سے شرعی نقطہ نظر سے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ ان حالات میں حضرتؒ کا جماعتی مسلک ان کے اپنے ارشاد کے مطابق ہمیشہ یہ رہا کہ:۔

"نہ اعلانِ حق میں کبھی دریغ کیا۔ نہ عمل میں کبھی نمائش اور ہنگامہ آرائی کو دخل دیا میری جماعت جس طرح شورش پسند نہیں۔ اسی طرح کسی اثر سے متاثر ہو کر کتمانِ حق کرنے والی بھی نہیں"۔
(معاملۃ المسلمین فی مجاذ لتہ غیر المسلمین)

سیاسی تحریکات میں عدم شرکت

حضرتؒ چونکہ درویش طبع تھے۔ اسلئے وہ سیاسی تحریکات میں حصہ نہ لیتے تھے۔ مگر سیاسی تحریکات کے متعلق جب آپ کے پاس استفسارات آتے تھے۔ تو اس وقت بحیثیت مجدد الملت اور حکیم الامت آپ کو مسئلہ کی شرعی حیثیت واضح کرنی پڑتی تھی۔ بس آپ کا سیاسیات میں صرف اتنی قدر حصہ تھا۔ اگرچہ آپ کو سیاست کے عملی میدان میں لانے کے لئے کانگریس اور اس کی حلیف جماعتوں نے بہت کوشش کی۔ مگر آپ ہمیشہ ان سے الگ تھلگ رہے کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ:۔

"میرے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت کی جماعت وابستہ ہے۔ جب تک مجھ کو شرح صدر نہ ہو جائے میں شریک ہو کر اتنے سارے مسلمانوں کی ذمہ داری کس طرح اپنے سر لے لوں۔ کیا قیامت کے دن میری گردن نہ ناپی جائے گی۔ میں تو ان تحریکات کو مسلمانوں کیلئے سراسر مضر اور اس سلسلہ میں اکثر عوام میں جو طریق عمل اختیار کئے جاتے ہیں ان کو ناجائز سمجھتا ہوں۔ نیز میرے نزدیک انکا نتیجہ سوائے ضرر کے اور کچھ نہیں" (اشرف السوانح جلد۲ صفحہ ۱۶۰)

یہاں تک کہ آپ نے مسلم لیگ میں بھی شرکت نہ فرمائی۔ جس کو آپ کی تائید و حمایت حاصل تھی۔

بینظیر استقلال و استقامت

غرضیکہ ان سیاسی طوفانوں نے بڑے بڑے اربابِ استقامت کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ مگر اس کوہِ استقلال کو اپنے مقام سے نہ ہٹا سکے۔ چنانچہ حضرتؒ بطور تحدیث بالنعمۃ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"سب کو کچھ نہ کچھ اپنے مرکز سے ہٹنا پڑا۔ لیکن الحمد للہ میں جس مرکز پر اول روز تھا۔ اس مرکز پر آج تک بدستور قائم ہوں۔ مجھ کو بفضلہ تعالیٰ اپنی رائے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹنا پڑا۔ بلکہ تجربوں سے تو اور بھی مجھ کو اپنی رائے پر مستحکم کر دیا ہے"۔
(اشرف السوانح جلد۲ صفحہ ۱۶۱)

انجامِ زندگی

جس نے اُبھارا خلق کو طاعتِ کردگار پر
نقش اسی کا رہ گیا صفحۂ روزگار پر

(اکبر الٰہ آبادی)

اہتمام اصلاحِ اُمت

دورِ انقلاب حضرت تھانویؒ نے جو زمانہ پایا۔ وہ آج کل کی طرح فتنوں کا زمانہ تو نہیں تھا۔ مگر انقلاب کا زمانہ ضرور تھا۔ یعنی امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں دنیوی حیثیت سے نہیں دینی حیثیت سے ایک انقلابِ عظیم آچکا تھا۔ اور کتاب وسنت کے آئینہ میں دیکھنے سے مسلمانوں کا کوئی قول وفعل خدا ورسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کے مطابق نظر نہ آتا تھا۔

— دین کو صرف عقاید وعبادات تک محدود سمجھ لیا گیا تھا۔ گو ان پر بدعات ورسومات کا رنگ غالب آچکا تھا۔ مگر اب نوبت ترک واہمال تک آپہنچی تھی۔ اور عوام فرائض کی بجا آوری سے اس طرح گریز کرنے لگے تھے۔ جیسے ان کے ذمہ کوئی فرض ہی نہیں۔

اخلاق۔ معاشرت اور معاملات کو تو سرے سے جزدِ دین ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ انہیں دنیوی مسائل تصور کر کے ہر ہر حکم شرعی کے مقابلہ میں اپنی اپنی رائے کو ترجیح دی جاتی تھی عجیب وغریب رسوم اختراع کی جاتی تھیں۔ اور انہیں اختیار کرنے میں شرم کی بجائے فخر محسوس کیا جاتا تھا۔ اور انہیں ہنر سمجھا جاتا تھا۔ یہ تو عوام کی حالت تھی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا یہ عالم تھا کہ وہ احکام خدا ورسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نہ صرف تمسخر اڑاتے تھے — بلکہ ان کو اپنی ہمہ ہما وترقی کی راہ میں حائل سمجھتے تھے۔

اہتمام اصلاح حضرت تھانوی کو چونکہ حق تعالیٰ نے اصلاح امت کی اہم ترین خدمت کیلئے پیدا فرمایا تھا۔ اسلئے آپ نے اپنی تمام زندگی اہتمام اصلاح امت میں ہی صرف کردی۔ اور تحریر وتقریر کے ذریعہ اتنا نادر علمی خزانہ چھوڑ گئے کہ اس کا عشر عشیر بھی احاطہ

تحریر میں لانا از بس دشوار ہے۔ آپ صرف کتابوں کے دفتر کے دفتر ہی نہ چھوڑ گئے۔ بلکہ ہر طبقہ خیال کے لوگوں کی اصلاح کے لئے اس کے حسب حال طریقۂ عمل بھی تجویز کر گئے۔ اور اس کی تعلیم دینے کے لئے مجازین بیعت اور مجازین صحبت کی ایک بہت بڑی تعداد بھی چھوڑ گئے۔ تاکہ وہ آنے والی نسلوں کی اس بارہ میں رہنمائی کرتے رہیں اور یہ سلسلہ فیض دخیر جاری و ساری رہے۔

آپ دینی انحطاط کے جس دورِ انقلاب سے گذر رہے تھے۔ سب سے پہلے آپ نے اس کا جائزہ لے کر وہ اسباب و علل معلوم کئے جو اس انقلاب کا باعث تھے۔ اس حکیم الامت کی تشخیص میں اس کے سبب صرف یہ دو ہی تھے:-

"تشخیص اسبابِ انقلاب میں تامل و تدبر و تتبع کرنے سے معظم اسباب دو امر ثابت ہوئے ایک قلتِ علم یعنی ناواقفی و بے خبری۔ دوسرا ضعفِ ہمت یعنی قصد و ارادہ کی کمی یا فقدان سبب اول سے خود احکام ضروریہ و واقعیہ ہی مخفی رہتے ہیں۔ اور سبب ثانی سے باوجود خبر اور آگاہی کے نوبت عمل کی نہیں آتی۔" (اصلاح انقلاب)

بے خبری کے ازالہ کی تدابیر

حکیم الامت حضرت تھانوی مصیبت کا علاج نہیں کرتے تھے۔ بلکہ معصیت کا علاج کرتے تھے۔ جو سبب بنتی ہے مصیبت کا۔ معصیت چونکہ ایک روحانی مرض ہے۔ اسلئے جسمانی امراض کی طرح اس کے اسباب کا ازالہ بھی اس کے معالجہ و اصلاح سے ہوتا ہے۔ مرض کی صحیح تشخیص کے بعد اس کے اسباب کے ازالہ کی صحیح تدبیر کرنا اور بھی بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ جس کے لئے توجہ تام کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت تھانوی نے برسوں کے تجربہ اور غور و خوض کے بعد مذکورہ بالا اسباب انقلاب کے ازالہ کی یہ تدابیر بتلائی ہیں:-

"بے خبری کے ازالہ میں تو معلم اور متعلم یعنی خواص و علماء احکام اور عوام طالبانِ احکام دونوں کو دخل ہے اور ہر ایک کیلئے جداگانہ ضروری دستور العمل ہے۔ طالبانِ احکام کا دستور العمل یہ ہے کہ

طالبانِ احکام کا دستور العمل

ان میں جو زیادہ فارغ ہیں۔ جیسے اہل نعمت اور اہل ثروت وہ اپنی اولاد کو علوم دینیہ کے لئے فارغ کر دیں۔ گو ضروریاتِ دنیوی کے لئے ملکی زبان اور فنون رائجہ کی بھی تحصیل کا مضائقہ نہیں۔ مگر یہ درجہ تبعیت سے متجاوز نہ ہونے پاوے۔ پس اولاد تو یوں درست ہوئی اور خود کوئی وقت مقرر

کر کے کسی عالم یا کامل الاستعداد طالب علم کے پاس جا کر یا اس کو بلا کر۔ اگر علوم عربیہ سے مناسبت ہو۔ تو وہ زیادہ بصیرت کا آلہ ہے۔ ورنہ اردو ہی کے مفید اور ضروری رسائل کو کسی محقق کے مشورے سے تجویز کر کے سبقاً سبقاً بہتر تو یہ ہے کہ دو تین بار ورنہ اقل درجہ تعلیماً ایک ہی بار۔ پھر مطالعۃً چند بار ان پر عبور کر لیں۔ گو یہ رسائل ایسے ہوں۔ جن میں سب اجزا کا کافی بیان ہو۔ یعنی عقائد۔ دیانات۔ معاملات۔ معاشرت اور اخلاق باطنہ۔

جن کو معاش کی ضرورت سے زیادہ فراغت نہیں ہے۔ اور حرف شناس ہیں یا بآسانی ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنے لئے بھی اور اپنی اولاد کے لئے بھی بجائے علوم عربیہ کے وہی رسائل وغیرہ اردو کے بطور درس طالب علمانہ کے تجویز کر لیں۔ اور پھر بطور دورہ ان کا بار بار مطالعہ کریں۔ اور جب تک درس کا انتظام نہ ہو سکے۔ بطور خود ہی دو چار ورق روزانہ بالالتزام مطالعہ کیا کریں۔ اور مواقع خلجان میں خود رائی سے کام نہ لیں بلکہ نشان بنا کر چھوڑ دیں۔ اور ماہر کے میسر ہونے کے وقت اس کی تحقیق کریں۔

جو لوگ ان میں حرف شناس نہیں ہیں۔ نہ بآسانی ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے بچوں کو کسی وجہ سے اس کے لئے فارغ کر سکتے ہیں۔ وہ ایسا انتظام کریں کہ ہفتہ میں بہتر تو یہ ہے کہ ہر روز ورنہ ایک ہی روز خاص مجلس علمی کیلئے بالالتزام مقرر کریں۔ اور کوئی عالم یا صحبت یافتہ اہل علم کا جو ان رسائل کو اچھی طرح سمجھا ہوا ہو۔ تجویز کریں۔ اور اگر کسی عالم سے تجویز کرا لیں زیادہ احتیاط ہے۔ اس روز سب لوگ کسی خاص مقام مسجد وغیرہ میں جمع ہو کر اس خواندہ فہمیدہ شخص کو لا کر ایک معین وقت تک مثلاً گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ ان رسائل کو سنا کریں اور سمجھا کریں۔

اگر ایسا شخص مفت نہ ملے تو کچھ اس کی مالی خدمت کریں۔ اور سنانے والے شخص کو جہاں شبہ رہے پنسل وغیرہ سے نشان بنا کر اس وقت اس کو کہتے دیں۔ پھر جب کوئی عالم میسر ہو۔ اس سے حل کر لیں اور سب مجمع کو پہنچا دیں۔ اور جہاں دیہات وغیرہ میں ایسا شخص نہ ہو۔ تو آپس میں مشروع طریق سے چندہ کر کے اس چندہ سے کوئی ایسا آدمی باہر سے بلا کر رکھ لیں اور طریق جاری کریں

ضروری التزام

تمام طبقات مذکورہ میں علاوہ اس تحصیل یا مطالعہ یا سماع رسائل کے دو امر کا اور بھی التزام رکھیں۔ ایک یہ کہ اپنے اعمال و احوال میں جب کوئی امر جس کا حکم معلوم نہ ہو پیش آوے۔ فوراً علماء حقانی سے اس کو دریافت کریں۔ اور اگر بوجہ بعد زبانی نہ پوچھ سکیں۔ تو بذریعہ خط کے تحقیق کریں۔ اگر اوسطاً ایک مسئلہ روزانہ کے حساب سے تقریراً یا تحریراً

پوچھ پاچھ رکھے۔ تو سال بھر میں ساڑھے تین سو سے زیادہ اور دس برس میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ مسئلے معلوم ہو سکتے ہیں کہ بعض نام کے یا جید عالموں کو بھی اتنے مسائل معلوم نہیں اور یہ کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔

دوسرے اس امر کا التزام رکھیں کہ علماء کی مجلس میں جایا کریں۔ خواہ خاص مجلس ہو جیسے جلسہ ملاقات و زیارت۔ خواہ عام مجلس ہو۔ جیسے جلسہ وعظ و نصیحت، اور جو سنیں دل سے یاد رکھیں۔ یہ تو مردوں کا انتظام ہو۔

اب عورتیں رہ گئیں۔ سو یہ مجموعی انتظام مذکورہ ان کے لئے اکثر کال سے خالی نہیں اسلئے سہل تر ان کے لئے یہ طریق ہے کہ معلمہ عفیفہ دیندار کی جاوے تو کمسن لڑکیوں کو اس کے ذریعہ سے قرآن مجید اور ایسے رسائل کی تعلیم دلادیں اور ان کے لئے بہشتی زیور کے دس حصے بالکل انشاء اللہ کافی ہیں۔ بلکہ بانضمام گیارھویں حصہ مسمی بہشتی گوہر کے مردوں کے لئے بھی کافی ہیں اور اگر کوئی معلمہ ایسی نہ ملے یا کسی لڑکی کو فراغ یا مناسبت نہ ہو تو ان کو بھی بڑی عورتوں کے انتظام میں شامل سمجھا جاوے اور وہ انتظام دو ہیں۔ ایک یہ کہ گھر کے مردوں میں سے اگر کوئی خواندہ ہو۔ تو وہ روزانہ کچھ وقت معین کر کے سب گھر والیوں کو اس وقت جمع کر کے رسائل بالا سنایا کریں سمجھایا کریں۔ بلکہ کئی دورے کر دیں۔ دوسرا انتظام یہ ہے کہ گاہ گاہ کسی متورع یا متبع سنت عالم کا گھر میں وعظ کہلا دیا کریں۔ کہ یہ عجیب موثر عمل ہے۔

علماء احکام کا دستور العمل

یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اس میں ساعی رہیں کہ ناواقفوں تک احکام پہنچیں۔ اور اس کی یہ صورتیں ہیں۔

ایک درس (گو بعض ہو) اس میں علوم ضروریہ کو مقدم اور مہتم بالشان رکھیں۔ دفیات سے حتی الامکان طالب علم کو پہلے فارغ کر دیں۔ اگر طالب علم دینی مختصرات یا اردو کے رسائل بھی پڑھے اور اپنے پاس وقت ہو۔ تو ہرگز اس کے درس کو خلاف شان نہ سمجھے طالب علم کے فضول سوال پر اس کو متنبہ کرے۔ جواب نہ دے۔

دوسری صورت وعظ ہے جس میں عام خطاب ہے۔ اس میں ضرورت وقت کا لحاظ رکھیں جن امور میں لوگ اس زمانہ میں مبتلا ہوں۔ یا جن ضروریات میں فروگذاشت کرتے ہوں۔ اور بیان اس پر رکھے۔ دوسرے مضامین اگر ہوں۔ تو بالتبع و بعلت ہوں اور یہ ضروری مضامین جمیع ابواب کے ہوں۔ صرف عقائد و دیانات پر اکتفا نہ کرے۔ بلکہ معاملات و معاشرت و اخلاق سے بھی

مشبع بحث کرے۔ بلکہ بوجہ متروک ہونے کے یہ ثلثہ اخیرہ زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔ اور وعظ میں بات صاف کہے کہ سننے والوں کی سمجھ میں خوب آجاوے۔ مگر خشونت اور اشتعال انگیز طرز سے بچے۔ اور وعظ میں عوض نہ لے۔ البتہ اگر وعظ کا نوکر ہو۔ وہ بات اور ہے۔

تیسری صورت جواب ہے استفسار کا۔ خواہ زبانی سوال ہو یا تحریری ہو۔ اس میں ان امور کا لحاظ رکھے کہ حتی الامکان جواب میں توقف نہ کرے۔ لایعنی سوال کا جواب نہ دے۔ بلکہ سائل کو متنبہ کر دے۔ اگر سوال محتمل دو صورتوں کو ہو۔ تو تشقیق سے جواب نہ دے (یعنی اس طرح جواب نہ دے کہ اگر اس طرح واقع ہے۔ تو یہ جواب ہے۔ اور اگر اس طرح ہے تو یہ جواب ہے) بلکہ سائل سے پہلے صورت واقعہ متعین کرا لے۔ پھر جواب دے۔ کیونکہ بعض اوقات سائل دو شقوں کا حکم سن کر ایک شق کو اپنے مفید مطلب سمجھ کر سوال میں اس کا دعویٰ کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے سائل کا یا اس کے مقابل کا ضرر دینی یا دنیوی ہوتا ہے۔ عامی کو دلیل بتلانے کا التزام نہ کرے کہ اکثر اس کے فہم سے خارج ہوگی۔ یا دوسرے مصححین کی سہولت کیلئے اگر دلیل کی طرف اشارہ کر دے۔ یا کوئی عبارت با ترجمہ نقل کر دے۔ مستحسن ہے۔

اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سائل غالب اس تحریر کو اچھی طرح نہ سمجھے گا۔ یا سمجھنے میں غلطی کریگا۔ جواب لکھ کر دے کہ کسی عالم سے اس جواب کو زبانی حل کرے۔ اگر قرائن سے معلوم ہو۔ کہ سوال براہ تعنت ہے۔ جواب نہ دے۔ غرض اہل سے دریغ نہ کرے۔ نااہل کو منہ نہ لگائے۔

چوتھی صورت تالیف و تصنیف ہے۔ خواہ اشتہار ہو یا اخبار ہو۔ یا رسالہ و کتاب ہو اس میں بھی ضرورت وقت کا لحاظ اور عبارت میں سلاست اور کفایت کی رعایت ہو اور اگر خدا تعالیٰ معاش کی کوئی صورت اور سبیل عطا فرما دے۔ تو اپنی تصانیف کی خود تجارت نہ کرے۔

علماء کے احکام کے دستور العمل کا متمم ایک اور امر بھی ہے۔ یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور منجملہ اس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کفار کی تبلیغ بھی ہے۔ خواہ بذریعہ تقریر اور خواہ بذریعہ تحریر۔ اپنے ملک کے کفار کو بھی اور دوسرے ملک کے کفار کو بھی۔ اس غرض کی تحصیل و تکمیل کے لئے۔ اگر ان اقوام کی زبان بھی سیکھ لے۔ تو بشرط خلوص نیت عین طاعت ہے۔ جیسے اس غرض سے انگریزی پڑھ لینا۔ تبلیغ احکام کے متعلقات ہی میں سے ان احکام کی ایک خاص حفاظت بھی ہے۔ یعنی اصول و فروع پر جو حملے یا آمیزشیں ہیں۔ خواہ اہل کفر ہوں یا اہل بدعت۔ ان کو دفع کرنا اور رفع کرنا۔ تاکہ طالبان حق شبہات سے محفوظ رہیں اور

اس مقصود کے لئے اگر اہل باطل پر رد و قدح کرنے کی حاجت ہو یا اُن سے مناظرہ کرنا مصلحت ہو تو اس سے بھی پہلو تہی نہ کرے۔ اس رد و قدح یا مناظرہ کے لئے اگر اہل باطل کے علوم و فنون حاصل کرنا ضروری ہو۔ وہ بھی طاعت ہے۔ جیسے اس وقت سائنس وغیرہ سیکھنا۔

ضعفِ ہمت کے ازالہ کی تدبیر تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ امور ذیل کو تقویت ہمت میں خاص اثر اور دخل ہے ایک اُن میں سے صحبت شیوخ کاملین کی ہے۔ جن کی علامتیں یہ ہیں کہ وہ بقدر ضرورت علم دین رکھتا ہو۔ عقائد و اعمال و اخلاق میں شرع کا پابند ہو۔ دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو۔ کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبۂ دنیا ہے۔ کسی شیخ کامل کی صحبت میں چندے رہا ہو۔ اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔ بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔ اس سے جو لوگ بیعت ہوں۔ ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع و قلت حرص دنیا کے اچھی ہو وہ شیخ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو۔ اور ان کی کوئی بری بات دیکھے یا سنے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔ اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالےٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔ خود بھی وہ ذاکر شاغل ہو۔ کیونکہ بدون عمل یا عزم عمل تعلیم میں برکت نہیں ہوتی اور صدور کشف و کرامت اور استجابت دعا و تصرفات لوازم مشیخت سے نہیں۔ غرض ایسے حضرات کی صحبت خاص طور پر مؤثر ہے۔ مگر اس صحبت کی تاثیر میں شرط یہ ہے کہ اس میں نیت بھی یہی ہو کہ میرے قلب میں رغبت طاعت اور نفرت معاصی پیدا ہو۔ اور اس کے ساتھ اس کا بھی التزام رہے کہ اپنی کیفیات قلبیہ کی شیخ کو اطلاع دے کر جو معالجہ تجویز فرمایا جائے۔ اس پر کاربند ہو۔

دوسرا امر ان میں سے بوقت میسر نہ آنے صحبت کاملین کے اہل اللہ کے حالات و مجاہدات کا مطالعہ یا استماع (دیکھنا سننا) ہے۔ مگر ان سے جو مقالات متعلقہ اسرار و مسائل غامضہ تصوف ہیں۔ ان میں ہرگز مشغول نہ ہو۔ البتہ علوم معاملہ یعنی تربیت باطن و تہذیب نفس کے بارے میں جو کچھ ان کے اقوال ہیں۔ وہ سراپا عمل درآمد بنانے کے قابل ہیں۔

تیسرا امر ان میں سے مراقبۂ موت و مابعد الموت ہے۔ مراد اس سے ابتداء نزع سے دخول جنت یا نار تک جو احوال (خوفناک امور) پیش آنے والے ہیں۔ مثلاً سوال نکیرین و عذاب و نعیم قبر و حشر و وزن اعمال و حساب و جزاء و عبور صراط وغیرہ سب کو کسی وقت فراغ میں بالالتزام

روزانہ کم از کم بیس منٹ سوچا کریں۔ تقویت ہمت میں جن ملکات کو دخل ہے۔ اس مراقبہ سے ان کا کمال پیدا ہو جائے گا۔"

احتیاطی تدابیر

انقلاب امت کی اصلاح کی تعبیر کی تعیین و تفصیل کے بعد لکھتے ہیں کہ:- "چونکہ ہر تدبیر پر عمل کرنے کے ساتھ اس کے موانع تاثیر سے تحرز بھی واجب ہوتا ہے۔ جس طرح امراض جسمانی میں پرہیز کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ اسلئے ان تدابیر اصلاح کے ساتھ ان امور سے بچنا بھی ضروری ہوگا۔ جو ان کے اثر میں خلل انداز ہیں۔

بیان اس کا یہ ہے کہ ان تدابیر میں سے بعض علماء کے متعلق تھیں۔ یہاں ان کے باب میں کلام مقصود نہیں۔ کیونکہ وہ خود جانتے ہیں۔ صرف ان میں جو عوام کے متعلق ہیں۔ ان میں بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے۔ سو اس باب میں یہ امور بتلائے گئے تھے (۱) کتب دینیہ کا پڑھنا یا دیکھنا یا سننا (۲) علماء دین سے مسئلہ پوچھنا (۳) وعظ سننا (۴) صحبت اہل کمال (۵) گھر والوں کو خود پڑھانا یا سنانا یا کسی کے ذریعہ سے پڑھوانا سنوانا۔ ان امور پنجگانہ میں سے ہر ایک میں بعض لوگ بے احتیاطیاں کرتے ہیں۔ جو معالجہ مطلوبہ میں بدپرہیزی کا حکم رکھتے ہیں بالترتیب ہر ایک کے متعلق مختصراً تنبیہ ضروری ہے۔

۱۔ کتب دینیہ کا پڑھنا یا سننا

اس کے متعلق آج کل بعض بکثرت یہ غلطی کرتے ہیں کہ جو کتاب دین کے نام سے دیکھی یا سنی خواہ اس کا مضمون حق ہو یا باطل۔ خواہ اس کا مصنف ہندو ہو یا عیسائی۔ یا دہری یا مسلمان۔ پھر مسلمان بھی گو صاحب بدعت ہی ہو۔ غرض کچھ تفتیش نہیں کرتے۔ اس کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں اور اسی میں وہ مضامین آ گئے جو کسی مسئلہ کے متعلق اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ سو اس میں چند مضرتیں ہیں۔ بعض اوقات بوجہ کم علمی کے کبھی امتیاز نہیں ہوتا۔ کہ ان میں کون صحیح ہے۔ کون غلط۔ کسی غلط کو صحیح سمجھ کر عقیدہ یا عمل میں خرابی کر بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر غلط ہے۔ مگر بعض مصنفین کا طرز بیان ایسا تلبیس آمیز یا دل آویز ہوتا ہے کہ دیکھنے والا فی الفور اس سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے پہلے اعتقاد کو ضعیف اور بے وقعت خیال کر کے بعض دفعہ تو اس پہلے کو غلط اور اس پچھلے کو صحیح سمجھ لیتا ہے اور بعض دفعہ گو اس کو قبول نہیں کیا۔ مگر متزلزل اور مذبذب ہو کر کبھی دل میں کھٹکا

۱؎ جیسے منکرین حدیث پرویز اینڈ کو

نے اور پریشان ہوتا ہے اور کبھی دوسروں سے تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ مگر چونکہ اس میں کچھ غموض
ہوتا ہے جس کے ادراک کے لئے اس کا علم وذہن کافی نہیں ہوتا۔ اسلئے سمجھ میں نہیں آتا
اور بے سمجھے لایعنی سوالات کرکے دوسروں کو پریشان کرتا ہے۔ اور اپنے فہم کا قصور فہم
میں نہیں آتا۔ اور جواب دینے والوں کو جواب سے عاجز سمجھ کر ان کے علم یا اخلاق میں تنگی کا
حکم لگا کر ان سے بدگمان ہوجاتا ہے اور کبھی انواع مفاسد پیدا ہوجاتے ہیں۔ ان سب کا
انسداد یہی ہے کہ کوئی کتاب۔ کوئی اخبار کوئی رسالہ کوئی تقریر تاوقتیکہ کسی محقق عالم کو نہ دکھلا
لیں اور اس سے رائے نہ لے لیں۔ ہرگز نہ دیکھیں۔

اخبارات کے بعض مفاسد اس قسم کے احقر نے ایک مستقل تحریر مسمی بہ "اخبار بینی"[1] میں
ایک زمانہ میں لکھے تھے۔ جس پر بالتدبر بعض معترضین نے عمل کیا۔ مگر وہ تحریر بغور پڑھنے کے
قابل ہے...... اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ کسی اخبار یا کسی کتاب کا مطالعہ مطلقاً
میں حرام ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ چونکہ ان چیزوں میں بعض اوقات ایسے مفاسد ہوتے
ہیں۔ اور ان مفاسد سے بچنا ملت اسلامیہ میں واجب ہے۔ اور بچنا بدوں معرفت کے ہو
نہیں سکتا۔ اور معرفت خود ہے نہیں۔ اسلئے کسی صاحب معرفت یعنی عالم محقق سے مشورہ
لے کر اس کا اتباع ضروری ہوگا۔

(ز) افسوس ہے کہ باوجود وضوح اس امر کے پھر اس ممانعت کو تنگ خیالی وتعصب پر محمول
فرمایا جاتا ہے کیا خیرخواہ باپ اپنے بچے کو زہریلی ہوئی مٹھائی کے کھانے سے روکے۔
کوئی عاقل اس باپ کو متعصب یا تنگ خیال کا لقب دے گا۔ غایت رافت کے ساتھ اس
کو متعصب کہے گا۔ اور اگر کوئی کہے کہ ہم خذ ما صفا ودع ما کدر کے طور پر اس کو دیکھتے
ہیں۔ اس کا جواب اُدھر کی تقریر سے واضح ہوگیا ہے کہ اس امتیاز کے لئے علم کامل اور
فہم دانی کی حاجت ہے اور کلام اس کے فاقد میں ہے۔ رہا کسی کا اپنے کو فاقد نہ سمجھنا۔
یہ معتبر نہیں۔ بلکہ کسی عالم کا کسی کو فاقد کہنا اس کے اثبات کے لئے کافی ہے اور یہی وجہ ہے
کہ جناب رسول کریم ونبی حکیم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے راسخ العلم والعمل
شخص کو توراۃ کے مطالعہ سے منع فرمایا۔ باوجودیکہ فی نفسہٖ آسمانی کتاب تھی۔ گو اس میں تحریف
بھی ہوگئی تھی۔ اور پھر مطالعہ بھی تنہا نہ تھا۔ بلکہ خود حضور پر نور کو سنا رہے تھے۔ اور اس میں جزء

---

[1] یہ حضرت کی آخری تصنیف بوادر النوادر میں شامل ہے

محرف کا معین و مبین ہو جانا ظاہر تھا۔ اس کے بعد کسی فساد کا احتمال ہی نہ تھا۔ مع ہذا پھر اس مصلحت سے کہ آئندہ کو یہ عمل ان مفاسد کے باب مفتوح ہونے کا سبب نہ بن جائے کس سختی سے منع فرمایا۔ اور کیسی ناخوشی ظاہر فرمائی۔ جیسا کہ حدیث دارمی میں مذکور ہے۔

ان دلائل حسیہ و حدیثیہ کے بعد امید ہے کہ اہل انصاف مصلحت اندیش کو کوئی خدشہ نہ رہا ہوگا۔ جبکہ اس تقریر سے وہ کتابیں وغیرہ بھی قابل تحرز قرار پائیں۔ جن میں مصالح کے ساتھ بعض مفاسد بھی ہوں۔ سو جن میں سراسر مفاسد ہوں۔ جیسے ناول (افسانے) وغیرہ جن سے اعمال و اخلاق کا بڑا حصہ نہایت گندہ ہو جاتا ہے۔ ان کا مطالعہ کس طرح جائز سمجھا جائے گا بالخصوص نوجوانوں اور عورتوں کو۔ بلکہ اگر ایسی کتابیں گھر میں دیکھی جاویں۔ آگ میں جلا دینا ہی ان کا حق ادا کرنا ہے۔

اب اس ذیل میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کے لئے ایک مختصر نصاب قابل مطالعہ کتب کا معین کر دیا جائے۔ تاکہ ان ہی میں مشغول رہ کر مخدوش کتب سے محفوظ رہیں:۔

بہشتی زیور گیارہ حصے۔ تعلیم الدین۔ فروع الایمان۔ جزاء الاعمال۔ تبلیغ دین۔ قصد السبیل حیات المسلمین۔ شوق وطن۔ اگر اس سے زیادہ مطول و مفصل ضرورت ہو کسی عالم محقق سے دریافت کر لیا جاوے۔

۲۔ علماء دین سے مسئلہ پوچھنا

اس میں چند غلطیاں کی جاتی ہیں ایک یہ کہ کیف ما اتفق کسی سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی نہیں تحقیق کرتے کہ یہ شخص واقع میں عالم بھی ہے یا نہیں۔ کسی کا نام مولوی سن لیا اور اسی سے دین کی باتیں پوچھنے لگے۔ بعض اوقات عالم ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس مشرب کا کس عقیدہ کا ہے ایسے شخص کے جواب سے بعض اوقات تو عقیدہ باطل میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تردد اور شبہ میں پریشان ہوتا ہے۔ یا پریشان کرتا ہے۔ جیسا کہ امر اول کے بیان میں گذر چکا ہے۔

دوسری غلطی یہ کی جاتی ہے کہ ایک مسئلہ کو کئی کئی جگہ پوچھتے ہیں بعض اوقات جواب مختلف ملتا ہے۔ تو اس وقت یا تو تعیین راجح میں پریشان ہوتے ہیں۔ یا جس میں نفس کی مصلحت ہوتی ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور کبھی اس کی عادت ہو جاتی ہے۔ تو استفسار سے یہی مقصود ہو جاتا ہے کہ نفس کے موافق جواب ملے اور جب تک ایسا جواب نہیں ملتا۔ برابر اس کد و کاوش میں رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وضع تدین سے بمراحل بعید ہے۔ اور تلعب فی الدین ہے۔

تیسری غلطی اس دوسری غلطی سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک مجیب کا جواب دوسرے مجیب کے سامنے نقل کردیا جاتا ہے۔ چونکہ بعض اوقات طبیعت کا خاص رنگ ہوتا ہے بعض اوقات نقل کا لب ولہجہ کچھ معارضانہ ہوتا ہے۔ اسلئے کبھی اس مجیب کی زبان سے دوسرے مجیب کی نسبت یا اس کے جواب کی نسبت کوئی ناملائم لفظ نکل جاتا ہے۔ پھر یہی ناقل یا کوئی دوسرا اس مجیب تک اس کو پہنچا دیتا ہے۔ پھر وہ کچھ کہہ دیتا ہے۔ اس کی خبر اس پہلے تک پہنچتی ہے اور بعض دفعہ بلکہ اکثر ان منقولات میں بھی بہت کچھ لفظی یا معنوی تغیر و تبدل کردیا جاتا ہے اور اس طرح باہم ایک فساد عظیم ان میں برپا ہو جاتا ہے۔

ایک غلطی یہ ہے کہ غیر ضروری مسئلے پوچھے جاتے ہیں۔ ایک غلطی یہ ہے کہ مسائل کے دلائل دریافت کئے جاتے ہیں۔ جن کے سمجھنے کے لئے علوم درسیہ کی حاجت ہے۔ چونکہ اس سائل کو وہ حاصل نہیں۔ اسلئے دلیل کو سمجھتا نہیں اور اگر اسی خیال سے کوئی مجیب دلیل بتانے سے انکار کرتا ہے۔ تو اس غریب کی بدخلقی پر محمول کیا جاتا ہے۔ ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ کسی سے کسی مسئلہ میں مباحثہ شروع کرتے ہیں۔ پھر اپنی تائید کے لئے فتویٰ حاصل کرتے ہیں۔ اور وہ فتویٰ اپنے مخالف کو دکھلا کر اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے موافق فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح خواہ مخواہ باہم جنگ وجدال کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ عوام کو اس میں پڑنا موجب خطر ہے۔ اگر ان سے کوئی اہل باطل الجھے تو علماء کا حوالہ دے کر اس کو قطع کردیا جائے اگر غرض ہوگی آپ پوچھے گا۔

ان سب غلطیوں کی اصلاح اس سے ہوسکتی ہے کہ اپنا دستور العمل اس باب میں یہ رکھیں کہ جب کوئی ضروری بات پیش آوے۔ اپنے عمل کرنے کیلئے نہ کہ مباحثہ کے لئے۔ ایسے شخص سے مسئلہ پوچھیں جس کا معتبر محقق ہونا صحیح ذریعہ سے پہلے معلوم ہو۔ اور اس پر اعتماد و اعتقاد بھی ہو اور دلیل دریافت نہ کریں اور نہ کسی دوسرے عالم سے بلا ضرورت پوچھیں۔ اگر باوجود ان سب رعایتوں کے اس کے جواب میں شبہ رہے اور تشفی نہ ہو۔ تو ایسی ہی صفت کے دوسرے عالم سے پوچھ لیں۔ اور اگر جواب پہلے کے خلاف ہو۔ تو پہلے کا جواب اس کے اور اس کا جواب پہلے کے سامنے نقل نہ کرے۔ اور جس قول پر قلب مطمئن ہو۔ اس پر عمل کریں۔

یہی عمل اس حالت میں کریں جبکہ بلا مراجعت دوسرے عالم کے خود بخود جواب اول کے خلاف کوئی جواب اس باب میں گوش زد ہو جائے۔ اگر استفسار تحریراً ہو۔ تو ان رعایات کے علاوہ اور بھی

رعایتوں کا لحاظ رکھیں۔ یعنی سوال کی عبارت اور خط بہت صاف ہو۔ حتی الامکان فضول غیر متعلق باتیں اس میں نہ لکھیں۔ اپنا پتہ و نام صاف لکھیں۔ اگر کئی بار ایک ہی جگہ استفسار جاویں۔ تب بھی ہر خط میں اپنا پتہ اور نام صاف لکھیں اور جواب کے لئے ٹکٹ ضرور رکھدیا کریں۔ بلکہ اگر سوال دستی بھی بھیجیں۔ تب بھی جواب کے لئے ٹکٹ رکھ دیں۔ پتہ پورا لکھ دیں۔ شاید اس وقت جواب مشایہ کا نہ دے سکیں۔ تو بعد میں ڈاک میں بھیج دیں۔ ورنہ ٹکٹ واپس آجائے گا۔ اور اگر کئی سوال ہوں تو کارڈ پر بھیجا کریں۔ اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہو جائے۔ تو ان سوالوں پر نمبر ڈال کر ان کی ایک نقل اپنے پاس بھی رکھ لیں اور مکتوب الیہ کو اطلاع دے دیں کہ ہمارے پاس سوالات کی نقل نمبروار موجود ہے۔ آپ اعادہ سوال کی تکلیف نہ کریں نمبروں کی ترتیب سے جواب لکھدیں۔

۳۔ وعظ سننا جس قسم کی غلطیاں نمبر اول میں کی جاتی ہیں۔ اس قسم کی غلطیاں لوگ یہاں کرتے ہیں۔ کیونکہ تحریر و تقریر دلالت احکام و آثار میں متقارب ہیں۔ یعنی لوگ ہر قسم کے واعظوں کا وعظ سن لیتے ہیں۔ اس کے وہی مفاسد ہیں جو نمبر اول میں تھے اور ان کا وہی انسداد ہے۔ جو مفاسد متعلقہ نمبر اول کا تھا۔ جب کوئی واعظ جدید آوے۔ آپ شہر یا قریب کے کسی عالم معتبر سے اس واعظ کی حالت پوچھ لیں۔ اگر وہ اطمینان دلادے۔ تو وعظ سنے ورنہ نہ سنے۔ کیونکہ بعض واعظ جاہل ہوتے ہیں اور بعض بد مذہب۔ اور ان میں بعض اپنے مدعا کے ذہن میں جما دینے میں ملکہ رکھتے ہیں۔ اور بعض ایسے چالاک ہوتے ہیں کہ اول اول مخاطبین کے موافق کہتے ہیں۔ پھر بعد مناسبت و موانست اپنے مسلک کی دعوت شروع کر دیتے ہیں۔ پس اس معاملہ میں محتاط رہنا چاہیئے۔ اور اگر باوجود احتیاط کے کوئی بات مشتبہ کان میں پڑ جائے۔ تو علماء محققین سے اس کی تحقیق کر لیں۔

۴۔ اہل کمال کی صحبت حاصل کرنا اس میں جو دھوکا ہوتا ہے وہ بہت عام ہے یعنی جو علامتیں اہل کمال کی ہیں۔ ان کی رعایت نہیں کی جاتی۔ جن کو احقر نے مضمون سابق میں "قصد السبیل" سے نقل کیا ہے۔ اس کا انسداد ان علامات کی رعایت ہے۔ بقول مولانا رومیؒ ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　پس بہر دستے نہ باید داد دست

اس کے ذیل میں اس صحبت کی مضرت بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ جو مقتدا بنا کر نہ ہو۔ محض دوستی کے طور پر ہو۔ گو وہ دوست بددین ہو۔ یہ بھی غلطی عظیم ہے۔ تجربہ سے ایک دوست کا اثر طبعاً دوسرے

دوستت پر ضرور ہوتا ہے اور مضرات جلد ہوتا ہے۔ اس لئے ارشاد نبوی ہے المرءُ علیٰ دین خلیلہ فلینظر بجالہ، البتہ جو ملاقات بضرورت ہو۔ وہ مستثنیٰ ہے۔

۵۔ گھر والوں کو خود پڑھانا اس میں جو غلطیاں ہوتی ہیں ان کا مجموعہ امور رابعہ کے بیان میں منتشر طور پر بطور علاج آگیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گھر والوں کے لئے کتابیں جو تجویز کی جائیں یا واعظ جو بلوایا جائے۔ ان میں رعایات مذکورہ سابقہ ملحوظ ہوں اور یہ امر تصریح و تخصیص کے ساتھ اس قابل ذکر ہے کہ بیانی لڑکی کا معلم نامحرم جوان یا میانہ عمر کا جائز نہ رکھا جائے۔" (اصلاح انقلاب)

حضرت تھانوی کے صدہا نظائر افادات علمیہ مفیدہ میں سے یہ مضمون حضرت کے علمی اہتمام اصلاح امت کا ایک مفید اور کارآمد نمونہ ہے۔ جس کے ذریعہ حضرت نے اصلاح امت کا ایک جامع و مانع طریق تجویز فرمایا کہ اگر اس پر مسلسل اور متواتر عمل ہوتا رہے۔ تو امت کے ہر طبقہ کی بسہولت اصلاح ہو سکتی ہے اور اس سے ہر زمانہ میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

مجازین صحبت و بیعت

چشمۂ فیض حضرت تھانوی کی یہ بڑی خواہش تھی کہ انکے بعد یہ چشمۂ فیض اسی طرح جاری رہے۔ اسلئے آپ نے جہاں اصلاح امت کے لئے مختلف دستور العمل مرتب فرمائے۔ وہاں سلسلۂ مجازین قائم کر کے اس بات کا بھی اہتمام فرمایا کہ ان کے ذریعہ آئندہ بھی اشاعتِ طریق کا سلسلہ جاری رہے۔ آپ کی خواہش تھی کہ:۔

"میرے سپرد دین کے جتنے کام ہیں۔ وہ سب میرے بعد بھی بدستور چلتے رہیں۔ اور کسی کو میرے نہ ہونے کا اس بنا پر افسوس نہ ہو کہ فلاں دین کا کام اب کون کریگا۔ ۔ اس مصلحت سے بھی میں اپنی مختلف دینی خدمات کو وقتاً فوقتاً دوسروں کے سپرد کر کے اِدھر اُدھر منتقل کرتا رہتا ہوں۔"

مجازین صحبت اسلئے ایسے حضرات کی نسبت جو آپ کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت سے اپنے اندر تلقین صلاحیت پیدا کر چکے تھے۔ ایک روز آپ کو خیال آیا کہ:۔

"بعض ایسے احباب کو جو تلقین کی کافی صلاحیت رکھتے ہیں۔ گو اجتماع شرائط بیعت

ہیں بعض خاص حالات کا انتظار ہے تلقین یا بیعت کی اجازت دے دوں"۔
تاکہ وہ لوگوں کو جس قدر فیض پہنچانے کے اہل ہیں۔ فیض پہنچا سکیں۔ اس سے ایک مقصود یہ بھی تھا کہ ایسے حضرات میں مزید اصلاح و تکمیل کا شوق پیدا ہوگا۔ وہ بالکل بے فکر نہ ہو جائینگے بلکہ اجازتِ بیعت کا درجہ حاصل کرنے کے لئے پہلے سے زیادہ اپنی تکمیل کی فکر و سعی کرینگے ان حضرات کا لقب آپ نے "مجازِ صحبت" تجویز فرمایا۔
آپ کی یہ تجویز بہت کارگر ثابت ہوئی۔ اور ایسے متعدد افراد اپنی تکمیل و اصلاح میں پہلے سے کہیں زیادہ فکرمند اور سرگرم ہو گئے۔ جن کی اطلاعات حضرت کو برابر پہنچ رہی تھیں اور جن کی بنا پر حضرت نے اپنی اس تجویز کے مفید ہونے کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا کہ:۔
"الحمدللہ میرا یہ خیال کہ اس قسم کی اجازت دیدینا خود اجازت یافتگان کے لئے بہت نافع ہوگا۔ بالکل صحیح نکلا۔ کیونکہ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو۔ جس پر اس اطلاع کے ملتے ہی گریہ طاری نہ ہو گیا ہو۔ اور اپنی ناکارگی پیش نظر ہو کر خود اپنی فکرِ اصلاح نہ دامنگیر ہو گئی۔ جیسا کہ ان کے اطلاع یابی کے بعد کے خطوط سے معلوم ہوا"۔
اس کے بعد یہ سلسلہ مستقل کر دیا گیا۔ مجازینِ صحبت ہی سے جن میں جملہ شرائط بیعت کا اجتماع ہو جاتا۔ ان کو مجازِ بیعت بنا دیا جاتا۔

مجازینِ بیعت مجازِ بیعت صرف ان اصحاب کو بنایا جاتا تھا۔ جو:۔
(۱) متقی ہوں (۲) خود اپنی اصلاح کئے ہوئے ہوں (۳) ان کو طریق سے مناسبت پیدا ہو چکی ہو۔ لیکن محض علمی مناسبت نہیں بلکہ حالی (۴) ان میں دوسروں کی بھی اصلاح کرنے کی اہلیت پیدا ہو گئی ہو (۵) اوصاف مذکورہ میں ان کو بقدر ضرورت رسوخ بھی حاصل ہو گیا ہو (۶) ان سے یہ توقع بھی ہو۔ کہ گو فی الحال ان کو اوصاف مذکورہ میں رسوخ کا درجۂ ضروریہ حاصل ہے۔ لیکن وہ آئندہ ترقی کر کے اس رسوخ کا درجۂ کاملہ بھی حاصل کر لیں گے۔
حضرت کے ہاں اجازت بیعت و تلقین کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ خود پہلے بیعت ہو چکا ہو۔ بلکہ جن میں بیعت و تلقین کی خصوصیات پیدا ہو جاتیں۔ ان کو فوراً مجاز بنا دیا جاتا۔ کیونکہ نفع بیعت پر موقوف نہیں ہوتا۔ بلکہ تعلیم اور اس کے اتباع پر موقوف ہوتا۔ جو اصل غایت ہے۔
جن اصحاب کو حضرت والا مجاز بناتے۔ ان کو اس امر کی اطلاع ان کے کسی خط میں تحریر فرما

دیتے اور یہ بھی لکھ دیتے کہ اس کی اطلاع اپنے خاص خاص احباب سے بھی کردی جائے۔ تاکہ وہ لوگ مطلع ہو کر ان سے نفع اٹھا سکیں۔ اکثر اس عنوان سے اجازت عطا فرماتے کہ:۔

"بے ساختہ یہ قلب میں آیا کہ آپ کو بیعت و تلقین کی اجازت دے دی جائے۔ لہٰذا توکلاً علی اللہ آپ کو اجازت دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نفع کو عام اور تام فرمائے۔ اگر کوئی رجوع کرے۔ تو انکار نہ کریں۔"

اوراق کا پورا نام اور پتہ اپنے پاس بطور یادداشت تحریر فرمالیتے تھے۔ پھر ان کو تنبیہاتِ وصیت کے تتمات میں جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ شائع فرمادیتے تھے۔ تاکہ کوئی غیر مجاز اپنے آپ کو اجازت یافتہ قرار دے سکے۔ اور لوگوں کو دھوکا نہ دے۔ اس کی ضرورت اس لئے پیدا ہوئی کہ بعض ارباب غرض نے خود کو حضرت کا مجاز ظاہر کرکے لوگوں کو دھوکا دیا تھا۔ اسی لئے حضرت فرماتے تھے کہ:۔

"پہلے زمانہ میں نہ اتنے جھوٹے ہوتے تھے۔ نہ ایسے امور میں جھوٹ بولنے کی جرأت ہوتی تھی۔ اسلئے اُس وقت اتنی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ اب ضرورت ہے۔ جس کی تصدیق واقعات سے ہوتی ہے۔ نیز اس اشاعت میں یہ بھی مصلحت ہے۔ کہ طالبین کو حضرات اہل اجازت کا علم ہوجائے۔ اور وہ ان سے نفع حاصل کرسکیں"

اجازت یافتگان میں جو غیر اہل علم ہوتے تھے۔ ان کو صرف عوام کے لئے اجازت ہوتی تھی کیونکہ اس سے اہل علم کی تسلی ہونا مستبعد تھی اور اس امر کو ظاہر کرنے کے لئے فہرست اجازت یافتگان میں ایسے مجازین کے نام کے آگے لفظ "للعوام" کا اضافہ فرمادیتے تھے۔ البتہ جن بعض غیر اہل علم سے بوجہ ان کی خوش فہمی کے یہ توقع ہوتی کہ وہ اہل علم کی بھی تسلی کرسکیں گے۔ اور ان سے اہل علم کو رجوع کرتے ہوئے استنکاف نہ ہوگا۔ ان کو اجازت عامہ بھی عطا کی جاتی تھی۔ اور فہرست میں ان کے نام کے آگے لفظ "للعوام" نہیں بڑھایا جاتا تھا۔

عملی تربیت حضرت تھانوی ایسے طالبین کو جن سے ابتداً مناسبت ہونے کی توقع نہیں ہوتی تھی۔ یا جو بیعت بلا تعلیم کی شرائط کو پورا کرکے صرف بیعت ہونا چاہتے تھے اکثر اپنے خلفاء و مجازین کے سپرد فرماتے رہتے تھے۔ تاکہ مجازین کو بھی امر تربیت میں ملکۂ تامہ حاصل ہوجائے۔ چنانچہ جب کسی طالب کی کوئی الجھی ہوئی حالت ہوتی۔ تو حضرت والا کے مجازین حضرت سے مشورہ لیتے رہتے۔ اور خود حضرت کو بھی اپنے سپرد کردہ طالبین کے اصلاحی خطوط کو مع اپنے

مجازین کے جوابات کے ملاحظہ فرمانے کا اتفاق ہوتا رہتا۔

ان مجازین سے بفضلہ تعالیٰ کثیر مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا رہا۔ اور جو اس وقت حیات ہیں ان سے ہزاروں لوگ بدستور مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں۔ اور ان کی تعلیم و تربیت کی برکت سے متعدد طالبین بعد تکمیل انہیں کی طرف سے صاحب اجازت بھی ہوگئے۔ جس پر حضرت بڑی مسرت کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ کہ خدا کے فضل سے یہ لوگ بہت سے مشائخ وقت سے زیادہ نفع رساں ہیں اور جن کی بے پروائی اور تاخیر جواب وغیرہ کا حال معلوم ہوتا طالبین کو اپنی طرف سے ان کے سپرد فرمانا چھوڑ دیا۔ اور اس کام کی بار ہا تاکید فرمائی۔ کہ بہت توجہ اور شفقت کے ساتھ طالبین کی تربیت کرنی چاہئے۔ اور جو کم توجہی سے کام لیتے تھے۔ ان کی شکایت بھی فرماتے تھے۔ حضرتؒ کے اس دستور العمل سے مجازین کو اسی طرح فائدہ پہنچتا تھا۔ جیسے کسی حکیم کے شاگرد کو اپنے استاد کے مطب میں بیٹھ کر تجربہ حاصل کرنے یا اس کی نگرانی میں مطب کرنے سے فائدہ پہنچتا ہے اور اس سے حضرت کو بھی اطمینان ہو جاتا۔ کہ آئندہ سلسلہ چل سکے گا۔ چنانچہ آپ بمسرت فرمایا کرتے تھے کہ:-

"الحمدللہ اب اپنے چند احباب ایسے ہوگئے ہیں۔ جو بفضلہ تعالیٰ طریق کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں اور امید ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ بھی ان کے ذریعہ اشاعت طریق کا سلسلہ جاری رہے گا۔"

یہ تو باقاعدہ اجازت یافتہ حضرات کا حال ہے۔ ویسے بھی حضرت کا ہر تعلیم و تربیت یافتہ کسی شیخ سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے حضرت نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ:-

"الحمدللہ اس صورت میں جتنے میرے احباب ہیں وہ اکثر ایسے تو ہیں جن پر اطمینان ہے۔ ورنہ اگر میں وسعت کرتا۔ تو ہر قسم کے لوگ بھر جاتے۔ وہ خلط مبحث ہو جاتا اب تو الحمدللہ فہم و اہتمام دین کے لحاظ سے میرے قریب قریب سب احباب ہی بفضلہ اس قابل ہیں کہ ان کو اجازت دے دی جائے۔ لیکن چونکہ کچھ نہ کچھ وجاہت بھی اجازت کے لئے مصلحت ہے۔ اس لئے پس و پیش ہے۔"

اخراجِ مجازین خلفائے مجازین میں سے جن کے حالات معلوم نہ ہوتے رہتے یا مشتبہ حالات سننے میں آتے۔ حضرت احتیاطاً ان کے نام فہرست مجازین سے خارج فرما دیتے۔ لیکن ان کو اہانت سے بچانے کے لئے ان کے نام شائع نہیں فرماتے تھے بلکہ

اخراج کے اعلان کی یہ صورت فرمائی کہ آئندہ جو فہرست مجازین شائع ہوتی۔ اس میں ان کے نام درج نہ کئے جاتے۔ اور صرف ان کے نام درج کئے جاتے۔ جن کی اجازت باقی رکھی جاتی تھی۔ البتہ جو وفات پا جاتے ان کا نام ضرور شائع فرما دیتے تھے۔

اس معاملہ میں کمال احتیاط یہ تھی کہ جن کے نام احتیاطاً خارج ہو کر درج فہرست نہ کئے جاتے ان کے متعلق یہ تنبیہ بڑھا دی جاتی تھی کہ:-

"بقیہ اوروں کو مجاز نہ سمجھنا ان کی صلاحیت کی نفی نہیں۔ میرے علم صلاحیت کی نفی ہے یعنی اُن کے قابل اجازت ہونے کی اب مجھ کو تحقیق نہیں۔"

البتہ اس قاعدہ کے خلاف ایک دفعہ مصلحتہً ایک صاحب کو بذریعہ خط فسخ اجازت اور فسخ بیعت کی اطلاع دے کر اس خط کی نقل تتمہ تنبیہات وصیت میں شائع فرما دی۔ مگر اس کے ساتھ ہی بخیال غایت تحفظ حدود یہ اطلاع عام بھی بڑھا دی کہ:-

"مقصود اس سے صرف ان لوگوں کو اطلاع دینا ہے۔ جو محض میری بیعت و اجازت کی بنا پر ان سے رجوع کرتے اور جن کے رجوع کی یہ بنا نہ ہو۔ وہ میرے مخاطب نہیں۔ ہر شخص کو اپنے دین کا اختیار ہے۔"

غرضیکہ حضرت کے ہاں ہر شے اپنی حد پر تھی۔ کسی بات میں نہ افراط تھی نہ تفریط۔ اور یہی صفت اعتدال آج کل عنقا ہے۔

درخشندہ ستارے

حضرت تھانویؒ کے مجازین میں بفضلہ تعالےٰ بڑی بڑی مقدس ہستیاں اور بڑے بڑے صاحب احوال رفیعہ و مقامات عالیہ اور اہل علم و تقویٰ گذر چکے ہیں اور موجود ہیں جو اس وقت ہند و پاکستان اور دیگر ممالک میں نہایت سرگرمی سے طالبین و سالکین کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہیں اور بندگان خدا کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ آسمان علم و شہرت پر مہر و ماہ کی طرح چمکنے والے حضرت کے بعض نادرۂ روزگار و صاحب کمال مجازین و منتسبین کے مختصر احوال درج ذیل ہیں۔

ا۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

شیخ الاسلام۔ صدر انجمن مسلمانان عالم و جمعیتہ علماء اسلام۔ شیخ الحدیث شارح مسلم شریف علامہ شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ ایسے فاضل اجل اور عالم بے بدل گذرے ہیں کہ جن کے تبحر علمی اور سیاسی بصیرت کا ایک زمانہ قائل اور معترف ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ با ایں علم و فضل اور زہد و تقویٰ انہوں نے روحانی تربیت

حاصل کرنے کے لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ہی منتخب کیا۔ اور ایک طالب و سالک کی حیثیت سے مدتوں تھانہ بھون حاضری دیتے رہے اور فیضِ باطنی حاصل کرتے رہے جس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے مترجم قرآن مجید پر جس خوبی۔ خوشنمائی۔ شگفتگی۔ متانت۔ سلاست۔ فصاحت اور بلاغت کے ساتھ آپ نے حواشی لکھے اور معارفِ قرآنی کو اردو جامہ پہنایا۔ وہ آپ کا ہی حصہ تھا۔

بقول مورخ اسلام سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ:-

"مولانا شبیر احمد صاحب بڑے خطیب و مقرر تھے۔ عالمانہ استدلال کے ساتھ بڑے دلچسپ قصے اور لطیفے بھی بیان کرتے تھے۔ جن سے اہلِ محفل کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی اور ظریفانہ فقرے اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود نہیں ہنستے تھے۔ گر دوسروں کو ہنسا دیتے تھے۔ ان کی تقریر میں کافی دلائل ہوتے تھے۔ سیاسی، علمی، تبلیغی اور واعظانہ ہر قسم کے بیان پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ ذہانت و طباعی اور بدیہہ گوئی ان کی تقریروں سے نمایاں ہوتی تھی۔ اکبر کے ظریفانہ اور فلسفیانہ شعر ان کو بہت یاد تھے۔ جن کو وہ اپنی تقریروں میں عمدگی سے کھپاتے تھے۔

مسلم لیگ کی خدمتوں میں ایسے الجھتے چلے گئے کہ پھر دوسری طرف ان کو خیال کا موقع ہی نہ ملا۔ اور آخر ۱۹۴۷ء میں لیگ کے بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ مرحوم بھی کراچی چلے گئے۔ اور وہیں کے ہو گئے۔ مرحوم نے کراچی پہنچ کر کوئی سرکاری عہدہ حاصل نہیں کیا۔ گر مذہبی معاملات میں ان کی حیثیت مشیر خاص کی تھی۔ اس لئے زبانِ خلق نے ان کو شیخ الاسلام کہہ کر پکارا۔ جو اسلامی سلطنتوں میں عموماً قاضی القضاۃ کا لقب ہوتا ہے۔ اور زیادہ تر اس لقب کی شہرت دولت عثمانیہ میں رہی اس حیثیت سے مرحوم پاکستان کی مجلس آئین ساز کے رکن بھی تھے۔ اور اس جماعت کے روح رواں بھی۔ جو اس کے آئین کو اسلامی قالب میں ڈھالنا چاہتی تھی۔ اس راہ میں مرحوم کی ابتدائی کوشش کی کامیابی کا وہ نتیجہ تھا۔ جس کو پاکستان کی آئینی اصطلاح میں "قرارداد مقاصد" کہتے ہیں۔

مرحوم گو مستقل طور پر پاکستان چلے گئے تھے۔ مگر تعجب ہوگا کہ انہوں نے نہ تو اپنا

کوئی خاص گھر بنایا۔ نہ کسی کی ذاتی کوٹھی پر قبضہ کیا۔ بلکہ بعض عقیدت مند اور اہل ثروت کے مکان میں رہے اور اس مسافرت میں اس مسافر نے اپنی زندگی بسر کردی۔

مرحوم کی کوئی ظاہری اولاد نہ تھی۔ لیکن بحمداللہ کہ انہوں نے اپنی کثیر باطنی اولاد چھوڑی ہے یہ ان کے تلامذہ ہیں۔ جو زیادہ تر دیوبند اور ڈابھیل میں ان کے شرف تلمذ سے مشرف ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہیں۔ وہ یادگار کے طور پر سپرد قلم کرتا ہوں۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ مولانا ابوالمآثر محمد حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوری۔ کہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود دائرہ علم ہے۔" (یادرفتگاں)

۲۔ مولانا سید سلیمان ندوی ؒ سید القلم کے فاضل اجل اور عالم بے بدل ہونے کا بھی زمانہ قائل ہے۔ دنیا انہیں فن تاریخ کا امام وقت سمجھتی ہے۔ کیونکہ وہ سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ تھے۔ عالم۔ فاضل اور مورخ ہونے کے علاوہ آپ مدبر، مفکر محقق۔ محدث، مبلغ۔ ادیب، خطیب۔ فقیہ اور شاعر بھی تھے۔ رمزی تخلص تھا۔ مولانا شبلی نعمانی ؒ کے صرف شاگرد ہی نہیں جانشین بھی تھے۔ جن پر استاد کو اتنا ناز تھا کہ وفات سے دو سال قبل ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۱۲ء میں خطبہ پڑھتے ہوئے اپنے اس ہونہار شاگرد رشید کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا کہ:۔

"ندوہ نے کیا کیا؟ ایک سلیمان کو پیدا کیا! تو یہی کافی ہے"!!

ہندوستان کی اتنی بڑی تاریخی درسگاہ سے نکلنے والے یگانہ روزگار سید سلیمان ندوی نے ایک ہی جست میں ندوہ سے تھانہ بھون کا فاصلہ کس طرح طے کیا۔ یہ داستان بڑی بصیرت افروز ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں کہ سید صاحب:۔

"مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ جب ان میں تصوف وسلوک کا ذوق پیدا ہوا۔ تو پہلے مولانا حسین احمد ہی کے جانب ان کا میلان ہوا اور ان ہی سے بیعت کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک پلنگ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ تشریف فرما ہیں۔ اور اس کے پاس ایک دوسرے پلنگ پر وہ خود مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ بیٹھے ہیں

یکایک مولانا حسین احمد اپنی جگہ سے اُٹھے اور سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر مولانا اشرف علیؒ کے سامنے پیش کرکے فرمایا "ان کو میری طرف سے قبول فرمالیں" اس خواب کے بعد وہ مولانا تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے"

(معارف سلیمان نمبر ص ۶۸)

سید صاحب نے اس سلسلہ میں حضرت تھانوی کی خدمت میں دسمبر ۱۹۲۹ء میں مندرجہ ذیل ذیل خط لکھا:۔

"بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن و حوادث سے گھبرا گھبرا اُٹھتا ہے۔ اور بے اختیار کسی سکینت و طمانیت کے مامن کی تلاش ہوتی ہے۔ تو خانقاہ امدادیہ یاد آتی ہے۔ لیکن ڈر تھا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت و بے گانگی سے میرے متعلق کیا کیا آپ تک پہنچا ہو۔ اور آپ مجھے مخاطب کا اہل بھی سمجھیں یا نہیں۔

اب اس کشمکش کی منزل میں ہوں۔ جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں بنتے دعا کا طالب اور توجہ کا خواستگار ہوں۔" (معارف سلیمان نمبر ص ۲۶۷)

دوسرے خط میں سید صاحب نے حضرت کو لکھا کہ:۔

"میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمادیں کہ مجھ میں استقامت و ثبت اور رغبت الی الطاعات پیدا ہو۔ فرائض کا پابند ہوں۔ بدعات سے نفور ہوں کبھی کبھی ذوق سجود کی لذت بھی پاتا ہوں۔ امام ربانی مجدد الملت ثانی شاہ ولی اللہ و عبد رحمۃ اللہ علیہ کے اور ان کے سلسلہ سے عقیدت تامہ ہے۔ خرافات و طاعات صوفیہ کا منکر ہوں۔"

(ایضاً نمبر ص ۲۸۸)

اس طرح سید صاحب نے اپنی دینی عظمت اور جلالت کا لحاظ کئے بغیر آستانۂ اشرفیہ پر جا کر اپنا سر نیاز جھکا دیا۔ علم و فن کا یہ شہباز بلا اطلاع بے وقت دربار اشرفیہ میں پہنچا۔ سید صاحب کی آمد کی مسرت سے ضابطوں کے بادشاہ اپنے ضابطوں سے انہیں مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے فوراً زنانخانہ سے باہر تشریف لائے۔ پھر کیا ہوا۔ اس کی تفصیل خود حضرت تھانوی کے مندرجہ ذیل گرامی نامہ سے پڑھ لیجئے جو آپ نے اس ملاقات کی نسبت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کو لکھا:۔

"مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعتہً تشریف لے آئے۔ میں مکان پر تھا۔ سنتے

ہی حاضر ہوا۔ میرے ذہن میں ان کا جثہ طویل و عریض تھا۔ پایا تو معتدل الخلقت پاکر قلب کو بہت اُنس ہوا۔ پھر ملاقات و مکالمت سے ان کی تواضع و سادگی و رعایت جلیس دیکھ کر تو مسخر ہی ہو گیا۔ گیارہ بجے تشریف لائے۔ تین بجے واپس تشریف لے گئے۔ مجلس میں بہت دیر تک ثنا خوانی کرتا رہا۔" (حکیم الامت ص ۱۳۵)

بس اس "مسخر ہونے" نے اُس شہباز کو مسخر کر دیا۔ وہاں کے "حال" کا اس مردِ قال پر سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی ان تمام پرانی تحریروں پر نظر ثانی کی۔ جن میں ذرا بھی جمہور امت سے اختلاف کا شائبہ یا احتیاط کے خلاف کوئی بات نظر آئی۔ اور اس طرح اپنے ہم مکتبوں۔ ہم مشربوں اور ہم عصروں کو یہ آخری عملی نصیحت فرمائی کہ:۔

قال را بگذار مردِ حال شو

اہل ندوہ نے شاہ سلیمان کا تختِ سلیمانی سے اتر کر دربارِ اشرفیہ کے خدام میں شامل ہونے کو اپنی توہین پر محمول کیا۔ مگر سید صاحب نے انہیں اپنے عملی استحکام سے یہ نکتہ سمجھایا کہ ؎

دستارِ فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو
ہونا ہے اسے اک دن نذرِ مئے میخانہ

بعض کو یہ جواب دیا کہ:۔

"جن کمالات کی بنا پر آپ نے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا۔ انہی کمالات نے مجھ کو مولانا تھانوی کے آگے جھکا دیا۔ میں نے اپنے انجام کی فکر کر لی اب آپ کو اختیار ہے کہ اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کر لیں" (معارف سید سلیمان نمبر ۲۹۴)

کبھی ان کے شور و غوغا پر یوں شکوہ کیا کہ:۔

"یہ لوگ مجھ کو زبان سے تو فاضل اور محقق کہتے ہیں۔ مگر درحقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں۔ آخر اس بات پر کیوں انہیں غور کرتے کہ ان کے خیال کے مطابق اگر واقعی محقق اور علامہ دہر ہوں تو کیا بلا وجہ میں نے مولانا تھانوی کا دامن تھاما۔ ان لوگوں کو سمجھنا چاہیئے کہ میں نے اپنے اندر کوئی تو کمی پائی۔ جس کی تکمیل کے لئے وہاں گیا"

(معارف سید سلیمان نمبر ۶۹)

غرضیکہ یہ وہ حالات تھے۔ جن میں سے سید صاحب بادۂ طریقت سے سرشار ہوئے اور زیادہ وقت علمی مذاکروں کی بجائے رُشد و ہدایت میں صرف کرنے لگے۔

قیام پاکستان کے بعد ارباب حکومت کو اس بورڈ کی صدارت کے لئے جو دستوری سفارشات کو اصول اور حدود شریع میں باقی رکھنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ ایک ماہر عالم کی ضرورت تھی ان کی نظر انتخاب سید صاحب پر پڑی اور انہیں خاص آدمی بھیج کر گورنمنٹ پاکستان بلوایا۔ سید صاحب محض اپنے شیخ کی خواہش کے مطابق قائم ہونے والی اسلامی مملکت کی خدمت کے جذبہ سے اپنی معیاری رہائش اور وسیع ذرائع آمدنی چھوڑ کر کراچی ایسے گراں شہر میں معہ اہل وعیال تشریف لائے۔ مالی پریشانیوں کے باوجود آپ نے عالمانہ وقار اور اشرفی استغنار کو قائم رکھتے ہوئے بڑے توکل وتحمل سے زندگی کے آخری ایام مسافرانہ اور درویشانہ شان سے یہیں گذار دیئے۔

قیام پاکستان کے دوران میں

۱۔ آپ نے سب سے پہلے دسمبر ۱۹۵۰ء میں مختلف فرقوں کے ۳۱ علماء کے اجتماع کی صدارت ورہبری فرمائی۔ اور تین چار دن کے اندر ایک ایسا دستوری خاکہ بنا کر پیش کیا کہ ارباب حکومت حیران رہ گئے۔ اور حضرت کی خدمت میں مبارکبادی کے خطوط اور برقیئے بھیجے۔ جس کی وجہ سے حکومت کی پیش کردہ رپورٹ نابود ہوگئی۔

۲۔ آپ نے ہر جگہ اس بات پر زور دیا کہ تن تنہا دستور سے کوئی مملکت "اسلامی مملکت" نہیں بن سکتی۔ اور نہ اس میں انقلابی شان پیدا ہوسکتی ہے۔ تاوقتیکہ ملک میں اسلامی قانون رائج نہ ہو۔ اور یہی بات آپ نے قائد ملت لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کے ذہن میں اس خوبی سے بٹھائی کہ بالآخر انہیں ایک لاکمشن مقرر کرنا پڑا تاکہ وہ مروجہ قوانین پر نظر ثانی کر کے ان کو اسلامی قانون کے حصار میں لے آئے۔ اس کمشن کے صرف تین ارکان تھے۔ جسٹس رشید جسٹس میمن اور علامہ سید سلیمان ندوی بعد میں سید صاحب کی تحریک پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا تھا۔ کیونکہ آپ اسلامی آئین کے سلسلہ میں تنہا ذمہ داری نہ لینا چاہتے تھے

۳۔ رئیس الخلفاء دربار اشرفیہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ کے اصرار پر جبکہ دستوری سفارشات از سر نو مرتب ہو رہی تھیں۔ بورڈ تعلیمات اسلامی مجلس دستور ساز پاکستان میں بھی اپریل ۱۹۵۲ء میں شرکت فرمائی تھی۔

۴۔ قائد اعظم کی یادگار میں جو دار العلوم تعمیر ہونا تھا۔ اس کی انتظامیہ کمیٹی کا بھی آپ کو رکن بنایا گیا تھا۔ جس نے اس کے لئے جگہ اور نصاب کا انتخاب کرنا تھا۔ آپ کی اور مولانا مفتی محمد شفیع

صاحب دیوبندی (جو اس کمیٹی کے بھی رکن تھے) کی کوشش سے ہی اس کی تعمیر کے لئے ملتان کو منتخب کیا گیا۔ جو کسی زمانہ میں علوم و معارف کا گہوارہ تھا۔

اور بالآخر وہ اسی سرزمین میں ابدی نیند سو گئے۔

۳۔ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے شاگرد رشید حضرت تھانوی کے خلیفہ ارشد۔ مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ ان علماء ربانی میں سے ہیں جنہوں نے لیگ کی اس وقت پشت پناہی کی جبکہ جمیعتہ العلماء ہند۔ احرار۔ نیشنلسٹ کانگریس کے جھنڈے تلے اس کے خلاف صف آرا ہو چکے تھے۔ سارا دیوبند ایک طرف اور مفتی دیوبند ایک طرف۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی اور مفتی محمد شفیع صاحب نے ملک کے طول و عرض میں طوفانی دورے کر کے لیگ کے حق میں رائے عامہ کو اس طرح بیدار کیا کہ مخالف کیمپ میں کھلبلی سی مچ گئی۔

. . . .

. . . .

. . . .

پاکستان بننے کے بعد آپ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ کے اصرار پر اپنا کتب خانہ اور کاروبار ہندوستان میں چھوڑ کر کراچی آ گئے۔ چونکہ اس وقت زمام اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ جن کی معیت میں یہ جنگ پاکستان لڑ چکے تھے۔ اسلئے انہوں نے آپ کی آمد پاکستان کا دلی خیر مقدم کیا۔ اور آپ کے تبحر علمی اور فقہی بصیرت سے فائدہ اٹھانے کے لئے آپ کو مجلس دستور ساز پاکستان کے قائم کردہ بورڈ تعلیمات اسلامیہ کا رکن بنا دیا گیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریک پر موجودہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے والے کمشن میں بھی آپ کو شامل کر لیا گیا۔ جس کے دوسرے ارکان خود سید صاحب جسٹس رشید اور جسٹس میمن تھے۔ علاوہ ازیں قائداعظم کے یادگاری دارالعلوم کی تعمیر اور اس کا نصاب مقرر کرنے والی کمیٹیوں میں بھی آپ کو شامل کیا گیا۔

عین اس وقت جبکہ یہ نعرہ لگایا جا رہا تھا کہ قرآن کے اندر اسلامی دستور ثابت کرنے والے کو ہزاروں روپیہ انعام دیا جائیگا۔ آپ نے شب و روز محنت کر کے دستور قرآنی کا خاکہ تیار کیا۔ دستور یہ کے ایک ایک ذمہ دار رکن کے پاس پہنچے۔ انہیں ایک ایک بات اور نکتہ

سمجھایا۔ اور ان کے ذہنوں کو اسلامی آئین بنانے اور قبول کرنے کے لئے اس طرح تیار کیا کہ خود قرآنی آئین کے منکر مسٹر بودہی نے کتاب و سنت کے مطابق مرتب کردہ اسلامی آئین کی ایک ایک دفعہ ایوان دستور یہ میں پیش کر کے منظور کرائی۔ اور ان کے حق میں بعض ممبران دستور یہ نے ایسی اسلام آموز اور ایمان افروز تقریریں کیں کہ دستوریہ کے ہندو ممبران چیخ اٹھے کہ ہم یہاں اسلام پر لیکچر سننے نہیں آئے۔ اس تمام تیاری اور کامیاب جد و جہد کا سہرا مفتی اعظم پاکستان کے سر ہے۔ جو پس پردہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے شیخ کے مذاق کے مطابق ارکان دستوریہ کو تبلیغ و تلقین میں مصروف رہے۔

۴۔ مولانا ظفر احمد عثمانی حضرت تھانوی کے خواہرزادہ اور تربیت یافتہ۔ سابق صدر شعبہ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی۔ حال شیخ الحدیث دار العلوم اسلامیہ ٹنڈو الٰہ یار ضلع حیدر آباد سندھ ان علماء مشاہیر میں سے ہیں۔ جنہوں نے جنگ پاکستان میں بالعموم اور سلہٹ کے ریفرنڈم میں بالخصوص بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا ریفرنڈم کے دوران میں جہاں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ صوبہ سرحد میں مصروف جہاد تھے وہاں مولانا ظفر احمد صاحب سلہٹ میں مصروف عمل تھے۔ کیونکہ ان دونوں محاذوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر قائد اعظم نے ان کی کمان علی الترتیب ان کے سپرد کر رکھی تھی۔

مولانا ظفر احمد عثمانی جس وقت سلہٹ پہنچے۔ اس وقت جمیعۃ العلماء ہند کے ارکان میدان پر چھا چکے تھے۔ پاکستان کی مخالفت میں در و دیوار پران کے اشتہار چسپاں ہو چکے تھے مگر ان کے وہاں پہنچ کر صرف چار تقریریں کرنے سے ہوا کا رخ بدل گیا۔ مخالفین نے نہ صرف پاکستان کی مخالفت ترک کر دی۔ بلکہ حامیان پاکستان سے اتحاد کر لیا۔ جس سے ہندوؤں کو سخت صدمہ پہنچا۔ اور انہوں نے ریفرنڈم کے دوران میں بڑی گڑبڑ کی۔ یہاں تک کہ کئی ہندو آفیسر اور ہندو عورتیں گرفتار کر لی گئیں۔ مگر ان ریشہ دوانیوں کے باوجود ریفرنڈم کا نتیجہ پاکستان کے حق میں رہا۔

حضرت تھانوی کی طرح مولانا ظفر احمد عثمانی بھی قائد اعظم کو تبلیغی خطوط لکھتے رہتے تھے جن کا باقاعدہ انگریزی ترجمہ ساتھ بھیجا جاتا تھا تاکہ ان کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ پاکستان بننے کے بعد جب سکہ اور ٹکٹ وغیرہ بنانے کا سوال پیدا ہوا۔ تو بعض نا فہموں نے ان پر قائد اعظم

کی تصویر چھاپنے کی تجویز پیش کی جسے قائد اعظم سے عقیدت کی وجہ سے منظور کیا جا رہا تھا۔ کو ہماری تحریک پر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مولانا ظفر احمد عثمانی۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے ارباب اختیار کو اس مسئلہ کے شرعی پہلو کی طرف توجہ دلائی۔ اور انہیں اس خلاف شرع فعل سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔

پاکستان بننے کے بعد آپ بھی اپنے دوسرے مذکور الصدر رفقاء کے ساتھ دستور اسلامی کی نا فیذ ترویج کے سلسلہ میں کوشاں رہے۔ اور بعض امور میں ارباب اختیار و اقتدار ان سے صلاح و مشورہ کرتے رہے۔ بلکہ مشرقی پاکستان کے انتخابات کے سلسلہ میں ان کی خصوصی طور پر امداد حاصل کی گئی۔ اور خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ کی زیر سرکردگی ۱۹۴۹ء میں جو وفد حجاز گیا تھا۔ اس کا بھی انہیں رکن بنایا گیا تھا۔

غرضیکہ دربار اشرفیہ کے ان چاروں بیدار و جری زنجیروں نے عین اس وقت جبکہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی بنیاد قائم کی جا رہی تھی۔ اور ارباب اختیار و اقتدار کو قدم قدم پر علمائے حق کی امداد کی ضرورت لاحق ہو رہی تھی۔ ذاتی اغراض و اقتدار کے لئے نہیں۔ بلکہ ذاتی نقصان اٹھا کر محض خدمت خلق و پاکستان کے لئے خلوت سے جلوت میں آ کر ارباب اختیار و اقتدار کی رہنمائی کی اپنے عالمانہ وقار اور درویشانہ استغنار کو کبھی ٹھیس نہ لگنے دی۔

۵۔ مولانا مفتی محمد حسن امرتسری قطب زماں۔ شیخ دوراں۔ رئیس الخلفاء دربار اشرفیہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری مہتمم جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور و صدر ...... جمعیتہ علمائے اسلام ان نفوس قدسیہ میں سے ہیں۔ جو نظام تکوینی کے سلسلہ میں مامور من اللہ ہوتے ہیں۔

دربار اشرفیہ کے اسرار و رموز اور علوم و معارف جاننے والے اس محقق عالم اور مرد درویش کا دربار، دربار اشرفیہ کا ہی نمونہ پیش کرتا ہے۔ جس میں بڑے بڑے با جبروت اور جلیل القدر ارباب اختیار و اقتدار کو دست بستہ کھڑے دیکھا۔

ان کا جلال و جمال۔ ان کا حال و قال۔ ان کا زہد و اتقاء۔ ان کا صبر و استقلال ان کا علم و فضل ان کی جذب و تاثیر اور شان استغنا حضرت تھانوی کی یاد دلوں میں تازہ کر دیتی ہے۔ اور بڑے بڑے نکتہ چینوں اور نقادوں سے اعتراف کرا لیتی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی اپنے سفرنامہ پاکستان میں لکھتے ہیں کہ:-

"حضرت تھانوی کی وفات کے بعد سے بڑی تمنا تھی کہ ان کا کوئی صحیح اور سچا جانشین دیکھنے میں آ جائے۔ آنکھیں مدت سے اس کے لئے ترستی ہوئی تھیں۔ ذکر متعدد ثقہ لوگوں سے سننے میں آیا تھا کہ اس صفت کے ایک بزرگ لاہور میں ہیں مولانا محمد حسن امرتسری ثم لاہوری جو مسجد نیلا گنبد کے متصل مدرسہ اشرفیہ میں رہتے ہیں۔ اپنے مرشد کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں۔
جذبۂ اشتیاق سب سے پہلے انہیں کی خدمت میں لے گیا۔ کہنا چاہیئے کہ مقام لاہور کے اہم ترین مقصدوں میں ایک مقصد یہی تھا۔ بعد عصر حاضری ہوئی۔ اور دیر تک حکمت و معرفت کے کلمات اور اچھی اچھی باتیں سننے میں آتی رہیں۔ بزرگی صورت سے ظاہر ہے۔ اور تواضع و حسن اخلاق تو شاید ان کا حصہ ہے۔
باربار اُٹھنا چاہا۔ لیکن مولانا کی شفقت نے اُٹھنے نہ دیا۔ اور ماری خاطریں کی گئی جائے اور ناشتہ سے خوب رہیں۔" (صدق جدید ۲۷ مئی ۱۹۵۵ء صلا)

یہ صحیح اور سچے جانشین انہیں کے تھے جن کے متعلق مولانا عبدالماجد صاحب کا ارشاد ہے کہ:-
"مولانا کی ذات خود دینی حیثیت سے عجیب ذات تھی۔ کوئی صرف فقیہ ہوتا ہے اور طریقت سے کورا۔ کوئی محض صوفی ہوتا ہے اور کلام کے مباحث سے نا آشنا۔ یہ حضرت ایک ہی وقت میں صوفی و محقق بھی تھے اور متکلم بے بدل بھی۔ رومی عصر بھی اور رازی وقت بھی۔ فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث و تصوف کے علاوہ کلام قدیم و جدید کے بھی خدا معلوم کتنے مسائل یہاں مجلسوں میں، واعظوں میں برابر بیان ہوتے رہتے ہیں۔ اور ہم جیسے کتنے لے اُڑے اور کما رہے ہیں سے خوشہ چینی کر کر کے اپنی بات بناتے اور اپنی دکان چمکاتے ہیں۔" (حکیم الامت ص۶۴)

حضرت تھانوی کے اس آئینہ صفات میں ان کے "صحیح اور سچے جانشین" کے خط و خال کتنے نمایاں ہو گئے ہیں۔

۶۔ مولانا عبدالباری ندوی ندوۃ العلماء لکھنؤ نے عصر جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے یوں تو ایسے بڑے بڑے عالم فاضل، مفکر اور ماہر پیدا کئے۔ جنہوں نے علمی اور تحقیقی میدان میں قابل فخر کارہائے نمایاں دکھائے مگر وہ ایسے اہل نظر صرف تین ہی پیدا کر سکا۔ جنہوں نے اپنی بصیرت سے دور

حاضر کے مجدد کو پہچانا اور اس کی تعلیم و تربیت سے فیض پایا۔ ان میں سے ایک مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔ جو فنا فی الشیخ کے مقام پر پہنچنے کے باوجود آخر وقت تک ندویانہ خصوصیات کے بھی حامل رہے دوسرے دارالمصنفین اعظم گڈھ کے رکن مولانا عبدالباری صاحب ندوی سابق استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ہیں۔ مولانا عبدالباری صاحب ایسے فنا فی الشیخ ہوئے کہ اپنی ندویت کو بھی بھلا بیٹھے۔ ان پر حضرت کا رنگ اتنا غالب ہے کہ ہر بات ان کے ہی انداز کی کہتے ہیں۔ اور ہر چیز ان کی ہی پسند کی چاہتے ہیں اور شب و روز حضرت تھانوی کی تعلیمات و تجدیدات کی تہذیب و تسہیل اور انکی اشاعت کثیر کی فکر میں رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں چار نادر کتابیں (۱) جامع المجددین (۲) تجدید سلوک و تصوف (۳) تجدید تعلیم و تبلیغ (۴) تجدید معاشیات کے نام سے ایسی مرتب فرمائیں کہ نو تعلیم یافتہ طبقہ کو پہلی دفعہ حضرت کی تجدیدات سے مستفید و مستفیض ہونے کا موقع ملا۔

۷۔ مولانا شبیر علی تھانوی حضرت تھانوی کی اپنی تو کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے مولانا شبیر علی صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب سے یہ فرما کر لے لیا تھا کہ:۔

"میری کوئی اولاد نہیں ہے لہذا شبیر کو مجھے دیدو۔ میں اس کو اپنی اولاد کی طرح رکھونگا"

مولانا شبیر علی لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر حضرت کی صلبی اولاد ہوتی۔ تو شاید اتنے ناز حضرت ان کے بھی نہ اٹھاتے۔ جتنے اس خادم کے اٹھائے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی شفقتوں کے سامنے میں اپنے والدین کی شفقتوں کو بھی بھول گیا۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آخر وقت تک حضرت ہی کی جوتیوں میں میری عمر گذری"۔ (خاتمۃ السوانح ص۱۴۱)

دوسرے حضرات نے تو حضرت تھانوی سے باطنی تربیت حاصل کی۔ مگر مولانا شبیر علی صاحب نے حضرت کے طبعی رجحان سے فائدہ اٹھایا۔ چونکہ خانقاہ امدادیہ کے تمام انتظامی امور انہی کے سپرد تھے۔ اسلیے انہیں انتظامی امور میں ہر وقت حضرت کی رہنمائی حاصل رہی۔

علاوہ ازیں سب سے زیادہ اور اہم اعزاز انہیں "سفیر اشرف" کا حاصل رہا۔ کیونکہ حضرت تھانوی اکثر انہیں ہی قائد اعظم کی خدمت میں بغرض تبلیغ و ارشاد بھیجا کرتے تھے اور انہوں

نے قائدِ اعظم کو پابندِ نماز بنانے اور حضرت تھانوی کے قریب لانے میں بڑے تاریخی کارنامے سرانجام دیئے۔ جن کی تفصیل "تعمیر پاکستان اور علمار ربانی" کے تیسرے باب "تدینِ قائدِ اعظم" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

پاکستان تشریف لانے کے بعد انہوں نے کچھ عملی کام کرنے کی بڑی کوشش کی۔ مگر انہیں کوئی اپنا ہم خیال رفیق نہ مل سکا۔ انہوں نے اس غرض کے لئے علمار کرام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی انتھک کوشش کی۔ مگر اربابِ غرض اور طالبِ جاہ حضرات کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور آخرکار وہ مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔

پاکستان تشریف لانے کے بعد انہوں نے پاکستان آکر مایوس ہونے والوں کے خواب کی خوب تعبیر کی کہ:

ہندوستان سے پاکستان آنے والے تقریباً ہر شخص نے یہی سمجھ لیا تھا کہ وہاں من و سلویٰ اتر رہا ہے۔ جاتے ہی پکی پکائی مل جائے گی۔ اور خوب مزے سے گزرے گی اگر اس کی بجائے وہ یہ خیال کرتے کہ وہاں جا کر صرف اپنے لئے ہی جہد للبقا نہیں کرنی۔ بلکہ ایک نوزائیدہ سلطنت کے استحکام میں بھی معاون ہونا ہے۔ تو انہیں ہرگز مایوس نہ ہونا پڑتا۔"

۸۔ مولانا قاری محمد طیب دیوبندی

لمیذ رشید۔ یادگار قاسم۔ فاضل اجل۔ مخزن علم مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کو شرفِ بیعت حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہے۔ علمی استفاضہ آپ نے علامۂ جلیل مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ، فخر العلمار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اور دیگر مشاہیر سے کیا۔ مگر روحانی دولت اور منصبِ خلافت حضرت تھانوی سے پایا۔

آپ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم بھی ہیں اور مہتمم بھی۔ اسی چشمۂ فیض کے فیض یافتہ بھی ہیں اور فیض رساں بھی۔ عالم و فاضل بھی ہیں اور پیر طریقت بھی۔ علم و عرفاں کے دریا بھی ہیں۔ اور تحریر و تقریر کے دھنی بھی۔ نظم و نسق کے ماہر بھی ہیں۔ اور طی الارض کے مشاق بھی۔ کہ اکثر سفر میں رہتے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو۔ جہاں آپ نے پہنچ کر خدا و رسولؐ کا پیغام نہ سنایا ہو یا جہاں آپ کی تصنیفات و تالیفات نہ پہنچی ہوں۔

جمعیۃ العلماء ہند کے روح رواں زیادہ تر اکابر دیوبند ہی تھے۔ گو مشاہیر دیوبند سے ہونے کے باوجود آپ سیاسی مدوجزر سے کبھی اثر پذیر نہیں ہوئے اور نہ اپنے دامن کو موجودہ سیاست کی نجاست سے آلودہ ہونے دیا۔ بلکہ اپنے پیر و مرشد حضرت تھانوی کے مسلک کے مطابق سیاست کو بذیل دین ہی لانے کو اسلم سمجھا۔ آپ کی شخصیت دین کی اہم ترین ضروریات اور مسلمانوں کے دینی حوائج کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

۹۔ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری

فخر الاماثل۔ خیر مجسم حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری مہتمم مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان حضرت تھانوی کے محبوب خلفاء میں سے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل ان کا جالندھر میں رشد و ہدایت اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے سرزمین ملتان کو اس چشمہ فیض کے لئے منتخب فرمایا۔ جو کسی زمانہ میں علماء و اولیاء کا مرکز اور علوم و معارف کا سرچشمہ تھی۔

بے سروسامانی کے عالم میں ملتان پہنچتے ہی آپ نے بلا تاخیر محض توکلاً علی اللہ یہی چشمہ خیر جاری کر دیا۔ جس سے ہزاروں طالبانِ علم اور تشنگانِ طریقت مستفید و مستفیض ہونے لگے جس سے اربابِ بدعات کے حلقوں میں ایک سراسیمگی سی پھیل گئی اور باطل کی تمام قوتیں اس خیر مجسم کے مقابلہ میں آ گئیں اور اس چشمۂ فیض کو بند کرانے کے لئے زور آزمائی کرنے لگیں۔ مگر خیر کے مقابلہ میں شر کب کامیاب ہوا تھا۔ جو اس دفعہ ہو جاتا۔

حاسدین و معاندین نے مدرسہ کو نقصان پہنچانے اور اہل مدرسہ کو بدنام کرنے کے لئے یہ مشہور کر دیا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب کا تعلق جماعت احرار سے ہے۔ جو نظریہ پاکستان کی مخالف تھی۔ اور انہی لوگوں نے مدرسہ کی شکل میں یہاں اپنا خفیہ اڈا قائم کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے ہم مشرب و ہم مسلک اربابِ مسلم لیگ کی مدد سے مدرسہ کی عمارت خالی کرانے اور مولانا موصوف کو شہر بدر کرانے کی مہم بھی شروع کر دی۔ حالانکہ یہ الزامات قطعاً بے بنیاد تھے مولانا خیر محمد صاحب اپنے شیخ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی طرح کانگریس کے مخالف اور مسلم لیگ کے حامی تھے۔ ۱۳۶۴ھ میں اراکین مجلس دعوۃ الحق بمبئی کے استفسار کے جواب میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی دیوبند نے کانگریس کی مخالفت اور مسلم لیگ میں شرکت کے متعلق جو تاریخی شرعی فتویٰ وقایۃ المسلمین عن ولایۃ المشرکین نامی رسالہ نومبر ۱۹۴۵ء میں شائع کیا تھا۔ اور جو کانگریس کے لئے ایٹم بم ثابت ہوا تھا۔ اس پر علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی

علامہ سید سلیمان ندوی۔ مولانا جمیل احمد تھانوی۔ مولانا ظفیر علی تھانوی کے علاوہ مولانا خیر محمد جالندھری کی بھی تصدیق ثبت تھی۔ اتفاق سے وہ رسالہ ہماری لائبریری میں محفوظ تھا۔ چنانچہ وہی رسالہ ارباب اختیار دیانت دار کو دکھلا کر ان کے ڈھول کا پول کھول دیا۔ جس سے ان کی تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اس کے باوجود وہ مدرسہ کو نقصان پہنچانے سے باز نہ آئے۔ مگر بفضلہ تعالیٰ نتیجہ ہمیشہ ان کے مخالف ہی رہا۔ جو ثمرہ ہے مولانا خیر محمد صاحب کی للہیت اور خلوص کا۔

آپ کے چہرہ کی نورانیت بشرہ کی شگفتگی۔ نظروں کی شفقت۔ لبوں کی مسکراہٹ اور اخلاق کی وسعت اشرفی جمال کی زندہ تصویر ہے۔ اس پیرانہ سالی میں خرابیٔ صحت کے باوجود آپ کو خیرالمدارس ایسے وسیع تعلیمی ادارہ کی انتظامی مشغولیتیں۔ درس و تدریس کی مصروفیتیں اور طویل تبلیغی سفروں کی صعوبتیں برداشت کرتے دیکھ کر ان کے متعلق حضرت تھانویؒ کے اس ارشاد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ "انجن تو چھوٹا سا ہے۔ مگر گاڑیاں بہت سی پیچھے کھینچے لا رہا ہے"۔

۱۰۔ مولانا عبدالماجد دریابادی

حضرت مولانا دریابادی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ شروع شروع میں وادیٔ الحاد میں بھٹکتے رہے کفر کی ڈگری حاصل کی۔ ہوش آئی تو "سچ" نگارین بیٹھے۔ مدتوں "خلافت" کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ جب اسے بچانے میں ناکام رہے تو اپنے "بچاؤ" کی فکر ہوئی۔ باطنی اصلاح اور روحانی ترقی کے لئے اپنا ہاتھ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایک ایسے فلسفی کو جو ہر چیز کو اپنی عینک سے دیکھنے کا عادی ہو ایک جگہ کبھی اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ .... مولانا دریابادی نے تعلقات طریقت تو مولانا مدنی سے قائم رکھے مگر عقیدت حضرت تھانوی سے بڑھالی۔ سب کچھ دیکھتے جانچتے تولتے اور صحیح و درست پانے کے باوجود ...... کبھی نہ کسی وقت آپ نے حضرت سے اختلاف بھی کیا۔ اور عاق ہو بیٹا کا نہ کیا۔ لیکن بایں ہمہ حضرت تھانوی نے ان سے جو شفقت آمیز سلوک کیا۔ اور جس محبت سے پیش آتے رہے۔ وہ صرف مولانا دریابادی کا ہی حصہ تھا۔ یہ حضرت تھانوی کی ہی توجہات و عنایات کا فیض ہے کہ کفر کا ڈگری یافتہ دربار اشرفیہ سے مفسر قرآن بن کر نکلا۔ اور مفسر بھی ایسا کہ جس نے اپنے قلم حقیقت رقم سے معارف قرآنی کے انمول موتی نہایت سلیس۔ شگفتہ۔ دلکش مگر ادیبانہ انداز میں صفحہ قرطاس پر بکھیر کر رکھ دیے جنہیں دیکھ کر ارباب نظر بے ساختہ پکار اٹھے کہ انہوں نے قرآن پاک کی جو تفسیر لکھی ہے اس کی

تمام تفسیری ذخیرہ کی موجودگی کے باوجود بھی اشد ضرورت تھی۔
ان کی بے مثل ذہانت۔ بے مثل تحریر۔ بے مثل طنز۔ بے مثل مزاج۔ بے مثل حق گوئی اور خوب گوئی ایسی نہیں کہ کوئی منصف مزاج اس کے تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل کرے۔ البتہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ارباب علم و فضل بھی ہوش کے عالم میں نہیں جوش کے عالم میں ان سے برافروختہ رہتے ہیں۔ حالانکہ اگر ان امور کو جو مابہ النزاع ہیں۔ تو اہشات و جذبات کی کسوٹی پر نہیں اصول و دیانت کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور منصف مزاجی سے کام لیا جائے۔ تو کوئی گنجائش اعتراض ہی باقی نہیں رہتی۔

فہرست مجازین دربار اشرفیہ کی طرف سے مجازین بیعت اور مجازین صحبت کی جو آخری فہرست شائع ہوئی۔ اس کا مفصل ذکر خاتمۃ السوانح میں موجود ہے مگر ان میں سے بعض وفات پا گئے ہیں۔ بعض نقل مکانی کر کے دوسرے مقامات پر چلے گئے ہیں۔ اسلئے خاتمۃ السوانح میں شائع شدہ فہرست کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل فہرست مجازین مرتب کی گئی ہے اور اس کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے۔

۱۔ خلد آشیاں مجازین
۲۔ فیض رساں مجازین

جو حضرات اس وقت (جون ۱۹۵۵ء) میں۔ چشمۂ فیض اشرفیہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور جن کے جدید پتے معلوم ہو سکے ہیں۔ ان کے جدید پتے درج کر دیئے گئے ہیں۔ اور جن کے جدید پتے معلوم نہیں ہو سکے۔ ان کے پرانے پتے ہی رہنے دیئے ہیں۔ جو حضرات ممنوع الاجازۃ قرار دیئے گئے تھے۔ وہ اس میں شامل نہیں کیے گئے۔ لہٰذا اس فہرست میں درج شدہ حضرات کے علاوہ اگر کوئی شخص خود کو حضرت کا مجاز ظاہر کرے تو اس کا دعویٰ غلط تصور کیا جاوے۔

خلد آشیاں مجازین جون ۱۹۵۵ء تک جو مجازین بیعت عالم بقا میں حضرت تھانوی کی خدمت میں پہنچ چکے ہیں۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

۱۔ مولوی محمد عیسیٰ صاحب محی الدین پوری پروفیسر عربی محمد محتشم گنج الہ آباد۔
۲۔ مولوی عبدالحلیم صاحب پنڈیرہ ڈاکخانہ بڈا شام بازار۔ ضلع بردوان۔
۳۔ مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری۔ محلہ کرم علی۔ میرٹھ شہر۔
۴۔ مولوی عبدالمجید صاحب بچھرایونی۔ خانیوال۔

۵۔ خواجہ عزیز الحسن صاحب انسپکٹر مدارس لکھنؤ
۶۔ مولوی محمد اسحاق صاحب مدرس مدرسہ عالیہ ڈھاکہ
۷۔ حاجی شمشاد علی صاحب کاکوری، اشرف المطابع۔ تھانہ بھون
۸۔ محمد عبد اللہ خاں صاحب بیرون امالی دروازہ۔ ریاست بھوپال
۹۔ مولوی رفیع الدین صاحب محلہ سبزی منڈی متصل مسجد سوداگر۔ الہ آباد
۱۰۔ منشی حقداد خاں صاحب پنشنر محلہ مولوی گنج۔ لکھنؤ شہر
۱۱۔ مولوی ولی احمد صاحب۔ قصبہ برہانپور۔ ضلع کیملپور
۱۲۔ حکیم کرم حسین صاحب سیتاپور۔ اودھ
۱۳۔ محمد عثمان خاں صاحب تاجر کتب متصل جامع مسجد دہلی
۱۴۔ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب چاندپور ضلع بجنور
۱۵۔ حکیم عبد الخالق صاحب ساکن ملتانیاں چوک فرید امرتسر
۱۶۔ ماسٹر ضامن علی صاحب سیکنڈری گورنمنٹ ہائی سکول کانپور
۱۷۔ مولوی عبد الودود صاحب آخون زادہ۔ دوبیاں۔ پوسٹ کالوخان پشاور
۱۸۔ حافظ ولی محمد صاحب محلہ کاغذیاں۔ قنوج۔ ضلع فرخ آباد
۱۹۔ حکیم خلیل احمد صاحب کھالہ پار محلہ پل حمران سہارنپور
۲۰۔ مولوی احمد علی صاحب کاغل
۲۱۔ مولوی محمد صاحب چاٹگام
۲۲۔ مولوی نور حسین صاحب اڈرانہ ضلع جہلم
۲۳۔ مولوی عبید الحق صاحب موہن پور
۲۴۔ حکیم محمد یوسف صاحب بجنور
۲۵۔ حکیم نور احمد صاحب کانپور
۲۶۔ مولوی عبد الرحمٰن صاحب بھرا
۲۷۔ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب اعظم گڑھ
۲۸۔ منشی محمد سلطان صاحب مدراس
۲۹۔ حاجی محمد مصطفیٰ صاحب۔ خورجہ

۳۰- مولوی محمد عیسیٰ صاحب بنارس

۳۱- مولوی شاہ لطف رسول صاحب فتح پور ضلع بارہ بنکی

۳۲- حافظ محمد عمر صاحب ہنڈوری۔ مقیم علی گڑھ

۳۳- شیخ معشوق علی صاحب قنوجی

۳۴- مولوی محمد صادق صاحب مالیگاؤں۔ ضلع ناسک۔

۳۵- مولوی رحیم بخش صاحب مقیم دہلی

۳۶- مولوی عبدالحی صاحب سہارن پور مقیم حیدرآباد

۳۷- خیرات احمد خاں صاحب بونا ضیا ضلع گیا

۳۸- مولوی ابوالحسن صاحب جونپور

۳۹- حاجی محمد یوسف صاحب رنگون

۴۰- مولوی ابوبکر صاحب ارکانی

۴۱- سید فیروز شاہ صاحب مندوری ضلع پشاور

۴۲- مولوی عبدالمجید صاحب شاہجہان پور

۴۳- مولوی عبدالرحمٰن صاحب بریلوی۔ مدرس مدرسہ اشاعت علوم بریلی

۴۴- مولانا سید سلیمان ندوی۔ مورخ اسلام اعظم گڑھ

(ب) اسمائے گرامی مجازین صحبت جو طلاع موت پہنچ کر اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو چکے ہیں

۱- حافظ علی نظر بیگ صاحب مغلپورہ کہنہ مرادآباد

۲- مولوی عبدالرحمٰن صاحب وکیل پٹنہ

۳- مولوی محمود الحق صاحب وکیل بردولی

۴- مولوی انوار الحسن صاحب آنریری مجسٹریٹ کاکوری ضلع لکھنؤ

۵- ماسٹر مظہر احمد صاحب محلہ فتح گڑھ بھوپال

۶- حافظ زاہد حسن صاحب امروہوی۔ کرہ رانی کھیت

۷- مولوی محمد طاہر صاحب دارالعلوم دیوبند

۸- مولوی ابوالفضل نور محمد صاحب صدر مدرس دینیات حیدرآباد دکن

۹- حاجی داؤد ہاشم صاحب پارک لین۔ رنگون

۱۰۔ منشی عبدالحمید صاحب تحصیلدار پنشنر۔ مقبول گنج۔ لکھنؤ
۱۱۔ حکیم فیاض علی صاحب مقیم نصر اللہ گنج۔ گورنمنٹ بھوپال
۱۲۔ قاضی محمد مصطفےٰ صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر بھدرتی اسٹیٹ بنارس
۱۳۔ میر امام الدین صاحب محاسب صدارت العالیہ حیدرآباد دکن
۱۴۔ مولوی عبدالمجید صاحب مدرس مدرسہ ناصر العلوم۔ گھوسی ضلع اعظم گڈھ
۱۵۔ مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی، مدرسہ حقانیہ شاہ آباد کرنال
۱۶۔ مولوی سید حسن صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند
۱۷۔ مولوی عبدالغنی صاحب رسولی، ضلع بارہ بنکی

فیض رساں مجازین

(ج) اسماء گرامی خلفاء مجازین بیعت جو چشمۂ فیضِ اشرفیہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

۱۔ مولوی عبدالغنی صاحب مہتمم مدرسہ روضۃ العلوم پھولپور۔ ضلع اعظم گڈھ
۲۔ حاجی فقیر محمد صاحب گھوٹکی۔ ضلع سکھر (مہاجر مدینہ طیبہ)
۳۔ مولوی افضل علی صاحب کھلواڑہ۔ ڈاکخانہ کپیلا ضلع بارہ بنکی
۴۔ مولوی حبیب اللہ صاحب سکھر
۵۔ مولوی واحد بخش صاحب مدرس اول، مدرسہ عربیہ احمد پور شرقیہ ریاست بہاول پور
۶۔ سید فخر الدین شاہ صاحب گھوٹکی، ضلع سکھر (سندھ)
۷۔ مولوی صغیر محمد صاحب مدرسہ عزیزیہ مغلٹولی شہر کمرلہ۔ بنگال
۸۔ مولوی عبدالمجید صاحب وزیرستان شمالی مقام ہرمز ڈاکخانہ عیدک۔ ضلع ڈور
۹۔ مولوی اطہر علی صاحب شہیدی مسجد کشور گنج ضلع میمن سنگھ
۱۰۔ مولوی عبدالوہاب صاحب ڈاکخانہ ہاٹ ہزاری موضع مدح اللہ پور ضلع چاٹگام
۱۱۔ ابوالبرکات صاحب مسجد محلہ نالہ ضلع سلطان پور (عوام کے لئے)
۱۲۔ مولوی نذیر احمد صاحب فاروق منڈی ضلع سرگودھا
۱۳۔ مولوی عبدالسلام صاحب موضع زیارت کاکا صاحب مسجد کلاں تحصیل نوشہرہ۔ ضلع پشاور
۱۴۔ مولوی محمد موسےٰ صاحب مدرس حرم نبوی باب النساء مدینہ منورہ (مہاجر مدنی)
۱۵۔ مولوی محمد سعید صاحب مقام کیرنور تعلقہ پنی ضلع مدراس

۱۶۔ مولوی نذیر احمد صاحب متوطن کیرانہ ضلع مظفر نگر حال خان جہان پور۔ ضلع کیرانہ
۱۷۔ مولوی مقصود اللہ صاحب مدرسہ امدادیہ خانقاہ اشرفیہ موضع تلگا سیہ ڈاکخانہ ادرا وتیہ ضلع پریسال
۱۸۔ مولوی وصی اللہ صاحب ندوا سرائے موضع فتحپور تال نرجا ضلع اعظم گڈھ
۱۹۔ مولوی محمد حسن صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد۔ لاہور۔
۲۰۔ مولوی سراج احمد خان صاحب امروہی محلہ چلہ امروہہ ضلع مراد آباد
۲۱۔ مولوی ممتاز احمد صاحب ڈاکخانہ بارا چٹی موضع سونڈھیا۔ گیا
۲۲۔ مولوی عبد الجبار صاحب ہارون آباد ریاست بہاول پور
۲۳۔ مولوی خیر محمد صاحب مہتمم مدرسہ عربی خیر المدارس۔ بیرون دہلی دروازہ ملتان شہر
۲۴۔ مولوی عبد الرحمٰن صاحب کاملپوری بہبودی ڈاک خانہ تک مالا۔ ضلع کیمل پور
۲۵۔ مولوی محمد طیب صاحب مہتمم مدرسہ دار العلوم دیوبند۔ ضلع سہارنپور
۲۶۔ مولوی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان۔ مہتمم دار العلوم نانک واڑہ کراچی
۲۷۔ مولوی محمد نبیہ صاحب ٹانڈہ بادلی ضلع مراد آباد
۲۸۔ مولوی محمد صابر صاحب محلہ گھیر مناف امروہہ ضلع مراد آباد
۲۹۔ نواب احمد علی خان صاحب محلہ قلعہ نوابان۔ سہارنپور
۳۰۔ مولوی عبد الرحمٰن صاحب منشی الہ ضلع الہ آباد
۳۱۔ ماسٹر قبول احمد صاحب اسسٹنٹ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سیتاپور
۳۲۔ مولوی جلیل احمد صاحب علی گڈھی مدرسہ جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور
۳۳۔ شہاب الدین صاحب خیاط کھتولی۔ ضلع میرٹھ
۳۴۔ مولوی مسیح اللہ خان صاحب مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد۔ ضلع مظفر نگر
۳۵۔ حافظ عنایت علی صاحب امام مسجد باجڑاں لدھیانہ (نعوام)
۳۶۔ مولوی نور بخش صاحب نواکھالی مدرسہ حمیدیہ پوسٹ بھیروا ہاٹ ضلع چاٹگام
۳۷۔ مولوی ولی محمد صاحب گرداسپوری مدرسہ آثار اولی صدر راولپنڈی
۳۸۔ مولوی اسعد اللہ صاحب رامپوری مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور
۳۹۔ مولوی حکیم الٰہی بخش صاحب اعوان محلہ ہزاری دروازہ شہر شکارپور ضلع سکھر۔ سندھ

۴۰۔ ماسٹر محمد شریف صاحب انگلش ٹیچر مکان ع ۷۰۹ نواں شہر ملتان چھاونی
۴۱۔ ماسٹر بشیر محمد صاحب کبیروالہ ضلع ملتان
۴۲۔ مولوی کفایت اللہ صاحب مدرس مدرسہ سعیدیہ جہن ہاٹ۔ شاہجہان پور
۴۳۔ مولوی حامد حسن صاحب امروہی مدرس مدرسہ عربی جامع مسجد تھانہ بھون
۴۴۔ حکیم فضل اللہ صاحب ٹنڈو ڈکار لیز۔ سندھ
۴۵۔ بابو عبدالعزیز صاحب ریٹائرڈ ہیڈ کلرک متصل مسجد ملک لال خان گوجرانوالہ
۴۶۔ مولوی رسول خان صاحب مدرس اورینٹل کالج لاہور۔ متوطن ہزارہ تحصیل مانسہرہ ڈاکخانہ شکیاری مقام اچھڑیاں
۴۷۔ مولوی محمد اللہ صاحب نواکھالی۔ مدرس مدرسہ اشرف العلوم۔ بڑا کٹرہ۔ ڈھاکہ
۴۸۔ حکیم مولوی عبدالحق خان صاحب ساکن کورٹ ضلع فتح پور ہسوہ
۴۹۔ محمود الغنی صاحب سہارنپوری کراچی
۵۰۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب ہومیو پیتھ۔ برنس روڈ۔ مقابل آگرہ ہوٹل۔ کراچی
۵۱۔ مولوی عبدالباری صاحب ندوی۔ شبستان قدم رسول۔ ہارڈنگ روڈ۔ لکھنؤ
۵۲۔ مولوی ابرارالحق صاحب مدرسہ اسلامیہ ہردوئی
۵۳۔ مولوی فقیر محمد صاحب معرفت حاجی محمد شریف صاحب صحاف ــ وکانداد موضع تری۔ قوم مہمند۔ یہ سرحد

(د) فہرست مجازین صحبت جو اشاعت طریق میں سرگرم عمل ہیں۔
۱۔ سعید احمد خاں صاحب بریرہ ڈاکخانہ بلرام ضلع ایٹہ
۲۔ شیخ محمد حسن صاحب الورباب ڈپو بندر روڈ کراچی
۳۔ منشی عبدالولی صاحب نائب ناظم ریاست کپور تھلہ معرفت کتب خانہ امداد الغربا سہارنپور
۴۔ شیخ عبدالکریم صاحب پنشنر سشن جج جوناگڑھ
۵۔ محمد جلیل صاحب پنشنر جج اعظم گڑھ
۶۔ منشی علی شاکر صاحب قانونگو۔ گولا ضلع کھیری کلیم پور
۷۔ محمد نجم احسن صاحب۔ وکیل۔ پرتاپ گڑھ
۸۔ مولوی منفعت علی صاحب وکیل $\frac{227}{5 بی}$۔ لیلی روڈ۔ صدر کراچی

۹- منشی علی سجاد صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر تھانہ بھون ضلع مظفر نگر
۱۰- حافظ محمد طٰہٰ صاحب کورٹ انسپکٹر گورکھپور
۱۱- خواجہ محمد صادق صاحب امرتسری (لاہور)
۱۲- منشی عبدالصبور صاحب نائب منشی حصہ اول ڈویژن دفتر نہر سارده شاہجہان پور
۱۳- بخشش احمد صاحب۔ مدرسہ سعیدیہ قاضی پور خورد۔ گورکھپور
۱۴- حافظ بقاء اللہ صاحب پانی پتی
۱۵- مولوی ظہور الحسن صاحب ناظم کتب خانہ امداد الغرباء سہارنپور
۱۶- مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب مدرسہ ٹنڈو الہ یار ضلع حیدرآباد سندھ
۱۷- مولوی سلطان محمود صاحب مدرس اول فتحپوری۔ دہلی
۱۸- حافظ محمد اسماعیل صاحب ولد حاجی جیون بخش محلہ بلیماراں۔ حویلی حسام الدین حیدر دہلی
۱۹- منشی محمد یعقوب صاحب کاکوری انگلش کلرک سررشتہ تعلیم رہتک
۲۰- مولوی عبدالصمد صاحب بنارسی مدرس کرنیل گنج۔ کانپور
۲۱- مولوی حمید حسن صاحب دیوبندی۔ مفتی ریاست مالیر کوٹلہ
۲۲- مولوی ریاض الحسن صاحب پوسٹ بکس ۳۰۷ مکہ مکرمہ
۲۳- حکیم محمد سعید صاحب گنگوہی۔ سرائے پیرزادگان۔ محلہ چوک گنگوہ۔ ضلع سہارنپور
۲۴- عبدالغفور صاحب ٹھیکیدار اشرف منزل۔ ہالی روڈ۔ جودھپور
۲۵- مولوی محمد داؤد یوسف محلہ تائی واڑہ۔ راندیر ضلع سورت
۲۶- مولوی محمد میاں صاحب نبیرہ مولانا محمد حسین صاحب دائرہ شاہ حجۃ اللہ۔ الہ آباد
۲۷- مولوی محمد یوسف صاحب بنوری کراچی
۲۸- علی ساجد صاحب ڈاکٹر ہاشمی ہومیوپیتھک۔ مولوی گنج لکھنؤ
۲۹- مولوی سعید احمد صاحب لکھنوی صدر مدرس مدرسہ تکمیل العلوم احاطہ کمال خان۔ کانپور
۳۰- سید مولوی عبدالکریم صاحب بمقام طوطہ کان ڈاکخانہ بٹ خیل مالاکنڈ ایجنسی براستہ مردان۔ صوبہ سرحد
۳۱- شیخ عبدالغفار صاحب رئیس گھوسی۔ ضلع اعظم گڑھ
۳۲- مولوی محمد نعیم صاحب بخاری ضلع بدخشاں۔ قصبہ ترگنی۔ ملک کابل

٣٣- مولوی سخاوت حسین صاحب مقام گوہانی پور۔ ڈاکخانہ رینگاڑہ۔ ضلع کٹک صوبہ اڑیسہ

٣٤- منشی عرفان احمد صاحب کاریک ڈاکخانہ تارگھر سہارنپور

٣٥- عزیز الرحمٰن صاحب نبیرۂ مولوی عبد الاحد صاحب مرحوم ملتیق منزل گلی چوڑی والان دہلی

٣٦- شفیق احمد صاحب گنگوہی مدرس مدرسہ سلیمانیہ۔ ہوا محل۔ بھوپال

٣٧- شاہ محمد صاحب طوطہ کان۔ ڈاکخانہ بٹ خیل مالاکنڈ ایجنسی۔ ضلع مردان

٣٨- خواجہ وحید اللہ صاحب پنشنر تارگھر سرکاری گڈھ باران ریاست کوٹہ۔ راجپوتانہ

٣٩- سید حسن صاحب ڈپٹی کلکٹر سید واڑہ نگرام۔ ضلع لکھنؤ

٤٠- مولوی مسعود علی صاحب شبلی منزل۔ اعظم گڑھ۔

٤١- مولوی حکیم عبد الرشید محمود صاحب انصاری۔ گنگوہ۔ ضلع سہارنپور

٤٢- مولوی حکیم محمد مسعود صاحب گنگوہی معروف بہ حکیم اجمیری۔ محلہ کھڑک بمبئی

٤٣- ماسٹر منظور احمد صاحب تحصیلی اسکول رڑکی۔ ضلع سہارنپور

٤٤- حکیم بہاؤ الدین صاحب ہردوئی محامد بورڈنگ ہاؤس

٤٥- ظفر احمد صاحب تھانوی ۲ ۵ ۴ اردو نیشن ہربنس روڈ۔ کراچی

٤٦- انوار احمد صاحب وکیل۔ ڈاکخانہ قدم کنواں۔ پٹنہ

٤٧- شفیع محمد صاحب قریشی پروفیسر گورنمنٹ کالج۔ حیدرآباد دکن

٤٨- شاہ محمد حلیم صاحب۔ فیض اللہ پور۔ ڈاکخانہ محمد پور۔ ضلع اعظم گڑھ

تصنیفات و خطبات

امدادِ الٰہی حضرت تھانوی کے تصنیفی کام پر "علم و ادب" کے باب میں بخوبی روشنی ڈالی جا چکی ہے اب ان کی تصنیفات و تالیفات اور خطبات و ملفوظات کی تفصیل پیش خدمت کی جاتی ہے۔ جو بظاہر ایک انسان کا نہیں بلکہ ایک بہت بڑے ادارہ یا اکاڈیمی کا کام نظر آتا ہے اور جس کی طویل فہرست آپ کے لئے موجب حیرت ہوگی۔ جیسا کہ خود صاحب سیرت کے لئے موجب حیرت ثابت ہوئی۔ ایک مرتبہ ایک خادم نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کا اتنی عمر میں اتنی کتابیں تصنیف کرنا تعجب معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا:-

"تالیف و تصنیف کے بعد اب میں بھی تعجب کرتا ہوں کہ مجھ سے اتنا کام کیسے ہو گیا اور تعجب کی ایک بات اور ہے کہ بعض اوقات بعض مضامین میرے لکھے ہوئے میری ہی سمجھ میں نہیں آتے۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ ایک جنگ میں ایک کافر پہلوان نے آ کر للکارا کہ کہاں ہیں ابوعبیدہ؟ میرے مقابلہ میں آویں! آپ نے جانے کا قصد کیا۔ تو لوگوں نے کہا کہ ہم حاضر ہیں۔ آپ اس دیو کے مقابلہ کو کیوں جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے مجھ کو غیرت آتی ہے۔ کیونکہ اس نے میرا ہی نام پکارا ہے۔ چنانچہ تشریف لے گئے۔ مقابلہ ہوا۔ دونوں جانب سے وار ہوئے۔ دفعتہً دیکھا کہ اس کا سر کٹا ہوا علیحدہ پڑا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ فرمانے لگے کہ حیرت ہے یہ کیسے ہوا عقل کام نہیں کرتی۔ اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى کہ یہ تو سب اللہ تعالیٰ کی امداد ہے بجز اس کی عنایت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

ایک اور صاحب نے حضرت کی تالیفات کی کثرت پر مدح و تعریف کی تو فرمایا کہ:-

"جو کچھ کام ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی امداد و توفیق سے ہوا ہے جس سے چاہا اپنا کام لے لیا اس میں بندے کی کیا تعریف ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہے۔ جیسے کسی منشی نے ایک بچے کے ہاتھ میں قلم دیکر اور اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے کر خوشخط لکھ دیا۔ اب بچہ خوش ہو رہا ہے کہ میں نے لکھا ہے۔ حالانکہ وہ منشی جی نے لکھا ہے"۔ (تالیفات اشرفیہ صفحہ ۶)

اسباب کثرت تالیفات

کثرت تالیفات کی . . . . . دوسری وجہ آپ نے یہ بیان فرمائی کہ:-

"میرے مزاج میں حرارت ہے۔ اس حرارت ہی کی وجہ سے اتنی حدت بھی ہے اگر دوسرے کا مزاج اتنا گرم ہو۔ تو وہ اتنا ضبط نہ کر سکے میں بہت ضبط کرتا ہوں اور اسی حرارت مزاج کا یہ بھی اثر ہے کہ اتنے تھوڑے سے زمانہ میں بحمد اللہ اتنی تصانیف ہو گئیں۔ ٹھنڈے مزاج والے سے اتنی تصانیف تھوڑا ہی ہو سکتی ہیں"۔

مزید فرمایا۔ اس میں حضرت حاجی صاحب کی دعا کا بھی اثر ہے۔ مکہ معظمہ میں حضرت مرشد علیہ الرحمۃ

کے حکم سے "تنویر" کا ترجمہ لکھا کرتا تھا۔ اور حضرت کو سنا بھی دیتا تھا۔ ایک بار حسب معمول سنایا تو حضرت نے دریافت فرمایا کہ کتنی دیر میں لکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اتنے وقت میں فرمایا۔ اتنے سے وقت میں تو کوئی بھی اتنا مضمون نہیں لکھ سکتا۔ اور بہت دعائیں دیں۔ میں نے ابھی (۱۲ ستمبر ۱۹۳۰ء تک کی) اپنی تصانیف کا شمار کیا۔ تو پانسو انتیس ہوئی ہیں۔ ان کو اس طرح شمار نہیں کیا کہ مثلاً تفسیر کی بارہ جلدیں ہیں۔ تو بارہ ہی شمار کر لی گئی ہوں بلکہ اس کو ایک ہی شمار کیا گیا ہے۔ ایک کتاب اور لکھ رہا ہوں۔ انشاء اللہ ۵۳۰ ہو جائیں گی۔

جدول مضامین ۱۲ ستمبر ۱۹۳۰ء کے بعد کی تصنیفات و تالیفات اور خطبات و القول الجلیل، ملفوظات اور کتب الفضائل کی تعداد نو سو سے زائد ہو جاتی ہے۔ اتنی کتب کے مضامین کا یاد رکھنا کہ کون سا مضمون کس کتاب میں ہے بڑا مشکل تھا۔ اور فوری حوالہ دینے کی جب ضرورت ہوتی۔ تو تلاش میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس مشکل کے حل کی آپ نے ایک عجیب ترکیب نکالی جس کی تفصیل آپ کے اس بیان میں ملتی ہے فرمایا کہ:۔

"میرا حافظہ ضعیف ہے۔ اپنا بعض ضروری مضمون تلاش کرتا ہوں کہ کس جگہ اور کس کتاب میں ہے۔ تو نہیں ملتا۔ اسلئے میں نے سب کتابوں کو دیکھ کر بطور یادداشت کے ایک جدول بنائی ہے۔ تاکہ اس کو دیکھ کر کتاب میں نکال لوں جو جدول جدید مضامین کی ہے۔ اس کا نام "غرائب الرغائب" ہے۔ یہ مطبوع بھی ہے اور دوسری جدول جو قدیم مضامین کی ہے۔ اس کا نام "الکلام الدالۃ علی الحکم الفعالۃ" ہے۔ اگر انہیں مضامین کو ایک جگہ جمع کرتا۔ تو محنت ہوتی اور خرچ بھی پڑتا۔ اب کوڑیوں میں کام نکل گیا۔ بلکہ کوڑی بھی صرف نہیں ہوئی۔"

اہمیت و افادیت تصنیف و تالیف ... کوئی آسان کام نہیں ہے اور امور دین و اسلام کے متعلق کتب لکھنا تو اور بھی مشکل کام ہے کیونکہ اس سلسلہ میں خفیف سی لغزش۔ کوتاہی اور تسامح کے نتائج بہت ہی مضرت رساں نکلتے ہیں۔

کسی کتاب کی تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں مصنف یا مؤلف کو جن جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کا قارئین کرام کو قطعاً اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اتنی کثیر کتب کے مصنف کو کن حالات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ صرف "حیات المسلمین" کی تفصیل سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ:۔

"یہ کتاب ان اعمال کی فہرست ہے کہ جن سے یقینی طور پر دنیا کی بھی فلاح حاصل ہوگی اور دین کی بھی۔ میں نے اس کو بہت سوچ سوچ کر لکھا ہے۔ اس کے لکھنے میں مجھ کو تعب ہوا ہے میں اول اس کے مضامین لکھتا تھا۔ پھران کو سہل کرتا تھا۔ اسکے بعد دیکھتا تھا۔ اگر کم سہل ہوئے تو پھر دوبارہ سہل کرتا تھا۔ اور ہر ماہ میں اس کے دو ورق لکھا کرتا تھا۔ اور وہ دو ورق بھی بعض مرتبہ کئی کئی بار کے مسودے ہی لکھے جاتے تھے لوگ اس کو اردو میں دیکھ کر بے وقعت سمجھتے ہیں۔ اس کی قدر ان علماء کو ہو سکتی ہے جو حدیث شریف پڑھاتے ہیں۔ وہ دیکھیں گے کہ کون سا اشکال کہاں پر کس ذرا سے لفظ سے حل ہو گیا ہے۔"

گو حضرت کی کتابیں بے شمار ہیں اور ہر موضوع پر ہیں مگر اگر انسان خلوص کے ساتھ کسی ایک کتاب پر بھی عمل کر لے۔ تو دینی اور دنیوی صلاح و فلاح یقینی ہے۔ چنانچہ حضرت فرماتے تھے کہ:-

"اگر مناسبت ہو جائے تو انہیں کتابوں کو لے کر بیٹھ جاوے۔ عمر بھر کے لئے رہبری کے واسطے کافی ہیں۔ مثلاً "قصد السبیل"۔ "تعلیم الدین"۔ "تربیت السالک" وغیرہ۔"
(ملفوظ مورخہ ۲۸ شوال ۱۳۴۴ھ)

اسی طرح "حیات المسلمین" کے متعلق فرمایا کہ:-

"مجھ کو اپنی کسی تصنیف کے متعلق یہ خیال نہیں ہے کہ یہ میرا سرمایۂ نجات ہے۔ البتہ "حیات المسلمین" کے متعلق میرا غالب خیال قلب پر یہ ہے کہ اس سے میری نجات ہو جائے گی۔ اس کو میں اپنی ساری عمر کی کمائی اور ساری عمر کا سرمایہ سمجھتا ہوں۔"
(تالیفات اشرفیہ صلک)

مواعظ کے متعلق فرمایا کہ:-

"لوگ مواعظ نہیں دیکھتے۔ حالانکہ ان میں سب کچھ ہے۔ گو وہ چھپے ہوئے ہیں مگر چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں وہی باتیں ہیں۔ جو علماء و صلحاء کی کتابوں میں ہیں کوئی جدید بات نہیں ہے۔ صرف زمانہ کا لحاظ ہے۔ جو شیخ الرئیس کے نسخے ہیں۔ وہ بعینہ حکیم محمود خاں صاحب کے زمانہ میں کام نہیں آتے۔ وہاں قدح بھر دوائیں ہوتی تھیں یہاں مختصر سے کام لیا جانے لگا۔" (ملفوظ مورخہ ۶ ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ)

تردید و تنقید | حضرت کی تحریروں میں دوسرے فرقوں کا براہ راست رد نہ ملے گا۔ جیسا کہ آپ

کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ :۔

"میں نے قصداً کسی کا رد نہیں لکھا۔ نہ اہل تشیع۔ نہ قادیانی نہ غیر مقلدین۔ نہ اہل بدعت کا۔ البتہ جس کسی نے کسی کے متعلق سوال کیا۔ اس کا جواب لکھ دیا۔ اور مجھ کو یاد نہیں رہتا کہ کس کے متعلق کیا لکھا ہے"۔ (ملفوظ مورخہ ۲۲ صفر ۱۳۵۲ھ)

آپ نے اپنی کسی کتاب پر تقریظ نہیں لکھوائی۔ کیونکہ آپ فرماتے تھے کہ :۔

"میں نے اپنی تالیف پر کسی سے تقریظ لکھوانے کی کوشش نہیں کی۔ تحریر موجود ہے۔ دیکھ لو۔ تقریظ کی کیا ضرورت ہے"۔

موضوع تصنیف | حضرت تھانوی نے مختلف موضوعات پر حسب ذیل کتابیں لکھیں :۔

علم القرآن | (۱) ترجمہ قرآن (۲) تفسیر بیان القرآن در ۱۲ جلد (۳) جمال القرآن (۴) تجوید القرآن (۵) آداب القرآن (۶) یادگار حق القرآن (۷) تشابہات القرآن (۸) ظہور القرآن (۹) اصلاح ترجمہ دہلویہ (۱۰) اصلاح ترجمہ حیرت (۱۱) التواجہ ما یتعلق بالتشابہ (۱۲) دفع الخلاف فی حکم الاوقاف (۱۳) سبق الغایات فی نسق الآیات (۱۴) تصویر المقطعات لیسیر بعض العبادات (۱۵) وجوہ المثانی (عربی) (۱۶) زیادات علیٰ کتب الروایات (۱۷) ذبابات لما فی الزیادات (۱۸) تنشیط الطبع فی اجراء السبع (۱۹) تقریر بعض البنات (۲۰) رفع البنان فی نفع السماء (۲۱) احسن الاثاث فی النظر الثانی (۲۲) التقصیر فی التفسیر (۲۳) الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان (۲۴) تمہید الفرش فی تحدید العرش (۲۵) تبعیر الزجاج

علم الحدیث | (۱) جامع الآثار (۲) تابع الآثار (۳) حفظ اربعین (۴) المسک الذکی (۵) الثواب الجلی (۶) اختیار الفتن (۷) موخرۃ الظنون (۸) الادراک والتواصل الیٰ حقیقۃ الاشتراک والتوسل

عقاید | (۱) الکبیر فی اثبات التقدیر (۲) فروع الایمان (۳) حفظ الایمان (۴) بسط البنان (۵) تغییر العنون فی بعض عبارات حفظ الایمان (۶) احکام التجلی (۷) ظہور العدم بنور القدم (۸) طلوع البدر فی سطوح القدر (۹) فتح المجیب فی حق الغیب (۱۰) نموذج لبعض معتقدات ابن العوج (۱۱) نافع الاشارہ الیٰ منافع الاستخارہ (۱۲) جزاء الاعمال (۱۳) احکام الایمان

عبادات | (۱) القول البدیع (۲) زکوٰۃ الفرض (۳) مراج الذیت (۴) الساعات للطاعات (۵) تعلیم الدین (۶) حیات المسلمین (۷) باب الریان (۸) بیت الدیان (۹)

عیش الحیات (۱۰) الخطب الماثورہ (۱۱) خطبات الاحکام (۱۰) کلمۃ القوم فی حکمۃ الصوم

تصوف (۱) دخول وخروج برنزول وعروج (۲) قصد السبیل (۳) تعلیم المطالب (۴) رفع الشکوک (۵) مسائل السلوک (۶) التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف چہار حصے (۷) تکمیل التصرف (۸) ملخص الانوار وداب التجلی (۹) مسائل مثنوی (۱۰) حقیقت الطریقت (۱۱) النکت الدقیقہ (۱۲) التکشف عن مہمات التصوف (۱۳) تائید الحقیقۃ (۱۴) انوار الوجود فی اطوار الشہود (عربی) (۱۵) التجلی التجلی العظیم فی احسن تقویم (۱۶) حق السماع (۱۷) کلید مثنوی (۸ جلد) (۱۸) عرفان حافظ (۱۹) معارف العوارف دو حصے (۲۰) مغارف المعارف (۲۱) الا نتباہ لاہل الاصطفاء (۲۲) تربیت السالک (۲۳) الجلاء والتوف فی الرضا والخوف (۲۴) ارضی الاقوال (۲۵) انظار المنظر فی آثار المظہر (۲۶) التیم فی السم (۲۷) العلم فی السم (۲۸) رفع الضیق عن اہل الطریق۔ (۲۹) البصائر فی الدوائر (۳۰) الرفیق فی سواء الطریق دو حصے (۳۱) شمس الفضائل لطمس الرذائل (۳۲) لامع علامات الاولیاء (۳۳) التحریض علی مالح التعریض (۳۴) الارشاد الی مسئلۃ الاستعداد (۳۵) شجرۃ المراد (۳۶) الصمصمہ فی حکم الوسوسہ (۳۷) الاعتدال فی متابعۃ الرجال (۳۸) القول الفصل فی بعض آثار الوصل (۳۹) تمییز العشق من الفسق (۴۰) مثنوی زیر وبم (۴۱) دونلے مثنوی (۴۲) حسن العلاج لسوء المزاج (۴۳) اصلاح المزاج

منطق (۱) تلخیص المرقات (۲) تلخیص الشرلیفیہ (۳) تسہیل المعانی (۴) تلخیص المنار (۵) المدار (۶) درایۃ العصمۃ (۷) تلخیص ہدایۃ الحکمۃ (۸) تلخیص البدایۃ (۹) تذییل شرح عقائد۔ (۱۰) عشرہ طرد سس (یہ سب عربی میں ہیں) (۱۱) تیسیر المنطق

علم الکلام اقامۃ الطامہ علی زاعم (۲) الانتباہات المفیدہ (۳) تعلیم الدین مع تکمیل الیقین (۴) المصالح العقلیہ ۳ جلد (۵) الخطاب الملیح فی تحقیق المہدی والمسیح (۶) قائد قادیان (۷) القول الفاصل (۸) المناویب لمن لیس لہ (۹) التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی (۱۰) ارسال الجنود الی ارسال الہنود (۱۱) تقلیف الثمرات فی تخفیف السطرات (۱۲) المفتوح فیما یتعلق بالروح (۱۳) الحق (۱۴) تقدیس القدسی عن تدلیس اللبسی (۱۵) نہایت الادراک فی اقسام الاشراک (۱۶) عمارۃ العالم بامارۃ الآدم (۱۷) بلوغ الغایۃ فی تحقیق خاتم الولایۃ (۱۸) حفظ الحدود لحقوق الجدود (۱۹) التعیم فی الجحیم (۲۰) رفع الرحمۃ من وسع الرحمۃ (۲۱) الکلمۃ التامہ فی النبوۃ العامہ (۲۲) تدویر الفلک فی تطہیر الملک (۲۳) القول الانفع فی تحقیق امکان الابدع (۲۴) نعم العون فی تحقیق توبۃ فرعون۔

(۱۶ سے ۲۴ تک سب عربی میں ہیں) (۲۵) القطر المثیل المعصر الجدید

اصلاحیات تصحیح العلم فی تقبیح النظم (۲) تحقیق تعلیم انگریزی (۳) تحقیق الفرید فی حکم التقریب الصوت البعید (لاؤڈ سپیکر) (۴) تفصیل الکلام فی حکم تقبیل الابہام (۵) اصلاح المعتوہ فی تعریف الحرام والمکروہ (۶) اصلاح الرسوم (۷) اصلاح الخیال (۸) اصلاح انقلاب وحصہ (۹) آداب المعاشرت (۱۰) آداب الاخبار (۱۱) اخبار بینی (۱۲) افکار دینی (۱۳) فیصلہ ہفت مسئلہ (۱۴) نصیحت نامہ بجواب وصیت نامہ (۱۵) علاج الخیال بجادہ تقیبی (۱۶) شذرات الحکم (۱۷) المذاہب (۱۸) اغلاط العوام (۱۹) تسہیل الطریق

سیاسیات (۱) الروضۃ المناظرہ (۲) حکایات الشکایات (۳) الصحف المنشورہ فی فضائل المائۃ انگورہ (۴) معاملۃ المسلمین (۵) صیانۃ المسلمین (۶) ضم فساد اہل فی ذم فساد اہل (۷) المحفوظ الکبیر للحافظ الصغیر (۸) احقر کے مسلک کی شرح (۹) احکام اتلاف (۱۰) تحذیر دیوبند (۱۱) تلبیس العراک فی تصحیح اشتراک (ہڑتال) (۱۲) الشکر والدعا النصر بالمنصر لیوم اللقاء۔

معاملات (۱) صفائی معاملات (۲) الحق الصراح فی تحقیق اجرت النکاح (۳) التوریع عن فساد التوریع (چندہ) (۴) دافع الفتاک عن منافع البنک (سود بنک) (۵) کشف الغشوعن وجہ الرشوۃ (رشوت) (۶) تحذیر الاخوان عن الربوا (سود) (۷) جلائل الانبار (۸) آداب المعاشرت (۹) رد القواعد فی طلاق ذات التعدد (۱۰) الخطوب المذہبہ للقلوب المنیبہ (۱۱) تحقیق التشبہ باہل السفاح لمن لا یرید اداء المہر فی النکاح (۱۲) تعدیل اہل الدہر فی درجۃ تقابل المہر (۱۳) الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد

تذکار (۱) نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب (یہ اب حبیب خدا کے نام سے شائع ہوئی ہے) (۲) شمیم الطیب (۳) یاد یاراں (ذکر محمود) (۵) خوان خلیل (۶) الترتیب اللطیف فی قصہ الکلیم والحنیف (۷) سیدنا یوسف (۸) تعلیم الطالب شجرہ طیبہ چشتیہ عالیہ (۹) السنۃ الجلیلہ فی الچشتیہ العلیہ (۱۰) یادگار دربار پرانوار حضرت خواجہ اجمیریؒ (۱۱) حکایات موعظت (۱۲) انوار المحسنین (۱۳) احسن التنظیم لمقولہ سیدنا ابراہیمؑ (۱۴) تحسین دار العلوم تزئین انوار النجوم (۱۵) شریف الدرایات

اذکار (۱) خیر الدلالہ (۲) القول الصحیح فی تحقیق دوازدہ تسبیح (۳) اوراد رحمانی (۴) الاستبصار فی فضل الاستغفار (۵) قربات عند اللہ وصلوٰۃ الرسول (۶) تتمہ قربات عند اللہ

(۷) طریقہ مولد شریف (۸) زاد السعید فی الصلوات علی النبیؐ (۹) امواج طاب (۱۰) مناجات مقبول ترجمہ قربات

فتاوی (۱) امداد الفتاوی جلدیں اولین (۲) امداد الفتاوی جلدیں اخرین (۳) تتمہ اولی وثانیہ امداد الفتاوی (۴) تتمہ ثالثہ امداد الفتاوی (۵) تتمہ اربعہ امداد الفتاوی (۶) امداد الفتاوی تتمہ (۷) حوادث الفتاوی تتمہ (۸) فتاوی اشرفیہ اول (۹) فتاوی اشرفیہ دوم (۱۰) فتاوی اشرفیہ سوم (۱۱) تتمہ خامسہ امداد الفتاوی (۱۲) اکمل الادیان فی اسہل اللسان (۱۳) الفصل المحرم فی فصل الحرم (۱۴) مسائل اہل الخطہ (۱۵) القول الدہلی (۱۶) اعذار الجنتہ

اسلامیات (۱) درجہ الحسام من اشاعت الاسلام (۲) حقوق الاسلام (۳) حقوق العلم (۴) ارشاد الہائم فی حقوق البہائم (۸) شہادۃ الاقوام (۶) آداب المساجد (۷) تنویر السراج (۸) تعدیل حقوق الوالدین (۹) شوق وطن (۱۰) تنبیہات وصیت (۱۱) خلل صفر (۱۲) العذر والنذر (۱۳) الاستحضار للاعتضار (۱۴) وصل السبب فی فصل النسب (۱۵) بیان الوفود فی اعوان ابن سعود (۱۶) اخبار اہل المجد عن آثار اہل النجد (۱۷) بہشتی گوہر (۱۸) بوادر النوادر (۱۹) الانسداد لفتنۃ الارتداد

نسائیات (۱) بہشتی زیور دس حصے (۲) بہشتی جوہر (۳) اصلاح النساء (۴) دفع الارتیاب عن مسئلہ ثبوت الانساب (۵) کسوۃ النسوۃ (۶) ثبات الستور (۷) الفار السکینہ (۸) الحیلۃ الناجزہ (۹) القول الصواب فی مسئلہ الحجاب (۱۰) کثرۃ الازواج

عملیات (۱) التقی فی احکام الرقی (۲) اعمال قرآنی (۳) خواص فرقانی (۴) آثار تقیا فی

متفرقات (۱) اسکات المنکر لآفات المسکر (۲) تعدیل التقویم (۳) ترجیح الراجح (۴) کرامات امدادیہ (۵) امداد المشتاق (۶) سوادخوری (۷) الطرائف والظرائف (۸) زوال السنہ فی اعمال السنہ (۹) نیل الشفا بنعل المصطفیٰ (۱۰) نصح الاخوان فی حروف الزمان (۱۱) القول الاحکم (۱۲) الحکم الحقانی (۱۳) صدق الرویا (۱۴) التراب السراب (۱۵) بناء القبہ (۱۶) خاتمہ بالخیر (۱۷) تنشیف الاسمار (۱۷) لوح الالواح (۱۸) عبرۃ البرادی (۱۹) المنتخب من المخطب (۲۰) الکلم الدالہ (۲۱) موائد العوائد (۲۲) غرائب الرغائب (۲۳) الرق المنشور (۲۴) جمع الصکوک فی قمع الشکوک (۲۵) چار جوئے بہشت (۲۶) تحقیق دار العلوم (۲۷) الکلم الطیب (۲۸) جزل الکلام فی عزل الامام (۲۹) سابعہ سیارہ (۳۰) تفسیری بشرح کلام نظیری (۳۱) تفایات العیب

(۲۲) اتہ درس (۲۳) اللطائف للطائف (۲۴) امثل الاقوال لافاضل الرجال (۲۵) دفع الاغلاط (۲۶) تفصیل محوذ بیت (۲۷) الشوارق فی الخوارق۔

مکتوبات (۱) خطاب الندوہ (۲) خطوط نوبی (۳) المعلومات الارشادیہ (۴) مکتوبات امدادیہ (۵) ضیاء الافہام (۶) مکتوب محبوب القلوب (۷) مکتوبات خیرت

ملفوظات (۱) کمالات امدادیہ (۲) المتن الامدادی (۳) حسن العزیز چہار حصہ (۴) مقالات حکمت (۵) مجادلات معدلت (۶) مزید المجید (۷) مجالس الحکمت (۸) مقالات حسنہ (۹) الطاحون (۱۰) القول الجلیل (۱۱) السلسبیل لعابری السبیل (۱۲) القطائف من اللطائف (۱۳) ملفوظات خیرت (۱۴) الملفوظات (۱۵) محفوظات (۱۶) جدید ملفوظات (۱۷) ریاض الفوائد (۱۸) حکم الحکیم (۱۹) ارشاد الرشید (۲۰) الافاضات الیومیہ (۲۱) ادب الاعتدال (۲۲) ادب الطریق (۲۳) ادب الترک (۲۴) ادب العشیر (۲۵) ادب الاسلام (۲۶) ادب الاعلام (۲۷) ملفوظات بتعلم حافظ صغیر احمد (۲۸) خیر الحضور فی الکانپور (۲۹) خیر العبور فی سفر گورکھپور (۳۰) خیر المحدور (۳۱) سفرنامہ پانی پت (۳۲) ذم الخلائق (۳۳) الصناعات فی العبارت (۳۴) المفتاح المعنوی (۳۵) فیوض الخالق (۳۶) نیل المراد (۳۷) سفرنامہ دیوبند (۳۸) سفرنامہ کوٹہ (۳۹) فضل العزیز (۴۰) رحمتہ العزیز دو جلد (۴۱) بصر الناظر (۴۲) ناظر الباطر (۴۳) انوار الحقائق (۴۴) وصیتہ الوصی (۴۵) حسن یوسف دو حصہ (۴۶) بزم جمشید (۴۷) فرائد الفوائد (۴۸) علو النازل (۴۹) نظر عنایت (۵۰) جبر الکبیر (۵۱) رحمت اعظم (۵۲) اسعاد الاسعد (۵۳) خیر الاختبار فی خیر الاختیار (۵۴) سفرنامہ گنگوہ (۵۵) کلمۃ الحق دو جلد (۵۶) سنتہ المعصوم (۵۷) جبر الکبیر (۵۸) فیوض الخالق (۵۹) اسعاد الطالبین (۶۰) تصحیح الخیال (۶۱) کلام الحسن (۶۲) ارمغان عید (۶۳) دنیا کی پستی اور دین کی مستی (۶۴) پیرایۂ ہستی۔

تفصیل المواعظ حضرت تھانویؒ کے جو مواعظ ضبط تحریر میں لائے گئے۔ ان کی موضوع وار تفصیل درج ذیل ہے۔

اتباع و تقلید (۱) حیات طیبہ (۲) طاعت الاحکام (۳) حق الاطاعتہ (۴) الغالب للطالب (۵) سبیل السعید (۶) الرحیل الی الخلیل (۷) اتباع المنیب (۸) الشریعۃ (۹) سلوٰۃ الحزین (۱۰) سنت ابراہیم (۱۱) الاتباع (۱۲) اعانتہ للتقوٰی (۱۳) التقوٰی (۱۴) طریق القرب (۱۵) العزت (۱۶) شرائط الطاعت (۱۷) سلوٰۃ الحزین۔

(٧) راحت القلوب (٨) القاف (٩) الاسعاد والابعاد (١٠) رطوبت اللسان

دین ودنیا | (١) منزلة الاعتنا بالدین (٢) منزلة العلم بالدین (٣) منزلة العمل بالدین (٤) الدین الخالص (٥) نفی الحرج (٦) ملت ابراہیم (٧) تفصیل الدین (٨) الحیوة (٩) تاسیس البنیان (١٠) الرضا بالدنیا (١١) متاع الدنیا (١٢) مظاہر المآل (١٣) الفانی (١٤) غریب الدنیا (١٥) الاطمینان بالدنیا (١٦) الدنیا (١٧) الکمال فی الدین للرجال

دار الآخرت | (١) تذکیر الآخرت (٢) الدنیا والآخرة (٣) ہم الآخرت (٤) المراد (٥) ترجیح الآخرت (٦) سبیل النجاح (٧) دار المسعود (٨) تجارت آخرت (٩) دیار اللقاء

دعا ودوا | (١) جہات الدعا دو حصے (٢) الافاضة فی معنی الاجابة (٣) نشر الرحمة (٤) الدعاء (٥) دوا العیوب (٦) علاج العرض (٧) الافتتاح (٨) علاج الکبر (٩) حب العاجلة (١٠) الخضوع (١١) الغضب (١٢) غوائل الغضب (١٣) المرض (١٤) اوج قنوج

رد بدعات | (١) تقویم الزیغ (٢) خصائل الجاہلیة (٣) نقد اللبیب فی عقد الحبیب (٤) الحضور الامور الصدور۔

حدود وحقوق | (١) خیر الارشاد فی حقوق العباد (٢) اصلاح الیتامٰی (٣) رمضان فی رمضان (٤) حرمات الحدود (٥) الحدود والقیود (٦) العبد الربانی (٧) حقوق البیت (٨) التبشیر (٩) الاسراف (١٠) کف الاذٰی (١١) حقوق السراء والضراء (١٢) حقوق المعاشرت (١٣) حفظ الحدود (١٤) حقوق القرآن (١٥) الوقت (١٦) الباب لاولی الالباب (١٧) النفقات فی الاوقات (١٨) الفتر (١٩) الرغبة المرغوبة (٢٠) التبشیر

خیر وشر | (١) عمل الذرة (٢) ایثار الیتامٰی (٣) الانسداد للفساد (٤) الظلم (٥) مفتاح الخیر (٦) التعاون علی الخیر

خوف وخشیت | (١) خواص الخشیت (٢) مواعظ اشرفیہ کانپور (٣) العلم والخشیة (٤) مواعظ اشرف (میرٹھ) (٥) ثمرات الخوف

حرص وہوس | (١) ذم الہوٰی (٢) منازعة الہوٰی (٣) الہوٰی (٤) الہوٰی والہدٰی

حج وقربانی | (١) ترغیب الاضحیة (٢) تعظیم الشعائر (٣) روح الحج والثج (٤) السوال فی شوال (٥) العبرة بذبح البقرة (٦) تکمیل الانعام فی صورة ذبح الانعام (٧) الحج المبرور (٨) الحج (٩) روح الارواح

صبر و شکر
(۱) الصبر (۲) حقیقۃ الصبر (۳) ماہیۃ الصبر (۴) الاجر النبیل فی صبر الجمیل (۵) الجبر بالصبر (۶) الصبر والصلوٰۃ (۷) الصبر بالصبر (۸) الشکر (۹) تحقیق الشکر (۱۰) شکر المثنوی (۱۱) النعم المرغوبہ (۱۲) شکر النعمۃ (۱۳) عمل الشکر (۱۴) شکر العطا

صوم و صلوٰۃ
(۱) تطہیر رمضان (۲) اکمل الصوم والعید (۳) احکام العشر الاخیرہ (۵) ندا رمضان (۶) الصیام (۷) شعبان فی الشعبان (۹) روح الجوار (۱۰) روح الافطار (۱۱) عصم الصنوف عن رغم الالوف النسوان فی رمضان (۱۲) اجر الصیام (۱۳) اجر الصیام بلا انعدام (۱۴) اکمال العدۃ (۱۵) اصلاحات فی الصلوٰت (۱۶) تحصیل المرام (۱۷) الیسر مع العسر (۱۸) الصلوٰۃ (۱۸) مثلث رمضان (۱۹) التہذیب چھ حصے (۲۰) العتق من النیران

صحبت بزرگاں
(۱) دماۃ الامت وبداۃ الملت (۲) تتمہ الملک (۲) اختیار الخلیل (۳) فوائد الصحبت (۵) انوار السراج (۶) البصیر بالبشیر

سلوک و تصوف
(۱) تقلیل الطعام (۲) تقلیل المنام (۳) تقلیل الکلام تقلیل الاختلاط (۵) التحصیل والتسہیل (۶) المرابط (۷) طریق القلندر

عبادت
(۱) العبادۃ (۲) آثار العبادۃ (۳) اسرار العبادۃ (۴) اصل العبادۃ (۵) اول الفضلۃ (۶) علو العبادۃ

علم و عمل
(۱) طلب العلم (۲) تعلیم البیان (۳) نور الصدور (تعظیم العلم مع تقسیم العلم (۵) تعمیم التعلیم (۶) کوثر العلوم (۷) الفاظ القرآن (۸) وعظ استغنا العی السوال (۹) الفار الجاذفہ (۱۰) فطار الاحوان (۱۱) التواصی بالحق (۱۲) الفصل والانفصال (۱۳) الاکرثیہ بالاعلمیۃ والاصابیۃ (۱۴) الجناح (۱۵) شرط التذکیر (۱۶) تجارۃ الامثال تعدد الاعمال (۱۷) تعدد الامثال (۱۸) تکمیل الاعمال۔ (۱۹) اول الاعمال (۲۰) آخر الاعمال (۲۱) ضرورۃ العلماء (۲۲) العمل للعلماء

عیدین
(۱) لوح الصیام (۲) الفطر (۳) لمود العید (۴) عود العید (۵) العید والوعید

میلاد النبی
(۱) الظہور (۲) السرور (۳) الحبور للنور الصدور (۴) الشذور فی حقوق الیدور (۵) نور النور (۶) المولد الفرحی فی المولد البرزخی (۷) الرحمۃ علی الامۃ

مال و جاہ
(۱) احکام المال (۲) مظاہر الاموال (۳) انفاق المحبوب (۴) المال والجاہ (۵) خیر المال للرجال (۶) خیر الاثاث للاناث (۷) احکام الجاہ

مضار المعصیۃ
(۱) استخفاف المعاصی (۲) ترک المعاصی (۳) مضار المعصیۃ (۴) ترجیح المفسد (۵) الکاف

مصیبت و راحت (۱) تادیب المصیبۃ (۲) التنبیہ (۳) التیسیر المتیسیر (۴) التراحم فی التراحم (۵) الامتحان (۶) الجلار للابتلاء (۷) الجلاء عن البلاء

محبت و مودت (۱) مواسات المصابین دو حصے (۲) آثار المحبت (۳) وحدت الحب (۴) اسباب الفتنۃ (۵) المودۃ الرحمانیہ

موت و حیات (۱) ذکر الموت (۲) خیر الحیات والممات (۳) التثبیت بر اقبۃ المیت (۴) یقظۃ النائم

فضائل (۱) فضائل العلم والخشیۃ (۲) فضل العلم والعمل (۳) شعبان (۴) راس الربیعین (۵) التعمیم التعلیم القرآن الکریم (۶) اسباب الفضائل (۷) الجمعین بین النفعین (۸) الفتنۃ (۹) الفضل العظیم (۱۰) الضحایا (۱۱) اشرف العلوم (۱۲) شب مبارک (۱۳) روز مبارک (۱۴) ماہ مبارک۔

نسوانیات (۱) صلاح النسوان (۲) الباقی (۳) العفۃ (۴) الکمال فی الدین للنساء (۵) الاستماع والاتباع (۶) غایۃ النجاح فی آیۃ النکاح (۷) رفع الالتباس (۸) برکت النکاح۔ (۹) کسار النساء

متفرقات (۱) اصلاح ذات البین (۲) الخیانت (۳) حقوق اللقاء (۴) الصلاح والاصلاح۔ (۵) تحریم المحرم (۶) نیل البر (۷) اقسام الربا (۸) جمال یوسف (۹) الطاعون (۱۰) الاستعداد (۱۱) الولایت (۱۲) الاستعداد (۱۳) العاقلات الغافلات (۱۴) الدعویٰ (۱۵) العود الی المقاصد (۱۶) التمدن (۱۷) المیمومان (۱۸) السکن (۱۹) آثار المزاج (۲۰) سنت ابراہیم (۲۱) نظام الحدیث (۲۲) احدی الحسنیین۔

تفصیل اعتنا بعض اہل علم نے حضرت تھانوی کی تالیفات کے ساتھ مختلف طرق سے اعتنا فرمایا۔ کسی نے تسہیل عبارت سے۔ کسی نے تلخیص انتخاب سے اور کسی نے دوسری زبان میں ترجمہ سے تاکہ حضرت کے علوم و معارف سے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی اعلیٰ و ادنیٰ اور عام و خاص محروم نہ رہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:۔

کتب معتنیٰ بہ (۱) امثال عبرت (۲) علم غیر منقول (۳) تفسیر المواعظ (۴) علوم امدادیہ (۵) ابیات حکمت (۶) عروس المواعظ (۷) اصول الوصول (۸) رفع الضیق (۹) الشفا (۱۰) ترجمہ اردو لریڈیم (۱۱) حواشی رسالہ انتباہات (۱۲) ابانۃ البیان (۱۳) تسہیل قصد السبیل (۱۴) الشرف الظہور (۱۵) حل الانتباہات (۱۶) مناجات مقبول (۱۷) معمولات اشرفی (۱۸) فرائد الفوائد (۱۹)

معمولات سفر (۲۰) ترجمہ مائتہ دروس (۲۱) تسہیل شوق وطن (۲۲) مداواۃ السفر (۲۳) معمولات خانقاہ (۲۴) اشرف السوانح (۲۵) انفاس عیسیٰ (۲۶) ادراک النعمت فی اشعار حکمت (۲۷) بہشتی گوہر (۲۸) ازالۃ الرین (۲۹) خلاصہ بیان القرآن (۳۰) کمالات اشرفیہ (۳۱) المحیص بیان القرآن (۳۲) الحصون الحصینہ (۳۳) تصحیح الاغلاط (۳۴) اشرف المعمولات (۳۵) افادۃ العوام ترجمہ خطبات الاحکام (۳۶) تسہیل تمہید حیات المسلمین (۳۷) عنوان التصوف (۳۸) مرآۃ المواعظ الموافقت (۳۹) تالیفات اشرفیہ (۴۰) اشرف الجواب (۴۱) افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ شریعت اور طریقت

ان کے علاوہ تقریباً ۶۰ مواعظ کی بھی تسہیل وغیرہ کی گئی ہے۔

تالیفات مترجمہ | ان کے علاوہ حضرت کی تالیفات کے بکثرت دوسری زبانوں میں بعض ارباب علم نے ترجمے بھی کئے۔ ان کی تفصیل تالیفات اشرفیہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں صرف تعداد پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ فرانسیسی	زبان میں		۱
۲۔ ہندی	〃	〃	۱
۳۔ ناگری	〃	〃	۱
۴۔ پشتو	〃	〃	۱
۵۔ برہمی	〃	〃	۵
۶۔ انگریزی	〃	〃	۸
۷۔ سندھی	〃	〃	۱۱
۸۔ گجراتی	〃	〃	۱۴
۹۔ بنگالی	〃	〃	۲۰

ماہنامے | حضرت تھانوی کے فیوض و برکات ظاہری و باطنی کی تبلیغ و اشاعت کے لئے حسب ذیل ماہنامے خانقاہ امدادیہ اشرفیہ سے جاری ہوتے رہے۔

النور | یہ ماہوار رسالہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون سے زیر ادارت مولانا شبیر علی صاحب ہر قمری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے مع ٹائیٹل ۲۶ صفحے تھے جو ۱۳۳۳ھ سے جاری ہوا۔ اس کا سال ماہ جمادی الاولیٰ سے شروع ہوتا تھا اس میں حضرت کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

المبلّغ اسے بھی مولانا شبیر علی صاحب تھانہ بھون سے شائع کیا کرتے تھے۔ ۴۰ صفحات کا یہ رسالہ ہر قمری مہینہ کو شائع ہوتا تھا۔ یہ ۱۳۴۹ھ سے جاری ہوا۔ اس کا سال شوال المکرم سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں حضرت کے جدید مواعظ شائع ہوا کرتے تھے۔

الابقاء یہ رسالہ دریبہ کلاں دہلی سے جناب محمد عثمان خاں صاحب تاجر کتب نے ہر قمری مہینہ کی پندرہ تاریخ کو شائع کرنا شروع کیا۔ اس میں مع ٹائیٹل ۳۶ صفحے ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ ۱۳۴۵ھ میں جاری ہوا۔ اس کا سال ماہ رمضان سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں حضرت کے کمیاب مواعظ شائع ہوتے ہیں۔ یہ اب تک کراچی سے شائع ہوتا رہتا ہے

الہادی یہ رسالہ بھی دریبہ کلاں دہلی سے زیر اہتمام خان صاحب موصوف ہر قمری مہینہ میں شائع ہوتا تھا۔ ۴۸ صفحات کا یہ رسالہ ۱۳۴۲ھ میں جاری ہوا۔ اس کا سال جمادی الاولیٰ سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں حضرتؒ کے ہر قسم کے علوم عقلیہ نقلیہ شائع کئے جاتے تھے

الامداد یہ رسالہ امداد المطابع تھانہ بھون سے رجب ۱۳۳۱ھ سے جاری ہوا۔ ضخامت ۴۰ صفحات کی تھی۔ حضرت کے ہر قسم کے مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔

اشرف العلوم یہ رسالہ دفتر اشرف العلوم سہارنپور سے زیر ادارت مولانا ظہور الحسن صاحب کسولوی محرم الحرام ۱۳۵۶ھ سے جاری ہونا شروع ہوا۔ ہر قمری مہینہ میں شائع ہوتا تھا شروع میں یہ ۲۲۵ صفحات پر چھپتا رہا بعد میں کل ضخامت ۴۰ صفحات رہ گئی۔

الاشرف یہ ماہوار رسالہ الناظر بک ڈپو لکھنؤ سے زیر ادارت مولوی محمد حسن صاحب نکالا کرتا تھا۔ یہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ سے جاری ہوا۔ اس کے نصف میں جدید ملفوظات اور نصف میں کتاب بوادر النوادر شائع ہوتی تھی۔

جدید اضافے حال ہی میں حضرتؒ کے متعلق مندرجہ ذیل کتب شائع ہوئیں۔

۱۔ حیاتِ اشرف — مصنفہ جناب غلام محمد صاحب عثمانیہ

۲۔ جامع المجددین
۳۔ تجدید تصوف و سلوک
۴۔ تجدید معاشیات
۵۔ تجدید تعلیم و تبلیغ
(۲ تا ۵) مصنفہ مولانا عبد الباری صاحب ندوی

۶۔ حکیم الامت — مصنفہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

تعدادِ کتب اس وقت تک حضرت تھانویؒ کی اپنی اور ان کے متعلق شائع ہونے والی تمام کتابوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے۔

حیرتِ فرنگی جیسا کہ "علم و ادب" کے باب میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت تھانوی نے اپنی کسی تصانیف پر رائلٹی لینی پسند نہ کی۔ ورنہ جس طرح آپ سینکڑوں کتابیں اپنی علمی یادگار کے طور پر چھوڑ گئے تھے اسی طرح ان کی رائلٹی سے کمایا ہوا لاکھوں روپیہ بھی پس انداز کر جاتے۔ مگر حضرت کو تو دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر تھی۔ اس لئے جب ایک مرتبہ ایک انگریز نے حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کو تفسیر لکھنے میں کتنے روپے ملے تو حضرت نے فرمایا "کچھ نہیں"۔ اس پر اس نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ پھر اتنی بڑی کتاب لکھنے کی آپ نے محنت ہی کیوں کی۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"ہم لوگ اس کے قائل ہیں کہ علاوہ اس زندگی کے ایک اور بھی زندگی ہے جس کو آخرت کہتے ہیں۔ میں نے یہ محنت اس توقع پر کی ہے کہ انشاء اللہ مجھے اس کا عوض اس دوسری زندگی میں ملے گا۔ اور ایک اس سے دنیا کا فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب میں دیکھوں گا کہ میرے مسلمان بھائی پڑھ پڑھ کر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تو مجھ کو خوشی ہو گی۔"

اس پر وہ انگریز بہت متاثر ہوا اور حضرتؒ کے دینی جذبہ کی تعریف کی۔ اگر حضرت تھانویؒ ان کتابوں پر رائلٹی لیتے تو آج اکثر گھروں میں حضرت کی علمی یادگاریں نظر نہ آتیں۔

اہل و عیال

ازواجِ محترمات حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دو بیویاں تھیں۔ اور دونوں بفضلہ تعالیٰ نہایت شفیق۔ غربا پرور۔ متوکل۔ قانع۔ مہمان نواز اور حضرت کی خدمتگزار تھیں۔ دوسرے عقد سے گو شروع میں بڑی بیگم صاحبہ کو طبعًا کچھ رنج ہوا۔ مگر حضرت کے عدل و مساوات کے پیشِ نظر یہ بہت جلد دور ہو گیا۔ اور دونوں ایک دوسرے سے بہت خوش و خرم رہنے لگیں۔

عقدِ ثانی پر اعتراض حضرتؒ کے عقدِ ثانی کرنے پر معاندین و مخالفین نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ آپ نے عقدِ ثانی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"نہیں میں نے یہ دروازہ کھولا نہیں۔ بلکہ بند کر دیا ہے۔ کیونکہ جب لوگ دیکھیں گے، کہ عدل یوں کیا جاتا ہے۔ اور عدل کی اتنی رعایت کرنی پڑتی ہے تو اس کو دشوار سمجھ کر عقد ثانی کی ہمت نہ کر سکیں گے"۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت کے عدل و مساوات نے عہد نبوی کی یاد تازہ کر دی۔ دراصل حضرت کا عقد ثانی نظام تکوینی کے ہی ماتحت ہے۔ اور اس زمانہ میں قدرت کو حکیم الامت کے ذریعہ یہ دکھلانا مقصود تھا کہ بیویوں کے ساتھ یوں عدل کیا جاتا ہے۔

ابتدائی دشواریاں

حضرت کو شروع شروع میں تو عدل کی جزئیات دقیقہ کی رعایت میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ لیکن چونکہ حضرت والا حقوق العباد کے متعلق بہت ہی زیادہ محتاط تھے۔ اسلئے برابر فکر و اہتمام بلیغ میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ حق تعالےٰ نے حسب وعدہ وَمَنْ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ سب دشواریوں کو آسان فرما دیا۔ رفتہ رفتہ ساری جزئیاتِ عدل کے متعلق طریق عمل سمجھ میں آگیا۔ اور پھر حضرت کو بفضلہ تعالےٰ کبھی کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کیونکہ جب انسان کی نیت صحیح ہو تو حالات خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں شروع سے نیت ہی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی ہو۔ وہاں عموماً یہی دیکھا گیا۔ کہ عشق و محبت کی بنا پر ہونے والے عقد ثانی بھی وبالِ جان ہی بن کر رہے۔

کمال عدل

حضرت ہر معاملہ میں مابین زوجین پورا پورا عدل برتتے تھے اور ہر لحاظ سے مساوی برتاؤ کرتے تھے۔ یہاں تک جب نیا نیا عقد ثانی ہوا۔ تو آپ فرماتے تھے کہ:-

"میں تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلاف عدل سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے اس کی طرف توجہ میں کمی ہوگی۔ جس کی باری ہے اور یہ اس کی حق تلفی ہے اسی طرح اب میں کپڑے خانقاہ میں ہی رکھتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں ایک گھر میں کپڑے رکھتا۔ تو دوسرے گھر والوں کو شکایت پیدا ہوتی۔ کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں۔ جتنی دوسری کے ساتھ ہے"۔

حضرت والا نقد یا غیر نقد جو کچھ دیتے۔ دونوں کو برابر دیتے۔ یہاں تک کہ ایسی چیزوں کی تقسیم کے لئے جو وزن کی جاتی ہیں۔ ایک نہایت صحیح کانٹا اپنی نشست گاہ کے سامنے لٹکا رکھا تھا جس کو مزاحاً "میزانِ عدل" فرمایا کرتے تھے۔ کھانا بھی ایک دن ایک گھر میں تناول فرماتے

اور دوسرے دن کا دوسرے گھر میں ۔ اس طرح رمضان المبارک میں افطار کے وقت بڑے گھر اور سحری کے وقت چھوٹے گھر سے کھانا کھاتے ۔

بے نظیر احتیاط حضرت والا طبعاً بڑے غیور واقع ہوئے تھے اور کسی کا احسان لینا گوارا نہیں فرماتے تھے ۔ یہاں تک کہ اپنی بیویوں کے بھی احسان مند نہیں ہوتے تھے ۔ فرماتے تھے کہ ان کے ساتھ تو احسان کرنا چاہیئے نہ کہ الٹا ان کا احسان لینا چاہیئے ۔

آپ اپنی آمدنی کے تین حصے فرماتے ۔ ایک ایک دونوں گھروں میں دیتے ۔ ایک حصہ اپنے ذاتی اخراجات کے لئے اپنے پاس رکھتے ۔ آپ دونوں گھروں سے جو کھانا کھاتے مختلف طریقوں سے اس کا معاوضہ بھی اپنی زوجین کو ادا کر دیتے ۔ تاکہ ان کا احسان نہ رہے ۔ گو وہ منع فرمائیں ۔ مگر آپ معاملہ کو صاف رکھنا چاہتے تھے ۔ اسلئے آپ اپنے کھانے کی رقم ایسے ذرائع سے ادا فرماتے کہ وہ بھی محسوس نہ کریں ۔ اور ان پر بھی بار نہ رہتا ۔

مزید یہاں جن مکانات میں آپ کی ازواج محترمات رہتی تھیں ۔ وہ دونوں ان کی ملک تھے اسلئے آپ ان مکانوں میں اپنی رہائش کے تمتع کا معاوضہ بھی انہیں ادا کرتے رہتے ۔ تاکہ کسی کا حق آپ کے ذمہ نہ رہے ۔

آپ کی برادری میں ادائے مہر کا دستور نہیں تھا ۔ مگر آپ نے دونوں گھروں کا مہر ادا کر دیا ۔ حالانکہ آپ کی بڑی اہلیہ محترمہ نے آپ کو اپنا پانچ ہزار کا حق مہر بخوشی معاف کر دیا تھا ۔ لیکن پھر بھی آپ نے وہ پانچ ہزار روپیہ انہیں ادا فرما دیا ۔ کیونکہ حضرت کے نزدیک وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی کی راجح تفسیر یہی تھی ۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ :-

" اگر عورت مہر معاف بھی کر دے ۔ تب بھی مرد کی غیرت کا مقتضا یہی ہونا چاہیئے ۔ کہ وہ پھر بھی مہر ادا کر دے "

انتہائی رعایت ایک حدیث شریف کی رو سے نہ صرف اپنی زندگی میں بلکہ اپنے بعد بھی بیویوں کی آسائش کی فکر سنت ہے ۔ اسلئے حضرت اپنے دونوں گھروں کی راحت و عافیت کا بہت ہی زیادہ خیال رکھتے تھے ۔ اور ہر موقع اور محل کا پورا پورا حق ادا فرماتے تھے ان سے بہت ہی نرمی لطف اور بے تکلفی کا برتاؤ فرماتے تھے ۔ حتی الوسع ان پر کوئی بوجھ نہ ڈالتے تھے ۔ یہاں تک کہ کسی خاص کھانے کی بھی کبھی فرمائش نہیں کرتے تھے ۔ اِلّا نادراً البتہ جب گھر والوں کی طرف سے اصرار ہوتا ۔ تو درخواست بھی نہیں فرماتے تھے ۔ بلکہ یہ دریافت فرماتے تھے

کہ اچھا تم خود ہی چند کھانوں کے نام بتا دو۔ جو تمہیں پکانا آسان ہو۔ پھر ان میں سے جو مجھے مرغوب ہوگا۔ میں بتا دوں گا۔ جب چند کھانوں کے نام لئے جاتے۔ تو حضرت ان میں سے کسی کی فرمائش کر دیتے۔ بقول خواجہ عزیز الحسن صاحب حضرت میں غیرت تو تھی۔ لیکن غیریت نہ تھی۔

اسی طرح اگر کبھی اتفاق سے کھانا کھاتے وقت دسترخوان پر پانی موجود نہ پاتے۔ تو کسی سے مانگنے کی بجائے خود ہی جا کر گھڑے سے پانی لے لیتے۔

اگر گھر میں سے کوئی بیمار ہو جاتیں۔ تو ہر قسم کی تکالیف اور اخراجات برداشت کر کے انہیں بڑے شہروں میں بہترین طبی امداد بہم پہنچانے کے لئے جاتے اور وہاں وہ کر ان کا علاج کراتے۔

ایک دفعہ بڑی اہلیہ صاحبہ چھت پر سے گر پڑیں۔ اس وقت حضرت خانقاہ میں فجر کی سنتیں پڑھ رہے تھے۔ اس دوران میں اطلاع ہوئی۔ چونکہ ایسی حالت میں نیت توڑ دینا شرعاً واجب ہے۔ اسلئے آپ نے فوراً نیت توڑ دی اور گھر تشریف لے جا کر ان کی تیمارداری فرمائی۔

غرضیکہ اگر آج ہر مرد اپنی بیوی یا بیویوں کے حقوق کی اس طرح حفاظت کرے۔ تو عورتیں تعدد ازدواج کے خدائی قانون کو ملکی اسمبلیوں کے ذریعہ منسوخ اور معطل کرانے کی کوشش کیوں کریں۔ جو خاوندوں کے خلاف نہیں۔ خدا کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے مترادف ہے۔

نوعیتِ تعلقات

حضرتؒ کو بوجہ کثرت مشاغل دینیہ گھر میں تشریف لے جانے کیلئے بہت ہی کم وقت ملتا۔ لیکن بہت ہی التزام کے ساتھ تشریف لے جاتے۔ اگر کثرتِ کار کی وجہ سے مغرب سے ذرا قبل فارغ ہوتے۔ تو تب بھی دو چار منٹ کے لئے ضرور گھر تشریف لے جاتے اور کھڑے کھڑے دو تین باتیں کر کے واپس آجاتے۔ محترمات کو بھی چونکہ حضرت کے دینی مشاغل کا علم تھا۔ اسلئے انہوں نے کبھی حضرت کے زیادہ دیر مشغول رہنے کی شکایت نہیں فرمائی تھی۔ اور جب حضرت گھر تشریف لاتے اور اہلیہ محترمہ کو کسی کام میں مشغول پاتے۔ تو از راہِ لطف و بے تکلفی فرماتے کہ ہم تو دن بھر کے کام کے بعد تھکے تھکائے تھوڑی دیر کے لئے اپنے دماغ کو راحت دینے کی غرض سے تمہارے پاس آتے ہیں اور تم اس وقت بھی اپنے کام میں لگی رہتی ہو۔ بس حضرت کے اس فرمانے سے آپ کی سارے دن کی غیر حاضری کا ازالہ ہو جاتا۔

غرضیکہ حضرت جتنی دیر گھر میں رہتے۔ اتنی دیر تو اتنے بے تکلف اور ہشاش بشاش نظر آتے جیسے ان کی کل کائنات ہی یہی ہے مگر مخدومیت کی شان قطعاً نہ جتاتے۔ لیکن تنبیہ کے وقت برابر تنبیہ فرماتے اور تنبیہ کرنے میں قطعاً لحاظ نہ فرماتے۔ جب گھر سے نکل کر خانقاہ میں پہنچتے اور مشاغل دینیہ میں مصروف ہو جاتے۔ تو پھر ایسا معلوم ہوتا کہ ان کی دنیا اس کے سوا اور کوئی نہیں لیکن ہر ایک کا حق ادا کرتے ہوئے بھی اپنے محبوب حقیقی کے تعلق میں سر مو فرق نہ آنے دیتے

خالہ کی خواہش

حضرت تھانویؒ کے قیام مکہ معظمہ کے زمانہ میں آپ کی بڑی اہلیہ محترمہ مع اپنی خالہ صاحبہ کے وہیں پہنچ گئی تھیں۔ خالہ صاحبہ نے حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ سے حضرت والا کے متعلق عرض کیا کہ ان کے لئے صاحب اولاد ہونے کی دعا کیجئے۔ حضرت حاجی صاحب نے باہر آکر حضرت والا سے فرمایا "تمہاری خالہ مجھ سے دعا کے لئے کہتی ہیں کہ تمہارے اولاد ہو۔ سو دعا تو میں نے کر دی ہے۔

آرزوئے شیخ

لیکن بھائی میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں۔ ویسے ہی تم بھی رہو جو حالت میری ہے۔ وہ حالت تمہاری بھی رہے"۔ پھر دیر تک اس زمانہ کی اولاد کی خرابیاں بیان فرماتے رہے۔ حضرت تھانوی نے عرض کیا کہ جو حالت حضرت کو پسند ہو۔ وہی حالت میں بھی اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔ یعنی بے اولاد رہنا۔ یہ سن کر حضرت حاجی صاحب بہت خوش ہوئے۔

اولاد

چنانچہ دوسرا عقد کر لینے کے باوجود بھی حضرت کی کوئی اولاد نرینہ یا مادینہ نہ ہوئی۔ اور حق تعالٰی نے آپ کو اولاد کے فتنہ سے بچا لیا۔ گو آپ صاحب اولاد نہ تھے مگر بچوں سے محبت اور مزاح خوب فرماتے تھے۔

جانشینی

جانشینی یا سجادہ نشینی محض ایک دنیوی رسم ہے۔ جسے محض ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے قائم رکھا جاتا ہے۔ اور ایک خاص مقام کو ہر حال میں آباد رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خواہ اسے آباد رکھنے والوں میں رشد و ہدایت کی اہلیت ہو یا نہ۔ حالانکہ شرعاً اس کا کہیں جواز موجود نہیں۔ اہل اللہ کے ہاں صرف اسی امر کو ترجیح دی جاتی ہے کہ جس میں تربیت و ارشاد کی صلاحیت پاتے ہیں۔ اسے رشد و ہدایت کی اجازت دے دیتے ہیں ــ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ جہاں چاہے بیٹھ کر خدمت دین انجام دے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ۱۸۵۷ء میں ہجرت کر کے

کہ تشریف لے جانے کے بعد بدتوں تھانہ بھون کی خانقاہ خالی رہی۔ اگر حضرت حاجی صاحب یا ان کے خلفاء کے نزدیک جگہ کو کوئی اہمیت حاصل ہوتی۔ تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی یا ان کے خلفاء اس گدی کو آباد رکھتے۔ جو ہر لحاظ سے آباد رکھنے کے اہل تھے۔ مگر کسی نے اس بدعت کو جاری نہ رکھا۔ جس کے نقصان حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ سجادہ نشینی میں بتفصیل گنوائے ہیں۔ جو رسالہ تحفتہ الشیوخ کا ضمیمہ ہے اور ۱۳۳۲ھ میں تصنیف و طبع ہوا۔

حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد بھی بعض نافہموں نے یہ سوال اُٹھایا کہ حضرت اقدس کا جانشین کون ہوگا۔ حالانکہ جو شیخ کمالِ علم۔ کمالِ تقویٰ۔ کمالِ معرفت۔ کمالِ عشق اور کمالِ ارشاد بلکہ جملہ کمالات میں فرد۔ اپنے زمانہ کا مجدد۔ امام اور مرجع اہلِ علم و کمال و مشیخت ہو۔ اس کا جانشین کون ہو سکتا تھا۔ حضرت کی طرح ان کے خلفاء میں کوئی جامع الکمالات تو نہیں ہوا۔ لیکن آپ کا ہر مجاز آپ کی بعض بعض خصوصیات کا مظہر اتم ضرور ہے۔

مولانا عثمانی کا تجسس

چنانچہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے اسی سلسلہ میں حضرتؒ سے یہ سوال کیا کہ اپنے خدام یعنی منتسبین میں سے سب سے زیادہ محبوب آپ کو کون ہے۔ اور یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر اس راز کو پوشیدہ رکھنے کیلئے حکم ہوگا۔ تو عمر بھر کسی پر ظاہر نہ کروں گا۔ اس پر حضرتؒ نے بے تکلف تحریر فرمایا کہ:-

"میں بتلانے میں کبھی پس و پیش نہ کرتا۔ اگر کوئی اس کا مصداق ہوتا۔ برخوردارم سچ بات تو یہ ہے کہ اب تک سے

ہر کسے از ظن خود شد یارِ من ۔۔۔ وز درونِ من نجست اسرارِ من

پوری مناسبت کسی کو نہیں ہوئی۔ اور اجنبیت کا مدار وہی ہے۔ ممکن ہے اس کا منشا میری ہی کمی ہو۔ بہرحال اس سوال کا جواب شائع نہ کیا جائے۔"

مولانا ظفر احمد صاحب کو بوجہ عزیز ہونے کے چونکہ رسوخ اور خصوصیت حاصل تھی۔ اور اس سوال کا محرک چونکہ ان کا تجسس اصلاح تھا۔ اسلئے انہوں نے حضرت کی خدمت میں لکھا کہ:-

"یہ جواب تربیت السالک میں نقل ہو جانا سالکین کے لئے زیادہ نافع معلوم ہوتا ہے۔ شاید کسی اللہ کے بندہ کو حضرت سے پوری مناسبت پیدا کرنے کا شوق پیدا

ہو جائے۔ میری جو حالت اُس جواب کو دیکھ کر ہوئی۔ واللہ میں کیا عرض کر دوں۔ سچ فرمایا کہ ؎

ہر کسے از ظن خود شد یار من ۔۔۔ وز درون من نجست اسرار من

واللہ مجھے حضرت کے اسرار معلوم ہو جانے کی بہت طلب ہے اور یہی اس سوال کا منشا ہے۔ اگر اس نالائق کے ضبط و تحمل سے زیادہ وہ اسرار نہ ہوں۔ تو خدا کرے مجھ کو معلوم ہو جائیں؟"

حضرت کی وضاحت حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس عریضہ کا یہ جواب لکھا:۔

"عزیزم۔ بہتر ہے۔ نقل کر دیا جائے۔ مجھ کو صرف یہ خیال مانع ہوا تھا۔ کہ احباب کی دلشکنی نہ ہو۔ باقی جب اس سے اہم مصلحت نقل میں ہے۔ تو موافقت کرتا ہوں۔ بر خود راز من میرے اسرار ہی کیا ہیں۔ مولانا کا قول تو میں نے تبرکاً نقل کر دیا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ میرے مذاق سے پوری مناسبت کسی نے پیدا نہیں کی۔ مو عزیزمن یہ بات میرے کرنے کی نہیں۔ خود اہل محبت کا فعل تتبع اور استفسار اور اتباع اس کا طریق ہے۔ واللہ الموفق۔ اور اس مناسبت کے بعد خود بخود مجھ کو اظہار اسرار ــــــ کا جوش ہوگا۔ اگر کچھ اسرار ہوں گے۔ یا نئے پیدا ہو جائیں گے"۔

مقام اشرف دراصل یہ اسرار حق تعالیٰ کی امانت ہوتے ہیں۔ اور سوا اس کے فضل خاص کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتے اور اس کے فضل خاص کو متحرک کرنے کے لئے فنا ور رضا کے مقام تک پہنچنا لازمی ہے۔ جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ثانیاً حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے جن کا خصوصی تعلق بھی رہا۔ وہ بھی زیادہ تر توجہ صرف اپنی ظاہری اور باطنی اصلاح کی طرف ہی مبذول رکھتے تھے۔ اور اسرار کا تجسس تو بہت آگے کی منزل تھی۔ ثالثاً ان کے معلوم ہو جانے سے یہ تھوڑا ہی تھا۔ کہ آئندہ کے لئے اتباع کتاب و سنت کی منزلیں طے نہ کرنی پڑتیں۔ بلکہ ان کے معلوم ہو جانے میں اس بات کا خطرہ تھا کہ اگر کسی وقت انسان تعلی میں آکر کوئی راز فاش کر بیٹھے۔ تو ہمیشہ کے لئے مردود ہو جائے۔ رابعاً ؎

ہے عقل و فہم سے بالا مقام حضرتِ والا ۔۔۔ کوئی جانے۔ تو کیا مانے۔ کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

کیونکہ حضرت تو اس کے مصداق تھے ؎

وہ راز ہوں کہ جو عیاں ہو کے بھی عیاں نہ ہوا ۔۔۔ وہ نکتہ ہوں جو بیان ہو کے بھی بیان نہ ہوا

حضرت تھانویؒ کے حقیقی بھتیجے اور منہ بولے بیٹے مولانا شبیر علی صاحب نے خانقاہ امدادیہ کے تمام انتظامی امور سنبھالنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا اور انہیں حضرت تھانوی کی خواہش کے مطابق انجام دیکر انکے دل میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا مگر انتظامی امور میں شب و روز مشغول رہنے کی وجہ سے وہ ان سے کما حقہٗ روحانی اور باطنی فیض حاصل نہ کر سکے جسکا حضرت تھانوی کو از حد احساس تھا اپنی زندگی کے بالکل آخری لمحات میں حضرت تھانوی نے مولانا شبیر علی صاحب کو بار ہا طلب فرمایا مگر آپ کو ہر مرتبہ یہی جواب ملا کہ وہ سہارنپور دوائی لینے گئے ہیں اگر کوئی بات انہیں کہنی یا سمجھانی ہو تو ہمیں بتلا دیجئے ہم انہیں بتلا یا سمجھا دینگے۔ مگر حضرت تھانوی نے اصرار کے باوجود وہ بات بتلانے سے گریز فرمایا اور مولانا شبیر علی صاحب کی عدم موجودگی پر بار بار اظہار افسوس فرماتے رہے۔ آپ جس بیتابی سے مولانا شبیر علی کو طلب فرماتے اور جس حسرت سے انہیں موجود نہ پا کر افسوس فرماتے اس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ان کی خدمات کا معاوضہ اپنے بعض اسرار انہیں منتقل کر کے دینا چاہتے تھے۔ مگر

؎ ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چنانچہ آپ دل کی بات دل میں ہی لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور مولانا شبیر علی صاحب آپ کے انتقال کے بعد پہنچے۔ جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

حقیقی جانشین حضرت کے مجازین اپنے اپنے مقام پر حضرت کا چشمہ فیض جاری کئے ہوئے ہیں۔ مگر حضرت تھانوی کے حقیقی جانشین تو آپ کے ملفوظات، خطبات اور تصنیفات و تالیفات ہیں۔ جن سے قیامت تک رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اہتمام سفر آخرت

صفائی معاملات حضرت تھانویؒ کے حالات زندگی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس امر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ کی انتہا درجہ کی احتیاط۔ غایت درجہ کا ورع و تقویٰ۔ اعلیٰ درجہ کی صفائی معاملات صرف اسلئے تھی کہ آپ بفحوائے ؏ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔ ہر وقت اس بات کے اہتمام میں رہتے تھے کہ ان کی وجہ سے کسی معاملہ میں کسی قسم کی دوسرے کو الجھن نہ ہو اور عند اللہ مواخذہ نہ ہو آپ صرف اپنے حالات و معاملات کو ہی آئینہ کی طرح صاف و شفاف نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اپنے تربیت یافتوں کو بھی موت کا اس قدر استحضار کرا دیتے تھے۔ کہ دربار اشرفیہ کا ادنیٰ سے ادنیٰ خادم خود کو ہر وقت موت کے لئے تیار اور اپنی زندگی کو حتی الوسع ہر طرح پاک و صاف رکھتا تھا۔ اور جب تک اسے اس مقام تک نہ پہنچا دیتے تھے۔ چین نہ لیتے تھے۔ چنانچہ

۱۔ ایک مرتبہ چند طالبوں نے خانقاہ میں مستقل قیام کرنا چاہا۔ تو دریافت فرمایا کہ کسی کے حقوق تو ذمہ نہیں اور جب معلوم ہوا کہ ہیں۔ تو فرمایا کہ پہلے جا کر ان کو اداء یا ابراء معاف کرا آؤ۔ چنانچہ ایک صاحب ہمت طالب نے جو غیر مستطیع تھے۔ تھانہ بھون سے الہ آباد تک کا لمبا سفر محض اس غرض سے پا پیادہ کیا اور بعد صفائی معاملات پا پیادہ ہی واپس آ کر تھانہ بھون میں مقیم خانقاہ ہوئے اور اخیر وقت تک مقیم رہے۔

۲۔ ایک بار ایک طالب اپنی بیوی کو جس سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ وہ ادائے حقوق زوجیت پر تیار تھا۔ ایک بھائی کے گھر چھوڑ کر خانقاہ میں آ گیا۔ جب حضرت کو دریافت پر اس بات کا پتہ چلا تو آپ نے اسے فرمایا کہ ایسی حالت میں اس کو معلق نہ رکھا جائے اس کا تصفیہ کر کے اور اس سے یکسوئی حاصل کر کے آؤ۔ چنانچہ جب وہ اس کو طلاق دے کر آئے تو آپ نے اس کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔

۳۔ ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں ایک ایسا غریب شخص آیا۔ جو کسی زمانہ میں چوری کی واردات کا مرتکب ہو چکا تھا۔ آپ نے اس کی تعلیم و تربیت کے لئے یہ شرط لگائی کہ پہلے سب سے معافی لکھوا کر آؤ۔ چنانچہ وہ سب سے معافی لکھوا کر لایا۔ ان معافی دہندگان میں ایک ایسا ہندو بنیا بھی تھا۔ جس کے اس نے دہلی میں پانچ سو روپیہ چرائے تھے۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت تھانوی کی زیر تربیت آنا چاہتا ہے۔ اور اب آئندہ پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا طالب صادق ہے تو اس نے بھی اس عنوان سے معافی نامہ لکھ دیا کہ میں نے حسبۃً للہ معاف کیا۔ چنانچہ آپ نے طریق کے مطابق ان معافی ناموں کی تصدیق کرانے کے بعد اپنی تعلیم و تربیت سے اس چور کو متقی بنا دیا۔

یہ تو دوسروں سے معاملہ تھا۔ حضرت کی اپنی حالت اور عادت یہ تھی کہ اگر کبھی تھوڑا سا بھی مسجد کا گرم پانی وضو سے بچ جاتا تھا۔ تو آپ اس کو بھی سقاوہ میں جا کر ڈال آتے تھے تاکہ مسجد کا اتنا سا مال بھی ضائع نہ ہو۔ اس سے آپ کی احتیاط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

طریق وصیت جب حضرت تھانوی اپنی عین حیات میں اس قدر محتاط تھے۔ تو سفر آخرت کے سلسلہ میں انہوں نے کس قدر احتیاط سے کام لیا ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ کے وصیت نامہ سے ہو سکتا ہے۔ یہ کل من علیہا فان کی منزل سے گزرنے والے ہر مسافر کے لئے سرمایہ عبرت و بصیرت ہے اور جامعیت و ندرت کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت

رکھتا ہے۔ حضرت کا طریق وصیت یہ تھا کہ آپ نے بعد وفات پیش آنے والے واقعات کے متعلق تو ایک مفصل وصیت لکھ رکھی تھی۔ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے مگر . . . . . .
. . . چونکہ روزمرہ کے حالات میں تغیر و تبدل لازمی ہوتا ہے۔ اسلئے ان کے منضبط کرنے کیلئے آپ نے وصیت نامہ کے محاذات میں اصل مضامین کے ہی مساوی خالی جگہ چھوڑی ہوئی تھی . . . . اور اس میں ترمیمہ حالات کے تعلیمات کو منضبط کرتے رہتے تھے۔ اور جب کسی جزو کی ترمیم کی مقدار زیادہ ہو جاتی۔ تو اصل کو اس کی جگہ سے کاٹ کر بقیہ مضامین کے بعد مع لحاظ ترمیمات اس کو ایک مستقل نمبر بنا کر متن میں اس کا اضافہ فرما دیتے تھے۔ اور چونکہ بعض نمبروں میں دوسرے نمبروں کا حوالہ ہوتا۔ اس لئے اس ترمیم شدہ نمبر کا عدد نہ بدلتے۔ بلکہ اس ترمیم شدہ حصہ کو مستقل کاغذ پر لکھ کر اسی اصل کی جگہ گوند وغیرہ سے چسپاں کر دیتے اور اگر کوئی مستقل نمبر بڑھانا ہوتا۔ تو اسے آخیر میں درج کر دیتے اور اس طرح آپ روز کا معاملہ دنیا میں معاون کرتے رہے تاآنکہ سفر آخرت پیش آ گیا۔

ان وصایا میں آپ نے اپنے بھتیجے مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کو وصی بنایا اور ان کے لئے یہ دو مشورے درج وصیت نامہ کئے۔

۱۔ ان وصایا کی تنفیذ کے وقت کسی متدین خوش فہم عالم کو بھی شریک کر لیں۔

۲۔ تنبیہات وصیت مدرسہ سے یا کہیں اور سے لے کر اور اس کے تمامات میرے ڈکس میں سے نکال کر ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ اور ان میں جو وصایا مقتضائے وقت ہوں ان پر بھی عمل یا ان کا اعلان خاص یا عام کیا جائے۔ اور ان کے کسی جزو میں اگر تعارض ہو اخیر پر عمل کیا جاوے۔ جس کی تعیین تاریخ کتابت سے ہو جائے گی۔

کتبہ اشرف علی۔ آغاز محرم ۱۳۴۶ھ

اثاث البیت کے متعلق وصیت

اثاث البیت کے متعلق وصیت اشرف السوانح جلد سوم میں صفحہ ۱۲۲ تا ۱۲۷ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں آپ نے اپنی مملوکہ۔ غیر مملوکہ اشیاء اور وقف جائداد کی فہرست وغیرہ اسی تفصیل سے دی جائے جیسی مملکت اسلامیہ جمہوریہ کا محکمہ تشخیص موت ٹیکس (اسٹیٹ ڈیوٹی ٹیکس ایکٹ ۱۹۵۰ء) کی رو سے کسی لاکھ پتی کے مرنے پر طلب کرتا ہے۔ یعنی جس تفصیل سے متوفی کی جائداد کی فہرست پیش کرنے کا مذکورہ بالا ایکٹ ۱۹۵۰ء تقاضا کرتا ہے۔ وہی تفصیل قانون کے خوف سے نہیں۔ خدا کے

خوف سے آپ نے خود تجویز اپنے وصیت نامہ ــــ میں درج کر دی تھی۔ جس سے ظاہر ہے کہ اگر طبائع میں خوف خدا پیدا ہو جائے۔ تو قانون سازی کا کام بالکل برائے نام رہ جائے۔

اہل حقوق کو وصیت حضرت تھانوی اپنے مذکورہ بالا وصیت نامہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میرے بعض اخلاق سیئہ کے سبب بعض بزرگان خدا کو حاضرانہ و غائبانہ میری زبان اور ہاتھ سے کچھ کلفتیں پہنچی ہیں۔ اور کچھ حقوق ضائع ہوئے ہیں۔ خواہ اہل حقوق کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ میں نہایت عاجزی سے سب چھوٹے بڑوں سے استدعا کرتا ہوں کہ للہ دل سے معاف کر دیں۔ اللہ تعالےٰ ان کی تقصیرات سے درگزر فرماویں گے۔ میں بھی ان کے لئے یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دارین میں عفو و عافیت عطا فرماویں۔ معذرت کرنے والے کی تقصیر سے درگذر کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اور اگر معاف کرنے کی ہمت نہ ہو تو حسب فتویٰ شرعی مجھ سے عوض لے لیں۔ خدا کے لئے قیامت پر مواخذہ نہ رکھیں کہ اس کا کسی طرح تحمل نہیں۔

اس قبیل کی کوتاہیاں جو دوسروں سے میرے حق میں ہو گئی ہوں۔ میں بطیب خاطر گذشتہ اور آئندہ کے لئے محض خدا تعالےٰ کے راضی کرنے کو اور اپنی خطاؤں کی معافی کی توقع پر وہ سب معاف کرتا ہوں۔"

علماء و طلباء کو وصیت "جو مدرسہ دینیہ فی الحال یہاں میرے تعلق میں جاری ہے۔ وہ ایک خاص شان کا مدرسہ ہے۔ جس کی تفصیل ضروری میرے مشفق مولوی عبداللہ صاحب کی تحریر تنبیہ پر نظر عمیق سے معلوم ہو سکتی ہے۔ میرا دل یوں چاہتا ہے کہ میرے بعد بھی اس کے انتظار کی طرف توجہ رکھی جائے۔ اور خدا تعالےٰ اس مدرسہ کی خدمت کی جس کو توفیق دے تو وہ اس کے طرز کو جس کا مہتم بالشان جزو تربیت اخلاق و اصلاح نفس ہے۔ نہ بدلے کہ ان شاء اللہ تعالےٰ اسی میں بہت خیر و برکت کی امید ہے۔

دینی یا دنیوی مضرتوں پر نظر کر کے ان امور سے خصوصیت کے ساتھ احتیاط رکھنے کا مشورہ دیتا ہوں کہ

۱۔ شہوت و غضب کے مقتضا پر عمل نہ کریں۔

۲۔ تعجیل نہایت بری چیز ہے۔

۳۔ بلے مشورہ کوئی کام نہ کریں۔

۴۔ غیبت قطعاً چھوڑ دیں۔

۵۔ کثرتِ کلام اگرچہ مباح کے ساتھ ہو۔ اور کثرتِ اختلاطِ خلق بلا ضرورتِ شدیدہ و بلا مصلحت مطلوبہ اور خصوصاً جبکہ دوستی کے درجہ تک پہنچ جائے۔ پھر خصوصاً جبکہ ہر کس و ناکس کو راز دار بھی بنا لیا جاوے۔ نہایت مضر چیز ہے۔

۶۔ بدون پوری رغبت کے کھانا ہرگز نہ کھاویں۔

۷۔ بدون سخت تقاضا کے ہم بستر نہ ہوں۔

۸۔ بدون سخت حاجت کے قرض نہ لیں۔

۹۔ فضول خرچی کے پاس نہ جائیں۔

۱۰۔ غیر ضروری سامان جمع نہ کریں۔

۱۱۔ سخت مزاجی و تندخوئی کی عادت نہ کریں۔ رفق اور ضبط و تحمل کو اپنا شعار بنا دیں۔

۱۲۔ زیادہ تکلف سے بہت بچیں۔ اقوال و افعال میں بھی۔ طعام و لباس میں بھی۔

۱۳۔ مقتدا کو چاہیئے کہ امراء سے نہ بدخلقی کرے۔ اور نہ زیادہ اختلاط کرے۔ اور نہ ان کو حتی الامکان مقصود بناوے۔ بالخصوص دنیوی نفع حاصل کرنے کے لئے۔

۱۴۔ معاملات کی صفائی کو دیانات سے بھی زیادہ مہتم بالشان سمجھیں۔

۱۵۔ روایات و حکایات میں بے انتہا احتیاط کریں۔ اس میں بڑے بڑے دیندار اور فہیم لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں۔ خواہ سمجھنے میں یا نقل کرنے میں۔

۱۶۔ بلا ضرورت بالکلیہ اور ضرورت میں بلا اجازت و تجویز طبیب حاذق مشفق کے کسی قسم کی دوا ہرگز استعمال نہ کریں۔

۱۷۔ زبان کی غایت درجہ ہر قسم کی معصیت و لایعنی سے احتیاط رکھیں۔

۱۸۔ حق پرست رہیں۔ اپنے قول پر جمود نہ کریں۔

۱۹۔ تعلقات نہ بڑھائیں

۲۰۔ کسی کے دنیوی معاملہ میں دخل نہ دیں۔

طالب علموں کو وصیت کرتا ہوں کہ نرے درس و تدریس پر مغرور نہ ہوں۔ اس کا کارآمد ہونا اہل اللہ کی خدمت و صحبت و نظرِ عنایت پر موقوف ہے۔ اس کا التزام نہایت اہتمام سے رکھیں ؎

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

دوستوں کو وصیت میں اپنے سب دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے سب معاصی صغیرہ و کبیرہ عمد و خطا کے لئے استغفار فرماویں۔ اور میرے اندر جو عادات و اخلاق ذمیمہ ہیں۔ ان کے ازالہ کے لئے دعا کریں۔

میں اپنے دوستوں کو خصوصاً اور سب مسلمانوں کو عموماً بہت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم دین کا خود سیکھنا اور اولاد کو تعلیم کرانا ہر شخص پر فرض عین ہے۔ خواہ بذریعہ کتاب ہو یا بذریعہ صحبت۔ بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ فتنۂ دینیہ سے حفاظت ہو سکے۔ جن کی آجکل بہت کثرت ہے۔ اس میں ہرگز غفلت یا کوتاہی نہ کریں۔

منتسبین کو وصیت میں اپنے تمام منتسبین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنی عمر بھر یا ذکر کے سورہ یٰسین شریف تین بار قل ہو اللہ شریف پڑھ کر مجھ کو بخش دیا کرے۔ مگر اور کوئی امر خلاف سنت و بدعات عوام و خواص میں سے نہ کریں۔

میرے ایصال ثواب کے لئے کبھی جمع نہ ہوں۔ نہ اہتمام سے نہ بلا اہتمام۔ اگر کسی دوسرے اتفاق سے بھی جمع ہو جاویں تو تلاوت وغیرہ کے وقت قصداً متفرق ہو جاویں اور ہر شخص منفرداً بطور خود جس کا دل چاہے دعا و صدقہ و عبادت نافلہ سے نفع پہنچا دے۔ نیز میری مستعمل چیزوں کے ساتھ متعارف طریق سے تبرکات سا معاملہ نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی محبت سے شرعی طریق سے اس کا مالک بن کر مخفی طور پر اپنے پاس رکھے تو مضائقہ نہیں۔ اس کا اعلان اور دوسروں کو دکھلانے کا اہتمام نہ کیا جاوے۔

حتی الامکان دنیا و ما فیہا سے جی نہ لگاویں اور کسی وقت فکر آخرت سے غافل نہ ہوں ہمیشہ ایسی حالت میں رہیں کہ اگر اسی وقت پیام اجل آجاوے۔ تو فکر اس تمنا کا مقتضی نہ ہو۔ لَوْلَا اَخَّرْتَنِیْ اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ اور ہر وقت یہ سمجھیں کہ ؏

شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود

اور علی الدوام دن کے گناہوں سے قبل رات کے اور رات کے گناہوں سے قبل دن کے استغفار کرتے رہیں اور حتی الوسع حقوق العباد سے سبکدوش رہیں۔

قرض کے متعلق وصیت خدا تعالیٰ کے فضل سے اس وقت میرے ذمہ بالکل کسی کا قرض نہیں اور حق تعالیٰ کا جو معاملہ فضل اس ناکارہ کے ساتھ ہے اس سے

امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اس سے محفوظ رہے گا۔ اور اگر اتفاق ہوا یا کسی کی امانت میرے پاس ہوئی۔ تو اس کی یادداشت زبانی یا تحریری ظاہر کر دی جاوے گی۔ اس کے ضمن میں یہ امر بھی قابل اطلاع ہے کہ مہر اہلیہ کا بھی ادا کر چکا ہوں۔ مکان مسکونہ اور بعض دیگر اموال ملا کر یہ سب مہر میں دیدیا۔ اس وقت وہ مکان خالص اُن کی ملک ہے۔ وہ اس میں جو چاہیں تصرف کریں۔ اسی طرح اثاث البیت اکثر ان کی ملک ہے اور بعض جو مشترک یا خاص میری ملک ہے وہ ہم دونوں کو یاد ہے۔ ہر ایک کا قول اس میں انشاء اللہ تعالیٰ قابل تصدیق ہے۔

میرے ذمہ جو کسی کا دین (امانت وغیرہ) ہے۔ یا اوروں کے ذمہ میرا دین ہے۔ اس کی تفصیل میرے ڈیکس کے ایک دراز میں ایک کاپی کے ٹھونہ میں ہے۔ اور کبھی مکان خورد کے کمرہ خورد کی الماری میں چوبی صندوقچہ میں بھی رکھ دی جاتی ہے۔ اور احتیاطاً لمبا سیاہ جلد والی بیاض میں بھی تلاش کر لیا جاوے اس بیاض میں بعض اور سرخیاں بھی نظر آویں گی۔ ان کا وصیت سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ ایک سرخی ملے گی۔ حساب طعام خانہ۔ اس کا مفہوم وہ خرچ ہے جو اپنے کھانے کی بابت گھروں میں دیتا ہوں۔ ان سے پوچھ لیا جاوے کہ ان کا کچھ باقی ہے یا میرا کچھ نکلتا ہے۔ وہ دین کی فرد ہے۔

امانات کے متعلق وصیت

امانات کی تھیلیوں یا لفافوں میں جو کہ میری ملک ہیں۔ اہل امانات کے نام اور پتے اور کچھ یادداشتیں لکھی ہوئی ہیں۔ ان پتوں پر ان لوگوں کو مع ان یادداشتوں کے بذریعہ خط رجسٹری کے اطلاع کی جاوے اس اطلاع میں جو صرف ہوگا۔ وہ میرے ترکہ سے خرچ کیا جاوے۔ اگر کوئی صاحب امانت زندہ نہ ہوں۔ تو ان کے ورثہ کو اسی طرح اطلاع کی جاوے۔ مگر نابالغ کا حصہ ہر حال میں ان کو ہی پہنچایا جاوے۔ اگر کسی کا جواب نہ آوے۔ تو علماء سے حکم شرعی پوچھ کر اس پر عمل کیا جاوے۔ اور تحقیق ورثہ میں بھی اسی مد اطلاع سے یعنی میرے ترکہ سے صرف ہوگا۔ اور جس میں کچھ لکھا ہوا نہ ملے یا لفظ ذاتی لکھا ہوا ملے۔ وہ میری ملک ہے اور داخل ترکہ ہے۔ اور شاید کسی تھیلی میں لفظ حساب مشترک لکھا ہوا پایا جاوے۔ یہ وہ رقم ہے۔ جس کو میں ہر مہینہ کے ختم پر گھروں میں تقسیم کر دیتا تھا مگر قبل تقسیم وہ میری ہے۔ اس میں تقسیم نہ ہوگی۔ البتہ ربع اس کا بھی نکال کر اس رقم میں شامل کر لیا جائیگا۔ جو اصل ترکہ سے بقدر ربع بعد وضع اخراجات تجہیز و تکفین و ادائے دین امانات بغرض کی واپسی کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس تھیلی میں اگر کسی اہلیہ کے نام پر کوئی رقم جمع شدہ

نظر آوے۔ وہ ان کو تملیکاً بہ توقع دوسری کو مساوی کردینے کے دی گئی ہے۔ مگر نہ وہ ان سے واپس لی جاوے۔ نہ دوسری کو عدل کے واسطے اتنی دی جاوے۔ کیونکہ عدل واجب حیات کے ساتھ منقطع ہوچکا ہے۔ اور نیت کے سبب عدم عدل کا مواخذہ بھی نہ ہوگا۔ البتہ اگر ایک کو حالت یاس میں دینا حجتہ شرعیہ سے ثابت ہوجاوے۔ تو وہ واپس کردیا جاوے۔

کتب خانہ کے متعلق وصیت

میرے کتب خانہ میں ہر قسم کی اور بعض دوسرے فرقوں کی بھی کتابیں بلا میرے قصد کے جمع ہوگئی ہیں۔ کوئی شخص ان کے کتب خانہ میں ہونے سے سب کی صحت مضامین کا شبہ نہ کیا جاوے۔ جو کتاب یا جو مضمون قواعد شرعیہ کے خلاف ہو۔ اس کو باطل سمجھا جاوے۔

مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں جو کتب احقر کے آنے سے پہلے کی ہیں۔ ان کو مع انکی فہرست کے جدا رکھا گیا ہے اور جو کتب میری معرفت آئی ہیں۔ وہ مع فہرست جدا ہیں اور واقفین نے ان کے نقل وغیرہ کا مجھ کو پورا اختیار دیا ہے۔ اسلئے میں نے یہ تجویز کیا ہے۔ کہ اگر خدانخواستہ کسی وقت یہاں ان سے انتفاع نہ ہوسکے۔ تو مدرسہ دیوبند میں ان کو منتقل کردیا جاوے۔

تالیفات کے متعلق وصیت

تالیفات کے بعض مقامات میں مجھ سے اختصار یا ابہام یا زیادہ مرہبہ یا غفلت سے کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہیں۔ جو اس وقت ذہن میں حاضر ہیں۔ ان کی اطلاع جزئی طور پر دیتا ہوں۔ اور جو اس وقت ذہن میں حاضر نہیں ان کے لئے دو قاعدے عرض کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ میری کسی ایسی تصنیف میں جو اس محل لغزش سے متاخر ہو۔ اس کی اصلاح کردی گئی ہو۔ اور متاخر ہونا تاریخ کے ملانے سے جو کہ ہر تصنیف کے آخر میں التزاماً لکھی گئی ہے۔ معلوم ہوسکتا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم کرلینا چاہیئے کہ میری تالیفات میں جو مضمون متعارض ہو۔ اس میں اخیر کا قول میرا سمجھا جائے۔ دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ ایسے مواقع مشتبہ کو دوسرے علماء محققین سے تحقیق کرلیا جاوے۔ اور ان کے قول کو میرے قول پر ترجیح دی جاوے۔ اس طرح اگر میرا لکھا ہوا کوئی مشتبہ فتویٰ کسی کی نظر سے گذرے۔ اس میں بھی یہی تقریر معروض ہے۔ کیونکہ بعض اوقات لکھنے کے بعد خود مجھ کو بعض جوابوں کا غلط ہونا محقق ہوا ہے۔ میں نے سائل کا پتہ معلوم ہونے پر اس کو مطلع بھی کردیا۔ لیکن پتہ معلوم ہونے کی صورت میں یا اس سائل کے پاس میری تصحیح کے محفوظ نہ رہنے کی تقدیر پر احتمال غلطی میں پڑنے کا ہوسکتا ہے۔ اسلئے احتیاطاً یہ عرض کیا گیا۔ اب اول جزئی

غلطیوں کے مقامات کو نقل کرتا ہوں۔

مقام اول "بہشتی زیور" میں عشاء کے بعد چار سنتیں لکھ دی ہیں صحیح یہ ہے کہ دو سنت ہیں اور دو نفل۔

مقام دوم بہشتی زیور میں ایام بیض ۱۲۔۱۳۔۱۴ تاریخوں کو لکھ دیا ہے صحیح ۱۳۔۱۴۔۱۵ ہیں۔

مقام سوم۔ تعلیم الدین و بہشتی زیور میں تیجے چالیسویں وغیرہ کے بدعت کے ہونے کے ذکر میں یہ لفظ لکھا گیا ہے۔ ضروری سمجھ کر کرنا اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید غیر ضروری سمجھ کر کرنا جائز ہو۔ سو یہ قید واقعی تھی۔ احترازی نہ تھی۔ حکم یہ ہے کہ خواہ کسی طرح سے کرے بدعت ہے

مقام چہارم "تعلیم الدین" میں قبروں پر چراغ جلانے کے بارہ میں یہ لفظ لکھا گیا ہے "کثرت سے چراغ جلانا" اس میں بھی مثل مقام سوم کے سمجھنا چاہیئے۔ حکم یہ ہے کہ ایک چراغ رکھنا بھی بدعت ہے۔

مقام پنجم۔ تعلیم الدین میں روپیہ کے پیسے ادھار لینے کو مطلقاً منع لکھ دیا ہے۔ اور واقع میں اس حکم میں تفصیل ہے۔ اگر عقد میں پورے پیسے ٹھہرے ہوں۔ دونی چونی وغیرہ نہ ٹھہری ہوں۔ اور عاقد کے پاس مبادلہ کے وقت پیسے پورے موجود بھی ہوں۔ لیکن کسی وجہ سے اس وقت قبضہ نہیں کرایا۔ تب تو جائز ہے۔ اور اگر ایک شرط بھی مفقود ہو تو ناجائز ہے۔ چونکہ عام لوگ ان دونوں شرطوں کا لحاظ نہیں کرتے اسلیئے انتظاماً علی الاطلاق منع کر دیا گیا۔

مقام ششم "شوق وطن" گیارھویں باب صفحہ ۲۲ میں ایک حدیث میں بوجہ غلطی نسخہ کے لم یؤمن لکھا گیا۔ اور دوسرے کالم میں اس بنا پر ترجمہ بھی غلط ہو گیا۔ صحیح متن لم یؤذن ہے اور ترجمہ یہ ہونا چاہیئے۔ جو شخص (با وجود ایسے حقوق متعلق ہونے کے جن میں وصیت کرنا واجب ہو) وصیت نہ کر جائے۔ اس کو مُردوں کے ساتھ کلام کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔ الخ

مقام ہفتم۔ یادگار دربار پر انوار کے بالکل آخر میں ایک مضمون از قبیل عملیات لکھا ہے وہ کسی بزرگ سے منقول نہیں ایک صاحب کانپوری کاتب مضمون نے بہ نیت نفع وہاں کے مزار کی ایک تاویل سے ایسا لکھ دیا ہے۔ اسلیئے اس عمل کو منقول سمجھ کر استعمال نہ کریں۔ نیز اس کی ترکیب بھی بلا تکلف قواعد سنت پر منطبق نہیں ہوتی۔

"فروع الایمان" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر پابندی احکام کے ساتھ ڈپٹی کلکٹری یا بیرسٹری وغیرہ اختیار کرو۔ تو چشم ما روشن دل ما شاد انتہی۔ اس سے بظاہر شبہ ان اعمال کے جواز کا معلوم

ہوتا ہے۔ سو سمجھ لینا چاہیئے کہ مقصود اس عبارت سے یہ ہے کہ اگر پابندی احکام کے ساتھ ترقی دنیوی ہو۔ تو اجازت ہے۔ یہ مثالیں تو مقصود نہیں کیونکہ ان اعمال کا مشروع ہونا نہ ہونا محتاج تفصیل مستقل ہے۔ البتہ ان مثالوں کو اظہار عنان و تسامح پر محمول کرنا چاہیئے۔ اور ان کے جواز علی الاطلاق کا شبہ نہ کرنا چاہیئے۔

میری تحریرات میں جو مضامین از قبیل علوم مکاشفہ ہیں۔ جو کہ علم تصوف کی ایک قسم ہے۔ جس کو حقائق و معارف سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور حجج شرعیہ ان سے ساکت ہیں۔ ان کو حسب قواعد اصولیہ و کلامیہ اموز ثابتہ بدلائل شرعیہ کے درجہ میں نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ بالکل اعتقاد نہ رکھنا بھی جائز ہے۔ اور اگر اعتقاد رکھے۔ تو محض احتمال کے درجے سے تجاوز نہ کرے۔

اصلاح مسودات کے متعلق وصیت

مولوی ظفر احمد عثمانی اکو وصیت کرتا ہوں کہ جو مواعظ میری نظر اصلاحی سے رہ جائیں۔ بشرطیکہ مولوی شبیر علی یا خواجہ عزیز الحسن یا حکیم محمد مصطفےٰ یا اور جو ان کی نظر میں صالح للاعانت ہوں۔ ان کی معیت میں ان پر بجائے میری نظر اصلاحی کر لیں۔

غیر مکمل مسودات کی تکمیل کے متعلق وصیت

جو مضمون میری طرف منسوب ہے۔ وہ بدون میری نظر ثانی کے جس کی علامت جابجا میرا بنانا ہے۔ جس کو میرا خط پہچاننے والے جان سکتے ہیں۔ اور مدت سے یہ بھی التزام ہے کہ اخیر میں یہ عبارت کہ "معائنہ کردہ شد" لکھ کر دستخط کر دیتا ہوں۔ بسبب احتمال غلطی نقل کر کے میری طرف منسوب نہ کیا جاوے (۲) ایسے غیر مکمل مضامین کی تکمیل بشرط امکان مولوی حبیب احمد صاحب و مولوی شبیر علی صاحب و مولوی ظفر احمد و مولوی حکیم محمد مصطفےٰ صاحب اور صرف صفائی مواعظ میں خواجہ عزیز الحسن صاحب سے یا جس کو یہ سب منتخب کریں۔ کرائی جاوے۔ اور مسودہ اجمالیہ کی اگر تسوید تفصیلی میں تکلف معلوم ہو۔ تو ان کو بصورت ملفوظات ہی صاف کر لیں (۳) اور اس صورت میں اس مضمون کی نسبت اس تکمیل کنندہ کی طرف کی جاوے اور تکمیل کنندہ کی ہر طرح کی اصلاح میں پورا اختیار ہے۔

تکمیل تحقیق تالیفات کے متعلق وصیت

یہ سب مضامین میں اہم ہے۔ ضمیمہ تتمہ خاتمہ تنبیہات کے مضمون ثانی میں بذیل نمبر ۲۷ ایک کتاب کا نام لکھا ہے۔ تصحیح الاغلاط۔ جس کی نسبت (لفظ) زیر تحریر لکھا ہے۔ اب بفضلہ تعالیٰ اس کا کام جاری

ہو گیا ہے۔ حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ مجھ کو اپنے فہم یا تحقیق پر وثوق تو کبھی نہیں ہوا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اپنے ساتھ اتنی بدگمانی بھی نہ تھی کہ از خود اپنی زلات واغلاط کی تفتیش کا اہتمام کرتا۔ البتہ اگر اتفاقاً ..... کسی نے کسی غلطی کی اطلاع دی۔ بحمد اللہ فوراً رجوع کرلیا۔ اور کسی نہ کسی موقع پر اس کو شائع کر دیا۔ چنانچہ میری تحریرات سے یہ بات ظاہر ہے خصوص امداد الفتاویٰ کے بعض حصص کے آخر میں ایک طویل فہرست بھی اس کی ملحق ہے یہ ایک دور ہے۔ پھر جب ان تنبیہات کی تعداد معتد بہ ہو گئی۔ تو مصلحت معلوم ہوئی۔ کہ اس کا ایک مستقل سلسلہ جاری رکھا جائے۔ چنانچہ ترجیح الراجح کی یہی حقیقت ہے۔ جس کا اس سنہ میں حصہ رابع جمع ہو رہا ہے۔ اور یہ دوسرا دور ہے۔ پھر خیال ہوا کہ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر لغزش پر کوئی نہ کوئی متنبہ بھی کر دیا کرے۔ تو اس صورت میں بہت زلات اصلاح سے رہ جاویں گے اسلئے اس کا یہ اہتمام کیا گیا کہ اہل علم میں سے ایسے متدین و معتمد علماً و عملاً حضرات کو جو نہ میری رعایت کریں اور نہ خواہ مخواہ کا عناد کریں۔ اپنی تمام مؤلفات پر نظر ثانی کرنے کے لئے منتخب کر کے ان کو یہ کام سپرد کر دیا گیا۔ کہ ایسے مواقع پر پوری تحقیق اور آزادی سے کام لے کر۔ ایسے زلات کی تصحیح فرماویں۔ چنانچہ نہایت خوبی سے یہ کام ہو رہا ہے اور حقیقت اس کتاب کی یہی ہے۔ اور یہ تیسرا دور ہے۔

میری وصیت یہ ہے کہ اگر میرے سامنے یہ کام مکمل نہ ہو۔ تو میرے بعد بھی اس کو جاری رکھیں۔ اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل و اشاعت کو سہل فرماویں۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

تنقید متعلق مؤلفات خود

یوں تو اپنے جمیع مؤلفات کے متعلق احتیاطاً مشورہ دیتا ہوں کہ دوسرے محققین علماء سے ان کی تنقید کرا کر عمل کریں۔ مگر بعض مؤلفات کی نسبت خصوصیت سے کچھ تنبیہات کرتا ہوں۔

(۱) القول الوجید کو عام لوگ نہ دیکھیں اور خواص بھی ان کو صرف ذوقیات و لطائف کے درجہ سے آگے نہ بڑھاویں۔

۲۔ نیل الشفاء کے متعلق النور نمبر ۹ جلد ۳ میں ایک تنبیہ شائع ہوئی ہے۔ اسکے خلاف نہ کریں

۳۔ فیصلہ ہفت مسئلہ کے متعلق تنبیہات وصیت کی تنبیہ دہم واجب العمل ہے۔

۴۔ بہشتی زیور و گوہر و امداد الفتاویٰ مع تتمات اور حوادث کے ساتھ ترجیح الراجح کا ضرور مطالعہ

فرما دیں کہ اس میں بہت سے مقامات کی اصلاح ہے۔ اور مکمل دلائل بہشتی زیور وگوہر کی طبع میں مولوی شبیر علی نے ان ضروری اصلاحات کو لیا بھی ہے۔

۵۔ جمال القرآن میں متعدد تسامحات ہو گئے ہیں۔ اب اصلاح کے بعد مولوی شبیر علی اسکو مکرر شائع کرنے والے ہیں۔ اس کو مکمل سمجھیں۔

۶۔ نصح الاخوان کے بعض مضامین میں بعض علماء نے بعض عبارات کے اجمال یا ایہام کے سبب اختلاف کیا ہے۔ کسی محقق سے سبقاً سبقاً پڑھ لیں اور اختلاف میں جو حق ثابت ہو اس کا اتباع کریں۔

۷۔ مسائل اہل الخانہ میں میری آخری تحریر کو قول فیصل نہ سمجھیں مستقل تحقیق کرلیں۔

آخر میں دعا ہے کہ حق تعالیٰ میری خطاء وعمد کو معاف فرما دیں۔ اور میری تقریرات وتحریرات کو اضلال کا سبب نہ بنا دیں۔

سوانح حیات کے متعلق وصیت

چونکہ محبت میں اکثر مدائح غیر واقعیہ مشہور کر دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے میں اپنی سوانح کا لکھا جانا پسند نہیں کرتا۔ اگر کسی کو بہت ہی بنانے کا شوق ہو۔ اور دوسرے اہل تدین وتحقیق بھی اجازت دیں تو روایت میں احتیاط شدید کو واجب سمجھنا چاہیئے۔ ورنہ میں بری ہوتا ہوں۔

خطوط کے متعلق وصیت

میرے بعد میرے نام کے خطوط خواہ لفافے ہوں یا کارڈ اور جوابی ہوں یا غیر جوابی اسی طرح منی آرڈر بھی وصول نہ کئے جاویں۔ بلکہ ان پر کیفیت لکھ کر واپس کر دیئے جاویں۔ البتہ اگر کوئی منی آرڈر کوپن سے مرسل کا معلوم ہو تو ڈاک والے اگر وعدہ کریں کہ مرسل کا خط دیکھ کر ہم دیدیں گے۔ تب جس قدر قانوناً گنجائش ہو۔ ڈاک خانہ میں امانت رکھا کر مرسل کے پاس خط بھیج کر دریافت کرلیا جاوے اور اس خط کا محصول میرے اس ترکہ سے دیا جائے۔ جو کہ میں نے اس غرض کیلئے متعین کیا گیا ہے۔ پھر وہ خط اہل ڈاک کو دکھا کر منی آرڈر وصول کرلیا جائے۔ اور اگر اس طرح وصول کرنا خلاف قواعد ڈاکخانہ کے ہو۔ تو ابتداء ہی سے واپس کر دیا جائے۔

اجازت یافتگان کے متعلق وصیت

میں نے مختلف اوقات میں جن صاحبوں کو بیعت لینے اور تعلیم وتلقین کی اجازت دی ہے۔ ان میں سے بعض حضرات اگرچہ وہ قلیل ہی ہیں۔ مجھ سے خط وکتابت اس قدر کم رکھتے ہیں کہ وہ انکے

موجودہ حالات کے اندازہ کرلینے کے لئے کافی نہیں اور اجازت کی حالت کا رکہ ان کا حاصل حالاً درستی اور بنا برمناسبت آلاتوقع رسوخ ہے متغیر ہوجانا کچھ مستبعد نہیں۔ فان الحی لا تؤمن علیہ الفتنۃ بلکہ یہ احتمال بعد راسخ ہوجانے کے بھی محال نہیں۔ اگرچہ نادر بحکم معدوم ہے کیونکہ رسوخ واقعی کا جس میں تغیر عادۃً محال ہے۔ علم قطعی کس کو ہوسکتا ہے۔ اور ظن کی خود حقیقت منجانب مخالف کے محتمل ہونے کو بتلا رہی ہے۔ اسلئے احتیاطاً سب مجازین کے متعلق بالخصوص مکاتبت نہ رکھنے والوں کے بارہ میں یہ عرض عام ہے کہ ان سے رجوع کرنے میں محض میری اجازت پر اعتماد نہ رکھیں۔ بلکہ جو علامات احقر نے "تعلیم الدین" میں صاحب کمال کی لکھی ہیں۔ ان پر منطبق کرکے عمل کریں۔ میں اپنے بعد اس کا بار نہیں رکھنا چاہتا۔

چونکہ بعض کے حالات ہی معلوم نہیں ہوتے۔ اور بعض کے حالات مشتبہ سننے میں آتے ہیں اسلئے احتیاطاً انتخاب کے بعد مجازین کی ایک مستقل فہرست تجویز کیا ہوں۔ ان کے سوا اوروں کو فی الحال مجاز نہ سمجھا جائے۔ البتہ اگر کسی کا حال قابل اطمینان ثابت ہوگا۔۔۔۔۔ اس کا نام از سر نو درج کیا جاویگا۔ بقیہ اوروں کو مجاز نہ سمجھنا ان کی صلاحیت کی نفی نہیں۔ میرے علم صلاحیت کی نفی ہے۔ یعنی ان کے قابل اجازت ہونے کی مجھ کو تحقیق نہیں۔

ضمیمہ متعلق معاش اہل علم

چونکہ ظاہر بینوں کو اہل علم پر شبہ دین فروشی کا ہوجاتا ہے اسلئے مدت سے خیال تھا کہ اہل علم کو کچھ حلال صنعتیں و حرفتیں بھی سیکھ لینا چاہیئے۔ تاکہ اگر توکل کے ساتھ دین کی خدمت نہ کرسکیں۔ تو ان ذرائع سے اکتساب معاش کرکے اپنی اور دین کی آبرو محفوظ رکھ سکیں۔ ذیل میں ایک فہرست ان ذرائع کی مع ان ماہرین کے نام و نشان کے دی جاتی ہے جنہوں نے خلوص کے ساتھ ان کی تعلیم کردینے کا صراحتہً یا دلالۃً وعدہ فرمایا ہے۔

(۱) مدرسی مدارس اسلامیہ (۲) زراعت حاجی عزیز الرحمٰن صاحب اچولی ضلع میرٹھ (۳) طب مولوی حکیم محمد مصطفےٰ صاحب میرٹھ محلہ کرم علی (۴) بیگ سازی چمڑا سازی منیجر کارخانہ ٹینری مولوی عبد الحلیم صاحب (۵) گھڑی سازی حافظ عبد الرزاق صاحب نصیر اینڈ کمپنی میرٹھ صدر بازار۔ (۶) کتابت و چھپائی منشی محبوب علی صاحب مطبع نامی میرٹھ (۷) تجارت کتب محمد عثمان خاں صاحب تاجر کتب دریبہ کلاں دہلی (۸) صابن سازی میر معصوم علی نارویسے سوپ کمپنی خیر نگر دروازہ میرٹھ (۹) حدادی (۱۰) نجاری مستری محمد صدیق

کیرانہ ضلع مظفر نگر (۱۱) بیڑی سازی (۱۲) خیاطت سلیمان پوسٹ بن گڈھی پختہ ضلع مظفر نگر (۱۳) صحافی یعنی جلد بندی (۱۴) ٹین سازی (۱۵) ملازمت اسکول ہائے سرکاری بذریعہ امتحان مولوی فاضل وغیرہ۔

بھلا اب یہ احتیاط و اہتمام کہاں۔ اس کی نظیر تو عہد متاخرین میں بھی بآسانی ملنی مشکل ہے

علالت و رحلت

قابل رشک صحت

حضرت تھانوی کی صحت کے متعلق مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرتؒ کی صحت جسمانی مدتوں قابل رشک رہی ایک تو جثہ قدرۃً قوی تھا۔ کاٹھی اچھی تھی۔ اور پھر حضرت کی احتیاط خوئے اعتدال اور ہر بد پرہیزی سے پرہیز میلوں چلنے اور خوب چلنے کی عادت، نتیجہ قدرۃً یہ تھا کہ اپنے اصل سن سے ۱۰-۱۵ سال کم معلوم ہوتے تھے اور مدتوں بیماری پاس بھی نہیں پھٹکنے پائی (حکیم الامت ص۵۰۳)

۷۰ سال کی عمر میں بھی رات کے وقت لکھنے پڑھنے کا کام بے تکلف بلا عینک کی مدد کے کر لیتے تھے"۔ (ایضاً ص۲۹۸)

وفات کی پیشگوئی

مولانا دریابادی کا اکثر تھانہ بھون آنا جانا رہتا تھا۔ نومبر ۱۹۳۲ء کے آغاز میں جب ان کی وہاں حاضری ہوئی۔ تو پہلی دفعہ ان کے کان چند ایسے فقروں سے آشنا ہوئے جن کے سننے کے لئے نہ تو وہ تیار تھے۔ اور نہ متحمل۔ لکھتے ہیں:۔

"اب کی بار طبیعت کو ذرا ناساز پایا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ ایک روز صبح کی مجلس خصوصی میں کچھ الفاظ اس طرح کے ادا فرمائے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اب اپنا وقت موعود قریب سمجھ رہے ہیں۔ کلمات میں یاس کا پہلو مطلق نہ تھا۔ کچھ اس طرح کا ذکر تھا کہ لکھنے پڑھنے کا کام جو کرنا تھا۔ وہ کر چکا۔ یہ کلمات کچھ اس مؤثر انداز میں زبان مبارک سے نکلے کہ میرا تو دل لرز گیا۔ اور یہ خیال کر کے کہ شمع اب جلد ہی بجھنے والی ہے۔ وہیں سرِ محفل آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے"۔

(حکیم الامت ص۵-۲۶۹)

اس سے ان کے دل میں جو ایک خطرہ سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی تصدیق کے لئے انہوں نے اپنے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں حضرت تھانوی کو لکھا کہ :-

"رسالہ استواء کے خاتمہ پر جو عربی عبارت درج ہوئی ہے۔ اس سے دل بہت متاثر ہوا کہ اب تصنیف و تالیف کا دور ختم ہو گیا۔ پچھلے مہینہ زبانی میں نے جناب والا سے یہی مضمون سنا تھا۔ اس وقت بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے بلا تشبیہ وہی کیفیت ہوئی جو آیۂ الیوم اکملت لکم دینکم الخ کو سن کر حضرت صدیقؓ کی ہوئی تھی۔ خدا جانے آپ کو کیا کچھ معلوم ہوا ہوگا۔ جب ہی تو آپ نے اپنی تصانیف کے خاتمہ کا اعلان فرما دیا۔"

حضرت نے اس آخری سوال کے جواب میں لکھا کہ :-

"صرف بڑھاپا اور کچھ نہیں۔"

مولانا دریابادی کی اس خواہش کا جواب کہ :-

"میں تو خالص اپنی خود غرضی کی بنا پر دعا کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ رہوں کم از کم اس وقت تک تو ضرور ہی جناب کو زندگی عطا ہو۔"

تو آپ نے لکھا کہ :-

"اور اگر پھر کوئی یہی دعا کرے۔ تو میں کہاں تک کھینچتا چلا جاؤں۔ یہ دعا کیجئے کہ وہاں سب مل جائیں۔" (حکیم الامت صـ۲۷۳)

آغازِ ضعف اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں پہلی بار حضرت کے زبان و قلم پر اپنے قویٰ، خصوصاً قوائے دماغی کے متعلق ایسے الفاظ آنے لگے :-

"اب میرا دماغ متحمل نہیں رہا۔" (حکیم الامت صـ۳۶۰)

"اب غائر نظر سے دیکھنے کی ہمت نہیں رہی" (ایضاً صـ۲۷۲)

لیکن آخر کہاں تک اور کب تک۔ اب سن ۸۰ سال کا تھا۔ اور ضعف نمایاں ہو چلا تھا۔ وسط ۱۹۳۸ء سے علالت مزاج مسلسل رہنے لگی۔ اس کی خبریں مختلف ذرائع سے آتی رہیں۔ سن سن کر ہول بڑھتا رہا۔ اور دعائیں اضطراب و اضطرار کے ساتھ ہونٹوں پر آتی رہیں۔" (حکیم الامت صـ۵۳)

مگر اس کے باوجود آپ کے ڈاک کے معمول میں فرق نہ آیا۔ البتہ ان میں حسب عذر کچھ نہ کچھ تخفیف

ہوتی رہی۔ اور احباب میں سے جن کے طویل طویل خط آتے۔ ان کو حتی الوسع مایوس نہ فرماتے مگر آخر نوبت بانیجا رسید کہ مولانا عبدالماجد صاحب کو اطلاع خاص بنا بر بے تکلفی" ان الفاظ میں بھیجی:۔

"مدت سے دماغی کام سے قاصر ہو گیا ہوں اور اکثر ایسی خدمات (علمی فقہی سوالات کے جواب دینے کے) عذر کر کے دوسرے اہل علم کا پتہ دیتا ہوں۔ چنانچہ استفتاء عموماً واپس ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ کے خط کے جواب میں عذر کرنے کو جی نہ چاہا۔ چونکہ طبع میں اضمحلال محسوس ہوتا تھا۔ اس کے نفع کے انتظار میں رہا کل قدرے نشاط معلوم ہوا۔ جواب لکھا۔ مگر اس تدر تعب ہوا کہ اس وقت تک دماغ میں درد اور طبیعت میں کسل غیر معمولی موجود ہے۔ اس تجربہ کے بعد صرف اسکی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر کبھی کسی جواب سے تقاعد کا اتفاق ہو جائے تو اس عذر پر محمول فرما لیا جاوے۔ لیکن سوال میں آپ بالکل آزاد ہیں"۔

(حکیم الامت صـ۵۲۶)

مرض الموت

خواجہ عزیزالحسن صاحب خاتمۃ السوانح میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اصل مرض وفات ضعف معدہ اور ورم جگر تھا۔ جس کے آثار یہ تھے کہ کبھی قبض لاحق ہو جاتا۔ جس سے حضرت اقدس کو سخت الجھن اور اذیت ہوتی۔ اور کبھی دستوں کے دورے ہونے لگتے۔ جس سے شدید ضعف ہو جاتا۔ علاوہ بریں مختلف اعضا پر ورم بھی رہنے لگا تھا آخر زمانہ میں اشتہا مفقود ہو گئی تھی۔ اور اکثر اوقات غنودگی کا عالم طاری رہنے لگا تھا۔ ان میں سے اکثر شکایات کم و بیش تقریباً پانچ سال متواتر رہیں۔ اس عرصہ میں علاج برابر جاری رہا۔ جس کے سلسلہ میں ایک بار سہارنپور اور دو بار لکھنؤ بھی معتد بہ مدت تک قیام فرمایا۔ مختلف طبیب بھی بدلے۔ جنہوں نے نہایت دلسوزی اور والہانہ توجہ سے علاج کیا۔ کیونکہ ان میں اکثر معتقدین جاں نثار تھے۔ لیکن اگر کبھی افاقہ ہوا تو محض عارضی ہوا۔ مرض کا استیصال کلی کسی علاج سے نہ ہو سکا۔ بالآخر نوبت بانیجا رسید کہ سقوط اشتہا کے باعث غذا تقریباً بالکل متروک ہو گئی۔ اور ضعف روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کی جانب حضرت اقدس بار بار معالجین کی توجہ منعطف فرماتے رہے اور اس عنوان سے کہ جب یہ حالت ہے اس کا انجام سوچ لیا جائے۔ گو میں تو اس انجام کے لئے تیار ہوں۔ لیکن گزارش گذار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

بالآخر باوجود انتہائی ضعف کے لکھنؤ کے طویل سفر کا پھر قصد فرمایا۔ لیکن اتنے میں دستوں کا آخری
دورہ شروع ہوگیا جس کا امتداد نہایت اشتداد کے ساتھ تقریباً ایک ماہ تک رہا۔ اور جس نے
رفتہ رفتہ بالکل صاحبِ فراش کر کے سفر کا امکان ہی منقطع کر دیا۔ اس دوران میں وہ چند مرغوبات
بھی چھوٹ گئیں جو کسی درجہ میں قوت پہنچاتی رہتی تھیں۔ اس حالت کے متعلق وفات سے
چند روز قبل حاضرین خاص سے فرمایا کہ اب تو کسی چیز کی بھی رغبت نہیں رہی۔ بس خواجہ صاحب
کا یہ شعر حسب حال ہے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی   اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

قوتِ قدسیہ لیکن با ایں ہمہ حضرت اقدس کی قوتِ قدسیہ ایسی کارفرما تھی کہ باوجود صرف
پوست و استخواں رہ جانے کے جس وقت غنودگی سے چونکتے ہوش و حواس
تدبر و انتظام، تحقیق و تدقیق، ہمہ گیری و رسائی، فکر، استحکام و اصابت رائے وغیرہ جملہ خصوصی اوصاف
حضرت والا اپنی اسی بے نظیر امتیازی شان سے نمودار ہونے لگتے۔ جو بحالت صحت ہمیشہ سے
تھی۔ بس صرف آواز کی پستی کا فرق ہوتا۔ ان حالات میں آخر وقت تک نہ صرف خدام و متعلقین
ہی کو بلکہ طبیبوں کو بھی افاقہ کا دھوکا رہا۔ گویا دو چار روز سے چہرۂ اقدس پر بھی جس کو اس سے
قبل ہمیشہ انتہائی ضعف و علالت کی حالت میں بھی بجلیۂ رعب و داب و ہیبت شاہانہ ہی دیکھا
گیا، ضعف کی خاص حالت تھی۔ اس سے مایوسی کے بھی خیالات آنے لگے۔ خود حضرت
نے بھی اس زمانہ میں بعض اوقات فرمایا کہ گو جسمانی تکلیف ہے لیکن الحمدللہ طبیعت منشرح
ہے۔ ایک بار فرمایا کہ کبھی کبھی خیال کرتا ہوں کہ بیکار تو پڑا ہی ہوں۔ لاؤ لیٹے لیٹے کچھ ذکر اللہ
ہی کر دوں۔ لیکن ضعف اس قدر ہے کہ زبان اٹھتی ہی نہیں۔ گو الحمدللہ قلب سے تو ذکر کرتا رہتا
ہوں۔ ایک دن بعد عصر آنکھیں بند کئے حسبِ دستور کروٹ لئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سمجھے
کہ غنودگی میں ہیں۔ مولوی جمیل احمد صاحب نے کچھ استفسار کسی غذا کے متعلق کہا تو جھنجھلا کر
آنکھیں بند کئے ہوئے ہی فرمایا کیا واہیات ہے۔ ایک مشغول آدمی کو اپنی طرف متوجہ
کرنا۔ مولوی صاحب نے عرض کیا بہت اچھا۔ تو اپنے مخصوص طرز تنبیہ میں فرمایا کہ ہمیشہ یہی
جواب ملتا ہے کہ بہت اچھا۔ لیکن عمل کبھی نہیں ہوتا۔

اس انتہائی عالمِ ضعف و انحطاط میں خطوط کو سن سن کر جو جوابات زبانی لکھواتے رہے ان
سے بھی سننے والوں کو حیرت پر حیرت ہوتی تھی کہ ہر لحاظ سے ہر مضمون نہایت جامع مانع اور سارے

ضروری پہلوؤں کو بالکل حاوی ہوتا تھا۔ حالانکہ غنودگی بھی طاری ہو ہو جاتی۔ لیکن جب افاقہ ہوتا۔ پھر لکھوانا شروع فرما دیتے۔ اور تسلسل میں ذرا فرق نہ آنے پاتا۔ اسی دوران میں ایک مصیبت زدہ بی بی کے جو حضرت اقدس کے کانپور کے زمانہ کے دیرینہ معتقد بلکہ دوست کی بیٹی تھیں۔ ایک نہایت دردناک خط کہ جو بہت طویل اور متعدد مضمونوں اور درخواستوں پر مشتمل تھا۔ پڑھا سنا۔ گو ہم لوگوں کے گمان میں کبھی کبھی غنودگی سی بھی طاری ہو گئی لیکن جب اس کا یکجائی جواب لکھوایا تو سننے والے حاضرین مجلس کو حیرت ہو گئی۔ کیونکہ کوئی جز ایسا نہ چھوڑا۔ جس کا جواب نہ لکھا دیا ہو۔ اور وہ بھی نہایت شفقت آمیز تسلی بخش موثر۔ جامع۔ مانع اور باربط۔ دورِ غنودگی میں اس درجہ حاضر دماغی۔ اللہ اکبر

حقیقتِ غنودگی

ایسے ہی حالات کو دیکھ کر جناب حکیم خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے جو حضرت کے معالج تھے۔ یہ فرمایا کہ یہ غنودگی طبی نہیں ہے بلکہ ظاہراً استغراق اور توجہ الی اللہ سے ناشی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم نے بہت سے مریض غنودگی والے دیکھے ہیں۔ ان پر غنودگی سے افاقہ کے بعد بھی کچھ ہنوز اس کا باقی رہتا ہے۔ دماغ کچھ بھولا بھولا سا رہتا ہے۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ خود غنودگی سے ہوشیار ہوئے یا ہوشیار کرنے سے ہوشیار ہوئے تو پھر دماغ پر غنودگی کا کوئی اثر ہی محسوس نہیں ہوتا" اور حضرتؒ چونکہ ہر حال میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے عادی تھے۔ تکلیف میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو ایسا نکال لیتے تھے۔ جو قابلِ شکر ہو۔ کسی بھی تکلیف میں کبھی کوئی شکایت حضرت کے قلب میں پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اسلئے آپ اس غنودگی کی یہ تعبیر فرماتے تھے کہ "یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ کیونکہ غنودگی میں مرض کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی"

(خاتمۃ السوانح صـ ٣٠)

تفکر و تردد

ایسے نازک وقت میں عام طور پر لوگ مریض کی تسلی کرانے کی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ مگر یہاں مریض مزاج پرسی کرنے والوں کی فکر میں تھا۔ آپ انہیں اس عالم میں ایسے عجیب جواب دیتے تھے۔ جن سے نہ تردد پیدا ہوتا تھا۔ اور نہ بے خبری گویا بیماری کے اس شدید ترین دور میں بھی دماغ صحیح کام کر رہا تھا۔ فرماتے تھے کہ اگر یہ لکھ دیا جائے کہ طبیعت اچھی ہے۔ حالانکہ اچھی نہیں۔ تو اس میں پوچھنے والوں کے سوال کو گویا مہمل قرار دینا ہے۔ اور یہ بھی دلشکنی کا باعث ہے۔ نیز ان کا حق بھی ہے کہ ان کو طبیعت کا حال

بتایا جائے۔ ہاں اس طور پر نہیں کہ وہ پریشان ہو جاویں۔ چنانچہ حضرت کسی کو تحریر فرما دیتے
کہ بیماروں میں تندرست ہوں اور تندرستوں میں بیمار۔ کسی کو لکھوا دیتے کہ مرض میں کمی ہے
مگر ضعف میں زیادتی ہے۔ کسی کو لکھوا دیتے کہ جیسا دیکھ گئے ہو۔ ویسا ہی ہوں۔ اور کسی کو
لکھاتے کہ مزاج تو اچھا ہے۔ معدہ اچھا نہیں ہے۔ گویا آخری وقت بھی مصالحِ عقلیہ۔
جذباتِ نفسیہ اور ضروریاتِ شرعیہ پر پوری پوری نظر رہی۔

سخت قدغن

شدتِ علالت کی اطلاع کی ہمیشہ خدام کو سخت ممانعت تھی۔ تاکہ دوسروں کو
پریشانی نہ ہو مگر اس کے باوجود علالت کی خبریں دور دراز تک برابر پہنچ رہی
تھیں مشتاقانِ دید پروانہ وار خانقاہ اشرفیہ کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اور دربارِ اشرفیہ کے
ضابطوں کی پابندیوں کو اس پریشانی کے عالم میں بھول رہے تھے۔ مگر ضابطوں کا بادشاہ اپنی
زندگی کے آخری لمحات میں بھی ان کی پوری طرح پابندی کر رہا تھا۔ کوئی پشاور سے بھاگا آرہا
ہے۔ تو کوئی گورکھپور سے اور کوئی کسی دوسرے دور دراز مقام سے بلا اطلاع آرہا ہے۔ مگر ہر
آنے والے سے یہی ارشاد ہوتا کہ اجازت نامہ کہاں ہے؟ جب وہ معذوری ظاہر کرتے اور
اعترافِ قصور کرتے تو فرماتے کہ تمہاری غلطی کا خمیازہ میں کیوں اٹھاؤں۔ پھر حاضرین سے
خطاب فرماتے کہ ان کو میں محروم کر کے بھی محروم نہیں کرتا ہوں۔ ایک سبق دے رہا ہوں ان
کے ناکام واپس جانے کا یہ اثر ہوگا۔ کہ یہ خبر سن کر دوسرے لوگ آنے بند ہو جائیں گے
اور اس طرح ان کو فائدہ پہنچے گا۔ اسی بے اجازت آنے والے ہجوم میں ہمارے علامۃ العصر
مورخ اسلام سید سلیمان ندویؒ بھی تھے۔ جو ہزاروں معتقدوں کی طرح زیارت کے لئے بے
چین تھے۔ چنانچہ وہ بھی بلا اجازت تھانہ بھون کو چل پڑے لکھتے ہیں کہ:۔

"خاکسار بھی خلافِ دستور بے اطلاع ٦ جولائی کو لکھنؤ سے روانہ ہو گیا اور ۷ کی
دوپہر کو عین بارش کی حالت میں اسٹیشن سے خانقاہ تک پیادہ پا بھیگتے ہوئے
پہنچا۔ دریافتِ حال سے معلوم ہوا کہ افاقہ کی صورت ہے جس سے تسکین ہوئی
میرا اس طرح خلافِ دستور بے اطلاع اچانک پہنچ جانا حضرت کے لئے تعجب
کا موجب ہوا۔ میری آمد کی خبر دینے والے سے پوچھا کہ "تم مولوی سلیمان کو پہچانتے
بھی ہو یا یونہی کہہ رہے ہو"۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ تو ارشاد ہوا کہ "ان کی عادت
بے اطلاع آنے کی نہ تھی"۔ حضرت کے عزیز خاص مولانا جمیل احمد صاحب نے عرض

کی علالت کی خبر سن کر چلے آئے ہوں گے۔ نماز ظہر کے بعد مجلس میں حاضری ہوئی۔ ضعف سے بستر پر لیٹے تھے۔ مصافحہ فرمایا۔ خاکسار نے دست مبارک کو بوسہ دیا! شفقت سے بشاشت ظاہر فرمائی۔ سفر کا حال پوچھا۔ کسی خادم کے ساتھ نہ لینے پر نصیحت فرمائی۔"
(یادِ رفتگاں ص۲۸۸)

اہتمامِ مجلس خواجہ عزیزالحسن صاحب لکھتے ہیں کہ:۔
"باہر چھتہ کے نیچے بیرونی اور مقامی مشتاقانِ دید گھنٹوں اس اشتیاق میں بیٹھے رہتے تھے کہ کب طالع کی زینت آئے۔ اور محض ایک جھلک ہی دیکھنا نصیب ہو جائے۔ گو اس کا موقعہ بھی بعض وقت نہ ملتا تھا۔ اور اکثر تو باوجود عدم باریابی ویسے ہی بیٹھے رہنے کو موجبِ تسلی سمجھتے تھے۔ ان کا برابر جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ جو باریاب بھی ہو جاتے تھے۔ تو صرف شروع میں۔ اور صرف دو چار کلمات حضرت کی زبانِ فیض ترجمان سے سننے ہی پاتے تھے کہ حضرت پر بے اختیارانہ طور پر عالمِ غنودگی طاری ہونے لگتا تھا۔ بس گویا اس شعر کا منظر آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا ؎

اف وہ پروانے کہ سمٹے ہی چلے جاتے ہیں ہائے وہ شمع کہ خاموش ہوئی جاتی ہے

مگر اس حال میں بھی کیا مجال کہ انتظامی شان میں فرق آجائے۔ باقاعدہ پرچے نو واردین و مقیمین کے پیش کئے جاتے اور ہر ایک پر بذاتِ خود و بوسائط حسبِ معمول سوال و جواب ہوتے۔ پھر کسی پر منظوری۔ کسی پر نامنظوری۔ کسی پر بشرائط و قیود منظوری دی جاتی۔ یہاں تک کہ کس کو کہاں بٹھایا جائے۔ اس پر حسبِ عادت پوری نظر تھی۔ ایک بار چند خاص خاص اہلِ علم حضرات وفات سے چند پہلے کر رمع رفتار کے حاضر ہوئے۔ تو سہ دری میں جگہ کم تھی۔ اسلئے حاضرین سے فرمایا کہ کچھ لوگ باہر تخت پر جا بیٹھیں تا کہ جگہ ہو جائے۔ ہم لوگ بطورِ خود وہاں جا بیٹھے۔ بعض مدت تو بیٹھے رہے۔ اس پر جائزہ لیا اور دریافت فرمایا کہ کون کون باہر بیٹھے ہیں اور کون کون اندر ہیں۔ پھر ان میں سے بعض کو اندر بٹھایا۔ بعض کو باہر۔ ہر ایک کا نام خود پوچھتے تھے۔ کیونکہ سر اٹھا کر خود دیکھنے کی سکت ہی کہاں تھی اور ہر ایک کے لئے جو جگہ مناسب تھی۔ اس کو وہاں بٹھانے کے لئے فرماتے جاتے تھے

جب سب تجویز فرمودہ جگہوں پر بیٹھ چکے۔ تو فرمایا کہ ترجیح یا مرجح کا کوئی شبہ نہ کریں۔ کیونکہ علاوہ فضل و کمال کے دیگر وجوہ بھی کسی کو اندر کسی کو باہر بٹھانے کے ہیں۔ پھر یہ بھی پوچھا کہ کسی صاحب کو ناگوار تو نہیں ہوا۔ اس پر سب نے عرض کیا کہ جی نہیں۔ تو ان سے فرمایا کہ اب تو یہ حالتِ مرض مستقل سی ہو گئی ہے۔ لہٰذا بار بار تشریف لانے کی بجائے وہیں سے دعائیں یاد فرمالیا کریں۔ (خاتمۃ السوانح ۳۱)

غرضیکہ بقول سید سلیمان ندویؒ

"اس ضعف و اضمحلال کی حالت میں بھی مجلس کا وقار، نظم و ضبط اور اصول و قواعد کی پابندی بدستور جاری تھی۔ اور آخیر لمحۂ حیات تک اس میں فرق نہیں آیا۔"

(یادِ رفتگاں ص ۲۸۹)

آمادگی سفر آخرت

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

"حضرت کو ضبط، صبر اور استقامت سے اپنی تکالیف ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ اور نہ آئندہ کے خطروں کو زبان پر لاتے تھے کہ دوسروں کو بے صبری نہ ہو۔ مگر بات بات سے سفر کی آمادگی ظاہر ہوتی تھی۔ مگر ان کی زندگی اور طرزِ زندگی میں صفائی اور باقاعدگی کی عادی تھی۔ اس کا اثر یہ تھا کہ وقت اخیر کے لئے کوئی کام اٹھا نہیں رکھا تھا۔ کہ سالک ہر لمحہ کو لمحۂ اخیر سمجھتا ہے۔ اور اسی کی تیاری رکھتا ہے۔ یہی حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ کوئی چیز کرنی باقی نہ تھی تمام انتظامات اور حساب کتاب اور وصایا سے پوری پوری فراغت تھی۔ عادت شریف تھی کہ آج کا کام کبھی کل پر اٹھا کر نہیں رکھا۔ گویا ہر وقت آمادہ سفر تھے"

(یادِ رفتگاں ص ۲۹۲)

تعینِ آرامگاہ

صرف یہی نہیں بلکہ:۔

"ایک زمین لے کر اس کو تکیہ یا قبرستان خاص بنا کر وقف کر دیا تھا۔ ایک مختصر سے احاطہ کے اندر ایک زمین گھیر دی گئی تھی جس میں کچھ درخت بھی لگا دئے گئے تھے۔ چھوٹی سی مسجد اور ایک مختصر سا سائبان بھی اس میں ہے اس میں دوسرے اعزہ اور خدام بھی آسودہ ہیں۔ اس کے بیچ میں اس مخدوم کی استراحتِ ابدی کے لئے زمین چنی گئی" (ایضاً ص ۲۹۲)

اور واپسی گورستان میں آپ کی پیشوائی کے لئے آپ کے خدام خاص حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری میرٹھی اور جناب وصل بلگرامی صاحب پہلے سے پہنچ کر آپ کا انتظار کر رہے تھے۔

آخری تقریر کانگریس کی تحریبی کارروائیوں کا فتنہ مرض وفات کے ایام میں زوروں پہ تھا۔ اتفاقاً انہی دنوں مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند حاضر خدمت ہوئے۔ تو طول مرض اور ضعف شدید کے باوجود آپ نے چھوٹے گھر سے باہر چھپنہ کے اندر چارپائی پر بیٹھے ہوئے ان کے سامنے گھنٹہ بھر ایک مفصل تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:-

"میں نے قرآن و سنت اور عمر بھر کے تجربہ نیز جن بزرگوں کی خدمت کا شرف حاصل ہوا۔ ان سب کے طرز عمل سے مدرسہ کے بارہ میں جو کچھ اصلح سمجھا وہ یہ ہے کہ مدارس اور ان کے متعلقین کو سیاسیات حاضرہ سے بالکل مجتنب رہنا چاہیئے اور صرف سیاسیات ہی سے نہیں بلکہ ہر اس کام سے جو تعلیمی مشاغل میں خلل انداز ہو۔ اگرچہ وہ کام فی نفسہ کیسا ہی محمود اور مفید کیوں نہ ہو۔ ہمارے بزرگوں نے طلبا کو بیعت کرنے اور سلوک میں مشغول ہونے سے بھی باوجود اس کو اہم سمجھنے کے طالب علمی کے زمانہ میں ہمیشہ منع فرمایا ہے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کبھی کسی طالب علم کو فراغت سے پہلے بیعت نہ فرماتے تھے۔ پھر کسی سیاسی اور ملکی تحریک میں شرکت کیسے گوارا کی جا سکتی ہے" (خاتمۃ السوانح ص۲۵)

حضرت مہتمم صاحب نے اس تقریر کو حرف بحرف تسلیم کیا۔ اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کا اظہار فرمایا جس سے حضرت بہت مسرور ہوئے اور دعائیں دیں۔

آخری نصیحت ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ کو یعنی وفات سے تقریباً اٹھارہ یوم قبل حضرت قاری محمد طیب صاحب دوبارہ حاضر خدمت ہوئے۔ تو آپ نے آخری نصیحت فرمانے کے لئے مولانا شبیر علی صاحب۔ مولانا جمیل احمد صاحب۔ ڈپٹی علی سجاد صاحب اور خواجہ عزیز الحسن صاحب کو خاص طور پر مجلس میں طلب کیا۔ اور فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ مدرسہ دیوبند کے بارہ میں اپنی آخری اور مختصر رائے آپ سب حضرات کے سامنے ظاہر کر دوں تاکہ بعد میں غلط انتساب کا احتمال نہ رہے۔

وقت مقررہ پر قاری صاحب اور متذکرہ بالا حضرات حاضر خدمت اقدس ہوئے۔ غایت

ضعف کی وجہ سے آواز بہت پست تھی۔ اسلئے حاضرین کو قریب بلا لیا تاکہ وہ آپ کی آخری نصیحت گوش ہوش سے سن سکیں۔ آپ نے احتیاطاً حاضرین سے دریافت بھی فرما لیا کہ وہ تقریر سن رہے ہیں یا نہ۔ جب انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو آپ نے کوئی سوا گھنٹہ بستر مرگ پر بیٹھے لیٹے نہایت مؤثرانہ انداز میں ایک مفصل، مدلل، مکمل اور مسلسل تقریر مع تمہید فرمائی۔ جیسے کوئی تصنیف شدہ رسالہ سنا رہے ہوں۔ اس آخری نصیحت میں آپ نے فرمایا:-

"میں عرصہ سے بیمار ہوں۔ حیات کا اعتبار نہیں۔ اس وقت پھر مدرسہ دیوبند کے متعلق اپنا خیال ـــــ صاف صاف ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مدرسہ دیوبند ایسی چیز نہیں کہ جس کے متعلق میں اپنی مختتم رائے ظاہر کئے بغیر چلا جاؤں۔ تاکہ بعد میں ہر فریق کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ وہ ہمارے موافق تھا۔ حق تعالے کا ارشاد ہے۔

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔	وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطا کریں۔ تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور امر بالمعروف فـ نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں۔ اور سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اس سے واضح ہے کہ دیانات مقصود بالذات ہیں اور سیاسیات وجہاد مقصود اصلی نہیں بلکہ اقامت دیانت کا وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکام دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے اور سیاسیات وجہاد سب کو نہیں دیا گیا۔ بلکہ جہاں ضرورت مصلحت سمجھی گئی۔ دی گئی۔ ورنہ نہیں۔ وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ بقدر ضرورت ہی لئے جاتے ہیں۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیت میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے جس سے دیانت کا وسیلہ ہونا اور تمکین فی الارض اور ریاست کا مقصود ہونا سمجھ میں آرہا ہے اور وہ یہ ہے:-

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم۔	تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالے وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائیگا۔ جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو

ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کو ان کے لئے قوت دیگا۔

یہاں ایمان و عمل صالح کو شرط قرار دیا جا رہا ہے تمکین فی الارض کی جس سے تمکین و سیاست کا مقصود اصلی ہونا لازم آتا ہے۔ سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح پر تمکین و شوکت کا وعدہ کیا گیا ہے اور بطور خاصیت کے شوکت کا دین پر ترتب ہونا ذکر فرمایا گیا ہے۔ پس دین پر سیاست و قوت موعود ہوئی۔ لیکن ہر موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔ ورنہ آیت کریمہ:-

ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم۔

اور اگر یہ لوگ توراۃ کی اور انجیل کی۔ اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے انکے پاس بھیجی گئی ہے (قرآن مجید) اس کی پوری پابندی کرتے۔ تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے۔

میں جس میں اقامت توراۃ و انجیل و قرآن یعنی عمل بالقرآن پر وسعت رزق کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے۔ بلکہ دین پر موعود ہے کہ دنیا ادھو کا ننگا نہیں رہ سکتا۔ پس موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔ یہاں بھی ایمان و عمل صالح پر شوکت و قوت اور سیاست و دیانت میں سیاست وسیلہ ہے اور دیانت مقصود اصلی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ سیاست کسی درجہ میں بھی مطلوب نہیں۔ بلکہ اس کا درجہ بتلانا مقصود ہے۔ کہ وہ خود مقصود اصلی نہیں۔ اور دیانت خود مقصود اصلی ہے۔ اسی بنا پر میرا خیال یہ ہے۔ کہ ایک جماعت ایسی بھی رہنی چاہیئے۔ جو خالص حفاظت دیانت اور تعلیم دین میں مشغول رہے اور وہ جماعت اہل مدارس ہی کی ہو سکتی ہے۔ اس لئے میری پختہ رائے یہ ہے کہ طلبہ کو سیاسیات میں مبتلا نہ کیا جائے۔ طلبہ اگر ان قصوں میں پڑ گئے۔ تو وہ تعلیم سے بھی جاتے رہیں گے اور تربیت بھی ان کی نہ ہو گی۔ چنانچہ جب سے طلبا کو اس سلسلہ میں ڈال دیا گیا ہے ان میں آزادی پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ لوگ ہر وقت ان کی طرف سے متفکر اور خائف رہتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار یہ کہا اور اب بھی کہہ رہا ہوں لیکن میں اس کے قبول کے آثار نہیں دیکھتا۔ چنانچہ اب جو مضمون (مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے جواب میں) آپ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس میں بھی تحق مدرسہ سیاسیات سے کوئی تبری نہیں

کی گئی۔ بلکہ اثبات معلوم ہوتا ہے۔ نیز اس بیان میں مناظرانہ صورت پیدا ہو گئی ہے۔ جس سے ذات البین پر برا اثر پڑتا ہے۔

میں نے جو کچھ کہا ہے۔ آپ کو مجبور کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ خود مجبور ہو کر کہا ہے تاکہ میرا طریق اور میری رائے تلبیس ہی نہ پڑ جائے۔ کہ میں نے ہمیشہ اس کی حفاظت کی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے بزرگ و شفیق استاد حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بھی اپنی رائے کے اخفا کو خیانت سمجھ کر ظاہر کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر میں تلبیس کو گوارا کرتا۔ تو اس وقت حضرت کے لئے کرتا۔ اب اس کی کوئی وجہ نہیں۔

اگر آپ کو اس طرز عمل کی تنقید پر دارالعلوم میں قدرت نہیں ہے تو کم از کم اپنی رائے کا اعلان صاف طور پر کر دینا چاہیئے"

مہتمم صاحب نے اس کا وعدہ فرمایا۔ حضرت نے مسرت و شفقت کا اظہار فرمایا۔ اور یہ مجلس ختم ہو گئی۔ اس تقریر کے دوران میں آپ کو سخت تکلیف ہوئی۔ بار بار رخسار مبارک تکیہ پر رکھ دیتے تھے۔

آخری عطیہ آپ کی آخری تصنیف لطیف بوادر النوادر کے ۲۵۰ نسخے آپ کی وفات سے چند روز قبل ہی جناب عبدالکریم صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج نے اپنے صرف سے طبع کرا کر حضرت کی خدمت میں بھیجے۔ حضرت نے اسی وقت بعض خاص مقربین کی فہرست تیار کرائی۔ جو غالباً ۱۶ تھے اور ہر ایک کو بوادر النوادر کا ایک ایک نسخہ دینے کی ہدایت فرمائی۔ مولانا سید سلیمان ندوی بھی اس وقت خانقاہ میں موجود تھے۔ چونکہ ان کا نام بھی اس فہرست میں موجود تھا۔ اسلئے مولانا جمیل احمد صاحب نے حضرت کا یہ عطیہ وہیں ان کے حوالے فرمایا۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ انہوں نے

"حضرت کا یہ ارشاد سامی پہنچایا کہ میرے مضامین سے اقتباسات جمع کر کے شائع کرو۔ اس حکم کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا نسخہ سمجھ کر اپنی سعادت کا اظہار کیا دوسرے دن حاضری کے موقع پر حضرت نے اپنی زبان مبارک سے خود یہ ارشاد فرمانا چاہا تو خاکسار نے حضرت کی زحمت تکلم کے خیال سے عرض کیا کہ یہ ارشاد مبارک مولانا جمیل احمد صاحب کے ذریعہ پہنچ چکا ہے مگر وہاں سے اٹھنے کے بعد مولانا جمیل صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ حضرت کا مقصود

کیا ہے۔ یعنی اس کتاب یا اور سے اقتباس یا عام کتابوں سے انہوں نے فرمایا۔ اس کو اچھی طرح میں نے خود بھی نہیں سمجھا۔ بعد کی حاضری میں موقع پا کر میں نے تفصیل چاہی۔ تو ارشاد ہوا۔ عام کتابوں میں جو مضمون مفید نظر آئیں۔ ان کو یکجا کر دیا کرو۔" (یادِ رفتگاں صفحہ ۲۹۰)

اس فہرست میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کا نام نامی بھی تھا۔ اس آخری تقسیم سے جو کتابیں بچ رہیں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ وہ سب بھیجنے والے سشن جج صاحب کو واپس کر دو۔ چنانچہ اسی طرح کیا گیا۔

آخری ملفوظ ۷ جولائی ۱۹۴۳ء سے حضرت پر غنودگی طاری رہنے لگی اور استماع ملفوظات سے حاضرین محروم رہنے لگے۔ وفات سے دو چار روز قبل خواجہ عزیز الحسن صاحب سے مصروف قیل و قال رہے۔ بہت ہی عجیب و غریب مضامین بیان فرماتے رہے اور بالآخر فرمایا کہ:-

"خواجہ صاحب یہ باتیں ہیں لکھنے کی۔ خواجہ صاحب پھر یہ باتیں سننے میں آئیں گی کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ کہیں اس کا اہتمام نہیں۔"

پھر مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی کا یہ مصرع پڑھا ع رانڈ ہو جائیں گے تلامذہ شفا میرے بعد۔

پھر مولانا عبدالسمیع صاحب بیدل کا یہ شعر پڑھا ؎

بیدلِ خستہ کو پاؤ گے کہاں کر لو اس کی مہمانی چند روز

وفات سے صرف ایک روز قبل عصر کے قریب انتہائی نقاہت کے باوجود ملفوظات کا سلسلہ یکایک شروع فرما دیا۔ گو آواز بمشکل نکلتی تھی۔ اور تقریر نہایت آہستہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زبان فیض ترجمان سے صادر ہوتی تھی۔ اس حالت میں آپ نے فرمایا کہ:-

"میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ میرے اعزہ مجھ سے لاکھ درجے بڑھ جائیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک کوئی بڑھا نہیں۔ میں نے تو ہمیشہ اپنے کو مویشیوں سے بھی بدتر اور کمتر سمجھا۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کی جوتیوں کی برکت ہے۔ مجھے اول یوم ہی وہ بات نصیب ہو گئی۔ حضرت نے ایک ایسی بشارت دی۔ جس کو میں نے اسلئے کبھی ظاہر نہیں کیا کہ گالیاں پڑیں گی۔ بڑے بڑے اکابر کا نام لے کر فرمایا۔ جن کی جوتیوں کی خاک کے برابر بھی میں اپنے آپ کو نہیں سمجھتا

کہ اب ان سے بھی ڈیڑھ چلے ہیں۔ میں ہمیشہ اس کو آئندہ کے لئے بشارت سمجھا کیونکہ اب تک تو میری حالت اس قابل کبھی نہیں ہوئی"

آخری فکر جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات الصلوٰۃ وما ملکت ایمانھم تھے۔ اسی طرح حضرت تھانوی کو بھی آخری فکر نماز اور حقوق کی تھی خواجہ صاحب سے آخری ایام میں فرماتے تھے کہ "مجھے دو چیزوں کا بہت خیال ہے نماز کا اور حقوق کا"۔ بالآخر جب بستر سے ہلنے کی بھی سکت باقی نہ رہی تھی۔ تو لیٹے لیٹے تیمم اور اشاروں سے نماز ادا فرمانے لگے۔ اور اخیر وقت تک ایک نماز بھی قضا نہ کی۔ یہاں تک کہ آخری غشی اور انتقال سے تھوڑی ہی دیر پہلے دریافت فرمایا کہ مغرب میں کیا دیر ہے۔ عرض کیا گیا کہ دس منٹ ہیں۔ فوراً کرر استفسار فرمایا کہ وقت کے آنے میں یا وقت کے جانے میں۔ آخری وقت میں بھی اس شان تحقیق نے سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

آخر وقت میں مولانا شبیر علی صاحب کو یاد فرمایا۔ وہ سہارنپور دوائی لینے کے لئے گئے ہوئے تھے جس پر بہت افسوس فرمایا کہ مجھے خانقاہ کے متعلق ان سے کچھ کام تھا۔ اس پر بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ مجھ سے فرمائیے تو فرمایا کہ تمہاری سمجھ میں نہ آویگا۔ اور پھر ان کی عدم موجودگی پر افسوس فرمانے لگے۔ اس پر انہوں نے اصرار فرمایا کہ حاضرین میں سے کسی کو سمجھا دیا جائے تو اس پر خاموشی اختیار فرمائی۔

آپ کی الجھن دور کرنے کے لئے بیگم صاحبہ نے مولوی جمیل احمد صاحب کو پیش کیا کہ ان کو سمجھا دیا جائے۔ تو حضرت نے ان کی توجہ کو دوسری طرف مبذول کرنے کے لئے امانتوں کا مضمون مطلب فرمایا۔ بیگم صاحبہ بھی ماشاءاللہ بڑی فہمیدہ تھیں۔ وہ بات سمجھ گئیں۔ اور انہوں نے پھر عرض کیا کہ مولوی جمیل اور مولوی ظفر کو سمجھا دیجئے۔ اس پر بھی خاموش رہے۔ دراصل یہ کوئی ایسے راز و اسرار کی بات تھی۔ جو وہ مولانا شبیر علی کے سوا کسی اور کو بتانا نہیں چاہتے تھے۔ چونکہ اس سعادت سے بہرہ ور ہونا عند اللہ مطلوب نہ تھا۔ اسلئے مولانا شبیر علی صاحب بر وقت نہ پہنچ سکے۔

یہ باتیں سن کر گھر کی لڑکیاں رونے لگیں۔ چھوٹی بیگم صاحبہ نے عرض کیا کہ دیکھیے! لڑکیاں رو رہی ہیں ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔ ایسی کیا جلدی ہے۔ صبح جب سانس کی تکلیف جاتی رہے۔ اس وقت سمجھا دیجئے۔ تو فرمایا رونے والی تو باولی ہیں۔ میں مایوسی سے تھوڑا ہی

کہہ رہا ہوں۔ حقوق العباد کا معاملہ ہے اور اللہ کا حکم ہے۔ اسلئے سب امانتوں کا سمجھا دینا ضروری ہے۔ پھر چھوٹی بیگم صاحبہ سے نماز مغرب ادا فرمانے کے بعد پوچھا کہ میں دونو کوما ہوار خرچ دے چکا ہوں۔ انہوں نے تسلی دی۔ کہ ہمیں بہت کچھ مل چکا ہے۔ ہمارے پاس خرچ کے لئے بہت کافی موجود ہے۔ آپ دے چکے ہیں۔ بے فکر رہیں پھر لفافوں میں سے امانتوں کی قیمت نکلوائیں۔ ایک میں چودہ آنے نکلے۔ فرمایا پندرہ آنے ہونگے۔ گر دیکھنے پر اکنی اور اسی لفافہ سے برآمد ہوئی۔ دوسرے لفافہ سے رقم نکالی گئی پانچ روپے کے چھ نوٹ نکلے۔ اور کچھ ریزگاری تھی۔ ان نوٹوں کو خود ہاتھ میں لے کر گننے کی کوشش کی۔ اور کچھ کہا بھی۔ مگر زبان لڑکھڑا چکی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اتنے میں غشی طاری ہو گئی۔ اور نوٹ سینے پر بکھر گئے۔

آخری ڈاک

بقول خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ حضرت کو کام جلد سے جلد پورا کرنے کا بہت ہی اہتمام تھا۔ یہاں تک کہ آخری روز بھی ڈاک گھر والوں سے کہہ کر ڈبہ میں سے نکلوائی اور اپنے سامنے رکھوالی۔ پھر تنے دیکھ کر فرمایا کہ اٹھالو۔ کسی اپنے خاص جاننے والے کا کوئی خط نہیں ہے۔ ایک اہل خصوصیت کا دستی لفافہ آیا۔ غنودگی اور ضعف بے انتہا تھا۔ مگر اس کو خود اپنے دست مبارک سے حسب معمول اس طرح کھولا کہ چپکا ہوا پرت پھٹنے نہ پائے۔ مگر اس طرح کھولنے میں خاصی دیر لگی۔ کیونکہ ناتواں انگلیاں اچھی طرح کام ہی نہ دیتی تھیں۔ اور کچھ غنودگی کا بھی اثر تھا۔ پاس بیٹھنے والے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ کہ خود کھول دیں۔ اور حضرت اقدس اس تعب سے بچ جاویں لیکن کسی کی مجال نہ تھی۔ کیونکہ حضرت اقدس کسی کی اعانت کسی کام میں حتی الامکان نہ لیتے تھے۔ اگر کوئی سبقت کرتا تو ناگواری کے ساتھ منع فرما دیتے۔

غرضیکہ آپ کا آخری عمل ڈاک کا ملاحظہ۔ خطوط کا جواب دینے کی کوشش۔ اور امانتوں کی سپردگی تھا۔ چونکہ طبیعت میں حقوق العباد کا غایت درجہ اہتمام تھا۔ اسلئے آخری وقت بھی اس کا خیال غالب رہا۔

آخری بشاشت

دوشنبہ (۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء) کو کھل کر اجابت آجانے کی وجہ سے طبیعت ذرا اچھی ہو گئی تھی۔ بعد ظہر جب حکیم عبدالمجید صاحب لکھنوی دیکھنے آئے تو حضرت نے خود نہایت تسلسل اور انشراح و قوت کے ساتھ اپنے حالات بیان فرمائے

تو انہوں نے اظہار اطمینان فرمایا کہ یہ ورست حضرت کے لئے نافع ثابت ہوئے۔ غنودگی بالکل نہیں رہی۔ دماغ کھل گیا۔ اور کلام بالکل مسلسل ہے۔ نبض میں بھی بجائے ضعف کے قوت پیدا ہو گئی ہے۔ اور واقعی حضرت کافی دیر تک حکیم صاحب سے بھی اور خدام سے بھی مرض و علاج کے متعلق تندرستوں کی طرح گفتگو فرماتے رہے اور دواپینے کے متعلق فرماتے رہے کہ دیکھو طبیعت ادھر نہیں آتی۔ غرضیکہ اس روز اس قسم کی گفتگو سے سب کو افاقہ کا دھوکا رہا۔

یوم وفات ۱۶ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء یوم سہ شنبہ کو صبح سے حضرت اقدس فرمانے لگے کہ آج تو ہاتھ پیروں کی جان سی نکل گئی ہے۔ ظہر کے بعد سو تنفس پیدا ہو گیا۔ فرمایا کہ اتنی شدید تکلیف مجھے عمر بھر نہیں ہوئی۔ مگر کراہنے کی بجائے لفظ اللہ اس انداز سے فرمایا کہ سب کو کچھ تشویش سی ہو گئی۔ مگر گھبراہٹ کے آثار قطعاً نہیں پائے جاتے تھے۔ اسی وقت کیا۔ تمام بیماری کے دوران میں کوہ استقلال بنے رہے۔ اور اتنی شدید و مدید علالت کی ساری تکالیف کو مردانہ وار نہایت صبر و سکون سے برداشت فرماتے رہے۔ غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت اقدس کو یہ محسوس ہو گیا تھا کہ یہ میرا آخری دن ہے۔ آپ کو بتلایا گیا کہ حکیموں نے شام کو جوزوں کی یخنی میں چاول ڈالنے کی اجازت دے دی ہے۔ تو فرمایا کہ چاہے ہیں اس وقت رہوں ہی نہیں۔ اسی طرح چھوٹی پیرانی صاحبہ سے فرمایا کہ آج تو ہم جا رہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہاں؟ فرمایا کیا تم نہیں جانتی۔

آخری غشی سوا گھنٹہ طاری رہی اس کے بعد آخر تک ہوش نہ آیا۔ البتہ سانس تیزی سے اور آواز کے ساتھ چلتا رہا۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی یٰسین شریف پڑھتے رہے اور آب زمزم چمچہ سے دہن مبارک میں ڈالتے رہے۔ خسرو دربار اشرفیہ خواجہ عزیز الحسن و دیگر حضرات نہایت حسرت سے حضرت کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا نظارہ بے بسی کے عالم میں کھڑے دیکھ رہے تھے کہ مستورات نے پردہ چاہا۔ اعزہ اندر رہے۔ اور باقی حضرات نماز عشا ادا کرنے چلے گئے۔

کسے خبر تھی کہ ساعت موعود اتنی قریب آگئی تھی۔ آفتاب علم و عرفان کی آخری کرنیں بھی روپوش ہونے کو تھیں۔ اللہ کی رحمت نا اہلوں اور نا قدرے لوگوں سے واپس لی

جا رہی تھی۔ رسول اسلام کا ایک سچا جانشین اپنے مالک و مولا کے دربار میں حضوری کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ لشکرِ اسلام کا سب سے بڑا جرنیل۔ دین کے ہر ہر محاذ۔ ہر ہر معرکہ۔ ہر ہر مورچہ کا دلاور۔ اپنے جسم کا پور پور دین کی راہ میں چور چور کئے ہوئے قلب خاشع۔ نفس مطمئنہ کے ساتھ عالم ناسوت کی بالکل آخری منزلوں سے گذر رہا تھا۔"

(حکیم الامت صفحہ ۶۰۵)

وہ ابھی نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ آپ نے جان جان آفرین کے سپرد کردی انا للہ وانا الیہ راجعون

تغیر عظیم

خواجہ عزیز الحسن صاحب حضرت کے خاصان خاص میں سے تھے لکھتے ہیں کہ:۔

میں وتر کی نماز کے تشہد میں تھا کہ دفعتہً مجھے اپنے قلب میں ایک تغیر عظیم محسوس ہوا جس نے مجھے پریشان کردیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بالکل کورا ہوگیا میں سوچنے لگا کہ یہ وہی بات تو نہیں ہے۔ جو حضرت اقدس فرمایا کرتے تھے کہ جب قطب الارشاد کی وفات ہوتی ہے تو اس وقت اہل احساس کو اپنے قلوب میں تغیر محسوس ہوتا ہے اور کیفیات میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا فیض عام ہوتا ہے۔ سب کو پہنچتا ہے۔ چاہے فیض پانے والے کو بھی یہ خبر نہ ہو کہ یہ فیض خاص کدھر سے آرہا ہے۔ بلکہ خود قطب الارشاد کو بھی کسی کی طرف فیض منتقل ہونے کا علم ہونا ضروری نہیں۔ جیسے آفتاب کی روشنی بلا اس کے قصد کے سب کو پہنچتی ہے یہ ارشاد یاد آکر گمان تو ضرور ہوا کہ اس تغیر کا سبب یہی ہے کہ حضرت اقدس عالم نزع میں ہی ہوں گے۔ پھر خیال ہوا کہ ابھی تو زندہ ہیں۔ گو عالم نزع میں سہی۔ یہ پہلے سے ہی اثر کیوں شروع ہوگیا۔ اس اشکال کا جواب ذہن میں یہ آیا کہ گو ابھی رحلت نہیں فرمائی لیکن نزاع میں اس عالم سے چونکہ بے تعلقی ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے اس کا اثر مثل وفات ہی کے ہوتا ہو۔ لیکن جب میں نماز سے فارغ ہو کر دردولت پر واپس گیا۔ تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی پانچ منٹ ہوئے رحلت فرما گئے ہیں اس وقت مجھے گمان غالب ہوا کہ وہ جو ایک تغیر خاص مجھے وتر کے تشہد کے وقت محسوس ہوا تھا۔ عجب نہیں عین پرواز روح مقدس ہی کے وقت ہوا ہو کیونکہ فارغ ہو کر دردولت تک پہنچنے میں تقریباً اتنا ہی وقت صرف ہوا ہوگا۔ وہ تغیر مجھے اس درجہ کا محسوس ہوا تھا کہ سلام پھیرنے کے بعد میں سخت پریشان ہو کر

بآواز کہنے لگا کہ یا اللہ اگر حضرت اقدس کے بعد میری یہی حالت رہی تو میرا ایمان کیسے سلامت رہے گا۔ (خاتمۃ السوانح ص۱۶)

نور کی کرنیں

چھوٹی بیگم صاحبہ نے بوقت نزع یہ دیکھا کہ جب سانس زور سے اوپر کو آتا تھا تو داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کے درمیان پشت کی طرف گھاٹی میں ایک ایسی تیز چمک جگنو کی سی پیدا ہو جاتی تھی کہ باوجود اس کے کہ بجلی کے دو قمقمے اس وقت روشن تھے۔ پھر بھی اس کی چمک غالب ہو جاتی تھی۔ پھر دوسرے سانس میں وہ چمک غائب ہو جاتی تھی۔ پہلے تو وہ یہ سمجھیں کہ کوئی جگنو آ بیٹھا ہے۔ لیکن جب دیر تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ تو پھر انہوں نے دوسری مستورات کو بھی جو اس وقت ان کے قریب موجود تھیں دکھایا کہ مجھے دھوکا ہو رہا ہے یا تمہیں بھی یہ چمک نظر آ رہی ہے؟ چنانچہ ان سب نے دیکھ کر اس کی تصدیق کی۔ سانس بند ہو جانے کے بعد وہ چمک بھی بند ہو گئی۔ اور پھر نظر نہ آئی۔

اس عجیب واقعہ کی ایک اہل علم اور صاحب ذوق خادم مجاز حضرت اقدس نے یہ توجیہ کی کہ یہ نور اس وجہ سے ظاہر ہوا کہ انہی دو انگلیوں سے بڑے بڑے علوم و دقائق اور معارف و حقائق ایک طویل مدت تک معرض تحریر میں آتے رہے ہیں۔ یہ نور اس کا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

تجہیز و تکفین

انتقال کے تھوڑی دیر بعد مولانا شبیر علی صاحب سہارنپور سے واپس آ کر واپس خانقاہ پہنچے۔ مگر اب نہ مرض باقی رہا تھا اور نہ مریض۔ مولانا نے فوراً گرد و نواح کے صرف اہل خصوصیت اور اعزہ ہی کو آدمی بھیج کر اطلاع کی۔ مگر یہ خبر وحشت اثر بجلی کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔

تجہیز و تکفین کے متعلق یہ فیصلہ ہوا کہ صبح کو ہو۔ صبح کو ہی خبر کے لئے دو آدمی سہارنپور بھیجے گئے۔ ایک مدرسہ مظاہر العلوم میں جس سے حضرت کو بہت روحانی تعلق تھا۔ دوسرا سہارنپور کے احباب کے پاس۔ اس صبح والی گاڑی کے جانے اور دوسری گاڑی کے آنے میں آدھ گھنٹہ کا فصل ہوتا تھا۔ اسلئے لوگ یہ خبر سنتے ہی جس حال میں تھے۔ اسی حال میں چل پڑے۔

سپیشل گاڑی

پہلی گاڑی سے جو لوگ بچ گئے۔ ان کے لئے محکمہ ریلوے نے فوراً ایک سپیشل گاڑی سہارنپور سے تھانہ بھون کے لئے چلائی۔ اس طرح ہزاروں

لوگ شمولیت جنازہ کے لئے وہاں پہنچ گئے۔ ادھر مولانا شبیر علی صاحب کی زیرِ نگرانی متعدد علماء صلحاء اچھی طرح مطابق سنت حضرت کو غسل دے چکے تھے اور جنازہ تیار کر کے باہر لانے لگے۔

بارانِ رحمت اس وقت عجیب کہرام مچا ہوا تھا۔ کوئی رو رہا تھا۔ کوئی چیخیں مار رہا تھا۔ ایک عجیب رقت انگیز نظارہ تھا۔ جس سے آسمان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور جونہی جنازہ گھر سے باہر نکلا۔ اس نے بھی ترشح کے ذریعہ اس مجدد الملت کو آخری خراجِ تحسین ادا کیا۔ دفن تک بادل چھائے رہے اور تمام راستہ میں ترشح سے خوب چھڑکاؤ سا ہو گیا۔

نمازِ جنازہ بے پناہ ہجوم کے پیش نظر چارپائی کے ساتھ دو لمبے بانس باندھ دیئے گئے اور چارپائی اٹھانے پر مستقل آدمی تعینات کر دیئے گئے اور لوگوں کو بانسوں کی مدد سے کندھا دینے کی ہدایت کی گئی۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے جنہیں نمازِ جنازہ پڑھانے کی پہلے سے بشارت ہو چکی تھی۔ نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اور حضرتؒ کو قبرستان "عشقبازاں" کے وسط میں آخری نیند سلا دیا گیا۔ جو حضرت نے خود زمین خرید کر وقف کیا تھا۔

مقامِ شہداء نظامِ تکوینی کے ماتحت جب کسی آفتابِ علم کے غروب کا وقت قریب آتا ہے تو صالحین کو عالمِ خواب میں قبل از وقت مطلع کر دیا جاتا ہے اور بغرض ترغیب بعض اوقات ان کے انجام کی بھی خبر دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرتؒ کی وفات سے چھ ماہ قبل ایک خادمہ ریسہ کو عالم رؤیا میں معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مولانا اشرف علی کو غروب ہوتا ہوا آفتاب سمجھو"۔ (اصدق الرؤیا)

اس کے پورے چھ ماہ بعد حضرت کا انتقال ہوا۔ اس طرح اور بھی بہت سے نیک لوگوں کو عالمِ رؤیا میں مختلف طریق سے اس امر کی اطلاع ہوئی۔ جنہوں نے خود حضرت سے ذکر کیا جو اکثر حضرت کی مرتب کردہ "اصدق الرؤیا" میں درج ہیں۔

حضرتؒ کے دفن ہونے کے بعد جو رات آئی۔ اس رات کو حضرت کے ایک مجاز بیعت نے جن کو خوابوں سے خاص مناسبت ہے۔ بعد نصف شب کے حضرتؒ کو خواب میں دیکھا۔ حضرت نے فرمایا کہ ا۔

"مجھے مردہ نہ سمجھو۔ میں زندہ ہوں۔ جس طرح میری حیات میں مجھ سے فیض لیتے

رہتے تھے۔ فیض لیتے رہنا فیض ہوتا رہے گا۔ اور مجھے مقام شہدا نصیب ہوا ہے کہہ دیا جاوے"

وفات کے آٹھویں روز صبح صادق کے قریب انہیں پھر ایسا خواب آیا جس میں تاکید کی گئی کہ "یہ خبر چھوٹی پیرانی صاحبہ کو پہنچا دو" چنانچہ انہوں نے صبح پرچہ لکھ کر حضرت مخدومہ محترمہ چھوٹی بیگم صاحبہ کی خدمت میں دونوں خواب پہنچا دیئے۔

ان رویائے صادقہ کی تائید دو حدیثوں سے بھی ہوتی ہے کہ پیٹ کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے اور حضرت کی وفات مرض اسہال سے ہوئی تھی۔ دوسرے فتنوں کے زمانہ میں سنت کو زندہ کرنے والے کے لئے بھی مخبر صادقؐ نے شہادت کی بشارت دی ہے اور حضرت کی ساری عمر احیائے سنت میں گذری۔

مزار مبارک حضرت تھانوی کیلئے دوسرے بزرگانِ دین کی طرح کوئی پُرشکوہ مزار تعمیر نہ کیا گیا اور نہ ایسا ہو سکتا تھا۔ کہ جس نے ساری عمر رد بدعات و رسومات میں گزار دی ہو۔ اس کی وفات کے بعد اس کا آغاز ان کے مزار کی تعمیر سے کیا جاتا۔ حضرت کا مزار کس نوعیت کا ہے۔ اس کی تفصیل مولانا عبدالماجد صاحب کے بیان کے مطابق یہ ہے:۔

"اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا۔ پورے دو فرلانگ بھی تو نہیں۔ اور مزار؟ آہ مزار! نہ کوئی بلند گنبد۔ نہ کوئی کلس دار قبہ۔ نہ چار دیواری، نہ آستانہ۔ نہ جنگلہ۔ نہ کٹہرا۔ ایک اوسط درجہ کی وسعت کا باغ۔ ایک سمت میں ایک مختصر پر فضا عمارت وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ۔ اور وہی اللہ کے اس شیر کی خوابگاہ! نہ شامیانہ۔ نہ چھت۔ صرف آسمان کی کھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تربت! سادگی کی تصویر!! صاحبِ قبر کی بے نفسی کا آئینہ۔ نہ لوح۔ نہ کتبہ۔ نہ پھول۔ نہ چادر۔ چند قدم کے فاصلے پر وصل بلگرامی مرحوم اور دوسرے مخلصین پیشوائی کے شوق میں پہلے ہی سے پہنچے ہوئے۔ شیخ کی قبر ان سب قبروں سے بھی پست! زندگی میں بھی تو اپنے کو اپنے متوسلین سے پیچھے رکھتے تھے (حکیم الامت صفحہ ۲۰)

خراجِ تحسین غرضیکہ بقول مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ:۔
"اب اس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا۔ جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر کی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا

شیخ محمد صاحب تھانوی کی یادگار تھا۔ اور جس کی ذات میں حضرت چشت حضرت مجدد الف ثانی۔ اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں۔ جس کا سینہ چشتی ذوق عشق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا۔ جس کی زبان شریعت وطریقت کی دعوت کی ترجمان تھی۔ جس کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا۔ اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو متفیض بنا رکھا تھا۔ اور جس نے اپنی تحریر و تقریر سے حقائق ایمانی و دقائق فقہی۔ اسرار احسانی اور رموز حکمت ربانی کو فاش کیا تھا۔ اور اسی لئے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرف زمانہ کے لئے یہ خطاب عین حقیقت تھا۔" (یادرفتگاں صفحہ ۲۸۳)

اعترافِ عظمت

نصفِ ماتم اشرف العلماء اشرف الاولیاء قطب الارشاد حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو چودھویں صدی کے نصف اول میں صحابہ کرام کے زندہ نمونہ تھے۔ بالآخر اس سرائے فانی میں بیاسی (۸۲) سال تین (۳) ماہ گیارہ (۱۱) دن گزار کر اپنی ابدی قیام گاہ کو واپس تشریف لے گئے۔ اس سانحہ ارتحال کی خبر ملک کے طول و عرض میں ہر طبقہ خیال میں انتہائی رنج و غم کے ساتھ سنی گئی۔ ملک کی سب جماعتوں نے جن میں حضرت کے سیاسی اور مشربی مخالفین بھی شامل تھے اس خسارہ کو خسارۂ عظمیٰ قرار دیا۔ اور یہ خبر سب سے پہلے ایک غیر مسلم اخبار نے نہایت اہتمام اور بہت ہی اچھے عنوان سے شائع کی۔ اخبارات نے سیاہ حاشیوں میں وفات کی خبر شائع کی۔ تعزیتی مقالے لکھے۔ اکابر قوم نے اپنے اپنے بیانات میں آپ کو آخری خراج تحسین پیش کیا اس موقع پر قائد اعظم نے بھی اپنے اس روحانی محسن کے متعلق ایک بیان "اظہار غم" دیا۔ جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے۔ تعزیتی قرار دادیں پاس کی گئیں۔ مدارس بند کر دیئے گئے۔ بعض لوگوں نے وفور غم میں دکانیں بھی بند کر دیں۔ فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی شروع ہو گئی۔ حضرت سے

تعلق رکھنے والا ہر شخص خود کو تعزیت کا مستحق سمجھے گا۔

تاثر ماجدی مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں کہ:۔
"آہ! طبیبوں کی اٹکل پر قائم کی ہوئی امیدوں کی بنیاد کیسی ریت پر نکلی بشری تدبیر نے خداوندی تقدیر کے مقابلہ میں کس بری طرح شکست کھائی! مولانا میرے استاد تھے۔ مقتدا تھے۔ سردار تھے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میرے محبوب تھے۔ آہ!! کہ عقیدت۔ عظمت اور محبت تینوں ایک ہی وقت میں کچلی کر رہ گئیں۔ تعزیت کا مستحق میں خود ہوں۔ کسی دوسرے سے کیا تعزیت کروں۔ اللہ نے ان کی ذات میں نورِ حق کی ایک جھلک دکھادی تھی۔ ولی کامل کا نمونہ اس بیسویں صدی عیسوی میں دکھادیا تھا ؎

باشما را نورِ مطلق دیدہ ایم　　نورِ مطلق را ہمہ حق دیدہ ایم

دین کے خادم اور بزرگ اور بھی اس وقت اچھے اچھے موجود ہیں۔ پر وہ ایک ہستی ان سب سے نرالی۔ ان سب سے انوکھی۔ اپنی نظیر بس آپ تھی عالمِ اسلامی میں اس سے بڑھ کر قیامت خیز حادثہ اس وقت اور کیا ہو سکتا ہے! دنیائے اسلام میں سناٹا ہوگیا۔ وقت کا سب سے بڑا عالم سب سے بڑا عارف محمدؐ کی فوج کا سب سے بڑا کارگذار اور وفادار جرنیل رفیقِ اعلیٰ سے جا ملا۔

ہم بدبخت ایسی نعمت کے اہل ہی کب تھے؟ حیرت اس پر نہیں کہ یہ نعمتِ عظمیٰ اپنے وقت پر واپس لے لی گئی۔ حیرت اس پر ہے کہ اتنے دن [illegible] رہی کیسے؟

ع ز بہار عالم دیگری ز کجا ایں چمن آمدی"

اعترافِ "برہان" یوں تو ملک کے تقریباً تمام موقر جرائد نے حضرت تھانویؒ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مگر ذیل میں ہم صرف ان چند جرائد کی آراء پیش کرتے ہیں جو سیاسی اور مشربی لحاظ سے حضرت تھانویؒ کے مخالف تھے۔ دہلی کے مشہور رسالہ البرہان اپنے اگست ۱۹۴۳ء کے شمارہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا کہ:۔

"یوں تو موت اس عالمِ آب و گل کی ہر اس چیز کے لئے ہی مقدر ہے۔ جو زندگی کا عارضی لباس پہن کر بساطِ ہستی پر نمودار ہوئی ہے۔ لیکن جس طرح زندگی زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ اسی

طرح ہر ایک کی موت بھی یکساں نہیں ہوتی کبھی کبھی ایسی اموات بھی واقع ہو جاتی ہیں۔ جو
صرف افراد و اشخاص کی اموات نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی عمارت
حیات بھی اس سے متزلزل ہو جاتی ہے۔ جو مرنے والے کے دامان عقیدت و ارادت سے
وابستہ ہوتے ہیں۔ پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہ ہائے اشک سے نہیں
ہوتا۔ بلکہ ہزاروں دلوں کی پرسکون آبادیاں ایک مستقل غمکدۂ آمال و امانی بن کر رہ جاتی ہیں
امیدوں اور ولولوں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ نشاط و کامرانی حیات کے آتشکدے
سرد ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثہ جانکاہ نے کائناتِ عالم کی
ہر ہر چیز کو اداس اور غمگین بنا دیا ہے۔ اسی قسم کی ایک موت پر عربی شاعر نے کہا تھا ؎

وَمَا كَانَ قَيسٌ هُلكُه هُلكَ واحدٍ وَلٰكِنَّه بُنيانُ قَومٍ تَهَدَّمَا

قیس کا مرنا صرف ایک شخص کا مرنا نہیں ہے بلکہ وہ ایک قوم کی بنیاد تھا جو منہدم ہو گئی

گزشتہ ماہ جولائی کی ۱۹، ۲۰ کی درمیانی شب کو تقریباً دس بجے حکیم الامت حضرت
مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا جو سانحہ ارتحال پیش آیا۔ وہ اسی قسم کا سانحہ تھا حضرت
مولانا جس طرح شریعت کے عالم متبحر تھے۔ طریقت اور سلوک میں بھی مقام رفیع کے مالک
تھے۔ ان کی ذات علوم ظاہری و باطنی کا مخزن تھی۔ علم سفینہ سے زیادہ علم سینہ ان کا اصلی
جوہر اور زیور تھا۔ تحریریں علم و فضل کا معدن ہوتی تھیں۔ اور تقریر بھی بلا کی اثر انگیز تھی وہ
جس بات کو حق سمجھتے تھے۔ اسے برملا کہتے اور کرتے تھے۔ اور اس میں انہیں کسی
لومتہ لائم کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ خود ایک درویش گوشہ نشین تھے۔ مگر ان کا آستانہ بڑے بڑے
اربابِ ثروت و دولت اور اصحابِ علم و فضل کی عقیدت گاہ تھا۔ جو بات اور جو عمل تھا۔
اخلاص اور دیانت کے ساتھ تھا۔ دنیوی وجاہت و شہرت اور مالی حرص و آز کا شاید دل
کے آس پاس بھی کہیں گذر نہ ہوا تھا۔ اپنے اصول اور اپنے عقیدہ و خیال پر اس مضبوطی اور
پختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔ کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے منحرف نہیں کر سکتی تھی
حضرت مرحوم کا آستانہ معرفت و روحانیت کا ایک چشمہ صافی تھا۔ کہ ہزاروں تشنہ کام آتے
اور سیراب ہو کر جاتے تھے۔ اور جن کی زندگیاں معصیت کوشی اور عصیان آلودگی میں بسر ہوئی
تھیں۔ یہاں سے پاک صاف ہو کر اور گوہر مقصود سے دامانِ آرزو بھر کر واپس لوٹتے تھے
ان کی زندگی اتباعِ سنت کا ایک زندہ درس اور ان کی گفتگو اسرار و رموز طریقت کا دفتر گرانمایہ تھی

بعض مسائل میں علمائے ہند کی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ اختلاف رہا لیکن تقویٰ و طہارت تفقہ فی الدین۔ شرعی علوم میں مہارت و بصیرت۔ راست گفتاری اور مخلصانہ عمل کوشی۔ انابت الی اللہ بے لوث خدمتِ دین۔ بے غرضانہ تلقینِ رشد و ہدایت۔ حضرت مرحوم کے یہ وہ اوصافِ عالیہ اور فضائلِ حمیدہ تھے۔ جو ہر موافق اور مخالف کے نزدیک برابر مسلّم رہے۔ بعض عوارض و اسقام کی بنا پر گوشہ نشین ہونے سے قبل اپنے مواعظِ حسنہ اور اپنی کثیر تصانیف کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اصلاحِ عقائد و اعمال اور ابطالِ رسوم و بدعات کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔ وہ غالباً تمام ہم عصروں میں ان کا واحد طغرائے امتیاز ہے قوم نے ان کو حکیم الامت کا خطاب دیا۔ اور بالکل بجا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کا ایسا کامیاب علاج کیا کہ جو خزف ریزے تھے۔ وہ گوہر آبدار بن گئے اور جو صرف پیتل تھے وہ زرِ خالص ہو گئے۔"

خراجِ "مدینہ" حضرت کے مخالف کانگرس کے ترجمان اخبار "مدینہ" بجنور نے یکم اگست ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں لکھا کہ:۔

"حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جو اگرچہ اس کارگاہِ ہست و بود میں بالکل فطری ہے لیکن جس پر ماتم کرنے والی آنکھ کبھی خشک نہیں ہو سکتی۔ حکیم ثنائی کے قول کے بموجب ایک مردِ کامل کو پیدا ہونے میں صدیاں نہیں صدیوں سے بھی کچھ زیادہ ہی کا زمانہ درکار ہوتا ہے۔ پھر جب ایسا گوہر نایاب دنیا کو خوش قسمتی سے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ تو اس کی جدائی جتنی بھی شاق گذرے کم ہے۔ خدا کے فضل سے مولانا تھانوی کی عمر بہت کافی ہوئی۔ اسی اور نوے سال کے بیچ عمر کے عدد کا پہنچ جانا آج کل کے پر از آلام و امراض زمانہ میں بہت بڑی بات ہے۔ پھر قدرت کی عنایت سے آپ کی صحت بھی اتنی اچھی رہی کہ سینکڑوں ہی کتابیں لکھ ڈالیں۔ لیکن پھر بھی آپ کی جدائی کا تصور آنکھوں کو اشکبار ہونے سے باز نہیں رکھ سکتا ؎

دل کے جانے کا شہیدی حادثہ ایسا نہیں   کچھ نہ دیتے آہ گر ہم عمر بھر رویا کئے

مولانا کی سیاسی رائے سے ہمیں کبھی اتفاق نہ ہوا۔ لیکن بایں ہمہ مولانا تھانوی کی علمی برتری اور ان کے طہارت و تقویٰ کی بلندی کے آگے ہمارا سرِ نیاز ہمیشہ جھکا رہا۔ مولانا ایک

بے مثال فقیہہ تھے۔ ایک عدیم النظیر مفسر تھے۔ بے مثال متکلم اور بلند پایہ محدث تھے پھر
خوش قسمتی سے علم وفضل کی اِس نعمت کے ساتھ ساتھ تصوف وطریقت کے میدان کے بھی
شہسوار تھے۔ آپ کی خانقاہ امدادیہ ضلالت وگمراہی کے دور میں طالبانِ حق کے لئے روشنی
کا مینارہ تھی۔ آپ کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ کا دل دشمن سے بھی انتقام
لینے کا روادار نہ تھا۔ چنانچہ آپ اپنے مخالفوں کے خلاف شاذ ونادر ہی کبھی کوئی لفظ زبان
سے نکالتے تھے۔ آپ کی زندگی با قاعدہ تھی۔ کھانے پینے۔ سونے جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے
کے تمام اوقات مقرر تھے۔ جن پر سختی سے عمل فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی صحت آخر
وقت تک قابلِ رشک طور پر اچھی رہی۔ ان تمام خصوصیات کے پیشِ نظر دعویٰ سے کہا جا سکتا
ہے کہ ایسی جامع شخصیت اب دنیا بمشکل ہی پیدا کر سکے گی۔ غرض مولانا کی شخصیت ایک بہت
بلند وممتاز حیثیت کی مالک تھی۔ آپ کے ارادت مندوں کی تعداد ملک میں کافی ہے۔ خاص
بات یہ ہے کہ اس تعداد میں اچھے اچھے علماء وفضلا اور بڑے بڑے اہلِ علم وبصیرت لوگ
شامل ہیں۔"

سیاسی بصیرت

ایک اور سیاسی جریدہ رقمطراز ہے کہ:

"۱۹، ۲۰ جولائی کی درمیانی شب میں مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ ۸۲ کی برس
کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا کی حکمت۔ تقویٰ اور ذہانت نے مسلمانوں کے
ہر طبقہ کو متاثر کیا۔ تصنیفات کے اعتبار سے مولانا کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ معاشرت
اسلامی پر آپ کی مبسوط کتاب "بہشتی زیور" بہت معروف ہے۔ اس کتاب سے لاکھوں عورتوں کو
اسلام کی تعلیمات سے بہتر واقفیت حاصل ہوئی۔ اور عام طور پر طبقہ نسواں کی تعلیم میں اضافہ ہوا
نیز اس کے لئے شرح مثنوی مولانا روم اور بیان القرآن کی جیسی تصانیف ہمیشہ آپ کی یادگار
رہیں گی۔ عام رسائل اور کتابیں اس درجہ مقبول ومطبوع ہوئیں کہ نقد لے ان کتابوں کی مجموعی
قیمت چالیس لاکھ روپیہ سے کسی صورت میں کم نہیں۔ اس عام مقبولیت کے باوجود کسی ایک
کتاب کا حق بھی مولانا نے اپنے لئے محفوظ نہیں رکھا۔ طبع واشاعت کی عام اجازت دی
اس سے مولانا کے اخلاص اور سیر چشمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تازہ ترین شمار کے مطابق مولانا مرحوم کی
کل تصانیف کی تعداد آٹھ سو تین ہے۔ عملی سیاسیات سے اگرچہ مولانا موصوف ہمیشہ کنارہ کش
رہے لیکن سیاسیات میں بصیرت تامہ رکھتے تھے۔ آپ اس کے کبھی مؤید نہیں رہے کہ مسلمان

کانگرس میں شریک ہوں۔ اس بنا پر کہ مسلم لیگ بہرحال مسلمانوں کی جماعت ہے مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی حامی ہے۔ اسلامی طریقہ پر مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کی دعویٰ دار ہے آپ اس کے مؤید تھے کہ سیاسی جماعت کے طور پر مسلمانوں کو اس میں شامل ہونا چاہیئے
مولانا واعظ کی حیثیت سے بھی ہندوستان میں بہت مشہور تھے۔ ہندوستان میں وسعت کے ساتھ آپ نے دورے کئے۔ آپ کے وعظوں میں ہزارہا مسلمانوں کا مجمع ہوتا تھا اور وہ متأثر ہو کر جاتے تھے۔ آپ کے مریدین کی تعداد بہت کثیر ہے۔ تحریر و تقریر اور ذاتی مثال کے ذریعہ چودھویں صدی کے اس نصف اول میں آپ نے وسعت کے ساتھ اسلامیت کی تبلیغ فرمائی۔ کہن سالی اور ضعف کے باوجود آخر وقت تک آپ مسلمانوں کی خدمت میں معروف رہے ذاتی حیثیت سے تقویٰ اور عمل کے معاملہ میں آپ کا خاص مرتبہ تھا۔ اس کے باوجود کہ مولانا نے پوری عمر پائی۔ لیکن پھر بھی افسوس ہے کہ یہ شمع علم وہدایت بجھ گئی۔ اور مسلمانوں کی محفل سونی ہو گئی"

حرفِ آخر۔ غرضیکہ بطور اعترافِ حقیقت اس آفتابِ علم کے غروب ہونے پر جرائد و عمائد نے جس قدر مقالے لکھے اور بیان دیئے۔ ان کے لئے ایک الگ دفتر کی ضرورت ہے۔ جس ہستی کی ہر ساعت اعلائے کلمۃ الحق میں گذری ہو جس کا ہر نفس احیائے سنت اور تبلیغ شریعت میں صرف ہوا ہو۔ اس کی خدمات کا کیا اندازہ اور شمار ہو سکتا ہے۔

وصفِ او ہرگز نیاید در کلام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

کتبہ
مفتی بشیر محمد عفی عنہ

طابع - انشا پریس لاہور
ناشر - ادارہ نشر المعارف چہلیک ملتان شہر
اگست سنہ ۵۶ء